تفسیر موضوعی

قرآن کا دائمی منشور

جلد 10

تالیف

آیت اللہ جعفر سبحانی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تفسیر موضوعی

جلد نہم

قرآن کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

ترجمہ

مولانا سید علی محمد نقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور ۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور

جلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہم، دہم

مؤلف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

مترجمین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا سید علی محمد نقوی، مولانا قیصر عباس

ترتیب و تنظیم نو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قلب علی سیال

کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

طبع ثانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبہ جدید پریس لاہور

سال اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فروری 2012ء

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے
ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان
کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، للہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء ومحققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کر سکتے ہیں۔ آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور مولانا سید علی محمد نقوی اور مولانا قیصر عباس نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

۱: اردو خوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء ومحققین کی خدمت میں اسلامی وقرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 9، 10 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تا کہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جا سکے۔ کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جا رہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 9

عنوان	صفحہ نمبر
انسان اور جہان کی معاد	19
مقدمہ مؤلف	19
قرآن میں قیامت کے اسماوصفات	20
۱۔الساعة	21
۲۔ازفة	21
۳۔الحاقة	22
۴۔القارعة	22
۴۔الطامة الکبریٰ	22
۱۔الواقعة	22
۲۔الصاخة	23
۳۔الغاشية	23
۴۔الاخرة	23
۵۔یوم الفتح	23
۶۔یوم عسیر	23
۷۔یوم معلوم	23
۸۔یوم الحق	23
۹۔یوم لا ریب فیه	23
۱۰۔المیعاد	24
قیامت کے بارے میں آیات کی تعداد	24
معاد گذشتہ انبیاء کی تعلیمات میں	25
۱۔آدم اور قیامت	26
۲۔حضرت نوحؑ اور قیامت	27
۳۔حضرت ابراہیمؑ اور معاد	28
۴۔حضرت موسیٰؑ اور قیامت کا اعتقاد	29
۵۔حضرت مسیحؑ اور قیامت	31
۴۔معاد کے قطعی ومسلم ہونے پر دلیلیں	32
۳۔معاد ہدف خلقت کا تعین کرتی ہے	32
پہلی قسم کی آیات	33
با ایمان مفکر اور ہدفِ خلقت	38
حضرت علی علیہ السلام اور ہدفِ خلقت	38
۲۔معاد عدلِ الٰہی کا تقاضا ہے	38
معاد اللہ کے وعدوں کی جلوہ گاہ	44
اعمال پر جزا۔ایک وعدۂ الٰہی	45
۴۔معاد۔رحمت خدا کا مظہر ہے	46
۵۔معاد کمالِ انسانی کی آخری منزل	48
۶۔اللہ پروردگار ہے تو معاد ضروری ہے	51
منکرین معاد اور انکار کے اسباب	52
معاد کے انکار کے حقیقی عوامل	52
۱۔لامحدود آزادی کی خواہش	52
۲۔تسلط کی خواہش اور انکار معاد	53
پہلا شبہ	56
معاد پر کوئی دلیل نہیں ہے	56
دوسرا شبہ	57

فہرست	صفحہ

فہرست	صفحہ
عقیدۂ معاد قصہ و کہانی ہے	57
تیسرا شبہ	58
افترا یا پاگل پن	58
چوتھا شبہ	58
ہمارے آبا کو زندہ کر دکھائیں	58
پانچواں شبہ	59
معاد ایک قسم کی جادوگری ہے	59
چھٹا شبہ	60
معاد احاطۂ قدرت سے باہر ہے	60
ساتواں شبہ	60
مردوں کو زندہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے	60
آٹھواں شبہ	61
موت انسان کے لیے فنائے مطلق	61
نواں شبہ	62
اس دو قسم کی خلقت میں کوئی رابطہ نہیں	62
دسواں شبہ	63
منتشر اجزا ناقابل شناخت ہیں	63
معاد کے امکان پر دلیلیں	65
شبہات کے تفصیلی جوابات	65
(الف) معاد قبضہ قدرت سے خارج ہے	65
ا۔ خدا کی وسیع قدرت	66
۲۔ معاد اور خلقت کا یہ عظیم کارنامہ	67
۳۔ انسان کی پہلی خلقت	67
(ب) دوسرا شبہ	68
معاد اور بوسیدہ بدن	68
قرآن کا جواب	69
(ج) تیسرا شبہ	72
معاد اور خداوند عالم کا علم	72
ا۔ علم خدا اور اجزا کی صورت میں بکھرے ہوئے بدن	72
۲۔ علم خدا اور بندوں کا حساب	72
(د) چوتھا شبہ	74
معاد اور دو خلقتوں میں ربط	74
مسئلہ تجرد روح	75
(ا) پہلی دلیل	76
ثابت شخصیت اور دگرگوں حوادث	76
(۲) دوسری دلیل	76
بدن سے غفلت کے باوجود شخصیت کا حضور	76
۳۔ تیسری دلیل	77
شخصیت کا ناقابل تقسیم ہونا	77
قرآن اور تجرد روح	78
پہلی قسم کی آیات	78
احتمال اوّل	85
احتمال دوم	85
مردوں کو زندہ کرنے کے سات نمونے	86
ا۔ علم الیقین	86
۲۔ حق الیقین	86
۳۔ عین الیقین	86
پہلا نمونہ	87
حضرت ابراہیم اور مردوں کو زندہ کرنا	87
ایک سوال کا جواب	88
دوسرا نمونہ	90

فہرست	صفحہ
عزیزؑ کی حیاتِ نو	90
قابل توجہ نکتہ	92
تیسرا نمونہ	92
افسوس کے مارے ہوئے	92
ایک سوال کا جواب	95
چوتھا نمونہ	96
بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہونا	96
پانچواں نمونہ	97
حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا	97
چھٹا نمونہ	98
ہمراہیانِ موسیٰؑ کی حیاتِ نو	98
ساتواں نمونہ	99
دعائے حزقیلؑ سے نئی زندگی	99
معاد جسمانی وروحانی	100
اقوال ونظریات	100
انکارِ معاد	100
۲۔معاد کے بارے میں شک	100
۳۔صرف جسمانی معاد	100
۴۔صرف روحانی معاد	101
۵۔معاد جسمانی وروحانی	101
معاد کے جسمانی یا روحانی کا معیار کیا ہے؟	101
(الف) انسان کی حقیقت کیا ہے	102
(ب) مختلف قسم کی جزا وسزا	103
قرآن اور جسمانی وروحانی معاد	104
معاد جسمانی پہلے معیار کے مطابق	104
قرآن اور روحانی معاد پہلے معیار پر	107

فہرست	صفحہ
قرآن اور جسمانی معاد دوسرے معیار پر	107
قرآن اور روحانی معاد دوسرے معیار پر	108
۱۔رضائے خدا کی لذت	108
۲۔رحمت خدا سے دوری	109
۳۔جانکاہ حسرت وغم	110
۴۔محبوب سے ملاقات	111
۵۔فراق محبوب کی تکلیف	114
معاد جسمانی کے بارے میں حکما و متکلمین کے نظریات	115
۱۔فارابی اور معاد جسمانی	115
فارابی کے نظریے پر تنقید وتحلیل	117
۲۔فارابی پر دوسرا اشکال	118
۳۔تیسرا اشکال	118
۲۔شیخ الرئیس اور معاد جسمانی	119
۳۔صدر المتالہین اور معاد جسمانی	120
۱۔وجود مختلف مراتب رکھتا ہے	123
۲۔ہر شے کی حقیقت اس کی صورت ہوتی ہے	123
۳۔وجود کے تین عالم	124
ان اصولوں کا نتیجہ	125
صدر المتالہین کے نظریہ کی تحلیل	125
(ج) اسلامی متکلمین اور جسمانی معاد	127
معاد جسمانی عقل کے ترازو میں	130
بدن کا احیاء ذاتاً ممنوع نہیں	130
منکرین معاد جسمانی کے تین شبہات	131
۱۔معادہ۔اعادۂ معدوم ہے	132
متکلمین کا جواب	132

فہرست	صفحہ
تکمیل وتوضیح	133
اس جواب کی توضیح وتشریح	133
۲۔شبہ آکل وماکول	134
اشکال کا جواب	136
شبہ آکل وماکول اور عدلِ الٰہی	138
۳۔سزا کا مقصد کیا ہے؟	139
ا۔غم کی تسکین	139
۲۔مجرم کی تربیت	139
۳۔دوسروں کے لیے عبرت	139
معاد جسمانی کے اشکلات کی ایک اور تحلیل	142
ا۔معاد جسمانی دنیا کی طرف برگشت ہے	142
۲۔معادِ جسمانی میں تناسخ کا لزوم	143
مفسدۂ تناسخ کا جواب	143
۳۔معاد جسمانی ظواہر آیات کے متناسب نہیں ہے	145
۴۔معاد دنیوی خلقت کی غایت ہے اس کی طرف برگشت نہیں	147
۵۔روح آخرت میں اپنے آپ کے ساتھ قائم ہے	148
۶۔انکار کی وجہ کیفیت معاد کا تعین کرتی ہے	149
۷۔پہلے بدن سے تعلق میں کیا ترجیح ہے	150
۸۔فعلیت سے قوت کی طرف واپسی	151
معاد روحانی عقل وحکما کی نظر میں	158
معاد روحانی اور حکمت ورحمت الٰہی	158
حکما کی معاد روحانی ہمہ گیر نہیں	159
ا۔حکما اور ماہیت لذت	160
۲۔عقلانی لذات کی حسی لذات پر برتری	160
۳۔عقلانی لذات کا دنیا میں کامل ادراک ممکن نہیں	161

فہرست	صفحہ
اشکال	161
۴۔عقلانی لذتیں حاصل کرنے کی شرط	162
۵۔عملی ادراکات کا عقلانی سعادتوں میں عمل دخل	163
۶۔عقلانی لذات کے مراتب	163
۷۔عقلانی شقاوتیں	164
۱۳۔تناسخ ومعاد	165
ا۔مطلق یالامحدود تناسخ	167
۲۔تناسخ محدود نزولی شکل میں	167
۳۔صعودی تناسخ	168
ا۔تناسخ ومعاد	168
۲۔تناسخ مطلق اور عنایت الٰہی	169
۳۔تناسخ نزولی اور واپس پلٹنا	170
۴۔صعودی تناسخ	171
تناسخ کی جامع تحلیل	173
ا۔دوارواح کا ایک بدن سے تعلق	173
ایک سوال کا جواب	174
۲۔روح وبدن میں ہم آہنگی کا نہ ہونا	174
تین سوال اوران کے جواب	175
ا۔دوابدان کا ہونا	175
۲۔نفس (روح) کی واپسی	176
۲۔تناسخ اور رجعت میں فرق	177
۳۔سنت الٰہی اور انسان کا دنیا کی طرف لوٹنا	178
۱۴۔موت: نئی زندگی کا دریچہ	180
ا۔موت کی اصطلاح لغت وقرآن میں	180
۲۔کیا موت عدمی امر ہے؟	181
۳۔موت ایک قطعی سنت ہے جو سب کے لیے ہے	182

فہرست	صفحہ
۴۔ انسانوں کا موت سے ڈرنا (بجز اولیاے الٰہی کے)	185
۵۔ قرآن میں موت کی اقسام	187
(الف) آسان و مشکل موت	187
ا۔ مشکل موت	188
۲۔ آسان موت	188
آسان و دشوار موت روایات میں	189
(ب) جسم اور دل کی موت	190
(ج) فرد اور اجتماع کی موت	191
ظلم۔ قوموں کی موت کا ایک سبب	192
د۔ افتخار آمیز موتیں	193
۶۔ قطعی اور غیر قطعی موت	194
۷۔ موت کے وقت توبہ و ندامت	194
۸۔ موت کے وقت وصیت	196
۹۔ انسان کی اپنی موت سے ناآگاہی	197
۱۰۔ موت اور ماموران الٰہی	198
۱۵۔ قرآن میں قبر و برزخ	201
برزخی زندگی روایات کی نظر سے	203
قبر میں سوال	204
کن چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا؟	206
کن لوگوں سے سوال کیا جائے گا؟	207
۱۶۔ قیامت کی علامات اشراط الساعۃ	209
پہلا ابہام	215
دوسرا ابہام	215
تیسرا ابہام	215
چوتھا ابہام	215

فہرست	صفحہ
پانچواں ابہام	216
چھٹا ابہام	216
قیامت کی علامات روایات میں	218
علامات قیامت مشاھد الساعۃ	220
آفرینش اجل معین رکھتی ہے	220
ا۔ خورشید و قمر کی گردش	220
۲۔ ہر انسان کی محدود حیات	221
۳۔ امتوں کی اجل	221
کائنات کے حوادث اور قیامت کی برپائی	221
قیامت کے وقت آسمان کی حالت	222
قیامت کے وقت زمین کی حالت	223
قیامت برپا ہونے کے بعد زمین کی حالت	224
قیامت کے وقت آسمانی چیزوں کی حالت	224
قیامت کے وقت زمینی موجودات کی حالت	226
سمندر	226
قیامت کے وقت پہاڑوں کی حالت	228
۱۸۔ نفخ صور یا نئی زندگی کا مقدمہ	230
نفخ صور کی حقیقت اور دوسری اصطلاحات	231
(الف) صیحۃ	231
(ب) صاخہ، نقر اور زجرہ کی اصطلاحیں	332
(ج) رجفعہ و رادفہ کی اصطلاحیں	233
نفخ صور والی آیات کی تحقیق و تفسیر	234
دو سوال اور ان کے جوابات	236
توضیح	236
پہلے سوال کا جواب	236
دوسرے سوال کا جواب	237

فہرست	صفحہ
۱۹۔ قیامت اور لوگوں کا حساب	240
۱۔ حساب سے کیا مراد ہے؟	241
۲۔ کون حساب لے گا؟	241
روایات کا فیصلہ	243
۳۔ کن اعمال کے بارے میں سوال ہوگا؟	244
خدا کی دنیوی نعمتوں کا حساب روایات کی نظر میں	248
۴۔ آیا سب سے حساب لیا جائے گا	249
تکوینی اور تدوینی حساب	251
حساب تکوینی	251
حساب تدوینی	252
گذشتہ آیات کی توضیح وتشریح	253
حساب کا عمومی ہونا روایات کی نظر میں	254
ان روایات کی توضیح وتحقیق	256
۵۔ اللہ سریع الحساب ہے	256
۶۔ محاسبہ بد	259
۷۔ آسان محاسبہ	260
۸۔ حساب میں لوگوں کا متفاوت ہونا	261
۹۔ حساب کے وقت سب لوگوں پر حجت تمام ہوگی	262
۱۰۔ گناہ کا اقرار اور عفو الٰہی کی اُمید	263
روز قیامت کی طوالت اور اس کے مواقف	264
۱۔ قیامت کا طولانی ہونا	264
۲۔ قیامت کے مواقف ومراحل	266
مواقف قیامت اسلامی متکلمین کی نظر میں	266
مواقف قیامت شیخ صدوق کی نظر میں	266
مواقف قیامت شیخ مفید کی نظر میں	268
قیامت اور میزان	271

فہرست	صفحہ
۱۔ ''میزان'' دنیوی میزانوں کی طرح	272
۲۔ قیامت میں ''میزان'' سے مراد عدل الٰہی ہے	273
(الف) قرآن میں میزان کے معنی اپنے استعمال کے لحاظ سے	274
۱۔ اشیا اور مالی معاوضات کے جانچنے کا وسیلہ	274
۲۔ نظام کائنات میں ہم آہنگی ونظم	274
۳۔ قوانین الٰہی کی عادلانہ تشریع	275
(ب) ہر چیز اپنے لحاظ سے ایک خاص میزان رکھتی ہے	275
آخرت میں میزان کے کچھ نمونے	276
چند اہل نظر کا کلام	278
قیامت میں عدالت الٰہی کے گواہ	279
۱۔ خداوند عالم	279
۲۔ انبیاء الٰہی	280
گواہوں کا وسیع علم	281
۳۔ پیغمبر اکرمؐ	281
۴۔ خود امت کے کچھ افراد کی گواہی	282
۵۔ فرشتے اعمال پر ناظر	283
۶۔ زمین یا عمل کی جگہ	284
۷۔ زمان یا گردش لیل ونہار کی گواہی	286
۸۔ قرآن کی گواہی	287
۹۔ نامہ اعمال	287
داخلی گواہ	289
(الف) اعضائے بدن	289
(ب) بدن کی کھال کی گواہی	290
قیامت وصراط	292
صراط یا عمومی راستہ	292

فہرست	صفحہ
عبور از صراط میں انسانوں میں فرق	296
تفسیر و توضیح	297
ولایت صراط سے گزرنے کا پروانہ	299
اعراف اور اعراف والے	301
اعراف: روایات کی روشنی میں	304
اصحاب اعراف	305
ائمہ معصومین علیہم السلام	305
۲۔ گناہگار شیعوں کا ایک گروہ	305
۳۔ وہ لوگ جن کی نیکیاں و برائیاں برابر ہوں گی	306
روایات و آیات کے مضامین میں موازنہ	306
کیا جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں	308
برزخی جنت و جہنم	310
منکرین کی دلیلیں	313
نقلی دلیل	313
۲۔ منکرین کی عقلی دلیل	315
جنت و جہنم کہاں پر ہیں	315
ایک جدا کائنات کے لیے جگہ کی ضرورت نہیں	316
کون لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے؟	318
مسئلہ کا تاریخی جائزہ اور متکلمین کے اقوال	318
عدم خلود کے قائلین کی ادلہ	320
(الف) نقلی دلیلیں	320
روایات سے استدلال	322
(ب) منکرین کی عقلی دلیلیں	324
جہنم میں خلود کے قائلین کی دلیلیں	325
۱۔ آیات الٰہی کو جھٹلانے والے	326
۲۔ خدا اور رسولؐ سے دشمنی	327
۳۔ عاصی و سرکش لوگ	327
۴۔ ظالم و ستم گر	329
اشقیا	330
۶۔ مجرمین	332
۷۔ گناہوں میں غرق لوگ	334
۸۔ بدعمل افراد	335
۹۔ قرآن سے منہ پھیرنے والے	337
۱۰۔ قیامت کے دن جن کے میزان ہلکے ہوں گے	338
۱۱۔ سود خور (سود کی حرمت کے بعد)	339
۱۲۔ بے گناہ مومن کا قاتل	340
گناہ وقتی اور سزا ابدی	342
اعمال کا تجسم اور ملکات	344
تجسم اعمال کا مقصد کیا ہے؟	344
تجسم اعمال آیات کی روشنی میں	345
تجسم اعمال روایات کی نظر میں	350
تجسم اعمال عقل و علم کی روشنی میں	353
چند مفسرین اور متکلمین کے نظریات	353
تحقیق و تنقید	354
اعمال کا تجسم اور بشر کا علم امروز	357
انسان میں کام کی حقیقت کیا ہے؟	357
دو سوال اور ان کا جواب	358
قیامت میں لوگوں کے مختلف حالات	360
قیامت میں انسانوں کی حالت	361
۱۔ ہر کوئی اپنی فکر میں ہوگا	361
۲۔ قیامت میں کوئی ایک دوسرے کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا	361

فہرست	صفحہ
۳۔غیر مفید (نفع نہ دینے والی چیزیں)	362
۴۔معذرت کرنا بے فائدہ ہوگا	362
۵۔وہ چیزیں جو نفع دیتی ہیں	362
(الف) قلب سلیم	362
(ب) سچائی	363
۶۔بعض دوست ایک دوسرے سے دشمنی کریں گے	363
۷۔مومنین و کفار کا ایک دوسرے سے سلوک	363
قیامت میں مختلف لوگوں کی حالت	365
قیامت میں نیک بخت لوگ	366
(الف) انبیاء و مومنین	366
(ب) متقی و پرہیز گار لوگ	366
ج۔صابرین	367
د۔نماز گزار	368
ھ۔سابقون	369
ا۔اس دنیا میں سابقون کی عظمت	371
۲۔آخرت میں مقام سابقون	372
۳۔شان مقربین بزبان قرآن	374
نیک لوگوں کے نامہ اعمال کے شاہد	374
و۔اصحاب الیمین	374
(الف) دنیا کی زندگی میں	377
(ب) موت کے وقت	377
ج۔دوسری دنیا میں	378
ز۔نیک کردار لوگ (ابرار، محسنین)	378
ابرار (نیک لوگوں) کی صفات دنیا میں	380
ابرار (نیک لوگوں) کی صفات آخرت میں	382
اشقیاء و بد بخت لوگوں کی قیامت میں کیفیت	383
(الف) اصحاب الشمال	384
اصحاب شمال کے اوصاف دنیوی	384
اصحاب الشمال کی وضع آخرت	385
اصحاب شمال کی اقسام و مراتب	387
(ب) ظالم و ستم گر	388
(ج) کافر و مشرک	390
د۔حقائق دینی کا انکار کرنے والے	391
ھ۔فاجرین و مجرمین	393
مجرم کون ہیں	395
و۔قیامت میں منافقوں کی حالت	397
منافقین اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رابطہ	397
منافقین اور مومنین کے درمیان رابطہ	398
منافقین اور کافروں کے درمیان رابطہ	399
منافقوں کی آخرت میں حالت	400

فہرست

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر 10

عنوان	صفحہ نمبر
قافلہ انسانیت کے عظیم رہنما	405
ا۔ انبیاء الٰہی کی بعثت اور مخالفین کے دلائل	407
پہلی دلیل	407
دوسری دلیل	409
ا۔ دہریے	410
۲۔ نافیانِ تکلیف	410
انبیاء کی رسالت کے متعلق مشرکوں کی دلیل	411
۲۔ اَنبیاء کی بعثت متکلمین اور فلاسفہ کی نظر میں	414
متکلمین اور بعثت انبیاء	414
نبوت اور قاعدہ لطف	415
انبیاء کی بعثت اور وجوب تکلیف	417
لزُوم نبوت اور فلاسفہ	418
۳۔ انبیاء کی بعثت کا لزوم قرآنی نکتہ نظر سے	421
پہلا حصہ	421
(الف) توحید کے ثبوت اور تکمیل سے متعلق آیات	421
(ب) اختلاف مٹانے سے متعلق آیات	421
(ج) رقابتوں کے فیصلے سے متعلق آیات	422
(ا) توحید اور خدا کے ایک ہونے کا ثبوت	422
انبیاء کے بھیجنے کا دوسرا مقصد	426
اختلافات کا خاتمہ	426
انبیاء کے بھیجنے کا تیسرا مقصد	431
رقابتوں کا فیصلہ	431
(۴) انبیاء کی بعثت کا لزوم قرآنی نکتہ نظر سے	434
دوسرا حصہ	434
ا۔ انسانی معاشرے میں عدل کے قیام سے متعلق آیات	434
ب۔ جبلی خواہشات کے توازن سے متعلق آیات	435
ج۔ کتاب وحکمت کی تعلیم سے متعلق آیات	435
د۔ بندوں پر اتمام حجت سے متعلق آیات	436
تفسیر	436
چوتھا مقصد	436
عدل کا قیام	436
(۵)۔ تزکیہ یا جبلی خواہشات میں توازن	438
پانچواں مَقصَد	443
کتاب اور حکمت کی تعلیم	443
چھٹا مقصد	446
بندوں پر اتمام حجت	446
۵۔ بعثت انبیاء کا لزوم شرعی ہے یا عقلی	451
۶۔ نبوت سے متعلق قرآنی الفاظ	454
(پہلا حصہ)	454

فہرست	صفحہ
(1) نبوت	454
(2) رسالت	454
(3) بعثت	454
زیر نظر آیات کی فہرست	454
نبوت کے لفظ سے مربُوط آیات	454
ب لفظ ''رسالت'' سے متعلق آیات	455
ج۔ لفظ بعثت سے متعلق آیات	455
1۔ نبوت	456
2۔ رسالت	460
3۔ بعثت	463
3۔ نیند سے بیدار ہونا	464
4۔ کسی بڑے کام کی ذمہ داری یا انجام دہی	464
5۔ جہاد کے لیے نکلنا	465
نبوت سے متعلق قُرآنی الفاظ	466
(دوسرا حصہ)	466
لفظ وحی اور اس کی قسمیں	466
(۱) ہدایت تکوینی	466
(۲) ادراک جبلی	466
(۳) القاء روحی	466
(۴) مدد غیبی	466
(۵) وحیِ تشریعی	466
الف۔ ہدایت تکوینی سے متعلق آیات	466
ب۔ ادراک جبلی سے متعلق آیات	466
ج۔ القاء روحی سے متعلق آیات	467
د۔ مدد غیبی سے متعلق آیات	467
ھ۔ وحی تشریعی سے متعلق آیات	468
آیات کی تفسیر	468
(۱)۔ تکوینی ہدایت یا کائنات پر حکم فرما نظام	469
2۔ ادراک جبلی	471
۳۔ اَلقاء رُوحی	473
۴۔ مددِ غیبی	476
۵۔ وحی تشریعی	477
۸۔ کیا تمام انسانوں کی طرف انبیاء بھیجے گئے ہیں؟	479
زیر نظر آیات کی فہرست	479
آیات کی تفسیر	480
ا۔ عقلی نکتہ نظر	480
۲۔ قرآنی نکتہ نظر سے بعثت کی عمومیت	481
ایک سوال کا جواب	485
احادیث سے استدلال	485
(۹) انبیاء اور میثاق الٰہی	490
زیر نظر آیات کی فہرست	490
آیات کی تفسیر	491
ا۔ بعد میں آنے والے انبیا پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا	491
حاصل کلام	494
۲۔ تمام پیغمبروں سے پیمان	495
۳۔ وحی کے پہنچانے میں امانت کا وعدہ	496
۱۰۔ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے	498
زیر بحث آیات کی فہرست	498

فہرست	صفحہ
تفسیر آیات	499
۱۱۔انبیاء کی تعداد	505
زیر بحث آیات کی فہرست	505
آیات کی تفسیر	505
ا۔پیامبرانِ الٰہی کی تعداد	505
۲۔کثرت انبیاء کی حکمت	507
۳۔قرآن میں انبیاء کے اسمائے گرامی	508
۴۔صاحب شریعت انبیاء	509
(۱۲) نبوت ایک خدائی عطیہ ہے	513
ا۔نبوت اور انتخاب الٰہی	516
ب۔خدا کی طرف سے خاص رہنمائی	517
ج۔نبوت، نعمت، رحمت اور رزق خدا ہے	517
(۱۳) انبیاء کی خصوصیات۔انبیاء کی عصمت اور متکلمین کا نکتہ نظر	519
ا۔عصمت کے مراحل اور متکلمین کی آرا	519
۲۔احکام الٰہی پر عمل میں عصمت	519
ا۔شیعہ متکلمین	520
ب۔حشویہ اور اصحاب الحدیث	520
ج۔معتزلی متکلمین کی اکثریت	520
د۔اشعری متکلمین کی اکثریت	520
۳۔عام اور انفرادی و اجتماعی امور میں عصمت	521
انبیاء کی عصمت پر دلائل	521
عصمت کے ضروری ہونے پر متکلمین کے دلائل	521
متکلمین کے چند اور دلائل	522
ا۔دو متضاد باتوں کی طرف بلانا محال ہے	522
ب۔پیغمبر کو اذیت پہنچانا حرام ہے	524
(۱۴) انبیاء کی خصوصیات (حصہ دوم) عصمت انبیاء اور قرآنی نکتہ نظر	525
زیر بحث آیات کی فہرست	525
تفسیر	527
ا۔قرآن اور وحی سے متعلق انبیاء کی عصمت	527
ا۔انبیا اور غیبی محافظ	527
۲۔برحق قضاوت	528
۳۔وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے	529
قرآن اور عصمت انبیاء	529
ا۔انبیاء ایسے ہدایت یافتہ انسان ہیں جو کبھی گمراہ نہیں ہوتے	530
ب۔انبیاء نعمت یافتہ ہیں	531
ج۔خدا کے حضور تسلیم محض	532
د۔گفتار و کردار میں اُسوہ حسنہ	533
ھ۔شیطان کی گمراہی سے محفوظ	535
(۱۵) انبیاء کی خصوصیات (حصہ سوم) عصمت انبیاء اور قرآنی نکتہ نظر	537
آیات مورد بحث	537
قضاوت اور موضوعات میں انبیاء کی عصمت	538
گواہی میں عصمت	540
مخالفین عصمت کے دلائل	542
مسئلہ سہوالنبی"	546

فہرست	صفحہ
تحقیق	548
(۱۶) انبیاء کی خصوصیات (حصہ چہارم) بیکراں علم ودانش	549
زیر بحث آیات کی فہرست	549
تفسیر۔	551
(الف) الٰہی قانون سے کامل آگاہی	551
ب) فلسفہ تشریع سے آگاہی	552
ج۔ پرندوں کی زبان سے واقفیت	555
د۔ انبیاء اور غیب کا علم	556
۱۔ نوحؑ آئندہ آنے والی نسل کی خبر دے رہے ہیں	556
۲۔ یوسفؑ کے مستقبل سے حضرت یعقوب کی آگاہی	557
۳۔ حضرت عیسیٰؑ کا غیب کی باتیں سُنانا	559
۴۔ پیغمبرؐ اسلام اور غیب کی خبریں	559
ھ۔ انبیاء اور حقائق خلقت سے آگاہی	560
(۱۷) انبیاء کی خصوصیات (حصہ پنجم) ان کے رُوحانی اور جسمانی کمالات	563
زیر بحث آیات کی فہرست	563
تفسیر	564
الف۔ انبیاء کے روحانی کمالات اور عقل کا فیصلہ	564
انبیاء کے روحانی کمالات قرآنی نکتہ نظر سے	565
اخلاق انبیاء روایات کی نظر سے	568
انبیاء کے جسمانی کمالات	569
(۱۸) انبیاء کی خصوصیات (حصہ ششم) وحی۔ انبیاء کے جہان غیب سے رابطے کا واحد ذریعہ	571

فہرست	صفحہ
زیر بحث آیات کی فہرست	571
تفسیر	572
۱۔ وحی انسانی نبوغ کا نتیجہ	575
۱۔ عشق	575
۲۔ طویل دور مظلومیت	575
۳۔ اقلیت میں ہونا	575
۴۔ بچپن کا زمانہ	576
۵۔ تنہائی	576
۶۔ خاموشی اور بے کاری	576
۷۔ ابتدائی پرورش	576
اس تفسیر پر اشکالات	576
۲۔ وحی نفسی	578
نبوت یا خواب آشفتہ؟	579
۳۔ باطنی شعور کی تجلی اور ناخود آگاہ ضمیر	581
اس نظریے کا جائزہ	582
۴۔ مکتبِ مشاء کے فلاسفہ کا عقیدہ	584
اس نظریے کی تحلیل	586
(۱۹) انبیاء کے مشترکات اور مختصات (حصہ اول) اولوالعزم انبیاء کون ہیں؟	588
زیر بحث آیات کی فہرست	588
تفسیر	590
انبیاء کے ایک دوسرے سے امتیازات	592
اولوالعزم انبیاء	593
۱۔ وہ انبیاء جو عالمی دین لے کر آئے	596

فہرست	صفحہ

۲۔تمام انبیاء اولی العزم ہیں 596
۳۔وہ انبیاء کہ جن میں استقامت زیادہ تھی 597
۵۔صاحب شریعت نبی 598
۴۔مُراد اٹھارہ انبیاء ہیں 599
(۲۰)انبیاء کے مشترکات اور مختصات حصہ دوم
رسُول اور نبی کون ہے؟ 601
زیر بحث آیات کی فہرست 601
تفسیر 603
ا۔رسالت کا لازمہ تبلیغ ہے 604
ب۔''رسول'' صاحب کتاب پیغمبر ہیں 606
ج۔رُسول وہ ہے جو کہ ایک نئی شریعت لائے 607
د۔رسُول وہ ہے جو فرشتہ وحی کو دیکھے اور اس سے باتیں کرے 607
ر۔دونوں الفاظ کسی جدا خصوصیات کے لیے ہیں 609
حاصل سخن 613
ایک سوال کا جواب 614
(۲۱)اثبات نبوت کی راہیں حصہ اوّل اثبات کی راہیں 618
معجزہ یا اثبات نبوت کی عمومی راہ ماہیت معجزہ کی تحقیق 619
موردِ بحث آیات 619
معجزہ یا اثبات نبوّت کو عمومی راستہ 620
ا۔کسی مقام ومنصب کا دعویٰ کرے (مع الدعوٰی) 621
۳۔مقابلے کی دعوت دے (مع التحدی) 622
۴۔دنیا والوں کی ناتوانی (مع عدم المعارضہ) 622
۵۔عمل اور دعویٰ میں مطابقت (مع مطابقة الدُعوٰی) 623
(۲۲)اثبات کی راہیں 625
اعجاز سے متعلق چند سوالوں کے جواب 625
آیات مورد بحث 625
تفسیر 627
ا۔کیا معجزہ بغیر علت کے ہوتا ہے؟ 627
مُعجزے کی علت کیا ہے؟ 628
ا۔معجزے کے عوامل غیبی ہیں 628
۲۔معجزہ ان طبیعی عوامل کا نتیجہ ہے جو ناشناختہ ہیں 628
۳۔معجزے کا عامل انبیاء کی ذات اور ان کا مستحکم ارادہ ہے 628
اس سلسلے میں قرآنی رہنمائی 630
خارق عادت کام میں علم کا کردار 631
ا۔نمونہ اوّل 631
نمونہ دوم 632
ب۔معجزہ اور نظم آفرینش 632
ج۔معجزہ۔صاحب اعجاز کی صداقت پر گواہ؟ 633
ھ۔کیا اس دور کے لوگ معجزے سے محروم ہیں؟ 639
مباہلہ۔ایک اور اعجاز جاوداں 640
و۔معجزے اور جادو میں فرق 641
ایک سوال کا جواب 644
(۲۳)اثبات نبوت کی راہیں حصہ سوم انبیاء کی پہچان کی دو اور راہیں 647

فہرست	صفحہ
زیر بحث آیات کی فہرست	647
تفسیر	647
۱۔گذشتہ نبی کی نص	648
۲۔قرائن اور شواہد کی جمع آوری	650
(۲۴) انبیاء اور ایفائے رسالت (۱) دعوت انبیاء کی اساس	653
زیر بحث آیات	653
تفسیر	655
پہلا عامل	656
بیرونی عامل۔بشارت و نذارت	656
۱۔دنیوی نعمتوں کی بشارت	657
۲۔دنیوی عذاب	658
(۱) دنیوی عذاب سے عمومی انذار	659
خاص دنیوی عذابوں کے ذریعے ڈرانا	660
۳۔اخروی خوف و رجاء	660
دوسرا عامل	662
دلیل کی بنیاد پر دعوت	662
استدلال کے ساتھ دی جانے والی دعوت کے نمونے	663
حضرت ابراہیم اور رسالت کی دلیل	663
(۲۵) انبیاء اور ادائے رسالت (۲) تبلیغ کی راہ میں	666
زیر بحث آیات	666
تفسیر	670
۱۔مشکلات میں صبر و استقامت	670
۲۔صراحت اور قاطعیّت	671
۳۔اصولوں پر سودے بازی نہ کرنا	673
۴۔خدا پر توکل	675
۵۔تبلیغ رسالت خدا کے لیے	677
۶۔انبیاء کا خیر خواہ اور ہمدرد ہونا	679
۸۔صحیح ذرائع سے استفادہ	680
۸۔خدا کی نعمتیں یاد آوری	681
۹۔مفسدین کے انجام کی یاد دہانی	683
۱۰۔دین واحد کی دعوت	685
۱۱۔امت کا اتحاد و نفاق	685
(۲۶) انبیاء کے مؤثر ترین مخالفین	690
زیر بحث آیات کی فہرست	690
تفسیر	693
۱۔مترفین	694
۲۔مستکبرین	695
۳۔وڈیروں کی مخالفت	697
۴۔فریب خوردہ لوگ	698
۵۔دُنیا پرست علماء	699
حقائق چھپانا	704
(۲۷) مخالفت کے محرّکات	706
آیات مورد بحث	706
تفسیر	707
۱۔آباء و اجداد کے دین پر تعصب	707
۲۔علمی غرور	709
۳۔خواہشات نفس	711

فہرست	صفحہ
(۲۸) مخالفت کے ہتھکنڈے تہمتیں اور تنقیدیں	712
زیر بحث آیات	712
تفسیر	716
۱۔جنون	716
۲۔سحرا جادوگری کا الزام	718
۳۔جھوٹ بولنے کی تہمت	720
۴۔زمین میں فساد اور تباہی پھیلانے کا الزام	720
۵۔جدال کی تہمت	721
۶۔ان کی دعوت کو افسانہ قرار دینا	722
چند حقائق سے غلط فائدہ اٹھانا	723
۷۔انبیاء کی بشریت	723
۸۔انبیاء اور ان کے ساتھیوں کی غربت	724
۹۔ان کے پیروکاروں کا کم ہونا	726
۱۰نحوست اور فال بد	726
مخالفین کا ردعمل	728
۱۱۔تمسخر و استہزا	729
۱۲۔دعوت سُننے سے فرار	730
۱۳۔قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں	731
۱۴۔قتل کا ارادہ	733
۱۵۔انبیاء کا قتل	734
(۲۹) انبیاء کی زندگی میں سُنن الٰہی	735
آیات موردِ بحث	735
تفسیر۔	737
۱۔غیبی امداد	737
۲۔انبیاء کا غلبہ اور کامیابی	740
۳۔انبیاء کی جلاوطنی اور نزول عذاب	743
۴۔نزول عذاب اور انبیاء و مؤمنین کی نجات	745
(۳۰) انبیاء قیامت میں	749
زیر بحث آیات	749
تفسیر۔	750
(۱)۔اعمال پر گواہی	750
(۲)۔شفاعت	752
(۳)۔قیامت کے دن کے شفیع	753
(۴)۔سوال اور باز پرس	754
(۵)۔اُمت سے شکایت	756

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انسان اور جہان کی معاد

مقدمہ مؤلف

نوعِ انسان کے تمام افراد میں بقا کا میلان اور زندگی سے محبت مکمل طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی انسان زندگی اور زندہ رہنے سے بیزار نہیں ہے۔ یہ کلیہ ان لوگوں پر بھی صادق ہے جو خودکشی کا اقدام کرتے ہیں چونکہ وہ موجودہ زندگی کو غم واندوہ کا موجب خیال کرتے ہیں لہٰذا اس سے نجات کی خاطر وہ خودکشی کرتے ہیں۔ پس یہ بقا کا میلان خود علامت ہے اس بات پر کہ موت پر زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ اگر موت زندگی کی انتہا ہوتی تو انسان میں اس حس کا وجود لغو اور عبث شمار کیا جاتا۔ اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ موت حقیقت میں ایک محدود اور تنگ ماحول اور دائرے سے نکل کر ایک وسیع دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ وہ چیز جس کی طرف رہنمائی اس کی فطرت کرتی ہے اسی چیز کو آسمانی شریعتیں ''اخروی زندگی'' اور انسان کی ''ایک نئی زندگی کی طرف واپسی'' کے عنوان سے بیان کرتی ہیں۔ تقریباً ہر شریعت میں اس اصل کو ''معاد'' اور ''قیامت'' کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔

اگر کسی شریعت میں معاد کا ذکر نہ ہو تو اس شریعت کو دین خدا کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کسی شریعت میں معاد کا بیان نہ ہونا یا بغیر کسی اہمیت کے ذکر ہونا خود اس دین کے جھوٹے اور جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ یہی ''اخروی زندگی'' یا معاد ہے۔ بعض کے نزدیک کم وبیش چودہ سو آیات صریحاً معاد کے بارے میں ہیں اور بعض کے نزدیک قرآن کا ایک تہائی حصہ معاد سے مربوط ہے۔ ہم نے اس بارے میں اگرچہ آیات کو شمار تو نہیں کیا لیکن بطور یقین یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی آیات کی تعداد بہت کم ہے جن میں صریحاً یا اشارہ وکنایہ کے ذریعے اخروی زندگی کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

موضوعی طریقہ پر یہ تفسیر وہ پہلی تفسیر ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے جس میں متعدد موضوعات سے متعلق پہلے آٹھ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور اب نویں جلد جو معاد یعنی قیامت کے موضوع پر ہے اسے پیش کر رہے ہیں۔ اس منزل پر ہم حوزہ علمیہ کے بہترین مدرس اور مصنف جناب حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ علی ربانی گلپائگانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ان دو جلدوں کی تنظیم وتالیف میں ہماری مسلسل بہت مدد کی۔ خداوند عالم انہیں اس کے بدلے بہترین اجر عنایت فرمائے۔

جعفر سبحانی

موسسہ امام صادق

۲۵/۵/۷۹ قم

قرآن میں قیامت کے اسماوصفات

تین سوال ہمیشہ سے ہر سوچنے والے انسان کے لیے معمہ بنے رہے ہیں اور ہر انسان ان سوالات کے حل کے لیے کوشاں وسرگرداں رہا ہے اور ہے۔ معاد (قیامت) ان ہی تین سوالات میں سے ایک سوال کا جواب ہے وہ تین سوالات جو ہر شخص اپنے آپ سے کرتا ہے یہ ہیں:

۱۔ یہ جہان اور انسان کیسے پیدا ہوئے اور وجود میں آئے؟

۲۔ ان کی خلقت کا مقصد و ہدف کیا ہے؟

۳۔ اس دنیا کا آخر انجام کیا ہوگا اور موت کے بعد انسان کا انجام کیا ہوگا؟

حافظ شیرازی نے ان سوالات کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

از کجا آمدہ ام؟ آمد نم بہرِ چہ بود
بہ کجامی روم آخر نمائی وطنم؟

ترجمہ: کہاں سے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں اور آخر مجھے کہاں جانا ہے، کیا مجھے میرا وطن نہیں دکھاؤ گے؟

قرآن مجید چونکہ لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے لہٰذا اس میں بالکل واضح الفاظ میں ان سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ پہلے سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ یہ دنیا واجب الوجود کے نور کا فیض و پرتو ہے۔ انسان اور کائنات کے وجود کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ (نور: ۳۵)

خدا زمین و آسمان کا نور ہے۔

هُوَالَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ (ملك: ۲۳)

وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے آنکھ، کان اور دل بنائے۔

دوسرے سوال کے جواب میں خدا کی معرفت اور کمال کے عالی مدارج اور مراتب تک رسائی کو خلقت انسانی کے ہدف کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔

ان دو سوالوں کی نسبت قرآن نے تیسرے سوال کے بارے میں زیادہ بحث کی ہے۔ قرآن نے دنیوی زندگی کو ایک دائمی اور جاوید زندگی کا مقدمہ شمار کیا ہے اور قرآن کی نظر میں نہ صرف یہ کہ موت زندگی کا اختتام نہیں بلکہ ایک کامل تر زندگی کے لیے رہگذر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ موت زندگی کی انتہا ہے آیات قرآن کی بنیاد پر اس سے مراد یہ مادی زندگی ہے ورنہ موت ایک زیادہ کامل اور وسیع زندگی کی طرف باز ہونے والا ایک دریچہ ہے۔

انسان موت اور برزخ نامی دوراہوں سے گزر کر ایک ایسے دن کا سامنا کرے گا جس میں تمام انسانوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا اور ایک عجیب وعظیم محشر برپا ہوگا۔یہی دن ایک نئی اور کامل زندگی کا نقطہ آغاز ہوگا۔

قرآن کریم نے اس دن کا متعدد صفات کے ساتھ ذکر کیا ہے جن میں سے چند کچھ اس طرح ہیں:

(۱) یوم القیامۃ (۲) یوم الدین (۳) یوم الاخر (۴) یوم عظیم (۵) یوم کبیر (۶) یوم محیط (۷) یوم الحسر ۃ (۸) یوم عقیم (۹) یوم الیم (۱۰) یوم الوقت المعلوم (۱۱) یوم الحق (۱۲) یوم مشھود (۱۳) یوم البعث (۱۴) یوم الفصل (۱۵) یوم الحساب (۱۶) یوم التلاق (۱۷) یوم ال آزفۃ (۱۸) یوم التناد (۱۹) یوم الجمع (۲۰) یوم الفصل (۲۱) یوم الوعید (۲۲) یوم الخلو د (۲۳) یوم الخروج (۲۴) یوم عسیر (۲۵) یوم التغابن (۲۶) یوم الموعود (۲۷) یوم عبوس

یوم کے ساتھ جو صفت بھی ذکر کی گئی ہے وہ قیامت کے مختلف حالات میں سے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ان اسما کے علاوہ کہ جن میں یوم کے ساتھ قیامت کے اوصاف کو ذکر فرمایا ہے قرآن نے قیامت کے لیے مخصوص اسماء بھی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے منجملہ ان کے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔الساعۃ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ(اعراف: ۱۸۷)

تم سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کب برپا ہوگی۔

ساعت کے معنی وقت کے ہیں چونکہ قیامت کا دن لوگوں کے قبور سے اٹھنے کا وقت ہے لہٰذا اسے ساعت کا نام دیا گیا ہے۔یہ استعمال مجازی ہے چونکہ ایک لفظ کلی بول کر اس کے واضح ترین مصداق کو مراد لیا گیا ہے۔

۲۔ازفۃ

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾(نجم ۵۷: ۵۸)

قیامت کا دن نزدیک ہوگیا۔اس کو ظاہر کرنے والا خدا کے علاوہ کوئی نہیں۔

''ازف''عربی زبان میں قرب ونزدیکی کے معنی میں ہے اور جہاں وقت تنگ ہو وہاں استعمال کیا جاتا ہے۔قرآن کی نظر میں قیامت زیادہ دور نہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ(قمر:۱)

''قیامت نزدیک ہوگئی''

لہٰذا قیامت کو آزفہ کا نام دیا گیا ہے۔

۳۔الحاقة

اَلۡحَآقَّةُ ۟ۙ مَا الۡحَآقَّةُ ۟ۚ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحَآقَّةُ ؕ۟ (الحاقه ۱ تا ۳)

''قیامت کیسی قیامت؟ اور تم کیا جانو کہ قیامت کیا ہے؟''

''حاقة'' ''حاق'' کی تانیث ہے اور حاقة اس چیز کو کہتے ہیں جسے یقیناً انجام پانا ہو۔ لہٰذا آیت کریمہ میں کلمہ ''الساعة'' کو مقدر ماننا ہوگا یعنی آیت اس طرح ہے الساعة الحاقة وہ گھڑی جو یقیناً وقوع پذیر ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حاقة کشف حقیقت کے معنی میں ہو اور قیامت کو حاقة اس لیے کہا گیا ہے چونکہ اس دن تمام حقیقتیں منکشف وظاہر ہوجائیں گی چنانچہ خود قرآن نے قیامت کے بارے میں کہا ہے ''یوم تبلی السرآئرُ'' یعنی وہ دن جس میں راز آشکار ہوں گے''۔ (طارق:۹)

۴۔القارعة

اَلۡقَارِعَةُ ۟ۙ مَا الۡقَارِعَةُ ۟ۚ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ۟ (قارعه ۱ تا ۳)

''کھڑکھڑانے والی، کیسی کھڑکھڑانے والی اور تمہیں کیا معلوم وہ کیسی کھڑکھڑانے والی ہے''

قرع کے معنی شدت کے ساتھ کھڑکھڑانے کے ہیں چونکہ اس حادثہ (قیامت) کی وجہ سے دل بڑی شدت کے ساتھ دھڑک اٹھیں گے لہٰذا اسے قارعہ کہا ہے۔

۴۔الطامة الکبریٰ

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ۟ۖ (نازعات: ۳۴)

جب وہ عظیم مصیبت آئے گی۔

لغت میں طامہ اس بڑی مصیبت کو کہا جاتا ہے جس کے سامنے دوسری مصیبتیں ہیچ ہوں۔

ان اسماء کے علاوہ بھی قرآن نے قیامت کے لیے چند دوسرے نام ذکر کئے ہیں مثلاً:

۱۔الواقعة

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۟ۙ (واقعه:۱)

۲-الصاخة

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ (عبس: ۳۳)

۳-الغاشية

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿١﴾ (غاشية: ۱)

۴-الاخرة

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (مومنون: ۱۷۴)

۵-يوم الفتح

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ (سجدہ: ۲۹)

۶-يوم عسير

فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿٩﴾ (مدثر: ۹)

۷-يوم معلوم

لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٥٠﴾ (واقعہ: ۵۰)

۸-يوم الحق

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ (بنا: ۳۹)

۹-يوم لا ريب فيه

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ (آل عمران: ۹)

۱۰۔المیعاد

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝۹ (آل عمران:۹)

قرآن مجید نے قیامت کے کچھ ایسے اوصاف بھی ذکر کیے ہیں کہ صرف ان کے معانی پر غور وفکر سے اہل ایمان کے دل لرز اٹھیں اور درحقیقت قیامت کے بارے میں شناسائی کے لیے ان اوصاف کو ذکر کر دینا کافی ہے: مثلاً:

۱۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝۸۸ (شعرا:۸۸)

وہ دن جس میں مال اور اولاد فائدہ نہیں دیں گے۔

۲۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ (آل عمران:۳)

وہ دن جس میں انسان اپنے نیک و بد تمام اعمال کو اپنے سامنے حاضر دیکھے گا۔

۳۔ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ (ال عمران:۱۰۶)

وہ دن جس میں کچھ چہرے سیاہ اور کچھ سفید ہوں گے۔

اس کے علاوہ یوم کے بعد جملہ کی صورت میں قرآن نے متعدد اوصاف ذکر کئے ہیں۔ ان سب کا ذکر کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ البتہ بعض کو ہم ان کے مناسب مقامات پر ذکر کریں گے۔

قیامت کے بارے میں آیات کی تعداد

بسا اوقات کہا جاتا ہے کہ قرآن کا ایک تہائی حصہ قیامت اور اخروی زندگی سے متعلق ہے اور مرحوم علامہ طباطبائی صاحب تفسیر ''المیزان'' میں فرماتے ہیں ''ان آیات کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے''۔ البتہ کچھ دوسرے حضرات جنہوں نے بڑی توجہ سے گنا ہے ان آیات کی تعداد چودہ سو بتاتے ہیں۔ لیکن اگر ان آیات کو بھی شمار کیا جائے جن میں قیامت کے بارے میں اشارات موجود ہیں تو ان کی تعداد یقیناً چودہ سو سے زیادہ ہوگی۔

بہر کیف اتنی زیادہ آیات کا ہونا اس اصل (قیامت) کی انتہائی اہمیت پر دلالت کرتا ہے اور وہ شخص خوش بخت ہے جس نے اس زندگی کے لیے زاد وتوشہ مہیا کر لیا ہے کیونکہ وہ ایسا مقام ہے کہ ''لا بیع فیه و لا خلة'' اس میں نہ کوئی خرید فروخت ہوگی اور نہ ہی کوئی دوستی کام دے گی'' ہم نے جو مقدمہ پیش کیا یہ اس موضوع کی شناخت کی خاطر تھا کہ جس سے مربوط آیات کو ہم ایک منظم صورت میں ذکر اور تفسیر کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے خداوند تعالی سے توفیق کی دعا کرتے ہیں۔

معاد گذشتہ انبیاء کی تعلیمات میں

معاد اور اخروی زندگی خلقت کے ہدف کی تعین اور آفرنیش سے مقصود حکومت کو بیان کرتی ہے اور انسانی زندگی میں اخروی حیات کا نہ ہونا اس کی خلقت کو عبث اور بلا مقصد ظاہر کرتا ہے۔ جو لوگ معاد کے قائل نہیں اور موت کو زندگی کی انتہا سمجھتے ہیں وہ لوگ ہمیشہ انسان کی خلقت کو لغو اور بعث شمار کرتے ہوئے اس کی خلقت پر معترض رہے ہیں اور اس پر اس طرح طنز کرتے ہیں:

ترکیب پیالہ ایکہ درھم پیوست
بشکستن آن روانمی دار دمست
چندین قد سرد نازنین و سرو دست
از بہر چہ ساخت و زبرای چہ شکست [۱]

اور دوسرا کہتا ہے:

دارندہ کہ ترکیب طبائع آراست
از بہر چہ افکند درا در کم و کاست
گرنیک آمد شکستن از بہر چہ بودے
ور نیک ن آمد این صور عیب کہ راست [۲]

مولانا جلال الدین رومی مثنوی میں ایک پیغمبر کی زبان سے ایک داستان نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ موت اور وجود انسانی کے قالب کا ٹوٹنا ان دیرینہ اعتراضات میں سے ہے جو ہمیشہ کئے جاتے رہے ہیں۔ مولوی نے اس طرح کہا ہے:

گفت موسیٰ ای خداوند حساب
نقش کر دی بازو چون کر دی خراب
نرو مادہ نقش کر دی جان را وانگہی ویران کنی آن را چرا

لیکن قرآن نے موت کے بعد بھی تسلسل زندگی کو بیان کر کے ان تمام اعتراضات کو دھو ڈالا ہے جیسا کہ سورہ مومنون ۱۱۵ میں ارشاد ہے:

---

[۱] ترجمہ: ایک صحیح ساغر کو کوئی مست توڑ دینا روا نہیں جانتا پھر یہ سرو قد نازنین، یہ سر اور ہاتھ کیوں بنا بنا کے توڑ دیئے۔

[۲] ترجمہ: مختلف طبائع کو کس نے ترکیب دیا اور ان میں کس لیے کمی بیشی رکھی ہے۔ اگر اچھا لگا تو پھر کیوں توڑ دیا اور اگر یہ صورتیں اچھی نہ لگیں تو قصور کس کا ہے؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴿۱۱۵﴾ (سورہ مومنون: ۱۱۵)

”کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد کے خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟

معاد کی اہمیت کے پیش نظر ہمیشہ انبیا کی تعلیمات میں توحید کے بعد ہی مسئلہ معاد سرفہرست رہا ہے اور بغیر استثنا کے تمام انبیا اسے بیان کرتے رہے ہیں۔ ہم یہاں انبیا کی تعلیمات سے ایسے مطالب نقل کریں گے جن سے ان کی شریعت میں معاد کا بطور اصل مسلم ہونا ثابت ہوتا ہو اور اس باب میں ہم صرف صاحبان شریعت انبیا کے اقوال کو نقل کریں گے چونکہ دوسرے انبیا ان ہی کی شریعت کی تبلیغ پر مامور تھے۔ جب اصل شریعت میں مسئلہ معاد ثابت ہو گیا تو بقیہ انبیا کی تعلیمات میں اس کا وجود بالکل واضح و روشن ہو جائے گا۔ ہم بات حضرت آدمؑ سے شروع کرتے ہیں اگرچہ پہلی شریعت کا نزول حضرت نوحؑ پر ہوا۔

اصولاً کسی دین اور آئین کو دین یا آئین کہنا اس صورت میں صحیح ہوسکتا ہے کہ لوگوں سے موت کے بعد کردار و گفتار پر حساب لینا اس دین کے اصول میں سے ہو، ورنہ اسے حزب یا مسلک تو کہہ سکتے ہیں، دین نہیں کہہ سکتے۔

ا۔ آدم اور قیامت

جب حضرت آدمؑ زمین پر تشریف لائے تو خداوند عالم نے تمام لوگوں کو اس طرح خطاب فرمایا:

قال اهبطوا بعضكم لبعض عدوٌّ و لكم فى الارض مستقر و متاع الى حين“

”اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور تم ایک معین وقت تک زمین پر رہ سکتے ہو اور اس سے استفادہ کر سکتے ہو“

دوسری آیت میں فرمایا:

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴿۲۵﴾ (اعراف ۲۴۔ ۲۵)

”خدا نے کہا: تم زمین میں زندگی گزارو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے اٹھائے جاؤ گے“

یہ یا اس قسم کے خطاب کہ جو حضرت آدمؑ کے زمین پر اترنے اور ابتدائے خلقت انسانی کے بارے میں ہیں اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے فرائض میں سے یہ تھا کہ قیامت کے بارے میں اپنی اولاد کو بتائیں۔

ان ہی خطابات میں سے ایک آیت گناہگاروں کے انجام کے بارے میں ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

(اعراف ۳۵: ۳۶)

''اے ابن آدم! اگر تمہاری طرف خود تم میں سے پیغمبر آئیں اور تمہارے سامنے میری آیات پڑھیں (تو جان لو) جو بھی پرہیز گاری اختیار کرے اور اعمال صالح انجام دے ان پر نہ خوف ہے اور نہ حزن ہے اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے سرکشی کی وہ لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے''

اس قسم کے خطابات کہ جو سورہ اعراف میں آیت ۲۶ سے آیت ۳۶ تک ہیں، یہ آغازِ خلقت میں الٰہی پیغام کی حکایت کرتے ہیں اور انہی سے عصر ھبوط (یعنی حضرت آدمؑ کا جنت سے زمین پر تشریف لانے کا زمانہ) میں عقیدۂ معاد کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔

۲۔ حضرت نوحؑ اور قیامت

حضرت نوحؑ جنہیں شیخ الانبیا کہا جاتا ہے ایک مفصل شریعت کے ساتھ جس میں بت پرستی کے خلاف جہاد اور توحید پرستی کی دعوت دو اہم عنصر ہیں اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے سب سے زیادہ تبلیغ بت پرستی کے خلاف کرنے کے ساتھ ساتھ مسئلہ معاد کو بھی لوگوں سے بیان کیا۔ وہ اپنی قوم کو طلب مغفرت کی دعوت دینے اور نعمات الٰہی کی یاد دہانی کے ضمن میں معاد کو یوں بیان کرتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ (نوح: ۱۷، ۱۸)

''خداوند عالم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر اسی کی طرف لوٹا دے گا۔ اور اسی سے دوبارہ نکالے گا''

اس آیت میں واضح الفاظ میں معاد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی اشارۃً معاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ خدا کے حضور میں راز و نیاز کرتے ہوئے حضرت نوحؑ یوں عرض کرتے ہیں:

رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾ (هود: ۴۷)

''خدایا میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس امر سے کہ میں ایسی چیز کا سوال کروں جس کے بارے میں مجھے علم نہ ہو۔ اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا''

۳۔ حضرت ابراہیمؑ اور معاد

گذشتہ دو انبیاء کی نسبت حضرت ابراہیمؑ نے معاد کے اعتقاد کی طرف زیادہ دعوت دی ہے اور ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ حضرت نوحؑ اور حضرت آدمؑ نے مسئلہ معاد کو صرف تعبدی امر کے طور پر ذکر فرمایا تھا جبکہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر اس مسئلہ نے ایک استدلالی رنگ اختیار کر لیا ہے جیسا کہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کا قول اس طرح نقل فرمایا ہے:

۱۔ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (بقرہ: ۱۲۶)

''ان میں سے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے''

۲۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝۴۱

(ابراهیم: ۴۱)

''خدایا! جس دن حساب لیا جائے اس دن مجھے، میرے ماں باپ اور مومنین کو بخش دے''

۳۔ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝۸۷ (شعرا: ۸۷)

''خدایا! جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا مجھے رسوا نہ کرنا''

۴۔ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۷ (عنکبوت: ۱۷)

''خدا کا شکر ادا کرو تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

ان آیات کے علاوہ ایک آیت میں تو حضرت ابراہیمؑ خدا سے مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت کے بارے میں سوال فرماتے ہیں:

۵۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ (بقرہ: ۲۶۰)

''اس وقت کو یاد کرو جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا خدایا! مجھے دکھا دے تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا۔ خدا نے کہا: کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟ ابراہیمؑ نے کہا: کیوں نہیں، صرف دل کے اطمینان کے لیے عرض کیا ہے تو اللہ نے کہا: چار پرندوں کو پکڑ لو اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے اجزا پہاڑوں پر بکھیر دو پھر انہیں اپنی طرف بلاؤ۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے''۔

۴۔ حضرت موسیٰ ؑ اور قیامت کا اعتقاد

قیامت کے اعتقاد کے بارے میں دعوت اگرچہ موجودہ تورات میں بہت کم ہے اور شاید دنیوی زندگی کی طرف یہودیوں کا دل وجان سے میلان تورات سے قیامت سے مربوط آیات کو نکال دینے کا موجب ہوا ہے لیکن قرآن کریم نے موسیٰ کی طرف خطاب الٰہی اور خود حضرت موسیٰ ؑ کی اپنی قوم سے گفتگو کو نقل کیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت موسیٰ ؑ میں بھی معاد کا موضوع اہم مسائل میں سے تھا، یہاں تک کہ بعض جگہوں پر معاد کا حسی مسائل کی طرح ذکر ہوا ہے۔ ہم چند آیتیں بطور اجمال ذکر کرتے ہیں:

۱۔ خداوند عالم حضرت موسیٰ ؑ کو خطاب کرتے ہوئے بنی اسرائیل پر ان لفظوں میں تنقید کرتا ہے۔

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ ؕ هَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾ (اعراف: ۱۴۶: ۱۴۷)

''ہم جلد ہی ان لوگوں کو جو ناحق زمین پر تکبر کرتے ہیں اپنی آیات پر توجہ کرنے سے منصرف کر دیں گے کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غفلت برتی۔ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں اور آخرت کی ملاقات کے منکر ہوں ان کے اعمال نابود ہو جائیں گے اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں انہیں اس کی سزا دی جائے گی''

۲۔ حضرت موسیٰ ؑ آل فرعون سے نفرین فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

وَاشۡدُدۡ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡا حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۸۸﴾

(یونس: ۸۸)

''خدایا! ان کے دلوں پر مہر لگا دے تا کہ ایمان نہ لا سکیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کا مزا چکھ لیں''

۳۔ جنہوں نے حضرت موسیٰ ؑ کے معجزات کو جھٹلایا اور سحر وجادو کہا ان کے جواب میں فرماتے ہیں:

وَقَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی مِنۡ عِنۡدِهٖ وَمَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۳۷﴾ (قصص: ۳۷)

''موسیٰ ؑ نے کہا: میرا خدا زیادہ جانتا ہے اسے جو اس کی طرف سے ہدایت لایا ہے اور اسے زیادہ جانتا ہے جس کے لیے آخرت میں بہترین انجام ہے۔ بہ تحقیق ظالمین فلاح وکامیابی نہیں پا سکتے''

۴۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ کو قتل کرنا چاہا تو حضرت موسیٰ ؑ نے فرمایا:

وَقَالَ مُوۡسٰٓى اِنِّىۡ عُذۡتُ بِرَبِّىۡ وَرَبِّكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤۡمِنُ بِيَوۡمِ الۡحِسَابِ۝۲۷ (مومن:۴۰)

''موسیٰ ؑ نے کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کے حضور ہر اس متکبر کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا''

عقیدۂ معاد مصریوں اور فراعنہ مصر کے درمیان ایک مسلم عقیدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن آل فرعون جو باطن میں نبوتِ موسیٰ ؑ پر ایمان رکھتا تھا لیکن اظہار نہیں کرتا تھا، نے اپنی قوم کے لیے عقیدہ معاد کو مختلف عبارتوں کے ذریعے بیان کیا ہے:

۵۔ وَيٰقَوۡمِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ يَوۡمَ التَّنَادِ۝۳۲ (مومن: ۳۲)

''اے میری قوم والو! میں تمہارے اوپر اس دن سے ڈرتا ہوں جس دن ظالمین کی آوازیں بلند ہوں گی''

۶۔ مَتَاعٌ وَّاِنَّ الۡاٰخِرَةَ هِىَ دَارُ الۡقَرَارِ۝۳۹ (مومن: ۳۹)

''بہ تحقیق آخرت ہمیشہ رہنے کا گھر ہے''

۷۔ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ (مومن: ۴۳)

''بہ تحقیق ہمیں خدا کی طرف لوٹنا ہے''

یہ سب آیات حکایت کرتی ہیں کہ عقیدہ معاد مصریوں کے دین میں موجود تھا اور یہ مردِ الٰہی اپنی قوم کے انداز کے لیے اس مسلم اصول سے استفادہ کرتا تھا۔

۸۔ بنی اسرائیل کہ جو ایک ضدی اور جھگڑالو قوم تھی، ہر چیز کو مادی صورت میں دیکھنا چاہتی تھی، یہاں تک کہ کہتی تھی جب تک خدا کو بھی نہ دیکھ لیں گے ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی وجہ سے ان کا اصرار اس بات پر بھی تھا کہ مردوں کو کیسے زندہ کیا جائے گا۔ یہ ہمیں دکھایا جائے اس موقع پر بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ پیش آیا کہ جس کی تفصیل ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ اس ذیل میں یہ آیت ہے:

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۝۷۳ (بقرہ: ۷۳)

''ہم نے ان سے کہا: اس مقتول کے کسی عضو کو گائے پر مارو (اس طرح سے وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتائے گی) خدا مردوں کو اس طرح زندہ کرتا ہے اور اپنی قدرت کا مظاہرہ کرتا ہے تا کہ تم سمجھ سکو''

۵۔ حضرت مسیحؑ اور قیامت

حضرت عیسیٰؑ کی زبانی روز قیامت پر اعتقاد اس دن سے ظاہر ہو گیا جس دن حضرتؑ نے پیدائش کے ساتھ ہی گہوارہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ (مریم: ۳۳)

''مجھ پر سلام ہو اس دن جس دن میں پیدا ہوا اور اس دن جس دن میں مروں گا اور اس دن جس دن مجھے زندہ کیا جائے گا''

حضرت عیسیٰؑ سے خطاب میں معاد کو ایک مسلم اصول کی صورت میں بیان کیا گیا ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ (آل عمران ۵۵ تا ۵۷)

''جب خدا نے عیسیٰؑ سے کہا: میں تمہیں چن لوں گا اور اپنے پاس لے جاؤں گا اور تمہیں ان سے پاک کر دوں گا جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے اور جو تجھ پر ایمان لائے انہیں قیامت تک کفار پر برتری دے دوں گا پھر تمہیں میری طرف لوٹ کے آنا ہے اور میں ہی تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا اس میں کہ جس میں تم اختلاف کرتے ہو اور وہ جو کافر ہوئے ان پر دنیا و آخرت میں شدید ترین عذاب کروں گا اور اُن کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے انہیں ان اعمال پر پورا پورا اجر وثواب دیا جائے گا اور خدا ظالمین کو دوست نہیں رکھتا''۔

(۳)

معاد کے قطعی و مسلم ہونے پر دلیلیں

قرآن نے روشن اور واضح دلیلوں کے ذریعہ سے معاد اور موت کے بعد اٹھائے جانے کو ثابت کیا ہے اور اسے ایک حتمی و یقینی امر شمار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل طریقوں سے اس پر استدلال کیا ہے۔

۱۔ معاد خلقت کے ہدف و مقصد کا تعین کرتی ہے۔

۲۔ معاد عدل الٰہی کا قطعی نتیجہ ہے۔

۳۔ معاد رحمت خدا کا مظہر ہے

۴۔ معاد انسانی تکامل کی آخری منزل ہے۔

۵۔ معاد خدا کے وعدوں کی جلوہ گاہ ہے۔

۶۔ خدا تعالٰی کے رب ہونے کا لازمہ انسانوں کا معاد ہے

ان چھ طریقوں کو اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

۳۔ معاد ہدف خلقت کا تعین کرتی ہے

وہ تین اہم سوالات جو ہر عاقل انسان کو پیش آتے ہیں ان میں سے ایک سوال انسان کے مقصد خلقت کے بارے میں ہے۔ انسان ہمیشہ اس فکر میں رہا ہے کہ اس جہان کو خصوصاً جانداروں کو کیوں خلق کیا گیا ہے، ان کی خلقت کا کیا مقصد ہے؟ یہاں انسان دو دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔

ایک گروہ مادی اور ملحد حضرات کا ہے جو تعداد میں بہت کم ہیں وہ خلقت کی علت کو دو قسم میں منحصر سمجھتے ہیں یعنی علت مادی اور علت صوری۔ علت مادی کے لحاظ سے وہ قائل ہیں کہ یہ جہان ایک قسم کے ذرات (ایٹمز) سے تشکیل پایا ہے اور ان اجزا کے ایک دوسرے پر اثر ڈالنے اور اثر قبول کرنے کے نتیجہ میں اس جہاد نے یہ صورت اختیار کی ہے۔ ان دو علتوں کے علاوہ انہوں نے کائنات کو کسی اور علت سے بے نیاز سمجھا ہے۔

ان کے مقابل دوسرا گروہ الٰہی حضرات کا ہے جو اس جہان کے لیے مذکورہ بالا دو علتوں کے علاوہ دو اور علتوں کا بھی معتقد ہے اور وہ علت فاعلی اور علت غائی ہیں۔

علت فاعلی سے مراد وہ قدرت ہے جس نے مادہ اور صورت کو پیدا کیا ہے اور علت غائی سے مراد وہ مقصد و ہدف ہے جس کی خاطر اس جہان کو خلق کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر فلسفی اور کلامی کتب میں بہت عمیق بحثیں کی گئی ہیں۔

ان مطالب کی روشنی میں اس جہان کی علت فاعلی خداوند متعال کی عظیم ذات ہے اور چونکہ وہ حکیم ہے اور حکیم کا کوئی فعل حکمت و غرض سے خالی نہیں ہوتا، نیز فضول اور عبث کام کرنا حکیم کے لیے قبیح ہے لہٰذا اس عالم کا خلق کرنا بھی کسی ہدف و حکمت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ غرض کیا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف اور صرف عقیدہ معاد کے ذریعے ملنا ممکن ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ یہ جہان اپنے تمام موجودات کے ساتھ ایک اور جہان میں جو اس سے زیادہ کامل اور زیادہ وسیع ہے، تبدیل ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اور جہان کی خلقت ایک دوسری کامل خلقت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے اور اگر اس دوسری خلقت کا عقیدہ نہ رکھیں تو پھر اس وسیع و عریض آسمان کا وجود، رنگا رنگ مخلوقات سے پُر زمین اور کامل ترین مخلوق انسان کی خلقت کہ جنہیں بطور مسلم ایک دن فنا ہو جانا ہے لغو اور عبث و فضول ہوگی اور کسی حکیم سے ایسے فعل کا سرزد ہونا محال اور ناممکن ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کی کچھ آیات میں مسئلہ معاد کو اسی نظریہ کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ نظریہ معاد کے بغیر خلقت کا یہ سلسلہ بالکل فضول اور بے قیمت ہے۔ یہ آیات دو قسم پر مشتمل ہیں:

(الف) وہ آیات جو "معاد" نہ ہونے کی صورت میں فعل خدا کو مہمل اور فضول شمار کرتی ہیں۔

(ب) وہ آیات جو خالق کائنات کو حق مطلق کے عنوان سے بیان کرتی ہیں۔

پہلی قسم کی آیات:

یعنی وہ آیات کہ جن کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اور جہان کو مہمل و فضول خلق نہیں کیا گیا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (مومنون: ۱۱۵)

"کیا تم نے یہ گمان کیا کہ ہم نے تمہیں عبث اور فضول خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟"

پھر اس آیت سے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ہر عیب سے منزہ بیان کیا گیا ہے:

۱۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

(مومنون: ۱۱۶)

"بلند و برتر ہے وہ خدا جو برحق مالک ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہی اس عظیم عرش کا رب ہے"

۲۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ (ص: ۲۷)

''اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فضول وعبث خلق نہیں کیا یہ صرف کفار کا گمان ہے اور کافروں پر افسوس ہے''

ان آیات میں پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں موجود کفار کے عقیدہ کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کی علت غائی کے منکر تھے اگر چہ علت فاعلی کا شرک کی آمیزش کے ساتھ اقرار کرتے تھے لیکن ان میں سے بعض علت فاعلی کا بھی انکار کرتے تھے اور وہ موت وحیات کو گردش زمانہ کے ساتھ مربوط سمجھتے تھے جیسا کہ سورہ جاثیہ ۲۴ میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ۔

۳۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾

(دخان ۳۸:۴۰)

''ہم نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے لہو وعبث کے طور پر خلق نہیں کیا ہم نے انہیں صرف حکمت کے ساتھ خلق کیا ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور بہ تحقیق یوم الفصل (قیامت[1] کا ایک نام) ان سے وعدے کی جگہ ہے''۔

ان تین آیات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی آیت ہدف وغرض نہ ہونے کی نفی کرتی ہے۔ تیسری آیت میں مسئلہ معاد کو ذکر کرتے ہوئے اس طریقہ سے رازِ خلقت کو حکمت کی بنیادوں پر ثابت کیا گیا ہے۔ اور ان آیات کے ساتھ ملا کر جب ان سے پہلے والی آیات کو جو منکرین معاد کا نظریہ بیان کرتی ہیں ملاحظہ کیا جاتا ہے تو معاد کا حکمت الٰہی کی بنیادوں پر استوار ہونا اور بطور غرض خلقت بیان ہونا مکمل طور پر واضح وروشن ہو جاتا ہے۔

۴۔ سورہ نباء میں قرآن ''عظیم خبر'' کے بارے میں مشرکین کے اختلاف کو یوں بیان کرتا ہے:

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿۲﴾ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ﴿۳﴾ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾ (نبا ۱:۵)

''وہ لوگ کس اہم خبر کے بارے میں پوچھتے ہیں قیامت (نباء عظیم) کے بارے میں؟ جس کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اس طرح نہیں ہے منکرین بہت جلد جان لیں گے اور پھر جلد ہی اپنی غلطی انہیں معلوم ہو جائے گی''

---

[1] قیامت کے ناموں میں ایک ''یوم الفصل'' ہے کیونکہ قیامت کے دن حق وباطل ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

اس آیت میں مسئلہ معاد کو ایک حتمی و قطعی واقعہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والی آیات میں عالم کے نظام خلقت کے تعجب آور اور انوکھے ہونے کو بیان کیا گیا ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۙ﴿۷﴾ وَّخَلَقۡنٰكُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ﴿۸﴾
وَّجَعَلۡنَا نَوۡمَكُمۡ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾ وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ
مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَّبَنَيۡنَا فَوۡقَكُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ﴿۱۳﴾
وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ﴿۱۴﴾ لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ
اَلۡفَافًا ﴿۱۶﴾ (نبا ۶ تا ۱۶)

"(قیامت کے بارے میں کیوں اختلاف کرتے ہو) کیا ہم نے زمین کو آسائش کی جگہ نہیں بنایا اور پہاڑوں کو اس کی حفاظت کی خاطر میخوں کے طور پر نہیں بنایا ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا خلق کیا اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام کا ذریعہ بنایا اور رات کو تمہارا لباس بنایا اور دن کو روزی حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا اور تمہارے سروں پر سات مضبوط آسمان خلق کیے اور ہم نے تیز دہکنے والا چراغ بنایا اور ہم نے بادلوں سے تیز بارش نازل کی تاکہ اس کے ذریعے سے اناج، گھاس، سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

اور اس کے بعد والی آیات میں ارشاد ہے:

اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ۙ﴿۱۷﴾ يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۱۸﴾

(نبا ۱۷: ۱۸)

"یوم فصل (فیصلے کا دن یعنی قیامت) مخلوق کی وعدہ گاہ ہے یہ وہ دن ہے جس میں صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج آؤ گے"

یہاں پر توجہ طلب بات ان آیات کی منطقی ترتیب و نظم ہے۔ پہلے حصہ میں قیامت اور لوگوں کے اختلاف کے بارے میں گفتگو ہے۔ دوسرے حصہ میں اس جہان کی خلقت اور عجائبات کا تذکرہ ہے اور تیسرے حصہ میں پھر قیامت اور انسانوں کے زندہ ہونے کو ذکر کیا ہے۔ ان تین حصوں کا آپس میں ارتباط در حقیقت قیامت کے ضروری ہونے پر دلیل ہے اور وہ ارتباط اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کا یہ اچھوتا مستحکم اصولوں پر مشتمل نظام چونکہ ایک حکیم فاعل کا فعل ہے لہٰذا لغو اور بے ہودہ نہیں ہوسکتا اور جب لغو نہیں ہوسکتا تو طبعی طور پر انسان و جہان کی خلقت بغیر معاد کے نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر یہ عظیم نظام کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جائے اور فنا ہو جائے تو یہ عظیم نظام شمسی یہ وسیع کائنات یہ متعدد عجائب کی حامل زمین تمام چیزیں لغو اور بیہودہ ہوں گی۔

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ حق مطلق (خداوند متعال کی عظیم ذات جو اس نظام و جہان کی خالق ہے) ایک ایسی چیز خلق کرے جس کا نتیجہ صرف اور صرف فنا مطلق ہے؟

(ب) حق مطلق ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس کا ہر فعل غرض وہدف کا حامل ہو۔

اب اُن آیات کو ذکر کرتے ہیں کہ جو زیر بحث موضوع ''معاد'' جو کہ خلقت کے ہدف کا تعین کرتی ہے، کو ایک دوسرے طریقہ سے بیان کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند حق مطلق ہے، اس کی ذات، صفات اور افعال میں کسی قسم کا بطلان ولغویت ممکن ہی نہیں ہے اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس عالم کی خلقت چونکہ اُس کے افعال میں سے ہے لہٰذا یہ بھی لغو و باطل نہیں ہوسکتی ہے ہدف رکھتی ہے اور وہ ہدف معاد کی صورت میں ہی پورا ہوسکتا ہے۔ یہ آیتیں کچھ اس طرح ہیں:

۵۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾ (حج:۶)

''اور یہ کہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، یہ اس لیے ہے کہ وہ حق ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''

خدا نے اپنے آپ کو اس آیت میں حق مطلق کے عنوان سے پہچنوایا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہی قیامت برپا کرے گا اور انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے حق ہونے اور قیامت کے برپا کرنے میں کیا ربط ہے؟

لفظ حق کے معنی پر توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب بالکل واضح ہوجائے گا کیونکہ حق باطل کے مقابلے میں ہے اور طبعی طور پر ذات حق کے یہاں کسی قسم کا بطلان نہیں پایا جاتا۔ وہ ایک ابدی اور تمام کمالات کی جامع اور ہر نقص وعیب سے مبرا ذات ہوگی۔ جو ذات ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہو تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ اس کا ہر ہر فعل نقائص وعیوب سے مبرا ہو۔ اگر اس طرح نہ ہو تو گویا ذات حق نہ ہوگی بلکہ باطل کا اس کے یہاں امکان پایا جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق کا فعل اس کی صفات کی جلوہ گاہ ہے جیسا کہ حق کی ذاتی صفات اس کی ذات کی جلوہ گاہ ہیں۔ اگر خداوند تعالیٰ کی ذات حق ہے اور اس میں کسی قسم کا بطلا نہیں پایا جاتا تو اُسے حکیم ہونا چاہیے اور حکیم وہ ہے جس کے فعل میں بیہودگی و لغویت نہ پائی جائے۔ ہمارے اس بیان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو حق کہنا اس کے فعل کے حق اور حکمت پر مبنی ہونے کی دلیل ہے یعنی اس کا فعل (یعنی کائنات کی خلقت) ہدف رکھتا ہے اور پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس کائنات کا عبث ولغو نہ ہونا معاد کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت میں یوں خطاب ہوا ہے:

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ (حج:۷)

''بتحقیق قیامت آنے والی ہے، اُس میں کوئی شک نہیں اور بتحقیق جو بھی قبروں میں ہے خدا اسے دوبارہ اٹھائے گا''

صرف یہ ایک آیت نہیں جس نے خداوند تعالیٰ کے حق ہونے کو معاد کے حتمی ہونے پر بطور دلیل پیش کیا ہے بلکہ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

٦۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَالْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾ (حج: ٦٢)

''حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا حق ہے اور اس کے علاوہ جن کو وہ پکارتے ہیں وہ باطل ہیں خدا بہت بلند و عظیم ہے''

اس کے بعد والی دو آیتوں میں انسان کی دوسری زندگی کو پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَالَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۫ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾ (حج: ٦٦)

''وہ وہ ہے جس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا بتحقیق انسان اس کی قدرت کی نعمتوں کا منکر ہے''

۷۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ (لقمان: ۲۸)

''تم سب کی خلقت اور پھر دوبارہ اٹھایا جانا نہیں ہے مگر ایک نفس کی خلقت و بعث کی مانند''

اس کے بعد ہی آیت ۳۰ میں خداوند تعالیٰ کو صفت حق کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے یعنی ذالک بان اللہ هُوَ الْحَقُّ اور پھر آیت ۳۳ میں معاد کا بیان ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ (لقمان: ۳۳)

''اے لوگو! خدا کی مخالفت سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ باپ بیٹے کی ضرورت کو پورا کر سکے گا اور نہ ہی بیٹا باپ کی۔ خدا کا وعدہ حق ہے دنیوی زندگی تمہیں فریب زدہ نہ کردے''

اگر پورے قرآن میں صرف یہی منطقی ترتیب ہوتی جو ان آیات میں ہے کہ خدا کے حق ہونے سے معاد کے وجود کا بطور نتیجہ استفادہ کیا گیا ہے تو یہ اس بات پر بہترین گواہ تھی کہ یہ کتاب (قرآن) انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتی اور وہ بھی جزیرۃ العرب جیسے علم و دانش سے دور ماحول میں۔ ان دو قسم کی آیات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہدفِ خلقت کا صحیح ترین بیان صرف معاد کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

باایمان مفکر اور ہدفِ خلقت

معاد ہی ہدف خلق کا تعین کرتی ہے اور قرآن اسے معاد کے یقینی ہونے کی دلیلوں میں سے ایک دلیل کے طور پر ذکر کرتا ہے اور صاحبِ عقل وفکر مومن اپنی پاکیزگی کے تحت اس حقیقت کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے ہیں اور ہمیشہ کائنات کے باہدف ہونے کا اپنی دعاؤں میں ذکر کرتے ہیں اور اشارۃ دوسری نئی زندگی کو بھی ذکر کرتے ہیں قرآن ان کی توصیف یوں کرتا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ (آل عمران ۱۹۰: ۱۹۱)

”تحقیق زمین وآسمان کی خلقت اور دن رات کی گردش میں صاحبانِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں وہ لوگ جو تمام حالات میں (کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے) خدا کا ذکر کرتے ہیں اور زمین وآسمان کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) پروردگار! تو نے انہیں بے ہودہ اور لغو خلق نہیں کیا پاکیزہ ہے تیری ذات ہمیں آتش جہنم سے بچانا“

پیغمبر اکرمؐ نے بھی ایک حدیث میں دنیا کا ہدف آخرت کو قرار دیا ہے حضرتؐ فرماتے ہیں ”الدنیا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ“ دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی جو کچھ اس دنیا میں بوئیں گے اس کا نتیجہ آخرت میں وصول کریں گے۔ اور واضح سی بات ہے کسان کے لیے کھیتی اہمیت کی حامل نہیں ہے بلکہ اس کا نتیجہ ومحصول اس کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اور ہدفِ خلقت

حضرت امیر المومنینؑ کے کلام مبارک میں بھی ایسے جملے ہیں جن میں آخرت کو بطور ہدف خلقت ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ حضرتؑ فرماتے ہیں:

وَ اِنَّ الْخَلْقَ لَا مَقْصَرَ لَهُمْ عَنِ الْقِيَامَةِ مُرْقِلِيْنَ فِيْ مِضْمَارِهَا اِلَى الْغَايَةِ الْقُصْوٰى (نهج البلاغه خطبه ۱۵۶)

”لوگوں کے لیے قیامت کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہیں اور وہ قیامت کے میدانوں میں تیزی کے ساتھ اپنے آخری

اور نہائی ہدف و منزل کی طرف سفر کر رہے ہیں“

اسی خطبہ میں دوسری جگہ حضرتؑ یوں فرماتے ہیں:

قَدْ شَخَصُوْا مِنْ مُّسْتَقَرِّ الْاَجْدَاثِ وَصَارُوْا اِلٰی مَصَآئِرِ الْغَایَاتِ

”وہ اپنی قبروں کے ٹھکانوں سے اٹھے اور اپنی آخری منزل کی طرف چل پڑے“

اور حضرتؑ خطبہ نمبر ۱۹۰ میں فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْغَایَةَ الْقِیَامَةُ وَ کَفٰی بِذٰلِكَ وَاعِظًا لِّمَنْ عَقَلَ وَمُعْتَبَرًا لِمَنْ جَهِلَ وَقَبْلَ بُلُوْغِ الْغَایَةِ مَا تَعْلَمُوْنَ مِنْ ضِیْقِ الْاَرْمَاسِ وَشِدَّةِ الْاِبْلَاسِ وَهَوْلِ الْمُطَّلَعِ

”زندگی کا مقصد قیامت ہے اور صاحبان عقل کے لیے یہی واعظ ہونے کے لحاظ سے کافی ہے اور جاہلوں کے لیے عبرت کے لحاظ سے کافی ہے اور اس مقصد تک پہنچنے سے پہلے جو کچھ جانتے ہو وہ قبروں کی تنگی ہے اور غموں کی شدت ہے اور قیامت کی وحشت ہے“

حضرت امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

وَاعْلَمْ (یَا بُنَیَّ) اَنَّكَ اِنَّمَا خُلِقْتَ لِلْاٰخِرَةِ لَا لِلدُّنْیَا و لِلْفَنَآءِ لَا لِلْبَقَآءِ وَ لِلْمَوْتِ لَا لِلْحَیَاةِ وَاَنَّكَ فِیْ مَنْزِلِ قُلْعَةٍ وَّ دَارِ بُلْغَةٍ وَّطَرِیْقٍ اِلَی الْاٰخِرَةِ

”جان لو اے بیٹے! تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو نہ کہ دنیا کے لیے فنا کے لیے نہ کہ اس دنیا میں باقی رہنے کے لیے موت کے لیے نہ کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے تم ایک ایسی جگہ پر ہو جہاں سے کسی لحظہ میں بھی ممکن ہے کوچ کر جاؤ اور ایسی منزل میں ہو جہاں سے چاہیے کہ آخرت کے گھر کے لیے زاد و توشہ حاصل کرو“

۲۔ معاد عدلِ الٰہی کا تقاضا ہے

عدل و انصاف کرنا مسئلہ حسن و قبح عقلی کی ایک شاخ ہے۔ حسن و قبح عقلی؟ عقل عملی میں بعض لوگ قائل ہیں کہ جس چیز کو عقل اچھا کہے اس پر عمل کرنا اور جس چیز کو عقل برا کہے اس کو ترک کرنا یہ ایک اصل کلی ہے اور انسان کے ساتھ خصوصیت بھی نہیں رکھتی (یعنی خدا کو بھی شامل ہے) یعنی عقل ہر اچھے کام کو ہر حال میں ہر مختار و مرید فاعل سے حسن شمار کرتی ہے اور ہر برے اور قبیح کام کو اس سے ناز یبا شمار کرتی ہے اور اس حکم میں واجب الوجود (خدا) اور ممکن الوجود (انسان) میں فرق نہیں کرتی۔ ان کے مقابلے میں ایک گروہ قائل ہے کہ عقل کسی چیز کی نیبائی و زشتی حسن

وقبح کو نہیں پا سکتی بلکہ صرف انبیا و وحی کے ذریعے کسی کام کے حسن وقبح کو جانا جا سکتا ہے (اگر چہ شیعہ اور معتزلہ کے نزدیک پہلا قول صحیح ہے)۔ چاہے ہم پہلے قول کو درست کہیں یا دوسرے قول کو منطقی وصحیح ہر دو گروہ اس بات کا یقین اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ خداوند کریم اپنے بندوں کے ساتھ عدل وانصاف کرتا ہے ظلم نہیں کرتا۔ اب اس لحاظ سے کہ عدل پہ چلنا زیبائی اور حسن رکھتا ہے اور خلاف عدل کام کرنا قبیح ہے اور چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کامل ہے پس اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ عدل کے مطابق کام کرے اور ہر قسم کے نقص و ظلم سے پہلوتہی کرے۔ یا اس لحاظ سے کہ خود شریعت وقرآن نے خداوند تعالیٰ کو عادل کہا ہے اور ظلم وستم سے منزا و مبرا کہا ہے جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸ میں ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ (آل عمران: ۱۸)

”خداوند تعالیٰ فرشتے اور صاحبانِ علم گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ عدالت پر قائم ہے اور کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو عزیز وحکیم ہے“۔

نیز سورہ یونس آیت نمبر ۴۴ میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا (یونس: ۴۴)

”خداوند تعالیٰ کسی قسم کا کوئی ظلم لوگوں پر نہیں کرتا“

اس بارے میں اور بھی بہت ساری آیات ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر تمام لوگ مطیع خدا اور نیک ہوتے تو خداوند تعالیٰ کا عدل کبھی ان کو اجر وثواب دینے کا تقاضا نہ کرتا۔ چونکہ جو عمل بھی کسی نے انجام دیا، جسمانی مشقت ہو یا ذہنی وفکری کام ہو، تمام کا تمام خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور نعمتوں کے ذریعہ سے انجام دیا ہے، لہٰذا لوگ کسی عمل پر خدا سے کسی اجر کے مستحق نہیں ہیں اور اگر ان نعمات کو بھی دیکھا جائے جن سے لوگ استفادہ کر رہے ہیں تو آخرت میں عمل پہ کسی قسم کی پاداش کا استحقاق نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ اجر وثواب کا وعدہ دیتا ہے تو یہ فضل واحسان کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔[1] اس کے مقابل اگر تمام لوگ بدکار اور گنہگار ہوتے تو خدا پر بالکل ضروری نہ ہوتا کہ انہیں عذاب کرے۔ اور اعمال کی سزا دے کیونکہ سزا دینا اس کا حق ہے اور اس پر واجب نہیں کہ اپنا حق وصول کرے۔

البتہ اگر پہلے گروہ کو اجر وثواب کا وعدہ اور دوسرے گروہ کو سزا وعقاب کی وعید کرے تو یہاں ایک اور مسئلہ پیش آئے گا کہ آیا حکیم

---

[1] ونكنه سبحانه جعل حقه على العباد ان يطيعوه و جعل جزآءهم عليه مضاعفة الثواب تفضلاً منه و توسعًا بما هو من المزيد اهله (نهج ابلاغه صبحى صالح خطبه ۲۱۶) اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنا حق قرار دیا ہے کہ اس کی پیروی کریں اور اپنے فضل وجود ورحمت واسعہ کے پیش نظر جو اس کے مقام ربوبیت کے لیے سزاوار ہے، اس کی دوگنی جزا قرار دی ہے۔

خالق پر اس وعدہ دوعید پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس پر عمل نہ کرنا قبیح ومذموم ہے؟ لیکن یہاں ہماری توجہ اس مسئلہ پر ہے کہ اگر وعدہ وعید بھی نہ ہوتا تو آیا جزاوسزا خداوند تعالی پر ضروری ہے یا نہیں؟

پس مسئلہ وعدہ دوعید سے قطع نظر اجر وعذاب دینے میں عدل الٰہی کا کیا تقاضا ہے؟ انسان دو قسم پر ہیں:

(ا) صالح لوگ (۲) بدکار لوگ

ان دو قسم کے لوگوں کے بارے میں عدل الٰہی کا کیا تقاضا ہے؟

یہاں پر عقل حسن وقبح کے بارے میں اپنے حکم سے استفادہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان دو قسم کے لوگوں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنا عدالت کے منافی ہے یعنی دونوں کو سزا دینا یا دونوں کو جزاوثواب دینا یا کسی کو کچھ بھی نہ دے یہ کام عدالت کے منافی ہے۔ البتہ دونوں کو سزا دینا یا دونوں کو جزا دینا عدل الٰہی کے مناسب نہیں اگرچہ معاد کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔ لیکن تیسری صورت کہ بالکل کسی کو کوئی بدلہ نہ دے، یہ عدالت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ معاد کے بھی منافی ہے۔ اور ہمارا مرکز سخن یہی تیسری صورت ہے کہ قرآن کی توجہ بھی اسی پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان دو گروہ میں اگر اس جہان میں جزا کے لحاظ سے کوئی فرق ہوتا تو اس صورت میں عدل الٰہی کوئی صورت پیدا کر لیتا۔ لیکن فرض یہ ہے کہ اس دنیا میں سوائے چند موارد کے ان دو گروہ کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ ہے۔ طبعی طور پر مفہوم عدالت کے بطور اتم و اکمل تحقق کے لیے ایک دوسری زندگی ضروری ہے کہ جو عدالت کی جلوہ گاہ ہو۔ اس طرح سے معاد کو حتمی ویقینی امر کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ یہاں چند آیات ذکر کرتے ہیں جو اس موضوع پر ہیں۔ یہ آیات دو قسم کی ہیں:

ا۔ ایک قسم ان آیات کی ہے جن میں جزاوسزا کے مساوی ہونے کا بصورتِ تعجب انکار کیا گیا ہے کہ یہ عدلِ الٰہی کے مناسب نہیں۔

دوسری قسم ان آیات کی ہے جن میں جزاوسزا کو معاد کے عواقب میں سے شمار کرتے ہوئے نئی زندگی کے ایک مقصد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آیات درج ذیل ہیں:

۲۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝۲۸ (ص:۲۸)

”آیا ہم ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے ان لوگوں جیسا برتاؤ کریں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا کیا ہم پرہیزگار اور فاسق افراد کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کریں گے“

۳۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝۳۵ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۶ (قلم: ۳۵)

”کیا ہم ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کے اوامر کے سامنے تسلیم کر دیا ہے۔ مجرموں کی طرح قرار دیں گے، تمہیں کیا ہوا ہے، کیا فیصلہ کرتے ہو؟“

۴۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَ مَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (جاثیه:۲۱)

''یا گناہگاروں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ صالح ومومن لوگوں جیسا سلوک کریں گے، ان کی زندگی اور موت ایک جیسی ہوگی، کیسا غلط اور برا فیصلہ کرتے ہیں؟''

ان آیات میں مجرم اور نیک لوگوں کے برابر ہونے کا شدت سے انکار کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی آیات میں وقوع معاد کو نیک و بد لوگوں کو جزا و سزا دینے کا مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔

بالفاظ دیگر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پہلی قسم کی آیات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہگار اور نیک لوگوں سے ہرگز ایک جیسا سلوک نہیں کرے گا لیکن یہ کہ ان کے ساتھ عدالت کے مطابق برتاؤ کہاں کرے گا۔ ان آیات میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ لیکن اسی بات کا جواب دوسری قسم کی آیات میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ یہ ثواب وعقاب اور جزا و سزا کہاں پر ہوگی؟ وہ آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ اِلَیۡهِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۴﴾ (یونس:۴)

''تم سب کو اس کی طرف پلٹ کے جانا ہے۔ یہ وعدہ حق و استوار ہے۔ وہی ہے جو ابتدا میں خلق کرتا ہے اور وہ دوبارہ خلق کرے گا تاکہ مومن و صالح لوگوں کو عدل کے مطابق جزا دے اور وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کا مشروب سخت کھولتا ہوا پانی ہوگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، اس کفر کی سزا کے طور پر جسے انہوں نے اختیار کیا''۔

۳۔ یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ لِیَجۡزِیَ اللّٰهُ کُلَّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۵۱﴾

(ابراهیم ۴۸:۵۱)

''جس دن یہ زمین کسی اور زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی اور سب خداوند یکتا وقہار کے پاس حاضر ہو جائیں گے تاکہ وہ ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا و سزا دے۔ اللہ بہت جلد لوگوں سے حساب لے گا''

۳۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝۵ (سبا ۳ تا ۵)

''اور کافروں نے کہا: قیامت نہیں آئے گی (اے نبیؐ!) کہہ دو کیوں نہیں، خدا کی قسم ضرور آئے گی تا کہ مومن و صالح لوگوں کو اجر و پاداش دی جائے اور ان کے لیے مغفرت ہے اور پاکیزہ رزق اور وہ جنھوں نے ہماری آیات کا انکار کرنے میں کوشش کی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۴۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ (طه: ۱۵)

''قیامت آنے والی ہے (اس کے وقوع کے وقت کو) پوشیدہ رکھوں گا تا کہ انسان کو اس کے عمل و کوشش پر جزا دی جائے''

۵۔ يَوْمَىِٕذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ڏ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝۶ۭ (زلزله: ۶)

''وہ دن جب لوگوں کو جدا جدا اٹھایا جائے گا تا کہ اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں۔

ان آیات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ نئی زندگی اور قیامت کو بیان کرنے کے بعد لِتُجْزٰی، لِیَجْزِیَ اور لِیُرَوْا جیسے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ یہ سب ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور وہ یہ کہ قیامت جزا و سزا دینے کی خاطر ہے جو کہ عدل الٰہی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ البتہ اگرچہ ان آیات میں عدلِ الٰہی کا ذکر نہیں ہوا لیکن پہلی قسم والی آیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جزا و سزا دینے کے اسباب میں سے ایک سبب عدل الٰہی بھی ہے۔

البتہ یہ بات یہاں پر قابل ذکر ہے کہ ثواب وعقاب کی بحث میں آئندہ ہم اس بات کا تذکرہ کریں گے کہ آخرت میں تجسم اعمال بھی ہوگا یعنی انسان کے عمل کے دو وجود ہیں۔ ایک تو عمل کا دنیوی وجود ہے جیسا کہ نماز کچھ اذکار و حرکات و سکنات کی صورت میں ہے اور ایک اخروی وجود ہے۔ وہاں عمل خود دوسرے اجسام کی طرح مجسم ہو کر حاضر ہوگا۔ اسی طرح یہ بات بھی آئندہ عرض کریں گے کہ اس دنیا میں کثرت گناہ یا کثرت اطاعت کی وجہ سے انسان کچھ ملکات حاصل کر لیتا ہے۔ ان ملکات کے مطابق کچھ خاص قسم کی تخلیق کرتا ہے۔ جو اس کے لیے تکلیف یا خوشی کا موجب بنے گی۔ یہ دو قسم کی صورت حال موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ ہماری بحث صرف اس جزا و سزا کے بارے میں ہے جو قرآن یا سنت کے ذریعے متعین کی گئی ہے۔

حضرت امیر المومنین کے معجزہ آسا کلام میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ موجود ہے کہ قیامت وہ دن ہے جب جزا و سزا دی

جائے گی اور وہ عدل الٰہی کی جلوہ گاہ ہے۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۰۲ میں حضرتؑ فرماتے ہیں:

یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللهُ فِیۡهِ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ لِنِقَاشِ الۡحِسَابِ وَجَزَآءِ الۡاَعۡمَالِ"

''وہ دن جب اللہ پہلے اور بعد والے لوگوں کو جمع کرے گا۔ حساب اعمال اور جزا و سزا دینے کے لیے''

خطبہ نمبر ۱۰۹ میں ہے:

فَجَدَّدَهُمۡ بَعۡدَ اِخۡلَاقِهِمۡ وَ جَمَعَهُمۡ بَعۡدَ تَفَرُّقِهِمۡ ثُمَّ مَيَّزَهُمۡ لِمَا یُرِیۡدُ مِنۡ مَّسۡئَلَتِهِمۡ عَنۡ خَطَایَا الۡاَعۡمَالِ وَخَبَایَا الۡاَفۡعَالِ وَجَعَلَهُمۡ فَرِیۡقَیۡنِ انعم علی هؤُلاءِ انتقم من هؤُلاءِ

''ان کے بدن بوسیدہ ہونے کے بعد نئے بنائے گا ان کو متفرق ہونے کے بعد جمع کرے گا، پھر انہیں خفیہ کاموں کے بارے میں سوال کرنے کی خاطر جدا جدا کرے گا اور ان کو دو گروہوں میں بانٹ دے گا ایک گروہ کو اپنی نعمات سے نوازے گا اور ایک گروہ سے انتقام لے گا''۔

معاد اللہ کے وعدوں کی جلوہ گاہ

یہاں پر معاد کے حتمی ہونے پر ہم ایک اور دلیل ذکر کرتے ہیں کہ جو شرعی و عقلی بنیادوں پر استوار ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا نے سابقہ کتابوں میں بھی اور قرآن میں بھی بندوں کو جزا و سزا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسئلہ قیامت اور جزا کو ایک وعدۂ الٰہی شمار کیا جاتا ہے۔ اب اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عقل ایک قطعی و یقینی حکم لگاتی ہے اور وہ یہ کہ وعدہ پر عمل کرنا حسن عقلی رکھتا ہے اور وعدہ پورا نہ کرنا قبیح ہے اور ناروا۔ اس بات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قیامت کا وقوع پذیر ہونا اور جزا و سزا چونکہ خدا کا وعدہ ہے لہٰذا یقیناً انجام پائے گا۔

قیامت کی قطعیت پر جو دو دلیلیں پہلے ذکر ہو چکی ہیں یہ دلیل ان سے مختلف ہے۔ پہلی دو دلیلوں میں استدلال کی بنیاد دو اساس حکم عقل تھا۔ جو آیات اس ضمن میں ذکر کی گئیں وہ اسی حکم عقل کے بیان میں تھیں۔ چاہے یہ کہا جائے کہ قیامت کے بغیر خلقت عبوث و لغو ہے، چاہے یہ کہا جائے کہ تمام لوگوں کے ساتھ جزا و سزا میں یکساں برتاؤ کرنا عدالت کے منافی ہے۔

لیکن جو دلیل ہم اب بیان کر رہے ہیں اس کی دو بنیادیں ہیں۔ ان میں سے ایک شرعی حیثیت ہے یعنی اگر خدا قیامت کی خبر نہ دیتا اور نیک و بد لوگوں کے لیے جزا و سزا معین نہ کرتا تو حکم عقل (کہ وعدہ پر عمل کرنا حسن عقلی رکھتا ہے اور خلاف وعدہ کرنا قبح عقلی رکھتا ہے) کا بالکل موضوع ہی نہ ہوتا لیکن چونکہ یہ ایک شرعی اصول ہے (کہ قیامت اور جزا و سزا کی خبر دے دی ہے) عقل اس کی بنیاد پر یہ حکم لگاتی ہے کہ قیامت اور جزا و سزا یقیناً وقوع پذیر ہوگی۔

اس استدلال کا کچھ آیات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مطلب سے مربوط آیات دو قسم کی ہیں:

۱۔ ایک قسم ان آیات کی ہے جو قیامت کے وقوع اور جزا وسزا کے بارے میں خدا کے وعدوں کو بیان کرتی ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ان آیات کی ہے جنہوں نے اس وعدہ کا تخلف ناپذیر اور یقینی ہونا بتایا ہے۔

پہلی قسم والی آیات کہ قیامت وعدہ الٰہی ہے کہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ ‌ؕ وَعۡدًا عَلَيۡنَا ‌ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾

(انبیاء: ۱۰۴)

''جیسے ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسے دوبارہ بھی لوٹائیں گے یہ ہمارا یقینی اور حتمی وعدہ ہے اور ہم اسے انجام دیں گے اور پورا کریں گے''

۲۔ فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَيَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾

(زخرف: ۸۳)

''انہیں کھلا چھوڑ دو تاکہ (اپنی حیوانی خواہشات میں) آگے تک چلے جائیں اور لہو ولعب کرتے رہیں یہاں تک کہ اس دن سے ملاقات کرلیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے''

اس مضمون کو سورہ معارج کی آیت ۴۳ بھی بیان کرتی ہے۔ نیز سورہ ذاریات کی آیت نمبر ۶۰ سورہ معارج کی آیت ۴۴ اور سورہ انبیا کی آیت نمبر ۱۰۳ میں قیامت کو وعدہ الٰہی کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

اعمال پر جزا۔ ایک وعدۂ الٰہی

بہشت کے بارے میں ارشاد ہے:

وَاُزۡلِفَتِ الۡجَـنَّةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ غَيۡرَ بَعِيۡدٍ ﴿۳۱﴾ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ (ق۔ ۳۱: ۳۲)

''جنت متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو زیادہ دور نہیں ہے یہ ایسی چیز ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے''

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوۡعِدُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ (حجر: ۴۳)

''دوزخ تمام مجرمین کے لیے وعدہ گاہ ہے''

بِهٖ‌ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ‌ ۚ (ھود: ۱۷)

''جس گروہ نے بھی (قرآن اور پیغمبر کا) انکار کیا جہنم اس کی وعدہ گاہ ہے''

یہاں تک ان پہلی قسم کی آیات کا بیان تھا کہ قیامت اور جزا وسزا وعدۂ الٰہی ہیں۔ اب دوسری قسم کی آیات کو بیان کرتے ہیں کہ جو

اس وعدہ کے یقینی طور پر انجام پانے کو بیان کرتی ہیں یعنی جو حکم عقل کی تائید کرتی ہیں۔اس بارے میں آیات بہت زیادہ ہیں ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹ (آل عمران: ۹)

''خدایا! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس کے بارے میں انہیں کوئی شک نہیں تحقیق اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا''

۲۔ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴ (آل عمران: ۱۹۴)

''خدایا! قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا''

(سورہ فرقان کی آیت نمبر ۱۱۶، توبہ کی آیت نمبر ۱۱۱، مریم کی آیت نمبر ۶۱، زمر کی آیت نمبر ۲۰ اسی مطلب کے بیان میں ہیں)

ظاہراً اسلامی متکلمین نے انہی آیات کی روشنی میں قیامت کے ضروری الوقوع ہونے پر عقلی حکم کو حاصل کیا ہے اور حکمت اور ایفائے عہد کے واجب ہونے کے ذریعے اس پر استدلال کیا ہے۔ جیسا کہ محقق خواجہ نصیر الدین طوسیٰ اسی مطلب کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ووجوب ایفاء الوعد والحکمة یقنتضی و جوب البعث

''ایفائے عہد کا واجب ہونا اور خدا کا حکیم ہونا قیامت کے ضروری ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ (کشف المراد مقصد ششم مسئلہ چہارم)

۴۔ معاد۔ رحمت خدا کا مظہر ہے

ایک اور ظریف نکتہ جس کی طرف قرآن متوجہ کرتا ہے کہ قیامت کو بطور رحمت الٰہی ذکر کرتا ہے اور وہ یوں کہ خدا نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ بندوں پر رحمت کرے۔ لہٰذا اس وجہ سے انہیں قیامت کے دن جمع کرے گا۔ سورہ انعام کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲ (سورہ انعام: ۱۲)

''کہہ دو (اے پیغمبرؐ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کس کی ملکیت ہے کہو خدا کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ دیا ہے (یعنی اپنے اوپر ضروری و لازم کر لیا ہے کہ بندوں پر رحم کرے) (اسی وجہ سے) تم سب کو وہ قیامت کے دن جمع کرے گا۔ اس دن میں کوئی شک نہیں اور گھاٹے میں وہ لوگ ہیں جو

ایمان نہیں لائے۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا دن کیسے رحمت خدا کا مظہر ہوسکتا ہے جبکہ اس دن ایک گروہ نعمت میں اور ایک گروہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔ آیا دردناک عذاب کو رحمت خدا کا مظہر کہا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اصولی طور پر قیامت برپا کرنے کا مقصد ہی انسان میں ممکنہ کمالات کو وجود میں لانا ہے تاکہ وہ اپنے ان اعمال کا نتیجہ پا سکے جن کے زیر سایہ اس میں پنہاں قوتیں فعال ہوتی ہیں اور آخرت میں زندگی کو بھی درحقیقی اسی عنوان کے تحت خلقت کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے۔ اب کوتاہی خود اس کا فرشخص کی ہے جس نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر رحمت الٰہی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا ہے۔ اس جہان میں خدا کے عطا کردہ سرمائے سے استفادہ نہ کرکے اس نے اپنے آپ کو جادہ رحمت سے دور کرلیا ہے۔

اس بات کے پیش نظر قیامت کا برپا کرنا رحمت کی بنیادوں پر ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں اور رحمت کا کافروں کے شامل حال نہ ہونا خود ان کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہے مسئلہ قیامت کی مثال امتحان کی سی ہے کہ جس کا مقصد کسی شخص کی صلاحیات کو سامنے لانا ہوتا ہے لیکن کافر کچھ وجوہ کی بنا پر ان صلاحیتوں سے درست استفادہ نہیں کرتے اور انہیں غلط اور نقصان دہ راہوں میں کام میں لاتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

۱۔ اس آیت نے قیامت میں لوگوں کے حضور کو خدا کی رحمت کا مظہر بتایا ہے جزا و سزا کو نہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

لیجمعنکم الی یوم القیامة

گویا اس دن میں حاضر ہونا ایک کامل ترین منزل کی طرف گامزن ہونا ہے، یہ الگ بات ہے کہ کافر نے اپنے آپ کو اس کمال سے محروم کرلیا ہے۔ یہ اس کا محروم ہونا اس حضور کے رحمت ہونے کے منافی نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا جملہ "الذین خسرو ا انفسھم" ہے یہ اس مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ محشر میں کفار کا حاضر ہونا کیسے رحمت خدا کا مظہر ہے حالانکہ اس دن کفار کے لیے صرف اور صرف خسارہ وعذاب ہے۔ آیت جواب میں کہتی ہے کہ یہ خسارہ خود ان کی طرف سے ہے۔ خود انہوں نے اپنے آپ کو رحمت الٰہی سے محروم کرلیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قیامت کا دن تمام لوگوں کے لیے کمال پانے کی کلاس ہے لیکن کچھ لوگوں نے اپنے اعمال کے باعث اپنے آپ کو اس کمال سے محروم کرلیا ہے۔

یہ آیت بھی اسی مقصد کو بیان کررہی ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۵۰ (روم: ۵۰)

"خدا کی رحمت ملاحظہ کرو، وہ کیسے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے، وہی خدا مردوں کو بھی زندہ کرے گا، وہ سب چیزوں پر قادر ہے"

اس آیت میں قیامت اور مردوں کے زندہ کرنے کے امکان کو زمین کے زندہ کرنے کے ذریعے سے ثابت کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ثانوی طور پر ایک دوسرے بات بھی اس آیت سے سمجھی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ جیسے زمین کا زندہ کرنا رحمت خدا کا مظہر ہے ایسے ہی قیامت میں مردوں کا زندہ کرنا رحمت الٰہی کا مظہر ہوگا۔ کیونکہ زمین کے زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خزاں میں پھول، گھاس اور درختوں کے خشک ہونے کے بعد موسم بہار میں زمین سے سبزے کا اگنا۔ یہ سبزے کا اگنا درحقیقت اسی زمین میں پوشیدہ استعداد اور قوتوں کا ظاہر ہونا ہے۔ اس زمین کے زندہ کرنے کے زمانہ میں جیسے میٹھے پھل اور پھول ظاہر ہوتے ہیں ایسے ہی کانٹے اور تلخ پھل بھی ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سب رحمت الٰہی کے آثار ہیں۔ اسی طرح مردوں کا زندہ کرنا بھی رحمتِ الٰہی کا تقاضا ہے اور پھر زندہ کرنے کے بعد جزا و سزا دینا اس کا لازمہ ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں آیتیں ایک حقیقت کو بیان کر رہی ہیں۔

۵۔ معاد کمالِ انسانی کی آخری منزل

فلاسفہ نے حرکت کی تعریف میں چھ چیزوں کو ضروری سمجھا ہے۔ ایک ان میں سے غایتِ حرکت ہے (یعنی حرکت کی نہایت و مقصد جس کی خاطر حرکت ہو)۔ حرکت کی تعریف میں غایت کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حرکت کی حقیقت یہ ہے کہ متحرک شخص درحقیقت جو چیز نہیں رکھتا اس کو پانے کی خاطر جستجو کرتا ہے۔ اس بات میں طبیعی حرکت اور ارادی حرکت برابر ہیں۔ اب بشر کی خلقت بھی ابتدا سے اسی بے قرار و بے ثباتی اور حرکت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ بشر زندگی کے ہر لحظے میں کمال کی طرف گامزن ہے، ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متحرک ہے۔ پہلے ایک چھوٹا سا جرثومہ تھا پھر علقہ و مضغہ وغیرہ جیسی منازل طے کرتا ہوا انسانی صورت پر پہنچتا ہے اور انتہائی جوش و خروش کے ساتھ بڑے بڑے کام کرتا ہے لیکن اس حالت میں بھی اس کی زندگی کی بے آرامی والی کیفیت موجود رہتی ہے اور وہ مسلسل دگرگونی کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ انسان کی زندگی ایک مسلسل حرکت کا نام ہے اور ہر حرکت میں غایت ضروری ہے لہٰذا انسان کی اس زندگی کو بھی بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں پر وہ استقرار و ثبات کو پا لے لیکن اس مادی دنیا میں اس کی ایسی حالت نہیں ہو سکتی لہٰذا ضروری ہے کہ ایک اور جہاں ہو جہاں سکون و ثبات ہو اور یہ دائمی حرکت اپنی غایت پر پہنچ کر رک جائے۔

قرآن کی رو سے یہ حالت قیامت کے دن امکان پذیر ہے۔ وہاں پر تمام کوششیں، تمام دوڑ دھوپ اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور مسلسل کوشش میں رہنے والا انسان اپنے ہدف کو پا کر ٹھہر جائے گا۔ قرآن اس فلسفی برہان کو کہ جو خود قیامت کے یقینی ہونے پر ایک دلیل ہے مندرجہ ذیل آیات میں بیان کرتا ہے:

ا۔ قرآن چند آیات میں انسان کی خلقت کے تکاملی مراحل کو ذکر کرتے ہوئے اس کی خلقت کی ابتدا نطفہ کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان مراحلِ خلقت میں ایک ایسی خلقت پر پہنچتا ہے کہ جو انتہائی اچھوتی اور تعجب آور ہے جس کی وجہ سے خدا خود اپنے اچھے خالق ہونے کی تعریف کرتا ہے۔ آیت یہ ہے:

لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۴﴾

(مومنون: ۱۴)

اس کے بعد قرآن انسان کی ترقی وتکامل کے دو اور مراحل (موت اور نئی زندگی) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں بیان کرتا ہے:

الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝۱۶ (مومنون ۱۵ تا ۱۶)

''پھر تم مر جاؤ گے اور اس کے بعد تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے''

یہ تینوں جملے لفظ ثم کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں اور ثم کے معنی میں یہ خصوصیت ہے کہ یہ چیزیں بالترتیب ایک دوسرے کے بعد واقع ہوں گی۔

آیت کے تینوں جملے ایک بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ابتدائے خلقت سے لے کر قیامت تک انسان پر ایک حالت طاری اور حاکم رہتی ہے جو اس کو مسلسل مضطرب رکھے ہوئے ہے اور وہ ہے نقص سے کمال کی طرف اور فقدان سے وجدان کی طرف حرکت اور بالقوہ استعداد کو مقام فعلیت پر پہنچانا۔

اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی خلقت کا کمال اس کی زندگی کے آخری مرحلے میں کو جو قیامت کے دن وجود میں آئے گا انجام پائے گا پس قیامت انسان کے تکامل وکمال کا آخری نقطہ ہے۔

اس مطلب کو دوسری آیات میں زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے اور وہ آیات درج ذیل ہیں:

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝۴۵ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝۴۶ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۝۴۷ (نجم ۴۵: ۴۷)

''اور (خدا) وہی ہے جس نے نر اور مادہ کو نطفے سے خلق کیا، جب وہ رحم میں ڈالا جاتا ہے اور وہی (خدا) دوبارہ خلق کرے گا''

کچھ آیات میں قیامت کے نام ''المنتهى''، ''المستقر'' اور ''المساق'' ذکر ہوئے ہیں۔ ان ناموں کو دیکھ کر قیامت کی ان اصفات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت ''منتہیٰ'' ہے یعنی اس دن انسان کی حرکت وکوشش کی انتہا ہو جائے گی اور ''مستقر'' ہے یعنی اس دن انسان کی پر تلاطم اور ہمیشہ بے قرار زندگی ثبات وقرار پا لے گی اور ''مساق'' ہے چونکہ یہ جہان اس کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور اس حقیقت کو بیان کرنے والی آیات درج ذیل ہیں:

۳۔ اُخْرٰى ۝۳۸ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝۴۲ (نجم ۳۹: ۴۲)

''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے سوائے اس کوشش کے جو وہ کرتا ہے وہ جلد ہی اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھ لے گا پھر اسے پوری جزا دی جائے گی اور تحقیق تمام سعی وکوشش پروردگار پر جا کر ختم ہوگی''

۴۔ وَزَرَ ﴿۱۱﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ (قیامت: ۱۲)

''اور اس دن قرار گاہ تیرے پروردگارؐ کی طرف ہے''

۵۔ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ (قیامت: ۳۰)

''اس دن حرکت کی غایت خدا پر ہے''

۶۔ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ﴿۸﴾ (علق: ۸)

''خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے''

۷۔ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾

(مومن: ۳۹)

''دنیوی زندگی مال ومتاع ہے یا جلد ختم ہو جانے والی لذت ہے اور ثبات وقرار اور ہمیشگی صرف آخرت کے گھر میں ہے''

اور اسی مطلب کی طرف اشارہ حضرت امیر المومنینؑ کے کلمات میں بھی ہوا ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

و ان الخلق لا مقصر لهم عن القيمة مر قلين فى مضما رها الى الغاية القصوى

''لوگوں کے لیے قیامت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور اس مقابلے کے میدان میں سب تیزی سے اپنے آخری ہدف ومقصد کی طرف رواں دواں ہیں''

عالم اسلام کے بزرگ فلسفی ملا صدر الدین شیرازی معروف بہ صدر المتالھین قرآنی آیات سے اس برہان کو سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جن آیات میں انسان کے نقص سے کمال کی طرف حرکت کے مختلف مراحل اور تغیر وتبدل کو ذکر کیا گیا ہے درحقیقت وہ اس مطلب کو بیان کررہی ہیں کہ انسان کی یہ تکاملی حرکت ایک غایت اور آخری مرحلہ رکھتی ہے، گویا انسان طبعی طور پر کمال کی طرف گامزن ہے اور فطرت کے ذریعے (اللہ کا دین فطرت ہی ہے) مبداء فعال (خدا) کا تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے اور انسان کی طبیعت کے مناسب کمال اس پست اور مادی عالم میں امکان پذیر نہیں بلکہ ایسا ایک اور عالم میں ہوگا جو درحقیقت انسان کی تکاملی حرکت کے لیے غایت ہے۔ جب انسان نے حرکت جوہری

کے ذریعے جماد، نبات، حیوان کی طرح کے خلقت کے تمام مراحل کو طے کرلیا اور اس جہان میں ممکنہ کمالات کو پالیا، اب آخرت کی طرف متوجہ ہوگا اور قوت سے فعل کی طرف متوجہ ہوگا اور اس وقت خدا کہ جو آخری عالی ترین ہدف اور کوشش وشوق کی انتہا ہے، کی طرف توجہ کرے گا۔

۶۔ اللہ پروردگار ہے تو معاد ضروری ہے

عربی زبان میں رب کے معنی صاحب و مالک کے ہیں۔ گھر کے مالک کو عرب ''رب الدار'' کہتے ہیں اور باغ والے شخص کو ''رب الضیعۃ''۔ دراصل ربوبی مرتبہ مربوب کی تدبیر کے متعلق ہے جیسا کہ خالقیت کا مرتبہ مربوب کی اصل خلقت کے متعلق ہے جیسے ممکن موجود مخلوق ہونے کے لحاظ سے خالق کے ساتھ ایک تعلق رکھتا ہے اور چونکہ خلقت کے بعد زندگی کی بقا میں تدبیر کا محتاج ہے اس لحاظ سے اپنے خالق کے ساتھ ایک اور رابطہ بنام رابطۂ مربوبی پیدا کرلیتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے رب کے معنی مالک ہونے کے ہیں۔

پس خدا کہ جو رب العالمین ہے وہ مالک ہوگا اور بندہ اس کا مملوک اور یہ بات بدیہی و واضح ہے کہ مملوک کے تمام مسائل تمام شئونِ زندگی اس کے مالک سے متعلق ہوتے ہیں اور اس کی تمام حرکات و سکنات کو بھی اسی کے زیر نظر اور اس کے حکم کے مطابق انجام پانا چاہیے اور چونکہ لوگ اطاعت و پیروی کے لحاظ سے دو قسم کے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کے رب کو ایک دن معین کرنا چاہیے جس میں وہ لوگوں کے اعمال کا حساب و کتاب لے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ خدا چونکہ انسانوں کا رب ہے اس لیے اُن پر اُس کی بندگی لازم ہے۔ درحقیقت بندگی انسان میں پوشیدہ ایک ذمہ داری ہے جو اعمال پر حساب کے بغیر متصور نہیں ہوسکتی۔ ضروری ہے کہ ایک جزا و سزا کا دن ہو جس میں انسانوں کو زندگی ملے کہ اس لحاظ سے ربوبیت وہاں تجلی کرے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیت میں لفظ رب استعمال ہوا ہے، اس کی جگہ اللہ یا خالق کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ سورہ انشقاق آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿٦﴾ (سورہ انشقاق: ۶)

''اے انسان! تم سخت کوشش کے ساتھ اپنے رب کی طرف جا رہے ہو اور بالآخر اس سے ملاقات کرلو گے''

شاید یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت میں معاد کے انکار کو ربوبیت کا انکار شمار کیا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ (رعد: ۵)

''اگر تمہیں تعجب ہے تو ان کے اس قول سے ہے کہ وہ کہتے ہیں جب ہم مٹی بن گئے تو کیا نئے سرے سے خلق کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے''

ہمارے سابقہ بیان سے واضح ہوگیا کہ معاد کے انکار کا لازمی نتیجہ انکارِ ربوبیت ہے کیونکہ جنہوں نے خدا کو رب اور اپنے آپ کو مربوب مان لیا تو انہیں ایسے دن کا انکار نہیں کرنا چاہیے جس دن انسان سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا اس لیے کہ اس

بات کا تصور کرنا ہی مشکل ہے کہ خدا بندوں کا مالک وصاحب ہو اور بندوں سے پورا پورا حساب نہ لے۔
یہیں پر انسان قرآن کی دقیق تنظیم کو دیکھ کر تعجب میں رہ جاتا ہے کہ جس جگہ پر بھی ایک لفظ اور کلمہ کو استعمال کیا گیا اگر اسے وہاں سے تبدیل کر دیا جائے تو مقصود و معنی ختم ہو کر رہ جائے گا۔

منکرین معاد اور انکار کے اسباب

ہمیشہ سے لوگ انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک گروہ وہ کہ جو اکثریت پر مشتمل ہے ان لوگوں کا ہے جو انبیاء کی آواز پر منفی جواب دیتے ہیں اور نتیجتاً معاد کا انکار کر دیتے ہیں اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو انبیاء کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور نتیجتاً معاد کے معتقد ہو جاتے ہیں۔
پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں بھی عرب ان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ اکثریت مشرک تھی اور ذاتِ خدا کی عبادت سے منہ موڑ کر مخلوق کی عبادت کر رہی تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو عقیدہ معاد سے بے نیاز و مستغنی خیال کرتے تھے اور ایک اقلیت بنام احناف معاد کو قبول کرتی تھی اور ان کا عقیدہ دین ابراہیمؑ کے مطابق تھا۔ اس گروہ کے علاوہ یہودیوں اور نصرانیوں نے بھی ایک لحاظ سے معاد کو قبول کیا ہوا تھا۔
جن لوگوں نے معاد کا انکار کیا ان کے اس انکار کے کچھ خاص عوامل واسباب تھے جنہیں قرآن نے کچھ آیات میں بیان کیا ہے۔ ہم اس بحث میں آیات کے توسط سے ان عوامل کو بیان کریں گے۔

معاد کے انکار کے حقیقی عوامل

منکرین معاد کے انکار کی حقیقی وجہ ان کے ظاہری شبہات اور ادلہ کی بنیاد پر مختلف ہے یعنی منکرین میں دو چیزیں تھیں، ایک ان کے شبہات اور دوسرے وہ حقیقی وجوہ جن کی بنا پر وہ معاد کا انکار کرتے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنیاد پر وہ شبہ اور تشکیک ایجاد کرتے ہیں۔ آیات میں غور و فکر کرنے سے دونوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے ہم اس بحث میں پہلے ان کی حقیقی وجوہ اور پھر ان کے شبہات کو کھول کر بیان کریں گے البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض منکرین کے انکار کی حقیقی وجہ ان کے شبہات ہی ہوں۔ لیکن اکثریت میں انکار کی حقیقی وجہ ان کے شبہات کے علاوہ ہے۔ شبہات تو صرف بہانہ ہیں۔ ہم ان حقیقی وجوہ میں سے صرف دو کو بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ا۔ لامحدود آزادی کی خواہش

شہوت پرست افراد اپنی جنسی اور حیوانی خواہشات کو پورا کرنے میں کسی پابندی کو قبول نہیں کرتے۔ اگر وہ لوگ ظاہری طور پر قوانین کو مان بھی لیتے ہیں تو صرف اس لیے کہ اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ دل سے قبول نہیں کرتے لہٰذا اندرونِ خانہ اور تنہائی میں سب قوانین کی مخالفت کرتے ہیں جب کہ عقیدۂ معاد انسان میں صبر اور محدودیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے الٰہی قوانین کی

مخالفت کرتے ہیں جب کہ عقیدۂ معاد انسان میں صبر اور محدودیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے الٰہی قوانین اور حقوق الناس کی رعایت پر مجبور کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یقیناً شہوت پرست لوگ اس عقیدہ کی مخالفت کریں گے چونکہ وہ چاہتے ہیں کہ محدود کر دینے والی زنجیر کو توڑ کر اپنی جنسی تشنگی کو سیراب کریں۔

قرآن اس عامل کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾

(قیامت ۳: ۴)

''کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ ہاں کیوں نہیں کریں گے بلکہ ہم تو اس کی انگلیوں کو پوروں تک کو بنانے پر قادر ہیں''

ان دو آیت میں قدرت خدا کے بارے میں منکرین کے ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مردوں کو زندہ کرنا قدرت الٰہی سے خارج ہے۔ آیات نے وسعتِ قدرت خدا کو اس طرح سے ثابت کیا ہے کہ ہم تو ان کی انگلیوں کو پوروں کو بھی بالکل پہلی طرح بنانے پر قادر ہیں۔

اس شبہ کا جواب دینے کے ساتھ ہی بعد والی آیت میں ان کے انکار کی حقیقی وجہ بیان کی گئی ہے کہ یہ شبہ تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ ان کے انکار کی اصل وجہ کچھ اور ہے:

بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾ یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَةِ ؕ﴿۶﴾

(قیامت: ۵، ۶)

''بلکہ انسان چاہتا ہے کہ پوری زندگی گناہ کرے۔ (انکاری لہجہ میں) پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟''

فجر کے معنی لغت میں ''پھاڑنے'' کے ہیں۔ اسی لیے آلودہ و برے شخص کو فاجر کہتے ہیں کیونکہ وہ دین اور عفت کے پردے کو پھاڑ دیتا ہے۔ یہاں پر فجر امامہ کے متعلق ہے جس کے معنی باقی ماندہ زندگی کے ہیں۔ اس سے مراد مسلسل گناہ کرنا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے مانع اور رکاوٹ کو عبور کر کے اپنی حیوانی اور جنسی خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتا ہے، طبعی طور پر ایسا شخص معاد کو قبول نہیں کر سکتا، لہٰذا اپنے آپ کو منکر معاد کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ تسلط کی خواہش اور انکار معاد

اقتدار و تسلط سے غرور و تکبر، دھونس اور دوسروں سے استفادہ کرنا جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں اور عقیدہ معاد اس قسم کے اقتدار و تسلط کے مناسب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے تاریخ شاہد رہی ہے کہ برسر اقتدار اور صاحب تسلط لوگوں کی سیاست قیامت کے انکار پر مبنی رہی ہے

کیونکہ وہ اپنی اجتماعی حیثیت اور سیاسی اقتدار کو صرف قیامت کے انکار کی صورت میں محفوظ رکھ سکتے تھے۔

ہمیشہ سے انبیاء کرامؑ اور یہ لوگ ایک دوسرے کی بالکل مخالف سمت میں رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ انکارِ معاد کے ساتھ ساتھ پورے دین کا انکار کر دیتے اور اپنے اس انکار کی توجیہ کی خاطر سادہ لوح افراد کے لیے شبہات کو ایجاد کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کا اس بارے میں یوں ارشاد ہے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

(مومنون ۳۳: ۳۸)

"اس نبی کی قوم کے مقتدر لوگ (حضرت نوحؑ کے بعد) جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی اور ہم نے انہیں فراواں دنیوی نعمتیں دے رکھی تھیں، انہوں نے کہا یہ نبوت کا مدعی محض تمہارے جیسا انسان ہے، جو تم کھاتے ہو وہ بھی وہی کھاتا ہے، جو تم پیتے ہو وہ بھی وہی پیتا ہے۔ اگر تم اپنے جیسے انسان کی پیروی کرو گے تو بے شک گھاٹے میں رہو گے۔ آیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب مرو گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو تمہیں قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ وعدہ جو تم سے کیا گیا ہے بعید ہے، بعید ہے۔ زندگی صرف یہی دنیوی زندگی ہے۔ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور ہمیں اٹھایا نہیں جائے گا۔ یہ (پیغمبر) جھوٹا انسان ہے (نعوذ باللہ) کہ جو معاد کی خدا کی طرف نسبت دیتا ہے اور ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے"

بااقتدار لوگ جنہیں قرآن نے لفظ "ملاء" کے ساتھ تعبیر کیا ہے، مکتبِ انبیاء کے خلاف جنگ کرتے تھے اور اس مکتب کے اصول میں سے ایک اہم اصول یعنی معاد کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے اور عوام فریبی اور اپنی مخالفت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے شبہات ایجاد کرتے تھے جیسا کہ آیت میں بیان کیا گیا ہے "ایعد کم انکم" اس کے بعد وہ خود اور ان کے ماتحت لوگ مل کر یہ نعرہ بلند کرتے و ما نحن له بمومنین اس آیت میں درحقیقت انکار کی دو اصلی عوامل کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۔ ایک نفسانی عامل ہے اور وہ عیش پرستی اور لذت طلبی ہے۔ اس عامل کو "واترفنا ھم فی الحیوۃ الدنیا" [1] کے ذریعے بیان کیا گیا ہے اور یہ اسی پہلی وجہ کی ایک قسم ہے۔

۲۔ دوسرا سیاسی عامل ہے اور وہ اپنے سیاسی و اجتماعی حیثیت کی حفاظت۔

ایک اور آیت میں اس عامل کی طرف اجمالی سا اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ معاد کے بارے میں شبہات ان کے انکار کی وجہ نہیں ہے بلکہ ان شبہات کی اصل وجہ ایک اور چیز ہے اور وہ ہے انبیاء کی جس طرح بھی ہو سکے تکذیب کرنا اور یہ تکذیب نا آگاہی و عدمِ علم کی وجہ سے نہیں بلکہ ہٹ دھرمی اور ضد کی بنا پر ہے۔ آیت یہ ہے:

عَجِيبٌ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵ (ق ۳:۵)

"کفار نے کہا جب مرنے کے بعد خاک ہو گئے (کیا دوبارہ زندہ ہوں گے) تو یہ لوٹنا بہت بعید ہے بے شک ہمیں معلوم ہے کہ زمین ان سے کیا کم کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ رکھنے والی کتاب ہے بلکہ انہوں نے حق کی اس وقت تکذیب کی جب وہ ان کے پاس آیا۔ پس وہ مضطرب صورتحال میں ہیں"

ان آیات میں ایک شبہ کو ذکر کرنے کے بعد اصلی عامل کو بیان کیا گیا ہے شبہہ کو "اذامتنا" کے ذریعے بیان کیا ہے اور قد علمنا ما تنقص کے ذریعے اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے (اسے شبہات کے ضمن میں آئندہ بیان کریں گے) لیکن قرآن اس کے ساتھ منکرین کے انکار کی اصلی وجہ کو بھی بیان کر دیتا ہے کہ یہ شبہات تو صرف ایک بہانہ ہیں ورنہ ان کے معاد سے انکار کی اصلی علت ہٹ دھرمی ہے اور ضد کی بنا پر دین سے انکار ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "بل کذبوا بالحق" پیغمبروں کی رسالت کا انکار کیا اور یہ کہ ان کا انکار منطقی بنیادوں پر استوار نہیں تھا بلکہ صرف عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ فکر و اندیشہ کے اضطراب میں مبتلا تھے کیونکہ اپنے اس انکار کے لیے درست توجیہ نہیں رکھتے تھے۔

سورہ سجدہ کی آیت ۱۰ بھی شاید اسی وجہ کو بیان کر رہی ہے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ (السجدہ: ۱۰)

[1] اتراف کے لغوی معنی ہیں کثرتِ مال کا کسی کو سرکش بنا دینا۔

''کافروں نے کہا: جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے خلق کیا جائے گا؟ بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں انہیں کہہ دو کہ تمہیں فرشتہ مرگ لے جائے گا جو تمہاری جان لینے پر معین کیا گیا''

اس آیت میں ایک شبہ اور اس کا جواب اور ایک اصلی عامل بیان کیا گیا ہے۔ اذا ضللنا کے ذریعے شبہ بیان کیا گیا ہے قل یتوفا کم ملک الموت'' کے ذریعے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ (بعد میں مفصلاً ذکر کیا جائے گا)۔ انکار کی اصل وجہ قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ ہر صورت میں معاد کا انکار کرنا چاہتے تھے۔ یہ شبہات صرف انکار کی توجیہ کی خاطر بہانہ تھے جیسا کہ ''بل هم بلقآء ربهم كافرون'' کے ذریعے اسے بیان کیا ہے۔ یہاں تک تو انکار معاد کے حقیقی عوامل بیان کیے گئے ہیں اب کفار کے معاد کے بارے میں شبہات کو بیان کیا جاتا ہے جن کو قرآن مجید نے ذکر فرمایا ہے۔

قران نے تقریباً دس شبہات کو ذکر کیا ہے۔

پہلا شبہ

معاد پر کوئی دلیل نہیں ہے

وَاِذَا قِيۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِىۡ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ ﴿۳۲﴾ (جاثيه: ۳۲)

''جب کہا گیا کہ وعدہ خدا حق ہے اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں تو انہوں نے کہا: ہم قیامت کو کیا جانیں کہ کیا ہے، ہمیں صرف اس کا گمان ہے اور ہمیں اس کا یقین نہیں ہے''

اس آیت میں یہ شبہ ذکر ہوا ہے کہ وہ جو منکر معاد تھے اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ ان کے معاد کو قبول نہ کرنے کی وجہ مسئلہ معاد کا برہانی نہ ہونا ہے اور ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ معاد کی طرف بلانے والے اگر کوئی واضح دلیل معاد پر لاتے تو وہ انکار نہ کرتے اور معاد کو مان لیتے۔ اگرچہ قرآن نے بطور مستقیم اس شبہ کا جواب نہیں دیا لیکن قرآن کے دوسرے بیانات سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی معاد کے بارے میں مخالفت معاد پر دلیل نہ ہونے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ان کے انکار کے کئی اور عوامل تھے ورنہ اگر صرف یہی شبہ ہوتا تو پھر اگر وہ معاد کے بارے میں قرآن کے مختلف فرمودات کو بغیر کسی تعصب کے مطالعہ کرتے اور منصفانہ فیصلہ کرتے تو ان کا شک یقین میں بدل جاتا اور وہ معاد کو مان لیتے۔

قرآن نے معاد کو ایک اجتناب ناپذیر امر کے بطور پر بیان کیا ہے اور اس کے ممکن الوقوع ہونے پر بڑی واضح اور محکم دلیلیں ذکر کی ہیں کہ جو حقیقت پسند لوگوں کے لیے انکار کی کوئی راہ نہیں چھوڑتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے بارے میں شک و تردد کو قرآن ایک تعجب آور چیز شمار کرتا ہے جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۵ میں ہے:

وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ۬ؕ (رعد: ۵)

''اگر تمہیں تعجب ہے تو ان کی یہ بات تعجب آور ہے کہ جب ہم خاک ہو گئے تو کیا ہم نئے سرے سے خلق کیے جائیں گے''

دوسرا شبہ

عقیدۂ معاد قصہ و کہانی ہے

چونکہ ہمیشہ سے اصول کے لحاظ سے تمام شریعتیں ایک جیسی رہی ہیں اور بعد والے پیغمبر گذشتہ پیغمبروں کی طرح معاد کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے جو عرب پیغمبر اسلامؐ کے دور میں تھے چونکہ وہ آنحضرتؐ کی نبوت کے منکر تھے لہٰذا معاد کو ایک تاریخی قصہ شمار کرتے تھے۔ قرآن ان کی بات کو یوں بیان کرتا ہے:

لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝ (مومنون: ۸۳)

''ہم سے اور ہمارے آباو اجداد سے اس سے پہلے معاد کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن یہ صرف پہلے لوگوں کا افسانہ ہے''

یہ لوگ صرف معاد کو گذشتہ لوگوں کا فسانہ شمار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اصول معارف کے بارے میں پوری دعوت کو ایسا سمجھتے تھے اور اسی چیز کو اپنی مخالفت پر دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے جیسا کہ سورہ فرقان آیت ۵ میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے:

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ۝ (سورہ فرقان: ۵)

''کفار نے کہا قرآن گذشتہ لوگوں کا افسانہ ہے جو صبح و شام اس پر لکھا جاتا ہے''

ایسا اعتراض بدونِ شک اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کا جواب دیا جائے کیونکہ کسی فکر و نظریہ یا واقعے کا تاریخی لحاظ سے قدیم ہونا اس کے افسانہ و بے پایہ ہونے پر دلیل نہیں بن سکتا اور حقیقت پسند افراد کو چاہیے کہ کسی نظریے کے درست یا نادرست ہونے کو دلیل و برہان کے ذریعے جانچیں نہ کہ قدیم و جدید ہونے پر یہی وجہ ہے کہ قرآن اس شبہ کے جواب کو ذکر نہیں کرتا چونکہ شبہ منطقی معیار سے بعید ہے۔

تیسرا شبہ

افترا یا پاگل پن

وہ لوگ معاد کی طرف دعوت کو خدا پر بہتان یا پاگل پن قرار دیتے تھے۔قرآن ان کی اس بات کو یوں نقل کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ

(سبا: ۸)

''کفار نے کہا ہم تمہیں ایک ایسا شخص دکھائیں جو تمہیں خبر دے گا کہ (مرنے کے بعد) جب تم ذرات کی صورت میں ہو گے تو تمہیں دوبارہ خلق کیا جائے گا۔اس نے خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے یا وہ مجنون ہے''

منکرین معاد کی طرف سے ایسے شبہات درحقیقت صرف بہانہ تھے تا کہ معاد کے بارے میں اپنی مخالفت کی توجیہ کر سکیں۔یہ جو اپنے کلام میں انہوں نے تردد کی صورت رکھی ہے (افترى على الله كذبا امر به جنة) یہ بھی سادہ لوحوں کو دھوکا دینے کی خاطر ہے تا کہ اس کے ذریعے خود کو غیر جانبدار ظاہر کر سکیں۔بہرکیف اس شبہ کے بے پایہ و بے اساس ہونے کی وجہ سے قرآن بغیر جواب کے اس شبہ کو ذکر کرتا ہے۔

چوتھا شبہ

ہمارے آبا کو زندہ کر دکھائیں

بعض منکرین معاد کے پاس یہی واحد دلیل تھی کہ جب پیغمبر انہیں عقیدۂ معاد کی طرف بلاتے تو وہ جواب میں کہتے اگر واقعاً معاد ممکن ہے تو ہمارے اطمینان کی خاطر ہمارے آبا کو زندہ کر دکھائیں۔اس بارے میں قرآن کا بیان اس طرح ہے:

يَظُنُّوْنَ ۝٢٤ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جاثیہ: ۲۵)

''جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتیں تو ان کے مقابل ان کے پاس صرف یہی دلیل تھی کہ وہ کہتے

ہمارے اجداد کو زندہ کر دکھاؤ، اگر تم سچے ہو''

اس آیت میں خاص کر ان کا صرف اپنے اجداد کو زندہ کرنے کے بارے میں کہنا بتاتا ہے کہ یہ ان کی طرف سے صرف ایک بہانہ تھا ورنہ ایک مردہ شخص کا زندہ کر دینا اگر چہ وہ ان کے اجداد میں سے نہ ہوتا بطور نمونہ کافی تھا اور اگر پیغمبرؐ ایسا کام کر دیتے تو پھر ہر روز قبیلے اور مختلف افراد کی طرف سے ایسی فرمائشیں ہونے لگتیں جس کے نتیجے میں نبوت اپنے اصلی خطوط سے ہٹ کر کھیل بن جاتی اور پھر بھی وہ اپنے انکار پر باقی رہتے اور نبوت کو جادوگری سے تعبیر کر دیتے۔

پانچواں شبہ

معاد ایک قسم کی جادوگری ہے

اس جہت سے کہ وہ لوگ معاد کو خارج از امکان سمجھتے تھے طبعی طور پر مردوں کا زندہ کرنا بھی ان کی نظر میں ناممکن تھا۔ اگر ان کے اطمینان کی خاطر کوئی مردہ زندہ کر بھی دیا جاتا تو وہ اسے جادوگری ہی شمار کرتے۔ اس بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے:

عَمَلًا ؕ وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ (هود: ۷)

''اور اگر ان سے کہو کہ تمہیں مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا تو کافر کہیں گے یہ واضح جادو کے علاوہ کچھ نہیں''

یہ مخالفین معاد ہی کو جادوگری سے تعبیر نہیں کرتے تھے بلکہ انبیاء کے معجزات کے بارے میں بھی یہی نظر یہ رکھتے تھے اور معجزات کو جادوگری قرار دے کر رد کر دیتے تھے۔

اس بارے میں قرآن کی تعبیر یوں ہے:

وَاِذَا رَاَوۡا اٰيَةً يَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ ۞۱۴ وَقَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞۱۵

(صفت: ۱۴، ۱۵)

وہ جب کسی آیت و معجزے کو دیکھتے تو تمسخر اُڑاتے اور کہتے یہ واضح جادو کے علاوہ کچھ نہیں۔

چھٹا شبہ

معاد احاطۂ قدرت سے باہر ہے

کبھی وہ لوگ کہتے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندگی کی طرف لوٹانا ممکن نہیں اور خارج از قدرت ہے۔ ایسی کون سی قدرت ہے جو بے روح خاک کو زندہ انسان میں تبدیل کر دے۔

اس بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ

(يٰسين: ۷۸)

''اور اس نے ہمیں ایک مثال دی اور اپنی خلقت کو بھول گیا۔ کہنے لگا کون ہے جو ان بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا''

البتہ قرآن نے اس آیت کے بعد اور دوسری آیات میں اس شبہ کا جواب دیا ہے جو آئندہ بحثوں میں ہم بیان کریں گے۔

ساتواں شبہ

مردوں کو زندہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے

کبھی وہ لوگ معاد کے انکار میں کہتے کہ مردوں کا زندہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ یہ اعتراض چھٹے اعتراض کی نسبت ذرا آسان تر ہے چونکہ اُس میں تو بالکل قدرت ہی کا انکار کر دیا تھا۔ یہ اعتراض اگر چہ صریحاً کہیں قرآن میں ذکر نہیں ہوا لیکن چونکہ متعدد آیات میں معاد کو ایک آسان کام بتایا گیا ہے اس سے پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یقیناً کوئی اس قسم کا اعتراض تھا جس میں معاد کو دشوار و مشکل کہا گیا ہو جس کے جواب میں قرآن نے کہا ہے:

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑲ (عنکبوت: ۱۹)

ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ㊹ (ق: ۴۴)

وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑦ (تغابن: ۷)

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ معاد اور دوبارہ زندہ کرنا خدا کے لیے ایک آسان کام ہے۔
ایک اور آیت میں معاد کو آسانی میں پلک جھپکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جیسے پلک جھپکنا انسان کے لیے آسان کام ہے ایسے ہی معاد کا برپا کرنا خدا کے لیے آسان ہے۔سورہ نحل کی آیت ۷۷ ملاحظہ فرمائیں۔

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ

(سورہ نحل: ۷۷)

''اور قیامت کا برپا کرنا نہیں ہے مگر پلک جھپکنے جیسا یا اس سے بھی نزدیک تر''
ممکن ہے یہ تشبیہ تیزی میں ہو یا آسانی میں اور ممکن ہے دونوں میں [۱] ہو۔ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ (روم: ۲۷)

''وہی ہے جو ابتدا میں خلق کرتا ہے اور پھر پلٹائے گا اور یہ کام خدا کے لیے بہت آسان ہے''
انسانی طاقت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پہلی دفعہ خلق کی نسبت اعادہ آسان ہے کیونکہ پہلی دفعہ خلق کرنا عدمِ مطلق (جب کچھ بھی نہ تھا) سے وجود میں لانا ہے اور اعادہ مادۂ موجود کو ضائع شدہ صورت میں واپس لانا ہے لیکن خدا کی قدرت کے لحاظ سے آسان و دشوار، بھاری، ہلکا اور بڑا چھوٹا سب برابر ہیں اور اس کے لئے کوئی کام دشوار نہیں ہے۔[۲]

آٹھواں شبہ

موت انسان کے لیے فنائے مطلق

وہ کہتے ہیں کہ معاد کے معنی تو قیامت کے دن لوٹ کر آنے کے ہیں جب کہ مرنے سے انسان مکمل طور پر فنا ہو جاتا ہے بنا بریں انسان ہی وجود نہیں رکھتا تو لوٹ کر کون آئے گا۔

---

[۱] بعض دوسری آیات میں بھی دو پہلوؤں سے یہی مضمون نظر آتا ہے۔سورہ صافات آیت ۱۹ میں منکرین معاد کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے: فانما ھی زجرۃ واحدۃ یعنی سوائے اس کے نہیں کہ یہ (معاد) ایک آواز ہوگی۔یہی مضمون سورہ نازعات کی آیت ۱۳ میں بھی پایا جاتا ہے۔

[۲] امیر المومنین علیہ السلام اس بارہ میں فرماتے ہیں: وما الجلیل واللطیف، والثقیل والخفیف واتوی والضعیف فی خلقه الاسواء (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۰) بڑا اور چھوٹا، بھاری اور ہلکا قوی اور کمزوری خلقت کے اعتبار سے اس (اللہ تعالیٰ کے لیے برابر ہیں۔

قرآن میں اس طرح ہے:

تَشۡكُرُوۡنَ ۝٩ وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ؕ

(سجدۃ:۱۰)

''اورانہوں نے کہا: جب ہم زمین میں گم اور نابود ہو گئے تو کیا نئے سرے سے خلق کیے جائیں گے؟''

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں ایک دوسرے شبہ کی طرف اشارہ ہو جو ہم ابھی بیان کریں گے۔

نواں شبہ

اس دو قسم کی خلقت میں کوئی رابطہ نہیں

وہ کہتے انسان موت کے ذریعے فنا ہو جاتا ہے اور فرضاً دوبارہ خلق ہونے کو مان بھی لیں تو اس نئی خلقت کا پہلی خلقت سے کوئی ربط نہیں ہوگا اور یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معاد والا انسان وہی دنیوی انسان ہے اور دونوں ایک ہی ہیں۔ اوپر آیت میں جملہ ''ضللنا فی الارض'' جس کے معنی زمین میں بکھر جانے کے ہیں، یہ ممکن ہے اس بات کو بیان کر رہا ہو کہ (اُن کے نزدیک) مرنے سے انسان کی شخصیت و واقعیت مخل ہو کر رہ جائے گی۔

جو جواب قرآن نے دیا ہے وہ ان دونوں شبہات کا جواب ہو سکتا ہے۔ قرآن جواب میں کہتا ہے:

انسان روح و بدن سے مرکب ہے اور انسان کی واقعیت وحقیقت اس کی روح ہی ہے جس میں تمام وجود کی خصوصیات تحقق پاتی ہیں اور موت کے وقت یہی واقعیت فرشتۂ موت کے ذریعے لی جاتی ہے اور بغیر کسی کمی کے یہ باقی رہتی ہے اور ظاہراً جو چیز فنا اور نابود ہوتی ہے وہ انسان کا بدن ہے۔ یہ بدن روح کے لے وسیلہ اور آلہ کی مانند ہے قیامت کے دن جسم کے متفرق اجزا اکٹھے ہو کر دوبارہ جسم کی صورت اختیار کر لیں گے اور وہ واقعیت جو محفوظ ہے اس بدن میں واپس آ جائے گی اور انسان زندہ ہو جائے گا۔ گویا اس صورت میں انسان فنا ہی نہیں ہوا کہ آٹھواں یا نواں شبہ پیش آئے۔ قرآن کی عبارت یوں ہے:

قُلۡ یَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ۝١١

(سجدۃ:۱۱)

''کہہ دو کہ فرشتۂ موت تمہیں لے لے گا جو تمہاری روح قبض کرنے پر متعین ہے۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے''

آیت سے یہ جواب تبھی سمجھ آ سکتا ہے کہ جب ''توفی'' کے معنی صحیح طور پر سمجھ آ جائیں۔ ''توفی'' کے معنی مرنے یا مارنے کے نہیں

ہیں بلکہ اخذ کرنے اور لینے کے ہیں۔ دوسری آیات میں اس معنی پر شاہد ہیں اور آئندہ بحثوں میں یہ جواب مفصلاً بیان کیا جائے گا۔

دسواں شبہ

منتشر اجزا نا قابل شناخت ہیں

موت سے انسان کا بدن فنا ہو جاتا ہے اور اس دنیا کے دوسرے بے شمار ذروں میں اس کا بدن بھی ذرہ ذرہ ہو کر مل جاتا ہے۔ پھر اس پر صدیاں گزرنے سے وہ ذرات دوسرے انسانوں کے ذرات یا بقیہ ذرات میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان کا پہچان لینا ناممکن کام ہے ایسی صورت میں معادِ انسانی کیونکر ہے؟

جواب: یہ شبہ درحقیقت علم خدا کی وسعت سے جہالت کی بنیاد پر ہے۔ اگر وہ خدا کی قدرت کی طرح اس کے علم کی وسعتوں کا اندازہ بھی کر لیتے تو ہرگز ایسا شبہ نہ کرتے۔ قرآن اس شبہ کو جواب کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۳ (سبا: ۳)

”کفار نے کہا: قیامت نہیں آئے گی کہو کیوں نہیں میرے رب کی قسم وہ ضرور آئے گی اور لانے والا وہ رب ہے جو غیب کا عالم ہے اور اس سے ایک ذرہ برابر شے بھی اوجھل نہیں ہو سکتی۔ نہ آسمانوں میں، نہ زمین میں، نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی۔ سب کی سب اشیاء کتاب مبین میں لکھی ہوتی ہیں۔

ایک دوسری آیت میں مسئلہ معاد ذکر کرنے کے بعد لفظ علیم ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدائی طور پر انسان یہ سوچتا ہے کہ یہاں اگر ”علیم“ کے بجائے ”قدیر“ ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ لیکن یہ تصور نا درست ہے کیونکہ خود جواب اعتراض کی نوعیت دیکھ کر ہونا چاہیے۔ مثلاً مذکورہ بالا آیت میں شبہ ذکر تو نہیں ہوا لیکن آیت میں ”عالم الغیب لا یعزب عنه. فی کتاب مبین“ مسئلہ علم خدا وغیرہ کے ذکر سے اعتراض کی نوعیت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے اور بعد میں آنے والی آیت میں بھی بالکل یہی صورت حال ہے کہ جملہ وھو بکل خلق علیم کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اعتراض کیسا تھا۔ آیت یہ ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ۝۷۸ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝۷۹ (یسین: ۷۸، ۷۹)

اس نے ایک مثال پیش کی (ایک بوسیدہ ہڈی لے آیا، اس کو پیس کر اس کے ذرات کو اڑا دیا) اور وہ اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا اور کہا کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا حالانکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ اسے کہہ دو! وہی خدا زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی دفعہ خلق کیا۔ وہ ہر مخلوق کے بارے میں آگاہ ہے۔

اس آیت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بات کرنے والا معاد کو دو چیزوں کی وجہ سے محال سمجھتا تھا:

۱۔ بوسیدہ ہڈیوں کا دوبارہ زندہ کرنا ناممکن کام ہے۔

۲۔ انسانی بدن کے اجزا جو دوسرے اجزا میں مخلوط ہو چکے ہوں ان کا پہچاننا ممکن نہیں۔

قرآن نے پہلی بات کے جواب میں انسان کی پہلی خلقت کو پیش کیا کہ جب پہلی دفعہ خق کرنا ممکن ہے تو دوسری دفعہ بھی ممکن ہوگا۔ دوسری بات کے جواب میں قرآن لفظ "علیم" لایا ہے کہ اس کا علم بہت وسیع ہے لہٰذا ذرات کو پہچاننا اس کے علم کے مقابل کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لحاظ سے یہ آیت اس پہلی آیت جس میں "لا یعزب عنه" استعمال ہوا ہے کے ساتھ مناسبت پیدا کرلے گی۔

یہاں تک منکرین معاد کے دس شبہات کو مختصر ومحکم جوابات کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ یہ شبہات انبیاء کرام کے زمانے میں بیان کیے جاتے تھے اور قرآن نے ذکر کرکے ان کے جوابات دیے ہیں۔ البتہ شبہات دس میں منحصر نہیں ہیں۔ قرآن نے ضمناً کچھ اور شبہات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جو آیات میں دقتِ نظر سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

ان دس شبہات کی مختصر فہرست یہ ہوگی:

۱۔	معاد پر دلیل موجود نہیں ہے	۲۔	عقیدۂ معاد صرف قصہ وافسانہ ہے
۳۔	کذب وجنون	۴۔	معاد صرف جادوگری ہے
۵۔	ہمارے آباء کو زندہ کر دکھائیں۔	٦۔	خارج از قدرت ہے
۷۔	مردوں کا خاک ہونے کے بعد زندہ کرنا مشکل ہے	۸۔	مرگ فناءِ مطلق ہے
۹۔	دو خلقتوں میں کوئی رابطہ نہیں	۱۰۔	منتشر اجزاء ناقابل شناخت ہیں

(۵)

معاد کے امکان پر دلیلیں

شبہات کے تفصیلی جوابات

منکرین معاد کے دس شبہات جو قرآن نے بیان کیے ہیں ذکر ہو چکے۔ اگرچہ قرآن نے شبہات کے ساتھ ہی کسی حد تک ان کے جوابات بھی بیان کر دیئے ہیں لیکن مسئلہ معاد کی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے مختلف سورتوں میں ان کے جوابات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اب ہم ان جوابات کو پیش کریں گے۔

ان دس شبہات میں سے چار شبہات نسبتاً اہمیت رکھتے ہیں اور قرآن نے بھی انہیں خاص اہمیت دی ہے اور دوسرے اعتراضات کے سطحی ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں کی اور وہ چار اعتراض یہ ہیں:

۱۔ معاد قبضۂ قدرت سے خارج ہے

۲۔ خاک شدہ بدنوں کا زندہ ہونا نا قابل یقین ہے

۳۔ منتشر اجزاء نا قابل شناخت ہیں

۴۔ ان دو خلقتوں میں کوئی ربط نہیں

البتہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرا شبہ دوسرے لفظوں میں پہلا شبہ ہی ہے لیکن چونکہ قرآن نے ان دو کو جدا جدا ذکر کیا ہے لہٰذا ہم بھی جدا جدا ذکر کریں گے۔

(الف) معاد قبضہ قدرت سے خارج ہے

منکرین معاد مقام ربوبی کی عظمت سے جہالت کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ دوبارہ اٹھانا اور انسان کا دوبارہ زندہ کرنا قدرت سے باہر ہے یا تو اسے اجتماع نقیضین [1] کی طرح ذاتی طور پر ممکن نہیں سمجھتے تھے یا ذاتاً اسے ممکن سمجھتے تھے، وقوع کے لحاظ سے محال سمجھتے تھے۔ (امکان ذاتی و امکان وقوعی، عدم امکان ذاتی یہ ہے کہ خود موضوع کا تصور اس کے ممنوع ہونے کی حکایت کرے۔ عدم امکان وقوعی میں اس طرح نہیں ہے بلکہ کچھ خارجی امور کی وجہ سے وہ ممکن نہ ہو۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ چونکہ منتشر اجزا نا قابل شناخت ہیں لہٰذا معاد ممکن نہیں۔

---

[1] جیسے وجود و عدم کا باہم جمع ہونا ممکن نہیں (مترجم)

پس اگر قابل شناخت ہوتے تو خود معاد کے امکان میں کوئی کلام نہیں تھا)

قرآن اس شبہ کی رد کے پہلے مرحلے میں خدا کی قدرت اور اس کی سعت کو ذکر کرتا ہے اور دوسرے مرحلے ہیں آسمانوں کی عظیم خلقت کو کہ جو اس کی قدرت کی عظمت پر دلیل میں ذکر کرتا ہے اور تیسرے مرحلے میں انسان کی پہلی خلقت کو معاد کے امکان وقوع پر دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے تا کہ اس طریقے سے اس شبہ کی وجہ سے منکرین معاد کو معاد کی قبولیت کی طرف ہدایت کر سکے۔ ان تین مراحل سے مربوط آیات کچھ یوں ہیں:

۱۔ خدا کی وسیع قدرت

معجزات، کرامات اور غیر عادی امور سے مربوط مسائل کو انسانی قدرت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے بلکہ قدرت خدا کو مدنظر رکھنا چاہیے اور مشرکین کے انکار سے متعلقہ اکثر اشتباہات قدرت خدا کا صحیح تصور نہ ہونے کی وجہ سے تھے۔ قرآن اس قسم کی جہالت کو یوں تعبیر کرتا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ [1] وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؀ (زمر: ۶۷)

"جیسے خدا کے لائق و شائستہ ہے اس طرح انہوں نے خدا کو نہ پہچانا اور قیامت کے دن زمین مکمل اس کے کنٹرول ہوگی اور آسمان اس کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے۔

مسئلہ معاد سے اس آیت کا ارتباط تب واضح ہو سکتا ہے جب معاد سے مربوط بعد والی آیات کا مطالعہ کیا جائے جو کچھ اس طرح ہیں:

"و نفخ فی الصور" اور صور پھونکا جائے گا۔

الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁ (بقرہ: ۱۴۸)

"تم جہاں بھی ہوئے خدا تم سب کو قیامت کے دن لائے گا۔ بتحقیق خدا تمام چیزوں پر قادر ہے"

اور سورہ ہود آیت ۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؃ (ہود: ۴)

"تمہیں خدا کی طرف لوٹ کے جانا ہے اور وہ سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے"

---

[1] "قدر" شان و شائستگی کے معنی میں ہے، قدرت کے معنی میں نہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شائستگی کے ساتھ پہچان اس کی قدرت کی پہچان کے ساتھ مربوط ہے۔

(اس سے مربوط بقیہ آیات یہ ہیں: نحل: ۷۷، عنکبوت: ۲۰، روم: ۵۰، حم سجدہ: ۳۹، شوریٰ: ۹، ۲۹، احقاف: ۲۳ اور حدید: ۲)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ان آیات میں تحقق معاد کی خبر قدرت خدا کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور چونکہ قدرت الٰہی میں کسی قدم کی محدودیت کا تصور ممکن نہیں اور جو چیز بھی قابل تحقق و وجود ہے خدا اس پر قادر ہے۔ مردوں کا زندہ کرنا بھی چونکہ امتناع ذاتی نہیں رکھتا، لہٰذا قدرت خدا کے لحاظ سے اس کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ معاد اور خلقت کا یہ عظیم کارنامہ

جو لوگ معاد کو کارج از قدرت خیال کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اس عظیم کارخانہ خلقت یعنی زمین و آسمان کی خلقت کو ملاحظہ کریں اور پھر ایک انسان کے زندہ کرنے کا اس عظیم کارخانہ خلقت سے موازنہ کریں، یا وہ قدرت جس نے نیلگوں آسمانوں کی یہ چھت بنائی اور زمین کا فرش بچھایا۔ کیا انسان کے زندہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی؟

جیسا کہ ارشاد ہے:

تُوْقِدُوْنَ۝۸۰ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۣ (یٰسین: ۸۱)

''وہ جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا آیا وہ انسانوں کے دوبارہ خلق کرنے پر قادر نہیں؟''

مُّبِيْنٍ۝۳۲ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝۳۳

(احقاف: ۳۳)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جو خدا آسمانوں اور زمین کی خلقت سے عاجز نہ ہو وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۹ بھی اس بارے میں ہے ملاحظہ کیجیے)

۳۔ انسان کی پہلی خلقت

اسلامی فلسفہ میں ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ ''کسی چیز کے امکان پر اس چیز کا واقع ہونا بہترین دلیل ہے'' (ادل دلیل علیٰ امکان الشيء وقوعه)

اسی طرح ایک اور قاعدہ کلیہ ہے کہ ''امثال و مشابہات کا حکم امتناع و امکان میں ایک جیسا ہوتا ہے'' (حکم الامثال فیما یجوز و مالا یجوز واحد)

اس قاعدہ کے مطابق جب خداوند عالم انسان کی پہلی خلقت پر قادر ہے تو اس کی دوسری خلقت پر بھی قادر ہوگا اور اگر قدرت انسان کو مدنظر رکھا جائے تو بلحاظ قاعدہ دوسری خلقت پہلی کی نسبت زیادہ آسان ہونی چاہیے۔ منکرین معاد کو اس سے عبرت حاصل کر کے اپنی بے جا ضد سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا۝۴۹ ... صُدُوۡرِكُمۡ ۚ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ مَنۡ يُّعِيۡدُنَا ؕ قُلِ الَّذِىۡ فَطَرَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (بنی اسرائیل: ۴۹، ۵۱)

''انہوں نے کہا جب ہم ہڈیاں اور خاک بن گئے تو کیا ہمیں دوبارہ خلق کیا جائے گا؟ وہ کہیں گے کون ہمیں پھر لوٹائے گا؟ ان سے کہہ دو وہی جس نے پہلی دفعہ تمہیں خلق کیا''

فَاَوۡلٰى ۝۳۵ اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى ۝۳۶ اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِيٍّ يُّمۡنٰى ۝۳۷ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝۳۸ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى ۝۳۹ اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى ۝۴۰ (قیامت: ۳۶، ۴۰)

''کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے بیکار خلق کیا گیا ہے؟ کیا وہ پلٹی ہوئی منی کا ایک قطرہ نہیں تھا؟ پھر اسے خون کے لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر اسے خلق کیا اور تزئین دی اور اس سے نر و مادہ کا جوڑا بنایا۔ کیا (ان کا خالق خدا) مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں؟''

(اس سے مربوط سورہ یٰسین کی آیت ۷۹ اور طارق ۵ تا ۸ بھی ہیں)

(ب) دوسرا شبہ

معاد اور بوسیدہ بدن

آیات کی طرف رجوع کرنے سے خصوصاً جن آیات میں لفظ ''عظام'' (ہڈیاں) استعمال ہوا ہے معلوم ہو جاتا ہے کہ منکرین اس شبہ پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ جب ہم خاک اور ہڈیوں میں تبدیل ہو گئے تو کیسے دوبارہ زندہ ہو سکیں گے۔ ان کا یہ اعتراض بہت سی آیات میں وارد ہوا ہے مثلاً سورہ یٰسین ۷۸، بنی اسرائیل ۴۹، ۹۸، مومنون ۳۵، ۸۲، صافات ۱۶، ۵۳، واقعہ ۷، ۱۱۔ قیامت: ۳۔

اس شبہ کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بوسیدہ اور خاک شدہ بدنوں کا زندہ کرنا خارج از قدرت ہے۔

۲۔ ان بدنوں کا زندہ کرنا نا قابل یقین واقعہ ہے اور بعید ہے۔

پہلی صورت اسی پہلے شبہ کی طرف لوٹتی ہے کہ جس کا تفصیلاً جواب قرآنی آیات کی صورت میں پیش کیا جا چکا ہے۔

البتہ دوسری ایک جداگانہ ہے اور اس بارے میں ایسی آیات نازل ہوئی ہیں جنھوں نے اعتراض و جواب ہر دو کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے کچھ آیات اس طرح ہیں:

خَاشِعَةٌ ﴿٩﴾ يَقُولُونَ ءَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿١٠﴾ ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿١١﴾ (نازعات: ۱۰، ۱۱)

''وہ کہتے ہیں کیا ہم مرنے کے بعد پھر لوٹائے جائیں گے؟ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے''

کسی چیز کے آغاز کو حافرہ کہتے ہیں: ''الحافرۃ اسم الاول الامر ومنہ رجع فلان حافرتہ''

۲۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا ءَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ﴿٦٧﴾ (نمل: ٦٧)

''کفار نے کہا: جب ہم اور ہمارے آبا و اجداد خاک ہو گئے تو کیا ہمیں زمین سے نکالا جائے گا (یعنی کیا ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا)؟''[1]

قرآن کا جواب

قرآن اپنی فصاحت و بلاغت اور ہدایت کے معجزہ ہونے کے لحاظ سے ہر ایک شبہ کا مناسب ترین جواب دیتا ہے۔ اس لیے اس شبہ کا بھی قرآن دو طرح کا جواب دیتا ہے تا کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے اور راہروان حقیقت کے لیے جادۂ ہدایت روشن ہو جائے۔ دونوں جواب یہ ہیں: (۱) انسان مٹی سے خلق کیا گیا ہے۔ (۲) پودے اور گھاس وغیرہ اسی مردہ خاک سے زندہ ہوتے ہیں۔

قرآن پہلے انسان کو اس نکتے کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ خلقت و حیات کی ابتدا اس مردہ مٹی سے ہوتی ہے۔ خدا کی حکمت، تدبیر اور قدرت کے صدقے یہ خاک ایک انتہائی اسرار آمیز اور تعجب انگیز زندہ موجود کی صورت میں ظاہری ہوتی ہے۔ بنا بریں بوسیدہ اور خاک شدہ بدنوں کے زندہ ہونے کا سن کر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے اس امر کو کیوں خدا سے بعید اور نا قابل یقین شمار کرتے ہو۔ اس کے علاوہ سب لوگ اپنی پوری زندگی پودے، درخت، پھول اور گھاس اگنے کے ذریعے زندگی کو مردہ خاک سے نمودار ہوتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں ہو زمین ایک ٹھہراؤ کے بعد اور مردگی کی حالت کے بعد دوبارہ زندہ ہوتی ہے اور درختوں اور پودوں کو اپنے دامن میں پروان چڑھاتی ہے۔

---

[1] اس بارہ میں مریم ٦٦، حقاف: ۱۷ اور صافات: ۱٦ کی طرف رجوع کریں۔

اس صورت حال کا مشاہدہ کرنے کے باوجود معاد کا انکار اس وجہ سے کرنا کہ خاک بننے کے بعد زندہ ہونا نا قابل یقین ہے، یہ سب انکار باطل بے جا اور واقعیت سے دور ہے۔ ان دو جوابات سے مربوط آیات کچھ اس طرح ہیں:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ شَيْئًا ط وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۞ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۞ (حج ۵:۷)

''اے لوگو! اگر تمہیں قیامت کے بارے میں شک ہے تو بتحقیق ہم نے تمہیں مٹی سے خلق کیا۔ تم زمین کو خشک دیکھتے ہو۔ جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو یہ حرکت کرے گی اور اوپر آئے گی اور ہر جفت سے پودے اُگائے گی۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا حق ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور بلا شک قیامت آنے والی ہے اور بتحقیق خدا قبروں سے مردوں کو اٹھائے گا''۔

یہ آیت ابتدا میں منکرین کے شک کو بیان کرتی ہے اس کے بعد اس شک کو ختم کرنے کے لیے عالم ہستی میں خدا کی دو سنتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ خود انسان کے مبداءِ حیات کو ذکر کرتی ہے کہ ہم نے تمہیں خاک سے خلق کیا ہے۔(فانا خلقنو کم من تراب)

۲۔ انہیں زمین کی حیات اور پودوں، پھولوں اور درختوں کی پرورش کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ خشک اور مردہ زمین بارش برسنے کے بعد حرکت کرتی ہے اور مختلف قسم کے پودے اُگاتی ہے۔(و تری الارض ھامدة)

اس کے بعد ان دونوں (انسان کی خاک سے خلقت اور پودوں کا خاک سے اگنا) کے فاعل کو بیان کرتی ہے کہ یہ اس لیے ہوا ہے چونکہ خدا حق ہے(ذالك بان الله هو الحق) اور وہی ہے زندہ کرنے والا اور مردوں کو زندگی دینے والا(وانه يحي الموتى) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے(وانه على كل شيئٍ قدير)

اس کے بعد نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ یہ سنت الٰہی جو ہمیشہ سے اس دنیا میں جاری ہے، قیامت کے امکان و تحقق پر دلیل ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

و ان الساعة اتية لا ريب فيها و ان الله يبعث من فی ال[1] قب

قرآن نے متعدد آیات میں زمین کی حیات مستمر کو تحقق معاد اور شبہ منکرین کے ابطال پر واضح ترین دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی چیز قرآن کے معجزہ ہونے پر شاہد ہے کہ وہ انسانوں کو ہدایت کرنے اور سوئے ہوئے افکار کو بیدار کرنے کے لیے انتہائی روشن اور واضح نمونوں سے استفادہ کرتا ہے جیسا کہ خداشناسی کے باب میں بھی مسلسل انسان کو ''انفس'' اور ''آفاق'' میں آیات تکوینی کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ معاد کے مسئلے میں بھی قرآن کا زیادہ اصرار و مطلب کے بیان پر ہے، ایک تو یہ کہ خدا کی وسیع قدرت؛ اس کی قدرت کے عظیم آثار اور زمین و آسمان کی انوکھی خلقت پر توجہ کرنا۔ اور دوسرا خود حیات انسانی میں قیامت کے نمونوں کا پایا جانا جیسے مردہ خاک کا موجودات زندہ میں تبدیل ہو جانا۔ اس ضمن میں مذکورہ آیات کے علاوہ کچھ اور آیات بھی ہیں جو اس مطلب کو بیان کرتی ہیں ان میں سے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ (اعراف: ۵۷)

''وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اس حال میں کہ وہ رحمت خدا کی خوش خبری دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوائیں اپنے دوش پہ گہرے بادلوں کو اٹھالاتی ہیں۔ ہم انہیں مردہ سرزمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے وہاں پانی نازل کرتے ہیں جس کے ذریعے ہم زمین سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو بھی زمین سے نکالیں گے۔ (یہ اس لیے کہا گیا ہے) تاکہ تمہیں قیامت کی یاد دلائی جائے۔

۲۔ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾ (زخرف: ۱۱)

''خدا وہ ہے جو آسمان سے معین مقدار میں پانی اتارتا ہے جس کے ذریعے ہم (خدا) مردہ زمینوں کو زندہ کرتے ہیں۔ تم بھی قیامت میں اسی طرح زمین سے نکالے جاؤ گے''۔

---

[1] سورہ طہٰ کی آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے: "منها خلقنا کم و فیها نعید کم و منها نخرجکم تارةً اخری"۔ ''ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اُسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور ایک بار پھر اسی میں سے تمہیں باہر نکالیں گے''۔ اس آیت سے بھی ایک طرح اس شبہ کا جواب ملتا ہے۔

(ج) تیسرا شبہ

معاد اور خداوند عالم کا علم

منکرین معاد کا تیسرا اہم شبہ علم خدا کے متعلق ہے۔حقیقت علم خدا سے جہالت کی وجہ سے وہ لوگ معاد کو غیر ممکن اور مافوق العادۃ سمجھتے ہوئے ناقابل یقین امر شمار کرتے تھے۔اس طرح مسئلہ معاد اور علم الٰہی دو لحاظ سے ان کے مدنظر تھا:

۱۔ منتشر اور مخلوط اجزا کا پہچاننا

۲۔ تمام لوگوں کے مختلف اعمال کا حساب و کتاب

یہ بات انتہائی واضح اور ناقابل تردید ہے کہ ان دو امور سے عہدہ برآ ہونا بشر کی قدرت سے باہر ہے چاہے اس میں جتنی استعداد و حافظہ قوی ہو اور جدید ٹیکنالوجی چاہے جتنی ترقی کر جائے۔اسی چیز کے پیش نظر وہ لوگ کہتے تھے کہ معاد کا متحقق ہونا ناقابل یقین ہی نہیں بلکہ ناقابل امکان ہے۔ان کا شبہ اس طرح سے ہے۔

۱۔علم خدا اور اجزا کی صورت میں بکھرے ہوئے بدن

اس بارے میں کچھ آیات سابقاً شبہات کے بیان میں ذکر ہو چکی ہیں مثلاً رو:۹،ق:۱۱،فاطر:۹۔یہاں پر صرف ایک آیت نقل کرنے پہ اکتفا کیں گے جو وہاں ذکر نہیں ہوئی:

ءَاِذَا مِتۡنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجۡعٌۢ بَعِيۡدٌ﴿۳﴾(ق:۳)

”کیا جب ہم مر گئے اور مٹی میں تبدیل ہو گئے تو ہمارا دوبارہ زندہ ہونا بہت بعید ہے“

اگرچہ اس آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ وہ معاد کے وقوع کو کیوں بعید سمجھتے تھے۔لیکن بعد والی آیت جو ان کے اس شبہ کے جواب کو بیان کر رہی ہے اسی کے ضمن میں ان کے انکار کی علت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا یہ انکار بھی درحقیقت علم الٰہی سے جہالت کی وجہ سے تھا۔

قد علمنا ما تنقص الارض منھم و عندنا کتاب حفیظٌ

”اور بے شک ہم جانتے ہیں اس کو جو کچھ زمین ان سے کم کرتی ہے اور ہمارے ہی پاس محفوظ رکھنے والی کتاب ہے“

۲۔علم خدا اور بندوں کا حساب

منکرین معاد کا ایک گروہ اگر اس وجہ سے معاد کو بعید شمار کرتا تھا کہ مردوں کے بکھرے ہوئے اجزا ناقابل شناخت ہیں تو دوسرا گروہ

اس وجہ سے منکر تھا کہ تمام بندوں کے اعمال کا حساب و کتاب رکھنا ناممکن کام ہے اور علم خدا اس کے لیے کافی نہیں۔ قرآن ان کے جواب میں اس طرح فرماتا ہے:

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

(لقمان:۲۸)

''تم سب لوگوں کا پیدا کرنا اور پھر دوبارہ زندہ کرنا نہیں ہے مگر صرف ایک انسان کے زندہ کرنے اور پیدا کرنے کی مانند، بتحقیق خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے''

اگر چہ آیت کے سرسری مطالعے سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت قدرت خدا کو بیان کر رہی ہے کہ ایک انسان کا خلق کرنا یا زندہ کرنا اور تمام لوگوں کا خلق کرنا و زندہ کرنا خدا کی قدرت کے سامنے مساوی ہے، لیکن آیت کا آخری حصہ وضاحت کے ساتھ دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت شبہ علم کے واجب سے مربوط ہے کیونکہ کہا ہے ''ان اللہ سمیع بصیر''یعنی وہ بندوں کے تمام اعمال کو مکمل طور پر جانتا ہے، سب چیزیں چاہے سننے سے تعلق رکھتی ہوں یا دیکھنے سے اس کے حضور حاضر ہیں۔ اس لحاظ سے بندوں کے اعمال کا حساب رکھنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے بعینہٖ یہی جواب حضرت موسیؑ کی فرعون کے ساتھ گفتگو میں بھی موجود ہے۔ حضرت موسیؑ فرعون کو تہدید کرتے ہیں کہ جو لوگ انبیا کی تکذیب کرتے ہیں ان کے لیے انتہائی دردناک عذاب ہے۔ اسی طرح عذاب ان کے لیے بھی ہے جنہوں نے انبیاء سے منہ موڑ لیا ہو۔

اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ (طٰہٰ:۴۸)

یہاں پر فرعون ایک سوال کرتا ہے جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ (طٰہٰ:۵۱)

''سابقہ امتوں کی سرگزشت کیا ہوگی؟''

یہ ایک مجمل سا سوال ہے لیکن حضرت موسیٰؑ کے جواب سے سوال کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے سوال کا مفہوم اس طرح تھا کہ اتنی کثرت سے جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں حساب کے لحاظ سے ان کی حالت کا کس طرح تعین کیا جائے گا؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ (طٰہٰ:۵۲)

''کہا! ان امتوں کے بارے میں علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے میرے پروردگار سے نہ کوئی چیز رہ سکتی ہے اور نہ اس کا بھولنا ممکن ہے''

(د) چوتھا شبہ

معاد اور دو خلقتوں میں ربط

منکرین معاد کا آخری شبہ ان دو خلقتوں (پہلی خلقت اور قیامت کے دن کی خلقت) میں رابطہ کا انکار ہے اور یہ کہ انسان کی موت سے اس کی حقیقت و تشخص ختم ہو جاتا ہے، دوبارہ کیسے ممکن ہے کہ بوسیدہ بدنوں کی ترکیب و تنظیم سے اسی انسان کو خلق کیا جائے جو پہلی خلقت میں تھا؟

اگر چہ یہ شبہ اتنی وضاحت کے ساتھ قرآن میں ذکر نہیں ہوا لیکن قرآن نے جو جواب منکرین کو دیا ہے اس سے اس شبہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اجمالاً قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے:

إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ ءَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ (سجدہ:۱۰)

''جب ہم زمین میں گم اور متفرق ہو گئے کیا ہمیں دوبارہ خلق کیا جائے گا؟''

قرآن اس شبہ کے جواب میں دو مطلب بیان کرتا ہے کہ جو جواب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مکمل تفاوت رکھتے ہیں:

بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ (سجدہ:۱۰)

''بلکہ وہ اپنے رب سے ملاقات کا انکار کرتے ہیں''

اس آیت میں ان کے انکار کی اصلی وجہ کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ زمین میں گم ہو جانا اور منتشر ہو جانا صرف ایک بہانہ ہے ورنہ وہ لوگ اول سے معاد کے منکر تھے، اس کے بعد شبہات اور اعتراضات کے درپے ہوئے۔

اس کے بعد قرآن ان کے شبہ کا صحیح علمی جواب بیان کرتا ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱

(سجدہ: ۱۱)

''کہہ دو: فرشتۂ موت جو تمہارے اوپر معین کیا گیا ہے وہ تمہیں پورا پورا لے لے گا اور پھر تمہیں ہماری طرف لوٹایا جائے گا''

اس آیت کے صحیح معانی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے توفی کے معنی پر توجہ کی جائے۔ اس لفظ کے اصلی معنی جیسا کہ لسان العرب ج ۱۵، ص ۹۸ ۳ مادی ''وفی'' میں بیان کیا گیا ہے ''اخذ'' اور ''لینے'' کے ہیں نہ کہ مارنے کے۔ اگر کوئی شخص آیاتِ قرآن کا مطالعہ کرے کہ جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے تو اس کے لیے یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ''توفی'' کے معنی ''اخذ'' کے ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں آیت کے معنی یہ

ہوں گے۔ فرشتہ موت تمہیں لے لیتا اور جان لو کہ تمہاری واقعیت وحقیقت روح ہے کہ جو ہمارے پاس محفوظ ہے اور جو چیزیں زمین میں گم اور منتشر ہوتی ہے وہ تم نہیں ہو بلکہ وہ اس حقیقت (روح) کے لیے آلات کے طور پر ہیں بنا بریں دیکھنا یہ چاہیے کہ ''یتو فاکم'' یعنی تمہیں فرشتہ موت لے لیتا ہے، واقعیت کیا ہے جسے فرشتہ لیتا ہے؟ مسلم ہے کہ وہ واقعیت فلسفی نکتہ نظر سے نفس انسانی اور شریعت کی زبان میں روح انسانی ہے کہ جو خدا کے پاس محفوظ ہے اور معاد میں وہی عنصری جسم کی طرف لوٹا دی جائے گی۔

ایسی صورت میں یہ رابطے والا شبہ کاملاً حال ہو جائے گا کیونکہ دو انسانوں کا وجود نہیں ہے کہ یہ سوال پیش آئے بلکہ ایک واقعیت ہے اور ایک حقیقت ہے جو دو خلقتوں میں عنصری بدن کے ساتھ تدبیری رابطہ برقرار کرتی ہے۔

اگر اس آیت کو مرنے کے بعد انسان کی بقا پر اور تجرد روح پر دلیل کے طور پر پیش کی جائے تو بالکل درست اور حقیقت ہے۔

اب جبکہ قرآن نے اس شبہ کا جواب موت کے بعد بقا روح کے حوالے سے دیا ہے جس کا لازمہ تجرد روح ہے، تو ضروری ہے کہ یہاں کچھ بحث تجرد روح کے ضمن میں بھی کر لی جائے۔

مسئلہ تجرد روح [1]

تجرد روح کو دو طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عقلی اور فلسفی دلائل کی روشنی میں

۲۔ قرآنی دلائل وآیات کی روشنی میں

پہلے ہم فلسفی دلیلوں کو بیان کریں گے تاکہ آیات قرآنی (کہ جو بقا روح پر دلالت کرتی ہیں) کے معانی سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ متعدد فلسفی ادلہ میں سے ہم صرف تین کو بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اگرچہ تجرد روح کو سائنسی اور تجربی طریقوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں ان کے ذکر کی جگہ نہیں ہے۔

---

[1] تجرد روح کا مطلب یہ ہے کہ روح مادی امر نہیں ہے یعنی عناصر سے مرکب کوئی جسم نہیں ہے۔

(۱) پہلی دلیل

ثابت شخصیت اور دگرگوں حوادث

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان ابتدائے زندگی سے آخر تک بدلتے حالات پر مختلف حوادث کا نشانہ بنا رہتا ہے۔لہٰذا بڑھاپے میں اس کی پہچان کے لیے اس کی بچپن کی پہچان پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا چونکہ حوادث کی تاثیر اس کے جسم پر ہوتی ہے اور اس کی شکل بدل جاتی ہے۔لیکن تمام عمر میں ایک چیز ثابت اور قائم رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت و تشخص محفوظ رہتا ہے۔اسے ''میں'' اور عربی میں ''انا'' سے تعبیر کرتے ہیں۔انسان اس کی وجہ سے ہمیشہ اپنے اعضا کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے مثلاً کہتا ہے میرا ہاتھ، میرا پاؤں اور میری زبان۔اسی طرح کاموں کو بھی اپنی طرف نسبت دیتا ہے مثلاً میں نے لکھا میں نے کھایا اور میں نے فلاں کام انجام دیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ شخصیت جو حوادث روزگار میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہے کیا چیز ہے؟

انسان ابتدا میں ایک بیکٹر یا سے تشکیل پاتا ہے اور آخر میں کامل انسان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔بچپن سے موت تک کروڑوں کی تعداد میں بیکٹر یا تبدیل کرتا ہے لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود ہمیشہ ایک چیز ثابت و قائم رہتی ہے کہ جو وہی ''میں'' کی حقیقت ہے۔کہتا ہے میں بچہ تھا، نوجوان تھا، کامل ہوا اور اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔اگر انسان کی واقعیت و حقیقت اس کا یہی جسمانی مادہ ہوتا تو کسی صورت میں ایک ثابت حقیقت باقی نہ رہتی حالانکہ اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی حقیقت مادہ اور بیکٹر یا کو قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان متبدل حالات کے ماورا ایک ثابت حقیقت موجود ہے جو محافظ وحدت ہے اور اجزائے بدن کو اسی کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔اس استدلال کو منطقی صورت میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسان میں ایک ثابت حقیقت بنام ''میں'' پائی جاتی ہے۔

۲۔ انسان کا جسم (بدن، قوائے بدن) ثابت نہیں ہیں۔

ان دو باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ''میں'' انسان کا مادی وجود نہیں ہے۔پس وہ حقیقت غیر مادی ہے۔(یہی مطلوب ہے کہ روح مادی امر نہیں ہے)

(۲) دوسری دلیل

بدن سے غفلت کے باوجود شخصیت کا حضور

آپ فرض کریں ایک شخص ایک بڑے باغ میں لیٹا ہوا ہے۔اس باغ میں بالکل خاموشی ہے۔کوئی چیز اس کی تنہائی میں مخل نہیں ہوتی

مثلاً موسم معتدل ہے، زیادہ گرمی ہے نہ زیادہ سردی، تیز ہوا ہے اور نہ ہی ایسی بادِ نسیم کہ جو درختوں کے پتوں کو ہلا کر اس باغ کو سکوت توڑ دے، بلبل کی آواز اور نہ آبشاروں کا شور زندگی کے شور شرابے سے دور ایسی حالت میں وہ شخص ہر چیز کو بھول کر ہر غم سے دور ہو کر اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے اور اپنی کائنات میں مگن۔ یہ ایسی صورت حال ہے کہ اسے خود اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ ایسے میں وہ شخص بالکل خود فراموشی کی حالت میں ہے۔ لیکن ایک چیز اس کے لیے حضور رکھتی ہے اور وہ ہے وہی ''میں'' اس مثال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان میں ایک ایسی حقیقت پائی جاتی ہے جو نا قابل فراموش ہے اور ہر حالت میں حاضر رہتی ہے اور یہ حقیقت اعضا و بدن کے علاوہ ہے (اشارات ابن سینا جلد ۲، ص ۲۹۲، طبیعات شفا، ص ۲۸۲)۔ بلکہ اور برہان کے بیان کے لیے اتنی لمبی چوڑی تمہید کی بھی ضرورت نہیں ہے اور مختصر طور پر بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ بسا اوقات متفکر، فلسفی اور سائنسدان حضرات اتنی گہری سوچ میں گم ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کے قریب کوئی اہم واقعہ بھی پیش آ جائے تو انہیں خبر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ صرف ایک چیز سے غافل نہیں ہوتے اور وہ ہے ان کی اپنی علمی و فکری شخصیت اور یہ کہ وہ ایک انسان ہیں جو سوچ کی حالت میں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کے بدن و اعضا کے علاوہ ہے۔

۳۔ تیسری دلیل

شخصیت کا نا قابل تقسیم ہونا

مادہ کی خصوصیات میں قابل تقسیم ہونا ہے۔ آپ چھوٹے سے چھوٹا مادی ذرہ فرض کر لیں۔ وہ اگر چہ حسی طور پر نا قابل تقسیم ہو لیکن عقل کے نزدیک وہ پھر بھی تقسیم کے قابل ہے۔ اس کی مشرقی طرف اس کی مغربی طرف کی غیر ہے اگر چہ اسے تقسیم کرنے کے آلات میسر نہ ہو سکیں۔ اسی وجہ سے فلسفی حضرت ''جزاء لا یتجزی'' (ایسا جز جو تقسیم نہ ہو سکے) کو باطل سمجھتے ہیں کیونکہ جزو جتنا بھی چھوٹا کیوں نہ ہو بال آخر اس کے لیے اوپر، نیچے اور شمال و جنوب فرض کیے جا سکتے ہیں۔ اگر فزکس میں جزء لا یتجزی کی بات کی بھی جاتی ہے تو مراد یہی ہے کہ وہ حسی طور پر نا قابل تقسیم ہے، ورنہ عقلی لحاظ سے کوئی ایسا مادی وجود نہیں ہے جو نا قابل تقسیم ہو۔ پس ہر مادی وجود قابل تجزیہ و تقسیم ہے۔ لیکن انسان اپنے اندر ایک ایسی حقیقت کو پاتا ہے جو کسی قسم کی تقسیم کو قبول نہیں کرتی اور اسے دو حصے کرنا کسی عقل و فکر کے لیے ممکن نہیں اور یہ حقیقت انسان کی شخصیت ہی ہے جسے فارسی میں ''من'' اور عربی میں "انا" [1] کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ایک بسیط اور نا قابل تقسیم شے ہے۔ اگر یہ حقیقت مادی ہوتی تو یہ بسیط و نا قابل تقسیم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ واقعیت جسے فلسفے میں نفس اور شریعت میں روح کہا جاتا ہے نہ امر مادی ہے اور نہ ہی آثارِ مادہ رکھتی ہے۔

یہ تین فلسفی و عقلی دلیلیں تھیں جن کے ذریعے انسان کی واقعیت (روح) کو مجرد از مادہ ثابت کیا گیا ہے، اگر چہ اس مورد میں تجرد روح

---

[1] اور اُردو میں ''میں'' (مترجم)

پراور بھی متعدد ادلہ موجود ہیں، مطالعے کے لیے ان کتب کی طرف مراجعہ کیا جا سکتا ہے۔

اسفار جلد ۹ باب ۲ فصل براہین تجرد روح اشارات جلد ۲ ص ۳۶۸ تا ۳۷۱، اصولِ فلسفہ جلد ۱ مقالہ ۳

قرآن اور تجرد روح

ابھی تک تجرد روح پر عقلی لحاظ سے ادلہ پیش کی گئیں اور اب اس مسئلہ کی تحقیق نقلی نکتہ نظر سے کریں گے اس مورد میں متعدد آیات ہیں جن میں سے چند ایک ذکر کی جاتی ہیں:

اس بارے میں آیات قرآن کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ آیات جو صریحاً تجرد روح کو ثابت کرتی ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو اجمالاً تجرد روح کو ثابت کرتی ہیں۔

پہلی قسم کی آیات

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ (زمر: ۴۲)

''خدا جانوں کو موت کے وقت اور نیند کے وقت پوری طرح لے لیتا ہے پھر جس کی موت کا وقت ہو چکا ہو اسے روک لیتا ہے اور دوسری کو ایک معین مدت کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور اس میں فکر رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں''

چونکہ ''توفی'' کے معنی ''پوری طرح لینے'' کے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ موت اور نیند کے وقت جسے خداوند عالم لے لیتا ہے وہ جسم کے علاوہ ایک واقعیت ہے۔ اگر انسان کی شخصیت اس کا خارجی و مادی بدن ہوتا تو ''اخذ'' ''امساک'' اور ''ارسال'' جیسے لفظوں کا استعمال کرنا کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا تھا۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (آل عمران: ۱۶۹)

''جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے ہوں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں''۔

سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ کی طرح اس آیت میں صریحاً شہدائے راہ حق کو حقیقتاً زندہ کہا گیا ہے اور اس لیے کہ سطحی فکر والے لوگ ان کی اس حیات کا مطلب حیات اجتماعی نہ لیں اور یہ نہ کہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا نام اور ان کی یاد معاشرے میں زندہ ہے اس آیت نے یا دوسری آیات نے ان کی زندگی کے کچھ ایسے آثار ذکر کر دیئے ہیں جو حقیقی زندگی کے ہوتے ہیں مثلاً "یرزقون"، "فرحین" (خوش وخرم ہیں) "یستبشرون" (انہیں بشارت دی جاتی ہے۔ یہ تینوں ایسی صفات ہیں کہ جو حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا شہدا کی زندگی کو صرف حیات اجتماعی سے تعبیر کر دینا واقع اور حقیقت سے بہت دور ہے کیونکہ اس قسم کی زندگی ہر قوم وملت حتیٰ کہ مادی حضرات کے درمیان بھی موجود ہے مثلاً مارکسسٹ حضرات بھی مارکس کی راہ میں مارنے جانے والوں کو شہید کہتے ہیں۔ اس باب میں شہیدانِ راہ حق کو کیا خصوصیت حاصل ہے لہٰذا ان کی زندگی سے مراد حقیقی زندگی ہوگی۔

۳۔ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

(مومن: ۴۵۔ ۴۶)

''آل عمران فرعون کو سخت اور برے عذاب نے جکڑ لیا۔ انہیں صبح اور شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت برپا ہوگی حکم ہوگا: انہیں سخت ترین عذاب میں داخل کردو''

اس آیت میں ہماری بحث جملہ "النار یعر ضون علیہا" کے بارے میں ہے جس کے معنی آگ پر پیش کرنے کے ہیں اور چونکہ یہ جملہ "و یوم تقوم الساعۃ" (قیامت برپا ہوگی کے مقابل میں ہے لہٰذا اس پیش کرنے کا مطلب موت اور قیامت کے درمیان والا جہان ہے۔ اگر حقیقت انسان اس کا یہی بدن ہوتا تو دوسرے انسانوں کی طرح آل فرعون کے بدن بھی کچھ مدت کے بعد بوسیدہ ہو کر ختم ہو جانے والے تھے، پھر یہ کہنے کا مطلب کیا ہے کہ انہیں صبح اور شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم میں روح ایک مثالی قالب میں زندگی بسر کرتی ہے، وہاں عذاب اور آگ پر پیش کرنا ممکن ہے، اور یہ زندگی برزخی زندگی ہے جس کے متعلق بحث آئندہ صفحات میں ہوگی۔

۴۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ (انعام: ۹۳)

''اگر تم دیکھو کہ جب ظالم موت کی سختیوں میں غلطاں ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے (کہتے ہیں) اپنی جانوں کو باہر نکالو آج تمہیں خدا کے بارے میں باطل گوئی اور آیات خدا کے سامنے تکبر

کرنے کی وجہ سے رسوا و خوار کردینے والے عذاب کی سزا دی جائے گی"

اس آیت میں "نفس" سے مراد وہی ہے جو اس پہلی آیت میں "نفس" سے مراد ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر: ۴۲)

آیت میں گویا ملائکہ ظالمین کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اپنی جانوں کو چھوڑ دو۔اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظالم ایک بدن رکھتے ہیں اور ایک "نفس" اور ان کا بدن ان کے خاندان کے پاس رہ جاتا ہے اور جان و نفس اس سے نکل جاتی ہے۔ اگر انسان کی حقیقت مادی وجود ہی ہوتا تو چھوڑ دینا اور خارج ہونے کے کوئی معنی نہیں تھے۔اس کے علاوہ آیت میں ہے "الیوم تجزون عذاب الھون" (آج خوار کردینے والے عذاب سے جزا دیئے جاؤ گے) اس آیت کا ظہور یہ ہے کہ جانیں نکالے جانے کے بعد عذاب سے دوچار ہوں گی اور یہ کہنا کہ اس عذاب سے مراد قبض روح ہے۔اس کے لیے قطعی قرینہ کی ضرورت ہے (جو موجود نہیں ہے)

۵۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے دو حواریوں کو انطاکیہ بھیجا تاکہ انہیں خدا پرستی کی دعوت دیں جس کے جواب میں وہاں کے لوگوں نے مخالفت کا اظہار کیا لیکن ان میں سے ایک شخص بنام "حبیب ابن نجار" حواریوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور نتیجتاً بت پرستوں کو خود سے ناراض کر بیٹھا اور وہ اس پر چڑھ دوڑے۔اس نے یوں جواب دیا:

انی امنت بربکم فاسمعون

"اے مسیحؑ کے رسولو! سن لو (گواہ رہنا) میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں"

یہ بات کہنے کے بعد وہ قتل ہوگیا۔قرآن نے کہا ہے کہ اسے "عالم غیب" سے خطاب ہوا: "قیل ادخل الجنة" کہ جنت میں داخل ہوجاؤ۔اس نے اس غیبی خطاب کے سننے کے بعد کہا:

قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷

(یٰسین: ۲۶، ۲۷)

"کاش! میری قوم کو پتہ چل جاتا اس کے بارے میں کہ خدا نے مجھے بخش دیا ہے اور مجھے باکرامت افراد میں سے قرار دیا ہے"۔

یہ بات مسلم ہے کہ اس آیت میں جنت سے مراد "جنت الخلد" نہیں ہے کیونکہ آیات سے یہ بات ثابت ہے کہ موت اور قیامت کے درمیان ایک برزخ حائل ہے۔پس اس جنت سے مراد بھی ایک اور جنت ہے جسے روایات میں "برزخی جنت" کہا گیا ہے۔اس آیت میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اسے خطاب ہوتا ہے "جنت میں داخل ہوجاؤ" یہ خطاب کسے ہوا ہے؟ بدن مخاطب ہے یا کوئی اور چیز؟ واضح ہے کہ بدن نہیں ہوسکتا چونکہ بدن تو مٹی کے نیچے چلا جائے گا۔پس طبعی طور پر ایک اور واقعیت ہے کہ جو جنت میں وارد ہورہی ہے اور وہ واقعیت کلام بھی کرتی ہی، اپنی مغفرت و مرامت کی خبر بھی دیتی ہے۔

اگر کوئی یہ تصور کرے کہ یہاں پر مراد یہ ہے کہ برزخ کا وقت گزار کر جنت الخلد میں وارد ہو جاؤ تو یہ آیت کی صراحت کے سراسر منافی ہے اور اگر اس قسم کی تاویلات کا دروازہ آیات میں کھول دیا جائے تو پھر قرآن سے استفادہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر آیت کی تعبیر "ادخل الجنة" ہے نہ "البشر بالجنة"۔ (تمہیں جنت کی بشارت ہو)

۲۔ جہاں پر قرآن "طوفانِ نوحؑ" اور آنجناب کی امت کے غرق ہونے کی خبر دیتا ہے وہاں قرآن نے بتایا ہے کہ ان کے غرق ہونے کی وجہ ان کے گناہ تھے اور اس کے بعد وہ جہنم میں وارد ہوئے۔ قرآن کی تعبیر یہ ہے:

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ (نوح: ۲۵)

"اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ غرق کر دیئے گئے اس کے بعد وہ جہنم میں داخل کر دیئے گئے اور انہوں نے خدا کے علاوہ کسی کو اپنا مددگار نہ پایا"

یہاں بھی استدلال کی صورت سابقہ آیت جیسی ہے کہ یہاں پر بھی مراد جہنم سے اخروی جہنم نہیں ہے طبعی طور پر برزخی جہنم مراد ہوگی۔ اس آیت کا مفہوم آل فرعون والی تیسری آیت کا سا ہے۔

۳۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ: ۱۱)

"کہہ دو تمہیں وہ فرشتہ موت پورا پورا لے لے گا جو تمہاری جانوں کے قبض کرنے پر متعین ہے"

یہ آیت قطعی اور واضح جواب ہے منکرین معاد کے اس گروہ کے لیے جو موت کو انسان کے لیے بالکل فنا شمار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موت کے بعد کوئی چیز ہی نہیں بچتی کہ اسے زندہ کیا جائے اور بالفرض قیامت میں انسان زندہ بھی ہوا تو اس کا پہلے والے انسان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا"

قرآن پہلے اس شبہ کو بیان فرماتا ہے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ (سجدہ: ۱۰)

"اور انہوں نے کہا: جب ہم زمین میں گم ہو گئے تو کیا ہمیں دوبارہ خلق کیا جائے گا؟"

اس کے بعد قرآن اُس مندرجہ بالا آیت کے ذریعے اس شبہ کا یوں جواب دیتا ہے

"اگرچہ مرنے کے بعد تمہارے بدن بوسیدہ اور منتشر ہو جائیں گے لیکن فرشتہ موت تمہیں مکمل طور پر قبضے میں لے لیتا ہے"

اس آیت کے ملاحظہ سے بدونِ شک واضح ہو جاتا ہے کہ بدن کے علاوہ ایک واقعیت ہونی چاہیے تاکہ یہ جواب منکرین کے شبہ کو دور کر سکے کیونکہ "شبہ بدن کے بوسیدہ اور زمین میں بکھر جانے کے بارے میں ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت اور ناقابل انکار امر۔ بنابریں ایک اور

واقعیت بدن کے علاوہ موجود ہونی چاہیے جو بغیر کسی تبدیلی اور نقصان کے محفوظ رہ سکے۔
یہاں تک ان آیات کو ذکر کیا گیا ہے جو صریحاً مطلوب کو بیان کرتی ہیں اور اب ہم اُن آیات کو بیان کرتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طریقہ سے ''تجردروح'' اور ''بقا بعد از موت'' کو بیان کیا گیا ہے۔

۸۔ قرآن انسان کی نطفہ سے ہڈی اور گوشت بننے کی خلقت کو ''خلق'' اور ''جعل'' کے لفظوں سے بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (مومنون: ۱۲)

''اور ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے پیدا کیا''

اور بعد والے مرحلہ کی خلقت کو ''انشا'' کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے کہ جو ابداع وایجاد کے معنی میں ہے اور اسے ایک دوسری خلقت سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا آثارِ وجودی کے لحاظ سے گذشتہ مختلف خلقتوں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (مومنون: ۱۴)

''پھر اسے ہم نے دوسری خلقت کے لحاظ سے ایجاد کیا''

خلقت کے پہلے مرحلے کو جو کچھ اس طرح تھے مٹی کے آمیزہ سے خلقت، نطفہ، علقہ، مضغہ اور ہڈیوں پر گوشت کا پیدا ہونا۔ یہ مراحل اگر چہ مختلف ومتفاوت ہیں لیکن سب ایک اصول میں شریک ہیں اور وہ ہے مادہ کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف تکامل۔ لیکن ان کے بعد والا خلقت کا مرحلہ ایسا ہے کہ جہاں پر ابداع وانشا کی بات آ جاتی ہے کہ یہ قطعاً مادہ کا سابقہ خلقتوں والا تکامل نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسری خلقت ہے اور نئی ھویت اور خاص قسم کے آثار والی خلقت ہے۔

بالفاظ دیگر سابقہ مراحل میں خلقت کا تکامل اس جدید مرحلے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے لیکن اس جدید مرحلے میں تکامل کے معنی مادی تکامل نہیں ہے کہ صرف مادہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں تبدیل ہو جائے بلکہ اس مقام پر آ کر مادہ میں ایک ایسی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہاں ایک غیر مادی واقعیت بغیر کسی سابقہ کے ایجاد ہو کر بدن (مادہ) کے ساتھ ہم آہنگی وارتباط پیدا کر لیتی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں پر ابداع وانشا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۹۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ طوفان کی موجوں نے فرعون اس کے پیروکاروں کو گھیر لیا۔ اس موقع پر فرعون نے توبہ کی اور اظہار ایمان کیا، لیکن توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔ اسی لیے اسے خطاب ہوا کہ تم خود تو غرق ہو رہے ہو لیکن تمہارے بے جان جسم کو ہم پانی سے باہر نکال دیں گے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت رہے یوں ارشاد ہوتا ہے:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ (یونس: ۹۲)

''آج ہم تمہارے بدن کو پانی سے نکال دیں گے تاکہ تمہارے بعد آنے والوں کے لیے وہ عبرت کی نشانی رہے''

یہ آیت فرعون کے جسم کے محفوظ رہنے کو بیان کر رہی ہے۔ اس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ دو چیزیں تھیں، ایک کو بچا لیا گیا اور ایک کو عذاب

میں مبتلا کر دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدن انسان کی حقیقت نہیں ہے۔انسان کی واقعیت بدن کے علاوہ ہے۔اسی واقعیت کو قرآن نے خطاب کیا ہے کہ آج ہم تمہارے بدن کو بچا لیں گے۔پس یہ آیت دلیل ہو جائے گی اس بات پر کہ فرعون میں دو واقعیتیں تھیں۔ایک بدن کا جس نے نجات پالی اور ایک دوسرے واقعیت جس پر غضب و عذاب الٰہی واقع ہوا اور یہ فرعون کا نفس و روح ہی ہے[1]۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۝ (اعراف:۷۷تا۷۹)

''(قوم ثمود' نے ناقۂ صالح (کہ جوان کا معجزہ تھا) کہ کونچیں کاٹ دیں اور خدا کے حکم سے سرتابی کی اور کہا! اے صالح! اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کا ہمارے ساتھ وعدہ کر چکے ہو۔پس زلزلے نے انہیں آ لیا اور انہوں نے صبح کی اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے تھے (مر چکے تھے)۔اس وقت صالح نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کی لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔

اس آیت سے دو امر معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ موت کے بعد روح کا باقی رہنا

۲۔ ارواح کے ساتھ انسان کے ارتباط کا ممکن ہو

ان دو مطالب کو جملہ "لقد ابلغتکم رسالۃ ربی" سے استفادہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت صالحؑ نے یہ جملہ انہیں اس وقت کہا جب زلزلے نے انہیں نیست و نابود کر دیا تھا اور بے جان بدنوں کی صورت میں وہ لوگ اپنے گھروں میں پڑے ہوئے تھے کیونکہ یہاں پر آیت کے الفاظ یہ ہیں:

فتولی عنھم و قال یا قوم لقد ابلغتکم

اور ''فتولی'' پر فاء جو کہ (حروفِ عاطفہ میں سے ہے) ترتیب کے معنی کو ادا کرتی ہے، پس آیت کے معنی اس طرح ہوں گے:

''زلزلے کے ذریعے مرنے کے بعد صالحؑ نے ان سے پشت پھیر لی اور وہ جملہ کہا''

---

[1] اگرچہ اس آیت کو ہم نے ان آیات کے ضمن میں نقل کیا جو مطلوب پر صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتیں لیکن علامہ طباطبائی مرحوم کی یہ بات صحیح و حق ہے کہ یہ آیت مطلوب پر صراحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہے۔(تفسیر المیزان جلد ۱۰، ص ۱۲۱)

اس سے زیادہ جاذب توجہ دوسرا جملہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ولکن لا تحبون الناصحین

''یعنی اس حال میں کہ منوں مٹی کے نیچے دب چکے ہو نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو''

۱۱۔ فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ﴿۹۱﴾ فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَقَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ ۚ فَكَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ كٰفِرِیۡنَ(اعراف: ۹۱، ۹۳)

''زلزلے نے قوم شعیب کو آ لیا اور وہ لوگ اپنے گھروں میں ہلاک ہو گئے۔ (ان کی ہلاکت کے بعد) شعیب نے ان سے پشت پھیر لی اور کہا: میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کی۔ پس کیسے میں کافر قوم کی دلجوئی کروں۔

اس آیت میں بھی طرزِ استدلال وہی ہے جو اس سے پہلے والی آیت میں تھا، فرق صرف یہ ہے کہ اس سے پہلے والی آیت میں قوم صالح کا تذکرہ تھا اور اس آیت میں قوم شعیبؑ کا تذکرہ ہے۔

وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً یُّعۡبَدُوۡنَ﴿۴۵﴾ (زخرف: ۴۵)

''اپنے سے پہلے آنے والے پیغمبروں سے پوچھو کہ آیا ہم نے رحمن کے علاوہ معبود بنائے ہیں کہ جن کی عبادت کی جائے؟''

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایک پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے پیغمبروں سے سوال کرے۔ وہ دوسرے پیغمبر اس دنیا میں موجود تھے یا عالم آخرت میں تھے؟ اس آیت سے بھی وہی دو امور (۱۔ بقائے روح، ۲۔ ارتباط با ارواح) اخذ کیے جا سکتے ہیں جو اس سے پہلی دو آیات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

وہ پیغمبر گذشتہ انبیا سے تمام شریعتوں کے مشترک اصول یعنی توحید کے بارے میں سوال کر سکتا ہے اور مندرجہ ذیل آیت اسی اصول مسلم (توحید کو بیان کر رہی ہے:

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ (نحل: ۳۶)

''ہم نے ہر امت کے لیے رسول بھیجا تا کہ وہ سب کہیں: خدا کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے

اجتناب کرو‘‘

ظاہراً اس آیت کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔

البتہ اُس آیت ’’وسئل میں دو اور احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں جنہیں مرحوم طبرسی (صاحب تفسیر مجمع البیان) نے ذکر کیا ہے۔

احتمال اوّل

کہ سوال و جواب گذشتہ انبیا کے پیروکاروں سے متعلق ہے بنابریں آیت کے معنی یہ ہوں گے: ’’وَسئَل اتباع من ارسلنا‘‘ انبیا کے پیروکاروں سے سوال کرو۔

یعنی آیت میں مضاف (اتباع) کو حذف کر دیا گیا ہے اور مضاف الیہ (من) اس کی جگہ ذکر ہوا ہے اس احتمال کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے۔

احتمال دوم

مخاطب خود پیغمبر اکرمؐ ہیں لیکن یہ آیت شب معراج سے متعلق ہے۔ اس رات سب انبیاء جمع ہوئے اور حضور اکرمؐ نے ان سے ملاقات کی اور گفتگو کی۔

یہاں ہماری نظر یہ ہے کہ یہ دونوں احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہیں اور کسی آیت سے خلاف ظاہر معنی اس وقت مراد لیے جاتے ہیں جب اس خلاف ظاہر معنی پر کوئی قطعی شاہد موجود ہو جبکہ یہاں پر کوئی قطعی شاہد موجود نہیں ہے۔ البتہ دوسرے احتمال کی تائید کچھ روایات سے ہوئی ہے کہ جو شیعہ و سنی کتب میں وارد ہوتی ہیں۔ اگر بالفرض وہ روایات سند کے لحاظ سے اعتبار بھی رکھتی ہوں تب بھی یہ آیت ہمارے مطلب پر دلالت کرتی ہے (یعنی اگر چہ آیت سے وہی معنی مراد لیے جائیں جو دوسرے احتمال میں کیے گئے ہیں) کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ تمام انبیا وفات پا چکے ہیں۔ پس بدن عنصری کے علاوہ بھی وہ ایک واقعیت ہیں کہ حضور اکرمؐ نے شب معراج ان سے ملاقات اور گفتگو کی۔ (مجمع البیان جلد ۵، ص ۴۹۔ ۵۰) یہاں ہماری نظریہ ہے کہ یہ دونوں احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہیں اور کسی آیت سے خلاف ظاہر معنی اس وقت مراد لیے جاتے ہیں جب اس خلف ظاہر معنی پر کوئی قطعی شاہد موجود ہو جبکہ یہاں پر کوئی قطعی شاہد موجود نہیں ہے۔ البتہ دوسرے احتمال کی تائید کچھ روایات سے ہوئی ہے کہ جو شیعہ و سنی کتب میں وارد ہوتی ہیں۔ اگر بالفرض وہ روایات سند کے لحاظ سے اعتبار بھی رکھتی ہوں تب بھی یہ آیت ہمارے مطلب پر دلالت کرتی ہے (یعنی اگر چہ آیت سے وہی معنی مراد لیے جائیں جو دوسرے احتمال میں کیے گئے ہیں) کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ تمام انبیا وفات پا چکے ہیں۔ پس بدن عنصری کے علاوہ بھی وہ ایک واقعیت ہیں کہ حضور اکرمؐ نے شب معراج ان سے ملاقات اور گفتگو کی[1]۔

---

[1] منجملہ آیات میں سے جو تجرد و بقائے روح پر دلالت کرتی ہیں سورہ مومنوں کی آیت: ۱۰۰ ہے و من وراءھم برزخ (المیزان جلد ۱۰، ص ۷۲) اور و اللہ خالق الکون ص ۴۳۱ کی طرف رجوع کریں۔

(٦)

مردوں کو زندہ کرنے کے سات نمونے

کسی چیز کے بارے میں انسان کے اذعان ویقین کے تین مرحلے ہیں کہ جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ا۔علم الیقین

جب بھی انسان کو کسی چیز کے بارے میں یقین پیدا ہوا اور اس چیز کے اوصاف وخصوصیات کے بارے میں جان لے جبکہ خود اس چیز یا اس کے آثار میں سے کسی کو اپنے حواس میں سے کسی ایک سے دیکھا نہ ہو تو اس علم کو ''علم الیقین'' کہتے ہیں مثلاً جان لے کہ آگ جل رہی ہے اور گرمی رکھتی ہے لیکن خود آگ کو دیکھا نہ ہو اس کے باوجود اس کے وجود کو مانتا ہو۔

۲۔حق الیقین

یعنی انسان اس مورد نظر چیز کو دیکھ بھی لے مثلاً دیکھ لے کہ آگ جل رہی ہے یہ درجہ پہلے درجے کی نسبت کامل تر ہے کیونکہ پہلے مرحلے میں صرف سننے سے یقین حاصل ہوا تھا جبکہ اس مرحلے میں دیکھنے سے یقین حاصل ہوا ہے اور ''شنیدن کہ بود مانند دیدن'' سننا دیکھنے جیسا کب ہوسکتا ہے''۔

۳۔عین الیقین

کہ انسان کسی چیز کے آثار کو اس کی مناسب حسن کے ساتھ محسوس بھی کرلے مثلاً آگ اس کے سامنے جل رہی ہے اس کی حرارت کا حس لامسہ کے ذریعے ادراک کرلے۔ یہاں اس کا یقین آخری درجے پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کیونکہ بسا اوقات کسی چیز کے بارے میں یقین تو حاصل ہوجاتا ہے اس کے باوجود کچھ سوالات انسان کے ذہن کو پریشان کیے رہتے ہیں لیکن اس تیسرے مرحلے کے یقین یا دوسرے مرحلے کے یقین سے وہ سوالات محدود و نابود ہوجاتے ہیں اگرچہ قرآن نے معاد کو ایک قطعی ویقینی واقعے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ عقل و برہان انسان کو اس کے قبول کرنے کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسے معاد کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے باوجود قرآن نے اس مسلم عقلی حقیقت کو مردے زندہ کرنے کے سات نمونے ذکر کرکے محسوس امر کے طور پر ذکر کیا۔ ہم اس فصل میں ان سات نمونوں کو بیان کریں گے۔

پہلا نمونہ

حضرت ابراہیم اور مردوں کو زندہ کرنا

مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم دریا کے کنارے جا رہے تھے تو ایک مردار کو وہاں پڑے دیکھا جو آدھا پانی میں اور آدھا پانی سے باہر تھا اور پانی اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے۔اس طرح سے اس کے اجزائے بدن (عجیب انداز میں) بکھر رہے تھے یہ منظر دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ مسئلہ قیامت کے بارے میں سوچنے لگے کہ جو انسان مر چکا ہے اور س کے اجزا اس مردار کی طرح بکھر چکے ہیں کیسے دوبارہ زندہ ہوگا۔اس وجہ سے آپ نے خدا سے درخواست کی کہ اجزا کے بکھر جانے کے بعد مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت مجھے دکھائی جائے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عقل و وحی کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ وجود قیامت سے آگاہ تھے اور اس پر مکمل یقین رکھتے تھے لیکن جیسا کہ سابقاً ذکر ہو چکا ہے بسا اوقات کچھ سوالات اصحاب یقین کے ذہن کو بھی پریشان کیے رہتے ہیں اسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ مردوں کا زندہ ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں تا کہ میرا علم الیقین حق الیقین کی منزل پر پہنچ جائے جو کہ یقین کی آخری منزل ہے۔

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی درخواست اور جواب خدا کو سورہ بقرہ آیت ۲۶۰ میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَـئِنَّ قَلۡبِىۡ ؕ (سورہ بقرہ: ۲۶۰)

”اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے کہا: پروردگار! مجھے دکھا دے تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا خدا نے کہا: کیا ایمان نہیں رکھتے ہو؟ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں صرف اطمینان دل کے لیے چاہتا ہوں (یعنی تا کہ ذہن کو پریشان کرنے والے سوالات سے چھٹکارا پا لوں)

یہاں یہ جملہ ”ولکن لیطمئن قلبی“ اسی مطلب کو بیان کر رہا ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بسا اوقات صاحبان یقین کے دل میں بھی کچھ سوالات ایسے اٹھتے ہیں کہ جن سے چھٹکارا اس متیقن کے دیکھے سوا ممکن نہیں ہے۔

یہ تھا حضرت ابراہیمؑ کا سوال خدا نے اس کا جواب یوں دیا:

قال فخذ اربعة من الطير فصر هن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزءًا ثم ادعهن ياتينك سعياً و اعلم ان الله عزيز حكيمٌ

''خدا نے کہا: چار پرندے پکڑلو انہیں اس حال میں کہ تمہارے ساتھ مانوس ہوں ذبح کر دو (ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور ملا دو) پھر ان کے اجزا مختلف پہاڑوں پر رکھ دو اور انہیں پکارو (تو دیکھو گے) وہ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ جان لو کہ خداوند عالم غلبے والا اور حکیم ہے (پرندوں کے بدن کے اجزا سے بھی واقف ہے اور انہیں پہلی صورت پر لوٹانے پر بھی قادر ہے)

آیت کی شان نزول جواب خدا اور پھر چار پرندوں کا انتخاب کر کے ذبح کرنا ان سب چیزوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے مدنظر صرف مردوں کے زندہ کرنے کا مشاہدہ نہیں تھا ورنہ صرف ایک مردے کا زندہ کرنا کافی تھا اور ان سب مقدمات کی ضرورت نہ تھی۔

لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ تھا کہ ہر حیوان کے بدن کے اجزا اس کے اصلی بدن کی طرف پلٹتے ہوئے دیکھیں۔ اس وجہ سے متعدد پرندوں کو ذبح کیا اور ان کے اجزا کو آپس میں ملا دیا۔ یہ مقصد تب پورا ہو سکتا ہے کہ وہ پرندے مختلف انواع سے تعلق رکھتے ہوئے۔ اس کے بغیر وہ مقصد یعنی ''اجزا کا اپنے اصلی بدن کی طرف لوٹانا'' پورا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے روایات نے بھی ان پرندوں کو مختلف انواع سے ذکر کیا ہے جو یہ تھے:

۱۔مور ۲۔کبوتر ۳۔مرغ ۴۔کوا

ان میں سے ہر پرندہ خاص قسم کے اوصاف کا مظہر ہے مور خودنمائی کا مظہر، مرغ شدید جنسی میلانات کا مظہر، کبوتر دوسروں کے لیے کھیل تماشے کا مظہر اور کوا ذکاوت وعقل مندی کا مظہر ہے۔

ایک سوال کا جواب

سوال:

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہرگز آیت میں حضرت ابراہیمؑ کو پرندوں کے ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ آیت میں لفظ ''فصرھن'' اگرچہ کاٹ دینے کے معنی میں آتا ہے لیکن یہاں پر اس سے مراد پرندوں کو اپنے سے مانوس کرنا ہے کیونکہ ''فصرھن'' کے بعد لفظ ''الیک'' استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ ''الیک'' دوسرے معنی (مانوس کرنا) سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا معنی تبدیل ہو جائے گا اور مطلب یہ بنے گا کہ چار پرندے پکڑلو اور انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو اور ہر ایک کو اس حال میں کہ وہ زندہ ہے ایک پہاڑ پر چھوڑ دو پھر انہیں اپنی طرف بلاؤ تا کہ وہ تمہاری طرف آئیں یعنی جیسے تمہارا پرندوں کو بلانا سبب ہو گا کہ وہ تمہاری طرف حرکت کریں اسی طرح قیامت کے دن خدا کا مردوں کو بلانا سبب ہو جائے گا کہ ان کے منتشر اجزا جمع ہو جائیں اور انسان کامل کی صورت میں محشر میں حاضر ہو جائیں۔ یعنی خدا کے لیے یہ کام اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا تمہارا پرندوں کو بلانا اور ان کا تمہارے پاس چل کر آنا۔

جواب:

آیت کی اس طرح تفسیر کئی لحاظ سے نا قابل قبول ہے:

اوّلاً

ابراہیم مردوں کا زندہ کرنا دیکھنا چاہتے تھے تا کہ دل سے مختلف اندیشے نکل جائیں اور یہ مطلب صرف اس صورت میں پورا ہوسکتا تھا کہ مردوں کو ان کے سامنے زندہ کیا جاتا اور صرف مثال وتشبیہ دے دینا کہ خدا کے لیے یہ کام اتنا ہی آسان ہے جتنا تمہارے لیے ان پرندوں کو بلانا اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ اس تشبیہ کی قوت وحی خدا سے زیادہ تو نہ تھی کیونکہ ابراہیمؑ قیامت کے بارے میں پہلے وحی الٰہی کے ذریعے یقین پیدا کر چکے تھے۔

ثانیاً

اگر آیت کے یہی معنی تھے کہ ان پرندوں کو زندہ پہاڑ پر چھوڑ دو تو پھر آیت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی ثم اجعل علی کل جبلٍ منهن جزأ کہ ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک جز ڈال دو۔

بلکہ اس طرح کہنا چاہیے تھا ثم اجعل علی کل جبلٍ منهم واحداً کہ ان میں سے ایک ایک پرندہ ہر پہاڑ پر چھوڑ دو۔

لفظ ''جز'' کہنے سے پتہ یہ چلتا ہے کہ ابراہیم ان پرندوں کو آپس میں ملا چکے تھے اور ملا دینا کاٹنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے بغیر ممکن نہیں۔

ثالثاً

لفظ ''فصرهن'' لغب عرب میں کاٹنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے بعد ''الیک'' کا ذکر اس کے بیان کے لیے ہے کہ اس ''فصرهن'' میں کاٹ دینے کے بعد ضمناً ایک اور معنی بھی یہاں مراد ہیں اور وہ مانوس کرنے کے ہیں گویا جملے کے معنی یہ ہوں گے: انہیں (پرندوں کو) اپنے ساتھ مانوس کرتے ہوئے ذبح کر دو اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم قیامت کے دن اجزا بدن کو ان کے اصلی بدن کی طرف لوٹ آنے پر قادر ہے اگر چہ وہ اجزائے کسی دوسرے انسان یا حیوان کے جز و بدن ہی کیوں نہ بن چکے ہوں اور مختلف اجزا کا آپس میں مل جانا اس سے مانع نہیں ہوسکتا کہ ہر جز اپنے اصلی بدن کی طرف لوٹ جائے۔

اتفاق سے حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بھی یہی بات خطور کر رہی تھی کیونکہ انہوں نے ایک مردار دیکھا کہ جو آدھا پانی میں اور آدھا خشکی میں تھا اور اسے خشکی اور پانی کے جانور کھا رہے تھے کیونکہ کچھ مدت بعد اس مردار کے اجزائے بدن ان حیوانات کے اجزائے بدن بننے

والے تھے لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ حیوانات کے اعضا کو ان کے اصلی بدن کی طرف لوٹتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ پرندوں کو ذبح کریں اور ان کا گوشت پہاڑوں پر بکھیر دیں۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ان مردوں کا زندہ ہونا دیکھ لیا اور ذہنی خلجان سے چھٹکارا پا لیا۔[1]

دوسرا نمونہ

عزیزؑ کی حیاتِ نو

صرف حضرت ابراہیمؑ ہی نے اپنی آنکھوں سے مردے زندہ ہوتے دیکھ کر اطمینان خاطر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ ان سے پہلے خدا کے ایک اور برگزیدہ بندے عزیزؑ (جنہیں ارمیا کہا جاتا ہے) اسی جیسے واقع سے دوچار ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں بھی ایسا ہی خیال آیا تھا کہ خدا ان مردوں کو جن کے اجزا بکھر چکے ہیں کیسے زندہ کرے گا۔ قصہ یہ ہے کہ وہ ایک سفر پر اپنی سواری پر سوار چلے جا رہے تھے۔ کچھ غذا و پانی بھی ہمراہ تھا۔ ایک دیہات کے قریب سے گزرے کہ جس کی چھتیں گر چکی تھیں۔ دیواریں ڈھے چکی تھیں اور لوگوں کے بوسیدہ جسم اور ہڈیاں ہر سو بکھری ہوئی تھیں جب انہوں نے اس وحشت ناک منظر کو دیکھا تو کہا: خدا ان مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟

البتہ حضرت عزیزؑ کا یہ کہنا قیامت کے انکار یا اس کے امکان کے بارے میں شک کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ صرف تعجب کی بنا پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب خدا کے اس برگزیدہ بندے نے مردے زندہ ہونے کا نمونہ دیکھا تو کہا میں جانتا ہوں خداوند عالم سب چیزوں پر قادر ہے یعنی میں اس حقیقت کے بارے میں پہلے سے آگاہ تھا اور اب بھی اعتراف کرتا ہوں۔

خدا نے عزیزؑ کے تعجب کو دور کرنے کے لیے تین ایسے کام کیے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مردے زندہ کرنے اور ''امکان معاد'' پر بہترین گواہ بن سکتا ہے۔ وہ تین کام یہ ہیں:

۱۔ خدا نے عزیر کو سو سال تک مار دیا، اس کے بعد انہیں زندہ کیا اور پوچھا: یہاں کتنی مدت تک ٹھہرے ہو؟ عزیزؑ نے کہا: ایک دن یا آدھا دن۔ جو حضرت عزیزؑ نے جواب میں ایک دن اور آدھے دن میں تردد کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی موت کا وقت ظہر سے پہلے کا تھا اور زندہ ہونے کا وقت ظہر کے بعد کا تھا اس لحاظ سے شک میں پڑ گئے کہ ان کے ٹھہرنے کا وقت پورا ایک دن تھا یا آدھا دن۔ اس موقع پر عزیزؑ کو خطاب ہوا کہ تم سو سال تک ٹھہرے ہو اور جو خدا قادر ہے کہ کسی مردہ کو سو سال بعد زندہ کر دے وہ ان مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے جنہیں مرے ہوئے زیادہ عرصہ گزر گیا ہو اور اس میں موت کی مدت کے زیادہ یا کم ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔

---

[1] یہاں شیخ محمد عبدہ نے اس آیت کی ایک ایسی تاویل کی ہے جو قطعاً ان کے علمی مقام کے مناسب نہیں تھی۔ تفسیر المنار جلد ۳، ص ۵۴ تا ۵۶

۲۔ عزیرؑ کے ہمراہ کچھ کھانے، پینے کا سامان بھی تھا جو کہ انجیر اور پھلوں کا رس تھا اور اس سو سال کی مدت میں ان میں سے کوئی بھی خراب نہ ہوا حالانکہ اس جیسی غذا جلدی خراب ہو جاتی ہے۔ خدا نے عزیرؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اپنی غذا اور پانی کی طرف دیکھو، سو سال گزرنے کے باوجود خراب نہیں ہوئی۔ جو خدا اتنی لمبی مدت گزرنے کے باوجود غذا کو خراب ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے وہ مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے کیونکہ غذا کا آلودگی سے محفوظ رکھنا بھی ایک قسم کا اسے زندگی دینا ہے اور یہ مردوں کے زندہ کرنے اور انہیں حیات دینے سے کمتر نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عزیرؑ کا گدھا اس عرصے میں بالکل فنا ہو چکا تھا اس کے اجزا بکھر چکے تھے حضرت عزیرؑ کے سامنے اس کے اجزا اکٹھے ہوئے ان پر گوشت پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندہ ہو گیا۔

یہاں یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ جلدی خراب ہو جانے والی چیز یعنی غذا اور پانی تو اتنی لمبی مدت میں ذرہ برابر بھی خراب نہیں ہوئی لیکن حیوان جسے خراب ہونے کے لیے ایک لمبی مدت چاہیے تھی۔ بوسیدہ ہو کر فنا ہو گیا۔

عزیرؑ نے جب مردے زندہ کرنے کے یہ تین نمونے دیکھے تو خدا کی قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا قرآن نے اس داستان کو سورہ بقرہ آیت ۲۵۹ میں یوں بیا فرمایا ہے:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ (سورہ بقرہ: ۲۵۹)

''یا اس کی طرح جو ایک ویران بستی سے گزرا جس کی دیواریں اس کی چھتوں کے اوپر گر چکی تھیں۔ اس کے ساکنین ہلاک و نابود ہو چکے تھے۔ ان کی ہڈیاں بکھر چکی تھیں۔ تو عزیرؑ اپنے آپ سے کہنے لگے: اللہ تعالیٰ انہیں کیسے زندہ کرے گا۔ خدا نے عزیرؑ کو سو سال تک موت دے دی اس کے بعد انہیں زندہ کیا اور پوچھا کتنا ٹھہرے ہو تو کہنے لگے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ خدا نے کہا بلکہ تم سو سال ٹھہرے ہو لیکن اپنی غذا اور پانی کی طرف دیکھو بالکل تبدیل نہیں ہوئے اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو کیسے فنا ہو چکا ہے۔ تمہارا موت کے بعد زندہ کیا جانا تمہارے لیے موجب اطمینان اور دوسرے لوگوں کے لیے قیامت کی نشانی ہے۔ اور اپنے گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھو کیسے انہیں ہم آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں (جب عزیرؑ نے یہ دیکھا) تو

کہا میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

قابل توجہ نکتہ

جملہ "فاماته الله مائة عامٍ ثم بعثه" دلالت کرتا ہے کہ خدا نے خود یہ بات کرنے والے کو موت دی تھی سو سال کے لیے اور پھر اسے زندہ کیا۔

لیکن تفسیر "المنار" کا مصنف (المنار ج ۳، ص ۴۹، ص ۵۰) کہتا ہے "کہ یہ جملہ نیند کی ایک قسم کی طرف اشارہ ہے کہ جسے "سبات" کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک زندہ موجود کچھ مدت کے لیے گہری نیند میں چلا جائے لیکن اس کی زندگی کا چراغ نہ بجھے اور یہ عموماً چند سال سے زیادہ نہیں ہوا کرتا"

اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ حیوانات یا انسان کے لیے ایک لمبی مدت کے لیے نیند کی حالت میں رہنا ممکن ہے جیسا کہ بعض حیوانات سردیوں کا پورا موسم نیند کی حالت میں بسر کرتے ہیں اور گرمیوں میں بیدار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ آیت اس مطلب کے سراسر منافی ہے جو کچھ "تفسیر المنار" میں کہا گیا ہے کیونکہ آیت میں "فاماته" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مار دینے کے ہیں اور اس کے بعد لفظ "بعث" ذکر کیا گیا ہے کہ جو زندہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تیسرا نمونہ

افسوس کے مارے ہوئے

اسلامی مفسرین نے نقل کیا ہے کہ قریش کے سرکردہ افراد نے یہود مدینہ کے پاس ایک گروہ بھیجا تا کہ وہ انہیں کتب آسمانی سے حضرت خاتم الانبیا کی دعوت کے صحت وسقم کے بارے میں مطلع کریں اور انبیاء کے اوصاف سے آگاہ کریں۔

یہودی علما نے ان سے کہا کہ اس سے ان تین امور کے بارے میں سوال کرو:

۱۔ وہ چند افراد جو اپنے گھروں سے نکلے اور گم ہو گئے اور ایک مدت تک گہری نیند کی حالت میں رہے وہ کتنی مدت سوئے، ان کی تعداد کیا تھی اور ان کے ہمراہ کیا تھا؟

۲۔ خدا نے موسیٰؑ کو کس شخص سے ملاقات کا حکم دیا کہ اس سے جا کر کچھ مسائل دریافت کرو اور سیکھو۔

۳۔ اس شخص کی کیا سرگزشت ہے جو دنیا کے آخری سرے تک گیا اور اس نے یاجوج ماجوج کے آگے دیوار بنائی۔ اس کے بعد اس سے قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کرو۔

اگر اس نے پہلے تین سوالوں کا جواب وہی دیا جو ہم جانتے ہیں تو جان لو وہ رسول خدا ہے اور اگر اس نے قیامت کے وقت کا تعین کر

دیا تو وہ جھوٹا ہے کیونکہ قیامت کے بارے میں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا (مجمع البیان جلد ۳ص ۴۵۱)

قریش کے نمائندے مدینہ سے واپس مکہ آئے اور اپنی ملاقات کا نتیجہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ قریش نے یہ سوالات حضرت پیغمبر اکرمؐ سے کئے اور خدا نے سورہ کہف میں ان تینوں سوالوں کے جواب دیئے ہیں۔

ابھی ہم پہلے سوا[۱]ل کے بارے میں گفتگو کریں گے کیونکہ وہ مسئلہ قیامت سے مربوط ہے ان افراد کی سرگزشت حضرت مسیحؑ کے بعد اور پیغمبر اکرمؐ کی بعثت سے پہلے واقع ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر تورات یا انجیل میں (عہد عتیق وعہد جدید) کہیں نہیں ملتا۔ یہودی اور عیسائی علمانے ان کے واقعے کو بڑی خاص اہمیت سے محفوظ رکھا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ڈیوکلیس نامی بادشاہ ۲۸۵۔۳۰۵ میلادی میں روم پر حکومت کرتا تھا اور وہ اپنی الوہیت وخدائی کا مدعی تھا۔

اسی طرح تاریخ کہتی ہے کہ ایک اور بادشاہ جس کا نام دقیانوس تھا ۲۴۹۔۲۵۱ میلادی میں روم[۲] پر حاکم تھا وہ لوگوں کو بت پرستی کی دعوت دیتا تھا اور خدا پرستوں کو قتل کروادیتا تھا۔ اس کا اصلی نام دسیوس تھا عربی میں جسے دقیانوس کہا جاتا ہے۔

چند پاکدامن اور مومن نوجوان جنہیں قرآن نے لفظ ''فتیہ'' سے ذکر کیا ہے انہوں نے اس جابر حاکم کے ظلم سے فرار کی خاطر اپنے شہر کو شکار کے بہانے چھوڑ دیا ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا۔ سفر طے کرتے ہوئے وہ ایک غار تک پہنچے اور اس غار میں پناہ لی۔ مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ ایک لمبی نیند کی حالت میں اس غار میں رہیں جیسا کہ کہا گیا ہے:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓي اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝۱۱ (کہف: ۱۱)

''اور ہم نے ان کے کانوں پر غار میں کئی سالوں تک (نیند کا) پردہ ڈال دیا''۔

مغربی مورخین ان کی نیند کی مدت ۱۵۷ سال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ۴۹ سے ۲۵۱ میلادی کے درمیانی عرصے میں وقوع پذیر ہوا حالانکہ یہ بات صراحت قرآن کے مخالف ہے قرآن کہتا ہے:

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝۲۵ (کہف: ۲۵)

''وہ اپنی غار میں پورے تین سو نو سال ٹھہرے''۔

بدن تر دید غار میں اتنی لمبی نیند بغیر کھائے پیئے موت سے زیادہ مشابہ ہے اور عام طبیعی نیند سے ہٹ کر ہے۔ یہ ایسی نیند تھی جس میں تمام طبیعی فعالیات متوقف تھیں سوائے روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن کے۔ اس کی مثال اس بڑے کارخانے کی سی ہے جو خود تو بند ہو لیکن اس کی مشینوں میں ایک چھوٹی سی چمنی روشن ہو کر جب چاہیں اس سے کارخانے کو چالو کر دیں۔[۳]

---

[۱] اصحاب کہف کا قصہ سورہ کہف میں آیت ۹ سے آیت ۲۶ تک میں بیان کیا گیا ہے۔

[۲] روم سے مراد یہاں شرقی ہے کہ جو موجودہ ترکی اور شامات کے کچھ حصے ہیں۔

[۳] اسے Pilot کہتے ہیں۔ (مترجم)

اس قسم کی نیند یقیناً موت سے کم تر نہیں ہے اور دنیا سے کٹے ہوئے غار میں ان افراد کی حفاظت خدا کی وسیع قدرت کے مقابلے میں کوئی مشکل کام نہیں۔

اس کی عام سی مثال بعض جانوروں میں سردیوں کے موسم کی لمبی نیند ہے یا ریاضت کرنے والوں کا قبر میں کچھ مدت تک روح کو جسم سے خارج کرکے مردگی کی حالت میں رہنا کہ بعد میں مالش اور گرم پانی ڈالنے سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

سائنسدان حضرات آج کل اس نظریے پر کام بھی کر رہے ہیں کہ ایک لمبی عمر کے لیے انسان یا دوسرے حیانات کے بدن کو جامد کر کے آیا وقتی طور پر زندگی کی فعالیات کو متوقف کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں جب چاہیں ان کی فعالیت کو دوبارہ شروع کر دیں؟ اگر یہ تھیوری کامیاب ہو جاتی ہے تو انسان کی عمر کئی گناہ بڑھ جائے گی۔ اس نظریے کے مطابق رشتہ حیات کلی طور پر منقطع نہیں ہوگا بلکہ وہ وقتی طور پر متوقف کریں گے اور پھر کچھ مدت بعد مناسب درجہ حرارت کے ذریعے اسے معمول کی زندگی کی طرف لوٹا دیں گے۔

اصحاب کہف کی صورت حال میں بھی کچھ ایسی ہی تھی ان کی حیات صرف متوقف ہوئی تھی بالکل منقطع نہیں ہوئی تھی یعنی ان پر ایک لمبی نیند طاری ہوئی تھی موت نہیں آئی تھی قرآن اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ (کھف:۱۸)

''تم انہیں بیدار سمجھو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں''

ان کی نیند دوسرے لوگوں کی نیند سے مختلف تھی کیونکہ عام طور پر نیند کی حالت میں انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں جبکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے دیکھنے والے کے دل میں خوف و وحشت بیٹھ جاتی جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

لو اطلعت علیهم لولیت منهم فراراً و لملئت منهم رعباً

''اگر تم انہیں دیکھ لیتے تو ان سے ڈر کر پشت پھیر کر بھاگ نکلتے اور تمہارا دل خوف سے بھر جاتا''

یہ نیند ہمارے طبیعی قوانین کے بالکل خلاف ہے اور یہ لوگ کسی غیبی قوت کی وجہ سے اتنی لمبی نیند سو کر زندہ رہے۔ البتہ یہ بھی مخفی نہ رہے کہ ان کے بدنوں کو بوسیدگی سے بچانے کی خاطر کچھ طبیعی عوامل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

و نقلبهم ذات الیمین و ذات الشمال

''اور ہم انہیں دائیں اور بائیں پہلو طرف تبدیل کرواتے ہیں''

اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ ہم نے انہیں تین سو نو سال کے بعد اس لمبی نیند سے بیدار کیا۔ کیوں بیدار کیا؟ اس کے لیے قرآن نے دو وجہیں بیان کی ہیں:

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ (کھف:۱۲)

''پھر ہم نے انہیں بیدار کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ کس گروہ کو اپنے ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں معلوم ہے''۔

۲۔ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ (کهف:۲۱)

''ہم نے اس زمانے کے لوگوں کو اصحاب کہف کو بیدار کرکے آ گاہ کردیا کہ وہ جان لیں کہ بتحقیق خدا کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے وجود میں کوئی شک نہیں''

اس لیے کہ اصحاب کہف بیدار ہونے کے بعد یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ صرف ایک دن یا آدھا دن ٹھہرے ہیں لہٰذا انہوں نے طے یہ کیا کہ ان میں سے ایک شخص شہر جائے اور کھانا خرید لائے لیکن جب وہ شہر میں داخل ہوا تو اس نے ہر چیز میں تبدیلی محسوس کی۔ سب نقشہ بدل چکا تھا اور وہ جس ریزگاری کے ذریعے غذا خریدنا چاہتا تھا اس کی وجہ سے اور گفتگو کرنے کے ڈھنگ وغیرہ سے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ان لوگوں میں سے ایک ہے جو چند سو سال پہلے گم ہوگئے تھے چونکہ ان کے گم ہونے کی داستان سینہ بسینہ نقل ہوتی آئی تھی اور تاریخ میں مندرج ہوچکی تھی۔

لوگوں نے جب یہ واقع دیکھا تو ان میں ایک عظیم تحول وجود میں آیا اور یہ واقعہ ان کے لیے قیامت کے بارے میں ایک اچھا درس ثابت ہوا چونکہ اس واقعے سے انہوں نے سمجھ لیا کہ قیامت میں مردوں کا زندہ کرنا ایک آسان سا کام ہوگا جو خدا موت جیسی نیند میں پڑے ہوئے لوگوں کو بیدار کرسکتا ہے ''مردوں کو زندہ کرنے'' پر بھی قادر ہوگا (اصحاب کہف کی بقیہ داستان کے لیے کف تفسیر کی طرف رجوع کریں)

ایک سوال کا جواب

سوال:

یہ غار کہاں واقع ہے؟

جواب

مورخین اس بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ یہ غار ''غارِ افسوس'' ہے۔ ''افسوس'' ایک قدیم تاریخی شہر ہے جو ''ازمیر'' سے ۷۳ کلومیٹر پر واقع ہے اور یہ غار ''افسوس سے ایک کلومیٹر دور پہاڑ کے اوپر واقع ہے اس غار میں سینکڑوں قبریں ہیں۔ غار کا دروازہ شمال مشرقی طرف ہے۔ عیسائی علما میں یہ غار بہت شہرت رکھتی ہے۔

استاد علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر المیان جلد ۱۳، ص ۳۱۷ میں روشن دلیلوں کے ذریعے ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے جو خصوصیات اس غار کے لیے ذکر کی ہیں وہ ''غار افسوس'' سے میل نہیں کھاتیں اور بعض دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ وہ ''غار رجیب'' ہے کہ جو عماّ اردن کے

دارالخلافہ سے آٹھ کلومیٹر دور ہے اور غار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے اور جو خصوصیات قرآن نے اس غار کی ذکر کی ہیں وہ اسی غار پر منطبق ہوتی ہیں۔ اس غار کے اندر ۸ ۰ ۷ قبریں موجود ہیں۔

اس غار کی ایک دیوار پر سرخ رنگ سے ایک کتے کی تصویر بھی بنائی گئی ہے اور اس غ آر کے اوپر جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے ایک مسجد بھی موجود ہے۔

اصحاب کہف کی غار کے بارے میں اور نظریات بھی ہیں جنہیں علامہ مرحوم نے تفسیر المیز ان کی تیرھویں جلد میں ص ۳۲۰ پر ذکر کیا ہے اور شاید ''رجیب'' کا لفظ ''رقیم'' کی بدلی ہوئی صورت ہو اور قرآن میں اس غار کو رقیم کہا گیا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ⑨

(کھف: ۹)

چوتھا نمونہ

بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہونا

اسلامی مفسرین لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک انتہائی دولت مند شخص تھا اور اس کا وارث سوائے اس کے چچا کے بیٹے کے کوئی نہ تھا اور دولت مند شخص باوجود لمبی عمر کے مرنے کا نام نہ لیتا تھا اس کے تنہا وارث یعنی چچا کے بیٹے نے اس کی موت کا بہت انتظار کیا بالآخر تنگ آ کر اس نے اسے قتل کرنے کی ٹھان لی اور بطور مخفی اسے قتل کر کے اس کی لاش کو سڑک پر ڈال دیا اور اس کے بعد آہ وفریاد شروع کر دی اور شکایت حضرت موسیٰؑ تک لے گیا کہ میرے چچا کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا اس موقع پر وحی آئی جس میں بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کا ایک عضو اس مقتول پر ماریں تا کہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کی نشان دہی کرے۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا کا یہ حکم بنی اسرائیل تک پہنچا دیا۔ جسے بنی اسرائیل نے مزاح سمجھا لیکن بحث و تمحیص کے بعد جسے قرآن نے سورہ بقرہ میں ذکر کیا ہے[1] انہوں نے گائے خرید کر ذبح کر دی اور اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے بدن پر مارا جس کی وجہ سے وہ زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے بارے میں بتایا:

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ⑦③ (بقرہ: ۷۳)

''پس ہم نے کہا مقتول کے بدن پر اس کا ایک ٹکڑا مارو۔ خدا اسی طرح مردے زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں

[1] سورہ بقرہ آیات ۶۷ تا ۷۳

دکھاتا ہے شاید تم سمجھو سکو"۔

اس آیت میں دو نکتے ہیں

۱۔ مردہ زندہ کرنے کا مقصد دو چیزیں تھیں ایک قاتل کی پہچان اور دوسرا مردہ زندہ ہوتے دیکھ کر قیامت کے بارے میں ان کے ایمان کا زیادہ ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اس دوسرے مقصد کو بھی بطور ہدف ذکر کیا ہے۔

۲۔ خدا نے مردہ زندہ کرنے کے لیے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا کہ گائے ذبح کر کے اس کا ایک عضومیت کے بدن پر مارا جائے؟

مفسرین لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل گائے پرستی کا ایک خاص میلان رکھتے تھے خدا نے چاہا اس طریقے سے ان کی نظروں میں گائے کا احترام کم کیا جائے کیونکہ یہ واقعہ سامری کے واقعہ کے بعد ہوا جس میں اس نے بنی اسرائیل کو "گوسالہ پرستی" کی دعوت دی۔ اب گائے کا ان لوگوں کے ہاتھوں ذبح ہونا کہ جو سامری کہ کہنے پر اس کی پرستش کر چکے تھے موجب بن سکتا تھا کہ وہ اپنے جعی معبود کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور دوبارہ اس کی پرستش کا نہ سوچیں۔

پانچواں نمونہ

حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا

سابقہ دلیلوں سے یہ تو واضح ہو چکا کہ انسان اور جہان کا معاد ممکن ہے اور ہر صاحب انصاف شخص پر یہ بات آشکار ہو چکی ہے کہ انسان کی نئی زندگی (بعد از موت) نہ صرف یہ کہ محال نہیں ہے بلکہ اس جہان میں اس کے متعدد نمونے بھی موجود ہیں اور قرآن مجید نے جہاں سابقہ چار نمونے ذکر کیے ہیں وہاں خدا کے ایک نبی کا بھی ذکر کیا ہے جو کہتا تھا:

اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى (ال عمران: ۴۹)

"میں مادرزاد اندھوں کو اور بیماروں کو صحیح کرتا ہوں اور میں مردے زندہ کرتا ہوں"

صرف یہی ایک پیغمبر تھے جو اپنی اس قدرت کا اظہار کرتے تھے بلکہ بعض جگہوں پر خدا کے ساتھ اپنا رابطہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے مردے زندہ بھی کئے جیسا کہ قرآن نے حضرت مسیحؑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى (مائدہ: ۱۱۰)

"اور یاد کرو اس وقت کو جب تم اندھوں اور برص والوں کو میرے اذن سے شفا دیتے تھے اور جب مردوں کو زندہ کرتے تھے"

اس کے علاوہ تاریخ انبیا و اولیا میں بطور متواتر نقل ہوا ہے کہ ان کے ذریعے مردے زندہ کئے گئے ہیں۔ اس طرح سے واقعیت پسند

شخص کے لیے معاد کے امکان میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

چھٹا نمونہ

ہمراہیانِ موسیٰؑ کی حیاتِ نو

اسلامی مفسر لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر شخص منتخب کیے اور انہیں اپنے ساتھ ''کوہ طور'' پر لے گئے تا کہ وہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام خود سن لیں۔ وہ جب پہاڑ پر پہنچے تو انہوں نے صرف سننے پر اکتفا نہ کیا بلکہ درخواست کر ڈالی کہ ہم اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں اس موقع پر ایک بجلی چمکی اور سب ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی درخواست و دعا کے سبب وہ زندہ ہو گئے۔

قرآن کی تعبیر یوں ہے:

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

(بقرہ: ۵۵، ۵۶)

''اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ خدا کو آشکار دیکھ لیں۔ پس تمہیں بجلی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا حالانکہ تم دیکھتے رہے پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تا کہ تم شکر کرو''

آیت صراحت رکھتی ہے کہ وہ لوگ قتل ہو گئے تھے چونکہ ''من بعد موتکم'' ہے نہ کہ صرف بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔

حضرت موسیٰؑ نے یہ منظر دیکھ کر خدا سے یوں درخواست کی:

رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَہۡلَکۡتَہُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا ۚ (اعراف:۱۵۵)

''میرے پروردگار! اگر مجھے اور انہیں ہلاک کرنا تھا تو پہاڑ پر آنے سے پہلے ہلاک کر دیتا کیا تو ہمیں ان چند سر پھرے لوگوں کے کام کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے''؟

اس لحاظ سے اس گروہ کا زندہ ہونا بھی ''احیائے موتی'' کا واضح نمونہ ہے۔

ساتواں نمونہ

دعائے حزقیلؑ سے نئی زندگی

بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اپنی سرزمین کو کسی وبا کی وجہ سے چھوڑ دیا اور وسط راہ میں خدا نے ان کی جان لے لی اور پھر ایک پیغمبر بنام ''حزقیلؑ'' کی دعا کی وجہ سے انہیں پھر سے زندگی ملی۔ (مجمع البیان جلد ۱، ص ۳۴۶)

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰـكِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾ (بقرہ: ۲۴۳)

''کیا تم نے ان کی سرگزشت نہیں دیکھی جو موت کے خوف سے اپنے وطن سے نکلے حالانکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے خدا نے کہا مرجاؤ پھر انہیں زندہ کیا۔ بتحقیق خدا لوگوں پر کرم کرتا ہے لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں''۔

مرحوم طبرسی (صاحب مجمع البیان) نے اس آیت کے ذریعے عذاب قبر اور رجعت کے امکان پر استدلال کیا ہے حالانکہ بہتر یہ تھا کہ اس آیت کے ذریعے اصل معاد پر استدلال کرتے۔

یہ تھے مردوں کے زندہ کرنے کے چند نمونے جو معاد کے امکان کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتے تھے۔

معاد جسمانی و روحانی

اس سلسلے میں دو حوالوں سے بحث کی جائے گی:

۱۔اقوال ونظریات ۲۔معاد کے روحانی اور جسمانی ہونے کا معیار

معاد کے اہم ترین مسائل میں سے اس کے وقوع کی کیفیت کا بیان ہے کہ آیا معاد جسمانی ہوگا یا روحانی یا جسمانی و روحانی ہر دو طرح سے ہوگا۔

اقوال ونظریات [1]

اس موضوع پر تاریخ علم کلام وفلسفہ میں پانچ نظریے ذکر کیے گئے ہیں:

انکارِ معاد

یہ نظریہ طبیعی فلاسفہ کے ایک گروہ نے پیش کیا ہے ان کے نزدیک انسان کی واقعیت وحقیقت اس کا یہی ظاہری بدن و پیکر ہے اور یہی اس کا مزاج و قویٰ ہیں جو موت سے کلی طور پر فنا ہوجاتے ہیں اور بکھرے ہوئے اجزا کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا اور انسان موت کے بعد معدوم ہوجاتا ہے اور چونکہ معدوم شے کا دوبارہ موجود کرنا محال ہے (اعادۂ معدوم محال ہے) لہٰذا انسان کا لوٹانا بھی محال ہے۔

۲۔معاد کے بارے میں شک

کہا جاتا ہے کہ حکیم جالینوس معاد کے بارے میں شک میں پڑ گیا تھا اور کسی طرف کو اختیار نہ کرسکنے کی وجہ سے اس بارے میں توقف کی صورت پر قائم تھا کیونکہ اسے اصل انسان کی واقعیت میں شک پڑ گیا تھا کہ وہ کیا ہے آیا یہی ظاہری جسم اس کی واقعیت ہے جو موت کے ذریعے نابود ہوجاتا ہے اور اس کا لوٹانا ممکن نہیں یا انسان کی واقعیت کوئی اور جوہر ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور اس کا لوٹانا ممکن ہے۔

۳۔صرف جسمانی معاد

اکثر مسلمان، اکثر فقہا اور محدثین (متقدمین) صرف جسمانی معاد کے قائل تھے اور روحانی معاد کا انکار کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک روح کی حقیقت اس طرح تھی جیسے کوئلے میں آگ اور پھول کی پتیوں میں پانی۔ وہ قائل تھے کہ ایسے ہی روح بدن میں جاری وساری

---

[1] اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں ان لوگوں کا نظریہ زیر بحث نہیں ہے جو مطلقاً خدا اور وحی کے منکر ہیں۔ بلکہ ان حضرات کے نظریات پر بحث کی گئی ہے جو وجودِ باری تعالیٰ کے معتقد ہوتے ہوئے اپنے اقوال پیش کرتے ہیں۔

ہے لہٰذا موت کے بعد بدن کے نابود ہونے سے روح بھی نابود ہو جائے گی لہٰذا انسان کے نام سے کوئی چیز باقی ہی نہیں رہے گی جو دوسرے عالم میں اٹھائے جائے گی۔

۴۔صرف روحانی معاد

اکثر سابقہ فلاسفہ جو مشائی فلسفہ کے پیروکار تھے صرف روحانی وعقلی معاد کو قبول کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک موت اور روح کے نکلنے کے بعد بدن نابود ہو جاتا ہے اور اس کی صورت وعوارض میں سے کوئی شے باقی نہیں رہتی لہٰذا اس کا لوٹانا ممکن ہے البتہ روح ایک ایسی واقعیت ہے جو مادہ سے مجرد ہے وہ فنا نہیں ہوتی اور بدن سے رابطہ منقطع ہونے کے بعد ''عالم مفارقات'' کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

۵۔معاد جسمانی وروحانی

بہت سے بزرگ حکما مشائخ عرفا متکلمین کا ایک گروہ مثلاً غزال، کعبی، حلیمی اور راغب اصفہانی اور بہت سے شیعہ علما مثلاً شیخ مفید، شیخ طوسیٰ، سید مرتضیٰ، محقق طوسی اور علامہ حلی جسمانی وروحانی ہر دو قسم کی معاد کو قبول کرتے ہیں کیونکہ وہ روح کو ایک جوہر مجرد از مادہ شمار کرتے ہیں کہ جو آخرت میں اسی بدن کی طرف لوٹے گی اور اکثر انصاری بھی اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں (شرح مقاصد جلد ۲ ص ۲۱۰، ۲۱۱، واسفار جلد ۹ ص ۱۶۳۔۱۶۵)

معاد کے جسمانی یا روحانی کا معیار کیا ہے؟

یہاں اہمیت اس بات کی ہے کہ معاد جسمانی یا روحانی کا مفہوم بیان کر دیا جائے تاکہ معاد جسمانی یا روحانی کے منکرین یا مثبتین کی مراد واضح ہو سکے مثلاً جنہوں نے صرف معاد جسمانی کو قبول کیا ہے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر ان کی مراد روح وحیات سے خالی جسم ہے تو اس صورت میں انسان کا بدن جمادات کی مانند ہر قسم کے ادراک وشعور سے خالی ہوگا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسے جزا وسزا دینا یا لذت وتکلیف اس کے لیے متصور نہیں ہو سکیں گے۔

اور اگر ان کی مراد روح کے ساتھ جسم ہے تو ایسی صورت میں وہ کیسے معاد کو صرف معاد جسمانی میں منحصر کرتے ہیں اور معاد کے روحانی ہونے کی کیسے نفی کرتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ بعض اصطلاح سے ناواقف لوگ کہتے ہیں کہ متشرعہ (اہل شریعت) معاد جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے قائل ہیں کیونکہ وہ ہرگز انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کے بغیر روح کے معتقد نہیں ہو سکتے یہ بیان جس شخص کا بھی ہے اس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ شخص معاد کے جسمانی یا روحانی ہونے کے معیار سے ناواقف ہے۔

معاد کے جسمانی یا روحانی ہونے کے لیے دو قسم کا معیار ہو سکتا ہے ایک کا تعلق انسان کی واقعیت سے ہے اور دوسرا جزا وسزا سے

مربوط ہے۔ان دو قسم کے معیار کی توضیح وتشریح جاننے کے بعد معاد جسمانی وروحانی کی حقیقت وماہیت کو جانا جاسکتا ہے۔

(الف) انسان کی حقیقت کیا ہے

انسان کی واقعیت کے بارے میں اہل نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے (محقق لاہیجی کہتے ہیں اس اختلاف کہ معاد روحانی ہے یا جسمانی) کا موجب انسان کی حقیقت کے بارے میں اختلاف کا ہونا ہے جس کے نزدیک انسان کی حقیقت صرف اس کا پیکر وجسم سے اور روح ایک عرضی امر ہے یا ایک صورت ہے قائم بہ مادۂ بدن ہے کہ جو موت سے زائل ہوجاتی ہے اس کے ساتھ اگر وہ شریعت کو مانتا ہے تو وہ معاد کے صرف جسمانی ہونے کا قائل ہوگا اور اگر کسی شریعت کو نہیں مانتا تو وہ اصل معاد کا منکر ہوگا اور جس کے نزدیک انسان کی حقیقت صرف روح مجرد ہے بدن صرف منفصل آلے کے طور پر ہے تو وہ صرف روحانی معاد کا قائل ہوگا اور جو شخص قائل ہے کہ حقیقت میں انسان مرکب ہے روح وبدن سے تو وہ معاد جسمانی وروحانی دونوں کا قائل ہوگا اور جو شخص حقیقت انسان کے بارے میں متردد ہوگا۔ وہ مسئلہ معاد میں متوقف ہوگا۔ گوہر مراد مقالہ ۳، باب ۴، فصل ۶)

اہل حدیث کہ جو زیادہ ظواہر شریعت کو اہمیت دیتے ہیں اور گہرائی میں نہیں سوچتے کہتے ہیں کہ انسان کی واقعیت اس کا ظاہری پیکر ہی ہے اور حس وحرکت وادراک اسی میں پائی جاتی ہیں اور اس حس وحرکت کے علاوہ روح ونفس کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ لوگ انسان کو حیوان کی طرح سمجھتے ہیں جس میں چند امتیازات پائے جاتے ہیں اور اس میں روح مجرد نام کا کوئی گوہر موجود نہیں ہے (وہ صرروح بمعنی حس وادراک کے قائل ہیں) یہ لوگ صرف معاد کے جسمانی ہونے کے قائل ہوسکتے ہیں اور جسمانی سے مراد وہی معنی ہیں جو حال حیات میں رکھتا تھا انہیں اس زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا جو معاد کے روحانی وجسمانی ہونے کے قائل ہیں بلکہ یہ صرف معاد جسمانی والے نظریئے کے علمبردار ہیں۔

لیکن ان کے مقابل وہ اہل فکر وتدبر ہیں جو ظواہر قرآن کا پاس کرتے ہوئے انسان کی اس ''ہیکل ظاہری'' اور محسوس حس و حرکت کے علاوہ اس حس وحرکت کے منشا بنام ''روحِ مجرد'' کے بھی معتقد ہیں کہ یہ روح مادے سے پاک ہے اور جسم کے ساتھ اس کا تعلق تدبیری ہے اور موت کے وقت روح کا بدن سے یہی تعلق ختم ہوجاتا ہے۔ یہ گروہ اگر کہے کہ محشر میں صرف روح مجرد محشور ہوگی بدن کو محشر میں نہیں لایا جائے گا تو یہ صرف معاد کے روحانی ہونے کے قائل ہوں گے لیکن اگر یہ لوگ کہیں کہ جسم وروح کو محشور کیا جائے گا تو یہ معاد جسمانی وروحانی کے قائل ہوں گے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہل حدیث صرف معاد کی ایک قسم کے قائل ہوسکتے ہیں جب کہ جو نفس مجرد کے معتقد ہیں ان کے نزدیک معاد کی دونوں قسمیں ممکن ہیں۔ نیز اہل حدیث صرف معاد روحانی کے معتقد نہیں ہوسکتے جبکہ ان کے غیر کے لیے یہ عقیدہ امکان رکھتا ہے۔

یہاں تک معاد جسمانی وروحانی کے پہلے معیار کا ذکر تھا۔ اب دوسرے معیار کو ذکر کرتے ہیں:

(ب) مختلف قسم کی جزا و سزا

اگر یہ کہیں کہ جنت یا جہنم میں جزاوسزا کا تعلق صرف جسم سے ہوگا (یعنی ایسی نعمات ہوں گی جن سے صرف جسم استفادہ کرسکتا ہے ایسی سزائیں ہوں گی جو جسم کے لیے ہیں) جب تک جسم نہیں ہوگا یہ جزاوسزا واقع نہیں ہوسکے گی۔ مثلاً بہشت میں پھلوں سے استفادہ کرنا یا اس کے مناظر سے لطف اندوز ہونا۔ یا دوزخ میں جلنا ان کا تعلق جسم سے ہے۔ ایسی صورت میں معاد جسمانی ہوگی چونکہ اس نظریے کے پیش نظر انسان صرف جسمانی لذتوں سے بہرہ مند ہے لہٰذا معاد بھی جزاوسزا کے لحاظ سے صرف جسمانی ہوگی لیکن اکثر کہیں کہ قیامت میں جسمانی جزاوسزا کے علاوہ ایک قسم کی اور جزا بھی ہے جس کا تعلق روح سے ہے کہ ان لذات وآلام کو پانے کے لیے روح کو قطعاً جسم کی ضرورت نہیں، اس صورت میں معاد کے روحانی ہونے کو بھی قبول کرنا ہوگا۔

تمام یا اکثر حکما اسلامی معاد کے جسمانی یا روحانی ہونے کو اسی معیار پر جانچتے ہیں۔

شیخ الرئیس نے شفا اور اپنی دوسری کتب میں معاد کا اس معیار پر مطالعہ کیا ہے اور اسی طرح صدر المتالہین بھی "مسئلہ معاد" کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے حسی، وہمی اور عقلی شقاوت اور سعادت اور لذت والم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس پہلو پر نظر ڈالتے ہیں کہ یہ چیزیں کیسے معاد میں واقع ہوں گی اور آخر میں معاد کے جسمانی وروحانی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں (الہیات شفا مقالہ ۹، فصل ۷، اسفار جلد ۹ ص ۲۱)

حکیم ہادی سبزواری نے بھی اسی طریقہ پر عمل کیا ہے کہ وہ معاد روحانی کے لیے صرف روح کے محشور ہونے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی روح جو دنیا میں معرفت کے ذریعے تکامل حاصل کر لیتی ہے اور عقل ہیولانی کے مرتبہ سے ترقی کر کے عقل بالفعل کے مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے وہ روح آخرت میں بھی "عالم عقل" اور "مثل نوریہ" کے ساتھ ملحق ہوجاتی ہے بلکہ اس مقام سے بھی ترقی کر کے لقاذات خدا اور صفات الٰہی سے متصف ہوجاتی ہے۔ سبزواری مرحوم کی عبارت یہ ہے:

ان الذی بالعقل بالفعل انتقی
فهو لعالم العقول مرتقی
ملتحق بمثل نوریه
واجدة لسنخها عرية
فجنة اللقاء و جنة الصفه
يثمر للكمل غرس المعرفة

(شرح منظومہ بحث معاد فریدہ!)

قرآن اور جسمانی و روحانی معاد

اب جب کہ ہر دو قسم کے معاد کے معیار کا پتہ چل چکا تو بہتر یہ ہے کہ اس موضوع کے بارے میں قرآن کا نظریہ بیان کر دیا جائے کہ قرآن کی نظر میں ہر دو معیار کے مطابق معاد کے وقوع کی کیفیت کیا ہے۔

فی الحال پہلے معیار پر قرآنی آیات پر معاد کے جسمانی و روحانی ہونے کی تحقیق کرتے ہیں۔

معاد جسمانی پہلے معیار کے مطابق

معاد جسمانی کے تحقیق میں پہلے معیار سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں بدن محشور ہوگا اور روح کا دوبارہ اس کے ساتھ تعلق برقرار ہوگا اور وہ جزا و سزا پائے گی۔

اس بارے میں قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں یہاں پر ہم اجمالاً ان آیات کی طرف اشارہ کریں گے اور اختصار کے پیش نظر ان آیات کو چند قسم میں بیان کریں گے۔

ا۔ وہ آیات کہ جو سابقہ امتوں میں مردوں کے زندہ کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں مثلاً ابراہیمؑ کی دعا سے پرندوں کا زندہ ہونا، نبی اسرائیل کی گائے کا واقعہ (اور ایک مقتول کا زندہ ہونا) عزیرؑ کا زندہ ہونا، بنی اسرائیل سے ایک گروہ کا زندہ ہونا اور حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا اور اصحاب کہف کی داستان۔

ان آیات کے ملاحظہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آخرت میں مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت بالکل وہی ہے جو ان آیات میں ''مردوں کو زندہ کرنے'' کے لیے ذکر کی گئی ہے اور ان داستانوں کے ذکر کرنے کا مطلب امکان معاد کے بیان کے علاوہ کیفیت معاد کا بیان بھی تھا۔ لہٰذا ان آیات پر توجہ کرنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آخرت میں بدن برزخی یا مثالی ہوگا جسے خود نفس اپنی خلاقیت کے ساتھ ایجاد کرتا ہے بلکہ یہ آیات انتہائی صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ یہی دنیوی بدن جنہیں ''مادی و عنصری بدن'' کہا جاتا ہے آخرت میں اٹھائے جائیں گے ورنہ اگر آخرت والے بدن ان دنیوی بدنوں کے علاوہ ہوں تو پھر جو یہ معاد کے بیان کے لیے اس دنیا میں مردے زندہ کر کے قرآن میں تشبیہیں ذکر کی گئی ہیں سب بے قیمت ہو کر رہ جائیں گی اور انبیاء کے ذریعے مردے زندہ کرنے اور معاد کے درمیان رابطہ ختم ہو جائے گا۔

البتہ یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ ''حیات اُخروی'' ایک خاص قسم کا کمال رکھتی ہے جو 'حیات دنیوی'' میں موجود نہیں جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ (عنکبوت: ٦٤)

''بتحقیق آخرت کا گھر حقیقی زندگی ہے اگر وہ جان لیں''

اس آیت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخرت میں اٹھایا جانے والا بدن یہی دنیوی بدن ہے اگرچہ ایک خاص کمال و برتری رکھتا ہو گا اور یہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ ''اخروی حیات'' بالکل دنیوی زندگی جیسی ہے صرف یہ کہ اخروی زندگی دائمہ ہے اور یہ زندگی عارضی ہے کیونکہ صرف ایک زندگی کا دائمی اور دوسری کا عارضی ہونا واجب نہیں بن سکتا کہ پہلی زندگی کو حقیقی اور دوسری زندگی کو مجازی کہا جائے بہرکیف باوجود اس کے کہ ہمیں اعتراف ہے کہ آخرت میں یہی دنیوی بدن محشور ہوگا نہ برزخی اور مثالی بدن تاہم مادہ اور اس کی خصوصیات سے عاری ہوگا اور ''اخروی زندگی'' اور ''اخروی بدن'' کا اس دنیوی بدن اور زندگی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اُس اخروی زندگی کی خصوصیات بھی اسی دنیوی زندگی والی ہوتیں تو پھر اس نظام دنیوی کو ختم کر کے ایک نیا نظام برپا کرنے کی کیا ضرورت تھی سوائے اس کے کہ یہ ایک عبث ولغو کام ہوتا۔ البتہ انسان جو اس مادی جہان یا اس کی خصوصیات میں مقید ہے اس کے لیے اخروی کامل زندگی کا صحیح ادراک ممکن نہیں ہے لہٰذا ان مسائل کو غیب سے متعلق سمجھتے ہوئے ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے اگرچہ ان کی حقیقت ہمارے لیے واضح نہ ہو۔

۲۔ وہ آیات جو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ انسان مٹی سے خلق کیا گیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا اور اسی سے اٹھایا جائے گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ﴿۵۵﴾ (طٰهٰ: ۵۵)

''ہم نے تمہیں زمین سے خلق کیا ہے اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور دوبارہ اسی سے تمہیں نکالیں گے''

ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ (نوح: ۱۸)

''پھر تمہیں زمین کی طرف لوٹا دے گا اور اسی سے نکالے گا'' [۱]

۳۔ وہ آیات جو قیامت کے دن قبروں سے نکلنے کو حشر کی کیفیت کے طور پر بیان کرتی ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمۡ يَنۡسِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾ (یٰسین: ۵۱)

''پس وہ اچانک قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف تیزی سے جائیں گے''

يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ﴿۷﴾ (قمر: ۷)

''وہ منتشر ٹڈیوں کی طرف اپنی قبروں سے نکل آئیں گے'' [۲]

۴۔ وہ آیات جو بیان کر رہی ہیں کہ قیامت کے دن انسان کے اعضا اس کے اعمال پر گواہی دیں گے اور ان اعضا کو برزخی اعضا یا بغیر مادہ کے صورتیں کہنا خلاف ظاہر ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] سورہ روم آیت ۲۵ اور اعراف ۲۵ بھی اسی مطلب کو بیان کرتی ہیں۔

[۲] معارج ۴۳، حج: ۷، انفطار: ۴ اور عادیات: ۹ بھی اسی مطلب کو بیان کرتی ہیں۔

يَوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ (نور: ۲۴)

’’وہ دن جب ان کے خلاف ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے‘‘ [1]

اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۶۵﴾ (یٰسین: ۶۵)

’’آج ان کی زبانوں پر مہریں لگا دیں گے ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے اعمال پر گواہی دیں گے‘‘

۵۔ وہ آیات جو دوزخ میں بدنوں کے تغیر و تبدل کو بیان کرتی ہیں۔

كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا لِيَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۵۶﴾ (نساء: ۵۶)

’’جب بھی ان کی جلد جل گئی تو ہم اس کی جگہ دوسری جلد قرار دے دیں گے تا کہ وہ عذاب کا مزہ چکھ لیں‘‘

وَسُقُوۡا مَآءً حَمِيۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ﴿۱۵﴾ (محمد: ۱۵)

’’وہ گرم پانی (حمیم) کے ساتھ سیراب کیے جائیں گے جو ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

۶۔ وہ آیات جو منکرین معاد کے شبہات کو بیان کرتی ہیں اور صریحاً دلالت کرتی ہیں کہ مخالفین انہی دنیوی بدنوں کو جو زمین میں ذروں کی صورت میں بکھر چکے ہوں کے معاد کا انکار کرتے تھے۔

قرآن نے ان کی بات کو اس طرح نقل فرمایا ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلۡقَهٗ ؕ قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِيَ رَمِيۡمٌ ﴿۷۸﴾ (یٰسین: ۷۸)

’’اس نے ہمیں ایک مثال دی اور اپنی خلقت کو بھول گیا اس نے کہا کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟‘‘

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هَلۡ نَدُلُّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمۡ اِذَا مُزِّقۡتُمۡ كُلَّ

---

[1] سورہ حم سجدہ آیت ۲۱ اسی مطلب کو بیان کرتی ہے۔

مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمۡ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۚ﴿۷﴾ (سباء: ۷)

''اور کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کے بارے میں بتائیں جو تمہیں خبر دے گا کہ جب تمہارے بدن مکمل طور پر فنا ہو گئے اور ذرہ ذرہ ہو گئے تو تمہیں دوبارہ خلق کیا جائے گا''

اسی طرح اور آیات بھی ہیں جو شبہات منکرین کی بحث میں تفصیلاً ذکر ہو چکی ہیں۔

ان آیات کے پیش نظر قرآن کریم انتہائی وضاحت کے ساتھ معاد جسمانی پر دلالت کرتا ہے جس میں کسی قسم کی تردید ممکن نہیں۔

قرآن اور روحانی معاد پہلے معیار پر

پہلے معیار کی بنا پر قرآن کا نظریہ معاد جسمانی کے بارے میں ذکر کرنے کے بعد اس معیار پر ہم معاد روحانی کے بارے میں قرآن کی نظر کو بیان کرتے ہیں۔

معاد روحانی کی تشخیص میں پہلے معیار کا مطلب یہ ہے کہ روح کو آخرت میں لوٹایا جائے گا۔ اس معیار کی بنا پر کہیں گے کہ:

اگر روح کے اٹھائے جانے سے یہ مراد ہو کہ صرف روح محشور ہوگی بدن محشور نہیں ہوگا تو قطعاً ایسا معاد روحانی درست نہیں ہے اور نظر قرآن کے مخالف ہے کیونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن کی نظر میں بدن یقیناً محشور ہوگا۔ البتہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ''معاد روحانی'' ہوگا۔ ان کی مراد یہی ہے کہ صرف روح بدن کے بغیر محشور ہوگی اور یہ نظریہ قرآن کے قطعاً مخالف ہے لہٰذا مسلمانوں میں سے جس کا بھی یہ نظریہ ہو درست نہیں ہے اگر کسی کی مراد معاد روحانی سے یہ ہو کہ روح بدن کے ساتھ محشور ہوگی تو یہ نظریہ درست ہے اور قرآن کی نظر بھی اس کے بارے میں مثبت ہے کیونکہ بدن کے محشور کرنے سے مقصود جزا و سزا کا دریافت کرنا ہے اور جسم کو بغیر روح کے جزا و سزا دینے کا کوئی معنی نہیں ہے۔ البتہ اس قسم کے معاد کو ''معاد روحانی'' کہنا اصطلاح کے مخالف ہے کیونکہ جو بھی معاد جسمانی کا قائل ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ بدن جمادات کی صورت میں محشور ہوں گے بلکہ ان کی مراد بھی یہ ہے کہ بدن حس، حرکت اور شعور کے ساتھ محشور ہوں گے۔ اس جیسے معاد روح کے محشور ہونے سے علاوہ مجرد و مادی سے اعم نہیں ہے۔

لہٰذا اگر اصطلاح کے مطابق کہنا چاہیں تو ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ پہلے معیار کے مطابق معاد روحانی (حشر روح بغیر بدن کے) قرآن کی نظر میں غلط ہے اور اس اساس پر معاد کو روحانی و جسمانی کہنا اصطلاح کے خلاف ہے۔

قرآن اور جسمانی معاد دوسرے معیار پر

معاد جسمانی کی تشخیص میں دوسرے معیار کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کچھ حسی جزا و سزا موجود ہے کہ جو بغیر حسی قوی و بدن کے متحقق نہیں ہو سکتی۔

اس معیار کی بنا پر بھی قرآن معاد جسمانی کو ثابت کرتا ہے اور بہت سی آیات اس بارے میں ہیں مثلاً وہ آیات جن میں صالحین کو بہشت میں نعمتیں دینے اور کافروں اور گناہگاروں کو عذاب دینے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ایسی آیات قرآن میں بہت زیادہ ہیں۔جن میں سے بطور نمونہ چند آیات کا انتخاب مشکل ہے۔جس شخص کو تھوڑی سی بھی قرآن سے آشنائی ہو وہ اس مطلب پر دال آیات کا مطالعہ خود کرسکتا ہے مثلاً سورہ واقعہ کا مطالعہ کرے جس میں تین گروہوں ''مقربان'' ''اصحاب یمین اور'' ''اصحاب شمال'' کے لیے وعدہ و وعید اور ثواب وعقاب کا ذکر ہے۔ان آیات سے ان لذات وآلام کا بطور حسی واقع ہونا واضح ہوجاتا ہے چونکہ یہ موضوع واضح وروشن ہے لہٰذا اس کے بارے میں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن اور روحانی معاد دوسرے معیار پر

معاد روحانی کی تشخیص کے لیے دوسرا معیار یہ ہے کہ آخرت میں حسی وجسمانی لذتوں اور آلام کے علاوہ کچھ اور جزا وسزا بھی ہے جو روحانی اور غیر حسی ہے اور صالح وگناہگار افراد کو دی جائے گی اور روح کو ان نعمات یا عذاب کے پانے کے لیے جسم کی ضرورت نہیں۔قرآن کی نظر بھی اس قسم کی جزا وسزا کے بارے میں مثبت ہے ہادیان دین کے کلام مقدس میں بھی اس پر شواہد پائے جاتے ہیں۔ہم یہاں پر قرآن او رمعصومین علیہم السلام کے کلام سے کچھ نمونے ذکر کریں گے۔

ا۔رضائے خدا کی لذت

قرآن کچھ جسمانی نعمات کا ذکر کرنے کے بعد رضائے الٰہی کا ذکر کرتا ہے اور اسے جسمانی لذتوں سے بھی بڑی لذت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی جزا ہے جو خدا کے شائستہ بندوں کو دی جائے گی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (توبہ: ۷۲)

''خدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور جنگ عدن میں پاکیزہ مسکن ہوں گے جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے لیکن ان سے بڑی نعمت اللہ کی رضا وخوشنودی ہے اور یہ عظیم کامیابی ہے''

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس آیت میں پہلے جسمانی لذتوں کا ذکر ہے اس کے بعد رضائے خدا کو ان سے بھی بڑی لذت ونعمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب بندے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ معبود اس سے راضی ہے تو ایک ایسی لذت وسرور سے سرشار ہوجاتا

ہے کہ مادی لذتوں کو بھول جاتا ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک بیان اس آیت کی توضیح کے ضمن میں ہے جس سے اس عقلی لذت وسعادت کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔۔آپؑ فرماتے ہیں:

''جب اولیائے خدا بہشت میں داخل ہوں گے تو خدا کی طرف سے خطاب ہوگا کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ان لذتوں اور نعمات جو تمہارے پاس ہیں سے بھی ایک بڑی نعمت اور لذت کے بارے میں بتایا جائے۔تو وہ تعجب سے پوچھیں گے: خدایا! جو کچھ ہمارے پاس ہے اس سے بڑھ کر اور کون سی لذت ہوسکتی ہے؟ تو دوبارہ وہی بات کہی جائے گی تو وہ لوگ کہیں گے: خدایا ہمیں اس نعمت کے بارے میں آ گاہ فرمادے۔تو خطاب ہوگا: سب سے بڑی لذت میری طرف سے خوشنودی اور میری تمہارے ساتھ محبت ودوستی ہے جو تمام بہشتی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔یہ کلام سن کر جنتی اس کی تصدیق کریں گے اور اقرار کریں گے کہ خدا کی رضا وخوشنودی سب لذتوں سے بڑھ کر ہے''

راوی کہتا ہے: امام علیہ السلام نے اس کلام کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی: "و رضوان من الله ا کبر" (بحار الانوار جلد۸، باب الجنة و نعیمها حدیث ۵۷)

۲۔رحمت خدا سے دوری:

جب خوشنودی معبود کا احساس موجب لذت ہے تو اس کے مقابلے میں جو لوگ اس کی رحمت واسعہ سے آ گاہ ہیں ان کے لیے اس کی رحمت سے دوری کا احساس دردناک عذاب ہے اور روح کے لیے سخت اذیت کا موجب ہے۔شاید قیامت کے دن حجابات کے اٹھ جانے کی وجہ سے خدا کی اس رحمت واسعہ سے سب لوگ مطلع ہوجائیں گے۔جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۶۸ میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ (سورہ توبہ: ۶۸)

''خدا نے منافق مردوں، عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ آگ ان کے لیے کافی ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دور کردیا ہے اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہے''۔

اس آیت میں ہمارے مدنظر یہ ہے کہ اس سے پہلے والی آیت میں مومنین ومومنات کے بارے میں گفتگو ہے اور اس آیت میں منافقین ومنافقات اور کفار کے بارے میں گفتگو ہے۔پہلی آیت میں پہلے جسمانی ومادی لذتوں اور نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے پھر رضا خدا جیسی (عقلی) نعمت ولذت کا ذکر ہے۔اس آیت میں بھی پہلے جہنم کی آگ کا ذکر ہے اور پھر ایک اور تلخ عذاب کو بیان کیا گیا ہے کہ جو رحمت خدا سے

دوری کا احساس ہے۔ درحقیقت یہ دو آیتیں وعدہ و وعید اور ان کے دریافت کرنے والوں کے لحاظ سے ''لف ونشر مرتب'' ہیں اور قطعی طور پر رحمت خدا سے دوری کی سزا آتش دوزخ کے علاوہ ہے اگر یہ بھی وہی ہوتو لازم آئے گا کہ جملہ ''ولعنھم اللہ''تکراری ہو جبکہ آیت سے اس کے خلاف کا تبادر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آیت کے آخر میں ''ولھم عذاب مقیم'' کہہ کر پائیدار عذاب کی بات کی گئی ہے جس طرح ممکن ہے یہ جملہ آگ کے دائمی ہونے کا بیان ہو اسی طرح ممکن ہے کہ یہ رحمتِ خدا سے دوری جیسے عذاب کے دائمی ہونے کا بیان ہو لیکن جہنم میں ہیشگی کو چونکہ اسی آیت میں پہلے صریحاً ذکر کر دیا گیا ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ یہ جملہ ایک دوسرے عذاب کے دوام کا بیان ہو جو آتش دوزخ کے علاوہ ہے (اور وہ رحمت خدا سے دوری کا عذاب ہی ہے)

۳۔ جانکاہ حسرت وغم

جب رحمت خدا سے دوری کا احساس عذاب روحانی کا موجب ہے تو گزشتہ پر حسرت اور تمام زندگی کے ضائع کرنے اور آخرت کے لیے توشہ وزاد مہیا نہ کرنے کا غم بھی ایک جانکاہ عذاب کی مانند ہوگا۔قرآن نے اس قسم کی روحانی تکالیف وآلام کی طرف اشارہ کیا ہے حتیٰ کہ قیامت کو ''یوم الحسرۃ'' کا نام دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ۘ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ وَّهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾

(مریم:۳۹)

''انہیں (ظالمین کو) یوم الحسرۃ سے ڈراؤ جب ان کا عذاب قطعی ہو جائے گا اس حال میں کہ وہ (اس دنیا میں) غفلت میں پڑے ہوں گے اور وہ ایمان نہیں لاتے''

ایک دوسری آیت میں قرآن گمراہوں کے برے انجام کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے دن ان کی حسرت کو مجسم کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ کیسے انھوں نے سرمایۂ حیات کو ضائع کر دیا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ‌ؕ كَذٰلِكَ يُرِيۡهِمُ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ (بقرہ: ۱۶۷)

''اور جنہوں نے اپنے کافر سربراہوں کی پیروی کی، کہا: کاش ہم دنیا میں لوٹ سکتے و جیسے انہوں نے یہاں ہم سے بیزاری اختیار کی ہم ان سے اسی طرح بیزاری کرتے۔اسی طرح خدا انہیں ان کے اعمال دکھاتا ہے کہ جو ان کے لیے حسرت آور ہوتے ہیں اور وہ جہنم کی آگ سے نکل پائیں گے''۔

ابوسعید خدری پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جس میں کفار کی اساس کو بیان کیا گیا ہے۔فرمایا:

''جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوں گے تو موت کو ان کے سامنے مجسم کیا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا آیا تم موت سے آشنا ہو؟ تو سب کہیں گے: ہاں! تو موت ان کے سامنے حیوان کی صورت میں مجسم کر کے ذبح کر دی جائے گی۔ اس طرح سے انہیں پتہ چل جائے گا کہ آخرت میں اس کے بعد موت نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی اور دونوں گروہ (جنتی اور جہنمی) اپنی اپنی جگہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے''۔[1]

امام محمد باقر علیہ السلام آیت ''كذلك يريهم الله اعمالهم حسرات عليهم'' کی تفسیر میں اس طرح فرماتے ہیں:

''مراد وہ شخص ہے جس نے مال حاصل کیا ہوا ور اسے ''راہِ خیر'' میں خرچ نہ کیا ہو اس کے وارث اس مال کو ارث میں لے گئے اور اس کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس قسم کا مال انسان کے لیے حسرت کا موجب بنے گا۔[2]

۴۔ محبوب سے ملاقات

قرآن میں بہت سے آیات میں کلمہ ''لقاالله'' وارد ہوا ہے۔ متکلم اور مفسر حضرات اس کی تفسیر میں مختلف آرا رکھتے ہیں۔ بعض اسے قیامت کے دن سے تفسیر کرتے ہیں اور بعض اسے آخروی نعمات پانے سے تفسیر کرتے ہیں۔ ان ہر دو قسم کی تفسیر کے لیے قرآن میں شواہد پائے جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص المعجم المفہرس میں کلمہ ''لقاء الله'' کو دیکھے تو ان تفسیروں کو بعید بھی نہیں سمجھے گا لیکن اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس لفظ میں معنی کے لحاظ سے اس سے زیادہ وسعت پائی جائے کہ ان دو معنی کے علاوہ ایک تیسرا معنی بھی اس میں شامل ہو جائے اور وہ کامل انسانوں کی اپنے پروردگار کے ساتھ واقعی لقا و ملاقات ہے یہ ایسی لقا ہے کہ جو ہرگز الفاظ و کلمات میں نہیں سماتی۔ اس قسم کی لقا ''نور قلب سے رویت'' اور ''باطن خرد کے شہود'' سے بھی بڑھ کر ہے۔ مشہور عارف مرحوم جواد ملکی تبریزی کا اس بارے میں ایک کلام ہے جسے ہم یہاں اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔

جناب تبریزی پہلے آیات لقا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''قرآن مجید میں بیس سے زیادہ موارد میں کلمہ ''لقاالله'' آیا ہے اور اسی طرح انبیاء وائمہ علیہم السلام کے کلام میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے''

اس کے بعد جناب تبریزی ''تنزیہ خداوند'' کے بارے میں روایات ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''دوسری طرف سے روایات میں ''تنزیہ حق تعالیٰ'' کے بارے میں ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں جن کا ظہور اس میں ہے کہ خدا معرفت کے تمام مراتب سے منزہ ہے''

اس کے بعد جناب تبریزی اس ظاہری تعارض کو ختم کرنے کے لیے علماء کے نظریات ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] مجمع البیان جلد ۳، ص ۵۱۵

[2] مجمع البیان جلد ۱، ص ۲۵۱

اس جگہ پر دو مسلک ہیں

۱۔ تنزیہ محض: اس مسلک کے مطابق خدا ہر قسم کی معرفت سے منزہ ہے لہٰذا جو روایات معرفت اور لقا اللہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انہیں موت، لقا ثواب اور لقا عقاب کے ساتھ تاویل کرنا چاہیے۔

۲۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ جو اخبار خدا کی تنزیہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ خدا کی معرفت آنکھ سے رویت کے ذریعے یا کنہ ذات الٰہی کی معرفت ہے وہ روایات کہتی ہیں کہ خدا ان دو قسم کی معرفت سے منزہ ہے اور جو روایات لقا معرفت وتشبیہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان سے مراد معرفت اجمالی معرفت اسما وصفات الٰہی اور تجلی مراتب ذات و اسما وصفات خدا ہے یہ وہ معرفت کی اقسام ہیں جو ممکن الوجود کے لیے ممکن ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''حجابات نورانیہ وظلمانیہ'' کے اٹھ جانے کے بعد عبد ذات و اسما وصفات خدا کی معرفت پیدا کر لیتا ہے اور یہ معرفت کی قسم حجابات کے اٹھنے سے پہلے کی معرفت سے جدا ہے۔ ایک تیسری عبارت میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ''انوار جلال و جمال خدا'' اولیائے خدا کے دل، دماغ اور باطن پر اس طرح تجلی کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ سے گم ہو جاتے ہیں اور فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں اس مقام پر ذات اقدس حق اسے اپنے جمال میں محو کر لیتی ہے اور اس کی عقل کو اپنی معرفت میں مستغرق کر لیتی ہے اور اس کے معاملات کی تدبیر وہ خود کرتا ہے اگر چہ عبد معرفت کے یہ چند مراحل طے کرنے کے بعد (کہ جو عبارت ہیں کشف سبحاتِ جلال، تجلی انوارِ جمال، فنا فی اللہ اور بقا باللہ سے) بھی عبد اپنے آپ کو ''کنہ معرفت ذات'' سے عاجز و ناتواں پاتا ہے۔

جناب تبریزی ایک دوسری جگہ پر کہتے ہیں:

''ممکن الوجود کی ملاقات خداوند جلیل کے ساتھ اگر چہ حقیقی ملاقات ہی ہے لیکن اس کی کیفیت ملاقی (ملنے والے) اور ملاق (جس سے ملاقات کی جارہی ہے) کے مناسب حال ہوگی اور یہاں پر ملاقات کی حقیقت وہی ہے کہ جو ادعیہ و زیارات اور روایات میں مختلف تعبیروں کے ساتھ بیان کی گئی ہے مثلاً ''وصول''، ''زیارت''، ''نظر بر وجہ''، ''تجلی''، دل کی آنکھوں سے دیکھنا، ''تعلق روح'' اور اس ملاقات کی ضد کے لیے بھی مختلف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مثلاً ''فراق'' بعد یعنی دوری ''حرمان یعنی محرومیت''۔

یہ ذکر کرنے کے بعد جناب تبریزی اس کلام پر مختلف روایات اور دعاؤں سے شواہد لاتے ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

''ہر قسم کی نفی کو خدا کی تنزیہ شمار نہیں کرنا چاہیے ورنہ ابطال معرفت لازم آئے گا۔ لہٰذا جو معانی خدا کے لائق نہیں ہیں مثلاً اس کی ذات کے محدود ہونے کے موجب ہوں یا اس کی ذات میں نقص کے موجب ہوں ان معانی سے خدا کی تنزیہ کرنی چاہیے۔ اسی طرح جو معرفت حواس کے ذریعے ہو اس کی بھی خدا سے نفی کرنی چاہیے البتہ خدا کی معرفت دل کی آنکھوں سے ممکن ہے اور وہ بھی کنہ ذات (حقیقت ذات) کی معرفت نہیں بلکہ معرفت بالوجہ ہے اگر اس معرفت کی خدا سے نفی کر دی جائے تو پھر اولیا و انبیا و عرفاء کے لیے معرفت کا مرتبہ سوائے عوامی معرفت

کے کوئی نہیں رہے گا۔

اس کے بعد جناب تبریزی "لقاء اللہ" کے طالبوں کو وصیت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اے برادر! اگر تم میں ہمت ہے تو اہل معرفت میں سے ہو جاؤ۔ اگر انسان ہونا چاہتے ہو، اگر روحانی بننا چاہتے ہو، اگر شریک ملائکہ بننا چاہتے ہو، انبیا و اولیا کے رفیق بننا چاہتے ہو تو کمر ہمت باندھ لو اور شریعت کے راستے سے آگے بڑھو۔ حیوانی صفات کو اپنے آپ سے دور کرو۔ اپنے آپ کو روحانی صفات سے متخلق کر لو۔ حیوانات اور جمادات کے مرتبہ پر قناعت نہ کرتے ہوئے مراتب عالیہ کو مدنظر رکھو۔ اس آب و گل سے حرکت کرو اور اپنے اصلی وطن کی طرف کوچ کرو کہ جو "عالم غیبی اور محل مقربین ہے تا کہ کشف و عیان کے ذریعے اس عظیم امر کی حقیقت کا ادراک کر سکو اور اس عظیم بزرگواری کے حصول کا طریقہ "معرفتِ نفس" ہے۔ ہمت کرو۔

یہ بزرگوار عارف اس کے بعد معرفت ولقا کے اس مرتبے کے لیے روایات و دعاؤں سے متعدد نمونے ذکر کرتے ہیں اور آخرت میں معشوق کے وصال اور لقائے محبوب و معبود کی لذت کو تمام حسی لذتوں سے برتر، یہاں تک کہ جنتی نعمتوں سے بھی برتر ذکر کرتے ہیں۔ "حدیث معراج" کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب بہشت پیغمبر اکرمؐ کے حضور پیش کی گئی تو آنحضرتؐ نے اللہ سے عرض کیا کہ خدایا! جب سے تو نے مجھے اپنی معرفت عطا کی، میں ہر چیز سے مستغنی ہو گیا"۔

اس کے بعد جناب تبریزی حافظ شیرازی کے اس عارفانہ کلام کا ذکر کرتے ہیں:

از درِ خویش خدایا بہشتم نفرست
کہ سرِ کوی تو از کون و مکان ما را بس
خارکِ درت بہشت من، مہر رخت سرشت من
عشق تو سرشت من، راحت من رضای تو[1]

"ترجمہ: خدایا اپنے دروازے سے مجھے میری بہشت نہ بھیجنا کہ تمہارا کوچہ مجھے کون و مکاں کے مقابلے میں کافی ہے تیرے دروازے کی خاک ہی میری بہشت ہے تیرے رخ کا چاند میری سرشت ہے تیرا عشق میری سرشت ہے اور تیری رضا میرے لیے راحت ہے"۔

[1] "لقاء اللہ" تالیف عارف شہیر میرزا جواد آقا ملکی تبریزی

۵۔فراق محبوب کی تکلیف

دعائے کمیل میں حضرت علی علیہ السلام نے اس قسم کی روحانی سزا والم کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ فرمایا:

فهبنی صبرت علی عذابك فكيف اصبر علی فراقك؟"

"خدایا! میں تیرے عذاب پر صبر کر بھی لوں تو تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا"

یہاں تک درج ذیل مطالب کے بارے میں اشارہ ہوا ہے:

۱۔ کیفیت معاد کے بارے میں علما کے نظریات

۲۔ معاد روحانی وجسمانی کے لیے پہلا معیار

۳۔ معاد روحانی وجسمانی کے لیے دوسرا معیار

۴۔ قرآن معاد کو پہلے معیار کے لحاظ سے صرف جسمانی سمجھتا ہے نہ کہ روحانی۔البتہ اس معنی کے لحاظ سے کہ بدن کے بغیر روح محشور ہوگی اس معاد کی قرآن نفی کرتا ہے۔

۵۔ قرآن میں جسمانی وروحانی جزا کے نمونے

۶۔ قرآن معاد کو دوسرے معیار کے لحاظ سے جسمانی بھی جانتا ہے اور روحانی بھی

معاد جسمانی کے بارے میں حکماء و متکلمین کے نظریات

گزشتہ صفحات میں دو مسائل کے بارے میں قرآن کی روشنی میں بحث ہوچکی ہے۔

۱۔ آیا قرآن کی رو سے معاد روحانی ہے یا جسمانی یا ہر دو؟

۲۔ معاد کے روحانی و جسمانی ہونے کا معیار کیا ہے؟

اگرچہ جتنی بحث ان دو موضوعات کے بارے میں ہوچکی ہے تفسیر موضوعی کے لحاظ سے کافی ہے اور ایک جداگانہ نئی فصل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس لیے کہ قارئین یہ جان سکیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں معاد جسمانی کے بارے میں حکماء و متکلمین کے کیا نظریات رہے ہیں اس فصل میں ایک مستقل بحث میں ہم ان نظریات کی طرف اشارہ کریں گے اور ان کا تحلیل و تجزیہ کریں گے۔

۱۔ فارابی اور معاد جسمانی

فارابی (متوفی ۳۳۹) کو فلسفے کا معلم دوم کہا جاتا ہے جو فلسفی مسائل میں خاص نظریات رکھتا ہے اور وہ معاد جسمانی (جسے قرآن نے متعدد آیات میں ثابت کیا ہے) کے بیان میں ایک خاص نظریہ رکھتا ہے جسے ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

فارابی آخرت کی طرف سفر کرنے والے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ ایک گروہ ایسا ہے کہ جس کے افراد کمال کے لحاظ سے اس مرتبے پر پہنچ چکے ہیں کہ انہیں کمال کے پانے کے لیے بدن کی ضرورت نہیں ہے اور یہ لوگ بدن اور بدن کے تعلقات کی طرف توجہ بھی نہیں رکھتے۔ ان کی زیادہ توجہ "عالم بالا" اور خلقت کے کلی حقائق کی طرف ہے۔

دوسرا وہ گروہ ہے جس کے افراد کو فارابی "بدنیون" کہتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن میں عالم بالا کے ساتھ تعلق و توجہ کی قدرت نہیں ہے۔ یہ لوگ بدن اور اس کے متعلقات کے علاوہ کسی برتر واقعیت سے آشنا نہیں ہیں۔ یہ لوگ طبعی طور پر "بدن پسند" اور "بدن خواہ" ہوں گے۔

فارابی پہلے گروہ کو "حقیقی سعادت مند" یا "حقیقی شقی" کہتا ہے یہ لوگ معاد میں بھی بدن کے بالکل محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی ذات اور اس کے متعلقات کے تعقل و فہم کے ذریعے لذت حاصل کرتے ہیں یا عذاب و سزا پاتے ہیں یعنی ان کی لذت اور عذاب اس بات سے وابستہ ہے کہ ان کی ذات میں کیسی صفات پائی جاتی ہیں۔ اگر ان کی ذات میں صفات و ملکات عالی و خوب پائی جائیں تو ان کا ادراک و تصوران کے لیے لذت بخش ہوتا ہے اور اگر ناپسندیدہ و پست صفات ہوں تو ان کا تصوران کے لیے تکلیف دہ اور موجب عذاب ہوتا ہے۔

لیکن دوسرا گروہ جس کی توجہ بدن سے مافوق نہیں ہے اس کے افراد کی توجہ صرف بدن اور اس کے علائق پر ہوتی ہے۔ انہیں جزا سزا پانے کے لیے بدن کی ضرورت ہے اور یہ بات واضح ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں لیکن یہاں فارابی کی ایک اور منطق بھی ہے اس کے نزدیک روح کا دوبارہ اسی دنیوی بدن سے تعلق برقرار کرنا ایک قسم کا تناسخ ہے۔ جو اس کی نظر میں محال ہے۔

اس صورت حال میں فارابی اپنے آپ کو دو مشکلوں میں پاتا ہے۔ ایک طرف سے تو دوسرے گروہ کا معاد ہے جو صرف روح کے بدن

کے ساتھ تعلق کے ذریعے متحقق ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف سے جدائی کے بعد روح کا اسی بدن سے تعلق تناسخ ہے۔ لہٰذا کیا کرے؟ اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لیے فارابی ایک نئی منطق لاتا ہے۔ کہتا ہے:

ممکن ہے آخرت میں روح کا تعلق ایک دوسرے بدن سے ہو اور اس بدن کے عناصر بھی عالم بالا سے تعلق رکھتے ہو۔ اس بدن کو یہ نام دیئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ جسم آسمانی (فلکی)

۲۔ وہ جسم جو ہوا سے تشکیل پایا ہو (ہوائی)

۳۔ وہ جسم جو دھوئیں سے تشکیل پایا ہو (دخانی)

اگر انسان ان تقسیمات کی روشنی میں دیکھے جو بطلیموس نے مادی ہان کے لیے ذکر کی ہیں تو بدن کو اخروی عناصر میں منحصر کرنا بالکل واضح ہوجائے گا۔

بطلیموس کا نظریہ یہ تھا کہ جسم افلامی (آسمانی) اپنی ایک خاص طبیعت رکھتا ہے جو چار عناصر کے علاوہ ہے۔ اس کے نزدیک تو افلاک کے علاوہ چار کرات موجود ہیں (جو زمین کے اردگرد پیاز کے چھلکوں کی طرح ہیں) وہ کرات یہ ہیں: مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔

اسی نظریے کی بنیاد پر فارابی کی فکر یہ ہے کہ تناسخ سے بچنے کے لیے قائل ہونا پڑے گا کہ آخرت میں روح کا تعلق ایک آسمانی بدن سے ہوگا یا ایسے بدن سے جو ہوائی مادہ سے بنا ہو یا دخانی مادہ سے بنا ہو۔ البتہ یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ روح کا اس بدن سے تعلق اس بدن کی تدبیر کے لیے نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر روح کا تعلق بدن سے اس کی تدبیر اور اسے کام میں لانے کے لیے ہو اور تناسخ کا موجب بھی نہ ہو تو پھر اسی دنیوی متروک بدن سے بھی تعلق برقرار ہوسکتا ہے لہٰذا روح کا اس بدن (فلکی یا ہوائی یا دخانی) سے تعلق ''استخدامی'' ہوگا۔ یعنی صرف جزا و سزا کے لیے روح اس بدن کو استعمال کرتی ہے۔ البتہ یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ فارابی کی نظر میں یہ جزا و سزا مادی و عنصری نہیں ہوگی بلکہ ایک قسم کی اچھی یا بری صورتیں ہیں۔ روح جنہیں تخیل کے ذریعے خلق کرتی ہے اور یہ صورتیں جنت یا جہنم میں موجود ہوجاتی ہیں۔

یہاں ایک سوال ممکن ہے کہ جنت اور دوزخ جن کا انسان سے وعدہ کیا گیا ہے فارابی کی نظر میں ان صورتوں کا تخیل کے ذریعے ایجاد کرنا ہے تو پھر ان کے لیے بدن کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اس صورت میں یہ دوسرا گروہ بھی پہلے گروہ کی طرح (پہلا گروہ کامل لوگوں کا تھا) بدن کے بغیر صورتوں کو تخیل کے ذریعے ایجاد کرکے جزا و سزا پاسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فارابی اور شیخ الرئیس بوعلی سینا کے نزدیک یہ حسی اور خیالی صورتیں مادی ہیں اور انہیں وہ مجرد نہیں سمجھے۔ اسی وجہ سے معلم دوم (فارابی) کو اس دوسرے گروہ کے لیے بدن کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ روح اس بدن کے ذریعے ان صورتوں کو ایجاد کرسکے۔

قارئین کی بہتر معلومات کے لیے ہم فارابی کے نظریے کو ان لفظوں میں مختصراً بیان کرتے ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو تعقل و تفکر کے لحاظ سے کامل ہیں وہ سعید ہوں یا شقی انہیں جزا و سزا پانے کے لیے بدن کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کا صرف اپنی ذات اور اس کے متعلقات پر توجہ کرلینا ان کی جزا و سزا کے مراتب کو فراہم کردیتا ہے اور نتیجتاً ان کے تصورات اُن کے لیے لذت و الم کا

سبب بن جاتے ہیں کہ ان کی لذت و تکلیف بھی عقلی ہوگی۔

۲۔ ناقص لوگ وہ دوسری قسم کے لوگ ہیں جن کی روح ترقی نہیں کر سکی اور وہ بدن کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتے (مطیع ہوں یا عاصی) یہ لوگ جزا و سزا کے پانے کے لیے بدن کے محتاج ہیں۔

۳۔ روح کا دوبارہ اسی دنیوی متروک بدن سے تعلق برقرار کرنا تناسخ کا موجب ہے اور تناسخ عقلی طور پر محال ہے۔

۴۔ اس دوسرے اور تیسرے دونوں مطالب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جزا و سزا پانے کے لیے ایک بدن ہونا چاہیے کہ روح کا اس کے ساتھ تعلق تناسخ کا موجب بھی نہ ہو تو وہ اخروی بدن یا افلاک (آسمان) کی جنس سے ہوگا یا تین بقیہ کروں سے تعلق رکھتا ہوگا۔

۵۔ اس گروہ کی روح کا اس بدن کے ساتھ تعلق برقرار کرنے کا ہدف صرف یہ ہے کہ روح اس بدن کے ذریعے لذت یا تکلیف دینے والی حسی صورتوں کو پا سکے۔ یہ کہ اس تعلق کا مقصد بھی دنیوی بدن کے تعلق کی طرح تدبیر و کام میں لانے کا ہو۔

۶۔ جیسے روح تنہا عقلی صورتوں کو خلق کرنے پر قادر ہے اسی طرح حسی و خیال صورتوں کو کیوں خود خلق نہیں کر سکتی؟ اس کی علت یہ ہے کہ حسی و خیالی صورتیں جسم میں نقش ہوتی ہیں اور جسم کے بغیر یہ صورتیں انجام نہیں پا سکتیں۔ [۱]

فارابی کے نظریے پر تنقید و تحلیل

یہاں تک ہم نے فارابی کے نظریہ کو تلخیص کر کے ذکر کیا ہے تا کہ حقیقت کے متلاشی اس سے بہتر طور پر آشنا ہو سکیں۔ اس نظریے پر جو اشکالات و اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

جیسا کہ بیان ہو چکا اس نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ معاد جسمانی میں روح اگر اسی دنیوی بدن سے تعلق برقرار کرے تو تناسخ لازم آئے گا۔

اس جگہ پر محقق عبدالرزاق لاهیجی کا کلام بہت دلکش ہے۔ وہ اس جیسے نادرست نظریات کی اساس کو حاصل کرتے اور فرماتے ہیں: تناسخ اور اس جیسے دوسرے اشکالات کی وجہ سے حکما معاد جسمانی کے مسئلے میں مقلد محض ہیں۔ [۲]

شاید محقق لاهیجی کی بات کا مطلب یہ ہے کہ حکما کا یہ گروہ درحقیقت معاد جسمانی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف "ظہوار شریعت" اور اس نظریے میں جمع کرنے کی خاطر ایک عنصری و جسمانی بدن کا قائل ہوا ہے تا کہ یہ آیات متحقق ہو جائیں۔

حالانکہ ہم تناسخ کی بحث میں ذکر کریں گے کہ تناسخ کی بنیاد دو امور پر قائم ہے۔

(الف) بدن کا متعدد ہونا اور یہ کہ روح پہلے بدن سے جدائی کے بعد دوسرے بدن سے تعلق برقرار کرے وہ دوسرا بدن چاہے نباتی خلیوں سے بنا ہو یا حیوانی نطفے سے یا انسانی جنین سے۔

---

[۱] اسفار جلد ۹ ص ۱۴۸، ۱۴۹

[۲] گوہر مراد مقالہ ۳، باب ۴، فصل: ۶ ص ۴۵۳

(ب) دوسرا بدن روح کے حاصل کردہ کمالات کے ساتھ ہم آہنگ بھی نہ ہو۔ اصطلاحاً اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نفس کو اس دوسرے بدن کے ساتھ تعلق برقرار کرنے کی خاطر "سیر نزولی و قھقھرائی" (یعنی درجہ کمال سے واپس پہلی حالت پر آنے) کی ضرورت ہے۔

لیکن جب روح دوبارہ اس پہلے دنیوی متروک بدن کے ساتھ تعلق برقرار کرنا چاہے ان دو شرطوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہوگی۔

۲۔ فارابی پر دوسرا اشکال

اگر معلم دوم نے یہ نظریہ تناسخ سے بچنے کی خاطر اپنایا تھا تو نہ صرف یہ کہ یہ نظریہ ان کے مقصد پر پورا نہیں اترتا بلکہ اس سے تناسخ بھی لازم آتا ہے۔ چونکہ انہوں نے کہا ہے کہ نفس دنیوی بدن سے جدائی کے بعد دوبارہ ایک اور بدن سے جو ہوائی یا دخانی یا فلکی ہوگا اور جو یقیناً عنصری ہے تعلق برقرار کرتا ہے اور ایک دن سے جدا ہو کر ایک دوسرے عنصری بدن سے تعلق برقرار کرنا ہی معرف نظریہ تناسخ ہے۔

۳۔ تیسرا اشکال

معلم دوم نے جو یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ آخرت میں ایک بدن فلکی ہوگا یا "کرات بالا" سے تشکیل یافتہ ہوگا اس نظریئے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ قابل قبول ہے۔ اصولی طور پر جیسا کہ ثابت شدہ ہے سو سے زیادہ عناصر سے مرکب ہو کر یہ دنیوی بدن یہ قابلیت پیدا کر سکا ہے کہ روح اس کے ساتھ تعلق برقرار کرے۔ اب وہ بدن جس میں صرف ایک عنصر پایا جاتا ہے۔[1] ہوا ہو یا دھواں اس میں ایسی قابلیت کہاں سے آجائے گی کہ وہ متعلق نفس بن سکے۔ ہر مفروضے کے لیے ضروری ہے کہ تجربے سے گزر کر آئے جبکہ فارابی کی یہ نظریہ اس شرط سے خالی و عاری ہے۔

۴۔ اس سلسلے میں صدر المتالہین فرماتے ہیں:

جب تک مختلف عناصر سے ترکیب شدہ جسم ایک نئی طبیعت اختیار نہ کر لے دخانی یا ہوائی جسم کے اجزا اکٹھے نہیں رہ سکتے بلکہ منتشر ہونے کے لیے آمادہ رہیں گے۔ اگر انسانی بدن تمام تحولات وتبدلات میں باقی اور قائم رہتا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اس نے مختلف عناصر سے ترکیب پا کر ایک نئی طبیعت اختیار کر لی ہے یہ طبیعت بدن کو انحلال و تفرق سے بچاتی ہے اور اگر روح ہوائی یا دخانی بدن کے متعلق ہونا چاہے تا کہ اس میں حسی اور خیالی صورتیں نقش ہو سکیں تو ضروری ہے کہ یہ بدن ایک خاص مزاج اور خاص طبیعت رکھتا جبکہ ایسا ہو تو تناسخ والا اشکال لوٹ آئے گا۔ کیونکہ یہ بدن روح کے بغیر خاص طبیعت رکھنے کی وجہ سے حیوانی بدن ہی ہے کہ روح پہلے بدن سے جدا ہو کر اس کے ساتھ تعلق برقرار کرتی ہے اور یہ نظریہ تناسخ ہے جس سے جناب فارابی فرار کرنا چاہتے تھے۔ ملا صدرا سرانجام یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فارابی کا یہ نظریہ غلط اور ناقابل قبول ہے۔ جس کا سبب یہ نظریہ بنا ہے کہ وہ (فارابی اور اس کے پیروکار) خیالی وحسی صورتوں کو مادی خیال کرتے ہیں۔

---

[1] بطلیموس کی نظر میں کرہ ہوا اور کرہ آتش بسیط عنصر ہیں اور خود یہ نظریہ مخدوش اور مردود ہے۔

۲۔شیخ الرئیس اور معاد جسمانی

یہاں یہ بات ذکر کردینا ضروری ہے کہ جونظریہ پیش ہو چکا ہے اگرچہ اسے فارابی نے پیش کیا ہے لیکن شیخ الرئیس نے ''الٰھیات شفا'' میں جسمانی وعقلی لذات وآلام کی توضیح وتشریح کرنے کے بعد اسی نظریے کو اختیار کیا ہے اور شیخ الرئیس معاد جسمانی کے بارے میں جس نظریے کو اپناتے ہیں وہ اس نظریے کے علاوہ نہیں ہے جو فارابی کے مدنظر تھا۔شیخ کہتے ہیں کہ ہماری نظر میں جونظریہ بعض علمانے اپنایا ہے وہ درست ومحکم ہے۔اس کے بعد اس نظریہ کو یوں نقل کرتے ہیں کہ جونفوس وارواح بدن سے جدا ہوجاتے ہیں اور وہ عالم بالا کی طرف توجہ نہیں رکھتے۔نہ خوش بختی کا موجب کمال رکھتے ہیں اور نہ ان میں کمال کا شوق پایا جاتا ہے کہ جس سے محرومی کی وجہ سے بدبخت ہوجائیں بلکہ ان کی تمام سعی وکوشش اور فعالیت کا تعلق عالم مادی اور عالم اجسام سے ہے اور دوسری طرف سے آسمانی موجودات میں سے کوئی چیز ان کی فعالیت کا تعلق عالم مادی اور عالم اجسام سے ہے اور دوسری طرف سے آسمانی موجودات میں سے کوئی چیز ان کی فعالیت سے مانع بھی نہیں ہے۔ایسا انسان جب کسی اخروی حالت کا معتقد ہوتا ہے اور اس کا ادراک کرتا ہے اور آسمانی اجرام وموجوات ان صورتوں کے وجود میں آنے کے لیے وسیلہ بن جاتے ہیں۔اس طرح سے ان انسانوں کو جو کچھ احوال قبر،قیامت اور اخروی نعمتوں یا عذاب کے بارے میں بتایا گیا تھا اسے وہ آخرت میں مشاہدہ کرتے ہیں اور پاتے ہیں۔

یہاں یہ تصور نہ کیا جائے کہ یہ انسان قیامت میں جن خیالی صورتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ حسی صورتوں سے ضعیف تر ہیں بلکہ وہ خیالی صورتیں تاثیر اور پاکیزگی کے لحاظ سے ان حسی صورتوں پر برتری رکھتی ہیں جیسا کہ خواب میں دیکھی جانے والی صورتیں حسی صورتوں پر برتری رکھتی ہیں بلکہ اخروی صورتیں استقرار کے لحاظ سے خواب والی سے زیادہ پائیدار ہیں کیونکہ رکاوٹوں کے برطرف ہونے،نفس (روح) کے مجرد ہونے اور قبول کرنے کی پاکیزگی (وہ قابل سماوی بدن ہے یا دخانی یا ہوائی بدن) کی وجہ سے یہ صورتیں زیادہ استوار ومحکم ہوں گی۔

اصولی طور پر انسان بیداری یا خواب کی حالت میں ذہنی صورتوں کا ادراک کرتا ہے نہ کہ خارجی واقعیت کا۔فرق صرف یہ ہے کہ خواب کی حالت میں ان صورتوں کی توجہ کا آغاز انسان کے اندر سے ہوتا ہے اور بیداری کی حالت میں توجہ خارج سے شروع ہوتی ہے۔جب صورتیں نفس میں نقش ہوجاتی ہیں تو انسان کا یہ ادراک متحقق ہوجاتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ لذت یا تکلیف کا موجب ذہنی صورتیں ہیں نہ خارجی موجود۔

شیخ الرئیس کے کلام کا یہ حصہ اُس سعادت اور شقاوت کے بارے میں تھا جو ناقص نفوس سے متعلق تھی۔لیکن جونفوس کمال پاچکے ہوں،یہ حالات ان کے لیے نہیں ہیں وہ بدن کے بغیر خود بخود ذاتی کمالات کو پالیتے ہیں اور حقیقی لذت سے سرشار ہوجاتے ہیں۔یہ لوگ اس مادی عالم اور جس جہان میں رہ رہے ہیں اس سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں اور اگر اس عالم کی طرف کچھ توجہ ان کے وجود میں پائی جائے تو اس کے آثار ان کے لیے تکلیف کے موجب بن جاتے ہیں اور وہ علیین کی منزل سے پیچھے رہ جاتے ہیں یہاں تک اس مادی عالم

کی توجہ ان سے زائل ہو جائے۔[1]

جیسا کہ آپ نے دیکھا شیخ الرئیس کی نظر میں انسان دو قسم کے ہیں:

۱۔ پہلا وہ گروہ ہے جس نے بدن سے اپنی توجہ ختم کر لی ہے اور عالم عقل کی طرف متوجہ ہے اور عقلی لذتوں (یعنی عالم بالا کا ادراک) کے پانے یا ان سے محرومیت کے ذریعے جزا و سزا پاتا ہے۔

۲۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو تکامل کے لحاظ سے اس حد تک نہیں پہنچا کہ وہ بدن سے اور مادی جہان سے اپنی توجہ ہٹا لے ان کی روح فلکی یا ہوائی یا دخانی بدن سے تعلق برقرار کرتی ہے اور اسی حالت میں اپنے ملکات کے مطابق صورتوں کا ادراک کرتی ہے کہ یہ صورتیں نورانی یا ظلمانی ہونے کی وجہ سے ان کے لیے جزا و سزا شمار ہوں گی۔

اگر شیخ کے کلام کے آخری حصے کو دقت نظر سے دیکھیں۔ جس میں انہوں نے خیالی صورتوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور انہیں حسی یا خواب والی صورتوں سے پائیدار تر بتایا ہے، تو یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ فارابی ہی کا نظریہ ہے جسے شیخ نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بنا بریں جو نظریہ صدر المتالھین کے ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے (جو ایک جداگانہ نظریہ ہے اسفار جلد ۹، ص ۱۵۰۔ ۱۵۲) یہ نظریہ صحیح اور استوار نہیں ہے بلکہ یہاں پر ایک نظریہ ہے جسے فارابی اور شیخ الرئیس (ابن سینا) نے اختیار کیا ہے اور صدر المتالھین نے نقل کیا ہے کہ غزالی بھی اسی نظریے کا معتقد تھا۔

۳۔ صدر المتالھین اور معاد جسمانی

صدر المتالھین نے بحث معاد میں چند مقامات کے ساتھ معاد جسمانی کا نظریہ پیش کیا ہے اور اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ آخرت میں محشور ہونے والا بدن یہی بدن ہے جو دنیا میں موجود ہے۔ ملا صدرا کے کلمات اور اسی طرح ان کے مکتب کے شاگرد محقق ہادی سبزواری کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی معاد کو ثابت کرتے ہیں جو اہل شریعت میں معروف ہے خصوصاً وہ ان کلمات پر زور دیتے ہیں کہ اخروی بدن بعینہ دنیوی بدن ہے نہ اس کی مثل یا اس کے مبائن۔

لیکن یہ استفادہ و تبادر ان کے کلمات سے ابتدائی ہے جب ان مقدمات کا مطالعہ کیا جائے جو انہوں نے اس مقام میں ذکر کیے ہیں تو وضاحت کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے کہ ملا صدرا معاد جسمانی کو مثالی یا برزخی سمجھتے تھے۔ ان کے بعد اشراقی فلسفہ کے پیرو اسی کے معتقد رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اشراقی یہ ثابت نہ کر سکے کہ اخروی مثالی بدن دنیوی مادی بدن ہی ہے لہٰذا وہ دو بدن کے تباین کے گرداب میں پھنس گئے۔ ملا صدرا نے یہ کام کیا کہ ان دو بدنوں کا ایک دوسرے کا عین ہونا ثابت کر دیا جن میں فرق صرف نقص و کمال کے لحاظ سے ہے اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر کامل وجود ناقص وجود پر مشتمل ہوتا ہے۔

---

[1] شفا مقالہ ۹، فصل ۷، ص ۴۳۱۔ ۴۳۲

جو لوگ معاد جسمانی کو روح کے مثالی بدن کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں وہ درج ذیل دو طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعے اثبات کرتے ہیں۔

۱۔ انسان اس مادی بدن کے علاوہ ایک مثالی بدن بھی رکھتا ہے جو عالم مثال میں موجود ہے (عالم مثال اس مادی عالم سے مافوق ہے اور مادہ کے علاوہ اسی عالم کی تمام صفات سے متصف ہے۔ یہ عالم اس مادی عالم سے کامل تر ہے) انسان کی روح اس دنیوی بدن سے جدائی کے بعد اس مثالی بدن کے ساتھ تعلق برقرار کرتی ہے اور اس کے بعد روح کی فعالیات اسی بدن کے ذریعے انجام پاتی ہیں البتہ روح کی فعالیات و اندیشہ کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتیں۔

یہ وہی نظریہ ہے جسے اشراقی حکما اختیار کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر معادِ جسمانی کی توجیہ کرتے ہیں۔ اس نظریے پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں جنہیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(الف) یہ مثالی بدن جو پہلے سے بنایا جا چکا ہے اس دنیوی بدن سے مختلف ہے لہٰذا آخرت میں محشور ہونے والا بدن اس دنیوی بدن کے علاوہ ہوگا حالانکہ قرآن دونوں بدنوں کے ایک ہونے یا مثل ہونے پر زور دیتا ہے۔

(ب) یہ مثال بدن طبعی طور پر عالم بالا سے روح کے تعلق کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا خود ایک روح رکھتا ہے اب دوسری روح کو قبول نہیں کر سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ایک بدن میں دو نفس جمع ہو جائیں جس سے تناسخ لازم آتا ہے۔

اشراقی اس دوسرے اشکال سے چھٹکارے کی خاطر مثالی بدن کو اپنے مقام سے نیچے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نفس کا بدن کے ساتھ تعلق دو قسم کا ہے۔

۱۔ کبھی تعلق بدن کی تدبیر اور اس میں تصرف کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ روح کا ہمارے دنیوی بدن کے ساتھ ہے۔

۲۔ نفس (روح) کا بدن کے ساتھ اس کی خیالی فعالیت کی انجام دہی کی خاطر ہے کیونکہ قوہ خیال اور اس کی صورتوں کو ایک مقام و محل کی ضرورت ہے اور جب تک بدن نہ ہو موضوع و محل ان صورتوں اور قوہ خیال کے لیے میسر نہیں ہو سکتا۔

مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ آخرت میں بدن کی ضرورت روح کی فعالیات کی خاطر ہے اور اس دنیوی بدن میں روح کے متعلق ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ ایسی صورت میں تناسخ لازم نہیں آتا۔

صدر المتالہین اسی نظریہ کو (روح کے مثالی بدن کے ساتھ تعلق کو) قبول کرتے ہیں اور چند مقامات کے ضمن میں غیر مستقیم طور پر ان دونوں اشکالوں کا جواب دیتے ہیں۔

(اس کی توضیح کچھ یوں ہے کہ) انہوں نے گیارہ مقدمات کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ مثالی اور مادی بدن دونوں ایک ہی چیز ہیں ان میں فرق صرف نقص و کمال کا ہے یعنی مثالی بدن اسی مادی بدن کی تکامل یافتہ صورت ہے اس طرح سے پہلے اشکال (کہ مادی اور مثالی بدن آپس میں تباین رکھتے ہیں) کا جواب دیا ہے۔

دوسرے اشکال کے جواب میں وہ مثالی بدن کو یہ نہیں سمجھتے کہ وہ عالم مثال میں پہلے سے بنایا جا چکا ہے بلکہ ان کے شاگرد عبدالرزاق لاھیجی کے بیان کے مطابق وہ مثالی بدن کو مادی بدن کے ہمراہ سمجھتے ہیں۔اس ضمن میں ان کا بیان یہ ہے:

''جیسا کہ روح بدن کے ساتھ تعلق کے وقت اپنے بدن اور اس کے تمام اجزا اور ظاہری و باطنی اعضا کا تخیل و تصور کرتی ہے اور لامحالہ یہ بدن خیالی ہوگا جو محسوس اور حواس خمسہ ظاہریہ کے ذریعہ ادراک میں آنے والے بدن کے علاوہ ہے۔یہ وہی بدن ہے جسے انسان خواب میں دیکھتا ہے۔انسان کا جب مادی بدن کے ساتھ ارتباط ختم ہوجاتا ہے تو انسان اسی خیال بدن جو اس کا اپنا تخیل تھا کے ساتھ باقی رہتا ہے۔یہی بدن لامحالہ جزئیات اور محسوس صورتوں کے ادراک کا ذریعہ ہوگا۔اس کے لیے روح کو کسی اور جسم کے ساتھ تعلق برقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔[1]

اس بیان کے مطابق مثالی بدن کی حقیقت یہ بنتی ہے کہ مثالی بدن دنیوی زندگی میں خود روح کی مخلوق ہے جو تخیل کے ذریعے وجود میں آتا ہے اور موت کے بعد روح کا تعلق اسی بدن سے برقرار ہوتا ہے نہ کہ مثالی بدن پہلے سے بنایا ہوا کوئی بدن ہے اور نہ ہی ایسا بدن ہے جسے دنیوی بدن کی تکامل یافتہ صورت سمجھا جائے۔

مثالی بدن اس دنیوی بدن کے اندر ایک بدن ہے کہ روح تکامل کے ذریعے دنیاوی بدن سے بے نیاز ہوکر اسی مثالی بدن سے تعلق برقرار کرتا ہے جو اس دنیوی بدن کے دامن میں پرورش پاتا ہے۔اس بات کے پیش نظر مثالی بدن دنیوی زندگی میں روح کا خلق کیا ہوا بدن نہیں ہے بلکہ طبیعت کے تکامل کا نتیجہ ہے کہ روح دو دنیوی بدن سے تعلق منقطع کرنے کے بعد مثالی بدن کے ساتھ تعلق برقرار کرتی ہے اس کے کچھ مدت بعد مثالی بدن سے بھی بے نیاز ہوجاتی ہے اور عالم عقل کے ساتھ مل جاتی ہے۔

امام خمینی قدس سرہ بھی مثالی بدن کی تشریح میں ایک خاص نظریہ رکھتے تھے جسے ہم یہاں ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں:

''اگر خارج میں موجود انسان کے تمام عقلی، خیالی اور حسی قویٰ کو مادہ کے ساتھ ملاحظہ کریں (تو یہ اس کا مادی بدن ہوگا) اور اگر ان تمام قوی کو اسی نظم و شکل میں مادہ کے بغیر تصور کریں تو یہ بدن مثالی ہوگا''۔

نیز فرمایا کرتے تھے:

شاید مثالی بدن سے مراد یہی قوائے نفس ہوں، تمام تفصیلات کے ساتھ''

یہاں پر ہم صدر المتالھین کے نظریہ کی وضاحت کے لیے ان اصول و مقدمات کو ذکر کرتے ہیں جنہیں خود ملاصدرا نے اپنے نظریہ کی وضاحت کے لیے ذکر فرمایا ہے۔

ملاصدرا نے اپنے نظریہ کے بیان کے لیے گیارہ اصول ذکر کیے ہیں لیکن ہماری نظر میں ان میں سے صرف یہ تین اصول پوری طرح

---

[1] گوہر مراد، ص ۴۷۱

دخالت رکھتے ہیں:

ا۔ وجود مختلف مراتب رکھتا ہے

صدر المتالہین کے فلسفہ میں وجود میں تشکیک کا پایا جانا مسلم اصول ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وجود تمام مراتب و مظاہر میں ایک واقعیت وحقیقت رکھتا ہے۔ مراتب میں تفاوت وفرق شدت وضعف اور تقدم وتاخر کے ساتھ ہے یا کمال ونقص کے ساتھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ واقعیات موجود کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور وجود وحدت حقیقت کی وجہ سے کمال ونقص کے لحاظ سے مختلف مظاہر ومراتب رکھتا ہے اور وجود میں کمال کے معنی شدت کے ہیں اور نقص اسی شدت کے فقدان کا نام ہے، تو وجود کے تمام مراتب ''واجب الواجب سے ہیولی تک'' میں صرف ایک حقیقت پائی جاتی ہے جس سے عدم کو دور کرنے والی حقیقت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے زیادہ اس حقیقت کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہے اور یہ تعبیر بھی لفظ کی توضیح وتشریح ہے اور یہ حقیقت مختلف درجات ومراتب رکھتی ہے جیسے واجب الوجود اور ممکن الوجود پھر ممکن الوجود متعدد مراتب رکھتا ہے۔

۲۔ ہر شے کی حقیقت اس کی صورت ہوتی ہے

کسی شے کے وجود میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک صورت اور ایک مادہ لیکن اس شے کی واقعیت اس کی صورت سے تشکیل پاتی ہے نہ کہ اس کے مادہ سے حتیٰ کہ اگر ہم اس کی صورت کو مادہ کے بغیر خارج میں ایجاد کرسکیں تو ہم نے اس کی واقعیت کو موجود کردیا ہے مثلاً ایک میز جو لکڑی سے مستطیل صورت میں بنائی گئی ہے تو اس میز کی واقعیت اس کی یہی صورت وشکل ہے، لکڑی اس کی واقعیت نہیں ہے (چونکہ اسی لکڑی سے کوئی دوسری چیز بھی بنائی جاسکتی ہے) انسان بھی اگرچہ مختلف اجناس (جماد، نبات، حیوان) سے تشکیل پایا ہے لیکن انسان کی واقعیت اس کی فصل ہے جو اس کی صورت ہے اور اس کی فصل وہی اس کا تعلق وتفکر کا مرتبہ ہے اور اگر اس کو اجناس (قریب وبعید) کے بغیر خارج میں ایجاد کرنا ممکن ہو تو ای سے انسان کا تحقق ہوجائے گا اور یہی قانون ان موجودات میں بھی جاری ہے جو پست مرتبہ سے ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں ان کی حقیقت ان کا آخری کمال ہے۔ اس سے پہلے والے مقدمات اس کی واقعیت وحقیقت میں کوئی دخالت نہیں رکھتے بلکہ صرف اس کی آمادگی میں دخیل ہیں لہٰذا اگر ان مقدمات کے بغیر آخری کمال تک پہنچنا ممکن ہوتا تو ان مقدمات کی ضرورت نہ تھی۔

اس حساب سے صدر المتالہین مدعی ہیں کہ انسان کا تشخص اس کے مادہ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس کی صورت اور آخری کمال کے ساتھ ہے اور وہ نفس ہے جو بدن کے ساتھ وحدت پیدا کرکے اس میں تدبیری تصرف کرتا ہے۔

۳۔ وجود کے تین عالم

صدر المتالہین کے نزدیک تمام موجودات تین طولی[1] مراتب رکھتے ہیں۔

۱۔ عالم طبیعت جس میں کون وفساد ہے۔

۲۔ عالم صور یا عالم مثال جو مادہ واستعداد سے مجرد ہوتا ہے۔

۳۔ عالم عقول ونفوس

بعبارت دیگر تین عالم یہ ہیں:

۱۔ نشاہ طبیعت (متغیر ومتبدل طبیعی صورتیں)

۲۔ نشاہ مثال (مادہ سے مجرد ادراک کی صورتیں)

۳۔ نشاہ عقول (کہ یہ صور عقلیہ اور الٰہی مثالیں)

تمام موجودات میں سے صرف انسان ہے جو کمال کی حرکت کے دوران میں وجود کے ہر سہ مرتبہ سے مستفید ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح سے ہے:

۱۔ انسان جب دنیا میں آتا ہے مراحل کمال طے کرتا ہوا بڑھاپے تک پہنچتا ہے یہ مادی انسان ہے جو مادہ اور اس کے آثار سے مستفید ہوتا ہے۔

۲۔ آخری عمر میں انسان کے وجود میں ایک خاص لطافت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے موت کے وقت وہ آخروی انسان بن جاتا ہے جو تمام قویٰ اور انسانی اعضا رکھتا ہے صرف دنیوی مادہ اس میں نہیں ہوتا۔ اس اخروی انسان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی مادی انسان سے نکلا ہے اس میں اس مادی انسان کے تمام مراتب حرکت جمع ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس انسان نے تمام نقائص سے پاک ہو کر کمال حاصل کر لیا ہے۔

۳۔ کچھ مدت کے بعد وہ انسان اخروی ایک اور ہستی کی طرف قدیم بڑھاتا ہے اور عقلی انسان بن جاتا ہے البتہ اس صورت میں اس کے قویٰ واعضا عقلی ہوں گے۔

انسانی وجود کے یہ تین نشاہ قوس صعودی اور خدا کی طرف برگشت کے مرحلے میں ہوتے ہیں جبکہ قوس نزولی اور خدا کی طرف سے وجود پذیر ہوتے وقت اس کے برعکس ہوتا ہے کہ فیض عالم عقل سے عالم مثال اور عالم مثال سے عالم طبیعت پر نازل ہوتا ہے۔

---

[1] طولی مراتب سے مراد یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا مرتبہ ہے۔ (مترجم)

ان اصولوں کا نتیجہ

ان اصولوں کی بنیاد پر صدرالمتالہین معاد کو اگر چہ معادِ جسمانی سمجھتے ہیں لیکن مثالی بدن کے ساتھ اور کہتے ہیں کہ پہلے مقدمہ کی بنا پر وجود کمال ونقص کے لحاظ سے کئی مراتب رکھتا ہے اور طبعی طور پر انسانی بدن میں بھی۔ یہ مراتب ہوں گے اور تیسرے مقدمہ کے لحاظ سے انسان کے لیے تین قسم کے عالم اور وجود کے تین قسم کے مرتبے اس کے لیے تصور کیے جائیں گے جو کہ نشاہ طبیعت، نشاہ مثال اور نشاہ عقل ہیں اور دوسرے مقدمہ کے مطابق ہر شے کی حقیقت و واقعیت اس کی صورت کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے مادہ کے ساتھ یعنی انسان کی واقعیت اس کی روح ونفس کے ساتھ ہے نہ کہ کسی اور چیز کے ساتھ۔ پس ان تین عوالم میں وجود نفس کے لحاظ سے جو انسان کی صورت ہے اس کی وحدت محفوظ رہے گی۔

ان تین مقدمات کی بنا پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان خدا کی طرف سفر کرتے ہوئے موت کے وقت ایک مثالی انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اسی دنیوی انسان کی واقعیت یعنی نفس وروح کا حامل ہوتا ہے لیکن اس مرحلے میں وہ مادہ سے خالی ہوگا اگر چہ صورت کے لحاظ سے وہی دنیوی صورت اس میں ہوگی۔

نیز وجود کے مراتب میں چونکہ تشکیک پائی جاتی ہے اس لحاظ سے یہ مثالی بدن اس دنیوی بدن سے کامل تر ہے اور ناگزیری طور پر قیامت کے دن میدان محشر میں جو انسان وارد ہوگا وہ بالکل دنیوی انسان ہے لیکن اس سے کامل ترین وہ ہوگا۔ یہ اس کے مثل بھی نہیں ہے اور اس کے مابین اور متضاد بھی نہیں ہے بلکہ اُس کے ساتھ اس کا فرق صرف کمال ونقص کے لحاظ سے ہے، صرف اس وجہ سے کہ اخروی بدن (مثالی بدن) فاقد مادہ ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس دنیوی انسان کے مباین ہے کیونکہ صورت وہی ہے صرف آخرت میں مادہ نہیں ہے اور مادہ کا نہ ہونا اس کے کما کی نشانی ہے نہ کہ نقص کی۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عالم طبیعت اپنی غایت ومقصود کو پہنچ جاتا ہے اور جو کچھ عالم کون وہستی میں ہے خدا کی طرلوٹ جاتا ہے۔ البتہ بات صرف اتنی ہے کہ اس واپسی کے سفر میں تمام نقائص، کھال اور چھلکے اتار کر مغز اور کمال کو اپنے ساتھ اوپر لے جاتا ہے۔[1]

صدرالمتالہین کے نظریہ کی تحلیل

یہ نظریہ جو گیارہ مقدمات پر استوار کیا گیا ہے کئی جہات سے قابل اشکال ہے، ہم کچھ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(الف) صدرالمتالہین کے پورے کلام سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے کہ دنیوی بدن اپنی حرکت وتکامل کے ساتھ ساتھ اخروی بدن کی پرورش بھی کرتا رہتا ہے اور حقیقت میں اخروی بدن اس دنیوی بدن کا باطن ہے اور یہ بدن اُس بدن کا ظاہر ہے اور قیامت کے دن نفس کا اُسی باطنی بدن کے ساتھ تعلق برقرار ہوگا۔

---

[1] اسفار جلد ۹ ص ۱۹۸۔۱۹۹، باب ۱۱، فصل ۱

اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اس جہان میں نفس اور بدن اپنی حرکت کا آغاز اکٹھے کرتے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے کمال کی طرف گامزن ہوجاتا ہے نفس کامل تجرد کی طرف بڑھتا ہے تو بدن لطافت کی طرف جس کے نتیجہ میں مثالی بدن میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نفس کا تعلق بدن کے ساتھ کسی علت و ملاک کے بغیر نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی وجہ کے بغیر ان میں وحدت وترکیب متحقق نہیں ہوسکتی، لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ نفس کو اس بدن کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ اس سوال کے جواب کے ضمن میں دو احتمال پائے جاتے ہیں اور صدرالمتالہین کے کلام میں اس کی وضاحت موجود نہیں ہے۔ وہ دو احتمال یہ ہیں:

۱۔ ضروری ہے کہ نفس اپنے تکاملی کی راہ میں کچھ مدت اس بدن (مثالی بدن) کے ساتھ رہے تا کہ اپنا تکامل سفر طے کرکے عالم عقل کے ساتھ مل جائے۔

۲۔ نفس اپنے ادراکات اور ثواب وعقاب کے پانے کے لیے اس بدن کا محتاج ہے۔

یقیناً یہ دوسرا احتمال منتفی ہے چونکہ صدرالمتاہین نے گیارہ مقدمات میں سے ایک مسلم مقدمہ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قوہ خیالیہ ایک ایسا جوہر ہے جو خود نفس کے ساتھ قائم ہے نہ کہ بدن اور اس کے اعضا کے ساتھ۔

علاوہ ازیں صدرالمتالہین نے ایک مقدمہ یہ ذکر کیا ہے کہ خیالی صورتیں نفس حال نہیں ہیں۔ جیسے کوئی شے کسی مقام ومحل میں حال ہوتی ہے بلکہ یہ صورتیں نفس کے ساتھ قائم ہیں جیسا کہ معلول علت کے ساتھ قائم ہوتا ہے جیسے قوہ خیال جوان صورتوں کی خالق ہے، استقلال رکھتی ہے اور بدن میں حلول نہیں رکھتی اسی طرح یہ خیالی صورتیں بھی استقلال رکھتی ہیں اور بدن کی محتاج نہیں ہیں۔ نتیجتاً نفس کو بدن کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کیونکہ نفس تخیل کے ذریعے اچھی یا بری صورتیں اپنی طبع وفلکہ کے مناسب خلق کرسکتا ہے اور فرض یہ ہے کہ ثواب وعقاب ان قبیح اور اچھی صورتوں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر اس عالم میں نفس کو خارج سے صورتیں قبول کرنے کے لیے بدن اور مادی آلات کی ضرورت ہے مثلاً آنکھ کے ذریعے طبیعی عمل اور ردعمل انجام پاتا ہے اس کے بعد نفس میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ اپنے عالم میں خارجی صورت کے مشابہ کوئی صورت خلق کرسکے اگر آنکھ نہ ہوتی تو نفس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہوسکتی حالانکہ آخرت میں معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ دنیا میں صورتیں خارج سے نفس پر وارد ہوتی ہیں جب کہ اُس جہان میں باطن اور تخیل کے ذریعے اچھی اور بُری صورتیں خلق ہوں گی۔ ایسی صورت میں بدن مثالی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے جب دوسرا احتمال رد ہوگیا تو ہم پہلے احتمال کو اختیار کریں گے جو یہ تھا کہ نفس اپنے کمال میں اور راہ سعادت طے کرنے کے لیے مثالی بدن کا محتاج ہے۔ لیکن اس احتمال کے اختیار کرنے میں بھی دو قسم کا ابہام پایا جاتا ہے

اولاً:

عالم عقل کے ساتھ اتصال اور وجود عقلی میں تحول کی صلاحیت تمام انسانوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ اکثر انسانوں میں مادی پہلو غالب ہوتا ہے اور ایسے افراد کبھی عالم عقول ومفارقات (مجردات) کے ساتھ تعلق پیدا نہیں کرسکتے۔ ایسی صورت میں مثالی بدن کے ساتھ زندگی مکمل

طور پر ہدف وملاک کے بغیر ہوگی۔

ثانیاً:

اس احتمال کا لازمہ یہ ہے کہ کامل انسان یا متوسط لوگ (جو مکمل طور پر کامل نہیں ہوئے لیکن اس تکامل کے قریب پہنچے ہوئے ہیں) کچھ مدت کے لیے اس بدن کے ساتھ زندگی گزاریں گے ضرورت کے پورا ہوتے ہی اسے چھوڑ کر عالم عقل کے ساتھ مل جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاد جسمانی صرف کچھ مدت کے لیے ہوگا حالانکہ ہم دائمی معاد جسمانی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

(ب) صدر المتالہین کے نظریہ کے مطابق یہ تین عوالم ایک دوسرے کے ساتھ اتصال رکھتے ہیں۔ عالم عقل کی جڑیں عالم مثال میں اور نتیجتاً عالم طبیعت میں بھی ہیں۔ اسی طرح عالم مثال کی جڑیں عالم طبیعت میں پائی جاتی ہیں اور یہ تینوں عوالم ایک دوسرے سے جدا ایک دوسرے کے مقابلے میں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں (جیسے علت ومعلول ایک دوسرے کے طول میں ہوتے ہیں) اور ارسطو کے بقول ''الکل فی الکل'' ہیں۔ بنابریں نفس عالم طبیعت میں ہوتے ہوئے یہ تینوں مرتبے رکھتا ہے۔ عالم طبیعت کے ساتھ ربط رکھتا ہے چونکہ یہی عالم اس کی حیوانی زندگی کا مبدا ہے اور عالم مثال کے ساتھ ربط رکھتا ہے چونکہ حسی مجرد صورتوں کا ادراک کرتا ہے اور عالم عقول کے ساتھ ربط رکھتا ہے چونکہ کلی مفاہیم اور مطلق حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ دوسرے جہان میں جب نفس میں قدرت بھی زیادہ ہوگی کیوں نفس اس ''جمع الجمعی'' حالت کو محفوظ نہ رکھ پائے گا بلکہ چاہیے کہ مثالی بدن میں محشور ہوتے ہوئے بھی عنصری ومادی بدن رکھتا ہو۔ اسی طرح ان دو بدنوں کے ہوتے ہوئے بھی عالم عقول پر توجہ برقرار رکھے واضح لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ جیسے عالم عقول عالم نفوس اور عالم طبیعت کی تدبیر کرتا ہے یعنی عالم عقل کا مکمل طور پر مجرد ہونا اسے عالم طبیعت کی تدبیر سے مانع نہیں ہوسکتا، اسی طرح یہ حقیقت نفس کے بارے میں بھی محقق ہونی چاہیے کہ وہ بھی عقلی تجرد کے باوجود عالم مثال اور عالم طبیعت میں تحقق پیدا کر سکے۔

(ج) اسلامی متکلمین اور جسمانی معاد

معاد جسمانی کی حقیقت کے بارے میں میں آخری اور مشہور نظریہ وہ ہے جسے اسلامی متکلمین نے پیش کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پروردگار بدن کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے ان سے پہلے بدن جیسا بدن بنائے گا اور روح کو اس کی طرف لوٹائے گا۔ ایسی صورت میں اگرچہ یہ بدن کی بعینہ معاد ضروری نہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ نئی خلقت بھی ہو اور بعینہ پہلا بدن بھی ہو لہٰذا دوسرے بدن کو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے بدن جیسا ہے اس کا عین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور قرآن میں بھی مماثلت ہی کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ

(یٰسین: ۸۱)

''جس خدا نے زمین وآسمان کو خلق کیا ہے کیا وہ قدرت نہیں رکھتا کہ انہی انسانوں کی مثل دوبارہ خلق کر سکے''

یہاں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر تشخص کے لحاظ سے یہ دوسرا بدن پہلے بدن کا غیر ہے تو پھر جزا و سزا اسے کیسے ہو سکے گی جبکہ اس کا مستحق پہلا بدن ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کہ جزا و سزا کی حقیقت جزا و سزا کا مالک ادراک ہے اور ادراک نفس (روح) کے ذریعے ہوتا ہے بدن تو صرف وسیلہ ہے اور فرض یہی کی اگیا ہے کہ اس بدن کا مادہ وہی پہلے بدن والا ہے جو اپنی صورت کھو چکا تھا اور دوبارہ ایک نئی خلقت میں اپنی پہلی صورت کو حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان بچپن سے بڑھاپے تک کی منازل طے کرتا ہے ایک ہی انسان ہے حالانکہ ہر زمانے میں اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے جوانی میں کوئی جرم کیا ہو اگر بڑھاپے میں پکڑا جائے تو بھی اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا کہ یہ وہ مجرم نہیں ہے۔

اسلامی متکلمین کہتے ہیں کہ ہمارے پاس معاد جسمانی کے اس نظریہ کی دلیل وہ بیانات ہیں جو آسمانی شریعتوں نے فرمائے ہیں اور خاص کر آسمانی کتب میں سے قرآن اور انبیا میں سے خاتم الانبیاء نے انہیں ہم تک پہنچایا ہے بلکہ معتزلہ نے معاد جسمانی کے اس نظریہ پر عقلی دلیل بھی قائم کی ہے۔[1]

ہم بھی یہاں پر عرض یہ کرتے ہیں کہ معاد جسمانی کے جس تصور کو اسلامی متکلمین نے ذکر کیا ہے ظواہر قرآن و سنت مکمل طور پر اس کی تائید کرتے ہیں اور سابقاً معاد جسمانی سے مربوط آیات کے ضمن میں ہم ایسی آیات ذکر کر چکے ہیں جو اس قسم کی معاد پر دلالت کرتی ہیں اب دوبارہ ان کی تکرار کی ضرورت نہیں۔

اب ہم یہاں اس گفتگو کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو معاد روحانی کے قائل حضرات کرتے ہیں۔ وہ ان آیات کے بارے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ ان آیات سے مراد نفوس کی سعادت و شقاوت ہے اگرچہ آیات ظاہراً کچھ اور کہہ رہی ہیں اور آیات میں اس قسم کا تصرف اس لیے کرتے ہیں چونکہ انبیا کے بھیجنے کا مقصد انسانوں کی راہ حق کی طرف ہدایت اور عملی و نظری لحاظ سے انہیں تکمیل و کمال تک پہنچانا تھا بلکہ ان کے علاوہ ان کے بھیجنے میں نظام اجتماعی، جس میں تمام لوگوں کے لیے مصلحت ہو کا تحفظ بھی انبیا کی بعثت کے اسباب میں سے تھا اور اس قسم کا ہدف لذت والم والی چیزوں کی ترغیب و ترہیب کے پرتو میں انجام پایا ہے۔

اور چونکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو روحانی لذات و کمالات کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ ان کی زیادہ توجہ حسی لذات و آلام کی طرف رہتی ہے اور اسی میں اپنی آرزوؤں کی تلاش میں رہتے ہیں لہٰذا انبیا نے بھی ان کے ساتھ اسی لہجے میں گفتگو کی ہے یعنی حسی و جسمانی نعمات کی نوید دی ہے اور جسمانی عذاب سے ڈرایا ہے تاکہ اس امید و بیم کے پرتو میں وہ کلی ہدف یعنی "تکمیل نفوس" اور بقائے نظام حاصل ہو سکے اور حقیقت میں لذات و آلام کے بارے میں قرآن فرمودات صرف مثال و سمبل کے طور پر تھے۔ ورنہ آخرت میں پھل ہے نہ تخت، حور ہے نہ قصور، آگ ہے نہ اس کے شعلے، اس بارے میں تمام قرآنی فرمودات ایک قسم کی عقلی سعادت و شقاوت کے لیے کنایہ ہیں۔ آخر کار یہ لوگ کہتے ہیں کہ معاد

---

[1] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۱۔ ۲۱۲

جسمانی سے مربوط آیات جبر و تجسیم سے مربوط آیات کی نسبت زیادہ تو نہیں ہیں۔ جیسے عقلی دلائل کی روشنی میں جبر و تجسیم والی آیات کی تاویل کی جاتی ہے۔ اسی طرح معاد جسمانی والی آیات کی بھی تاویل ممکن ہے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اسی نظریہ کی نسبت معلم دوم ابونصر فارابی سے بھی دی ہے۔[1]

دو باتوں پر توجہ کرنے سے اس نظریہ کا جواب معلوم ہو جائے گا۔

۱۔ اس نظریہ کا لازمہ یہ ہے کہ انبیا نعوذ باللہ ہمیشہ جھوٹ کہتے رہے ہیں اور حقیقت حال کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اگر کسی ایک آیت کے سمبل اور مثال ہونے کو مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام آسمانی کتب اور خصوصاً قرآن کی بہت ساری دوسری آیات بھی اسی طرح ہوں گی ورنہ اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ قرآن کی تمام آیات مطالب کے لحاظ سے متزلزل ہیں اور جیسے کوئی چاہے معاد کی تفسیر کرلے اور معاد کے نظریہ کی طرف دعوت کو صرف صورۃ دعوت اور نظام زندگی کے تحفظ کا ذریعہ شمار کرلے۔

۲۔ معاد سے مربوط آیات اور جبر و تشبیہ سے مربوط آیات (فرضاً اگر مان لیں کہ وہ آیات جبر و تشبیہ پر دلالت کرتی ہیں) میں واضح فرق موجود ہے۔ تجسیم و جبر صریحاً خلاف عقل ہیں لہٰذا ان آیات کی تاویل کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے جبکہ عقیدۂ معاد نہ صرف یہ کہ مخالف عقل نہیں ہے بلکہ قرآن نے اس کی طرف دعوت بھی دی ہے لہٰذا معاد سے مربوط آیات کی تاویل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

---

[1] شرح مقاصد، جلد ۲، ص ۲۱۳

معاد جسمانی عقل کے ترازو میں

یہاں تک معاد روحانی و جسمانی کا قرآن کی رو سے بیان تھا نیز اسلامی حکما و متکلمین کے نظریات بھی بیان ہو چکے۔ اب ہم معاد جسمانی و روحانی کو عقل و برہان کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

پہلے معاد جسمانی کے بارے میں سابقہ دو معیاروں کے مطابق عقل کی نظر کا جائزہ لیتے ہیں۔ البتہ یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ دوسرے معیار کے مطابق معاد جسمانی کا تحقق پذیر ہونا تبھی ممکن ہے کہ پہلے معیار کے مطابق معاد جسمانی کا امکان ثابت ہو چکا ہو۔ یعنی اگر کوئی شخص معاد جسمانی کو پہلے معیار کی بنیاد پر غیر ممکن سمجھتا ہے تو اس کو معاد جسمانی کے بارے میں دوسرے معیار کی بنیاد پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حسی نعمات و آلام کا قیامت میں پانا بدن کے محشور ہوئے بغیر ممکن ہی نہیں لہٰذا جب پہلے معیار کی بنیاد پر عقل کے نزدیک معاد جسمانی ممکن و بال اشکال ہوجائے گا تو ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ معاد جسمانی (یعنی قیامت کے دن حسی لذات و آلام کا پانا) کوئی اشکال نہیں رکھتا بلکہ ایک حتمی و قطعی امر بھی ہے کیونکہ اگر حسی لذات و آلام وجود نہ رکھتی ہوں اور صرف روحانی پاداش و نعمات ہوں تو بدن کو محشور کرنا ایک لغو و عبث کام ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ کی حکیم ذات سے سرزد ہونا ممکن نہیں ہے۔

البتہ ان حسی نعمتوں اور عذاب کی کیفیت و مقدار کے لحاظ سے خصوصیات کو عقلی دلیلوں سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ عقل صرف یہ کہہ سکتی ہے کہ بدن کے ساتھ محشو ہو تو حسی جزاء و سزا کا تحقق بھی ہوگا اس جزا و سزا کی مقدار کیا ہوگی یا کیسی ہوگی عقل اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی اور شاید شیخ الرئیس نے جو اپنی کتاب الہیات شفا میں کہا ہے کہ معاد جسمانی کو عقل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف قرآن و وحی نبوی کی تصدیق کے باعث مورد قبول ہے۔ ان کی مادبھی یہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کیونکہ انہوں نے دو قسم کی معاد کا ذکر کیا ہے۔ ایک قسم کو عقلی لحاظ سے بھی قابل اثبات جانا ہے اور دوسری قسم کے قبول کو صرف تصدیق شریعت میں منحصر جانا ہے اور یہ جزا و سزا (لذات و آلام) کی بنیادوں پر جسمانی و روحانی معاد ہی ہے اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ان لذات و آلام کو کمیت و کیفیت کی خصوصیات کے ساتھ عقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (الهيات شفا مقاله ۹، ص ۷)

بنابریں شیخ الرئیس کو اس کلام کی وجہ سے معاد جسمانی کا منکر شمار کرنا زیادتی ہوگی جس کا سبب شیخ کے کلام میں غور و تدبر کا نہ کرنا ہے۔

بدن کا احیاء ذاتاً ممنوع نہیں

جب کہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معاد جسمانی میں عقلی بحث کے لحاظ سے اصلی بحث میں پہلے معیار (یعنی بدن کا روزِ قیامت محشور ہونا) کی بنیاد پر ہے لہٰذا دیکھا یہ جائے کہ اس بارے میں عقل کیا کہتی ہے؟

کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے میں سب سے پہلے جو چیز عقل کو متوجہ کرتی ہے وہ اس واقعے کا ذاتی امکان یا امتناع ہے پس دیکھنا یہ چاہیے کہ مرنے کے بعد بدن کا زندہ ہونا ممکن واقعات میں سے ہے یا ایک محال و ممتنع چیز ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عقلی لحاظ سے ایسا ہونا ممنوع ومحال شمار نہیں کیا جاتا جبکہ معاد جسمانی کی وجہ سے کوئی عقلی مشکل پیش نہیں آتی توضیح مطلب یہ ہے کہ کسی واقعے کے محال ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دونقیض ومتناقض چیزوں کا اجتماع یا ارتفاع لازم آئے یا ایسی چیز لازم آئے جس کی برگشت اجتماع یا ارتفاع نقیضین کی طرف ہو جیسا کہ دور[1] وتسلسل[2] العلل ہے کہ جو عقلی لحاظ سے ممتنع ہے اس لیے کہ اس کی بازگشت اس امر کی طرف ہے کہ ایک موجود علت ہو بھی اور نہ بھی ہو یا مثلاً یہ کہ کسی چیز کا تحقق ہو بھی اور نہ بھی ہو یا اس کی ہستی غیر سے وابستہ ہو بھی اور نہ بھی ہو اور ان تمام صورتوں میں اجتماع نقیضین لازم آتا ہے جبکہ معاد جسمانی کی وجہ سے کسی طور پر بھی دو متناقض چیزوں کا ارتفاع یا اجتماع لازم نہیں آتا۔

صدر المتالہین فرماتے ہیں کہ معاد کے منکرین سے پوچھ جائے کہ کیا تم معاد کے امکان کے منکر ہو یا نہیں اگر اس کے امکان کے منکر ہو اور معاد کو ممتنع سمجھتے ہو تو اس پر دلیل لاؤ جبکہ تمہاری باتوں میں اس مطلب پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی اور اگر معاد کو ممکن سمجھتے ہو تو ہم کہیں گے کہ جو چیز ممتنع ومحال بھی نہیں ہے اور ایک سچے مخبر کی طرف سے اس کے وقوع کی خبر بھی دی گئی ہے تو اسے دلیل وبرہان کے دائرے کے اندر قبول کرلیا جائے گا۔ اسفار جلد ۹ ص ۱۶۷

اصولاً اگر دیکھا جائے تو فلسفہ وکلام کی تاریخ میں بھی ابھی تک مخالفین معاد جسمانی نے اس کو محال امور میں سے شمار نہیں کیا۔

منکرین معاد جسمانی کے تین شبہات

ان دس شبہات کے علاوہ کہ جنہیں قرآن نے منکرین معاد کی طرف سے بیان کیا ہے اور سابقاً ان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے علم کلام وفلسفہ کی کتابوں میں منکرین معاد کی طرف سے تین اور شبہات کو ذکر کیا گیا ہے مناسب یہ ہے کہ یہاں پر ان کا ذکر بھی کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ معاد کا تحقق نہ صرف یہ کہ ذاتی امتناع نہیں رکھتا بلکہ اس کے وقوع سے کسی قسم کا اشکال پیش نہیں آتا۔ بالآخر یہ قطعی نتائج ہمارے سامنے آئیں گے۔

۱۔ قطعی دلیلیں معاد کے وقوع کو ایک ضروری اور لازم امر کے طور پر ثابت کرتی ہیں۔

۲۔ معد جسمانی (اور روحانی) کا تحقق ووقوع امتناع ذاتی نہیں رکھتا۔

۳۔ معاد کے وقوع سے کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔

---

[1] دور: یعنی دو چیزیں ہوں اور ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسری پر موقوف ہو۔ اس سے اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ چونکہ اس سے ایک شے کا وجود وعدم جمع ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

[2] تسلسل: سلسلہ علل موقوف نہ ہو اور رُکے نہیں بلکہ ہر علت کے وجود کے لیے ایک اور علت کی ضرورت ہو۔ اس سے متناہی ولامتناہی کا اجتماع لازم آتا ہے۔ (مترجم:

۴۔ پس ایک محقق وانصاف پسند شخص کے لیے معاد کو قرآن کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ان شبہات کو یہاں پر ذکر کیا جائے اگر چہ ان شبہات کو صحیح مان لینے سے معاد کے امکان ذاتی کی نفی نہیں ہو جاتی بلکہ حکمت و مصلحت کے متضاد ہونے کی وجہ سے صرف معاد کے وقوع کی نفی ہو سکتی ہے۔ وہ تین شبہات درج ذیل ہیں:

۱۔ معاد ''اعادۂ معدوم'' کے باب میں سے ہے۔

۲۔ شبہ آکل و ماکول

۳۔ انسان اور جہان کو معاد لغو وعبث کام ہے۔

اب ان شبہات کا جدا جدا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ معادہ۔ اعادۂ معدوم ہے

دو قسم کے لوگ اس شبہ میں گرفتار ہوئے ہیں:

ایک وہ لوگ جو بطور کلی معاد کا انکار کرتے ہیں دوسرے وہ لوگ جو صرف معاد جسمانی کے منکر ہیں یہ دونوں گروہ کہتے ہیں کہ موت کے بعد بدن کی صورت معدوم ہو جاتی ہے لہٰذا اس کا دوسرے جہان میں زندہ ہونا اور دوبارہ اٹھنا معدوم کا اعادہ ہوگا کہ جو عقل کی نظر میں محال اور غیر ممکن ہے۔

متکلمین کا جواب

متکلمین اس شبہ کے جواب میں کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ اعادہ معدوم محال نہیں ہے بلکہ ممکن ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ روز قیامت بدن کا لوٹنا اعادہ معدوم نہیں ہے۔ اسی بات کو علمی اصطلاح ہیں یوں کہہ لیں کہ متکلمین نے شبہ کے صغریٰ و کبریٰ دونوں میں خدشہ کیا ہے۔

محقق سعد الدین تفتازانی یہ اشکال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً اعادۂ معدوم محال نہیں ہے وثانیاً اعادہ معدوم کا محال ہونا مان بھی لیں تو بھی جواب یہ ہے کہ قیامت میں بدن کے اعادہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بدن ان تمام خصوصیات کے ساتھ اٹھایا جائے گا جو دنیوی زندگی میں رکھتا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ بدن کے بکھرے ہوئے اجزاء دوبارہ جمع کیے جائیں اور انہیں زندگی سے نوازا جائے گا۔ تفتازانی اس جواب کے بعد ایک اور اشکال سے دوچار ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ اُن کے جواب کا لازمہ یہ ہے کہ اخروی و دنیوی بدن آپس میں اتحاد و عینیت نہ رکھتے ہوں۔ تفتازانی اس اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں:

دنیوی واخروی بدن کا اتحاد معاد جسمانی کی شرائط میں سے نہیں ہے بلکہ صرف عرفاً دو بدن کا ایک ہونا کافی ہے یعنی صرف یہی کافی ہے کہ ایک بدن کو دیکھ کر کہا جائے کہ یہ فلاں بدن ہے۔ [1]

---

[1] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۳

تکمیل وتوضیح

یہ عرض کر دیا جائے کہ ان دو جواب میں سے قابل بحث اور جو اشکال کے لیے جواب ہوسکتا ہے۔ یہی دوسرا جواب ہے پہلا جواب درست نہیں ہے کیونکہ اعادہ معدوم تمام خصوصیات کے ساتھ بلا شک و بحث محال ہے یہی وجہ ہے کہ فخر رازی جیسے افراد جو عموماً حکما کے برخلاف نظریہ پیش کرتے ہیں اور اپنی تشکیک والی روش پر گامزن رہتے ہیں وہ بھی امتناع اعادۂ معدوم کو بدیہی امور میں سے شمار کرتے ہیں۔ (شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۰۹)

اور اعادہ معدوم کے محال ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اعادہ معدوم خلقت مجدد کی صورت میں ہوسکتا ہے اور جب خلقت مجدد ہوگی تو اسے اعادہ معدوم نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ خلقت مماثل کہلائے گی۔

دوسرے لفظوں میں، اگر مراد یہ ہے کہ زمانے کو پیچھے کی طرف لوٹایا جائے کہ جو چیز اس دوسرے زمانے میں معدوم ہے اسے پہلے زمانے میں موجود دیکھا جائے تو اس کے لیے اگرچہ دوسری خلقت کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ اعادہ معدوم نہیں ہے بلکہ یہ شے کے وجود کا خود اس کے اپنے ظرف وجود میں مشاہدہ ہے اور تمام معدومات میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک وقت میں وہ موجود ہوتے ہیں اس کے بعد معدوم ہوتے ہیں اور اگر مراد شے کا دوسرے زمان میں تحقق ہے تو یہ خلقت مجدد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ خلقت مماثل ہی ہوگی نہ کہ اعادۂ معدوم۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعادۂ معدوم یا مشاہدہ معدوم ہے در ظرف وجود یا ایجاد مماثل ہے پس اعادہ معدوم محال ہوگا۔

تو گویا شبہ کے کبریٰ میں خدشہ ممکن نہیں ہے اہم شبہ کے صغریٰ کا ابطال ہے اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے دن بدن کا زندہ کرنا از قبیل اعادۂ معدوم نہیں ہے۔

اس جواب کی توضیح وتشریح

موت کے بعد دو چیزیں باقی رہتی ہیں:

۱۔ بدن کے متفرق اجزاء جو مٹی بن کر زمین میں بکھر جاتے ہیں۔

۲۔ روح جو فرشتہ قبض کر لیتا ہے اور خدا کے نزدیک محفوظ رہتی ہے۔

ان دو کے بارے میں تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ معدوم ہو چکے ہیں بلکہ دونوں وجود رکھتے ہیں صرف جو چیز معدوم ہوئی ہے اور اسے خلقت مماثل ملے گی وہ اجزائے بدن کی اجتماعی خصوصیات ہیں جو روح حیوانی کا سرچشمہ ہیں۔

دراصل اشکال کی بنیاد یہ تصور بنا ہے کہ موت کی وجہ سے بدن کے کچھ اجزاء نابود ہوجاتے ہیں۔ یعنی انسان کے بارے میں تصور وہی تھا جو ایندھن کے بارے میں اس کے جل جانے کے بعد تھا۔

گذشتہ زمانے میں غالباً اور آج بھی کچھ لوگوں کا تصور یہی ہے کہ جو ایندھن جل رہا ہے وہ ایک بے وزن جرم (آگ) میں تبدیل ہو

جا تا ہے جس سے دھواں اٹھتا ہے اور معدوم ہو جا تا ہے اور اس سے صرف راکھ ہی باقی رہ جاتی ہے۔لیکن فرانس کے کیمسٹری کے ماہر''لاوازیہ'' نے ۱۷۷۵ء میں یہ اعلان کیا کہ اجرام کبھی معدوم نہیں ہوتے کیونکہ جو اجسام کیمیائی یا حیاتی عمل ورد عمل کے نتیجہ میں وارد یا خارج ہوتے ہیں ان اوزان کا حاصل جمع دونوں طرف سے مساوی ہوتا ہے کیمیائی عمل اور رد عمل یا حیاتی آ ثار نہ کسی چیز کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ دنیا کے وزن میں ایک مثقال کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

عالم، جرم کے لحاظ سے یا ہمارے عرف میں وزن کے لحاظ سے ثابت و جامد ہے صرف صورتیں بننے بگڑنے کی حالت میں ہیں نتیجتاً کیمسٹری کے اس ماہر نے اپنی تحقیق کے ذریعے یہ بات دریافت کر لی کہ عالم طبیعت میں کوئی چیز معدوم نہیں ہوتی اور کیمیائی فعل وانفعال کے باوجود اجسام کا وزن ثابت رہتا ہے۔اس قانون کی جو درحقیقت فنا کے انکار کی پہلی ندا اور بشر کی زبان سے ابدیت کا اعلان ہے'' قانون بقائے مادہ''[1] کہا جاتا ہے۔

آ ج ''لاوازیہ'' کے قانون کو'' قانون بقائے عنصر'' کے نام سے بیان کرتے ہیں اور کیمیائی ترکیبات کے دوران میں اجسام کے سالمات میں شکست وریخت ہوتی رہتی ہے لیکن چونکہ ایٹمز کی جنس وتعداد میں تبدیلی نہیں آتی لہٰذا ان کا وزن بھی تبدیل نہیں ہوتا اور ثابت رہتا ہے۔

بقائے مادہ کے اس قانون نے انسان کے امکان ابدیت کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دی ہیں اور انبیاء کی اس آواز کی مکمل اور بھر پور تائید کر دی کہ ہم سب بقا وابدیت کے لیے خلق کئے گئے ہیں نہ کہ فنا و نابودی کے لیے اور دوسری طرف سے انسان اس دیرینہ اشکال کا (کہ موت کی وجہ سے بدن کے کچھ اجزا نابود ہو جاتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ روزِ قیامت خدا انہیں دوبارہ خلق کرے) جواب دے دیا اور اس قانون نے ثابت کر دیا کہ قیامت اجزائے مادہ کی شکل گیری اور صورت سازی کا دوسرا نام ہے انسان کا کچھ بھی معدوم نہیں ہوتا کہ اعادہ معدوم لازم آئے۔

۲۔شبہ آکل و مأکول

آکل کے معنی'' کھانے والا'' اور ماکول کے معنی'' کھایا ہوا'' ہیں اشکال کا محور یہ ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کی غذا بن جا تا ہے چاہے بطور مستقیم ہو جیسا کہ بعض آدم خور پائے جاتے ہیں یا غیر مستقیم طریقہ سے یعنی مردوں کے بدن خاک میں تبدیل ہو جائیں پھر گھاس اور پھل وغیرہ کے ذریعے کسی دوسرے حیوان کے بدن کا جز بن جائیں اور آخر میں انسان اس حیوان کو کھا لے تو وہ انسان میں بدل جائیں ایسی صورت میں اس پہلے والے یعنی ماکول انسان کی معاد کیسے ہوگی (یہ شبہ علم کلام کی بیشتر کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے جیسے کشف المراد ص ۳۳۵، شرح مواقف جلد ۸، ص ۲۹۵، شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۳، اسفار جلد ۹، ص ۱۹۹) شبہ آکل و ماکول دو لحاظ سے معاد میں اشکال کا

---

[1] The Law of Conservation of Matter

موجب ہوا ہے۔

۱۔ ان دو افراد میں سے وہ ناقص محشور ہوگا جس کے بدن کا کچھ حصہ دوسرے کے بدن کا جز بن چکا ہے۔

۲۔ یہ امر عدل الٰہی کے بھی منافی ہے کیونکہ ممکن ہے مومن کے بدن کا کچھ حصہ کافر کے بدن کا جز بن جائے اور دوزخ میں چلا جائے یا کافر کے بدن کا کچھ حصہ مومن کا جز بن جائے اور جنت میں چلا جائے۔

علم کلام کی اکثر کتب میں ان دو صورتوں میں تمیز نہیں کی گئی۔

چونکہ مستقیماً ایک انسان کا دوسرے انسان کا گوشت کھانا بہت کم ہے لہٰذا اہم اشکال کو غیر مستقیم طرز پر پیش کرتے ہیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ قبرستان میں مردوں کی خاک زراعت کے ذریعے فصلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان اور حیوانات اس سے استفادہ کرتے ہیں نتیجتاً غیر مستقیم طور پر مردوں کے بدن زندہ انسانوں کے بدنوں کے اجزا بن جاتے ہیں یہاں پر اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ جب ایک انسان کا بدن دوسرے انسان کی غذا بن جائے تو ماکول کے بدن کا کچھ حصہ آکل کے بدن کے ساتھ مرکب ہو جاتا ہے اور اس کے بدن کا جز شمار ہونے لگتا ہے اور قیامت کے دن خدا دونوں بدن اٹھانا چاہتا ہے تو اس فعل خدا کی چند صورتیں متصور ہوں گی۔

۱۔ وہ کھایا ہوا جزا ایک ہی وقت میں ہر دو بدن کے ساتھ محشور ہو۔

۲۔ صرف آکل کے بدن کے ساتھ محشور ہو۔

۳۔ صرف ماکول کے بدن کے ساتھ محشور ہو۔

۴۔ کسی بدن کے ساتھ محشور نہ ہو۔

ان میں سے پہلا فرض محال ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شے ایک وقت میں دو جگہ پر حاضر ہو (یہ کلیہ اس مادہ کے ساتھ مختص ہے جو کثافتوں سے پُر ہے) دوسرے فرض کا لازمہ یہ ہے کہ ماکول انسان کا بدن ناقص محشور ہو۔ تیسرے فرض میں آکل کا بدن ناقص محشور ہوگا اور چوتھے فرض میں دونوں بدن ناقص محشور ہوں گے اور یہ سب صورتیں اعتقادات شریعت کے خلاف ہیں۔

البتہ یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرے اور تیسرے فرض کا لازمہ یہ ہے کہ آکل یا ماکول میں سے ایک بالکل محشور ہی نہ ہو کیونکہ یہ فرض کرنا ہی غلط ہے کہ ماکول انسان کے تمام اجزائے بدن کسی دوسرے کی غذا بن جائیں بلکہ صرف کے کچھ اجزاء جذب ہوتے ہیں ورنہ زیادہ دفع ہو جاتے ہیں یعنی انسان جو غذا کھاتا ہے اس میں سے صرف تین فی صد غذا کھانے والے کے بدن کا حصہ بنتی ہے بقیہ غذا مختلف صورتوں میں بدن سے خارج ہو جاتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک بدن مختلف حالتوں میں اس طرح تبدل وتحول میں پڑ جائے کہ ہمیشہ ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتا رہے اور مسلسل پھل اور گھاس میں تبدیل ہو ہو کہ مختلف انسانوں کی غذا بنتا رہے تو ایسی صورت میں اس کے بدن کا اکثر حصہ دوسرے متعدد انسانوں کا جز بن جائے گا اور آخر کار اس کے بدن کا کچھ حصہ بھی باقی نہ رہے گا اگر چہ یہ ایک نادر الوجود فرض ہے لیکن بحث کے آخر میں اس کے بارے میں بھی گفتگو کی جائے گی اور ہم ثابت کریں گے کہ معاد جسمانی حتیٰ کہ اس فرض میں بھی کوئی اشکال نہیں رکھتی۔

اشکال کا جواب

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو معاد جسمانی کے قائل ہیں ان کی نظر میں پہلی اور چوتھی صورت نہیں ہے کیونکہ یہ پہلی صورت محال ہے اور چوتھی صورت بھی ایسا فرض ہے جس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ طبعی طور پر وہ ماکول جز کسی نہ کسی بدن کے ساتھ محشور ہونا چاہیے۔ اور بنا بر قاعدہ چونکہ وہ آکل کے بدن کا جز شمار ہوتا ہے آکل ہی کے بدن کے ساتھ اسے محشور ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیش آئے گا کہ کیا پھر ماکول کا بدن ناقص محشور ہوگا؟

یہاں پر ہم چند مطالب ذکر کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سوال کا کسی نہ کسی طرح سے جواب ہے:

۱۔ سائنسی لحاظ سے انسان کا بدن پھوٹنے والے چشمے کی مانند ہے کہ طبیعی فعل و انفعالات کے نتیجے میں ہمیشہ اس کے اندر سے نئے اجزا پھوٹتے رہتے ہیں اور باہر سے تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس مسئلے میں سائنس دان تقریباً اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ آٹھ سال میں انسان کا ایک بار پورا بدن تبدیل ہوجاتا ہے گویا اگر انسان کی عمر چونسٹھ سال ہو تو اس عمر میں وہ آٹھ بدن تبدیل کر چکا ہوتا ہے اور چونکہ بدن کے تبدیل ہونے کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے لہٰذا انسان کو اس کا پتہ نہیں چلتا خصوصاً یہ عمل ہے بھی بہت آہستہ اور تدریجی اور جو کام بھی یہ خصوصیت رکھتا ہو یعنی مسلسل آہستہ اور تدریجاً انجام پائے انسان کے لیے غیر محسوس ہوجاتا ہے۔

اب اگر انسان کا آخری بدن کسی دوسرے انسان کی غذا بن بھی جائے تو ممکن ہے اس کے دوسرے بدنوں میں سے کوئی ایک اٹھایا جائے جو یہ مانع نہ رکھتا ہو۔ یہ امر بہت بعید ہے کہ اس کے تمام بدن گھاس وغیرہ میں تبدیل ہوکر دوسرے انسان کی خوراک بن چکے ہوں۔

۲۔ فرض کریں انسان کے تمام بدن مستقیم طور پر یا بطور غیر مستقیم کسی دوسرے انسان کی خوراک بن چکے ہوں۔ لیکن یہ تو عرض کر چکے ہیں کہ پورا بدن دوسرے بدن کی طرف جذب نہیں ہوتا بلکہ اس کا اکثر حصہ دفع ہوجاتا ہے لہٰذا کیا مانع ہے کہ اس کی روح ایک کمزور اور ظریف بدن کے ساتھ تعلق قائم کرلے اور اسی بدن کے ساتھ محشور ہو کیونکہ کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں ہے جو کہے کہ انسان کا اخروی بدن اس کے دنیوی بدن کے ساتھ وزن و حجم کے لحاظ سے بھی فرق نہ رکھتا ہوگا بلکہ یہ کافی ہے کہ محشور ہونے والا بدن دنیوی بدن ہی ہو اگرچہ دونوں بدن چند جہت میں آپس میں اختلاف رکھتے ہوں کیونکہ اس بدن کا مادہ تو وہی ہے فرق صرف وزن و حجم میں ہوگا۔

۳۔ آپ فرض کریں کہ انسان کے تمام بدن پورے کے پورے دوسرے ابدان کے جز بن چکے ہوں اور اب ماکول انسان کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو تو ایسی صورت میں بھی دو جواب ممکن ہیں۔

(الف) ممکن ہے آکل انسان دوسرے بدن رکھتا ہو جن میں یہ مانع موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں ماکول کے اجزائے بدن اس کی طرف لوٹا دینے سے کیا اشکال پیش آتا ہے جب کہ آکل کا دوسرے بدن کے ساتھ حشر بھی ممکن ہو۔

(ب) فرض کریں (اگرچہ یہ فرض بہت نادر و بعید ہے) آکل و ماکول دونوں کے تمام بدن اس مانع سے دو چار ہو چکے ہوں اگر ماکول کے اجزا اس کی طرف لوٹا دیئے جائیں تو آکل کے لیے کچھ باقی نہ بچے تو ایسی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ کوئی مانع موجود نہیں ہے کہ ماکول کے بدن

کی تکمیل کے لیے زمین کے اس مواد سے استفادہ کیا جائے جو ابھی تک دوسروں کی خوراک نہ بنا ہو اور معاد جسمانی کے باب میں ہمارے پاس دلیل صرف اس حد تک ہے کہ جب انسان کو قیامت میں اٹھایا جائے گا تو اس کے بارے میں کہا جائے کہ یہ وہی دنیوی انسان ہے۔

یہاں پر مناسب ہے کہ قارئین کی توجہ معاد کے بارے میں وارد آیات و روایات کی طرف مبذول کروائی جائے ان میں دقت نظر سے پتہ چلتا ہے کہ معاد میں آنے والا انسان اس دنیوی انسان کے مماثل ہو تو کافی ہے۔ آیات و روایات میں تحقق عینیت پر بالکل اصرار نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ اشکال پیش ہی نہیں آ سکتا۔ کہ یہ بعینہٖ وہ بدن نہیں ہے۔

البتہ جہاں پر بعینہٖ اسی بدن کا اٹھانا ممکن ہو وہاں پر دوسرے مواد سے استفادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یعنی جب انسان کے بدن کے اپنے مادی اجزا زمین میں باقی ہوں تو طبعی طور پر وہی زندہ کئے جائیں گے مثلیت سے استفادہ اس صورت میں کیا جائے گا کہ جب ماکول کے بدن سے کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔

قرآن فرماتا ہے:

اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾ (یٰسین: ۸۱)

”آیا جس خدا نے زمینوں اور آسمانوں کو خلق کیا ہے وہ قادر نہیں ہے کہ ان انسانوں کی مانند خلق کرے؟ یقیناً وہ قادر ہے وہ زبردست خالق اور دانا ہے“۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا آیت میں لفظ ”مثلھم“ استعمال کیا گیا ہے نہ ”عینھم“ اور ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اللہ مومن کی روح کو قبض کرنے کے بعد برزخی بہشت میں متنعم فرماتا ہے اور قیامت کے دن اسی صورت کے ساتھ اسے محشور فرمائے گا جو وہ دنیا میں رکھتا تھا“ (بحار الانوار جلد ۶، باب احوال برزخ حدیث ۳۲)

یہ آیت اور روایت شاہد ہیں کہ معاد کا محور صورت انسان کا تحفظ ہے اور صرف یہی کافی ہے کہ اٹھایا ہو شخص وہی شکل و صورت رکھتا ہو جو دنیا میں رکھتا تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسی خاک کے ساتھ محشور کیا جائے جس کے ساتھ پہلے دن خلق ہوا تھا اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل موجود ہے۔ البتہ یہ بات پھر عرض کر دیں کہ اگر وہ پہلے والا مادہ محفوظ ہو تو پھر کسی نئے مادے کی طرف رجوع بلاوجہ ہوگا۔

یہاں پر صدر المتالہین مرحوم کا ایک قول عرض کرتے ہیں جو درحقیقت ان کے فلسفی اصولوں میں سے ایک ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”ایک انسان کی شخصیت وحقیقت اس کی روح کے ساتھ ہے نہ کہ بدن کے ساتھ انسان جس بدن کے ساتھ اپنے مادی کام انجام دیتا ہے یہ اس کی شخصیت تشکیل دینے والا بدن نہیں۔ اسی وجہ سے تعین بھی نہیں رکھتا۔ لہٰذا انسانی روح نے جس بدن کے ساتھ بھی تعلق برقرار کر لیا یہ وہی انسان ہوگا جو پہلے تھا اور یہ اعتقاد کہ لوگ اپنے بدنوں کے

ساتھ قبروں سے محشور ہوں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی اسے دیکھے یہ کہے کہ یہ وہی انسان ہے جسے ہم نے دیکھا تھا یہ ضروری نہیں کہ اس کے بدن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہ ہو اور اگر دنیا میں بدصورت تھا تو ضروری نہیں ہے کہ بدشکل محشور ہو یا اگر لنگڑا و نابینا تھا یا بوڑھا تھا تو ضروری نہیں کہ اسی طرح وہاں پر محشور کیا جائے اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے صرف یہ ضروری ہے کہ اس کی واقعیت (روح) ایسے بدن کے ساتھ تعلق پیدا کرے جو دنیوی بدن جیسا ہو چاہے اس دوسرے بدن کا خاکی مادہ پہلے بدن والا ہو یا نہ ہو"۔ (اسفار ج۹ ص ۲۰۰)

یہاں تک شبہ آکل و ماکول کا جواب اس جہت سے تھا کہ جب بدن پھل اور گھاس وغیرہ میں تبدیل ہو کر دوسرے انسانوں کی خوراک بن جائے تو محشور بدن ناقص اٹھایا جائے گا اور واضح ہو گیا کہ معاد جسمانی میں ایسا کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔ لیکن شبہ آکل و ماکول ایک دوسری صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے، اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔

شبہ آکل و ماکول اور عدلِ الٰہی

یہاں پر یہ اشکال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اگر ماکول انسان مومن ہو جو کافر کے بدن کا جز بن جائے تو جب کافر کو عذاب کیا جائے گا تو مومن کے بدن کا ایک حصہ بھی معذب ہوگا حالانکہ وہ حصہ جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس کے برعکس بھی ممکن ہے کہ ماکول کافر ہو آکل مومن ہو تو کافر کا کچھ بدن جنت میں چلا جائے گا اور یہ دونوں صورتیں عدل الٰہی کے منافی ہیں۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس شبہ میں محور ثواب و عقاب اور عدل الٰہی ہے جب کہ پہلے والے شبہ میں محور انسانی بدن کا ناقص محشور کیا جانا تھا پس شبہ آکل و ماکول کی دونوں صورتوں میں فرق واضح ہے۔

اس اشکال کے جواب میں ہم دو مطلب ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ایسی صورت میں ماکول کا عضو آکل کے بدن کا جز ہے اور ماکول کے بدن کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتا اس کی مثال یوں لے لیں کہ ایک انسان کے گردے آپریشن کے ذریعے کسی دوسرے انسان کو لگا دیئے جائیں اور آپریشن بھی کامیاب ہو جائے۔ ایسی صورت میں گردے اس دوسرے انسان کے شمار ہوں گے اور پہلے انسان کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتے ہوں گے۔ آج جیسا کہ بعض حیوانات کی آنکھیں یا دوسرے اعضا زندہ انسانوں کو لگائے جاتے ہیں۔ آپریشن کی کامیابی کی صورت میں ان اعضا کا پہلے والے موجود کے ساتھ کوئی ربط نہیں رہے گا۔

۲۔ یہ اشکال درحقیقت مادی طرزِ تفکر کا نتیجہ ہے جن کے نزدیک انسان کی واقعیت اس کا بدن اور گوشت پوست ہے حالانکہ الٰہی نکتہ نظر سے انسان کی واقعیت اس کی روح ہے۔ اگر ایک عضو کسی دوسرے انسان کا جز بن جاتا ہے تو اسی دوسرے انسان کی روح اس عضو کے ساتھ تعلق تدبیری پیدا کرلے گی۔ اب اگر اس انسان کا بدن کہ جس کا کوئی عضو کسی دوسرے انسان کا ہے پر اللہ کا عذاب یا رحمت ہو تو طبیعی طور پر یہ جزا و سزا اسی دوسرے انسان سے مربوط ہوگی کیونکہ جزا و سزا کا مرکز روح انسانی ہے بدن تو اس لذت والم کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے اور فرض یہ ہے کہ یہ عضو اب اس پہلے انسان کے ساتھ کوئی ربط ہی نہیں رکھتا کہ اس پر وارد ہونے والا عذاب وثواب اس پر کوئی تاثیر کرسکے۔ یہاں تک

منکرین معاد کے دوسرے شبہ کا جواب تھا۔

۳۔سزا کا مقصد کیا ہے؟

اگر معاد کا ہدف یہ ہے کہ اس کے ذریعے نیک لوگوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجرم کو سزا دینے کا مقصد کیا ہے؟ تین چیزیں مجرم کو سزا دینے کا ہدف بن سکتی ہیں:

ا۔غم کی تسکین

اگر ایک انسان کسی دوسرے انسان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو مقتول کے وارثین کی ہمیشہ خواہش قاتل سے قصاص لینا ہوتی ہے تا کہ اس ذریعے سے وہ اپنے دکھوں کا مداوا کر سکیں۔

۲۔مجرم کی تربیت

بعض سزائیں مجرم کی تربیت کی خاطر دی جاتی ہیں مثلاً مجرم کو جیل میں ڈال دینا تا کہ ماحول کے دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے برے کاموں سے ہاتھ کھینچ لے۔

۳۔دوسروں کے لیے عبرت

بسا اوقات کچھ مجرمین کو عام لوگوں کے سامنے سزا دی جاتی ہے یہاں پر تادیب مجرم کے علاوہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔[1]

آپ نے دیکھا کہ مجرم کو سزا دینے کے یہ تین مقصد ہو سکتے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو سزا دینے کا کیا مقصد ہے۔اگر مقصد سزا دینے والے کی تسکین ہے تو یہ ہدف یہاں درست نہیں چونکہ سزا دینے والا خدا ہے جو ان مادی احساسات سے بلند و برتر ہے،اگر ہدف مجرم کی تنبیہ ہے تو تنبیہ کا تعلق دنیا سے ہے نہ کہ آخرت سے،اور اگر ہدف دوسروں کی عبرت ہے تو آخرت میں عبرت معنی نہیں رکھتی کیونکہ عبرت لینے کا وقت گزر چکا ہے۔پس مجرم کو سزا کس لیے؟

ایک اور بیان میں اس اشکال کو ذرا وسعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اخروی جزا جس میں بھی شامل ہو جاتی ہے۔کہتے ہیں کہ جسمانی لذت کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ لذت کے ذریعے انسان اپنے کسی نہ کسی درد کی دوا کرتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ لذت کی

---

[1] وَلْيَشْهَدْ عذابهما طآئفةٌ من المومنين (نور:۲) چاہیے کہ مومنین کا ایک گروہ بدکار مرد اور عورت کو سزا دیتے ہوئے مشاہدہ کرے۔

حقیقت عدمی امر ہے نہ وجودامر۔ اور یہ ہدف انسان کے محشور نہ کرنے سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ پس معاد کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ [1]

جواب

اس شبہ کا دو طرح سے جواب دینا ممکن ہے:

۱۔ سابقاً چھ دلیلوں سے معاد کی ضرورت تحقق ثابت کی جا چکی ہے اور معاد کی ضرورت کے معنی ہیں کہ آخرت کے نام سے ایک جہان کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی وضروری امر ہے لہٰذا اب معاد کی غرض سے سوال واقعیت سے بہت دور ہے۔ بعبارت دیگر اگر معاد کا وقوع ضروری نہ ہوتا بلکہ صرف امکان کی حد تک رہتا تو یہ سوال بجا تھا کہ ایک امر ممکن کو وجود دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب کچھ علل واسباب نے کسی واقعہ کی ضرورت وجود کو لازم کر دیا ہو تو پھر اس واقعے کی علت غائی کے بارے میں سوال بالکل بے محل ہو گا کیونکہ جن علل نے معاد کو ایک ضروری واقعے کے طور پر ثابت کر دیا وہ فاعلی کے ساتھ ساتھ غائی بھی ہوں گی لہٰذا جزا وسزا کے مقصد کو جاننے کے لیے بھی انہی علل کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ یہاں پر ہم ان چھ ادلہ میں سے صرف ایک دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاد ہی عدل الٰہی کی جلوہ گاہ ہے۔ معاد کے علاوہ خداوند عالم کا عدل کوئی کامل مظہر نہیں رکھتا۔ طبعی طور پر معاد سے غرض ایک اچھے اور زیبا کام کو وجود عطا کرنا ہے اور عقل اچھے کام کے وجود کو حسن اور اس کے ترک کو قبیح کہتی ہے لہٰذا اب یہ سوال کہ یہ اچھا کام کیوں وقوع پذیر ہوا؟ ایسا سوال ہے جس کا جواب خود سوال کے اندر موجود ہے۔

گویا سوال کرنے والے نے معاد کے ضروری ہونے پر موجود ادلہ کی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ اگر ان علل کی طرف توجہ کر لیتا تو معاد کی علت غائی کو حاصل کر لیتا کیونکہ علت نمائی خود ان علل کے اندر موجود ہے البتہ معاد کا عدل الٰہی کے لیے جلوہ گاہ ہونا اس کی علتوں میں سے ایک ہے اس کے علاوہ بھی علل موجود ہیں جو سابقاً ذکر ہو چکی ہیں۔ زیادہ حیران کن اشکال کرنے والے کا وہ نظریہ ہے جو اس نے جسکانی لذات کے بارے میں پیش کیا ہے کہ یہ لذتیں واقعیت واصالت نہیں رکھتیں بلکہ صرف درد وغم کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں حالانکہ یہ بات اگر چند موارد میں صحیح ہو تب بھی اکثر موارد میں غلط ہے مثلاً سخت بھوک کے وقت کھانے کی لذت بھوک کے درد کو مٹاتی ہے لیکن تمام لذتیں اس طرح کی نہیں ہیں۔ کیا انسان ایک اچھے منظر کے دیکھنے سے جو لذت اٹھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس منظر کو نہ دیکھے تو اسے درد شروع ہو جائے گا۔

۲۔ یہ اشکال ممکن ہے ان جزاؤں اور سزاؤں کے بارے میں کیا جا سکے جو صرف جعلی ہیں یعنی وہ جزائیں اور سزائیں جو انسانی وجود کا لازمہ نہیں ہیں بلکہ کسی طرف سے انسان پر لاگو کی جاتی ہیں یا ان کے ذریعے انسان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔

لیکن اس بات پر توجہ رہنی چاہیے کہ جزا وسزا کی کچھ قسمیں جعلی نہیں ہیں بلکہ انسان کے وجود کا لازمہ ہیں یعنی انسان اس جہان میں کچھ اچھے یا برے کاموں کی وجہ سے ایسے ملکات کسب کر لیتا ہے جو اس کی ذات وشخصیت کو فعلیت عطا کرتے ہیں۔ جب انسان کو روز محشر محشور کیا جائے گا تو انہی ملکات کے ساتھ اسے اٹھایا جائے گا اور انہی ملکات کی وجہ سے ایسے آثار وافعال پائے گا جو ان ملکات کے متناسب ہوں گے ان آثار سے جان چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ یہی افعال وآثار اس کی خوشی یا عذاب کا موجب بنیں گے۔ فارسی کی مشہور ضرب المثل

---

[1] شرح مواقف ج۸، ص۲۹۶، شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۴

اس مطلب کو خوب بیان کرتی ہے۔ ''شتر درخواب بیند پنبہ دانہ'' مقصد یہ ہے کہ یہ حیوان (اونٹ) اپنی خوراک کے ساتھ ایک خاص ارتباط رکھتا ہے خواب میں بھی اسے نہیں بھولتا۔ ایسے ہی گنہگار انسانوں کی مثال ہے کہ جو شہوات میں غرق ہوجانے کی وجہ سے خاص قسم کے ملکات کسب کر لیتے ہیں جن کی وجہ سے اپنے لیے خبیث اور موذی صورتیں خلق کر لیتے ہیں، جیسے نیک لوگ اچھے ملکات کسب کر لیتے ہیں جن کی وجہ سے اپنے لیے اچھی صورتیں خلق کر لیتے ہیں، جن سے انہیں لذت وراحت ملتی ہے۔

اس جواب میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ کچھ تکلیفیں اور راحتیں خود محشور ہونے والے انسان کی خلق شدہ ہیں کہ دوسرے جہان میں اپنی واقعیت کے مناسب صورتیں خلق کرتا ہے۔

۳۔ جزاوسزا کے بارے میں ایک تیسری بات بھی کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اعمال اس (مادی) جہان میں ایک صورت رکھتے ہیں۔ یہی اعمال برزخ اور قیامت میں ایک دوسری صورت رکھتے ہیں یعنی ایک ہی شے موقع ومحل کی مناسبت سے جدا جدا تجلی رکھتی ہے مثلاً چقماق کا پتھر بعض حالات میں سرد اور ملائم ہوتا ہے حالانکہ یہی پتھر کچھ دوسرے حالات میں (جب اسے لوہے پر مارا جائے تو) اپنے اندر سے آگ نکالتا ہے جب کہ چقماق کے پتھر کی واقعیت ایک ہی صرف حالات کے بدلنے سے جدا جدا تاثیر ظاہر کرتا ہے۔[1]

اس اساس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ جزائیں اور سزائیں خود انسان کے اچھے یا برے اعمال کا تجسم ہیں جو مختلف حالات میں مختلف طرح سے ظاہر ہوتی ہیں۔

تجسم اعمال کا مسئلہ ایک قرآنی حقیقت ہے جو متعدد آیات میں وارد ہوا ہے اور ہم اس مسئلے کو ایک جداگانہ فصل میں بیان کریں گے۔

---

[1] یہ مثال حضرت علیؑ کے ایک بیان سے اخذ کی گئی ہے کہ جب ایک اعرابی ایک کافر کی ہڈی تیسرے خلیفہ کے پاس لایا اور کہنے لگا اگر مشرک لوگ جہنم میں ہیں تو کیوں مجھے اس ہڈی سے گرمی کا احساس نہیں ہوتا خلیفہ نے حضرت امیرؑ کو بلا بھیجا۔ حضرت نے اس مشکل کو اس مثال کے ذریعے حل فرمادیا (العذ یرج ۸، ص ۲۱۴) یعنی انسان جو کافر کی ہڈی سے گرمی کا احساس نہیں کرتا۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ برزخی حس نہیں رکھتا اگر اس میں برزخی حس ہوتی تو یقیناً گرمی کو محسوس کر لیتا۔

معادجسمانی کے اشکلات کی ایک اور تحلیل

ان سابقہ اشکلات کے علاوہ معادجسمانی کے بارے میں ایک اشکال اور ذکر کیا گیا ہے جسے صدرالمتالہین نے پیش کیا ہے پہلے یہ ذکر کر دیا جائے کہ صدرالمتالہین معادجسمانی پر مصر تو ہیں لیکن معتقد ہیں کہ معاد کا تحقق مثالی بدن کے ساتھ ہوگا نہ کہ عنصری بدن کے ساتھ بعبارت دیگر صدرالمتالہین معادجسمانی کو دوسرے معیار (حسی لذات کے ادراک) کی اساس پر قبول کرتے ہیں (جیسا کہ متکلمین بھی قبول کرتے ہیں) لیکن اُن کے نزدیک ان لذات یا آلام کا ادراک بدن مثالی کے ذریعے ہوگا تو گویا صدرالمتالہین کا متکلمین کے ساتھ اختلاف نظر پہلے معیار میں ہے (کہ روح دوبارہ اسی بدن عنصری کے ساتھ تعلق پیدا کرلے گی) اب ہم صدرالمتالہین کے متکلمین پر اشکلات کی تحقیق کرتے ہیں۔

ا۔معادجسمانی دنیا کی طرف برگشت ہے

معادجسمانی جیسا کہ متکلمین کہتے ہیں (یعنی متفرق اجزا کا جمع ہوکر پہلی صورت میں بدن بن جانا اور پھر روح کا اس سے متعلق ہونا) یہ درحقیقت دنیا کی طرف ہی رجوع ہے حالانکہ قرآن میں اس عالم کو ''دارعقبیٰ'' اور ''نشاۃ اخری'' جیسے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ معادجسمانی اس تصور کے علاوہ ہونی چاہیے جو متکلمین اس کے بارے میں رکھتے ہیں اور وہ اس طرح ہو کہ اسے دارعقبیٰ یا نشاۃ اخری کہا جاسکے اور اس میں زندگی بھی دنیوی زندگی کے علاوہ ہونی چاہیے۔(اسفار جلد ۹ ص ۱۵۳)

جواب

عقبیٰ و اخری جیسے عنادین کے تحقق یا حیات اخروی کے حیات دنیوی سے مختلف ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ معدجسمانی عنصری و مادی صورت میں نہ ہو بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ دنیا کو عمل و کوشش کا گھر اور آخرت کا نتیجہ و انجام کا گھر سمجھیں۔حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ان دونوں گھروں میں تفاوت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

وان الیوم عمل ولا حساب و غداً حساب و لا عمل[۱]

''آج عمل کا دن ہے نہ کہ محاسبہ کا اور کل (آخرت) محاسبہ کا وقت ہے نہ کہ عمل کا''

یہ جو وحی کی زبان میں اس جہان کو نشاۃ اولیٰ اور آخرت کو نشاۃ اخری کہا گیا ہے یہ اس لیے ہے کہ وہ جہان ہر لحاظ سے اس جہان سے کامل تر اور ترقی یافتہ ہے اور اُس جہان میں روح بدن سے متعلق ہونے کے باوجود نئے افق کا مشاہدہ کرسکتی ہے اور ایسے ترقی کے مراحل طے کر

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۴۲

سکتی ہے جو اس کے لیے اس جہان میں ممکن نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ اس جہان میں تدبیری ہے لہٰذا بلند مراحل کی طرف ترقی نہیں کر سکتی جبکہ دوسرے جہان میں روح کا بدن کے ساتھ تعلق عذاب و ثواب کے حصول کے لیے ہے اس کا جنبۂ تدبیری بہت کمزور و تاریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس جہان میں روح کا قلمرو وسیع اور کمالات کے ادراک کی قدرت زیادہ ہے۔ بہرحال دو قسم کی زندگی ہے اور دو قسم کی ہر منزل اور دونوں میں بہت سے مشترکات بھی پائے جاتے ہیں اور عقبی و اخری جیسے اوصاف کے وقوع کے لیے ضروری نہیں کہ اس جہان میں بدن عنصری و مادی نہ ہو۔

۲۔ معادِ جسمانی میں تناسخ کا لزوم

سب سے بڑا اشکال جو معاد جسمانی کے بارے میں صدر المتالہین سمجھتے ہیں مسئلہ تناسخ ہے جو ناممکن ہے کیونکہ مختلف صورتوں میں تناسخ کا لازمہ دو روحوں کا ایک بدن میں اجتماع ہے جو ممکن نہیں ہے لہٰذا تناسخ بھی ممکن نہیں ہوگا۔

صدرا کہتے ہیں: وہ مشکل جو تناسخ کے قائلین کو درپیش ہے جس کی وجہ سے ان کا نظریہ مردود ہوا ہے وہی مشکل جسد عنصری کے ساتھ معاد جسمانی میں بھی موجود ہے۔ اس اعتقاد کا لازمہ بھی دو روحوں کا اجتماع ہے ایک بدن میں۔ اگرچہ اسے تناسخ نہ کہا جائے لیکن مشکل وہی ہے۔ کیونکہ جب ایک طرف سے باہم متصل اجزا نے یہ اہلیت پیدا کر لی کہ روح ان کے ساتھ تعلق پیدا کر لے تو یہی کافی ہے کہ عالم بالا سے ایک نئی روح ان کے متعلق ہو جائے۔ اور دوسری طرف سے اگر پہلی روح (جسے اصطلاح میں روح مستنسخہ کہہ سکتے ہیں) تحقیق معاد کے لیے اس کے ساتھ تعلق پیدا کر لے تو نتیجہ دو روح یک قالب ہوگا اور یہی تناسخ ہے۔

صدرا اور دوسری جگہ میں اسی اشکال کو بعنوان لزوم مفسدہ تناسخ در معاد جسمانی عنصری ذکر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پیچیدہ اشکال ہمارے طریقے کے علاوہ قابل حل نہیں ہے اور جو جوابات اس کے متکلمین نے دیئے ہیں وہ ناتمام ہیں ابھی تک کوئی اسلامی متکلم یا حکیم اسے حل نہیں کر سکا اور بعض نے تو اتنے بوکھلائے کہ تناسخ کو بھی جائز سمجھنے لگے۔ اسکے بعد صدرا ان کے جواب کو ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جواب ناتمام ہے۔[1]

مفسدۂ تناسخ کا جواب

اس شبہ کا جواب ان اصولوں کی بنیاد پر جنہیں خود صدر المتالہین نے بیان کیا ہے کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ اگر روح کو تکامل مادہ کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ کہیں کہ مادہ جب تعلق روح کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے تو عالم مجرد کی طرف سے روح جنین کے متعلق ہو جاتی ہے اور مادہ کا کمال روح کی ہستی میں کوئی دخالت نہیں رکھتا یعنی روح جو پہلے سے بنائی جا چکی ہے یا اس کے مشابہ موجود ہے جو عالم بالا سے قالب کی طرف ارسال کی جاتی ہے ایسی صورت میں آپ کا اشکال پیش آ سکتا ہے کیونکہ ان کی قابلیت کے وقت ایک روح عالم بالا سے اس کی طرف ارسال ہو جائے گی

[1] اسفار جلد ۹ ص ۲۰۵

دوسری طرف روح سنسخہ بھی اسی بدن سے تعلق پیدا کرنا چاہیے گی اور تناسخ پیش آ جائے گا۔لیکن یہ نظریہ (خلقت ارواح قبل از ابدان) حکمت متعالیہ کے اصول کی رو سے مردود ہے بلکہ حکمت متعالیہ تو یہ کہتی ہے کہ روح انسان مادہ کے کمال کا نتیجہ ہے اور اس کی ہستی تکامل بدن جنین کی وجہ سے ہے اس معنی میں کہ انسان کا مادہ جنین کے ساتھ مراحل طے کرتا ہوا ایسی حد پر پہنچ جاتا ہے کہ مجرد میں تبدیل ہو جاتا ہے بغیر اس کے کہ مادہ کے وزن میں کوئی کمی واقع ہو اور یہ تکامل مشیت الٰہی کے تحت انجام پاتا ہے کہ اس کا حکیمانہ ارادہ مقتضی ہے کہ ہر موجود کو حد کمال تک پہنچا دے۔اس اصول کی بنیاد پر جب جنین تکامل کے اس مرحلے پر پہنچ جائے کہ روح انسانی اس کے متعلق ہو جائے (روح جو ایک لطیف موجود ہے اور تجرد کے ابتدائی مرتبہ پر فائز ہے) تو یہ روح جنین کے متعلق ہو جانے کے بعد جنین (بچہ) کے جسمانی تکامل کے تمام مراحل میں اس کے ہمراہ رہتی ہے اور کامل تر رہتی ہے یہاں تک کہ روح انسانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس حد تک کمال پیدا کر لیتی ہے کہ تیس سالہ جوان کی روح کمال کے لحاظ سے بچے کی روح سے نا قابل قیاس ہے کیونکہ بچے کی روح صرف تجرد کے ابتدائی مرتبے پر فائز ہوتی ہے جو صرف اشیاء کی صورتوں کا موجود مجرد کی حیثیت سے ادراک کر سکتی ہے جبکہ تیس سالہ انسان عقل عملی و نظری کے لحاظ سے اتنا کمال یافتہ ہوتا ہے کہ اس کی روح تجرد کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہو جاتی ہے۔

جب آپ نے اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ لیا تو اب ہم اشکال کے جواب کی وضاحت کرتے ہیں کہ اگر معاد جسمانی تدریجی طور پر وقوع پذیر ہوتا یعنی اُس جہان میں بھی انسان (محشور) پہلے جنین اور بچہ کی صورت میں پیدا ہوتا اور آہستہ آہستہ انسان کامل بنتا تو آپ کا اشکال بجا تھا کیونکہ جب یہ انسان (جسے اٹھایا جا رہا ہے) جنین کی صورت میں ہوتا تو اس میں جدید روح کو قبول کرنے کی لیاقت موجود ہے اور اگر اس کی طرف روح مستنسخہ بھی لوٹا دی جائے تو مفسدہ تناسخ لازم آ جائے گا۔لیکن جیسا کہ قرآن نے کہا ہے مسئلہ معاد تدریجی طور پر وجود میں آنے والا نہیں ہے بلکہ دفعی و آنی ہے یعنی ایک لحظے سے بھی کم وقت میں (طرفۃ العین) پلک جھپکنے میں بدن کے اجزا جمع ہو جائیں گے۔ایسی صورت میں بدن میں صرف اپنی روح کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو گی نہ کہ کسی نئی روح کو کیونکہ مندرجہ بالا اصول کے مطابق نئی روح پہلے سے تو خلق شدہ نہیں ہے اور نہ قیامت میں خلق ہو گی بلکہ وہ مادہ کے تکامل کے زیر سایہ تکامل پاتی رہتی ہے اور یہ تب ممکن ہے کہ خلقت تدریجی ہو جبکہ ادلہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قیامت کے دن خلقت تدریجی نہیں ہو گی بلکہ دفعی ہو گی۔

بالفاظ دیگر نئی روح حرکت و تدریج کے زیر سایہ وجود پذیر ہوتی ہے اور حرکت و تدریج کے بغیر روح وجود نہیں پا سکتی لہٰذا جب خدا مردوں کو زندہ کرے گا تو وہاں پہلی روح کے علاوہ کوئی اور روح نہیں ہو گی و بدن کے متعلق ہو اور مفسدہ تناسخ لازم آئے۔

یہ شبہ فلسفی مکتب فکر مشائی کے نکتہ نظر کی بنیاد پر پیش کیا گیا جب کہ اس کی وجہ سے صحیح طرز فکر پیدا نہیں ہو سکی۔مشائی کہتے ہیں کہ روح کی نسبت بدن کے ساتھ ایسے ہی ہے جیسے پرندے کی نسبت پنجرے کے ساتھ ہوتی ہے یعنی خالق نے پہلے سے ارواح کو خلق کر دیا ہے اور وہ سب انتظار میں کھڑی ہیں کہ بدن دنیا میں تیار ہو جائے تا کہ وہ اس میں قیام کریں یا اس طرح ہے کہ پہلے سے اگرچہ خلق شدہ نہ ہوں لیکن مشیت خدا یہ ہے کہ جب بھی کوئی بدن مل جائے (چاہے ۷۰ سال کے بوڑھے کا ہو) فوراً ایک روح اس کے مناسب خلق کر دے اور اس کی طرف بھیج دے۔

لیکن مشائی مکتب فکر کی یہ دونوں باتیں حکمت متعالیہ کے اصول سے میل نہیں کھاتیں لہٰذا قیامت کے دن صرف ایک بدن ہوگا اور ایک ہی روح۔

آخر میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ معاد جسمانی میں مفاسد تناسخ میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا کیونکہ مفاسد تناسخ درج ذیل ہیں۔

۱۔ عقیدہ تناسخ بالکل معاد کے متضاد عقیدہ ہے۔

۲۔ تناسخ کا لازمہ دو روحوں کا ایک بدن سے تعلق ہے۔

۳۔ جب کامل روح کسی پست بدن سے متعلق ہو تو تناسخ کا لازمہ روح کا تنزلی سفر ہے۔

جب کہ معاد جسمانی میں جیسا کہ بیان ہو چکا ان امور میں سے کوئی امر بھی نہیں پایا جاتا۔

۳۔ معاد جسمانی ظواہر آیات کے متناسب نہیں ہے

یہ تیسرا اشکال ہے۔

قرآن نے معاد کے بارے میں ''انشاء'' اور ''مثل'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٦٠﴾ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ (الواقعہ: ۶۰، ۶۱)

'ہم نے موت تمہارے درمیان مقدر کر دی ہے اور ہم تمہیں مزید زندہ رکھنے سے ہرگز عاجز نہیں ہیں۔ یہ موت اس لیے مقدر کر دی تاکہ کچھ لوگوں کو تمہاری جگہ پر قرار دے دیں اور تمہیں اس خلقت میں قرار دے دیں جسے تم نہیں جانتے''

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾

(دھر: ۲۸)

''ہم نے انہیں خلق کیا اور ان کی خلقت کو مستحکم کیا اور جب چاہیں ان کو موت دے کر ان کی مثل لے آئیں گے''

پہلی آیت میں لفظ "انشاء" اور دوسری آیت میں ''مثل'' استعمال کیا گیا ہے اور لفظ "انشاء" وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں خلقت سابقہ نہ رکھتی ہو اور معاد جیسا کہ متکلمین کہتے ہیں اس طرح تو بے سابقہ خلقت نہیں ہے اور کلمہ ''مثل'' گواہ ہے کہ اخروی خلقت بالکل پہلے والی خلقت نہیں ہے بلکہ اس جیسی ہے۔ [۱]

---

[۱] اسفار جلد ۹ ص ۱۵۳

جواب

جیسے آپ نے کہا کہ لفظ ''انشا'' بے سابقہ خلقت کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے، یہ درست ہے اس کے علاوہ بھی ایک مورد اور ہے جہاں پر یہ لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خلقت پہلے تھی پھر نابود ہوگئی اب نئے سرے سے ایجاد ہو۔ قرآن نے نوع انسان کی خلقت کے بارے میں یوں کہا ہے:

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ (ملك:
٢٣)

''وہ ہے جس نے تمہیں خلق کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھ اور دل قرار دیئے''

اس آیت میں لفظ ''انشاء'' نوع انسان کی خلقت سے مربوط ہے جو مکمل طور پر ابداعی اور بے سابقہ ہے لہٰذا یہ لفظ بے سابقہ خلقت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن دوسرے موارد میں جہاں خلقت بے سابقہ و ابداعی نہ تھی وہاں بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ (انعام: ٦)

''ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اس کے بعد ان سے ہم نے ایک دوسرے گروہ کو خلق کیا''

ممکن ہے کہا جائے کہ نئی قوموں میں لفظ ''انشاء'' استعمال کرنے کا معیار ان کا خلقت کا بے سابقہ ہونا ہی ہے اگر چہ انسان کی اصل خلقت سابقہ دار ہے انسان کی خلقت معاد میں بھی اس کی دوسری خلقت ہے جو پہلی خلقت کے مماثل ہے اس لحاظ سے اقوام جدیدہ کے مشابہ ہو جائے گی جو نوع کے لحاظ سے خلقت سابقہ دار رکھتی ہیں اگر چہ شخصی لحاظ سے نئی خلقت رکھتی تھیں۔

جب قرآن میں ہم لفظ ''انشا'' کے استعمال کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خلقت اور ایجاد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چاہے وہ خلقت سابقہ دار ہو یا مکمل طور پر ابداعی ہو۔ جیسا کہ قرآن نزول باران کے مقدمات میں فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝

(رعد: ١٢)

''وہ وہ ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے امید و بیم کے لحاظ سے اور بھاری بادلوں کو وجود میں لاتا ہے''

یہاں پر بھاری بادلوں کے بارے میں لفظ ''انشاء'' استعمال کیا گیا ہے۔ آیا ان جیسے بادلوں کا ایجاد کرنا بے سابقہ ہے؟ اگر تو ان کا وجود شخصی مراد ہے تو پھر بعینہ یہی بات اخروی بدن کے مورد میں بھی صادق ہے کیونکہ یہ خلقت دوسری خلقت ہے جو کئی جہات سے پہلی خلقت

سے شباہت رکھتی ہے۔

اس سے زیادہ کمزور بات یہ ہے کہ معاد میں خلق بدن کے بارے میں لفظ ''مثل'' کو سامنے رکھ کر کہا جائے کہ لفظ مثل کا تقاضا ہے کہ معاد اس طرح نہیں ہونی چاہیے جیسے متکلمین کہتے ہیں۔ حالانکہ لفظ ''مثل'' کا تقاضا صرف یہ ہے کہ اخروی زندگی دنیوی زندگی کی مانند ہے نہ کہ اس کی عین اور اس لحاظ سے کہ یہ خلقت (معاد میں) اگرچہ عنصری ہوگی لیکن خلقت دوم ہے اور اس دنیوی زندگی سے کامل تر اور لطیف تر ہے لہٰذا مثل کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو انسان ایک جیسے گھر بناتا ہے وہ دوسرے گھر کو پہلے گھر کے مشابہ کہے گا نہ کہ اسے عین پہلا گھر کہے گا۔

۴۔ معاد دنیوی خلقت کی غایت ہے اس کی طرف برگشت نہیں

چوتھا اشکال یہ ہے کہ معاد عقلی و نقلی دلائل کے مطابق دنیوی خلقت کی غایت ہے اور خدا کی طرف حرکت کا نقطۂ آغاز ہے اور یہ تب ممکن ہے جب دوسرے جہان میں انسان کی خلقت اس کی اس جہان میں خلقت کے علاوہ ہو اور اگر معاد کے معنی مادی خلقت و ظلمانی زندگی کے ساتھ کیے جائیں تو ایسی صورت میں خدا کی قربت و غایت خلقت انسان کیسے ہو سکے گی؟ (اسفار جلد ۹ ص ۱۵۳)

جواب

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ معاد خدا کی طرف رجوع ہے اور ایک لحاظ سے اس کے قرب کی موجب ہے اور خلقت انسان کی غایت بھی ہے لیکن ان حالات کا محور انسانی روح ہے نہ کہ اس کا بدن۔ چاہے روح بدن کے علاوہ محشور ہو یا برزخی بدن کے ساتھ محشور ہو یا عنصری بدن کے ساتھ محشور ہو۔ ہر حالت میں بدن روح کے لیے ایک وسیلہ و آلہ ہے اور روح اس بدن سے مادی دنیا میں ایک طرح سے استفادہ کرتی ہے تو آخرت میں ایک اور طرح استفادہ کرے گی۔ یعنی اس دنیا میں روح بدن سے کمال و تحصیل کے لیے استفادہ کرتی ہے جبکہ آخرت میں روح کو بدن کی ضرورت حسی جزا و سزا پانے کے لحاظ سے ہوگی۔

بہر حال خدا کی طرف لوٹنا یا خدا کا قرب مشروط نہیں ہے کہ روح مجرد ہو یا کسی خاص قسم کے بدن کے ساتھ ہو روح ایک مجرد موجود ہے جو کئی مراتب رکھتی ہے جیسے پہلی نشاۃ میں بدن و طبیعت کے ساتھ تعلق کے باوجود کلیات و حقائق مرسلہ (غیر مقید) کی مدرک غیبی صورتوں کی شاہد ہے ایسے ہی آخرت میں بھی وہ بدن کے ساتھ تعلق کے باوجود دنیوی ادراک سے قوی تر ادراک رکھتی ہے اور معنوی لذات کے ادراک اور غیر مادی حقائق پر توجہ پر بھی قادر ہے۔

معاد کا اس طرح جسمانی ہونا جیسا کہ متکلمین کہتے ہیں یہ بھی رجوع اللہ کے منافی نہیں ہے اور معاد کے دنیوی زندگی کی غایت ہونے کے بھی منافی نہیں ہے کیونکہ معاد کا غایت ہونا دو لحاظ سے قابل مطالعہ ہے:

۱۔ ایک تو تجسم اعمال اور جزا و سزا کے لحاظ سے

۲۔ دوسرا استعداد و قوۃ کے عملی شکل اختیار کر لینے اور انسان کی کمال کی طرف حرکت کے متوقف ہو جانے کے لحاظ سے۔

ان دو مطالب میں سے کوئی بھی عنصری بدن کے زندہ ہونے کے منافی نہیں ہے چونکہ جزا و سزا پانا اور تجسم اعمال تو واضح ہے کہ عنصری بدن کے منافی نہیں ہے اور استعداد کا عملی شکل اختیار کر لینا اور کمال کی طرف حرکت کا متوقف ہو جانا بھی منافی نہیں ہے کیونکہ روح کا اخروی بدن کے ساتھ تعلق دنیوی بدن کے ساتھ تعلق کا غیر ہے اور روح کا عنصری بدن کے ساتھ تعلق حرکت کو لازمی قرار دیتا ہے جب دونوں قسم کا تعلق ایک جیسا ہو جبکہ ہم سابقاً عرض کر چکے ہیں کہ یہ دو قسم کا تعلق ہے نہ کہ ایک قسم کا۔

۵۔ روح آخرت میں اپنے آپ کے ساتھ قائم ہے

پانچواں اشکال یہ ہے کہ روح اس دنیا میں بدن کے ساتھ قائم ہے اور اپنی تکاملی حیات میں اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی لیکن آخرت میں زیادہ تکامل اور قوت کی وجہ سے اپنے آپ کے ساتھ قائم ہے اور بدن کی محتاج نہیں ہے اور اگر وہاں پر کوئی بدن ہوگا بھی تو وہ بدن روح کے ساتھ قائم ہوگا اور اسی وجہ سے آخرت کو قیامت کہا جاتا ہے کیونکہ روح اس آشیانے سے پرواز کر جاتی ہے اور اس سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور عالم غیب پر توجہ کی بنا پر خود سے قائم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اخروی بدن کو مادی بدن نہیں کہا جا سکتا کہ روح جس کی محتاج ہوتی ہے بلکہ وہ بدن برزخی یا مثالی ہونا چاہیے جو روح کی مخلوق اور روح ہی کے ساتھ قائم ہوگا۔[1]

جواب

آپ کی دلیل کا محور لفظ "قیامت" ہے جو آیات و روایات میں آیا ہے اور آخرت کے ناموں میں سے ایک نام ہے لیکن آخرت کو قیامت اس وجہ سے نہیں کہا جاتا جو آپ نے فرمائی ہے بلکہ کچھ اور معیار ہیں جن کی وجہ سے آخرت قیامت کہلاتی ہے جنہیں ان آیات نے واضح کیا ہے:

۱۔ یوم یقوم الحساب (ابراهیم: ۴۱)

۲۔ یوم یقوم الاشهاد (مومن: ۵۱)

۳۔ یوم یقوم الروح والملٰئِکۃُ صفا (نبا: ۳۸)

۴۔ یوم یقوم الناس لرب العالمین (مطففین: ٦)

یہ آیات بتاتی ہیں کہ آخرت کو قیامت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اُس دن حساب بپا ہوگا، گواہ اٹھیں گے، روح اور ملائکہ صفوں کی صورت میں کھڑے ہوں گے اور مردے قبروں سے اٹھیں گے۔ آپ نے دیکھا ان آیات میں بالکل اُس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا جو صدر المتالهین نے بیان کی ہے۔ اس سے قطع نظر جواب یہ ہے کہ مادی بدن کو اس صورت میں ترک کیا جا سکتا ہے کہ روح بطور کلی اس سے بے

[1] اسفار جلد ۹ ص ۱۵٦

نیاز ہو جائے حالانکہ آخرت میں روح کو جزا و سزا پانے کے لیے بدن کی ضرورت ہوگی اور قطعی طور پر یہ ضرورت برزخی یا مثالی بدن سے پوری نہیں کی جا سکتی جس کے قائل صدرا ہیں۔

۶۔ انکار کی وجہ کیفیت معاد کا تعین کرتی ہے

ایک اشکال یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے مسئلہ معاد کو لوگوں سے بیان فرمایا تو بہت شدت سے منکرین نے اس کی مخالفت کی۔ اگر یہ معاد جس کی دعوت قرآن لوگوں کو دے رہا ہے مردوں کا احیاء ہی ہوتا، تو اتنی وحشت اور شدت انکار کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس جیسی زندگی کا مشاہدہ تو وہ حیوانات، نباتات اور انسان میں کر چکے تھے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے انہیں ایک ایسے عالم کی دعوت دی جس میں روح کا بدن سے تعلق ختم ہو جاتا ہے اور ایک ایسے جہان میں اسے اٹھایا جائے گا جو مکمل طور پر اس جہان سے مختلف ہوگا تو ایسی صورت میں معاد کے انکار کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ اس لحاظ سے کہ اس جیسی اخروی حیات کا سمجھنا ان کے حسی ادراک سے بعید تھا لہٰذا اس کی مخالفت پر تل گئے۔

۲۔ چونکہ وہ بدن اور اس کے آثار و لوازم مثلاً شہوت، غضب وغیرہ کے ساتھ انتہائی شدید وابستگی رکھتے تھے اس لیے وہ اس قسم کی معاد کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور انہوں نے وحی کے خلاف نکتہ نظر اختیار کر لیا۔ [1]

جواب

اس شبہ کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ وہ لوگ معاد کو اسی پہلے معنی کے لحاظ سے بھی غیر معقول سمجھتے ہوئے اسے جنون کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔

مردوں کا زندہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ مشرکین آسانی سے اسے قبول کر لیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج عقل و خرد کی اتنی ترقی کے باوجود حیات مجدد اور آخرت کا مسئلہ کچھ پڑھے لکھے اذہان کے لیے بھی کاملاً واضح نہیں ہے قرآن بعض مخالفین کے قول کو یوں نقل کرتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ (سباء: ۷،۸)

"اور کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایسا مرد دکھائیں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو نئے

[1] اسفار جلد ۹ ص ۱۵۶

سرے سے خلق کیے جاؤ گے۔ یہ آدمی یا جھوٹ بولتا ہے یا مجنون ہے"

جیسا کہ آپ نے دیکھا آیت کا ظاہر یہی ہے کہ مشرکین کے لیے وجہ تعجب خود مردوں کا زندہ کرنا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو بدن ذرہ ذرہ ہو کر بکھر چکا ہو وہ دوبارہ جمع ہو کر نئے سرے سے خلق ہو۔ اور قبل از یں ہم نے ایک جداگانہ فصل میں منکرین معاد کے شبہات کو ذکر کر دیا ہے آپ ان شبہات کا مطالعہ کریں تو واضح ہو جائے گا کہ ان کی مراد بھی معاد ہی ہے جیسے متکلمین کہتے ہیں۔

صدر المتالہین نے جو انکار کی دوسری وجہ ذکر کی اس کے بارے میں بھی عرض کرتے ہیں کہ اگرچہ منکرین معاد کے انکار کی بڑی وجہ یہی چیز تھی لیکن یہ وجہ خود اصل معاد پر اشکال ہے چاہے قیامت میں اٹھایا جانے والا بدن وہی عنصری و مادی ہو یا برزخی و مثالی، ہر حالت میں اصل معاد کا اعتقاد انسان کی مادی خواہشات کے مناسب نہیں ہے نہ کہ کیفیت معاد کا اعتقاد۔

۷۔ پہلے بدن سے تعلق میں کیا ترجیح ہے

ساتواں اشکال یہ ہے کہ روح بدن کے تکامل کا نتیجہ ہے اور اس کے ساتھ ایک خاص رابطہ رکھتی ہے اس کا بدن کے ساتھ ربط جعلی و فرضی نہیں ہے بلکہ تکوینی وخلقت کے لحاظ سے ہے اسی ربط کا نتیجہ ہے کہ روح کا جب تک بدن کے ساتھ ربط رہتا ہے صرف اپنے بدن کے ساتھ ربط رہتا ہے، کسی اور بدن کے ساتھ نہیں لیکن جب روح بدن سے جدا ہو گئی اور بدن کے اجزا متفرق خاکی ذروں میں تبدیل ہو گئے تو ایسی صورت میں کہ جب روح کا تعلق بدن سے منقطع ہو چکا ہے اگر یہ اجزا جمع ہو کر انسانی صورت اختیار کر بھی لیں تو بھی روح کا اس بدن کے ساتھ دوبارہ تعلق ترجیح چاہتا ہے یعنی یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیوں روح اس بدن کے متعلق ہوئی اور کسی اور بدن کے متعلق نہ ہوئی؟ [1]

جواب

معاد جسمانی عنصری کی نفی میں اس شبہ پر تب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ جب برہان ودلیل کے ذریعے ثابت ہو جائے کہ روح اور جس بدن سے وہ جدا ہوئی ہے ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ موجود نہیں ہے اور قطع تعلق کے بعد روح ہر بدن کے ساتھ مساوی نسبت رکھتی ہے اگر اس مطلب پر برہان موجود نہ ہو تو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ہر روح اور اس بدن کے درمیان جس کے دامن میں اس روح نے پرورش پائی ہے ایک خاص تعلق اور خصوصیت موجود ہے جو اس روح اور کسی دوسرے بدن کے درمیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب قیامت بپا ہوگی تو ہر روح صرف اسی بدن کے مناسب ہوگی جس کے دامن میں اس نے پرورش پائی ہو لہٰذا صرف اسی بدن کے ساتھ محشور ہوگی نہ کہ کسی اور بدن کے ساتھ اور چونکہ صدر المتالہین کا یہ شبہ ایک عقلی شبہ ہے اور دلیل بھی نہیں رکھتا لہٰذا ظواہر آیات وروایات کے لیے ہمارا یہ احتمال کافی ہے۔

بالفاظ دیگر یہ بات صحیح ہے کہ ہر روح کو مواد بدن (مختلف عناصر) کے ساتھ برابر کی نسبت حاصل ہے لیکن اس لحاظ سے کہ ان عناصر کی ترکیب سے ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اعضا واعصاب میں مشاہدہ کی جاتی ہے اب ممکن ہے کہ وہ کیفیت جو ترکیب عناصر

---

[1] اسفار جلد ۹ ص ۲۰۵

سے حاصل ہوئی ہے ہر بدن میں صرف اسی روح کے مناسب ہو جو دنیا میں اس بدن کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔

درست ہے کہ قیامت کے دن بعینہٖ دنیا والا بدن نہیں لوٹے گا کیونکہ عینیت کو فلسفی معنی کے مطابق باقی رکھنے کے لیے زمان و مکان اور دوسری خصوصیات کا لوٹانا بھی ضروری ہے جو محال امیر ہے۔

لیکن اس جہت سے کہ وہ لوٹایا ہوا بدن اس پہلے والے بدن کی تمام خصوصیات و کیفیات رکھتا ہوگا طبعی طور پر بدن کی روح کے ساتھ ہم آہنگی و مناسبت بھی باقی رہے گی اور اس طرح سے ترجیح بلا مرجح کا اشکال بھی حل ہو جائے گا۔

۸۔ فعلیت سے قوت کی طرف واپسی

معاد جسمانی عنصری پر کیے جانے والے اشکالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جسے فعلیت سے قوہ کی طرف رجوع کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے کہ جو محال امر ہے۔

انسانی روح بدن کو چھوڑتے وقت تمام یا بعض قوتوں کو فعلیت میں تبدیل کر لیتی ہے اور ان سب کو پا لیتی ہے ایسی صورت میں اس مجرد موجود (روح) اور اس محض مادی موجود (بدن) میں کوئی مناسبت ہی نہیں پائی جاتی کہ دوبارہ آپس میں اتحاد پیدا کر لیں۔ بنابریں اگر معاد جسمانی کو قبول کر لیں تو ضروری ہے کہ روح مادی بدن کی طرف لوٹے اور دونوں میں ہم آہنگی و مناسبت تب پیدا ہو سکتی ہے کہ جب روح اپنے تجرد کے مرتبہ تنزل کرے اور فعلیت سے قوۃ کی طرف لوٹ آئے اور یہ چیز حکمت الٰہی سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ حکمت الٰہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ناقص چیزوں کو کمال تک پہنچائے نہ کہ برعکس کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ عنصری بدن کی طرف لوٹنا یا تجرد و کمالات کے ساتھ ہوگا یا ان سے تنزل کے بعد۔ اگر پہلی صورت ہو تو روح و بدن میں مناسبت و ہم آہنگی نہیں ہوگی اور دوسری صورت میں فعلیت سے قوت کی طرف رجوع لازم آئے گا۔

مرحوم صدر المتالہین اشکال میں صرف پہلی صورت پر متوجہ تھے اور دوسری صورت کے مسلماً ممتنع ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں فرماتے وہ اس طرح فرماتے ہیں:

روح کی پیدائش کا سرچشمہ مادہ کی ذاتی حرکت ہی ہے جو ہمیشہ راہ کمال کو طے کرتا رہتا ہے اور نیچے سے اوپر کی جانب متحرک رہتا ہے یہاں تک کہ حرکت جوہری کے زیر سایہ تمام مراتب کو طے کر لیتا ہے اور مرتبہ روح اور اس سے اوپر والے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے ایسی صورت میں روح اور خاکی بدن کے اجزا کے درمیان کوئی مناسبت نہیں رہے گی۔ [1]

حکمت متعالیہ کے موسس (صدر المتالہین) اس لحاظ سے کہ اخروی نشاۃ کو دنیوی زندگی کے بالکل مقابل سمجھتے ہیں اس طرح فرماتے ہیں:

”ارباب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے کہ آخرت میں انسان کی ہستی و وجود کی ایک اور قسم ہے جو دنیوی زندگی

---

[1] اسفار جلد ۹ ص ۲۰۶

سے جو پانی اور مٹی سے پیدا ہوتی ہے بالکل مختلف ہے۔ اصولی طور پر موت اور قیامت خدا کی طرف حرکت و قرب کا نقطہ آغاز ہے نہ کہ مادی خلقت کی طرف رجوع ہے کہ جسے مادی کی تاریکی وظلمت مکمل طور پر ڈھانپے ہوئے ہے"۔ [1]

یہ اشکال نہ صرف معاد جسمانی عنصری کے قائلین کو درپیش ہے بلکہ یہ ایک دیرینہ اشکال ہے کہ جو ابدان سے پہلے خلقت ارواح کے نظریہ پر بھی کیا جاتا رہا ہے۔ جو لوگ قائل ہیں کہ ابدان کی خلقت سے پہلے انسانوں کی روحیں خلق کی جا چکی ہیں اور ہر روح امر الٰہی کے ساتھ ایک بدن کے متعلق ہو جاتی ہے، ان پر بھی یہی اشکال ہوتا ہے کہ روح ایک مجرد موجود ہے اور مادہ وقوہ سے پاک اسے مادی دنیا میں لوٹانا موجب بنے گا کہ وہ فعلیت سے قوت کی طرف رجوع کرے۔

بالفاظ دیگر اگر تجرد کامل کو باقی رکھتے ہوئے بدن کے ساتھ تعلق پیدا کرے تو ایسی صورت میں اتحاد کے لیے ہم آہنگی کا معیار اُس میں نہیں ہوگا اور اگر تجرد و فعلیت سے تنزل کرے اور مادہ وقوۃ سے آلودہ ہو جائے تو فعلیت سے قوت کی طرف رجوع لازم آئے گا۔ اور یہی وہ اہم و معروف اشکال ہے جس کا شیخ الرئیس ابن سینا نے اپنے معروف ''عینیہ'' قصیدہ میں ذکر کیا ہے جس کا پہلا شعر کچھ یوں ہے:

هبطت اليك من المحل الارفع
ورقاءُ ذات تعزز و تمنع

اگر چہ شیخ کے بعد کچھ لوگوں نے اسی بحر پر قصیدہ کہہ کر اپنی دانست میں شیخ کے اس اشکال کا جواب دے دیا ہے جو فی الحال ہمارے مورد نظر نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ فعلیت سے قوۃ کی طرف رجوع والا اشکال بعض کی نظر میں معاد جسمانی عنصری کے نظریہ پر پیش آتا ہے اور تاریخ فلسفہ وعرفان میں مختلف مناسبتوں پر ذکر کیا جاتا رہا ہے مثلاً مثنوی میں مولانا رومی نے صرف ایک تمثیل پر اکتفا کی ہے اور ابہام کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ہیچ آئینہ دگر آہن نشد
ہیچ فانی، گندم خرمن نشد
ہیچ انگوری دگر غورہ نشد
ہیچ میوہ پختہ باکورہ نشد ([2])

اس شبہ کا جواب دینے سے پہلے ہم ایک نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ صدر المتالہین اور اسلامی متکلمین

---

[1] اسفار جلد ۹ ص ۱۵۳

[2] مثنوی دفتر اوّل ص ۱۳۸

کے ساتھ ایک اصول میں ہم اتفاق نظر رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ اس دنیوی زندگی اور اخروی نشاۃ میں کچھ تفاوت واختلاف پایا جاتا ہے اور خدا ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ دوبارہ دنیا بسائے اور انسان کو اس کی طرف لوٹا دے کیونکہ اگر یہی کچھ کرنا ہوتا تو پہلے دنیا میں یہ مقصد حاصل ہو رہا تھا۔ ہمارا ان کے ساتھ اختلاف اس بات پر ہے کہ وہ اس اختلاف کو وجود مادی کے تحقق وعدم تحقق میں بیان کرتے ہیں اور معتقد ہیں کہ آخرت میں وجود مادی بالکل نہیں ہوگا، نہ وہاں پر عنصری بدن ہوگا اور نہ ہی حسی جزاوسزا۔

جب کہ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس نظریے پر نہ تو کوئی قطعی دلیل موجود ہے اور نہ ہی بہت سی قرآنی آیات کے موافق ہے بلکہ ہم دوسرے جہان میں عنصری بدن اور حسی جزاوسزا کے قائل ہونے کے باوجود دونوں جہانوں میں موجود اختلاف کو دوسری طرح سے بیان کریں گے اور وہ یہ کہ دونوں جہانوں میں کیفیت کا اختلاف پایا جاتا ہے جو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز و مشخص کرتا ہے اور بہت سی آیات وروایات میں اس اختلاف کو بیان کیا گیا ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ اس دنیا میں شراب کی تاثیر مست کرنے کی ہے چراغ عقل کو بجھا دیتی ہے جب کہ اگلے جہان میں شراب یہ تاثیر نہیں رکھتی۔[۱]

۲۔ جن بہشتی نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے قرآن انہیں بیان کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے:

''جس جنت کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے اس کی واقعیت یہ ہے کہ اس میں تبدیل یا خراب نہ ہونے والی پانی اور دودھ کی نہریں ہیں، اس میں لذت بخش شراب کی نہریں ہیں اور شہد مصفی کی نہریں ہیں''[۲]

اس آیت میں چار جنتی نعمات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس میں ایسے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے جو بالکل دنیوی اوصاف کے خلاف ہیں۔

۳۔ آخرت میں موت نہیں آئے گی۔ قرآن کریم یوں فرماتا ہے:

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (دخان: ۵۶)

''جنت میں وہ پہلی موت کے علاوہ موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے''[۳]

اس لحاظ سے کہ موت عالم طبیعت میں تضاد وتزاحم کا نتیجہ ہے کہ قوتیں تحلیل ہوجاتی ہیں اور موجود سے حیات کی قابلیت سلب ہو جاتی ہے لہٰذا آخرت میں موت کا نہ ہونا پتہ دیتا ہے کہ وہاں تضاد وتزاحم بھی نہ ہوگا۔

۴۔ اس دنیا میں بہترین اور معتدل ترین آب وہوا کے باوجود انسان کا بدن گرمی وسردی کا احساس کرتا رہتا ہے جبکہ آخرت میں جنتی ہر قسم

---

[۱] لا فیھا غول ولاھم عنھا ینزفون۔ (صافات: ۴۷)

[۲] مثل الجنۃ التی وعد المتقون فیھا انھار من ماءٍ غیر اسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ وانھار من خمر لذۃ للشاربین وانھار من عسل مصفی (محمد: ۱۵)

[۳] لا یرون فیھا شمسًا ولا زمھریراً (دھر: ۱۳)

کی گرمی وسردی سے محفوظ ہوں گے۔[1]

آن جہاں جزباقی و آباد نیست
ز آنکہ ترکیب وی ازا ضدا دنیست
نفی ضد کرد از بہشت بے نظیر
کہ نبا شد شمس و ضدش ز مہریر

مذکورہ اختلافات کے علاوہ اور بھی کچھ تفاوت ہیں جو آیات وروایات میں ذکر کیے گئے ہیں جنہیں ہم یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتے بلکہ یہاں ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاد جسمانی عنصری کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس جہان (مادی دنیا) کی تمام خصوصیات کے بھی آخرت کے لیے قائل ہو جائیں اور کوئی دلیل عقلی موجود نہیں ہے کہ مادہ جہاں پر بھی ہو تمام حالتوں میں ایک جیسے آثار واحکام رکھتا ہے۔

اس مطلب کو جان لینے کے بعد اب ہم صدر المتالہین کے آٹھویں اشکال کے بارے میں کچھ مطالب بیان کرتے ہیں کہ ان مطالب میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طرح سے اشکال کو حل کرتا ہے۔

(الف) موت اور روح کا بدن سے جدا ہو جانا اس کے اس کامل تجرد کی علامت نہیں ہے جس میں قوتیں اور قابلیت ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ حکما کی نظر میں اکثر اموات ''اخترامی وپیش رس'' ہیں طبعی نہیں یعنی ابھی تک ارواح کے تکامل کا امکان موجود ہوتا ہے لیکن کسی وجہ سے موت آجاتی ہے اور روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے یہ بات کہ موت روح کے مکمل تجرد کی علامت ہے اور دلیل ہے کہ اب روح کا بدن کے متعلق ہونا ناممکن ہے اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف دلیل موجود ہے جو ثابت کرتی ہے کہ تمام لوگوں کی موت ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ روحیں جب اس جہان کو ترک کرتی ہیں تو فعلیت وکمالات کے لحاظ سے متفاوت ہوتی ہیں۔ قرآن کے عظیم مفسر علامہ طباطبائی مرحوم ''احیاء موتی'' اور بعض امتوں کے مسخ ہو جانے کے بارے میں ایک بحث فرماتے ہیں ہم مناسبت کی وجہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

علامہ ''احیاء موتی'' میں فعلیت سے قوت کی طرف رجوع والے اشکال کو ذکر کرتے ہیں اور اس کے جواب میں یوں فرماتے ہیں:

''جو کچھ تجربے سے ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائے خلقت میں انسان کی واقعیت ایک ''جوہر نباتی'' کی مانند ہے۔ جو اپنی ارتقائی سفر اور تکاملی سفیر میں ''جوہر حیوانی'' کی طرف بڑھتا ہے اور تجرد برزخی کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں اسے جزئی وخیال کے ادراک کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ مرحلہ پہلے مرحلے (نباتی صورت) کی نسبت فعلیت وکمال شمار کیا جاتا ہے۔ اب محال ہے کہ وہ اپنی تکاملی راہ میں دوبارہ اس مرحلے (نباتی صورت) کی طرف لوٹ جائے یہاں تدریجاً یہ واقعیت برزخی روح تکامل حاصل کرتی رہتی ہے اگر تو اپنی

---

[1] دوزخیوں کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے: والذین کفروا لھم نار جھنم لا یقضی علیھم فیموتوا یعنی کافروں کے لیے آتش دوزخ ہے اور اُن کے لیے موت کا حکم ہی صادر نہ ہوگا کہ وہ مریں (فاطر:۳۶)

طبعی عمر پوری کر لے تو ایک طرح کے خاص حیوان میں بدل جاتی ہے اور اگر اپنی طبعی عمر پوری نہ کر سکے اور اخترامی موت کا شکار ہو جائے تو اسی بسیط حیوانی نفس کے مرتبہ پر باقی رہتی ہے"

"پھر جب بھی یہ حیوانی نفس انسانیت کی طرف تکامل کی راہ میں قرار پاتا ہے تو تدریجاً حرکت جوہری کے زیر سایہ مثالی فعلیت سے آگے بڑھتا ہے اور عقلانی فعلیت وتجرد حاصل کر لیتا ہے یہاں پر انسان کی واقعیت اور صورت اس کے لیے بالفعل متحقق ہو جاتی ہے اس مرحلے پر وہ اپنی ذات وہستی کو بطور کلی اور مادہ ولوازم مادہ سے مجرد ادراک کر سکتی ہے۔اس کے لیے محال ہے کہ دوبارہ اس مرتبہ سے جو فعلیت عقلانی ہے پہلے کرتبہ کی طرف لوٹ جائے جو فعلیت مثالی ہے اور مرتبہ عقلانی کے لیے قوۃ ہے"

"یہ انسان کی فعلیت وصورت بھی اپنے لیے مختلف افعال وحالات رکھتی ہے جن کے تدریجاً تحقق سے انسان کی ایک خاص نوع پیدا ہو جاتی ہے (جیسا کہ مرتبہ فعلیت حیوانی میں ہوا تھا)

"بنابریں اگر فرض کریں اگر کوئی انسان مرنے کے بعد دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ آئے اور اس کی روح اسی مادہ سے تعلق قائم کر لے جس کے ساتھ پہلے تعلق رکھتی تھی تو کسی طور پر بھی اس کا تجرد ضائع نہیں ہوگا بلکہ جو تجرد اسے موت سے پہلے حاصل تھا اب بھی اسی مرتبہ پر فائز ہوگی اور کوئی سفر تنزلی انجام نہ دے گی اور نہ ہی فعلیت کے مرتبہ سے قوت کے مرتبہ کی طرف تنزل کرے گی" [1]

بالفاظ دیگر فرق ہے ان مجردات کی خلقت میں جو پہلے دن سے کامل تجرد کے سانچے میں خلق کیے گئے ہیں اور ان کا بدن کے ساتھ تعلق ممکن نہیں ہے اور اس روح میں جو مادہ کے کمال کے نتیجہ میں مسلسل کمال کی طرف گامزن رہتی ہے اور موت کے وقت بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ان دو موجود کا آپس میں قیاس کرنا قیاس مع الفارق دو مختلف چیزوں کو ایک دورے پر قیاس کرنا ہے۔

(ب) مادی بدن کے ساتھ امکان تعلق تب نقص شمار ہوتا ہے جب روح کے حاصل شدہ کمالات اور فعلیتوں کے منافی ہو لیکن اگر اس لحاظ سے کہ روح درجات ومراتب رکھتی ہے روح کی وہ فعلیتیں اور کمالات بھی محفوظ رہیں اور یہ امکان تعلق بھی تو ایسی صورت میں یہ امکان روح کے لیے نقص شمار نہیں ہوگا۔

روح ایک الٰہی موجود ہے جو عقلانی محض کے مرتبے میں کامل مجردات کے ادراک پر قادر ہے اور ایک دوسرے مرتبہ میں کہ جو تجرد مثالی وبرزخی کا مرتبہ ہے صرف اشیا کی صورتوں کو مادہ کے بغیر ادراک کرتی ہے ان دو مرتبوں پر فائز ہونے کے باوجود ایک اور مرتبے میں وہ ایسی خصوصیت رکھتی ہے کہ بدن کے ساتھ تعلق برقرار کر سکتی ہے اور اس کی تدبیر کر سکتی ہے جیسا کہ دنیا میں یہ تین مرتبہ رکھتی تھی بالفاظ دیگر دوسری فعلیات وکمالات کے باوجود قوۃ واستعداد کو باقی رکھنا نقص وعیب شمار نہیں کیا جاتا۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ا، ص ۲۰۷، ۲۰۹

(ج) ہم روح کے مقام کو اخروی بدن سے موازنہ کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ ہم کہیں کہ آخرت میں روح کی بدن کے ساتھ وہی نسبت ہے جو فلاسفہ کی نظر میں عالم عقول کو عالم مادہ کی نسبت حاصل ہے۔ حکمت متعالیہ کے اصول کے مطابق عالم مادہ اپنی وسعتوں کے ساتھ عالم عقول کے زیر نظر چلایا جاتا ہے اور عقول کا تجرد ان دو کے درمیان تدبیری تعلق سے مانع نہیں ہے۔ اسی طرح آخرت میں روح کا تجرد و کمال بھی مانع نہیں ہو سکے گا کہ وہ اپنے پہلے بدن کے ساتھ تدبیری تعلق برقرار کرے اور اس طرح مبدائے حیات بن جائے جو حسی جزا و سزا کا ادراک کر سکے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تعلق تدبیری کی ان دو قسموں میں کئی فرق موجود ہیں لیکن ان کے باوجود تعلق کی ان دو قسموں میں ایک قدر مشترک بھی موجود ہے۔ جو مسئلے کو حل کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ کامل تجرد مادہ سے تعلق سے مانع نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ روح کئی مرتبے رکھتی ہے جن میں سے صرف ایک مرتبہ بدن کے ساتھ سروکار رکھتا ہے نہ کہ تمام مرتبے۔

اصولی طور پر بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ امکانی انسان کے لیے اس بحث کی تمام جزئیات واضح و روشن نہیں ہیں چونکہ عالم آخرت عالم غیب ہے جو ابہام کے پردوں میں گم ہے۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ بھی وحی کی روشنی میں۔ اور اگر وحی (کہ جس میں غلطی و خطا کا کوئی امکان نہیں ہے) کسی مسئلے کو تصریحاً ذکر کر دے تو ان مبہم تفکرات کی وجہ سے اس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا اور نہ ہی آیات کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ یہاں پر ایک اور احتمال بھی ہے، اگر چہ اسے قطعی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک احتمال کی حد تک ظواہر آیات کو ملتزم ہونے میں معاون ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آخرت میں روح کا بدن کے ساتھ تعلق فعلیات و کمالات و ترقی حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے کیونکہ سعی و کوشش اور فعلیات کے حصول کے لیے یہ جہان ہے اور آخرت تو بوئے ہوئے کو کاٹنے اور ان فعلیات کے نتائج پانے کی جگہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق:

وان الیوم عمل ولا حساب وغداً احساب ولا عمل[1]

اور پیغمبر اکرمؐ کی تعبیر کے مطابق

الدنیا مزرعة الاخرة

''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''

بدن کے ساتھ روح کا تعلق آخرت میں ایک قسم کی جزا و سزا کے تحقق کی خاطر ہے جو بدن کے ساتھ تعلق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں روح کا بدن کے ساتھ تعلق ثواب و عقاب پانے اور جزا و سزا حاصل کرنے کی خاطر ہے۔ اس جیسے تعلق کو نہ تو نقص شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کمال سے نقص کی جانب رجوع ہو سکتا ہے لہٰذا آخرت میں روح کے بدن کی طرف رجوع میں اس کی فعلیات ضائع نہیں ہوتیں لہٰذا فعلیت سے قوہ کی طرف رجوع بھی لازم نہیں آئے گا۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۴۲ (آج عمل کا دن ہے حساب کا نہیں، کل حساب کا دن ہوگا عمل کا نہیں)

روح وبدن کے درمیان ہم آہنگی بھی باقی رہتی ہے کیونکہ جو بدن قیامت میں لوٹا یا جائے گا تکامل وجودی کے لحاظ سے اسی بدن کی حد میں ہے کہ موت کے وقت روح جس سے جدا ہوئی تھی نہ کہ جنین وبچپن کی حدود میں ہوگا۔لہٰذا یہ اشکال بھی پیش نہیں آئے گا کہ روح وبدن میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

(۱۲)

معادروحانی عقل وحکما کی نظر میں

''معاد از نظر جسمانی وروحانی'' کے زیر عنوان ان مطالب کی تحقیق ہو چکی ہے:

۱۔ اقوال وآرا

۲۔ معاد جسمانی وروحانی کی پہچان کے معیار

۳۔ ہر دو معیار کے لحاظ سے قرآن کی نظر میں معادروحانی وجسمانی

۴۔ اسلامی حکما و متکلمین کی آراونظریات معاد جسمانی کے بارے میں

۵۔ معاد جسمانی عقل کی ترازو پر

۶۔ معاد جسمانی سے متعلق اشکالات کے جوابات

اس بارے میں آخری بحث ہے ''معادروحانی عقل کی ترازو میں'' نیز حکما کے نظریات کی تحقیق اس بارے میں ہر دو معیار کی بنیاد پر عقل معادروحانی کی تائید کرتی ہے۔ پہلا معیار یعنی روح کا آخرت میں محشور ہونا۔[1] ایک روشن و بدیہی مطلب ہے کیونکہ روح کے بقا وتجرد کے ثابت ہو جانے کے بعد اب اس کے محشور ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں رہے گا۔ گویا اس بحث میں اہم چیز دوسرے معیار کی بنیاد پر معادروحانی کا ثابت کرنا ہے۔ اس مورد میں ہم دو نظر سے حکم عقل کی تحقیق کریں گے:

۱۔ اس کا ممکن یا ممتنع ہونا

۲۔ اس کے تحقق پر دلیل

پہلی نظر کے لحاظ سے کوئی عقلی مانع موجود نہیں ہے جو کہے کہ غیر حسی جزاوسزا جس کے لیے روح کو بدن عنصری کی ضرورت نہیں ہوتی، وجود نہیں رکھتیں لہٰذا یہاں بھی دوسری بات زیادہ اہم ہے یعنی مذکور معیار کی بنیاد پر معادروحانی کے وجود پر دلیل عقلی۔

معادروحانی اور حکمت ورحمت الٰہی

سابقاً جہاں پر ہم معاد کے حتمی ہونے کی دلائل کی تحقیق کر رہے تھے تو عرض کیا تھا کہ ''حکمت'' اور ''رحمت الٰہی'' جیسے اصول معاد کے قطعی ویقینی ہونے کو ثابت کرتے ہیں اب یہاں پر بھی عرض کرتے ہیں کہ یہی دو اصول معادروحانی کے تحقق کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔

---

[1] قرآنی رو سے روح کا حشر بدن کے ہمراہ ہوگا اگرچہ عقل اصل معادروحانی کو صحیح کہتی ہے چاہے بدن اس کے ہمراہ ہو یا نہ ہو۔

اس بات کی توضیح کی آخرت میں محشور کیے جانے والے انسان دو قسم کے ہوں گے۔

ایک وہ جو تکامل کے لحاظ سے اس حد تک پہنچ سکے ہیں کہ لذائذ میں سے صرف حسی لذتیں اور اسی طرح آلام میں سے صرف حسی آلام کا ادراک کر سکتے ہیں بطور مسلم اس گروہ کی معاد ثواب وعقاب کے لحاظ سے صرف حسی لذات وآلام کے ذریعے ہوگی اور سعادت وشقاوت کے لحاظ سے ان کا حسی ادراک اور جسم ہی معیار قرار پائے گا۔ لیکن کچھ ایسے انسان بھی پائے جاتے ہیں جو معرفت وکمال کے اس درجے تک پہنچ چکے ہیں کہ جسمانی لذتیں ان کی نظر میں ہیچ ہیں اور ہر گز ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ لوگ روحانی مقامات اور قرب حق پر فائز ہونے میں ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں اور ان کی سعادت اسی میں ہے کہ بلند موجودات کی ہمسائیگی اختیار کریں۔ یہاں رحمت حق کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو روحانی اجر دیا جائے اور ان کی معاد صرف جسمانی لذائذ میں خلاصہ نہ ہو۔

بالفاظ دیگر عقل وعمل کے لحاظ سے کامل افراد نے اپنی روح میں روحانی حیات کامل کو ذخیرہ کر لیا ہے اور اس دنیا میں مادہ کے ساتھ شدید ارتباط کی وجہ سے وہ روحانی حیات ظہور نہیں کر پاتی لیکن قیامت کے دن جب تمام حجاب اٹھ جائیں گے تو کامل لوگوں کی روحانی حیات بتدریج ان کے وجود میں ظاہر ہونا شروع ہو جائے گی یعنی قرب حق، لقائے الٰہی اور نورانی موجودات کے ساتھ وابستگی شروع ہو جائے گی اور اس قسم کے کمالات جو انسان کو آخرت میں حاصل ہوتے ہیں ان کا بیج اس دنیا میں علم وعمل کے ذریعے بویا جاتا ہے یعنی اس دنیا میں معارف واعمال بیج ہیں جن کا نتیجہ اگلے جہان میں مشاہدہ ولقا کی صورت میں ظاہر ہوگا''۔ [1]

بہر حال سعادت کے لحاظ سے صرف معاد جسمانی پر اکتفا کامل نفوس کے حق میں ایک قسم کی جفا ہے کیونکہ وہ زیادہ فیض کے خواہاں تھے اور کمال کے لیے زیادہ لیاقت رکھتے تھے۔ [2]

حکما کی معاد روحانی ہمہ گیر نہیں

وہ نکتہ جس کا یہاں پر بیان ضروری ہے وہ یہ ہے کہ معاد روحانی کو حکما بھی قبول کرتے ہیں اور قرآن کریم نے بھی اسے قبول کیا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ قرآن کی معاد روحانی عمومی ہے اور ہمہ گیر ہے جبکہ جس معاد روحانی کو حکما قبول کرتے ہیں وہ صرف ایک گروہ کے لیے ہو گی یعنی جو لوگ علم وعمل کے لحاظ سے کامل ہوں گے ان کے لیے ہوگی اور وہ لوگ جو نیک تو تھے لیکن معرفت کے لحاظ سے کمال کے درجہ تک نہ پہنچ سکے ہوں اگرچہ وہ اہل سعادت اخروی تو ہوں گے لیکن معاد روحانی یعنی کچھ عقلانی لذات سے مستفید ہونے سے محروم رہیں گے۔

لہٰذا یہاں پر ضروری ہے کہ مختصر طور پر حکما کا نظریہ آلام ولذات عقلانی کے بارے میں بیان کیا جائے کیونکہ یہی چیز معاد روحانی کی بنیاد ہے۔

---

[1] المعرفۃ بذر المشاہدہ

[2] حکیم سبزواری اسی پر ایک عقلی دلیل بھی ذکر کرتے ہیں مراجعہ کریں شرح منظومہ بحث معاد فریدہ دوم۔

ا۔حکما اور ماہیت لذت

حکما کے نزدیک لذت نام ہے ایسی چیز کے ادراک کا جو ادراک کرنے والے قوی اور حواس سے مناسبت رکھتی ہو جیسا کہ شیرینی کی لذت جو قوہ ذائقہ کو حاصل ہوتی ہے۔ایسی صورت میں نفس ناطقہ اور اس کے تعقل کے لیے مناسب و ہم آہنگ معقولات و کلی حقائق کا ادراک ہے اس طرح سے کہ یہ خالق جہان کو اس کی صفات جمال وجلال کے ساتھ پہچان لے۔اس کے بعد بالترتیب عقول و نفوس مجردہ تا اجرام سماوی و موجودات عنصری و مادی سب موجودات کے مبدائے خلقت سے صدور کا طریقہ سمجھ لے اور موجودات کی علمی صورتیں بطور کلی اس کے نفس میں نقش ہو جائیں۔[1]

گویا لذت کی ماہیت مقولہ ادراک سے تعلق رکھتی ہے اور دو چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ایک جس کا ادراک کیا جا رہا ہے دوسرے ادراک کرنے والے قوی و حواس۔

۲۔عقلانی لذات کی حسی لذات پر برتری

حکما کی نظر میں عقلانی لذتیں حسی لذتوں پر اس طرح برتری رکھتی ہیں کہ ان کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہیں اور برتری کا معیار دو چیزیں ہیں۔

ا۔ ادراک کرنے والے کی برتری

۲۔ ادراک ہونے والے کی برتری

صدر المتالہین اس بارے میں کہتے ہیں:

''ہستی کا ادراک جو لذت وسرور کا باعث ہے،مختلف ہوتا ہے،کبھی حسی ہے اور کبھی عقلانی۔بنابریں اس ادراک کی وجہ سے جو لذات وسعادات حاصل ہوں گی وہ بھی متفاوت ہوں گی''

نیز وہ کہتے ہیں:

''عقلانی ادراکات قوائے غیر مادی سے مربوط ہیں اور حسی ادراکات مادی قوی کا فعل ہیں اور چونکہ مجرد ہستی مادی ہستی پر برتری رکھتی ہے لہٰذا عقلانی ادراکات بھی حسی ادراکات سے برتر ہوں گے اور چونکہ کامل ترین ہستی واجب الوجود ہے کامل ترین سعادت ولذت بھی وجود خدا کا ادراک ہوگا۔یہ لذت بھی ایسے ہی ہے جیسے خود خدا اپنے ذات کے ادراک سے سرور ولذت پاتا ہے یا یہ لذت ان لذات جیسی ہے جو فرشتوں اور خدا کے مقربین کو اپنی ذات اور خدا کی ذات کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے اور واضح ہے کہ اس جیسی لذت حسی لذتوں سے

---

[1] شرح ہدایہ اثیری، ص ۳۳۸

بالکل قابل قیاس نہیں ہے کیونکہ حسی لذات قوائے شہو یہ وغیر ہ سے حاصل ہوتی ہیں"۔

۳۔عقلانی لذات کا دنیا میں کامل ادراک ممکن نہیں

حکما معتقد ہیں کہ اس قسم کی عقلانی لذتیں دنیا میں بطور کامل قابل ادراک نہیں ہیں لیکن آخرت میں کچھ لوگوں کے لیے (جن کا بیان آئے گا) حاصل ہوں گی۔

دنیا میں ان لذات کے کامل ادراک نہ کر سکنے کی وجہ روح کا مادی بدن کے ساتھ تعلق و وابستگی ہے جتنا مادہ کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا حضور و شہود کم تر ہوگا حتیٰ کہ انسان کا اپنی ذات کا ادراک حضوری بھی جیسے آخرت میں ہوگا اس طرح دنیا میں نہیں ہوگا۔

لہٰذا کامل ادراک جو عقلانی لذات کا سبب ہے بطور کامل اس دنیا میں متحقق نہیں ہوسکتا کیونکہ روح کا بدن کے ساتھ تعلق ہے بالخصوص وہ لوگ جو اپنے جسم مادی اور اس کے لائق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اپنی ذات کی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔[1]

آخرت میں ادراک بھی بطور کامل حاصل ہوگا اور اس سے حاصل شدہ لذتیں بھی کیونکہ وہاں کوئی مانع موجود نہیں ہے۔انسان کے حقائق کلی اور عقلانی موجودات کے ساتھ ارتباط سے دو چیزیں مانع ہوسکتی ہیں۔

۱۔ جہل و ناآگاہی

۲۔ توجہ و تعلق بدن کے ساتھ

چونکہ ہم ان لوگوں کی بات کر رہے ہیں جو دنیا میں حقائق کلیہ و عقلیہ کے بارے میں کامل معرفت رکھتے ہیں لہٰذا پہلا مانع تو ختم ہو گیا اور دوسرا مانع موت کی وجہ سے اٹھ جاتا ہے۔

اشکال

ممکن ہے کہا جائے کہ روح آخرت میں بھی بدن سے متعلق ہوگی چونکہ فرض یہ ہے کہ معاد آخرت میں روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی لہٰذا اگر روح کا بدن کے ساتھ تعلق کامل عقلی موجودات کے ادراک سے مانع ہوسکتا ہے تو آخرت میں بھی یہ مسئلہ موجود ہوگا۔

جواب

اس اشکال کے جواب میں ہم تین مطالب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ اگرچہ اخروی بدن عنصری و جسمانی ہے (نہ کہ مثالی برزخی جیسا کہ خواب کی صورتیں ہوتی ہیں) لیکن اس کے باوجود اخروی بدن دنیوی بدن کی نسبت کامل تر اور لطیف تر ہوگا اور کوئی بعید نہیں کہ روح کا اس بدن سے ارتباط عقلانی عوالم کے ادراک سے مانع نہ ہو سکے۔

---

[1] نسوا اللہ فانسهم انفسهم (حشر: ۱۹)

۲۔ روح کا اس بدن سے تعلق روح کے دنیوی بدن سے تعلق سے مختلف ہے چونکہ روح دنیا میں بدن کی مدبر ہے اور اس کے لیے وجہ حیات ہے یعنی انسان اپنے اعضاو فعل و انفعالات کے ذریعے اپنی زندگی کو باقی رکھتا ہے حالانکہ روح کا آخرت میں بدن کے ساتھ تعلق اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف جسمانی ثواب وعذاب پانے کی خاطر ہے۔

۳۔ ممکن ہے کہ بشری قوی بدن سے جدائی کے بعد آخرت میں زیادہ قوی اور طاقت ور ہو جائیں اور بدن کی طرف لوٹنے کے بعد عقلانی امور کا ان کے لیے ادراک آسان ہو جائے۔ اس مورد میں فقیہہ و نامدار متکلم فاضل مقداد سیوری کا ایک کلام نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''دنیا میں عقلانی لذتوں کا مکمل طور پر ادراک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگرچہ بشری نفوس مادہ سے مجرد ہیں لیکن اس دنیا میں ضعیف اور ناتواں ہیں جو موت کے وقت بدن سے جدائی کے بعد عالم قدس سے فیض حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے قوی اور پُر تجلی ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً آخرت میں بدن کی طرف لوٹنے کے بعد بعید نہیں ہے کہ ہر دو قسم کی سعادت (عقلی وحسی) بطور کامل حاصل کر لیں اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سعادت کا یہ مرتبہ بلند ترین مرتبہ ہے''[1]

۴۔ عقلانی لذتیں حاصل کرنے کی شرط

اس سوال کا جواب بطور اجمال سابقہ بحثوں سے معلوم تو ہو چکا ہوگا کیونکہ عقلانی لذتیں انسان کے عقلانی ادراکات کا نتیجہ ہیں تو گویا عقلانی لذتوں کو پانے کی شرط دنیا میں عقلانی ادراک میں کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکماء میں مشہور ہے:

المعرفة بزرا المشاهدة

معرفت نورانی موجودات کے مشاہدہ کے لیے بیج کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اس دنیا میں حقائق اور عقلی موجودات کی شناخت آخرت میں ان کے ساتھ ملحق ہونے کا مقدمہ ہے اور یہ سوال کہ ادراک عقلانی کا وہ کون سا کمترین مرتبہ ہے جس کے ذریعے انسان آخرت میں عقلانی لذتوں سے بہرہ مند ہو سکے؟ اس کے جواب میں صدرالمتالہین کی ایک مفصل گفتگو ہے ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ وجود خدا اور اس کی صفات جلال و جمال کو پہچان۔ جیسے خدا کا علم فعلی وازلی، اس کی وسیع قدرت، خلقت میں عنایت اور خدا کی وسیع رحمت وجود جو سب کی سب صفات حقیقی ہیں اور عین ذات ہیں۔ نیز اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صفات غیر حقیقی (اضافی) جیسے خالقیت، رازقیت وغیرہ جیسی سب صفات خدا کی خالقیت کی طرف لوٹتی ہیں۔

۲۔ عقول جو خدا کے کلمات تامہ اور اس کے فرشتگان علمی ہیں۔

۳۔ نفوس کلیہ جو کتب الٰہیہ اور اس کے عملی فرشتے ہیں ان کی شناخت

---

[1] اللوامع الالٰہیہ، ص ۳۷۸

۴۔ مبدائے خلقت سے ہستی کے صدور کی کیفیت اور موجودات کا قول نزولی وصعودی میں مبدائے خلقت کے ساتھ ارتباط کی معرفت۔ جب انسان دنیا میں اس درجہ پر پہنچ جائے تو اس نے ایک بہت بڑی خیر حاصل کر لی ہے اور سعادت کا بہت بڑا مرتبہ اسے ملے گا۔

البتہ معرفت کا یہ درجہ عقلانی سعادت کو پانے کا پہلا زینہ ہے جتنا کم وکیف کے لحاظ سے اس مقدار میں اضافہ ہوتا جائے گا اس کی عقلانی سعادت کامل تر ہوتی جائے گی۔

۵۔ عملی ادراکات کا عقلانی سعادتوں میں عمل دخل

نفس انسانی کی حقیقت دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے وہ اپنے سے برتر حقائق کے ساتھ ارتباط پیدا کرتا ہے (حقائق برتر جیسے عالم ربوبی وعالم عقول) اور دوسرے پہلو سے وہ اپنے سے پست حقائق کے ساتھ ارتباط پیدا کرتا ہے (حقائق پست تر جیسے بدن وقویٰ) اسی لحاظ سے انسان کے ادراکات بھی دو قسم کے ہیں:

۱۔ ادراکات علمی ونظری

۲۔ ادراکات عملی

حکماء کی نظر میں عقلانی سعادت میں صرف انسان کے علمی ونظری ادراکات دخالت رکھتے ہیں عملی ادراکات نیز اچھے کام اور گناہوں سے اجتناب عقلانی سعادت میں کوئی دخالت نہیں رکھتے۔ یہ صرف ہے کہ نفس انسانی کو آلودگی، شہوات اور بدی میں غرق ہونے سے روکتے ہیں البتہ ایسے زاہد و پارسا لوگوں کے لیے جو علمی معرفت میں کامل نہیں ہوتے ایک اور طرح کی سعادت ولذت ہوگی جو ان کے مناسب حال ہوگی۔

۶۔ عقلانی لذات کے مراتب

سابقہ مطالب کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو عقلانی لذتیں حاصل ہوں گی وہ سب ایک مرتبہ میں نہیں ہوگی بلکہ مراتب مختلف ہوں گے۔ اس بارے میں حکیم ہادی سبزواری کا کلام بہت جامع ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

لوگ عملی اور علمی مراتب کے لحاظ سے سات قسم کے ہیں:

۱۔ علم وعمل میں کامل لوگ

۲۔ علم میں کامل عمل میں متوسط

۳۔ علم میں کامل عمل میں ناقص

۴۔ عمل میں کامل علم میں متوسط

۵۔ عمل میں کامل علم میں ناقص

۶۔ ہر دو میں متوسط

۷۔ ہر دو میں ناقص

ان سات اقسام میں سے صرف پہلی تین قسم کے لوگ عقلانی لذتوں سے بہرہ ور ہوں گے البتہ با تفاوت مراتب کیونکہ پہلی قسم کے لوگ مرنے کے بعد فوراً عالم عقول کی طرف ترقی کر جائیں گے جبکہ دوسری اور تیسری قسم والے لوگ عالم مثال میں توقف اور کچھ مراحل طے کرنے کے بعد عالم عقول کے ساتھ ملحق ہوں گے۔ [۱]

۷۔ عقلانی شقاوتیں

اخروی شقاوتیں درج دو عوامل میں سے کسی ایک کا نتیجہ ہوں گی:

۱۔ گناہ جو بدن و قوائے بدنی سے صادر ہوتے ہیں

۲۔ نفسانی پست ملکات مثل حسادت ریا، حق کے ساتھ عناد اور علمی حقائق کا انکار

ان میں سے پہلی قسم کی شقاوتیں جسمانی ہوں گی جو جسمانی و حسی نعمات کے مقابلے میں ہیں۔

دوسری قسم کی شقاوتیں غیر جسمانی ہوں گی جو روحانی و عقلانی سعادتوں کے مقابل ہیں۔

یہ عقلانی شقاوتیں ان لوگوں سے مربوط ہوں گی جو اس دنیا میں عقلانی معرفتوں کی نسبت فطری اشتیاق و استداد کے باوجود ان کے حصول میں سستی و غفلت کرتے رہے، عقل بالفعل اور عقل مستفاد کے مرتبے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ غلط تصورات و اعتقادات کی وجہ سے اخروی ذاب و شقاوت میں گرفتار ہو گئے۔

یہ عقلانی شقاوتیں ابدی اور ناقابل زوال ہوں گی۔ اگرچہ ممکن ہے کچھ مدت کے بعد جسمانی عذاب کا سلسلہ ختم ہو جائے لیکن جنہیں عقلانی عذاب ہو گا وہ اس میں ہمیشہ مبتلا رہیں گے۔

یہ تھا خلاصہ اس گفتگو کا جو اسلامی حکما نے معاد روحانی و لذائذ عقلانی کے بارے میں کی ہے۔ [۲]

---

[۱] اسرار الحکم، ص ۳۱۱۔ شرح منظومہ بحث معاد فریدہ ۱:

[۲] اگر کوئی مزید تفصیل دیکھنا چاہے تو وہ مفصل کتب کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ جیسے اسفار ج ۹، ص ۱۲۱۔ ۱۴۰۔ شرح منظومہ و اسرار الحکم، گوہر مراد، الٰہیات شفاء مبدء و معاد ملا صدرا و ابن سینا اور دیگر فلاسفہ کی کتب۔

۱۳۔ تناسخ و معاد

کلمہ تناسخ ''نسخ'' سے لیا گیا ہے اور اس کے بارے میں اہل لغت کی عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو خصوصیتوں کے بارے میں بولا جاتا ہے:

۱۔ تحول و انتقال

۲۔ دو حادثوں کے پے در پے ہونا جن میں سے ایک دوسرے کا جانشین ہو۔[1]

شریعت میں جب ایک حکم کسی دوسرے کے ذریعے برطرف ہو جائے تو اس کے لیے لفظ نسخ استعمال کرتے ہیں اور اس میں معنی نسخ کی دونوں خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں لیکن جب یہی لفظ علم کلام میں استعمال ہو مثلاً کلمہ تناسخ تو وہاں صرف پہلی خصوصیت پر اکتفا ہوتا ہے دوسری خصوصیت مورد نظر نہیں ہوتی مثلاً کہیں گے کہ تناسخ یہ ہے کہ روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہو جائے۔ یہاں تحول و انتقال تو ہے لیکن جانشینی موجود نہیں۔ بہر حال ضروری ہے کہ ہم تحول و انتقال کی الواع کی طرف اشارہ کریں۔

۱۔ انسان کی روح کا اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال۔

۲۔ روح کا حرکت جوہری کے زیر سایہ مرتبہ قوہ سے مرتبہ کمال کی طرف انتقال۔ جیسے بچے میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی روح کمالات کے لحاظ سے صرف قوۃ ہے تدریجاً کمال تک پہنچتی ہے۔

۳۔ روح کا مرنے کے بعد کسی دوسرے جسم میں منتقل ہونا۔ جیسے نباتی خلیہ، حیوانی نطفہ یا انسانی جنین۔ بعبارت دیگر جب انسان مر جاتا ہے اس کی روح آخرت کی طرف انتقال کے بجائے دوبارہ اسی دنیا کی طرف لوٹ آتی ہے اور اس رجوع میں روح کو اپنے لیے بدن کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے مادی زندگی گزار سکے۔ یہ بدن جسے ہم جسم کہتے ہیں کبھی تو نبات کی صورت میں ہوگا، کبھی حیوان اور کبھی انسان اور یہ روح کا تکامل کے بعد تنزل ہے کہ وہ نبات یا حیوان یا انسانی جنین کے ساتھ ملحق ہو جاتی ہے اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرتی ہے اور فارسی کی معروف مثل ''روز نو و روزی از نو'' مجسم ہو جاتی ہے۔ یہ وہی تناسخ ہے جس کا ذکر اسلامی فلسفہ اور پہلے یونانی فلسفہ بلکہ انسان کی فکری محفلوں میں ہوتا رہا ہے اور اکثر وہ لوگ جو معاد کے بارے میں صحیح تحلیل نہیں کر سکتے تھے اسی نظریے کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ گویا تناسخ معاد کی خصوصیات کی تلافی کرتا ہے اور انسان کا دنیا کی طرف رجوع اور مادی بدن سے تعلق یا جزا پانے کے لیے ہے یا سزا پانے کے لیے مثلاً جو لوگ پہلی زندگی میں صحیح اور پاکدامن تھے وہ دنیا کی طرف لوٹیں گے اور خوشحال و بہترین زندگی (عنوان جزاء) گزاریں گے۔ اور جو لوگ پہلی زندگی

---

[1] لغت کی کتاب اقرب الموارد میں لکھتے ہیں النسخ فی الاصل النقل راغب مفردات میں کہتے ہیں النسخ ازالة شيءٍ یتعاقبه کنسخ الشمس الظل والظل الشمس والشیب الشباب نسخ یعنی ایک شے کا دوسری شے کے تعاقب میں آ کر اسے مٹا دینا ہے جیسے سورج سائے کو۔ سایہ دھوپ کو اور بڑھاپا جوانی کو مٹا دیتا ہے۔

میں ظالم وستم گر تھے وہ سزا کے طور پر پست زندگی کی طرف لوٹیں گے۔

اگر کہو کہ آج اگر کسی کو اچھی زندگی گزارتے ہوئے اور دوسروں کو بھوکا ننگا دیکھتے ہیں تو یہ خود ان کے اپنے سابقہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس میں فرد یا معاشرہ کا کیا قصور ہے؟

اس کے باوجود کہ ہم فلسفی وکلامی بحثوں کو مخلوط نہیں کرنا چاہتے ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ ایسی صورت میں یہ عقیدہ تناسخ عالمی لیٹروں کے لیے ایک بہترین دلیل ہوگا کہ جو اپنی عزت ورفاہ کو اپنی سابقہ پارسائی کا نتیجہ اور غریبوں کی بدبختی کو ان کی سابقہ زندگی کی غلط کاریوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ عوام کو جو ہمیشہ ان کے خلاف انقلاب وسرکشی پر پُر جوش وکمر بستہ رہتے ہیں خاموش کرتے رہتے ہیں۔ اگر مارکسزم دین کو لوگوں کے لیے افیون کہتا ہے تو انہی عقائد کو افیون جاننا چاہیے اور انہی عقائد کو ظالمین و مستکبرین کا ہتھیار شمار کرنا چاہیے، نہ کہ ان خرافات سے پاک مقدس شریعتوں کو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تناسخ کے عقیدہ نے ہندوستان جیسی سر زمینوں پر پرورش پائی جن میں طبقاتی نظام کا تفاوت ہمیشہ سے حکم فرما رہا ہے۔ بطور مسلم دولت وطاقت کے زور پر ظالم لوگ بھوکی ننگی قوموں کے غم وغصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے اعمال کی توجیہ انہی جیسے عقائد کے ذریعے کر سکتے تھے۔ اپنے عیش اور ہمسائے کی بدبختی کی توجیہ اسی طرح سے کر سکتے تھے تاکہ مظلوم وستم رسیدہ انقلاب کی سوچنے کے بجائے اپنی پہلی زندگی پر افسوس کرتا رہے کہ کاش میں اپنی پہلی زندگی میں یہ یا وہ نہ کرتا اور اب اس مصیبت میں نہ پڑتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اب اچھی حالت میں ہیں اپنی پہلی زندگی کی نیکیوں کا پھل کھا رہے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی پر ظلم کریں۔

یہ اصول بالکل ظالم وجابر لوگوں کی خاطر ہی گھڑا گیا تھا اور اس نے ہندوستان کی سرزمین پر پرورش پائی۔ بہر حال یہاں ہم اپنی فلسفی بحث کو جاری رکھتے ہوئے تناسخ کی اقسام بیان کرتے ہیں۔ اصولی طور پر تناسخ کے قائلین کی طرف سے تین نظریے پیش کیے جاتے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ لامحدود تناسخ

۲۔ محدود تناسخ نزولی صورت میں

۳۔ محدود تناسخ صعودی صورت میں

عقیدہ معاد کے ساتھ تصادم کے حوالے سے یہ تینوں نظریے یکساں نہیں ہیں۔[1] کیونکہ پہلی قسم فلسفی بحثوں کے لحاظ سے باطل ہے اور عقیدہ معاد سے کاملاً متضاد ہے اور تیسری قسم صرف ایک فلسفی نظریہ کی بنا پر نا درست ہے ورنہ اس کا عقیدہ، عقیدہ معاد کے منافی نہیں ہے اسی طرح دوسری قسم بھی عقیدہ معاد کی تمام جہت سے مخالف نہیں ہے لیکن چونکہ تینوں قسمیں اس بات میں شریک ہیں کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف منتقل ہوگی، اس وجہ سے تیسری قسم کو بھی تناسخ کی اقسام میں سے شمار کریں گے۔ اب ہم ان تینوں اقسام کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ مطلق یا لامحدود تناسخ

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگوں کی روحیں ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس انتقال کے لیے نہ افراد کے لحاظ سے کوئی محدودیت ہے اور نہ ہی زبان کے لحاظ سے۔ یہ انتقال ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور اگر معاد نام کی کوئی چیز ہے تو یہی دنیا کی طرف رجوع کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ چونکہ یہ رجوع و انتقال افراد و زمان کے لحاظ سے لامحدود ہے لہٰذا اسے لامحدود یا مطلق تناسخ کہا گیا ہے۔ قطب الدین شیرازی اس قسم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کچھ لوگ جو فلسفے سے آگاہی میں نچلے درجے پر ہیں اس قسم کے تناسخ کے معتقد ہیں یعنی ہمیشہ ارواح موت کے ذریعے مختلف بدنوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی رہتی ہیں اور ایک بدن کی نابودی روح کے اس جہان کی طرف رجوع سے مانع نہیں بن سکتی۔[2]

۲۔ تناسخ محدود نزولی شکل میں

اس قسم کے تناسخ کے قائل اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو لوگ علم و عمل اور حکمت عملی و نظری کے لحاظ سے درجہ کمال پر فائز ہیں موت کے وقت دوبارہ اس جہان کی طرف نہیں لوٹتے بلکہ مجردات و مفارقات (مادہ و آثار مادہ سے مفارق) کے ساتھ ملحق ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے کمال سے اس جہان کی طرف رجوع کے لیے کوئی سبب موجود نہیں ہے۔

---

[1] محقق لاھیجی اس بارے میں فرماتے ہیں مشائی حکماء میں سے کوئی بھی تناسخ کا قائل نہیں اور قدیم اسلامی مشائیوں میں تناسخ کا سخت مخالف ارسطا طالیس اور اس کے پیرو تھے۔ تناسخ کے وقوع کے قائل ہند، چین اور بابل کے حکما اور شیخ اشراق کے گمان کے مطابق قدیم یونانی حکما اور مصر و فارس کے حکما سب صرف نفوس اشقیا میں تناسخ کے قائل تھے۔ سب اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ بالآخر ارواح عنصری اجسام سے چھٹکارا پا کر عالم افلاک یا عالم مثال سے متصل ہو جائیں گی اور ان کے نزدیک اجسام عنصری میں ارواح کا رہنا نفوس شریرہ کے لیے عذاب جہنم ہے۔ یہ ہے تناسخ جسکے قائل منسوبین بہ حکمت بھی ہیں اور تناسخ دائمی یعنی ارواح کا ہمیشہ ابدان عنصریہ میں تردد اس کی قائل ایک جماعت ہے جو حشر و نشر ثواب و عقاب اور توحید کی منکر ہے۔ (گوہر مراد مقالہ ۳، صاب ۴، فصل ۷، ص ۲۷۴)

[2] شرح حکمۃ الاشراق ص ۴۷۶

لیکن وہ لوگ جو حکمت عملی ونظری کے لحاظ سے کمال پر نہیں پہنچے اور ان کا نفس معقولات کا آئینہ نہیں بن سکا اور نفس کو رذائل سے پاک کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکے وہ حکمت عملی ونظری کی تکمیل کی خاطر دوبارہ اس دنیا میں لوٹیں گے یہاں تک کہ دونوں پہلو مکمل ہو جائیں گے جب تکمیل ہوگئی تو عالم نور کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔تناسخ کی اس قسم میں دو قسم کی محدودیت پائی جاتی ہے۔ایک تو افراد کے لحاظ سے ہے کیونکہ یہ تناسخ تمام افراد کے لیے نہیں ہے۔بلکہ کامل افراد مرنے کے بعد دنیا کے بجائے عالم نور وابدیت کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے اور دوسری محدودیت زمان کے لحاظ سے ہے یعنی جن لوگوں کو تکمیل کی خاطر اس جہان کی طرف لوٹایا جائے گا وہ ہمیشہ اس طرح نہیں لوٹائے جائیں گے بلکہ جس دن ان کی علمی وعملی کمی پوری ہوگئی کامل انسانوں کی طرح دنیا سے نکل کر عالم نور کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔

۳۔صعودی تناسخ

یہ نظریہ دو بنیادوں پر استوار ہے۔

۱۔ تمام اجسان میں سے نبات واحد جسم ہے جو فیض (حیات) پانے کے لیے بشری استعداد رکھتی ہے۔

۲۔ انسانی مزاج برتر حیات پانے کے لیے نبات سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے یعنی وہ ایسی حیات پانے کے اہل ہے جو حیوانی ونباتی مراحل گزار چکی ہو۔

انہی دو اصولوں کی وجہ سے (نبات میں زیادہ استعداد کا ہونا اور انسان میں زیادہ اہلیت کا ہونا) فیض الٰہی جو حیات وروح ہے پہلے نبات کے متعلق ہوتی ہے اور اپنی تکاملی سیر اور سفر کمالی کے بعد حیوان کے نزدیک ترین مرتبہ نخل (کھجور) میں ظاہر ہوتی ہے۔اس کے بعد حیوانات کے عالم میں قدر رکھتی ہے تکامل کے بعد اور مرتبہ میمون (بندر) پر پہنچنے کے بعد ایک چھلانگ میں انسان کے متعلق ہو جاتی ہے اور اپنی تکاملی حرکت جاری رکھتی ہے یہاں تک کہ مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے (اسرار الحکم، ص ۲۹۳، ۲۹۴)

اب جبکہ آپ نے تناسخ کی اقسام کو مکمل طور پر جان لیا اب ان پر نقد وتحلیل کی خاطر ہم چند مطالب ذکر کرتے ہیں:

۱۔تناسخ ومعاد

تناسخ کی تینوں قسموں میں غور وفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تناسخ مطلق کا قائل ہونا صدر در صد معاد کے نظریے کے مدمقابل ہے اور جو لوگ تناسخ لامحدود کے قائل ہیں وہ کسی مورد میں معاد کے قائل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس نظریے کے مطابق انسان ہمیشہ اس دنیا کی طرف لوٹتا رہے گا اور جس نقطے سے شروع کرے گا اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

جبکہ تناسخ نزولی میں نہ تو تناسخ سب کے لیے ہے اور نہ ہی ہمیشگی ہے اور کاملین ابتدا سے معاد رکھتے ہوں گے یعنی ان کی موت سبب بن جائے گی کہ ان کی ارواح عالم نور کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔البتہ غیر کامل افراد کے لیے ایک مدت تک معاد نہیں ہوگی۔وہ موت کے بعد دوبارہ اس جہان کی طرف لوٹیں گے جب علم وعمل کے لحاظ سے مکمل ہو جائیں گے وہ بھی کاملین کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے اور ان کی

قیامت بھی برپا ہو جائے گا۔

تیسرا نظریہ (صعودی تناسخ) تو معاد کے ساتھ معمولی سا تضاد بھی نہیں رکھتا بلکہ اس کی خطا و غلطی راہ تکامل کے بیان کرنے میں ہے کہ اسے اس نے جداگانہ طور پر بیان کیا ہے اور روح کو پہلے عالم نبات میں محبوس کیا پھر حیوانات میں منتقل کیا اور مراحل طے کرنے کے بعد انسانی بدن کے متعلق کیا۔ اس نظریہ میں روح کی مثال اس پرندے کی سی ہے جو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے کی طرف اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا ہو اور ان مراتب کے درمیان بالکل ربط موجود نہیں ہے روح ہر دور میں اپنے لیے ایک بدن رکھتی ہے یہاں تک کہ آخری بدن پر پہنچ جائے اور موت کے بعد عالم آخرت کے ساتھ ملحق ہو جائے۔

اگر اس نظریے کا قائل ان مراتب کو متصل و مربوط سمجھتا تو یہ حرکت جوہری والے نظریے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ تھا یا آپ یوں کہہ لیں کہ اس نظریے میں حرکت جوہری متصل طریقے سے منعکس ہوئی ہے حالانکہ اگر انفصال کی قید ہٹا کر یوں کہتے کہ انسان نطفہ جنین سے کامل انسان ہونے تک نباتی وحیوانی مراحل طے کرتے ہوئے مرتبہ انسانی تک پہنچتا ہے بغیر اس کے کہ روح کے لیے مختلف متعلقات و موضوعات ہوں، تو یہی حرکت جوہری کہلاتی۔

بہرحال یہ نظریہ اگرچہ نظریہ معاد کے ساتھ تصادم نہیں رکھتا لیکن فلسفی برہان کے لحاظ سے ردشدہ و نا قابل قبول ہے۔

۲۔ تناسخ مطلق اور عنایت الٰہی

اس بارے میں ہم دو مطلب ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اگر ارواح ہمیشہ اس طرح کے تناسخ کو طے کرتی رہیں تو پھر تحقق معاد کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی حالانکہ فلسفی دلائل کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ معاد ایک حتمی وضروری امر ہے اور شاید اس نظریہ کے قائلین کو معاد کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکی اس وجہ سے تناسخ کو معاد کا قائم مقام سمجھنے لگے حالانکہ مذکورہ چھ دلائل نے ثابت کر دیا کہ صرف یہ لوٹنا (جزا و سزا پانے کے لیے) معاد کی غایت نہیں ہے کیونکہ معاد صرف جزا و سزا کے لیے نہیں ہے تاکہ ہم تناسخ کو جو پہلی زندگی کے مناسب ہو عدل الٰہی کے پورا کرنے کا ذریعہ سمجھ لیں بلکہ ضرورت معاد کی متعدد دلیلیں ہیں اور متعدد وجوہ جن کا حصول معاد اخروی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس نظریے میں قدرت خدا کو محدود کر دیا گیا ہے کہ جو انسان پہلے خلق کر دیئے گئے اب ہمیشہ کے لیے وہی مورد تحول و تغیر رہیں گے اور کوئی انسان خلق نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ جو روح ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف منتقل ہوتی ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا مادہ میں چھپا نقش شدہ موجود ہے یا جسم و جسمانیات سے مجرد ہے۔

پہلے فرض میں روح انسانی عرضی حالت یا مادہ میں منطبع یا منقوش صورتیں خود اخذ کر لیتی ہے جن کا ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف انتقال محال ہے کیونکہ عرض و منطبع صورت کی حقیقت ہی قیام بالغیر ہے اور انتقال کی صورت میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ نفس منطبع انتقال کی

حالت میں جو تیسری حالت ہے موضوع کے بغیر ہو اور مستقل ہو۔

بالفاظ دیگر جو روح پہلے بدن میں منطبع ہے وہ ایک موضوع رکھتی ہے اور انتقال کے بعد بھی اسی طرح ہے بات تیسری حالت (انتقال) کی ہے کہ اس نظریے کے مطابق اس حالت میں روح متصل طور پر موضوع کے بغیر موجود ہے جو ناممکن ہے اور درحقیقت اس قسم کے استقلال کا قائل دو نقیض کے درمیان جمع کرتا ہے کیونکہ اس صورت کی واقعیت قیام بالغیر ہے اور اگر وہ اسی واقعیت کے ساتھ مستقل (بغیر کسی موضوع کے) وجود رکھتی ہو تو آن واحد میں نقیضین کا جمع لازم آئے گا۔

دوسرے فرض جس میں روح مستتبع تجرد کی حامل ہے اور ہمیشہ مادہ کے متعلق ہوتی رہتی ہے، کا لازمہ یہ ہے کہ وہ موجود جو تکامل و بلندی کی لیاقت رکھتا ہے کبھی اپنے مطلوب تک نہ پہنچے اور ہمیشہ ایک محدود حد میں رہے کیونکہ مادہ سے مسلسل تعلق محدودیت کا موجب ہے کیونکہ یہ روح جو مادہ کے متعلق ہے ذات کے لحاظ سے مجرد ہے اور فعل کے لحاظ سے ہمیشہ مادہ کے ساتھ قائم اور یہ خود ایک قسم کی نفس کے لیے درجات بالا کی طرف جانے میں رکاوٹ ہے حالانکہ عنایت الٰہی یہ ہے کہ ہر موجود مطلوب کمال تک پہنچ جائے۔

کمال ممکن سے مراد علمی و عملی کمال ہے اور اگر انسان ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف منتقل ہوتا رہے تو کبھی بھی عمل و علم کے لحاظ سے حقائق کے نفس پر انعکاس اور نفس کی رذائل سے پاک ہونے کے لحاظ سے حد کمال تک نہیں پہنچ پائے گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ روح اس جہان میں چار عقلی مراتب تک پہنچ جائے جو عقل ہیولانی، عقل بالملکہ، عقل بالفعل اور عقل مستفاد سے عبارت ہیں۔ لیکن اگر نفس کامل تجرد پیدا کر لیتا اور بدن سے بے نیاز ہو جاتا تو معرفت و ادراک حقائق کے لحاظ سے زیادہ کامل ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ روح کو مادی بدن میں ہمیشہ محبوس رکھنا عنایت الٰہی سے ہم آہنگ و مناسب نہیں ہے (شرح حکمۃ الاشراق ص ۴۷۶، اسفار ج ۹ ص ۷)

یہاں یہ نکتہ بیان کرنا ضروری ہے کہ دوسری شق کا ابطال جیسے اوپر کہا گیا ہے یہ درست نہیں ہے کیونکہ روح کا بدن سے تعلق اسے تحصیل کمال سے نہیں روکتا اور اصولی طور پر اگر روح کا بدن کے ساتھ تعلق حکمت الٰہی کے منافی ہو تو کہنا پڑے گا کہ سب لوگوں کی معاد یا بعض کاملین کی معاد روحانی ہوگی یعنی صرف ان کی روح محشور ہوگی اور بدن محشور نہیں ہوگا حالانکہ قرآنی نصوص سراسر اس کے خلاف ہیں لہٰذا اس وجہ سے دوسری شق کے ابطال کے لیے اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ یہ فرض ان دلائل کے منافی ہے جو معاد کو ضروری امر کے طور پر ثابت کرتے ہیں اور اگر ان ادلہ کو قبول کر لیں تو دوسرے فرض (کہ روح مستنسخہ ہمیشہ اس جہان میں بدن کے متعلق ہوتی رہتی ہے) کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ تناسخ نزولی اور واپس پلٹنا

تناسخ نزولی میں علم و عمل کے لحاظ سے کاملین مادی جہان کی طرف رجوع نہیں کریں گے صرف علم و عمل میں ناقص لوگ دنیوی زندگی کی طرف لوٹیں گے اور وہ بھی انسانی جنین یا نباتی خلیے یا حیوانی نطفے سے متعلق ہو کر۔

اس نظریئے پر تنقید کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ جب روح بدن سے جدا ہوتی ہے تو اس کی واقعیت پر توجہ کی جائے۔ روح انسانی

بدن سے جدائی کے وقت (مثلاً چالیس سالہ شخص کی روح) ایک خاص کمال تک پہنچ چکی ہے اور اس میں کچھ قوتیں فعلیت پہ پہنچ چکی ہیں اور کوئی شخص بھی اس بات کا انکار نہیں کرسکتا ہے کہ چالیس سالہ انسان کی روح دو سالہ بچے کی روح سے قابل قیاس نہیں ہے۔

تناسخ نزولی میں جو چالیس سالہ انسان کی روح موت کے بعد انسانی جنین کے متعلق ہوتی ہے دو حالتوں سے خالی نہیں ہے۔

۱۔ انسانی روح ان کمالات وفعلیات کے ہوتے ہوئے جنین انسانی یا حیوانی یا کسی دوسرے کامل حیوان کے بدن سے متعلق ہوتی ہے۔

۲۔ انسانی روح ان کمالات وفعلیات کے بغیر کسی انسان یا حیوانی جنین سے متعلق ہوتی ہے۔

پہلی صورت تو ذاتاً ممنوع ہے کیونکہ روح اور بدن تکامل میں ہم آہنگی رکھتے ہیں بدن جتنا ترقی کرتا جاتا ہے روح بھی اس کے متوازی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اب یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک روح جو بدن کے ساتھ بالکل ناہم آہنگ ہے اس کی تدبیر کرے۔

بالفاظ دیگر روح کا ایسے بدن کے ساتھ تعلق دوضد میں جمع کا موجب ہوگا کیونکہ اس لحاظ سے کہ پہلے بدن کے ہمراہ تھی تو بہت سے کمالات وفعلیات رکھتی تھی اور اس لحاظ سے جنین کے متعلق ہونا چاہتی ہے چاہیے کہ ان کمالات وفعلیات کی فاقد ہوتو یہ جمع بین ضدین یا جمع بین نقیضین ہے۔

اگر فرض کیا جائے کہ روح کمالات وفعلیات سے عاری ہوکر جنین سے متعلق ہوتی ہے تو یہ ان کا سلب ہوجانا روح کی ذاتی خصوصیت کی وجہ سے ہے یا کسی بیرونی عامل کی وجہ سے ہے۔

پہلی صورت تو ممکن نہیں ہے کیونکہ کمال سے نقص کی طرف حرکت کسی شے کی ذاتی خصوصیت نہیں ہوسکتی اور دوسری صورت عنایت الٰہی کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حکمت الٰہی یہ ہے کہ ہر موجود کو کمال ممکن تک پہنچادے۔

جو کچھ بیان ہو چکا یہ صدرالمتالہین کے کلام کی روشن تصویر ہے''۔ (اسفار جلد ۹، ص ۱۶)

۴۔ صعودی تناسخ

صعودی تناسخ میں انسان کے تکامل کی راہ نبات سے حیوان اور پھر انسان تک پہنچنا ہے اور اس لحاظ سے کہ نبات حیات کو پانے کے لیے انسان سے زیادہ اہلیت رکھتی ہے اور انسان دوسری انواع سے زیادہ اہل ہے تو چاہیے کہ حیات (نباتی روح) نبات سے تعلق برقرار کرے اور معین مدارج طے کرتے ہوئے انسانی بدن تک منتقل ہوجائے۔

اس نظریے کے قائلین سے سوال کیا جائے گا کہ یہ روح (جو نبات سے حیوان کی طرف اور انسان کی طرف منتقل ہوئی) واقعیت کے لحاظ سے کیسی ہے۔ آیا اس کی موقعیت متعلق میں منطبع اور منقش ہونا ہے۔ جیسا کہ پتھر پر تصویر یا کسی موضوع میں عرض نقش ہوجاتا ہے یا یہ روح اپنی ذات میں مجرد موجود ہے اور مادی بدن کی محتاج نہیں ہے اگرچہ فعل وفعالیت میں وسیلے کے طور پر بدن سے استفادہ کرتی ہے۔

پہلی صورت میں تین حالتیں رکھتی ہوگی۔

۱۔ پہلی حالت کی روح پہلے موضوع (بدن) میں منطبع ہو۔

۲۔ بعد والی حالت کہ انتقال کے بعد روح دوسرے بدن میں منطبع ہو جائے۔

۳۔ انتقالی حالت کی پہلے بدن کو چھوڑ چکی ہو اور ابھی تک دوسرے بدن سے متعلق نہ ہوئی ہو۔ اس صورت میں یہ اشکال پیش آئے گی کہ روح تیسری حالت میں اپنی ہستی کو کیسے محفوظ کرے گی جبکہ اس کی واقعیت ہی انطباع در غیر اور حال در محل ہے۔ یعنی اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی دوسری چیز میں نقش ہو اور کسی مقام پر رہے اور فرض یہ ہے کہ اس تیسری حالت میں ابھی تک اس نے کوئی موضوع پیدا نہیں کیا (تو گویا عرض کا بغیر موضوع کے ہونا لازم آئے گا جو محال ہے)

دوسری صورت میں (جب روح ذاتاً مجرد ہو) اشکال دوسری طرح کا ہے اور وہ یہ کہ جو روح حیوان سے متعلق ہے جب حیوان کی حد میں تعین پیدا کر لے تو وہ انسانی بدن سے متعلق نہیں ہو سکتی کیونکہ روح حیوانی اس لحاظ سے حیوانی درجے میں محدود ہو چکی ہے اس کا کمال صرف قوت شہویہ و غصبیہ میں ہے اور اس حد میں روح کے لیے یہ دو قوتیں کمال شمار کی جاتی ہیں اور اگر حیوانی روح اس حد میں ان دو قوتوں سے عاری ہو جائے تو درحقیقت حیوانی روح نہیں ہے وہ اپنے بلندترین کمال سے عاری ہے۔ حالانکہ یہی دو قوتیں نفس انسانی کے لیے نہ صرف یہ کہ کمال نہیں ہیں۔ بلکہ اسے بلند انسانی درجات کی طرف بڑھنے سے مانع بھی ہیں۔ انسانی روح تب تکامل پا سکتی ہے کہ اس نے ان دو قوتوں کو کنٹرول کر لیا ہے۔

اب سوال ہوگا کہ کیسے حیوانی روح انسان کے لیے پایۂ تکامل ہو سکتی ہے حالانکہ دونوں کے متصور کمالات ایک دوسرے سے تباین و تضاد رکھتے ہیں۔ اگر حیوانی روح ان خصوصیات کے ساتھ انسانی بدن سے متعلق ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کے لیے کمال کی موجب نہیں بلکہ اسے انسانی درجے سے بھی نیچے لے آئے گی اور حیوانی حد میں داخل کر دے گی جس میں یہ خصوصیتیں پائی جائیں۔

البتہ اس قسم کے تناسخ کے قائلین نے یہ اشتباہ کیا کہ تکامل کو متصل صورت میں ذکر کرنے کے بجائے انہوں نے اسے بطور متصل بیان کیا اور اس تناسخ اور حرکت جوہری میں فرق یہی ہے کہ تناسخ میں تکامل مختلف موضوعات میں تحقق پذیر ہوتا ہے (نبات، حیوان اور انسان میں) جبکہ حرکت جوہری میں روح کا تکامل متصل اور ایک ہی بدن میں تحقق پاتا ہے۔ بہتر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس تناسخ میں نباتی روح نے تعین پیدا کر لیا ہے اور اس کی خصوصیات کے ساتھ حیوانی بدن سے متعلق ہوتی ہے اور حیوانی روح حیوانی خصوصیات مثلاً شہوت و غصب کے ساتھ انسانی بدن سے متعلق ہوتی ہے اس کے بعد انسان تکامل کی راہ کو طے کرتا ہے۔

لیکن قابل توجہ یہ بات ہے کہ اس قسم کا سفر کمال کا ذریعہ نہیں بن سکتا بلکہ انسان کے لیے موجب انحطاط بھی ہے کیونکہ اگر حیوانی روح شہوت و غضب جیسی صفات سے متصف ہو کر انسان سے متعلق ہوگی تو یقیناً اسے ایک درندے کی صورت میں پیش کرے گی۔ جس کی نظر میں صرف شہوت و جنسیات کے کسی چیز کی اہمیت نہ ہوگی۔ حالانکہ حرکت جوہری میں ایک جماد اپنے تکاملی سفر میں انسان تک پہنچ جاتا ہے لیکن وہ کسی مرتبے میں تعین نہیں پاتا اور نہ ہی ہر مرتبہ کی خصوصیات کا بطور متشخص کسب کرتا ہے۔

یہ وجہ ہے کہ یہ جماد کا سفر باعث کمال ہے جبکہ پہلا سفر باعث جمع بین اضداد اور موجب انحطاط ہے۔ گویا تناسخ کہ یہ قسم اگرچہ معاد کے ساتھ تضاد نہیں رکھتی لیکن فی نفسہ باطل و غلط ہے۔ (اسفار جلد ۹ ص ۲۲۔۲۳)

تناسخ کی جامع تحلیل

یہاں تک تناسخ کی اقسام اور دلائل کے ساتھ ان کے غیر صحیح ہونے سے آشنائی ہو چکی اب نوبت ہے کہ تمام خصوصیات کو مدنظر رکھے بغیر تناسخ کو جامع طور پر مورد بحث قرار دیا جائے۔ اور ہم ابطال تناسخ پر پیش کیے گئے متعدد دلائل میں سے صرف دو دلیلوں کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ دو ارواح کا ایک بدن سے تعلق

تناسخ بطور مطلق کا لازمہ یہ ہے کہ دو روحیں ایک بدن میں جمع ہو جائیں۔ اس برہان کو دو اصول قبول کرتے ہوئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ جسم نباتی ہو حیوانی ہو یا انسانی جب تعلق روح کی لیاقت رکھتا ہو تو مقام بالا سے روح اس سے متعلق ہو جاتی ہے کیونکہ مشیت خدا یہی ہے کہ ہر ممکن کو اس کے کمال مطلوب تک پہنچا دے۔ اس صورت میں نباتی خلیہ روح نباتی کا خواہاں ہے حیوانی نطفہ حیوانی روح کا خواہاں ہے اور انسانی جنین انسانی روح کا طالب ہے اور وہ اس سے قطعی طور پر قائم ہو جاتا ہے۔

۲۔ جب انسان کی موت سے اس کی روح کسی نباتی جسم یا حیوانی جسم یا انسانی جنین سے متعلق ہو جائے تو جس جسم سے متعلق ہو ضروری ہے کہ اس میں ایسا تشخص وحیات ہو جو اس روح کے مناسب ہو۔

ان دو مقدموں کو قبول کر لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بدن سے دو روحیں متعلق ہوں ایک تو خود اس جسم کی اپنی روح کے جو اس کی اہلیت کی وجہ سے خالق کی طرف سے اسے عطا کی جاتی ہے اور دوسری روح مستنسخہ پہلے بدن کی طرف سے۔

جبکہ دو روحوں کا ایک بدن میں اجتماع دو لحاظ سے باطل ہے:

اولاً: خلاف وجدان ہے ابھی تک تاریخ نے کوئی ایسا واقعہ نقل نہیں کیا کہ کسی انسان نے اپنے اندر دو روحوں کا دعویٰ کیا ہو۔

ثانیاً: لازم آئے گا کہ صفات نفس کے لحاظ سے دو وصف مشابہ رکھتا ہو مثلاً جب طلوع شمس سے آگاہ ہو یا کسی کے عشق میں مبتلا ہو تو چاہیے کہ ان حالات کو بطور مکرر اپنے اندر احساس کرے۔ (کشف المراد، ص ۱۱۳)

بالفاظ دیگر دو روحوں کا ایک بدن میں ہونا یہ نتیجہ دیتا ہے کہ ایک انسان دو شخصیتیں دو ذاتیں اور دو تعین رکھتا ہو۔ درحقیقت اس کا لازمہ یہ ہے کہ واحد متکثر ہو جائے اور متکثر واحد۔ کیونکہ خارج میں موجود کلی انسان کا ایک فرد ہے اور وحدت کا لازمہ ایک روح کا ہونا ہے لیکن تناسخ کی بنا پر دو روحیں رکھتا ہو تو طبعی طور پر انسان کلی کے دو فرد ہوں گے اور یہ وہی اشکال ہے کہ ایک کثیر ہو جائے اور کثیر ایک ہو جائے۔ (اسفار ج ۹، ص ۱۰)

یہ فرض عقلاً محال ہونے کے علاوہ ایک اور اشکال بھی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہر انسان ہر مورد میں دو فکر، دو علم اور اسی

طرح دوسری نفسانی صفات رکھتا ہو۔

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے کوئی کہے کہ نباتی خلیہ یا حیوانی نطفہ یا انسانی جنین جب تعلق روح کی اہلیت رکھتا ہے تو روح مستنسخ اس سے متعلق ہو جائے گی اور کسی دوسری روح سے متعلق ہونے سے مانع ہو جائے گی۔ پس دو روح در یک تن والا اشکال بھی لازم نہیں آئے گا۔

جواب

اگر یہ روح مستنسخ مانع ہو سکتی ہے تو اس کے برعکس بھی ممکن ہے کہ خود اس خلیے یا حیوان یا جنین کی اپنی روح، روح مستنسخ سے تعلق سے مانع ہو جائے۔ جب یہ بھی ممکن ہے تو اس احتمال کو ترجیح دینا بلا وجہ ہوگا۔

بالفاظ دیگر ان میں سے ہر بدن صرف ایک روح سے تعلق کی اہلیت رکھتا ہے اور جو روح بھی متعلق ہوگی وہ دوسری کے تعلق سے مانع ہو جائے گی پس مانعیت کی صلاحیت دونوں میں ہے آپ صرف ایک کی مانعیت کو کیوں قبول کر رہے ہیں۔

۲۔ روح و بدن میں ہم آہنگی کا نہ ہونا

بدن و روح میں ترکیب ایک حقیقی و واقعی ترکیب ہے، ایک جعلی و فرضی ترکیب نہیں ہے جیسے میز یا کرسی کی ترکیب ہوتی ہے۔ اس حقیقی ترکیب کی وجہ سے ان دو میں ایک قسم کی وحدت پائی جاتی ہے۔ اسی وحدت کی وجہ سے روح انسانی بدن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس کے تکامل کے ساتھ ساتھ یہ بھی ترقی کرتی ہے اور زندگی کے تمام مراحل بچپن، نوجوانی، جوانی، پیری اور فرتوتی میں سے ہر مرحلہ میں تدریجاً قوتیں مرحلہ فعلیت کو پہنچتی ہیں۔ ایسی صورت میں کہ جب روح کمالات فعلی کو کسب کر چکی ہو کیسے نباتی خلیے یا حیوانی نطفے یا انسانی جنین کے ساتھ متحد و ہم آہنگ ہو سکتی ہے جب کہ روح کمالات کے لحاظ سے مرتبہ فعلیت پر فائز ہے اور بدن ابھی تک کمالات کے پہلے مرحلے پر ہے اور صرف استعداد و قوۃ رکھتا ہے۔

البتہ یہ اشکال اس صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ روح اپنے سے پست بدن سے متعلق ہونا چاہیے جو ابھی تک کمالات کے لحاظ سے مرحلہ فعلیت پر نہیں پہنچا لیکن اگر روح اپنے سے ہم آہنگ بدن سے متعلق ہونا چاہے تو یہ اشکال پیش نہیں آئے گا۔[1]

آخر میں یہ عرض کر دیا جائے کہ اس مورد میں اشکال کا محور روح و بدن میں ہم آہنگی و اتحاد کا نہ ہونا تھا جو تناسخ کی غالب صورتوں میں موجود ہے اور اس برہان تناسخ کا تناسخ نزولی میں مذکورہ برہان سے کوئی ربط نہیں کیونکہ وہاں برہان کا نتیجہ فعلیت کا قوۃ کی طرف رجوع تھا۔

---

[1] اسفار جلد ۹ ص ۲۔۳

تین سوال اوران کے جواب

کیا پہلی امتوں کا مسخ ہونا تناسخ نہیں ہے؟

قرآن کے بیان کے مطابق پہلی امتوں میں مسخ واقع ہوا ہے کچھ ظالمین کو سؤر اور بندر وغیرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا یہ بھی وہی صورت ہے کہ ان کی انسانی روح ان کے بدن سے جدا ہو کر ان کثیف حیوانات کے بدن سے متعلق ہوگئی۔اس بارے میں قرآن کہتا ہے:

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾ (مائدہ: ۶۰)

’’(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ میں تمہیں خدا کے نزدیک سزا میں اس سے کہیں بدتر عیب بتادوں (اچھا لوسنو) جس پر خدا نے لعنت کی ہو اور اس پر غضب ڈھایا ہو اور ان میں سے کسی کو (مسخ کر کے) بندر اور (کسی کو) سور بنا دیا ہو اور (خدا کو چھوڑ کر) شیطان کی پرستش کی ہو۔پس یہ لوگ درجے میں کہیں بدتر اور راہِ راست سے بھٹک کے سب سے زیادہ دور جا پہنچے ہیں‘‘

دوسری جگہ یوں فرمایا:

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿١٦٦﴾ (اعراف: ۱۶۶)

’’جب انہوں نے سرکشی کی اس سے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ پست بندروں کی شکل میں ہو جاؤ‘‘

جواب

جیسا کہ سابقاً عرض کیا ہے تناسخ کی بنیاد دو چیزیں ہیں:

ا۔ دو ابدان کا ہونا

ایک وہ بدن جس سے روح جدا ہوتی ہے۔دوسرا وہ بدن کہ روح پہلے بدن کو چھوڑنے کے بعد جس سے متعلق ہوتی ہے۔اب یہ دوسرا بدن جو بھی ہو نباتی خلیہ یا حیوان وغیرہ۔

۲۔ نفس (روح) کی واپسی

یعنی پہلے سے کسب کردہ کمال سے پستی کی طرف انحطاط۔ جب روح نباتی خلیے یا حیوانی نطفے یا انسانی جنین سے متعلق ہوتی ہے تو یہی صورت حال پیش آتی ہے۔

لیکن جو اشکال کیا گیا ہے اس میں ان دو شرائط میں سے کوئی بھی نہیں پائی جاتی نہ تو تعدد بدن ہے اور نہ ہی کمال سے پستی کی طرف نزول ہے۔

تعدد بدن نہیں ہے کیونکہ فرض یہ ہے کہ وہی ظالم و ستمگر لوگ بحکم خدا بندر و سور بن گئے تھے۔ ظاہری انسانی لباس سے محروم ہو کر وہ حیوانی لباس میں ظاہر ہو گئے۔ درحقیقت یہاں صرف ایک ہی بدن تھا، صرف شکل تبدیل ہوئی تھی۔

اور یہ کہ روح نے تنزل نہیں کیا اس لیے کہ اس عمل کا ہدف اس گروہ کو سزا دینا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بندروں اور سؤروں کی شکل میں دیکھیں اور اس سے انہیں تکلیف ہو اور یہ ظاہری تبدیلی ان میں سزا کے طور پر واقع ہوئی۔ اگر ان کی روح مقام انسانی سے مرتبہ حیوانی کی طرف تنزل کرتی تو ان کا ادراک بھی حیوانی ہوتا ایسی صورت میں سزا نہ ہوتی۔ سزا تب متحقق ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے پہلے ادراک اور انسانی شعور کے ساتھ اپنی موجودہ شکل و صورت کو دیکھیں اور اس سے سخت رنج و تعجب اٹھائیں۔ ورنہ اگر ان کی روح حیوانی روح کی طرف تنزل کر جائے تو وہ اپنی حالت کو دیکھ کر کبھی غم و اندوہ محسوس نہ کرتے۔ بلکہ اس حالت میں خوشی محسوس کرتے۔

قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ (بقرہ: ٦٦)

”ہم نے اسے ان کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی سزا اور متقین کے لیے عبرت بنا دیا“ [۱]

جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس عمل کا ہدف انہیں سزا دینا تھا در عین حال دوسروں کے لیے عبرت کا سامان فراہم کرنا تھا اور پہلا ہدف تب متحقق ہو سکتا ہے کہ جب ان کی انسانی نفسیات باقی رہیں۔ [۲]

بالفاظ دیگر مسخ کی واقعیت یہی ہے کہ وہ مقام انسانیت رکھتے ہوئے بندروں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں۔ نہ یہ کہ شکل کے علاوہ ان کی انسانیت بھی بدل جائے اور بندر و سور کی روح ان کے بدن سے متعلق ہو جائے۔

---

[۱] آیت سے استدلال اس بات پر مبنی ہے کہ کلمہ ”ما“ سے مراد ان کے گناہ ہوں۔ چاہے شکار سے نہی سے پہلے والے گناہ ہوں یا بعد والے۔ لیکن بعض نے ”ما“ سے مراد معاصر امتیں اور بعد والی امتیں لیا ہے اور ایسی صورت میں وہ مجبور ہوئے ہیں کہ نکالاً کو عبرت کے معنی میں لیں۔ درنتیجہ موعظۃ للمتقین کا جملہ تکراری ہو جائے گا۔ مجمع البیان جلد ۱ ص ۱۳۰

[۲] شرح مقاصد جلد ۲ ص ۳۹ بحار جلد ۵۸ طبع بیروت ص ۱۱۳ المیزان ج ۱ ص ۲۱۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۔ تناسخ اور رجعت میں فرق

قیامت کی علامات کے ضمن میں سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ قیامت سے پہلے کچھ ظالمین کو اس دنیا کی طرف لوٹایا جائے گا اور بعض روایات کی بنا پر کچھ صالحین کو بھی دنیا کی طرف لوٹایا جائے گا نتیجتاً ان کی روح دوبارہ دنیوی بدن سے متعلق ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے رجوع میں اور تناسخ میں کیا فرق ہے؟

جواب

اس گروہ کا دنیا کی طرف لوٹنے اور حضرت عیسیٰ کے ہاتھوں مردوں کے زندہ ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن کے تمام پیرو اور دین مسیح کے پیرو اس بارے میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کی تصدیق کرتے ہیں اور کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ مردوں کا زندہ کرنا تناسخ کے مقولہ سے ہے بلکہ سب اسے حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ اور کرامت کہتے ہیں۔ بنابریں کچھ ظالمین اور صالحین کا دنیا کی طرف لوٹنا، مردوں کے احیائے کی طرح ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے توسط سے انجام پاتا تھا اور تناسخ سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ جیسا کہ سابقاً کہا گیا ہے تناسخ کا محور تعدد بدن اور روح کا مقام انسانی سے تنزل ہے اور احیاموتی میں نہ تعدد بدن ہے اور نہ ہی روح اپنے بلند مقام سے تنزل کرتی ہے۔ بلکہ روح اسی بدن سے متعلق ہوجاتی ہے جسے اس نے چھوڑا تھا اور اس کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے۔ بنابریں رجعت میں روح ہرگز اپنی تحصیل کردہ فعلیات کو ضائع نہیں کرتی اور نہ ہی تنزل کے ساتھ بدن سے متعلق ہوتی ہے کہ آپ اشکال کریں کہ یہ روح کی ارتجاعی حرکت ہے، مرتبہ فعلیت سے قوت کی طرف رجوع ہے بلکہ روح انہی فعلیات کے ساتھ بدن سے متعلق ہوتی ہے جو وہ کسب کر چکی ہوتی ہے۔

ہاں! یہاں پر ایک اور سوال ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس رجعت کا کیا فائدہ ہے اور کیا ہدف ہے؟

آیا روح بدن کے ساتھ دوبارہ تعلق تدبیری کے بعد حرکت استکمالی کو قبول کرے گی یا نہیں اور کیا صالح افراد جیسا کہ انبیاء کرام ہیں یا ظالم وستمگر فرعون کی طرح کے افراد میں کچھ ایسے فعلیت وکمال کے مراحل تصور کیے جاسکتے ہیں جو وہ حاصل نہ کر سکے ہوں اور رجعت میں وہ حرکت استکمالی کے ذریعے انہیں حاصل کریں۔ یا یہ کہ وہ تمام مراتب کمال کو عالم نور میں پا چکے ہیں اب حرکت ارتقائی وکمالی ان کے لیے متصور نہیں ہے؟

یہ سوال قابل توجہ ہے لیکن اس کا مورد بحث سوال سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہاں ہدف یہ ہے کہ واضح کیا جائے کہ تناسخ ورجعت دو مقولوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے۔ البتہ ہم اس سوال کا جواب آئندہ بحثوں میں مناسب جگہ پر عرض کریں گے۔ [۱]

یہاں پر لازم ہے کہ ایک مورخ کی تاریخ علم کلام نقل کرنے میں خیانت کی طرف اشارہ کیا جائے۔ وہ احمد امین مصری ہے۔ جس نے

---

[۱] تفسیر المیزان ج۱ ص۲۱۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اپنی کتاب فجر الاسلام میں شیعہ کو عقیدہ تناسخ سے متہم کیا ہے۔[۱] حالانکہ شیعہ کی کلامی کتابیں تناسخ کے رد میں بھری پڑی ہیں۔

۳۔سنت الٰہی اور انسان کا دنیا کی طرف لوٹنا

قرآن نے متعدد مقامات پر ''احیاءِ موتی'' اور ارواح کے دوبارہ دنیا کی طرف آنے کی خبر دی ہے۔[۲] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کا بدن کی طرف دنیا میں لوٹنا سنت الٰہی کے لحاظ سے کیسا ہے؟

جواب یہ ہے کہ:

سنت الٰہی انسان کی موت وحیات کے بارے میں یہ ہے کہ انسان عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کے بعد اس دنیا کی طرف نہ لوٹے سوائے استثنائی موارد کے جیسا کہ عیسیٰؑ کے ہاتھوں مردوں کا زندہ ہونا یا رجعت وغیرہ۔ قرآن میں اس سنت کی طرف اشارہ بھی فرمایا گیا ہے:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (مومنون: ۹۹، ۱۰۰)

''جب موت ان میں سے کسی ایک کی طرف آتی ہے تو وہ کہتا ہے خدایا! مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ جو عمر ضائع کر چکا ہوں اعمال صالح کے ذریعے اس کی تلافی کر دوں۔ (خطاب ہوتا ہے) یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس کے بعد اسے قیامت تک برزخ کا زمانہ درپیش ہے۔''

یہاں پر ہم ایک دلچسپ بات ذکر کر دیں کہ زمانہ طاغوت[۳] میں ایک مصنف نے اپنی تحریروں کی وقعت بڑھانے کی خاطر ایک نیا شوشہ چھوڑا اور دعویٰ کر دیا کہ وہ ہپناٹزم کے ذریعے نئے علمی مسائل دریافت کر رہا ہے از جملہ یہ کہ افراد کی ارواح نے کچھ اسرار بیان کیے ہیں او رکہتی ہیں کہ کبھی وہ پرندے کے بدن میں تھیں یا کسی نبات میں تھیں اور اب انسانی بدن میں موجود ہیں۔ اس طرح سے اس مردود نے کفر آمیز عقیدہ تناسخ کو اذہان میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔

---

[۱] فجر الاسلام، ص ۲۷۷

[۲] پرندوں کا حضرت ابراہیم کے ہاتھوں زندہ ہونا (بقرہ: ۲۶۰)
عزیرؑ اور ان کے گدھے کا زندہ ہونا (بقرہ: ۲۵۹)
بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہونا (بقرہ: ۷۳) وغیرہ

[۳] ایران میں انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد ماقبل کی شاہی حکومت کے زمانے کو ''زمانہ طاغوت'' کہا جاتا ہے (مترجم)

لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے سوالات وجوابات کوئی عملی وقعت نہیں رکھتے اور نہ ہی عقلاً وشرعاً حجیت رکھتے ہیں۔ہم نے خود اس قسم کی محفلیں دیکھی ہیں جن میں لوگ حالت نیند میں ایسی باتیں کرتے تھے جو بالکل بے بنیاد تھیں۔بعید نہیں ہے کہ ان کے جوابات ان کے وہم وخیال کی پیدائش ہوں کیونکہ ایسی حالت میں خیال بافی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔البتہ یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیل کا نہیں ہے۔اُمید ہے کہ پھر کسی مقام پر اس سلسلے میں تفصیلی بات کریں گے۔

شرح این ہجران و این خونِ جگر
این زمان بگذار تا وقتِ دگر

۱۴۔موت: نئی زندگی کا دریچہ

موت دنیوی زندگی کا آخری مرحلہ اور نئی زندگی کا آغاز شمار ہوتی ہے۔[۱] اس جہت سے ضروری ہے کہ قرآنی نکتہ نظر سے معاد کی مربوطہ ابحاث میں موت سے مربوط مسائل سے بھی آ گاہی حاصل کی جائے۔قرآن میں موت سے مربوط بحثوں کو مندرجہ ذیل موضوعات میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ موت کی اصطلاح لغت و قرآن میں
۲۔ کیا موت عدمی امر ہے؟
۳۔ موت ایک قطعی سنت ہے جو سب کے لیے ہے۔
۴۔ انسانوں کا موت سے ڈرنا (سوائے اولیاء الٰہی کے)
۵۔ موت کی اقسام قرآن کی رو سے۔
۶۔ موت اور حتمی اجل
۷۔ حالت موت میں توبہ
۸۔ موت کے وقت وصیت
۹۔ انسان کا اپنی موت سے ناآ گاہ ہونے کا راز
۱۰۔ موت اور ماموران الٰہی

اب ہم قرآن کی رو سے ان میں سے ہر موضوع کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

۱۔موت کی اصطلاح لغت و قرآن میں

موت کے معنی لغت عرب میں مرنے کے ہیں۔یہ لفظ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے، جیسے صاحب مقائیس نے ذکر کیا ہے۔وہ کہتے ہیں موت "ذھاب القوۃ من الشی" (کسی چیز سے قدرت و قوت زائل ہو جائے) کے معنی میں ہے۔اسی وجہ سے عرب لوگ آگ کے خاموش ہونے اور زمین سے زراعت کی قابلیت ختم ہونے حتیٰ کہ انسان کی نیند کے موارد میں لفظ موت استعمال کرتے ہیں چونکہ ان سب میں

[۱] پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ جناب نے فرمایا: الموت اوّل منزل من منازل الاخرۃ و اخر منزل من منازل الدنیا (بحار الانوار، ج ۶، ص ۱۳۳)

ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے قابلیت واستعداد کا زائل ہو جانا۔[1]

اسی مشترک معنی کی بنا پر قرآن لفظ موت کو درج ذیل موارد میں استعمال کرتا ہے:

۱۔	جو زمین نا قابل زراعت ہو۔	و اية لهم الارض الميتة (يٰسين: ۳۳)
۲۔	وہ بت جن میں حرکت نہ ہو۔	اموات غير احياءٍ (نحل: ۲۱)
۳۔	انسان کی خلقت سے پہلے کے مراحل	و كنتم امواتاً فاحيا كم (بقرہ: ۲۸)
۴۔	جب انسان کی روح قبض کی جاتی ہے۔	ثم انكم بعد ذلك لميتون (مومنون: ۱۵)

۲۔ کیا موت عدمی امر ہے؟

اگر موت سے مراد وہ حالت ہے جو قوت کے زائل ہونے پر انسان پر طاری ہوتی ہے یعنی وہ فقدانی حالت جو انسان پر مرتے وقت طاری ہوتی ہے تو موت عدمی امر ہوگی لیکن اس کے باوجود موت کو مختلف جہات کے لحاظ سے امر وجودی کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ انسان کی موت ملائکہ کے توسط سے واقع ہوتی ہے جو انسان سے قوی واستعداد لے لیتے ہیں یہ ایک قسم کا فعل ہے جسے عدمی امر نہیں کہا جا سکتا البتہ اس کا نتیجہ عدمی امر ہے اور وہ ہے حواس وقویٰ کا کام نہ کرنا۔

۲۔ موت قرآن کی رو سے زندگی کی انتہا نہیں ہے بلکہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف اور پست زندگی سے برتر زندگی کی طرف انتقال ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

ايها الناس انا و ايا كم خلقنا للبقا لا للفنا لكنكم من دارٍ الى دارٍ تنقلون[2]

''اے لوگو! ہم اور تم بقا کے لیے خلق کیے گئے ہیں نہ کہ فنا کے لیے۔ موت کے ذریعے تم ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل کر دیئے جاؤ گے''

سالار شہیداں حضرت امام حسین علیہ السلام کے کلام میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ آپؑ اپنے اصحاب سے خطاب فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

صبراً بنی الكرام فما الموت الا قنطرة تعبر بكم عن البوس والضراء

---

[1] منقائیس اللغۃ جلد ۵، ص ۲۸۳ لسان العرب جلد ۲، ص ۹۰

[2] ارشاد شیخ مفید، ص ۱۲۷

الی الجنان الواسعة والنعیم الدآئمة فایکم یکره ان ینتقل من سجن الی قصرٍ [1]

''صبر کرو۔ موت ایک پل ہے جو تمہیں سختیوں اور مصیبتوں سے وسیع باغوں اور دائمی نعمتوں کی طرف منتقل کر دے گی۔ پس کون ہے تم میں سے جو نا پسند کرے کہ قید خانے سے محل کی طرف منتقل ہو۔

۳۔ بشر کی زندگی اس دنیا میں محدود ہے اور اس کی زمانی حد موت ہے اور موت ہی ہے جس سے دنیوی زندگی کا آخری مرحلہ ہے۔

۴۔ موت کا کبھی بدن سے موازنہ کیا جاتا ہے اور کبھی روح کے ساتھ۔ پہلے لحاظ سے موت ایک عدمی امر ہے کیونکہ موت سے بدن ہر قسم کی حرکت و جنبش ہاتھ سے بیٹھتا ہے اور اگر موت کو روح کی نسبت دیکھا جائے تو طبعی طور پر موت ایک دوسرے جہان کی طرف انتقال کا نام ہے اور کسی چیز کا فقدان اس میں نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انسان کی موت اس کے بدن کی طرف منسوب ہوئی ہے نہ کہ روح کی طرف۔

قرآن موت و حیات کو بیان کرتے ہوئے دونوں کو مخلوق خدا قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ (ملك: ۲)

''خدا وہ ہے جس نے موت و حیات کو خلق کیا''

طبعی طور پر خلقت کی نسبت موت کی طرف انہی مختلف نکتہ ہائے نظر کے لحاظ سے ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں ورنہ ایک محض عدمی و فقدانی امر خلقت کے قابل نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا موت و دنیوی زندگی کا آخری مرحلہ ہے قرآن اس تقدیر کا اس طرح تذکرہ کرتا ہے:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۶۰﴾ (واقعه: ۶۰)

''ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ مقرر و معین کیا ہے اور ہم مغلوب نہیں ہوں گے (یعنی انسان کی مادی زندگی کا خاتمہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ خدا کے مقابلے میں کوئی برتر قدرت موجود ہے جو اسے زندگی گزارنے سے مانع ہو جاتی ہے بلکہ یہ خود ایک قدرت خدا کا مظہر ہے اور اسی کی تقدیر ہے''

۳۔ موت ایک قطعی سنت ہے جو سب کے لیے ہے

قرآن و احادیث کی روشنی میں انسان اور اس عالم کی موت ایک قطعی سنت ہے اور سب کے لیے ناگزیر ہے۔ اس بارے میں

[1] معانی الاخبار شیخ صدوق، ص ۲۸۹، بحار ج ۶ ص ۱۵۴

سائنس بھی وحی الٰہی سے ہم آہنگ ہے۔ مربوط آیات پیش کرنے سے پہلے مفاد آیات کی وضاحت کی خاطر بہتر یہ ہے کہ ایک سائنسی اصول ٹرموڈینامک یہاں پر ذکر کیا جائے۔

نیوٹن سے بعد کے سائنسدانوں کا نظریہ ہے کہ یہ عالم نظم و ترتیب سے بے نظمی و تباہی کی طرف جا رہا ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ جب تمام اجسام کی حرارت برابر ہو جائے گی بالکل ان برتنوں کی طرح جو کسی مائع سے بھرے ہوں اور مختلف سطحوں پر حرکت کر رہے ہوں لیکن جب ان کی سطحیں برابر ہو گئیں وہ سب ساکن ہو جائیں گے۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ حرارت میں جتنی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کچھ قابل استفادہ قوت غیر قابل استفادہ قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی نا قابل استفادہ قوت قابل استفادہ قوت میں تبدیل ہو جائے۔

اس قانون ٹرموڈینامک کے مطابق حرارت گرم اجسام سے ٹھنڈے اجسام کی طرف جاری ہوتی ہے اور یہ جریان اپنے آپ برعکس نہیں ہو سکتا اور درحقیقت انتھراپی (بڑھاپا) نا قابل استفادہ قوت کی قابل استفادہ قوت سے نسبت کا نام ہے۔ اس وجہ سے یہ جہان بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا کہ جب یہ فرق مٹ جائے گا (سطح حرارت سب اشیا کی برابر ہو جائے گی) اور نظام خلقت تباہ ہو جائے گا اور اس عام کی زندگی تمام ہو جائے گی۔ یہ قانون پورے مادی جہان کی موت کو قطعی بنا دیتا ہے اور ہم قیامت کے وقت نظام خلقت کو تباہی سے مربوط آیات کے ضمن میں بھی اس قانون کا تذکرہ کریں گے لیکن اہمیت اس مسئلے کی ہے کہ موت انسان کے لیے حتمی و قطعی امر ہے چاہے وہ زندگی کی حفاظت کے لیے جتنی احتیاط کر لے موت سے فرار ممکن نہیں ہے کیونکہ طبی احتیاطیں ممکن ہے اس کی عمر میں چند دن کا اضافہ کر دیں لیکن بالآخر زندگی کے دن ختم ہو جائیں گے اور بشر کو موت کے سامنے شکست تسلیم کرنا پڑے گی۔

اس بارے میں قرنِ معاصر کے ایک سائنسدان کا قول ہے کہ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ''موت کی طرف'' حتیٰ کہ اگر ہم سائنسی ترقی کے ذریعے فزیکل طور پر اپنے آپ کو دوبارہ جوانی کی طرف لوٹا دیں اور زندگی کو دو تین صدیاں طولانی کر لیں لیکن موت پر کبھی غالب نہیں آ سکتے کیونکہ ہمارے بدن کا ڈھانچہ موت کا متقاضی ہے موت کی طرف سرعت سفر اگرچہ عمر کی زیادتی سے کم ہو جاتی ہے لیکن متوقف ہرگز نہیں ہوتی۔ مستقبل میں سائنس جتنی ترقی بھی کر جائے ہر موجود انسان کے لیے ضروری ہے کہ جلد یا بدیر اس جہان کو ترک کر دے۔[1]

اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو موت کو ایک قطعی حادثہ شمار کرتی ہیں۔

۱۔ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ

(نساء:۷۸)

''تم جہاں پر ہو گے موت تمہیں پالے گی اگرچہ تم مستحکم برجوں میں ہوئے''

---

[1] راہ و رسم زندگی الیکس کارل ص ۱۴۱۔

۲۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط (آل عمران: ۱۸۵ [۱])

”ہر انسان موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے“۔

۳۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ۝۳۴

(انبیاء: ۳۴)

”ہم نے آپؐ (رسول اللہؐ) سے پہلے کسی بشر کو اس دنیا میں حیات جاوید نہ دی پس اگر آپؐ مر جائیں تو کیا وہ حیات جاوید پالیں گے؟ [۲]

حضرت علی علیہ السلام موت کی عمومیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

و لو ان احداً یجد الی البقآء سلمًا اولدفع الموت سبیلاً لکان ذلك سلیمان بن داؤد علیه السلام الذی سخر له مُلك الجن والانس

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۲)

”اگر کسی کے پاس بقائے کی کوئی راہ ہوتی اور وہ کو اپنے سے دور کر سکتا تو وہ سلیمان ابن داؤدؑ ہوتے جن کے لئے جن وانس مسخر کر دیئے گئے تھے۔

ایک دوسری جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

ان لله لکاًینادی فی کل یومٍ لدوا للموت

(نہج البلاغہ کلمات قصار: ۱۳۲)

”خدا کا ایک فرشتہ ہے جو ہر روز پکارتا ہے مرنے کے لیے بچے جنو“

اس بارے میں خاندان عصمت سے بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ [۳]

---

[۱] یہ آیت انبیاء ۳۵ اور عنکبوت ۵۷ میں بھی ہے۔

[۲] اس بارے میں ان سورں کی طرف بھی مراجعہ کیا جائے، زمر: ۳۰، احزاب: ۱۶، وقعدہ: ۶۰، جمعہ: ۸، زمر ۴۲، آل عمران: ۱۶۸ اور مومنون: ۱۵

[۳] نہج البلاغہ اور بحار جلد ۶ باب ۴ کی طرف مراجعہ کیا جائے۔

۴۔انسانوں کا موت سے ڈرنا (بجز اولیاے الٰہی کے)

فطرتاً انسان زندگی سے محبت کرتا ہے۔ یہ صدا انسان کی فطری ہے اور زندگی سے محبت کا فطری ہونا خود ایک دلیل ہے کہ مرموت کے بعد زندگی ہوگی جو انسان کے اس فطری میلان کی آئینہ دار ہوگی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انسان میں ایک ایسی چیز کا میلا پایا جائے جو کبھی عملی نہ ہو سکے۔

اس حوالے سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔کچھ وہ لوگ ہیں جو اُخروی زندگی کے بارے میں صحیح اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے موت کو زندگی کی انتہا سمجھتے ہیں اسی وجہ سے ہمیشہ موت کا لفظ سن کر وحشت زدہ ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ وہ موت کو اپنی فطری میلان کے خلاف سمجھتے ہیں۔موت ان کی نظر میں ایک وحشت ناک بالا ہے جو ان کی زندگی سے دست و گریبان ہے۔

لیکن اولیاے الٰہی اچونکہ دنیوی زندگی کے علاوہ اُخروی زندگی کے بھی معتقد ہیں لہٰذا موت ان کے لیے کوئی مشکل ایجاد نہیں کرتی کیونکہ موت صرف محیط زندگی کی تبدیلی کا نام ہے اور ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف تبدیلی کا نام ہے۔اس کے باوجود ہر جگہ پر ہر کسی کے لیے موت کی ایک طبیعی فکر مندی پائی جاتی ہے۔اس لیے کہ انسان کا اپنے اعزا مثلاً بیوی، بیٹے اور دوست و احباب کو چھوڑ نا رنج و غم کے بغیر ممکن نہیں ہے اگر چہ انسان موت کے بعد ایک بلند و برتر زندگی کی طرف قدم بڑھاتا ہے لیکن یہ رنج و غم ایک فطری بات ہے جو تمام افراد میں موت کے وقت پایا جاتا ہے۔البتہ غیر طبیعی ڈر یا رنج و غم دو اسباب کی وجہ سے ہے جو غیر مومن شخص کو پیش آتے ہیں۔

(الف) کافروں کے نزدیک موت زندگی کی انتہا ہے یقیناً اس کا تصور بھی ان کے لیے اذیت کا موجب ہوگا۔لیکن مومنین موت کی حقیقت سے واقفیت کی بنا پر اس اذیت سے دور ہیں۔

(ب) کچھ لوگ اگر چہ معاد کے معتقد ہیں لیکن اپنے جرائم و گناہوں کی کثرت کی وجہ سے موت سے ڈرتے رہتے ہیں ان کے لیے موت ایک تلخ گھونٹ ہے جو مجبوراً انہیں پینا پڑے گا۔

بعض آیات میں دنیا پرست یہود کے موت سے خوف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔مثلاً

قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَـكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۹۴ وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ۝۹۵ (بقرہ: ۹۴، ۹۵)

”ان (یہود) سے کہہ دو کہ تم یہ سوچتے ہو کہ بہشت صرف تمہارے لیے ہے اگر سچ کہتے ہو تو موت کی تمنا کرو لیکن وہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے“[1]۔

---

[1] یہی مضمون سورہ جمعہ کی آیت ۷، ۸ میں بھی آیا ہے۔

موت سے ان لوگوں کا ڈر غیری طبعی ہے جو ان دو عوامل میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہے اور جیسا کہ ہم نے موت سے ڈر کی وجہ کا ذکر کیا ہے یہی چیز روایات میں بھی مذکور ہے۔ قارئین کے لیے سبق آموز ہونے کی وجہ سے ان میں سے کچھ روایات کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگے: میں موت کو پسند نہیں کرتا۔ آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا کیا مال و دولت رکھتے ہو؟ کہنے لگا ہاں۔ حضرتؐ نے پوچھا کیا آخرت کے لیے کچھ زاد و توشہ بھیج چکے ہو؟ کہا نہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اسی وجہ سے موت کو پسند نہیں کرتے ہو"۔ [۱]

۲۔ حضرت علی علیہ السلام ان لوگوں کے لیے جن کے دل دنیا کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں، فرماتے ہیں:

و اعلما انه لیس شیئٌ الا و یکاد صا حبه یشبع منه و یمله الا الحیاة فانه لا یجد فی الموت راحةً (خطبه: ۱۳۳)

جان لو جو چیز بھی اس دنیا میں ہے انسان اس سے سیر ہو جاتا ہے اور اکتا جاتا ہے مگر زندگی کیونکہ وہ موت میں اپنے لیے راحت و سکون نہیں پاتا"

۳۔ حضرت علیؑ اپنے حکیمانہ کلمات میں مزید فرماتے ہیں:

ولا تکن ممن تکره الموت لکثرة ذنوب [۲]

"وہ شخص نہ بن جاؤ جو موت کو کثرت گناہ کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے"

۴۔ قال رجل للحسن ابن علی ما بالنا نکره الموت و لا نحبه فقال انکم اخربتم اخر تکم و عمر تم دنیا کم فانکم تکرهون النقلة من العمران الی الخراب (بحار جلد ۶، ص ۱۳۹)

"کسی نے امام حسن علیہ السلام سے عرض کیا: کیا وجہ ہے ہم موت ناپسند کرتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: چونکہ تم نے اپنی آخرت برباد کر لی ہے اور دنیا آباد کر لی ہے اور تم ناپسند کرتے ہو کہ آبادی سے بربادی کی طرف جاؤ"

۵۔ قیل لمحمد بن علی بن موسی ما بال هولاء المسلمین یکر هون الموت قال لا نهم جهلوه فکر هوه و لو عرفوه و کانوا من اولیاء الله

---

[۱] بحار الانوار جلد ۶، ص ۱۲۷

[۲] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۵۰

عزوجل لا حبوه ولعلموا ان الاخرة خير لهم من الدنيا

(معانی الاخبار، ص ۲۹۰)

''کسی نے امام جوادؑ سے عرض کیا: یہ مسلمان موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: انہوں نے موت کو پہچانا نہیں ہے اگر موت کو پہچان لیتے اور اولیائے خدا میں سے ہوتے تو موت کو پسند کرتے اور جان لیتے کہ آخرت ان کے لیے دنیا سے بہتر ہے''۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا موت سے ڈر کی وجہ یا تو ایمان کا نہ ہونا ہے یا حقیقت موت سے ناآ گاہی ہے یا گناہوں کی سزا کا ڈر ہے اور واضح سی بات ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اولیائے خدا میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے خدا موت کا استقبال کرتے ہیں اور فرشتہ موت کو لبیک کہتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

والله لا بن ابی طالب الانس بالموت من الطفل بثدی امه (نہج البلاغہ خطبہ ۵)

''خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ ماں کے سینے سے ہوتا ہے''۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

فوا لله ما ابالی دخلت الی الموت اوخرج الموت الی (خطبہ:۵۵)

۵۔ قرآن میں موت کی اقسام

موت زندگی میں ایک طبعی حادثہ ہے اور اپنی جہات کے لحاظ سے قابل تقسیم ہے۔ ہم اس بارے میں وارد آیات کے لحاظ سے موت کی اقسام کو یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔

(الف) آسان و مشکل موت

ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف انتقال یقیناً مشکلات کے بغیر نہیں ہوسکتا یہ بات صرف موت سے مختص نہیں ہے کہ ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف انتقال میں دشواری کا احساس ہوتا ہے بلکہ جنین جو مختصر سی مدت ماں کے پیٹ میں گزارتا ہے جب دنیا میں قدم رکھنا چاہے تو دشواری محسوس کرتا ہے۔ اس وجہ سے امام رضا علیہ السلام ایک روایت میں ان تین مراحل کو انسان کی زندگی میں وحشت ناک ترین قرار دیتے ہیں۔

۱۔ مرحلہ پیدائش

۲۔ مرحلہ موت

۳۔ اٹھائے جانے کا مرحلہ

اس کے بعد فرماتے ہیں: خداوند عالم نے حضرت یحییٰ کو ان تین خوفناک مراحل میں اپنی پناہ میں لے لیا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

"و سلام علیه یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیاً" (مریم: ۱۵)

اگر چہ اس لحاظ سے موت دشواری و سختی کے بغیر نہیں ہوگی۔ لیکن عوارض اور غیر طبیعی دشواریوں کے لحاظ سے یہ دو قسم پر تقسیم ہوتی ہے۔

۱۔ مشکل موت

جو زیادہ تر ظالموں اور گناہگاروں کو آئے گی۔

قرآن فرماتا ہے:

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ (ق: ۱۹)

''اور موت کی سختیاں آئیں۔ جن کا آنا حق ہے اور (اس سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے جس سے تم گریزاں تھے''

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ (محمد: ۲۷)

''کیسا ہے وہ وقت جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کر لیں گے اور ان کے منہ اور پشت پر تازیانے ماریں گے''[1]

۲۔ آسان موت

جو غالباً صالحین کو آئے گی۔

قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ (نحل: ۳۲)

''پرہیز گار وہ ہیں فرشتے جن کی روح کو اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں اور انہیں کہتے ہیں

[1] سورہ نساء ۹۷، انفال: ۲۸، انعام: ۹۳ اور قیامت ۷۵ کی آیات بھی اسی مفہوم کی حامل ہیں۔

سلام ہو تم پر‘‘۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ (فجر: ۲۸)

’’اے صاحبِ نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ ؤ درحالیکہ راضی ہو جزا پر اور برگزیدہ ہو خدا کے نزدیک‘‘

بعینہٖ یہی تقسیم روایات میں بھی وارد ہوئی ہے۔ ہم بعنوان نمونہ چند روایات کا تذکرہ یہاں پر کرتے ہیں۔

آسان و دشوار موت روایات میں

۱۔ امام مجتبیٰ مومن کی موت کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعظم سرورٍ یرد علی المومنین اذا نقلوا عن دار النکد الی نعیم الابد (بحار جلد ۶، ص ۱۵۴)

’’موت مومنین کے لیے عظیم ترین خوشخبری ہے کیونکہ وہ پر مشقت گھر سے ابدی نعمتوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں‘‘۔

۲۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

کنزع ثیابٍ و سخة قملة و فك قیودوا غلال ثقیلة والا ستبدال با فخر الثیاب واطیها روآئع واوطی المرا کب وانس المنازل (بحار جلد ۶، ص ۱۵۵)

’’موت مومن کے لیے لباس اتارنے کی مانند ہے، پاؤں سے زنجیر اتارنے کی مانند ہے، بہترین خوشبوؤں والے اور فاخرہ لباس پہننے کی مانند ہے۔ موت مومن کے لیے زیادہ رام سواری ہے اور زیادہ مانوس گھر ہے‘‘۔

۳۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

للمومن کا طیب ریح یشمه فینعش لطیبه و ینقطع التعب والا لم کله عنه (بحار جلد ۶، ص ۱۰۴)

’’موت مومن کے لیے خوشبو سونگھنے کی طرح ہے جس کی خوشبو کی وجہ سے وہ سو جاتا ہے اور اس سے تمام رنج و مشقت دور ہو جاتے ہیں‘‘۔

۴۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

اعظم ثبور یرد علی الکافرین اذا نقلوا عن جنتهم الی نارلا تبید ولا تنقد(بحار جلد۶، ص ۱۰۴)

''سب سے بڑی ہلاکت کافروں پران کی موت ہے جس کے ذریعے وہ اپنی جنت سے جہنم کی طرف منتقل کیے جاتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ہوگی۔

۵۔ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

للکافر کخلع ثیاب فاخرةٍ والنقل عن منازل انیسة والا ستبدال باوسخ الثیاب واخشنهاو اوحش المنازل واعظم العذاب (بحار جلد۶، ص ۱۵۵)

''موت کافر کے لیے فاخرہ لباس اتارنے کی مانند ہے اور مانوس گھر سے منتقل ہونے کی مانند ہے اور سخت اور گندے لباس پہننے کی مانند ہے اور وحشت ناک ترین گھر ہے اور بہت بڑا عذاب ہے''

(ب) جسم اور دل کی موت

غالباً موت کو جسم کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ یہ تب ہے جب روح کا رابطہ جسم سے کٹ جائے لیکن جو شخص فکر اور سوچ کے لحاظ سے بہت پست ہو قرآن اسے بھی مردہ نما زندہ سے تعبیر کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم معاندین کو ایسے مردے شمار کرتا ہے جو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ۝۸۰ (نمل: ۸۰)

''اے رسولؐ! تو مردوں اور بہروں کو نہیں سنوا سکتا کہ جب وہ تجھ سے پشت پھیر چکے ہیں''

اس آیت میں ہٹ دھرم مشرکین کو مردے کہا گیا ہے جو سمجھتے نہیں اور بہرے کہا گیا ہے جو سنتے نہیں۔[1]

اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَـيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ (انعام: ۱۲۲)

''کیا وہ جو (دل کے لحاظ سے) مردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے

[1] سورہ روم کی آیت ۵۱۔۵۲ اس مضمون پر وارد ہیں۔

ذریعے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تاریکیوں میں دھنس چکا ہے اور ان سے باہر نہ نکل سکے''۔

حضرت علیؑ کی نظر میں سست و بزدل لوگ جو چند روزہ زندگی کی خاطر دشمن سے ذلت وتسلط کو قبول کر لیتے ہیں، مردہ ہیں اور مجاہد لوگ جو دین وشریعت کی حفاظت کی خاطر جام شہادت نوش کر لیتے ہیں، زندہ ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

فالموت فی حیا تکم مقھورین والحیاۃ فی موتکم قاھرین (نہج البلاغہ خطبہ ۵۱)

''نیز جو لوگ زبان یا عمل یا دل کے ذریعے نہی از منکر نہیں کرتے وہ بھی حضرت کی نظر میں مردہ ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

و منھم تارك لا نكار المنكر بلسانه و قلبه ويده فذلك ميث الاحيآء [1]

زاہد و پارسا لوگوں کے وصف میں فرمایا:

یرون اھل الدنیا یعظمون موت اجسا دھم و ھم اشدا عظاماً لموت قلوب احیاۂھم (نہج البلاغہ خطبہ ۲۳)

''دنیا والے جسموں کی موت کو امر عظیم سمجھتے ہیں حالانکہ زاہدین زندہ لوگوں کے دلوں کی موت کو بڑا سمجھتے ہیں''

(ج) فرد اور اجتماع کی موت

علما اجتماعی زندگی کے لیے فرد کی زندگی کی طرح نشیب وفراز اور صعود و کمال کے قائل ہیں۔ یعنی معاشرہ بھی فرد کی مانند ہے اور جب تک ایک فرد کمال کے سن کو نہ پہنچ جائے اس کی رفتار میں تندی وتہاجم کی کیفیت ہوتی ہے کچھ مدت کے بعد جب وہ رشد وقدرت کے اوج کو پہنچ جاتا ہے تو اب اس کے اعصاب وقوی پر سستی وضعف طاری ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں تہاجم وتندی کے بجائے وہ مدافع رہتا ہے تاکہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے ہاتھ سے نہ دے بیٹھے اور آخر کار موت کے پنجے میں آ جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت معاشرے کی بھی ہے۔ کچھ مدت تک اس میں تہاجمی حالت ہوتی ہے اس کے بعد دفاع کی حالت میں آ جاتا ہے اور آخر کار نیست ونابود ہو جاتا ہے۔ معاشروں کی تاریخ کے چار مراحل ہیں: تکون، تہاجم، تدافع اور انقراض۔ ایک مدت تک ایک تہذیب وتمدن کسی اجتماع پر حاکم رہتا ہے اور وہ رشد کرتا ہے۔ کچھ مدت گزار کر اس

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۳۷۴۔ نیز خطبہ ۸۷

تمدن کی موت کا وقت آ جاتا ہے اور ایک نئی تہذیب تشکیل پاتی ہے۔

قرآن اس آیت میں کسی بھی اجتماع کی موت و حیات کی طرف اشارہ فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ (اعراف:۳۴)

”ہر امت کے لیے ایک مدت معین ہے جب بھی اس کی آخری گھڑی آ پہنچے تو وہ اس سے ایک لحظہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی“

مسلماً مختلف تمدنوں کا اقوام و ملل پر طلوع و غروب خدا کے سنن میں سے ہے لیکن سنت الٰہی کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ایک اجتماع کسی عامل کے بغیر اندر سے کھوکھلا ہو جائے بلکہ کسی اجتماع کو کمزور اور بوڑھا کرنے کے لیے کئی عوامل ہیں ہم صرف ایک عامل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ظلم۔ قوموں کی موت کا ایک سبب

ظلم و تجاوز و اقوام میں ایک چھوٹے سے نقطے سے شروع ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے جس کے بعد پھر دھماکے کی صورت پیش آتی ہے بالکل اس دیگچے کی مانند جس کا منہ بند ہو اور اندر اس کے بخارات جمع ہوتے رہیں۔ وہ ایک دھماکے سے کسی عمارت کو تباہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ظلم بھی کسی معاشرے کو تباہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ (ھود: ۱۱۷)

”خدا ظلم کے طور پر کسی بستی کو تباہ نہیں کرتا جب کہ اس کے رہنے والے اصلاح کی کوشش میں رہیں“

ایک اور آیت میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ (بنی اسرائیل: ۱۶، ۱۷)

”جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہیں تو ہم اس کے مالداروں کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں۔ پس وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں اور مستحق عذاب ٹھہرتے ہیں۔ اس وقت ہم اس آبادی کو برباد کر دیتے ہیں۔ کتنی ہی آبادیوں

کو ہم نے نوحؑ کے بعد برباد کیا اور خود تیرا رب لوگوں کے گناہوں سے آگاہی میں کافی ہے۔

ان آیات میں قہر الٰہی کی صورت میں کسی معاشرے کی ہلاکت کی وجہ اس کے گناہ و نافرمانی کو ٹھہرایا گیا ہے (''ففسقوا فیھا'' اور ''بذنوب عبادہ'' دو جملے اس کی حکایت کر رہے ہیں)۔ البتہ کچھ گناہ کسی معاشرے کی بنیادیں گرنے کے عمل سے ایک قسم کا مادی رابطہ رکھتے ہیں۔ مثلاً: ظلم کا عام ہو جانا حکومت کے بارے میں لوگوں کی نفرت کو زیادہ کر دیتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں عداوت پروان چڑھنے لگتی ہے جس کا نتیجہ قتل و فساد کی صورت میں نکلتا ہے اور تمدن تباہ ہو جاتا ہے۔ البتہ کچھ گناہوں کا معاشرے کی تباہی کے ساتھ رابطہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسا مادی رابطہ موجود ہو لیکن ہم اس سے آگاہ نہ ہوں یا کوئی مادی رابطہ نہ ہو بلکہ کوئی غیبی رابطہ ہو جس کی وجہ سے وہ لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جائیں۔ البتہ اس مورد میں بحث وسیع ہے جس کی یہاں مناسبت نہیں ہے۔

د۔ افتخار آمیز موتیں

موت کی کچھ قسمیں تو ایسی ہوتی ہیں جو واقعاً قابل افتخار ہوتی ہیں اور وہ راہ خدا میں موت اور عدل و قسط کی خاطر مرنا ہے یا تحصیل علم اور کسب معارف الٰہی کی راہ میں مرنا جیسا کہ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (بقرہ: ۱۵۴)

''جو لوگ راہ خدا میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے''[۱]

نہ صرف اس گروہ کی موت افتخار کی موجب ہے بلکہ جو لوگ دین اور کسب معارف الٰہی کی راہ میں اپنے گھر کو چھوڑتے ہیں اور راستے میں موت انہیں آ لیتی ہے ان کی موت بھی قابل فخر ہے۔ یہ موت دوسروں کی موت کی مانند نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (نساء: ۱۰۰)

''جو لوگ اپنے گھر سے خدا اور رسولؐ کی طرف ہجرت کرتے ہیں پھر موت انہیں آ لیتی ہے، بے شک ان کا اجر خدا کے ذمے ہے''۔[۲]

---

[۱] سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۹ اسی مضمون میں ہے۔

[۲] سورہ حج کی آیت ۱۵۸ اسی مضمون میں ہے۔

۶۔ قطعی اور غیر قطعی موت

قرآن میں دو قسم کی موت بتائی گئی ہے:

۱۔اجل مسمی ۲۔اجل مطلق

مفسرین نے ان اقسام کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ان کے مطالعے سے جو مجموعی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ''اجل مطلق'' سے مراد موجودات کا اپنی طبیعی عمر گزارنا ہے یعنی ہر نوع کے موجودات کی عمر ایک حد معین رکھتی ہے، جس سے زیادہ عمر ہونا نادر و کم یاب سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً انسان کی طبعی عمر (کہتے ہیں ۱۲۰ سال ہے)۔ یہ ایک حد رکھتی ہیں، اس سے زیادہ نادر و کمیاب ہے جو کسی فیصلے کے لیے معیار نہیں بن سکتی۔ بالکل اس طرح کہ جو چیزیں خود انسان بناتا ہے ان کی بھی ایک مدت محدود ہوتی ہے مثلاً جو عمارت لوہے سے بنائی جاتی ہے اس کی ایک خاص عمر ہے اور جو عمارت اینٹ وغیرہ سے بنائی جاتی ہے اس کی ایک الگ عمر ہوگی۔اسی طرح جو ڈیم پانی کو کنٹرول کرنے کی خاطر بنائے جاتے ہیں ایک محدود عمر رکھتے ہیں۔

لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر موجود اپنی طبیعی عمر کو پورا کرلے۔ بلکہ بسا اوقات کچھ عوامل اسے طبیعی عمر پورا نہیں کرنے دیتے اور اس معین مدت تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت آلیتی ہے۔اس موت کو''اجل مسمی'' کہتے ہیں چونکہ صرف خدا تمام انسانوں کے انجام سے آگاہ ہے اس لیے خدا کہتا ہے کہ اس کے پاس ہے''اجل مسمی'' یعنی ممکن ہے بشر اپنی اجل مطلق سے آگاہ ہوجائے لیکن اجل مسمی سے ہرگز آگاہ نہیں ہوسکتا[1]۔

گویا اجل مطلق کسی چیز میں باقی رہنے کی صلاحیت کے پیش نظر ہوتی ہے جبکہ اجل مسمی کسی شخص کی ان خصوصیات کے پیش نظر دیکھی جاتی ہے جن کی وجہ سے موت اس کی کمین میں ہے۔

۷۔موت کے وقت توبہ وندامت

قرآنی آیات فرماتی ہیں کہ موت کے وقت انسان کے سامنے سے تمام مادی حجاب ہٹا دیئے جاتے ہیں اس طرح کہ لوگ آخرت

---

[1] ظاہراً یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی۔ مختصر طور پر عرض کردوں کہ اصطلاح میں موت کی یہ دو قسمیں یوں ہیں۔موت حتمی وموت غیر حتمی۔موت حتمی وہ موت ہے جو ایک انسان مثلاً زید کے لئے کاتب تقدیر نے لوح محفوظ پر لکھ دی ہے مثلاً صد سال یہ مطلق ہے اس میں تبدیلی اس صورت میں ممکن نہیں ہے کہ اس میں اضافہ ہوجائے بلکہ جب وہ صد سال کا ہوجائے گا تو حتماً اس کی موت واقع ہوجائے گی۔البتہ اس مدت سے پہلے ممکن ہے اس کی زندگی کا چراغ بجھ جائے وہ صد سال میں کوئی مانع پیش نہ آنے کی صورت میں ہے چونکہ زندگی عالم تزاحم میں واقع ہے لہٰذا ممکن ہے کوئی مزاحم آجائے اور زندگی کا چراغ گل ہوجائے۔اس موت کو غیر حتمی کہتے ہیں اور وہ احادیث جو کہتی ہیں صدقہ، صلہ رحمی، دعا وغیرہ عمر میں اضافہ کا موجب بنتی ہیں ان میں مراد یہی ہے کہ اس موت غیر حتمی کو ٹالنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ دوسری اصطلاح میں پہلی قسم کو طبعی موت اور دوسری قسم کو حادثاتی موت کہتے ہیں، مترجم

میں اپنے انجام سے آ گاہ ہو جاتے ہیں اور اپنی برزخی آنکھوں سے وہ عالم برزخ کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صالحین موت کا استقبال کرتے ہیں اور اسے ہدیہ الٰہی سمجھتے ہیں جبکہ گناہگار سخت پشیمان ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب توبہ اور تظاہر بہ ایمان انہیں کوئی فائدہ دے گا۔

قرآن فرماتا ہے کہ ان کی اس وقت کی توبہ قبول نہیں ہے اور اس وقت کی پشیمانی کوئی فائدہ نہیں دے گی کیونکہ ندامت تب باعث کمال روح ہے جب نادم گناہ پر قادر ہو اور جب اس سے قدرت سلب ہو چکی ہو اور کوئی چارہ نہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں ندامت اس کے روحی تغیر اور حقیقی توبہ پر دلالت نہیں کرے گی۔ اس ندامت و توبہ اور جو ندامت و توبہ کے پہنچنے سے پہلے کی جاتی ہے اس میں یہی فرق موجود ہے۔ ان دونوں کی ماہیت مختلف ہے۔ اس بارے میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔ چند ایک کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ (نساء: ۱۸)

''وہ لوگ جو مدتوں گناہ کرتے رہتے ہیں جب کسی ایک کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو کہتا ہے میری توبہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے''

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ۝ لَعَلِّىۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِيۡمَا تَرَكۡتُ (مومنون: ۹۹، ۱۰۰)

''جب ان بدکرداروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو کہتا ہے: خدایا! مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ جن موارد میں میں نے کوتاہی کی ہے ان میں اعمال صالح کروں۔ خطاب ہوگا: ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا''

طاغوت مصر فرعون بھی جب ڈوبنے لگا تو اس نے یہی حیلہ اپنانا چاہا اور اظہار ایمان کرنا چاہا لیکن خدا نے قبول نہ کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدۡرَكَهُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِيۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝ اٰۤلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَيۡتَ قَبۡلُ وَكُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝ (یونس: ۹۰، ۹۱)

''جب غرق ہونے لگا تو اس نے کہا: میں اسی خدا پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اس کی بارگاہ میں اپنے آپ کو تسلیم کرتا ہوں (جواب ملا: اب کیسے کرتے ہو جبکہ پہلے مخالفت کرتے رہے ہو اور زمین میں فساد کرتے رہے ہو''

جو امتیں مستحق عذاب تھیں عذاب آنے سے پہلے انبیا کا تمسخر اڑاتی تھیں لیکن جب عذاب کا سامنا کرتیں تو دامن انبیا میں پناہ لیتیں۔

جیسا کہ قرآن نے کہا ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ (مومن:۸۴، ۸۵)

''جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہا: ہم ایمان لے آئے خدا پر۔ جبکہ یہ ایمان ان کے لیے اس وقت مفید نہ تھا''۔

حضرت امیر المومنین بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

''فھو یعض یدہ ندامة علی ما اضمرہ عند الموت من امرہ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۹)

''گناہگار موت کے وقت جب عذاب سے مطلع ہوں گے تو ندامت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں پر کاٹیں گے''

آخر میں یہ بات عرض کر دی جائے کہ اس قسم کی توبہ وندامت کا قبول نہ کرنا خداوند تعالیٰ کی رحمت واسعہ کے خلاف نہیں ہے کیونکہ شریعت میں پشیمانی کا قبول کرنا لفظ ندامت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ انسان کی روح میں تغیر وتحول آ جائے جس کی وجہ سے وہ فیض الہٰی کے لائق ہو جاتا ہے (یہ مسئلہ شفاعت کی بحث میں بھی آئے گا) اور یہ تحول وتغیر تب پیش آتا ہے جب بشر گناہ پر قادر ہو اور پھر بھی نہ کرے۔ لیکن جب ہلاکت کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکا ہے اور اب اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا ہو تو یہاں پر توبہ اس کے داخلی تغیر کا باعث نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ توبہ دل وجان کو صفائی و پاکیزگی عطا کرتی ہے لہٰذا رحمت خدا بھی اس کے شامل حال نہیں ہوگی۔

۸۔موت کے وقت وصیت

احادیث کے لحاظ سے مستحب ہے کہ انسان تمام حالات میں قرض وحقوق کے لحاظ سے اپنی حالت واضح رکھے مبادا موت اسے آ لے اور وہ اپنے ذمے حقوق کو بیان نہ کر سکے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما ینبغی لامرئٍ مسلم ان یبیت لیلة الا ووصیتہ تحت راسہ (وسائل الشیعہ جلد ۱۳، کتاب وصایا باب، حدیث ۷)

''مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ رات سوئے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے سر کے نیچے ہو''۔

اور کچھ لوگ صحت وسلامتی کے وقت وصیت نہیں کر پاتے، تو لطف خدا یہ ہے کہ اس نے مؤکد دستور دیا ہے کہ ہر مسلمان مرتے وقت

اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ

(بقرہ: ۱۸۰)

''تمہارے اوپر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی پر موت کی علامات واضح ہو جائیں تو وہ اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کرے''

یہی وجہ ہے کہ انسان کی وصیت چاہے لفظی ہو چاہے کتبی، اس کا نافذ کرنا ضروری ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ دو عادل مرد اس کی وصیت کو سنیں اور اس پر گواہی دیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ (مائدہ: ۱۰۶)

''اے مومنین! جب تم سے کسی کی موت کا وقت آ جائے تو وصیت کے وقت تم میں سے دو عادل مرد حاضر ہوں اور اس پر گواہی دیں''۔

۹۔ انسان کی اپنی موت سے ناآگاہی

خدا کے الطاف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے انسان میں بقا کی اُمید کو خلق کر دیا ہے تا کہ خود انسان کو ہر وقت موت کا احساس نہ ستاتا رہے۔ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ

الامل رحمة لا متی و لولا الا مل ماوضعت والدة والدها ولا غرس غارس شجراً (سفینۃ بحار مادہ اُمل)

''اُمید میری امت کے لیے رحمت ہے اگر اُمید نہ ہوتی تو کوئی ماں بچہ نہ جنتی اور کوئی شخص درخت نہ لگاتا''

اگر لوگوں کو پہلے سے اپنی موت کا وقت اور مقام معلوم ہوتا تو موت سے سالوں پہلے سے وہ غم و اندوہ اور سکون و جمود کا شکار ہو جاتے، ان سے ہر قسم کی کوشش و سعی سلب ہو کر رہ جاتی بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اسی خوف سے ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر موت سے پہلے مر جاتے۔

اصولی طور پر اپنی مقرر و محدود اجل تک پہنچنے کے اسباب میں سے ایک سبب انسان کی اپنی موت کے زمان و مکان سے ناآگاہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موت وغیرہ کا علم خدا نے اپنی ذات کے ساتھ مختص رکھا ہے اور کسی فرد کو اپنی موت کے زمان و مکان سے مطلع نہیں رکھا۔ (سوائے چند استثنائی موارد کے)۔

البتہ انسان کی موت سے نا آ گاہی تربیتی پہلو بھی رکھتی ہے کیونکہ صلاح ونیکی کی راہ پر چلنا اس وقت روح کا کمال شمار ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے اندر کسی کام کو انجام دینے یا ترک کرنے کی قدرت کا احساس رکھتا ہو نہ کہ جب جان بہ لب ہو۔ البتہ موت کے وقت سے نا آ گاہی انسان میں غرور کو ایجاد کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ لیکن اچھے اور صالح لوگ اس غرور پر کنٹرول کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

موت کے وقت سے نا آ گاہی ایک اور طرح سے بھی تربیت کے لحاظ سے موثر ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بسا اوقات جب انسان کو موت کے بعید ہونے کا پتہ چل جائے تو ممکن ہے وہ یہ سوچ کر گناہ کرنے لگے کہ موت کے قریب توبہ کر لیں گے لیکن جب موت کا وقت انسان کو معلوم نہ ہوا اور ہر لحظہ اُسے موت کا احتمال رہے تو اس صورت میں عاقل شخص کم گناہ کرے گا، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید توبہ کا موقع نہ مل سکے۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ (لقمان: ۳۴)

''کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس زمین پر مرے گا''۔

انسان کی موت سے نا آ گاہی کے بارے میں مختلف آیات وارد ہوئی ہیں اور وہ آیات جو کہتی ہیں اجل مسمّی نزد خدا ہے وہ بھی اسی مطلوب پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۰۔ موت اور ماموران الٰہی

توحید کے مراتب میں سے ایک مرتبہ توحید درربوبیت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس عالم کی تدبیر صرف خدا کرتا ہے اور خالق صرف وہی ہے اور شرک در تدبیر عالم قرآن کی نظر سے مردود ہے۔ سورج کی تپش، چاند کی روشنی اور پھول کی خوشبو وغیرہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۵۴ (اعراف: ۵۴)

''اسی کے لیے ہے خلق کرنا اور تدبیر کرنا خدا کی ذات بابرکت ہے جو عالمین کا پروردگار ہے''۔

لیکن تدبیریں میں توحید کا اقرار اس بات سے مانع نہیں کہ نظام عالم ان اسباب کے ذریعے چلایا جائے جنہیں خود خدا نے اس کام پر معین فرمایا ہے۔ کیا خوب کہا ہے فارسی کے ایک شاعر نے:

نقش ہستی نقشی از ایوان ماست
آب و باد و خاک، سرگردان ماست

ما بہ دریا حکم طوفان می دھیم
ما بہ سیل و موج فرمان می دھیم
آب ہا از خود نہ طغیان می کنند
آنچہ می گوئیم ما، آن می کنند

روح کا قبض کرنا ایک طبیعی حادثہ ہے اور ایک لحاظ سے خالق کائنات سے مربوط ہے۔ قرآن کبھی تو اس کی خدا کی طرف نسبت دیتا ہے اور اسے فعل خدا کہتا ہے اور کبھی اسے فرشتوں کی طرف نسبت دیتا ہے جو خدا کے معین کردہ ہیں۔

ایک جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر: ۴۲)

''موت کے وقت خدا جانوں کو اخذ کرتا ہے''

دوسری جگہ فرمایا:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (نحل: ۲۸، ۳۲)

''وہ جن کی روح فرشتے قبض کرتے ہیں''

ایک اور آیت میں قبض روح کی نسبت ملک الموت کی طرف دی گئی ہے کیونکہ بالخصوص قبض ارواح اس کا کام ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ (سجدہ: ۱۱)

''کہہ دو! ملک الموت تمہاری قبض ارواح پر معین ہے، جو مکمل قبض کرتا ہے''

واقعیت کے لحاظ سے تینوں نسبتیں درست ہیں کیونکہ ایک طرف سے دیکھا جائے تو اس جہان کا مستقل ایک ہی مدبر ہے نتیجتاً وہی قابض روح بھی ہوگا اور دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ نظام ہستی علت و معلول اور اسباب و مسببات کی بنیاد پر قائم ہے۔ ہر واقعہ کسی خاص عمل کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا فرشتے اور ملک الموت جو خدا کے مقرر کردہ ہیں قابض ارواح ہوں گے اور اس قسم کی نسبتیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں یعنی ایک چیز خدا کی طرف بھی منسوب ہے اور غیر خدا کی طرف بھی لیکن دونوں نسبتیں باہم تفاسیر رکھتی ہیں ایک نسبت اصل و بالذات ہے جب کہ دوسری غیر مستقل ہے۔ اس کی دو مثالیں قرآن سے پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ قرآن نے انسان کے خفیہ کاموں کے بارے میں کہا:

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ (نساء: ۸۱)

''جو وہ رات کو سوچتے ہیں خدا اُسے لکھتا ہے''

دوسری جگہ پر قرآن نے اس کام کی نسبت فرشتوں کی طرف دی ہے۔

اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰىهُمۡ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَیۡهِمۡ یَكۡتُبُوۡنَ﴿۸۰﴾ (زخرف: ۸۰)

''کیا وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم ان کی مخفی باتوں کو نہیں سنتے ؟ کیوں نہیں؟ ہم سنتے ہیں اور ہمارے قاصدان کے پاس ہیں جو اسے لکھ لیتے ہیں''

۲۔ درج ذیل آیات میں موت وحیات کو فعل خدا کہا گیا ہے:

(آل عمران: ۱۵۸)، (توبہ: ۱۱۶)، (واقعہ: ۶۰)، (نجم: ۴۴)، (بقرہ: ۲۵۸)، (حجر: ۲۳)، (ملک: ۲)، (مومنون: ۶۰)، (مومن: ۶۸) اور (دخان: ۸)

جبکہ مندرجہ ذیل آیات میں موت کو خدا کے قاصدوں کا فعل کہا گیا ہے:

(انعام: ۶۱)، (اعرف: ۳۷)، (نحل: ۲۸) اور (نحل: ۳۲)

ان دو قسم کی نسبتوں میں جمع اس صورت پر ہے جو ہم نے ذکر کی ہے لیکن دوتیت (ثنویت) اور استقلال اور اسباب کی فکر کو ختم کرنے کی خاطر باوجود اس کے کہ قرآن میں نظام علت ومعلول کو قبول کیا گیا ہے پھر بھی بہت زیادہ اصرار اس بات پر کیا گیا ہے کہ ہر قسم کا واقعہ اور آثار طبیعت خدا کی طرف سے ہیں اور امکانی حادثات صرف خدا کی عطا کردہ قوت سے کچھ آثار وافعال کا ذریعہ قرار پاتے ہیں اور کسی قسم کا استقلال نہیں رکھتے۔

۱۵۔ قرآن میں قبر و برزخ

اگر موت کو انسان کے لیے دنیا کے بعد پہلی منزل سمجھیں اور طبعی طور پر غسل، کفن اور نماز میت بھی اسی منزل کا حصہ ہیں تو چاہیے کہ قبر میں اتارے جانے کو دوسرا گھر شمار کیا جائے اور وہ ایسا گھر ہے جس سے انسان کو پہلے ذرہ برابر بھی واسطہ نہیں پڑا ہوتا۔ ایک بہت تنگ گھر جو چوڑائی میں آدھا میٹر اور لمبائی میں دو میٹر ہے۔ انسان مٹی پر چہرہ رکھنے کے بعد لوگوں کی مادی نظروں سے پنہاں ہو جاتا ہے اور چند اینٹیں قبر کی دیوار پر رکھ کر منوں مٹی اس پر ڈال دی جاتی ہے اور اس انسان کا مادی تعلق دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔

البتہ منزل کی یہ قسم ایک حسی مسئلہ ہے اور قرآن بھی مختلف مناسبتوں سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ (عبس: ۲۱)

''پھر اسے مار کر قبر میں وارد کر دیا''

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ (حج: ۷)

''اور خدا انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں''۔ [۱]

لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو انسان کی دوسری منزل قرآن کی رو سے برزخ ہے انسان کی روح اپنے مناسب بدن کے ساتھ اس عالم میں رہتی ہے اور انسان کو وہاں کچھ خاص حالات درپیش آئیں گے جن کی طرف ہم اشارہ کریں گے اور قبر سے مراد عالم برزخ ہی ہے۔

قرآن اس آیت میں اسی دوسری منزل کا ذکر کر رہا ہے:

وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (مومنون: ۱۰۰)

''اور اس کے بعد انہیں عالم برزخ درپیش ہے جو قیامت تک ہوگا''۔

اس میں لفظ ''ورای'' اپنے غالب معنیٰ (پیچھے) میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہاں اس سے مراد آگے ہے جیسا کہ کچھ اور آیات میں بھی اس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ (کھف: ۷۹)

''اس کے آگے ایک بادشاہ تھا جو کشتیاں غصب کر لیتا تھا''۔

---

[۱] اسی بارے میں توبہ ۸۴، فاطر ۲۲، ممتحنہ ۱۳، عادیات: ۹ اور تکاثر ۱۲ کی طرف مراجعہ کیا جائے۔

لغت عرب میں ''برزخ'' فاصلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿۲۰﴾ (رحمن: ۲۰)

''ان دو دریاؤں کے درمیان فاصلہ ہے کہ وہ ایک دورے سے نہیں ملتے''

اور اس قسم کی زندگی کو برزخ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی فاصلہ ہے دنیوی زندگی اور اخروی زندگی کے درمیان۔ البتہ مندرجہ بالا آیت سے برزخی زندگی کا استفادہ نہیں ہوتا۔ یہ آیت صرف اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان فاصلہ ہے لیکن دوسری آیات میں حیات برزخی پر مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔

ا۔ وہ آیات جن کے ذریعے تجرد و بقاروح بعداز مرگ ثابت ہوتی ہے ایسی زندگی پر بھی شاہد ہیں۔

یہ آیات وضاحت کے ساتھ اثابت کرتی ہیں کہ عالم برزخ میں انسان نفسانی و روحانی آثار وصفات بھی رکھتا ہے۔ مثلاً خوشی و غمی اور آثار جسمانی بھی رکھتا ہے جیسے رزق وغیرہ اور ''فرحین یستبشرون'' ''یرزقون'' اور ''بنعمة من الله'' کے الفاظ انہی آثار زندگی کی حکایت کر رہے ہیں (سورہ آل عمران ۱۶۹ اور ۱۷۱)

جیسا کہ وہ آیات جو آل فرعون کو آگ پر پیش کرنے اور قوم نوح کے آگ پر ورود وغیرہ کے بارے میں پہلے ذکر ہو چکی ہیں (تجرد نفس کی بحث میں) اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ کفار کو اس منزل میں مبتلائے عذاب کیا جائے گا۔

حیات برزخی پر کسی نہ کسی طرح دلالت کرنے والی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے:

قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ (مومن: ۱۱)

''کافر قیامت کے دن کہیں گے: خدایا! تو نے دو بار ہمیں مارا اور دو بار زندہ کیا پس ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟''

اس آیت میں دو دفعہ مرنے اور دو دفعہ زندہ ہونے کی بات کی گئی ہے۔ اس سے مراد کیا ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ ان اقوال میں سے جو زیادہ واقع کے قریب اور آیت سے مناسبت رکھتا ہے یہ ہے کہ دو ''اماتة'' سے مراد ایک تو اسی دنیا میں مارنا ہوا دوسرا حیات برزخی کے بعد پہلے صور پھونکنے پر واقع ہوگا جس میں سب جاندار مر جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ (زمر: ۶۸)

''جب صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے مر جائے گا مگر جو خدا چاہے''

اور دو "احیاء" سے مراد یہ ہے کہ ایک دنیوی موت کے بعد ہے جسے حیات برزخی کہا جاتا ہے اور دوسرا وہ احیاء ہے جو دوسرے صور کے پھونکے جانے سے انجام پائے گا سب قیامت میں زندہ کئے جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾ (یٰسین: ۵۱)

"اور صور پھونکا جائے گا پس اچانک مردے قبروں سے نکل کر میدان محشر کی طرف دوڑ پڑیں گے"

اگر اس دو قسم کے "اماتہ و احیا" کو واضح طور پر ذکر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے:

۱۔ پہلا اماتہ...... دنیوی موت جب اجل قطعی آ جائے گی۔

۲۔ دوسرا اماتہ...... جب پہلا صور پھونکا جائے گا۔

۳۔ پہلا احیا...... موت کے بعد انسان کا زندہ ہونا عالم برزخ میں [1]

۴۔ دوسرا احیا...... انسان کا دوسرے صور کے وقت زندہ ہونا

کبھی کہا جاتا ہے کہ دو اماتہ سے مراد یہ ہے:

۱۔ انسان کی اس وقت کی موت جب ابھی وہ جماد یا نطفہ تھا۔

۲۔ جب زندگی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ احائے اول یعنی جب اسے جماد یا نطفہ سے بعد زندگی عطا کی (انشا نہ خلقا اخر)

۴۔ دوسرا احیا یعنی قیامت کے دن زندہ کرنا۔

لیکن اماتہ و احیاء کی یہ تفسیر اشکال سے خالی نہیں ہے چونکہ آیت میں دو موتوں اور دو احیا کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس تفسیر میں اگر چہ جو دو احیا بیان کیے گئے ہیں درست ہیں اور حقیقت رکھتے ہیں لیکن دو قسم کا اماتہ حقیقی نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقی امتہ تب صدق کر سکتا ہے جب پہلے زندگی ہو حالانکہ دو نطفہ زندگی کا حامل نہیں ہوتا لہٰذا اس پر اماتہ بھی حقیقتاً صدق نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس مرحلہ (مرحلہ نطفہ و جماد) کے بارے میں موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ اماتہ کا:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ (بقرہ: ۲۸)

"کیسے خدا کا کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی دی"

برزخی زندگی روایات کی نظر سے

حیات برزخی اور ارواح کا قیامت سے پہلے معذب یا متنعم ہونا بہت سی روایات میں صریحاً مذکور ہے۔ ہم بطور نمونہ چند ایک کو یہاں

---

[1] پہلے احیاء کا مطلب یہ ہے کہ روح عنصری بدن سے منتقل ہو کر برزخی بدن کے ساتھ تعلق تدبیری برقرار کرے۔

ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ابوبصیر کہتا ہے میں نے امام صادق سے مومنین کی ارواح کے بارے میں سوال کیا تو حضرت نے جواب میں فرمایا: مومنین کی ارواح بہشتی گھروں میں ہیں وہاں غذا کھاتی ہیں اور پیتی ہیں اور ہمیشہ یہ کہتی رہتی ہیں: خدایا! قیامت برپا کردے اور اپنے وعدے پورے کردے۔[۱]

۲۔ نیز حضرت نے مشرکین کی ارواح کے بارے میں فرمایا: وہ آگ کے عذاب میں مبتلا ہیں اور ہمیشہ کہتی ہیں: خدایا! قیامت برپا نہ کرنا اور ہمارے بارے میں اپنے وعدے پورے نہ کرنا۔[۲]

قبر میں سوال

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے قبر کے ایک ظاہری معنی ہیں یعنی وہ گڑھا جس میں انسان کو دفن کیا جاتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ جو قبر کے احکام مثلاً سوال و جواب اور فشارِ قبر وغیرہ ذکر کیا گیا ہے وہ اسی عنصری اور خاکی بدن سے تعلق رکھتا ہے۔ روایات میں وارد ہوا ہے کہ:

۱۔ قبر بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔
واضح ہے کہ خاکی اور حسی قبر یہ وصف نہیں رکھتی لہٰذا قبر سے مراد یہاں کچھ اور ہوگا۔

۲۔ کسی نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ میں نے آپؑ سے سنا ہے کہ ہمارے سب شیعہ بہشت میں ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: صحیح ہے۔ اس نے کہا: اکثر شیعہ گناہ کبیرہ کرتے ہیں۔ تو حضرتؑ نے فرمایا: آخرت میں پیغمبر اکرمؐ یا وصی کی شفاعت انہیں میسر آئے گی۔ آپؑ نے مزید فرمایا: خدا کی قسم! میں تم پر برزخ سے ڈرتا ہوں۔ اس نے کہا: برزخ کیا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا:

القبر منذ حين موته الى يوم القيامة (بحار جلد ٦، باب احوال برزخ

حديث ١١٦)

''برزخ سے مراد انسان کی قبر ہے موت سے قیامت تک''

یہ برزخ عمومیت رکھتی ہے لہٰذا ایسی ہونی چاہیے، جو سب انسانوں کے لیے ہو سکے۔ چاہے کوئی درندے کی غذا بن گیا ہو یا پانی میں غرق ہو گیا ہو یا آگ میں جل گیا ہو۔ چاہے کوئی قبر میں خاک میں تبدیل ہو گیا ہو اور طوفان اس کی مٹی کو ادھر اُدھر بکھیر چکا ہو۔ مسلماً وہ سب قبر کے نام سے برزخ رکھتے ہیں۔ پس وہ قبر کہاں ہے؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر سے مراد یہ خاکی قبر نہیں ہے بلکہ ایسی قبر ہے جو سب لوگوں کے

---

[۱] بحار الانوار جلد ٦، باب احوال برزخ ص ٢٦٩، حدیث ١٢٢ ص ٢٧٠، حدیث ١٢٦

[۲] یہ روایت امام سجادؑ سے ہے اور برزخ سے مراد حضرت نے ھوالبقر فرمایا ہے۔ واللہ ان القبرلر وضة من رياض الجنة اوحفرة من حضر النار۔ (بحار، جلد ٦، باب سکرات موت حدیث ١٩)

لیے مناسبت رکھتی ہے۔

اب جبکہ کسی حد تک قبر کی حقیقت معلوم ہوگئی مختصر طور پر قبر کے سوال و جواب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مسلم متکلمین و محدثین کی آرا نقل کرتے ہیں:

شیخ صدوق فرماتے ہیں: سوال قبر کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ حق ہے اور جو بھی صحیح جواب دے لے گا اس کے لیے قبر میں شادمانی اور آخرت میں بہشت ہوگی اور جو بھی صحیح جواب نہ دے سکا اسے قبر اور آخرت میں عذاب کیا جائے گا۔ (بحار جلد ۶، ص ۲۷۹)

شیخ مفید فرماتے ہیں: پیغمبر اکرمؐ سے صحیح روایات وارد ہوئی ہیں کہ ملائکہ قبر میں آئیں گے اور اہل قبر سے دین کے بارے میں سوال کریں گے۔ بعض روایات میں آیا کہ ان دو فرشتوں کو منکر و نکیر کہا جاتا ہے جو مرنے والے کے پاس آئیں گے اور خدا، رسول اور امام کے بارے میں سوال کریں گے اور دین کے بارے میں پوچھیں گے۔ اگر جواب ٹھیک دے دیا تو اسے ملائکہ نعمت و شادمانی کے حوالے کردیں گے ورنہ اسے ملائکہ عذاب کے حوالے کردیں گے۔ (تصحیح الاعتقاد، ص ۴۵)

محقق طوسیٰ فرماتے ہیں: قبر میں عذاب واقع ہوگا کیونکہ یہ ایک ممکن کام ہے اور نقلی ادلہ تواتر کی حد تک اس پر قائم ہیں (کشف المراد مقصد ۶ مسئلہ ۱۴)

سوال قبر و فشار قبر ایک ایسا مسئلہ ہے جسے تمام اسلامی فرقے قبول کرتے ہیں، سوائے ایک شخص بنام ضرار کے۔

احمد ابن حنبل اہل حدیث کے عقائد بیان کرتے ہوئے ایک رسالے میں لکھتے ہیں:

''عذاب قبر حق ہے اس میں لوگوں کے گناہوں، خدا اور بہشت و دوزخ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور منکر و نکیر (جو دو فرشتے ہیں) بھی حق ہیں''۔ [۱]

ابوالحسن اشعری کہتا ہے ہم عذاب قبر، منکر و نکیر اور اُن کا مردوں سے سوال کرنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ [۲]

معتزلہ کے ایک سربراہ قاضی عبدالجبار جو پانچویں صدی ہجری میں تھے کہتے ہیں: امت میں عذاب قبر کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا، صرف ایک آدمی بنام ''ضرار ابن عمرو'' اس کا منکر ہے۔ وہ کچھ مدت کے بعد ہمارے گروہ سے جدا ہوکر مجبرہ کے ساتھ جاملا اور اگر ابن راوندی نے ایسی نسبت (انکار سوال قبر وغیرہ) ہماری طرف دی ہے تو اسی وجہ سے ہے۔ [۳]

یہ عقیدہ متواتر احادیث سے استفادہ کیا گیا ہے سب کہتی ہیں کہ مرنے والوں سے سوال کیا جائے گا اور روایات میں سوائے ایک دو

---

[۱] طبقات الحنابلہ ا، ص ۲۲۶ مصنفہ قاضیٔ ابوالحسن محمد ابن ابی یعلی۔ اس کتاب میں یہ رسالہ نقل ہوا ہے اور جدا بھی کتاب السنہ کے نام سے چھپا ہے۔

[۲] ابانہ، ص ۲۷

[۳] شرح الاصول الخمسہ، ص ۷۳۰

روایات [1] کے کوئی ایسی موجود نہیں جو یہ تصریح رکھتی ہو کہ قبر میں مادی بدن اٹھے گا اور سوالات کے جوابات دے گا۔ لیکن وہ آیات جو انسانوں کے لیے برزخی زندگی کو ثابت کرتی ہیں ان پر توجہ کرنے سے نیز برزخ والی روایات جو ذکر ہو چکی ہیں جن کے ذریعے ثابت ہو گیا ہے کہ قبر و برزخ ایک ہی چیز ہے، ان پر توجہ کرنے سے یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ قبر میں سوال، فشار اور عذاب وغیرہ سب کے سب مادی بدن کے بجائے کسی اور بدن سے مربوط ہیں ایسا بدن جو حیات برزخی سے مناسبت رکھتا ہو متکلمین کی اصطلاح میں اسے برزخی یا مثالی قالب کہا جاتا ہے اور روایات میں یہی تعبیر وارد ہوئی ہے۔ [2]

سابقہ مطالب سے تین باتیں واضح ہو گئیں:

۱۔ قبر کی حقیقت برزخ ہی ہے۔

۲۔ قبر میں عذاب، سوال اور فشار کو تقریباً تمام اسلامی متکلمین قبول کرتے ہیں۔

۳۔ سوال و عذاب قبر مثالی بدن سے مربوط ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مسئلہ سوال قبر بہت سی روایات میں وارد ہوا ہے۔ ان روایات میں جو زیادہ اہم مطالب بیان کئے گئے ہیں یہ ہیں:

۱۔ وہ چیزیں جن کے بارے میں سوال ہوگا۔

۲۔ وہ لوگ جن سے سوال کیا جائے گا۔

ہم یہاں پر ان روایات کو بطور نمونہ ذکر کرتے ہوئے اس بحث کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

کن چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا؟

۱۔ ایک روایت میں ہے کہ امام سجاد علیہ السلام ہر جمعہ لوگوں کو موعظہ فرماتے تھے ایک موقع پر فرمایا: اے ابن آدم! موت سے مت غافل ہو، بہت جلدی تمہاری روح قبض کر لی جائے گی اور تم ایک گھر کی طرف منتقل کر دیے جاؤ گے پھر تمہاری روح تمہیں لوٹا دی جائے گی۔ اور دو فرشتے بنام ''منکر و نکیر'' سوال کے لیے تمہارے پاس آئیں گے۔ سب سے پہلے تم سے وہ تمہارے پروردگار کے بارے میں سوال کریں گے اس کے بعد اس رسول کے بارے میں جو تمہاری طرف بھیجا گیا، اس دین کے بارے میں جسے تم نے قبول کیا، تمہاری زندگی کے بارے میں کہ کہاں

---

[1] بحار جلد ۶ ص ۲۲۲، حدیث ۲۲، و ص ۲۲۴، حدیث ۲۵

[2] بحار جلد، ص ۲۶۸، حدیث ۱۱۹ از امام صادق ولكن فى ابدان كابدانهم اور حدیث ۱۲۴ میں ہے۔ فاذا قبضها الله عزوجل صير تلك الروح فى قالب كقالبة فى الدنيا فيا كلون و يشربون اور حدیث ۳۲ میں ہے۔ فاذا قبضه الله صير تلك الروح الى الجنة فى صورة كصورته

خرچ کی اور مال ودولت کے بارے میں کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا۔[1]

۲۔ حضرت امیر المومنین سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا:

جب انسان کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے دو فرشتے بنام منکر ونکیر آتے ہیں ان کا پہلا سوال رب کے بارے میں ہوتا ہے اس کے بعد پیغمبر اور ولی کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اگر جواب صحیح دے دیا تو نجات پا جائے گا ورنہ معذب ہوگا۔ (بحار ج ۶ ص ۲۳۳، حدیث ۴۶)

کن لوگوں سے سوال کیا جائے گا؟

اس بارے میں بھی متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔

۱۔ ابوبکر حضرمی کہتا ہے میں نے امام محمد باقرؑ سے سنا کہ حضرت نے فرمایا:

''قبر میں سوال نہیں ہوگا مگر ان لوگوں سے جو خالص مومن ہوں یا خالص کافر کہتا ہے میں نے پوچھا پس دوسرے لوگوں کی کیا صورت حال ہوگی؟ تو حضرت نے فرمایا: انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا''[2]

۲۔ محمد ابن مسلم کہتے ہیں امام صادق نے فرمایا:

لا یسئل فی القبر الا من محض الایمان محضا و محص الکفر محضا (بحار جلد ۶، ص ۲۶۰، حدیث ۱۰۰)

''محض ایمان ومحض کفر کا مطلب یہ ہے کہ وہ فکری لحاظ سے مستضعف نہ تھے اور اپنے لیے ایک عقیدہ (کفر یا ایمان) انتخاب کر چکے تھے''

روایات میں اخلاقی وسبق آموز مطالب مذکور ہیں۔ فشار قبر اور اس کے عوامل کے بارے میں نیز نیک کاموں اور ولایت اہل بیت کی تاثیر سعادت اور قبر میں آرام وراحت کے لحاظ سے بھی روایات وارد ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی تحقیق کے لیے ایک جداگانہ رسالے کی ضرورت ہے۔ ہم قبر وبرزخ سے مربوط ایک سوال اور اس کے جواب کے ذکر کے ساتھ اس موضوع پر اپنی گفتگو تمام کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ عالم برزخ میں روح کا مثالی بدن کے ساتھ تعلق (جو روایات وعقیدہ متکلمین کے ذریعے ثابت ہے) تناسخ ہے؟ لیکن یہ خیال فاسد ہے چونکہ روح کا مثالی بدن کے ساتھ تعلق تناسخ سے کوئی ربط نہیں رکھتا اس لیے کہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد روح دوبارہ اس عالم کی طرف لوٹے گی اور نباتی خلیے یا حیوانی نطفہ یا انسانی جنین کے ساتھ تعلق قائم کرے گی اور ترقی کرتے کرتے پھر انسان کامل بن جائے گی۔ واضح

---

[1] بحار جلد ۶، ص ۲۲۳ باب احوال برزخ حدیث ۲۴

[2] بحار جلد ۶، ص ۲۳۵ حدیث ۵۲ ابوبکر حضرمی اس مضمون کی روایت امام صادق سے بھی نقل کرتا ہے اور عبداللہ بن سنان امام صادق سے وابن بکیر امام محمد باقر سے اسی مضمون کو نقل کرتے ہیں۔ در ص ۲۶۰، حدیث ۹۸۔۹۹

سی بات ہے کہ لوٹنے کا یہ طریقہ حکمت الٰہی کے منافی ہے کیونکہ اس طریقے کے مطابق انسان ترقی کرتے کرتے جب موجود کامل بن جائے گا پھر واپس اپنی پہلی حالت پر لوٹ جائے گا۔ یہ طریقہ ایک مسلّم فلسفی اصول کے منافی ہے اور وہ یہ کہ فعلیت سے قوہ کی طرف نہیں لوٹا جا سکتا اور مسلماً روح کا مثالی بدن کے ساتھ تعلق میں یہ اشکال نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ مثالی بدن کمال کے لحاظ سے ہم آہنگ و مناسب ہے روح کے ساتھ لہٰذا یہ تعلق روح کے فعلیت سے قوہ کی طرف لوٹنے کا موجب بھی نہیں بنے گا۔ حتیٰ کہ بعض فلاسفہ تو اس کے بھی معتقد ہیں کہ یہ بدن (مثالی) خود نفس (روح) کا خلق کردہ ہے۔ روح اس جہان یا دوسرے جہان میں خالقیت کی ایک خاص قدرت رکھتی ہے وہ اس بدرن کو تصور کے ذریعے خلق کرتی ہے اور قیامت کے متحقق ہونے تک اسی بدن کے ساتھ رہتی ہے۔

١٦۔قیامت کی علامات

اشراط الساعة

علما قرآن کی پیروی کرتے ہوئے ایک مسئلہ بنام"اشراط الساعۃ"بیان کرتے ہیں جس سے مراد قیامت کی علامت ہیں۔

علامات قیامت دو قسم کی ہیں:

١۔ وہ حوادث جو قیامت سے پہلے اور نظام خلقت کے ختم ہونے سے پہلے واقع ہوں گے اور لفظ اشراط زیادہ تر اس قسم کے واقعات و حوادث کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

٢۔ وہ حوادث جن کی وجہ سے نظام خلقت تباہ ہوجائے گا ان میں سے اکثر سورہ تکویر، انشقاق اور زلزلہ میں ذکر کئے گئے ہیں۔[1]

پہلے ہم"اشراط الساعۃ"کو بیان کرتے ہیں اور دوسری قسم میں مشاہد الساعہ کو بیان کریں گے۔

اشراط الساعہ یعنی قیامت کی نشانیاں یہ لفظ قرآن میں بھی وارد ہوا ہے اور روایات میں بھی پہلے ان قرآنی آیات کی تحقیق کرتے ہیں جن میں یہ لفظ (اشراط) وارد ہوا ہے۔ یہ کل سات آیتیں ہیں:

١۔ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ ﴿١٨﴾ (محمد:١٨)

"کیا وہ ایمان لانے میں کسی چیز کے انتظار میں ہیں سوائے قیامت کے کہ اچانک آجائے (اور وہ ایمان لے آئیں) کہ دو قیامت کی نشانیاں آچکی ہیں، جب قیامت آجائے گی تو پھر کب ان کا ایمان انہیں فائدہ دے گا"۔

اشراط"شرط"بروزن صدف کی جمع ہے جو علامت کے معنی میں آتا ہے۔ ابن منظور لسا العرب میں کہتے ہیں:

"شرط بفتح را علامت کے معنی میں ہے۔ اس کی جمع اشراط ہے اور اشراط الساعۃ یعنی قیامت کی نشانیاں" (لسان العرب جلد ٧، مادہ شرط، ص ٣٢٩)

جبکہ شرط (صبر کے وزن پر) کا معنی وہ چیز ہے جس کے ساتھ کسی شے کا وجود وابستہ ہو۔ اس کی جمع شروط و شرائط ہے اور آیت میں اشراط کے یہ دوسرے معنی کرنا درست ہے۔

---

[1] قرآن مجید کی سورہ ہائے ٨١، ٨٢، ٨٤ اور ٩٩ کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس جیسے حوادث کو شاہد الساعہ کہا جاتا ہے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کی کچھ علامتیں واقع ہو چکی ہیں اب وہ کون سی علامات ہیں یہ آیت یا کوئی دوسری آیت اس بارے میں روشنی نہیں ڈالتی۔ لیکن مفسرین کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا بعثت انا والساعۃ کھا تین"[1] میں مبعوث کیا گیا ہوں اس حالت میں کہ میں اور قیامت میں دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہیں۔ یعنی میری بعثت اور قیامت میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعثت پیغمبر کو کس طرح قیامت کی علامات میں سے شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ ان میں بہت زیادہ فاصلہ موجود ہے؟

جواب یہ ہے کہ باقی ماندہ عمر کا اس کی گذشتہ عمر سے موازنہ کرنا چاہیے اور اگر یہ عالم اپنے بڑھاپے کے دن گزار رہا ہے تو طبعی طور پر بہت سی عمر گزار چکا ہے اور بہت کم عمر اس کی باقی رہ گئی ہے۔ اس نسبت کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ قیامت آنے میں زیادہ دقت باقی نہیں۔ البتہ ممکن ہے پیغمبر اکرمؐ کے کلام میں کوئی دوسرا نکتہ بھی پنہاں ہو جو ہمیں معلوم نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں اشراط سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے چاند کا دو ٹکڑے ہونا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿١﴾ (قمر: ۱)

"بعض نے اسے آخری آسمانی کتاب قرآن کے نزول پر منطبق کیا ہے"

بہر حال یہ آیت قاطعانہ حکایت کر رہی ہے کہ قیامت کی کچھ علامتیں واقع ہو چکی ہیں۔

۲۔ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿٩٨﴾ (کھف: ۹۸)

ذوالقرنین نے کہا: اس قسم کی دیوار بنانا جو یاجوج و ماجوج کو روک لے میرے رب کی رحمت ہے جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا تو اسے میرا رب تباہ کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے اور قطعی ہے۔

اس آیت میں اُس دیوار کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے بنائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ قیامت تک یہ دیوار باقی و پائیدار رہے گی۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس دیوار کی تباہی قیامت کی دو قسم کی علامتوں میں سے کس قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ آیا پہلی قسم سے ہے کہ جب ابھی تک نظام کائنات صحیح و سالم ہو گا یہ دیوار تباہ ہو جائے گی یا دوسری قسم سے ہے کہ جب سب چیزیں تباہ ہوں گی یہ بھی تباہ ہو جائے گی۔ یعنی اشراط الساعہ سے ہے یا مشاہد الساعہ ہے؟ لیکن ایک اور آیت کے ذریعے اس ابہام کو دور کیا جا سکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ

---

[1] مجمع البیان جلد ۵، ص ۱۰۲

كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝۹۷ (انبیا: ۹۶، ۹۷)

''جب یاجوج وماجوج کی راہ کھول دی جائے گی تو وہ ہر بلندی سے اُترے ہوئے آئیں گے۔ اس وقت وعدہ خدا نزدیک ہوگا۔ اس وقت کافروں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی''۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یاجوج وماجوج دیوار گرنے کے بعد اپنے وہی پہلے جیسے کام کریں گے۔ اور بلندیوں سے متمدن دنیا کی طرف بڑھیں گے۔ طبعی طور پر وہ اپنی پہلی والی فسادی طبیعت کے مطابق عمل کریں گے۔ اس مطلب کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ علامت اشراط الساعہ سے تعلق رکھتی ہے۔

اس آیت میں جملہ "حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج" پہلی آیت کے جملہ "فاذا جآء وعد ربی جعله دکاء" کے مضمون کو ادا کر رہا ہے اور دونوں جملے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان دو آیات کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سد یاجوج و ماجوج کی تباہی پہلی قسم (اشراط الساعة) سے تعلق رکھتی ہے۔

۴۔ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۝۶۱

(زخرف: ۶۱)

''عیسیٰ ؑ تحقیق قیامت کے بارے میں ذریعہ آگاہی تھے اور اس بارے میں شک نہ کرو۔ میری پیروی کرو اور یہی صراط مستقیم ہے''۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے مشرکین سے فرمایا تم اور تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہوں گے۔[1] تو مشرکین نے اعتراض کیا کہ ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ ؑ کا کیا بنے گا۔ کیونکہ انہیں بھی عیسائی پوجتے ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں چند آیات میں کچھ مطالب بیان فرماتا ہے۔ ایک ان میں سے یہی آیت ہے اور وہ یہ ہے کہ مسیح میں الوہیت کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس کا وجود قیامت سے آگاہی کے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔

البتہ مشہور قرآت میں آیت علم بروزن حلم ہے یعنی ذریعہ آگاہی جبکہ بعض اسے علم (سلف کے وزن پر) پڑھتے ہیں یعنی علامت یعنی وجود عیسیٰ علامت قیامت ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ وجود عیسیٰ ؑ کب قیامت کی علامت ہے؟ آیا جب وہ ماں سے متولد ہوئے کا کسی اور دن؟

روایات کہتی ہیں کہ عیسیٰ ؑ حضرت مہدی ؑ کے ظہور کے وقت آسمان سے اتریں گے اور اس وقت ان کا وجود قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا۔ اس مورد میں شیعہ وسنی کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

---

[1] انکم و ما تعبدون من دون الله حصب جهنم (انبیا: ۹۸)

''تمہارے لیے کیسا ہوگا؛ جب ابن مریمؑ تمہارے درمیان آئے گا اور تمہارے اس امام کی اقتدار کرے گا جو خود تم سے ہوگا''۔ [1]

اس آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا وجود خود ایک قسم کا معجزہ تھا۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا جوان کا ایک معجزہ تھا۔ امکان قیامت کے دلائل میں سے ہے کیونکہ قیامت بھی ایسا ہی ایک بڑا معجزہ ہے جس میں مردے زندہ ہوں گے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود اور ان کے معجزہ کو دیکھتے ہوئے امکان قیامت میں شک نہیں کرنا چاہیے۔ اس احتمال کی بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ مسیحؑ کی پوری زندگی قیامت کے امکان پر دلائل میں سے ایک دلیل تھی کیوں اس (مسیحؑ) کے بارے میں شک کرتے ہیں اگر اس کی ذات میں فکر کرنا چاہتے ہو تو اس جہت سے کرو نہ کہ اُس جہت سے کہ وہ معبود ہے یا خدا ہے۔

اسی دوسرے احتمال کا موید آیت کا یہ جملہ (فلا تمترن بھا) بھی ہے اس میں قیامت میں شک نہ کرنے کو عیسیٰؑ کے وجود پر متفرع کیا گیا ہے۔ اور یہ جملہ پہلی تفسیر کے بھی منافی نہیں چونکہ اگر کسی وقت میں موجود عیسیٰؑ قیامت کی علامت ہو تو علامت کے دیکھنے سے ذوالعلامت (قیامت) میں شک نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ⑩ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑪ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ⑫ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ⑬ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ⑭ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ⑮ (دخان:۱۰ تا ۱۵)

''اس دن کا انتظار کرو جس دن آسمان بالکل دھواں بن جائے گا جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا اور یہ دردناک عذاب ہے۔ لوگ کہیں گے: خدایا! ہم سے عذاب دور فرما ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہ تذکر و یاد آوری انہیں کب فائدہ دے گی۔ حالانکہ ہماری طرف سے واضح رسول آیا انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور کہا کہ اسے سکھایا گیا ہے یہ مجنون ہے۔ ہم تھوڑا سا عذاب دور کریں گے اور پھر تم اپنے اعمال کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

اس آیت کے بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

ا۔ جتنے حوادث کا تذکرہ اس آیت میں ہوا ہے سب کے سب اشراط الساعہ سے مربوط ہے یعنی قیامت کے برپا ہونے سے پہلے آسمان دھواں ہو جائے گا اور لوگ دعا مانگنے لگیں گے اور اس دھوئیں کے برطرف ہونے کی درخواست کریں گے۔ خطاب ہوگا: تم نے ہمارے پیغمبر کی باتوں پر توجہ نہ کی اور اس پر دیوانہ یا غیر خدا کا سکھایا ہوا ہونے کی تہمت لگائی، ہم کچھ عذاب تم سے دور کریں گے لیکن پھر تم اپنے بد اعمال کی

[1] باب الاصول جلد ۱۱ ص ۷۴، باب اشراط قیامت حدیث ۷۸، ۷

طرف لوٹ جاؤ گے۔

بعد والی آیت بھی اس احتمال کی تائید کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ إِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿١٦﴾ (دخان: ١٦)

''اس دن ہم اپنے سخت غضب کا اظہار کریں گے اور انتقام لے لیں گے''۔

مسلّم طور پر اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ اس کا وصف ''کبریٰ'' بیان کیا گیا ہے اور قرآن میں قیامت اور اس کے عذاب کو ''اکبر'' و ''کبریٰ'' سے توصیف کیا گیا ہے۔[1]

ایسی صورت میں تناسب اسی میں ہے کہ پہلے والے حوادث قیامت کے دن پہلے سے مربوط ہوں کہ لوگ اس دن بھی عذاب الٰہی سے عبرت نہیں پکڑیں گے خدا کے ساتھ کفر کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ عذاب الٰہی اُنہیں آ لے گا۔ درحقیقت ان آیات نے مجموری طور پر دو قسم کے دن (یوم) کی بات کی ہے:

١۔ يوم تأتي السماء

٢۔ يوم بنطش البطشة الكبرىٰ

پہلا یوم اشراط ہے اور دوسرا قیامت کا دن ہے۔

٢۔ آیت میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت رسالت کے مکی زمانے سے مربوط ہے کہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی تکذیب اور لجاجت کی وجہ سے مورد نفرین و عذاب قرار پائے اور آنحضرتؐ نے فرمایا: ''حضرت یوسفؑ والے برسوں کی طرح اس قوم کی قسمت میں بھی سال لکھ دے'' اور آنحضرتؐ کی یہ دعا مقبول ہوگئی جس کی وجہ سے خشک سال (قحط) پیش آ گئی اور مشرکین قریش بھوک میں مبتلا ہو گئے۔ بھوک کی وجہ سے انہیں ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا اور مردار اور ہڈیاں کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آ کر کہنے لگے:

''آپ تو صلہ رحمی کا درس دیتے ہیں جبکہ آپ کا قبیلہ تباہ و نابود ہو رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے خدا سے عذاب برطرف کرنے کی درخواست کی اور عذاب برطرف ہوگیا لیکن وہ لوگ پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے''۔[2]

١۔ آیت میں صریحاً موجود ہے یوم تاتی السماء (جس روز آسمان دھواں لائے گا) اور حقیقتاً دھواں آسمان کو ڈھانپ لے گا لہٰذا یہ کہنا کہ دھواں تو نہیں تھا بھوک کی وجہ سے ان کو دھواں نظر آتا تھا یہ ظہور آیت کے موافق نہیں ہے۔

٢۔ سیرت کی کتب میں سے کسی میں ایسا واقعہ نقل نہیں کیا گیا۔ اصولی طور پر اس قسم کی بددعا اتنی خلقت کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی رحمت واسعہ کے موافق بھی نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے تو جنگ احد میں بھی بددعا نہ کی تھی جس میں ان کی پیشانی زخمی ہوگئی تھی اور دندان مبارک شہید ہو

---

[1] فاذا جآءت الطامة الكبرى (نازعا ٣٤) فيعذبه الله العذاب الا كبر (غاشيه: ٢٤)

[2] مجمع البیان جلد ۵، ص ٦٢

گئے تھے پھر کیوں مکہ میں بددعا کرنے لگے جہاں ابھی تک لوگوں کی اذیت رسانی اس حد تک نہیں پہنچتی تھی۔

اگر یہ تفسیر صحیح مان لیں تو پھر دو یوم سے مراد یہ ہوگا:

یوم تاتی السماء یعنی پیغمبر اکرمؐ کے مکی زندگی کے ایام اور یوم نبطش یعنی جنگ بدر کا دن جس دن عرب کے بڑے بڑے سور ما مارے گئے تھے۔

۶۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ (نمل: ۸۲، ۳۸)

"جب عذاب ان پر حتمی ہو گیا تو ایک حرکت کرنے والے کو ہم زمین سے نکالیں گے جو اُن سے بات کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر ایمان نہیں لاتے اور ایک دن آئے گا جس دن ہر قوم میں سے اس گروہ کو اٹھائیں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتا تھا جب کہ اُسے روک لیا جائے گا۔

آیت میں کچھ ابہام پائے جاتے ہیں پہلے انہیں ذکر کر دیا جائے:

۱۔ "وقع القول علیهم" سے کیا مراد ہے؟

۲۔ "دابہ" جو زمین سے نکلے گا کیا ہے؟ انسان یا حیوان؟

۳۔ وہ لوگوں سے کیا بات کرے گا؟

۴۔ ایاتنا سے مراد کون سی آیات ہیں آیا تکوینی آیات مراد ہیں جو خدا کی صفات جلال و جمال کو بیان کرتی ہیں یا معجزات انبیا مراد ہیں یا آیات قرآن میں مراد ہیں؟

۵۔ اخراج دابہ اور اس کے بولنے کا ہدف کیا ہے؟ کیا خدا چاہتا ہے کہ اس معجزے سے سخت دل کفار کو مومن بنا دے یا دابہ کے بولنے کا مقصد یہ ہے کہ کافر پشیمان ہو جائیں کیونکہ ان حالات میں وہ سمجھ لیں گے کہ اب ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں رکھتا؟

۶۔ معنی کے لحاظ سے "ان الناس کانوا بایاتنا" کا کیا محل ہے؟ کیا اس عذاب کی علت ہے جو "وقع القول علیهم" سے سمجھا گیا ہے یا یہ جملہ "دابہ" کی لوگوں سے گفتگو کو بیان کر رہا ہے یعنی اس دن مشرکین ومخالفین کی حالت کو بیان کر رہا ہے؟

یہ ابہامات ہیں جو اس آیت میں پائے جاتے ہیں ان میں سے کچھ تو قابل رفع ہیں لیکن کچھ ابھی تک اپنے ابہام پر باقی ہیں۔ بقول علامہ طباطبائی مرحوم قرآن میں کوئی دوسری ایسی آیت بھی نہیں ہے جو ان میں سے کچھ ابہامات کو دور کر دے۔ [1]

---

[1] المیزان جلد ۱۵، ص ۴۳۴

پہلا ابہام

"وقع القول علیھم" سے کیا مراد ہے؟ کہا جا سکتا ہے اس سے مراد ان کے عذاب کا حتمی ہونا ہے اور بعد والی آیات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ﴿۸۵﴾ (نمل: ۸۵)

"ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر عذاب یقینی ہو گیا وہ بولنے کی قدرت نہیں رکھتے"

البتہ یہاں پر قول سے مراد قول لفظی نہیں ہے بلکہ قول تکوینی ہے۔ دوسری آیات میں اسے "کن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ قول تکوینی عذاب الٰہی ہی ہے جو ان پر قطعی و یقینی ہو گیا۔

دوسرا ابہام

دابہ سے کیا مراد ہے؟ قرآن اور لغت عرب میں "دابہ" حرکت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ چاہے حیوان ہو چاہے انسان۔ یہ جو جہاں پر لفظ "دابہ" کا استعمال ہوا ہے اس کی مناسبت سے اور اس کا غالب استعمال بھی حیوان میں ہوتا ہے اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "دابہ" سے مراد غیر انسان ہے۔ اس کا زمین سے نکلنا اور پھر بولنا خارق العادۃ ہو گا لیکن اس عقیدہ کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ خصوصاً روایات میں اس آیت کی تفسیر کچھ اور بھی وارد ہوئی ہے۔

تیسرا ابہام

دابہ لوگوں سے کیا کہے گا؟ ممکن ہے کہا جائے کہ "دابہ" کا قول بعد والا جملہ ہی ہے یعنی "ان الناس کانوا بایاتنا لا یوقنون" اس جملے کے ساتھ وہ دابہ آیات الٰہی کے مقابلے میں کفار کے انکار کی خبر دے گا۔

چوتھا ابہام

آیات سے کیا مراد ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں:

۱۔ تکوینی آیات مراد ہوں مثلاً عظیم نظام خلقت جو خدا کے علم و قدرت کی حکایت کرتا ہے۔

۲۔ انبیا کے معجزات مراد ہوں جو وہ لوگوں پر اتمام حجت کے لیے لائے تھے۔

۳۔ آسمانی کتب مراد ہوں جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔

آخری احتمال پر شاہد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کچھ لوگوں کی آیات الٰہی پر ایمان لانے کی وجہ سے تعریف کرتا ہے اور سیاق آیات کو دیکھتے

ہوئے پتہ چلتا ہے کہ وہاں آیات سے مراد آسمانی کتاب ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ (سجدہ: ۲۳)

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّةً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ۟ؕ وَکَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾

(سجدہ: ۲۴)

''ہم نے بنی اسرائیل میں سے ایسے امام بنائے جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے تھے چونکہ انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے''۔

پانچواں ابہام

دابہ کے اخراج کا ہدف کیا ہے؟ اس بارے میں آیات سے کوئی مطلب حاصل نہیں ہوتا لیکن احتمال یہی ہے کہ یہ کام مومنین و کافرین کو جدا کرنے اور کفار کے دل میں حسرت پیدا کرنے کے لیے کیا جائے گا۔

چھٹا ابہام

''ان الناس کانوا بآیتنا لا یوقنون'' سے متعلق تھا اس بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ یہ اسی دابہ کا کلام ہو جو زمین سے نکلے گا۔

۲۔ یا اسی مطلب کی علت و تعلیل ہو جو ابتدائے ذیت میں ذکر کیا گیا۔ یعنی سوال کیا جائے کہ کیوں ان پر عذاب قطعی ہو گیا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ ہٹ دھرم تھے اور آیات الٰہی پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

یہاں تک کہ پہلی آیت کا بیان تھا۔ دوسری آیت بھی ہر امت میں سے ایک گروہ کے اٹھائے جانے کی گواہی دے رہی ہے۔ کہتی ہے:

''ویوم نحشر من کل اُمۃٍ فوجاً کیونکہ اس آیت نے صرف خاص گروہ کے اٹھائے جانے کی بات ہے لہٰذا قیامت سے قطعاً مربوط نہیں ہے کیونکہ قیامت کے دن تو سب لوگ محشور ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَّحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ (کهف: ۴۷)

''ہم سب کو قیامت کے دن محشور کریں گے اور کسی کو نہیں چھوڑیں گے''

لہٰذا جب ایک خاص گروہ کے زندہ کرنے کی بات ہوگی تو یہ واقعہ قیامت سے پہلے ہوگا۔

ان آیات کے بارے میں بیان شدہ توضیحات کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دو آیات میں قیامت کی دو نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ خروج دابہ اور اس کا لوگوں سے کلام کرنا

۲۔ کچھ لوگوں کا زندہ ہونا

اس پر بات شاہد کہ یہ حادثے قیامت سے پہلے واقع ہوں گے یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسی سورہ نمل کی آیت نمبر ۸۷ میں خود قیامت کے برپا ہونے کو بیان کیا ہے۔فرماتا ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (سورہ نمل: ۸۷)

جس ''دن صور پھونکا جائے گا جو بھی زمین و آسمان میں ہیں مر جائیں گے''

اب سیاق آیات پر توجہ کیجیے۔ پہلے ''خروج دابہ'' کا ذکر ہے۔ پھر ہر امت میں سے ایک گروہ کے زندہ ہونے کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد اس دن کا ذکر ہے جس دن صور پھونکا جائے گا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام آیات قیامت سے مربوط مسائل کو بیان کر رہی ہیں۔ دو حادثے قیامت سے پہلے واقع ہوں گے اور تیسرا قیامت برپا ہونے کے دن۔ بہر حال ہم نے ان آیات کی تفسیر کے لیے خود ان آیات کے سیاق و سباق اور دوسری آیات سے مدد لی ہے اور جو لوگ ان آیات کی ذرا وسعت سے تحقیق کرنا چاہیں اس بارے میں وارد شدہ روایات کی طرف مراجعہ کریں جو کچھ ابہامات کو دور کر سکتی ہیں۔ [1]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(انعام: ۱۵۸)

''وہ لوگ جو صرف یہ انتظار کر رہے ہیں کہ ملک الموت ان کی طرف آئے یا خود خدا آئے یا رب کی کچھ نشانیاں آئیں۔ جس دن رب کی کچھ نشانیاں آ گئیں اس دن کسی کا ایمان جو پہلے ایمان نہیں لا یا یا عمل صالح انجام نہیں دیا اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ ان سے کہہ دو: منتظر رہیں ہم بھی انتظار کر رہے ہیں''۔

اس آیت اور اس سے پہلے والی آیات کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کفار کے عناد اور ڈھٹائی کی خبر دے رہا ہے کہ وہ لوگ

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳، ص ۲۰۹ تا ص ۲۱۱ تفسیر طبری جلد ۲۰، ص ۱۰، ۱۲ در منثور جلد ۵، ص ۱۱۱۶ کی طرف رجوع کیا جائے۔

بالکل ایمان نہیں لائیں گے وہ لوگ ایسے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس دن ایمان لانا ممکن نہیں ہے اور اگر ممکن ہو تب بھی فائدہ مند نہیں ہے۔

وہ لوگ تین چیزوں میں سے کسی ایک کے منتظر ہیں:

۱۔ فرشتے ان کی طرف آئیں لیکن وہ جان لیں کہ فرشتے ان پر عذاب لے کر ہی نازل ہوں گے۔[1]

۲۔ خود خدا ان کے پاس آئے اور اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ لیں۔ یہ انتظار بے ہودہ و باطل ہے اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد قیامت کا آنا ہو جس دن کافروں کی آنکھوں پر سے حجابات اٹھ جائیں گے اور پروردگار اپنی صفات جلال و جمال کے ذریعے سب پر آشکار و واضح ہو جائے گا اور اس کی ذات کے بارے میں کسی کے لیے کوئی خفا و پردہ نہیں رہے گا۔

یعنی اس کی توحید اور علم و قدرت اسی طرح واضح ہو جائیں گی کہ کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہے گی اگرچہ یہ ہو تو طبعی طور پر ایمان اس دن فائدہ نہیں دے گا۔

۳۔ وہ لوگ خدا کی کچھ علامات کے منتظر ہیں جو وقوع قیامت کی خبر دیں گی۔

یہ آیات کون سی ہیں اس بارے میں دو احتمال ہیں:

(الف) مراد اشراط الساعہ ہے۔ ان میں سے ایک خروج دابہ ہے۔

(ب) مراد خود قیامت کے حوادث ہیں۔ مثلاً نظام خلقت کا نابود ہو جانا۔

اس صورت میں جو لوگ پہلے ایمان نہیں لائے ان کا اس وقت ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا۔ یہ آیت اشراط الساعہ سے تب مربوط ہو سکتی ہے کہ پہلے احتمال والا معنی مراد لیا جائے۔ ایسی صورت میں اس کا ہماری بحث سے کوئی ربط نہیں رہے گا یہاں تک ہمیں قیامت کی نشانیوں سے قرآن کی رو سے آشنائی حاصل ہوئی اب اشراط الساعہ کے بارے میں روایات کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں۔

قیامت کی علامات روایات میں

اشراط و علامات قیامت کے بارے میں شیعہ و سنی کتب میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں اور ان میں دو طرح کی روایات ہیں:

۱۔ نظام آفرینش میں خارق العادۃ حوادث کا وقوع

۲۔ وہ تحولات جو لوگوں کے افکار و اذہان میں پیدا ہوتے ہیں

اس لحاظ سے کہ ان تمام روایات کی تحقیق مفصل بحث کی محتاج ہے جو تفسیر موضوعی کے انداز سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لہٰذا ہم یہاں مختصر طور پر چند نمونے ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔[2]

---

[1] ما ننزل الملائکۃ الا بالحق و ما کونوا اذاً منظرین (حجر: ۸)

[2] زیادہ تفصیل کے طالب بحار ج ۶، باب اشراط الساعہ و جامع الاصول ابن اثیر جلد ۱۱، ص ۴۷ تا ۹۳ کی طرف مراجعہ کریں۔

حذیفہ ابن اسید کہتے ہیں: ہم چند اصحاب کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے تو آنحضرتؐ نے موضوع گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے کہا: قیامت کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا: قیامت برپا نہیں ہوگی مگر یہ کہ دس غیر طبیعی حادثے پیش آ جائیں:

۱۔ مشرق کی طرف زمین کا دھنس جانا۔

۲۔ مغرب کی طرف زمین کا پھٹ جانا

۳۔ جزیرۃ العرب میں بھی زمین میں شگاف ہو جانا

۴۔ آسمان میں دھوئیں کا ظاہر ہو جانا

۵۔ دجال کا ظہور

۶۔ دابہ کا زمین سے نکلنا

۷۔ یاجوج و ماجوج کا لوگوں پر حملہ کرنا

۸۔ سورج کا مغرب کی سمت سے طلوع ہونا

۹۔ عدن کی طرف سے آگ کا ظاہر ہونا

۱۰۔ عیسیٰ بن مریم کا لوٹ آنا یا ایسی ہوا کا چلنا جو لوگوں کو دریا میں پھینک دے۔ [1]

نیز وہ تحولات جو لوگوں کے اذہان میں واقع ہوں گے اور لوگ دین سے دوری ہو جائیں گے ان کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔ ان میں سے جامع ترین وہ روایت ہے جسے عبداللہ بن عباس نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔ (بحار جلد ۶، ص ۲۰۶۔ ۲۰۹، کی طرف مراجع کریں)

---

[1] صحیح مسلم جلد ۸، ص ۱۷۹ یہ روایت صدوق نے خصال میں نقل تو کی ہے لیکن دسویں علامت ذکر نہیں کی۔

علامات قیامت

مشاهد الساعة

علامات قیامت کی پہلی قسم یعنی اشراط الساعہ کے بعد اب علامات قیامت کی دوسری قسم کو بیان کیا جاتا ہے۔ان علامتوں کا وقوع عمر دنیا کے یقینی اختتام اور وقوع قیامت کی خبر ہے۔انہیں مشاہد الساعہ کہا جاتا ہے۔

آفرینش اجل معین رکھتی ہے

سب سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے یہ نظام خلقت ایک معین مدت رکھتا ہے۔اس مدت کے ختم ہونے سے اس جہان کی عمر بھی ختم ہو جائے گی اور زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔قرآن اس بارے میں یوں فرماتا ہے:

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ③ (احقاف:۳)

’’ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو خلق نہیں کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک معین مدت تک خلق کیا ہے اور کافر جس سے ڈرائے گئے ہیں اس سے روگردانی کرتے ہیں‘‘[1]۔

اس آیت کی وضاحت کی خاطر ضروری ہے کہ ان موارد کا تذکرہ کیا جائے جن میں اجل کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔

ا۔خورشید و قمر کی گردش

قرآن کی بہت سی آیات کہتی ہیں کہ سورج اور چاند کی حرکت ایک معین و محدود مدت تک ہوگی اور اس وقت کے بعد یہ حرکت سے رُک جائیں گے جس کے نتیجے میں منظومہ شمسی کو تاریکی ڈھانپ لے گی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (لقمان:۲۹)

’’خدا نے سورج، چاند کو مسخر کر دیا اور ہر ایک معین مدت تک حرکت کر رہا ہے‘‘۔(اس ضمن میں رعد:۲، فاطر:۱۳، زمر:۵ بھی ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] اس آیت کا مضمون سورہ روم آیت ۸ میں بھی آیا ہے۔

۲۔ ہر انسان کی محدود حیات

ہر انسان کی زندگی معین کی گئی ہے۔ اس مدت کے بعد اس کی زندگی کا چراغ خاموش ہو جائے گا۔ اور وہ آخرت کی طرف روانہ ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (زمر: ۴۲)

''اللہ موت کے وقت مکمل طور پر جان لے لیتا ہے اور ان کی جان بھی نیند کے وقت لے لیتا ہے جو نہیں مرے ہوتے پھر جس کی موت کا وقت آ چکا ہوتا ہے اس کی روح روک لیتا ہے اور دوسروں کی روح کو اجل معین تک چھوڑ دیتا ہے''۔ (انعام: ۲، اسراء: ۹۹، منافقون: ۱۱، مومن: ۶۷ اور ہود: ۳ بھی ملاحظہ کریں)

۳۔ امتوں کی اجل

نہ صرف یہ کہ ہر بشر کی اجل معین ہوتی ہے بلکہ قرآن کی نظر میں امتوں کی عمر بھی اجل محدود رکھتی ہے:

اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ (یونس: ۴۹)

''ہر امت وقوم کی زندگی کی مدت معین ہے اور جب اس کی آخری گھڑی آ جائے گی تو وہ ایک لحظہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی''۔ (حجر: ۵، مومنون ۴۳ اور اعراف: ۳۴ بھی ملاحظہ فرمائیں)

مجموعی طور پر آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس عالم طبیعت کی تمام چیزیں ایک معین مدت رکھتی ہیں۔ جب وہ مدت ختم ہو جائے گی تو ان کی دنیوی زندگی بھی تمام ہو جائے گی۔

کائنات کے حوادث اور قیامت کی برپائی

قرآن میں ان اہم آسمانی حوادث کا تذکرہ ہے جو اختتام حیات جہان اور وقوع قیامت کی خبر دیتے ہیں یہ خوفناک و اہم حوادث، آسمان، زمین، دریا، پہاڑ، انسان، چاند، سورج اور ستاروں پر محیط ہیں۔ ایک جملے میں یوں کہہ لیں کہ یہ نظام کائنات تباہ ہو جائے گا اور قیامتِ موعود برپا ہو جائے گی۔

قیامت کے وقت آسمان کی حالت

اس بارے میں قرآن نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

انشقاق (ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا)[۱]، انفطار (کٹ جانا)، اذا السماء انفطرت (انفطار ۱، مزمل: ۱۸)، انفتاح (کھل جانا) و فتحت السماء (نبا: ۱۹)، انفراج (پھٹ جانا)،[۲] انطواء (لپیٹ دیا جانا)[۳]، تبدل (تبدیل ہونا)،[۴] مور (اضطراب)،[۵] مهل (پگھلی ہوئی دھات،[۶] دخان (دھواں)[۷]، ورد (سرخ پھول)[۸]، دھان (تیل)، کشط (زائل کر دینا)[۹]

جو آیات قیامت کے وقت آسمان کی حالت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی حالت تبدیل ہو جائے گی، اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا، تموج وحرکت سے دوچار ہو جائے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، پھٹ جائے گا، سرخ پھول پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائے گا۔ اور آخرکار دھوئیں کی صورت ہو کر لپیٹ دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن نے آسمان کی ابتدائے خلقت کی حالت اور اس کی اختتامی حالت کو ایک جیسا بتایا ہے یعنی ہر دو حالت میں اسے دھواں بتایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ (حم سجدہ: ۱۱)

"یعنی زمین کی خلقت کے بعد آسمان کا قصد کیا جبکہ وہ دھواں تھا"

۲۔ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۰﴾ (دخان: ۱۰)

---

[۱] اذا السما انشقت (انشقاق: ۱، الرحمن: ۳، حاقه: ۱۶، فرقان: ۱۶)

[۲] و اذا السماء فرجت (مرسلات: ۹)

[۳] یوم نطوی السماء (انبیاء ۱۰۴ و ذمر: ٦٧)

[۴] یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات (ابراهیم: ۴۸)

[۵] یوم تمور السما موراً (طور: ۹)

[۶] یوم تکون السما کالمهل (معارج: ۸)

[۷] یوم تاتی السما بدخان (دخان: ۱۰)

[۸] فکانت وردة کالدهان (رحمن: ۳۷)

[۹] و اذا السما کشطت (تکویر: ۱۱)

"وہ دن جس میں آسمان دھواں ہو جائے گا"

اب یہ دھواں کیسا ہے اس بارے میں گفتگو کا یہ مقام نہیں ہے۔

قیامت کے وقت زمین کی حالت

قیامت کے وقت آسمان کی حالت جاننے کے بعد زمین کی حالت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلے وہ جو قرآن نے اس بارے میں استعمال کی ہیں۔

زلزلہ، [۱] بارز (ظاہر)[۲]، تبدل (تبدیل)[۳]، تشقق (پھٹ جانا)[۴]، اندکاک (محو ہو جانا)[۵]، رج (سخت حرکت و اضطراب)[۶] اور مد (پھیلنا)[۷]

آیات نے جو قیامت کے وقت زمین کی حالت بتائی ہے اُس کے مطابق زمین پر سخت زلزلہ آئے گا جو کچھ زمین پر ہے تباہ ہو جائے گا زمین کی سطح ظاہر ہو جائے گی زمین پھٹ جائے گی، مردے باہر آ جائیں گے اور قیامت کے میدان میں محشور ہوں گے۔ یہاں پر دو نکتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ زمین و آسمان دونوں کے بارے میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: "تبدل" "وانشقاق" یعنی خدا کی یہ دو عظیم خلقتیں (زمین و آسمان) پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔

۲۔ جیسے آسمان کے آغاز و انجام کے بارے میں ایک ہی کلمہ استعمال کیا گیا ہے یعنی دخان اسی طرح زمین کے آغاز و انجام کے بارے میں بھی ایک ہی کلمہ استعمال ہوا ہے اور وہ ہے مد جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ وھو الذی مد الارض (رعد: ۳، حجر: ۱۹، ق: ۷)

۲۔ و اذا الارض مدت (انشقاق: ۳)

---

[۱] اذا زلزلت الارض زلزالھا (زلزلہ: ۱)

[۲] و تری الارض بارزۃً (کہف: ۴۷)

[۳] یوم تبدل الارض غیر الارض (ابراھیم: ۴۸)

[۴] یوم تشقق الارض عنھم سراعًا (ق: ۴۴)

[۵] اذا دکت الارض دکاً (فجر: ۲۱)

[۶] اذا رجت الارض رجاً (واقعہ: ۴)

[۷] و اذا الارض مدت (انشقاق: ۳)

قیامت برپا ہونے کے بعد زمین کی حالت

جیسے بعض آیات میں دنیا کی عمر کے اختتام پر وقوع قیامت کی علامات کے طور پر زمین کی حالت بیان کی گئی ہے اسی طرح بعض دوسری آیات میں قیامت کے بعد زمین کی حالت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ وَجِاۡىۡٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾ (زمر: ۶۹)

''(قیامت کے دن) زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ کتاب رکھ دی جائے گی۔ انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے اور انسانوں کا فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا''

آیت کا آخری حصہ صراحت کے ساتھ شہادت دے رہا ہے کہ یہ آیت قیامت کے بعد سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے والی آیات بھی اسی مطلب پر دلالت کر رہی ہیں کیونکہ ان آیات میں دو نفخہ (نفخہ صعق و نفخہ قیام) کے بارے میں بات کی گئی ہے اور جب انسان قبروں سے اٹھ کر میدان محشر میں حاضر ہوں گے۔ اس وقت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

واشرقت الارض بنور ربها...

قیامت کے وقت آسمانی چیزوں کی حالت

بدونِ شک آسمان میں تبدیلی اس کے موجودات کی تبدیلی کے بغیر نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ قرآن نے ان کی حالت کو بطور جداگانہ قیامت کی علامات کے طور پر ذکر کیا ہے لہٰذا ہم یہاں پر اس قسم کی آیات کا تذکرہ کرتے ہیں اور سورج، چاند اور ستاروں کی حالت کی تبدیلی لوگوں کو متوجہ کر سکتی ہے اور قیامت کے وقوع پر بہتر دلیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۞ (تکویر: ۱)

''جب سورج کی روشنی سمیٹ لی جائے گی''

۲۔ وَخَسَفَ الۡقَمَرُ ۞ وَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ۞ (قیامت: ۸،۹)

''چاند تاریک ہو جائے گا اور سورج، چاند اٹھا لیے جائیں گے''۔

یہ کہ سورج اور چاند کے جمع کرنے سے کیا مراد ہے اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کئے ہیں:

۱۔ دونوں کی روشنی زائل ہو جائے گی۔

۲۔ دونوں مغرب سے طلوع کریں گے۔[۱]

لیکن ان دو احتمالات پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی گئی۔ شاید مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت سورج و چاند ایک جگہ پر اکٹھے ہو جائیں گے اس احتمال کی تائید دو مطلب کرتے ہیں۔

۱۔ کلمہ جمع حقیقی معنی یہ ہیں کہ دو چیزیں ایک مکان یا ایک زمان میں اکٹھی ہو جائیں۔ اس نکتے کی طرف اشارہ زجاج وفراء کرتے ہیں جو خود پہلے احتمال کو اختیار کرتے ہیں۔ پس اگر معنی حقیقی کے خلاف قرینہ موجود نہ ہو تو لفظ کو ظاہری معنی سے پھیرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۲۔ اس لحاظ سے کہ وقوع قیامت کے وقت آسمان کی حالت پہلے جیسی نہیں رہے گی لہٰذا سورج اور چاند پر بھی یہ حکم جاری ہوگا۔ قرآن نے ان کی موجودہ حالت یوں بیان کی ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۟ۙ۳۸ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۳۹ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۴۰ (یٰسین: ۳۸ تا ۴۰)

''سورج جب اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ ہم نے چاند کے لیے منزلیں مقرر کی ہیں اور ایک دور مکمل کرنے کے بعد وہ شاخ خرما کی مانند (باریک وزرد) اپنی پہلی منزل کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (ان کی حرکت ثابت ہے) نہ سورج چاند سے ٹکراتا ہے نہ رات دن سے آگے نکلتی ہے اور ہر ایک اپنے خاص مدار میں حرکت کر رہا ہے''۔

سورج، چاند اور ستاروں کا یہ نظام قیامت کے وقت ختم ہو جائے گا تو سورج چاند کے پاس پہنچ جائے گا۔ نتیجتاً دونوں آپس میں جمع ہو جائیں گے۔

یہ تو تھی سورج اور چاند کی حالت اور دوسرے ستاروں کی حالت قیامت کے وقت۔ قرآن نے اس بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

---

[۱] مجمع البیان جلد ۵، ص ۳۹۵

طمس، [۱] انکدار، [۲] انتشار [۳]

طمس کے معنی محو و زائل ہونے کے ہیں اور انکدار و انتشار کے معنی تباہی اور الٹ پلٹ ہونے کے ہیں۔ [۴]

بنابریں یہ ستارے جو ابِ آسمانوں کی زینت ہیں [۵] اور اپنی منظم روشنی سے لوگوں کی دقت وراہ کے سلسلہ میں ہدایت کرتے ہیں۔ [۶] دنیا کی عمر کے آخری وقت یہ بھی بجھ کر تاریک ہو جائیں گے۔ ان کا نظم ختم ہو جائے گا اور زمین کی طرف کھچ جائیں گے۔

قیامت کے وقت زمینی موجودات کی حالت

زمینی موجودات میں سے قیامت کی نشانیوں کے طور پر دو چیزیں مورد توجہ قرار پائی ہیں اور وہ ہیں پہاڑ اور سمندر۔ شاید یہ ان کی عظمت و اہمیت کی وجہ سے ہے کیونکہ سطح زمین کی اکثریت کو پہاڑوں اور سمندروں نے گھیر رکھا ہے۔ دوسری طرف سے پہاڑوں کی عظمت و شکوہ جو زمین کے ستون بھی ہیں کی وجہ سے ان میں تحول و تغیر بہتر طور پر قیامت کے وقوع کی خبر دے سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں اکثر آیات پہاڑوں کی حالت کے بیان میں آئی ہیں۔

سمندر

دنیا کے آخری وقت کے سلسلے میں تین آیات میں سمندروں کی حالت دو لفظوں ''سجر'' (پر ہو جانا) اور ''فجر'' (پھٹ جانا) کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

و اذا البحار سجرت (تکویر: ۶)	جب سمندر بھر جائیں گے
والبحر المسجور (طور: ۶)	قسم ہے بھرے ہوئے سمندروں کی
و اذا البحار فجرت (انفطار: ۳)	جب سمندر پھٹ جائیں گے۔

طبرسی مرحوم نے ''فجر'' و ''سجر'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پانیوں کے درمیان سے رکاوٹوں کا اٹھ جانا اور ان کا آپس میں جمع

---

[۱] فاذا النجوم طمست (مرسلات: ۸)

[۲] و اذا النجوم انکدرت (تکویر: ۲)

[۳] و اذا الکواکب انتثرت (انفطار: ۲)

[۴] و زینا السماء الدنیا بمصابیح (حم سجدہ: ۱۲)

[۵] و هو الذی جعل لکم النجوم لتهتدوا بها فی ظلمات البر و البحر (انعام: ۹۷)

[۶] و علامات و بالنجم هم یهتدون (نحل: ۱۶)

ہوجانا اور نتیجتاً سمندروں کا پُر ہوجانا۔ [1]

دوسرے مفسرین نے جو دیگر معنی بتائے ہیں ان کی نسبت طبرسی مرحوم کی بیان کردہ تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔اس پر شاہد یہ ہے کہ قرآن نے سمندروں کی موجودہ خصوصیات میں سے یہ بتایا ہے کہ ان میں حد بندیاں ہیں۔ میٹھے پانی نمکین پانیوں سے جدا ہیں اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾ (فرقان: ۵۳)

"خدا وہ ہے جس نے تلخ و شیریں کو ملا دیا (ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں) اور ان دونوں کے درمیان رکاوٹ قرار دے دی کہ وہ ایک دوسرے سے مل نہ جائیں"

آیت کے ذیل "و جعل بینھما برزخاً" سے معلوم ہوتا ہے کہ "مرج" کے معنی آپس میں ملا دینا نہیں بلکہ مراد دونوں کے مکان کا ملے ہوئے ہونا ہے۔اسی مطلب پر گواہی سورہ رحمن کی آیت ۱۹۔۲۰ دے رہی ہے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿٢٠﴾

"کہ وہ دو سمندر آپس میں ملے ہوئے ہیں لیکن ان کے درمیان برزخ اور حد فاصل ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتے"

اس آیت کی تفسیر میں مناسب ترین کلام یہ ہے کہ یہ آیت سمندروں کی خلقت میں خداوند عالم کی حکیمانہ تدبیر کو بیان کر رہی ہے،اس طرح کہ جاندار موجودات اور انسانوں کی زندگی کے لیے مناسب حالات پیدا ہوسکیں۔کیونکہ جیالوجسٹ حضرات کی نظر میں زمین کے تین حصے ایسے سمندروں کے تحت ہیں جو نمکین ہیں اور ہوا کی لطافت اور چند جانداروں کی زندگی کی دوری جہات میں اچھی خاصی دخالت رکھتے ہیں اور دوسری طرف میٹھے پانی زمین کے اندر ذخیرہ ہیں جو چشمے اور کنوئیں کے ذریعے سے باہر نکالے جاتے ہیں اور موجودات کی زندگی کی بنیادی شرط کو فراہم کرتے ہیں۔

یہ دو قسم کے پانی (نمکین و شیریں) آپس میں نہیں ملتے اس طرح سے کہ تمام میٹھے پانی نمکین ہو جائیں یا سب نمکین پانی میٹھے ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو جانداروں کی زندگی زمین پر ممکن نہ رہے۔

---

[1] و اذا البحار سجرت۔ ای ارسل عذبھا علی ما لحھا و ما لحھا علی عذبھا حتی امتلاء ت۔ و اذا البحار فجرت۔ ای فتح ببعضھا فی بعض عذبھا فی ملحھا و ملحھا فی عذبھا فسارت بحراً واحداً۔ (مجمع البیان جلد ۵ ص ۴۴۳۔۴۴۹

لیکن جب دنیا کی عمر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا تو میٹھے اور نمکین پانیوں کی رکاوٹیں بھی زائل ہو جائیں گے۔ "سجرت" اور "فجرت" کے الفاظ اسی حالت کو بیان کر رہے ہیں۔[1]

قیامت کے وقت پہاڑوں کی حالت

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اکثر آیات دنیا کے آخر وقت پہاڑوں کی حالت کو بیان کرتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ "سیر" (حرکت دینا)

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳ (تکویر: ۳)

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ (کهف: ۴۷)

وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰ (طور: ۱۰)

۲۔ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰ (نبا: ۲۰)

(جس دن صور پھونکا جائے گا) پہاڑ چل پڑیں گے اور سراب کی صورت بن جائیں گے۔

"سراب" یعنی آب نما جو دور سے پانی نظر آئے جبکہ پانی نہ ہو۔ یہ تو سراب کے اصلی معنی ہیں لیکن بعد میں اس کے معنی کو وسیع کر دیا گیا اور ہر اس غیر حقیقی چیز (جو وجود نہ رکھتی ہو) کو سراب کہنے لگے جس کے بارے میں حقیقی ہونے کا گمان ہو اور آیت میں بھی یہی معنی مراد ہیں یعنی پہاڑ اپنی عظمت کے باوجود اس طرح نابود ہو جائیں گے کہ خارج میں ان کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہے گا اور تم صرف تو ہم کرو گے کہ پہاڑ ہیں:

۳۔ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ (معارج: ۹)

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ (قارعه: ۵)

"پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے"

۴۔ نسف (اکھیڑنا) وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝۱۰ (مرسلات: ۱۰)

"جب پہاڑ اپنی جگہ سے اکھیڑ دیے جائیں گے"

۵۔ رجف (شدید حرکت واضطراب)

---

[1] المیزان جلد ۲۰، ص ۱۱۲

۶۔ کثیب (خاکی ٹیلہ)

۷۔ مهیل (ریزہ ریزہ ہونا)

یَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا مَّهِيۡلًا ﴿۱۴﴾ (مزمل: ۱۴)

''جب زمین اور پہاڑوں میں شدید اضطراب پیدا ہوگا اور پہاڑ خاک کے ٹیلوں کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

۸۔ بُس (ریزہ ریزہ ہونا)

۹۔ هباء منبث (غبار)

وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ﴿۶﴾ (واقعہ: ۵،۶)

''پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے جیسے ہوا میں ذرے بکھرے ہوں''

۱۰۔ دَكّ (ٹکڑے ٹکڑے ہونا)

وَّحُمِلَتِ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ (حاقہ: ۱۴)

''زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لئے جائیں گے اور بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے''

دنیا کے اختتام پر یہ ہے پہاڑوں کا انجام۔ وہ پہاڑ جو سختی و استحکام میں ضرب المثل تھے۔ زمین کے محکم ستون شمار ہوتے تھے، لوہے کی میخوں کی طرح زمین کے تعادل کے محافظ تھے۔[1] جب زمین کی آخری گھڑی آن پہنچے گی تو پہاڑ شدت سے اپنی جگہ سے اکھیڑ دیے جائیں گے اور اپنا توازن کھو بیٹھیں گے اور دھنی ہوئی روئی کی طرح نرم ہو جائیں گے، شدید حرکت شروع کر دیں گے اور آخر غبار کے ذرات کی صورت میں بکھر جائیں گے اور ان کے وجود کا سراب باقی رہ جائے گا۔ اس طرح سے نظام کائنات رک جائے گا اور ایک لحظہ میں جہان تاریک و وحشت ناک ہو جائے گا۔ البتہ یہ دنیا کا اصلی اختتام نہیں ہے بلکہ ایک نئی اور جاوداں زندگی کی خوشخبری ہے کہ قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے اور یہ کائنات کے حوادث اس زندگی کے آ پہنچنے کی علامت ہیں۔

[1] ان آیات کی طرف رجوع کریں: نبا: ۷، نازعات: ۳۲، غاشیہ ۱۹، حشر: ۲۱

۱۸۔ نفخ صور یا نئی زندگی کا مقدمہ

اس سے پہلے والی فصل میں ان علامات کا تذکرہ تھا جو قیامت کے وقت وقوع پذیر ہوں گی۔ اب ضروری ہے کہ اُس مسئلے کی تحقیق کریں جسے قرآن ''نفخ صور'' کے نام سے بیان کرتا ہے۔

''نفخ صور'' دو مرحلے رکھتا ہے۔ ایک تو سابق بیان شدہ حواث (مشاہد الساعۃ) سے پہلے ہوگا اور دوسرا ان حوادث کے بعد۔ پہلے نفخ صور کو ''صعق'' یا ''فزع'' کہا جاتا ہے اور دوسرے کو ''قیام'' یا ''بعث'' کہا جاتا ہے۔ اب دونوں کے بارے میں آیات ذکر کی جاتی ہیں:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ (زمر: ۶۸)

صور پھونکا جائے گا پس جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے خوف سے مر جائے گا مگر وہ جسے خدا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا، اچانک سب لوگ اُٹھ پڑیں گے اور میدان محشر میں اپنی سرنوشت کے منتظر رہیں گے''۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ نفخ صور دو مرتبہ انجام پائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری آیات بھی کسی نہ کسی طرح اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ (نمل: ۸۷)

''جس دن صور پھونکا جائے گا جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے شدت خوف سے مر جائے گا مگر وہ کہ جسے خدا چاہے اور سب ذلت کے ساتھ خدا کے حضور حاضر ہو جائیں گے''۔

پہلی آیت میں لفظ ''صعق'' استعمال کیا گیا ہے اور اس آیت میں لفظ ''فزع''۔ اس وجہ سے بعض نے کہا ہے کہ قیامت کے وقت تین صور پھونکے جائیں گے۔

۱۔ نفخۂ فزع

۲۔ نفخۂ صعق

۳۔ نفخۂ قیام و بعث

لیکن جیسا کہ طبرسی مرحوم نے کہا ہے ''فزع'' سے مراد صعق ہی ہے اور دونوں آیات کا مطلب یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ صور پھونکا

جائے گا تو (کچھ کے علاوہ) سب لوگ مرجائیں گے۔

اب دیکھیں آیت کے ذیل میں ہے ''وکل اتوہ داخرین'' اگر تو جملہ سے مراد لوگوں کا میدان محشر میں آنا ہو تو یہ جملہ دوسرے نفخہ کے بارے میں ہوگا اور پہلی آیت کے دوسرے حصے کے ساتھ معنی کے لحاظ سے ہم آہنگ و متحد ہو جائے گا۔ مگر یہ کہ کہا جائے کہ ''وکل اتوہ داخرین'' کا مطلب سب کی موت ہے چونکہ موت بھی ایک قسم کا خدا کے پاس حضور ہے۔

یہاں ایک تیسرا احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس آیت میں نفخ صور بطور مطلق ذکر ہوا ہے کیونکہ دونوں مرتبہ صور پھونکا جانا قیامت کے مختصات میں سے ہے، بنا بریں جو کچھ آیت کے ابتدا میں ہے **ففزع من فی السموات** ... یہ پہلے صور کی خصوصیات میں سے ہوگا اور جو کچھ آیت کے ذیل میں ہے یعنی **کل اتوہ داخرین** دوسرے صور کی خصوصیات میں سے ہوگا۔ [۱]

ان آیات کے علاوہ سات اور ایسی آیات ہیں جن میں صور کا ذکر ہوا ہے۔ البتہ سب کی سب دوسرے صور کو بیان کر رہی ہیں اور ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی یہاں تشریح و تفسیر نہیں کرتے۔ [۲]

نفخ صور کی حقیقت اور دوسری اصطلاحات

نفخ صور کے علاوہ بھی قرآن میں کچھ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو نفخ صور کی حقیقت (یعنی عمومی موت اور نئی زندگی کے اعلان) کو بیان کرتی ہیں:

(الف) صیحة

''صیحہ'' کے معنی چیخ کے ہیں۔ یہ بھی صور کی طرح دو مرتبہ ہوگا۔

۱۔ صیحۂ موت

۲۔ صیحہ احیاء

پہلے صیحہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ (یٰسین: ۴۹، ۵۰)

''وہ صرف ایک صیحہ کے منتظر ہیں جبکہ وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے وہ نہیں آ لے گا پس وہ نہ وصیت

---

[۱] المیزان جلد ۱۵، ص ۴۳۹

[۲] کہف: ۹۹، مومنون: ۱۰۱، ق: ۲۰، حاقہ: ۱۳، انعام: ۷۳، طہ: ۱۰۲، نبا: ۱۸

کی قدرت رکھتے ہوں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکیں گے"

دوسرے صیحہ کے بارے میں فرمایا:

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ﴿۵۳﴾ (یٰسین: ۵۳)

"(نفخہ صور) صرف ایک چیخ ہے اچانک وہ سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے"۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

السُّجُوۡدِ﴿۴۰﴾ وَاسۡتَمِعۡ يَوۡمَ يُنَادِ الۡمُنَادِ مِنۡ مَّكَانٍ قَرِيۡبٍ﴿۴۱﴾ يَّوۡمَ يَسۡمَعُوۡنَ الصَّيۡحَةَ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡخُرُوۡجِ﴿۴۲﴾ (ق: ۴۱، ۴۲)

"ایسے دن کے منتظر رہو جب خدا کے پاس سے ایک منادی ندا دے گا۔ اس دن سب لوگ حتمی چیخ سن لیں گے۔ وہ دن ہے مردوں کے قبروں سے نکلنے کا"۔

بعض نے کہا ہے کہ صیحہ سے مراد وہ آواز ہے جو دو نفخوں سے پہلے ہوگی جس کی وجہ سے دنیا نابود ہو جائے گی اور لوگ اس کی وجہ سے مر جائیں گے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ "صاخہ"، "نقرہ"، "زجرہ"، جیسی اصطلاحیں جو دوسری آیات میں استعمال کی گئی ہیں اس صیحہ کو بیان کرتی ہیں اور مذکورہ دو قسم کے نفخ صور سے ربط نہیں رکھتیں۔ [1]

لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا جن آیات میں لفظ صیحہ استعمال کیا گیا ہے ان میں سے کچھ پہلے نفخ صور سے مربوط ہیں اور کچھ دوسرے سے۔

(ب) صاخہ، نقر اور زجرہ کی اصطلاحیں

جن آیات میں یہ تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تینوں نفخ صور دوم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ﴿۳۳﴾ يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيۡهِ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيۡهِ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امۡرِیًٴ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ﴿۳۷﴾

(عبس: ۳۳ تا ۳۷)

"پس جب بلند آواز آئے گی وہ دن جس میں انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹوں سے دور بھاگے گا

---

[1] معاد شناسی ج ۴، ص ۱۷۳

اور ہر ایک ایسی مشغولیت میں ہوگا جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر توجہ نہ دے پائے گا''

اس بات پر شاہد کہ یہ آیت دوسرے نفخ صور سے متعلق ہے یہ ہے کہ

اولاً

اس آیت میں انسان کے اپنے نزدیکی رشتہ داروں سے فرار کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ چیز پہلے صور میں موضوعیت نہیں رکھتی۔

ثانیاً

بعض آیات میں آیا ہے کہ اس دن (جس دن بلند آواز سنی جائے گی) لوگ دو قسم کے ہوں گے ایک قسم ہشاش و بشاش اور ایک افسردہ غمگین۔ [۱]

۲۔ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿١٤﴾ (نازعات: ۱۳، ۱۴)

''(آخری نفخہ) صرف ایک آواز ہے چانک وہ زمین سے اوپر اٹھا دیئے جائیں گے''۔ [۲]

یہ آیت بھی نفخ دوم سے مربوط ہے کیونکہ دوسرے نفخہ کے آثار یعنی احیا و قیام کو ن بیان کررہی ہے۔

۳۔ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ (مدثر: ۸ تا ۱۰)

''جب بگل بجایا جائے گا وہ دن کفار پر سخت ہوگا''۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ دن کافروں پر سخت ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقر در ناقور سے مراد دوسرے صور کا نفخہ ہی ہے جس کے بعد مردے زندہ ہوجائیں گے اور کفار سخت عذاب الٰہی میں گرفتار ہوجائیں گے جبکہ پہلے نفخہ کا خوف وہراس عمومی ہے جیسا کہ صعق وفزع والی آیات میں بیان ہو چکا ہے۔

(ج) رجفہ ورادفہ کی اصطلاحیں

یہ دو اصطلاحیں بھی نفخ صور کے دو مرحلوں کو بیان کرتی ہیں رجفہ نفخہ صعق کو اور رادفہ نفخہ فزع کو بیان کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] وجوه يومئذ مسفرة ضاحكة مستبشرة ووجوه يومئذ عليها غبرة ترهقها قترة اولئك هم الكفرة الفجرة (عبس: ۳۸ تا ۴۲)

[۲] سورہ صافات کی آیت ۱۹ بھی اسی مضمون پر ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ (نازعات: ۶، ۷)

راجفہ ایسی عظیم آواز کو کہا جاتا ہے جس سے تردد واضطراب پیدا ہوجائے جیسا کہ بجلی کی آواز ہوتی ہے اور ''ردف'' کے معنی دو چیزوں کا ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے پس آیت کے معنی ہوں گے:

''وہ دن جب عظیم صدا پیدا ہوگی اس کے بعد فوراً صیحہ بلند ہوگی''

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ و متحد ہے اور دونوں نفخہ صعق و قیام کو بیان کر رہی ہیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ۝ (سورہ زمر: ۶۸)

نفخ صور والی آیات کی تحقیق و تفسیر

کلمہ ''نفخ'' لغت میں پھونکنے کے معنی میں آتا ہے اور صور بگل کو کہتے ہیں (منجد میں بگل لکھا ہے) یہ دو کلمے یعنی ''نفخ'' اور ''صور'' ''فی'' کے ذریعے آپس میں مرتبط ہوتے ہیں (نُفخ فی الصور، ینفخ فی الصور) لہٰذا آیات میں نفخ صور کے معنی یہ ہوں گے کہ قیامت کے وقت شاخ (سینگ) میں پھونکا جائے گا ظاہراً شاخ (بگل) سے مراد اس کی معروف قسم ہے جسے گذشتہ زمانے میں بگل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اسے جنگ کے اعلان کے لیے بجاتے تھے۔

اب آیا صور پھونکنے سے بھی یہی معنی مراد ہیں یعنی بگل بجانا؟ آیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب دنیا کی عمر اختتام کو پہنچے گی تو خدا کا ایک فرشتہ بگل بجائے گا جس کی آواز اتنی مہیب و وحشت ناک ہوگی کہ تمام موجودات اس کے سنتے ہی مر جائیں گے اور وہی بگل پھر باجایا جائے گا اور سب موجودات دوبارہ زندہ ہوجائیں گے؟

یا یہ کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں بلکہ یہ تمام موجودات کی موت اور ان کے احیاء سے کنایہ ہے اور قرآن کی صریح نص کی بنا پر مارنے اور زندہ کرنے والا خدا ہے اور یہ بھی قرآن کی صریح نص ہے کہ خدا جس چیز کا ارادہ کرے کن کے تکوینی کلمہ کے ذریعے وجود میں آجاتا ہے۔

صور کے بارے میں آیات یا روایات میں اس قسم کی توضیح نہیں ملتی لیکن آیات سے یہ نکتہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک بہت مہیب و ہولناک آواز سب موجودات کے کانوں تک پہنچے گی جو ان سب کی موجب بنے گی اور اسی کی وجہ سے نظام کائنات تباہ ہوجائے گا آسمان وزمین (جیسا کہ گزر چکا ہے) تبدیل ہوجائیں گے۔ سورج، چاند اور ستارے تاریک ہوجائیں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور سخت قسم کی حرکت سے دوچار ہوجائیں گے۔ سمندر پھٹ جائیں گے اور ان کا پانی ایک دوسرے سے مل جائے گا۔

یہ سب حوادث نفخ صور کی اس دہشت ناک آواز کے بعد واقع ہوں گے۔صعق وفزع اور رجف والی آیات اس مطلب پر واضح شاہد ہیں۔زمر:۶۸،نمل:۸۷،اور نازعات:۶)

اس کے بعد دوسرا نفخ صور تحقق پذیر ہوگا اور انسان (اور دوسرے موجودات) میدان محشر میں حاضر ہوجائیں گے اور انتظار حساب و کتاب کریں گے اور "فاذا هم قيام ينظرون" و "فاذا هم بالساهرة" کے جملے اس مطلب پر واضح شاہد ہیں۔

قرآن نے ان آیات میں تین غیبی چیزوں کی خبر دی ہے:

۱۔ صور

۲۔ نفخ

۳۔ صیحہ

لیکن ان کی واقعیت وحقیقت کیا ہے؟ ہمارے لیے اس دنیا میں معلوم نہیں ہے اور انسان پر لازم ہے کہ بہت سے غیبی مطالب پر ایمان لائے۔علامہ طباطبائی کا اس سلسلے میں ایک بیان ہے جو مطالعہ کرنا چاہے وہ رجوع کرے۔[۱]

قرآن حضرت شعیبؑ کی ظالم قوم کے برے انجام کے بارے میں صیحہ کا ذکر کرتا ہے جس سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ۝۹۴ (هود: ۹۵)

"جب ہمارا امر (زمان عذاب) پہنچ گیا تو ہم نے شعیب کو اور ان کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے نجات دے دی اپنی رحمت کے ساتھ اور ظالمین کو صیحہ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں بے جان جسموں کے ساتھ گر پڑے"

قوم ہود اور قوم صالح کی ہلاکت کے لیے بھی یہی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔[۲]

لہٰذا اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ دنیا کے اختتام پر اور مردوں کے زندہ ہوتے وقت آواز بلند ہوگی لیکن اس کی کیفیت ہمارے لیے روشن نہیں ہے۔

اس فصل اور گذشتہ فصل میں بیان شدہ مطالب سے مجموعی طور پر دو باتیں استفادہ ہوتی ہیں۔

۱۔ تمام موجودات کی زندگی معین اجل رکھتی ہے جس کے آنے سے ان کی عمر اختتام پر پہنچ جائے گی اور یہ اصول فرشتوں،انسانوں اور تمام موجودات پر حاکم ہے۔

---

[۱] رسائل توحیدیہ رسالہ انسان پس از دنیا،ص ۲۲۸

[۲] سورہ مومنون ۴۱ وھود ۶۷

۲۔ درعین حال یہ حیرت انگیز واقعہ اور دوسرے واقعات اس جہان میں طبیعی اسباب کے بغیر رونما نہیں ہوں گے اور ان کا سبب نفخ صور و صیحہ ہی ہے جس کے سننے سے تمام موجودات مرجائیں گے۔

دوسوال اور ان کے جوابات

یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے:

۱۔ دونوں نفخوں میں کتنا فاصلہ ہوگا؟

۲۔ اور نفخ سے کن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے؟

توضیح:

سورہ زمر کی آیت نمبر ۶۸ میں نفخ دوم کو ''ثم'' کے ساتھ پہلے نفخ پر عطف کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کلمہ دو چیزوں میں فاصلے پر دلالت کرتا ہے پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو نفخوں میں کتنا فاصلہ ہوگا؟

نیز سورہ نمل کی آیت ۸۷، اور اسی آیت میں نفخ اول کے بعد ''الا من شاء اللہ'' کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گروہ نفخہ صعق وفزع سے مستثنیٰ ہے یعنی یہ لوگ خوف و ہراس میں مبتلا نہیں ہوں گے اور نہ ہی انہیں ضرر پہنچے گا۔

اگر ہم کہیں کہ سورہ نمل کی آیت دوسرے نفخہ کے بارے میں ہے تو دونوں آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ دونوں نفخوں سے مستثنیٰ ہیں لہٰذا وہ بالکل امن میں رہیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں؟

پہلے سوال کا جواب

آیات میں کوئی ایسا بیان نہیں پایا جاتا جس سے دو نفخوں کے درمیانی فاصلے کا اندازہ ہو سکے۔ اس بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے نفخہ دوم کے بعد قیامت واقع ہو جائے گی اور بہت سی آیات وقوع قیامت کے وقت کو خدا سے مخصوص جانتی ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی اس سے با خبر نہیں ہے۔ بنا بریں دو نفخوں کے درمیان فاصلہ بھی کسی کو معلوم نہیں کیونکہ جب یہ فاصلہ معلوم ہوگا تو دوسرے نفخہ کا وقت اور قیامت کے وقوع کا وقت بھی معلوم ہو جائے گا اور یہ صریح آیات کے خلاف [۱] ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امام سجاد علیہ السلام سے جب دو نفخ صور کے درمیانی فاصلے کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت نے فرمایا ما شاء اللہ جو خدا چاہے گا۔ [۲]

---

[۱] مصنف کا یہ نتیجہ اخذ کرنا درست معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا لازم آتا ہے وثانیاً اگر یہ لازم آ بھی جائے تو صراحت آیات کی مخالفت لازم نہیں آتی کیونکہ آیات علم ذاتی کو خدا سے مخصوص کرتی ہیں نہ علم وہبی کو (مترجم)

[۲] بحار الانوار جلد ۶ ص ۳۲۴

البتہ بعض روایات میں یہ فاصلہ بیان ہوا ہے لیکن ان کے متن و سند میں اشکالات کی وجہ سے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اگرچہ انہیں رد کرنا بھی جائز نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب

البتہ دوسرے سوال کا جواب آیات کی طرف مراجعہ کرتے ہوئے وضاحت سے دیا جاسکتا ہے۔

سورہ نمل میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

(نمل: ۸۹، ۹۰)

''جو بھی محشر میں نیکیاں لائے گا اسے اس سے بہتر جزا دی جائے گی اور (ایسے لوگ) اس دن فزع اسے امن میں رہیں گے اور جو محشر میں بُرے کردار کے ساتھ آیا اس کے چہرے کو آگ میں ڈالا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ سزا نہیں ہے مگر تمہاری بداعمالیوں کی''۔

جملہ ''**فکبت وجوھھم فی النار**'' دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن سے مراد قیامت ہے جس دن صالح افراد فزع سے امان میں ہوں گے اور یہ دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا۔ اس صورت میں اس آیت کا مضمون دوسری آیت سے ہم آہنگی و مناسبت رکھتا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ (انبیاء: ۱۰۳)

''انہیں وہ بڑی فزع غمگین نہیں کرے گی اور فرشتے ان سے ملیں گے اور کہیں گے یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ تم سے کیا گیا تھا''

اب دیکھنا یہ ہے کہ حسنہ سے کیا مراد ہے؟

اس بارے میں دو احتمال ہیں:

۱۔ مراد مطلق حسنہ ہو یعنی جس کے نامہ اعمال میں کسی قسم کی کوئی نیکی ہوگی اس استثنا میں وہ شامل ہوجائے گا اور نفخ صور کے فزع سے امان میں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب مومنین اس استثنا میں شامل ہوجائیں گے۔

۲۔ حسنہ مطلق مراد ہو یعنی وہ شخص یا اشخاص جن کے نامہ اعمال میں کسی قسم کی کوئی بدی نہیں ہوگی۔ بلکہ ان کے نامہ اعمال میں صرف

نیکیاں ہی نیکیاں ہوں گی وہ اس فزع سے امان میں ہوں گے۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ''فزع قیامت'' سے بہت تھوڑے لوگ نجات پائیں گے''۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے اسی دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''یہ جو اس گروہ کو امان دی گئی ہے اور حسنہ کو سیئہ کے مقابل قرار دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنہ سے مراد حسنہ مطلق ہے یعنی جس کے ساتھ کسی قسم کا گناہ نہ ہو اور بدیہی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو طنیت و اعمال و ملکات کے لحاظ سے طیب و طاہر ہوں گے اور اس لحاظ سے کہ قرآن نے بداعمال و ملکات کے لحاظ سے کہ قرآن نے بداعمال کو خبیث و رجس کہا ہے اور دوسری طرف ایمان کے کچھ مراتب کو شرک کے ہمراہ جانا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی پلیدی سے صرف وہ لوگ پاک ہیں جو تمام جہات میں موحد ہوں اور توحید کے تمام مراتب (توحید ذاتی، صفاتی، افعالی اور عبادی) کو قبول کر چکے ہوں''[1]

بنابریں اس بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ مورد بحث آیت میں مستثنیٰ لوگ خدا کے ممتاز و برجستہ بندے ہیں وہ خدا پر محکم و عمیق ایمان کی وجہ سے نفس مطمئنہ کے مالک ہیں اور کوئی کسی قسم کا ہولناک حادثہ انہیں مضطرب نہیں کر سکتا جیسا کہ دنیوی زندگی میں بعض موحد و مومن افراد کی یہ خصوصیت ہوتی ہے۔ انبیا و اوصیا اور کچھ ان کے پیروکار ایسے ہی لوگ ہیں۔ اگرچہ حوادث میں استواری استقامت کے لحاظ سے خود ان میں بھی فرق موجود ہے۔ یہ فرق خدا پر ایمان و معرفت کے لحاظ سے ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سورہ نمل کی آیت ۸۷ میں بطور دقیق معلوم نہیں ہے کہ نفخ صور سے مراد نفخۂ اوّل ہے یا دوم لیکن سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں دونوں نفخوں کا تذکرہ ہوا ہے اور الا من شاء اللہ کے ذریعے استثنا نفخہ اول کے بعد آیا ہے لہٰذا جن کا استثنا ہوا ہے وہ صعق کے بعد خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے جبکہ پوری کائنات اس سے نیست و نابود ہو جائے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس گروہ میں کون لوگ ہیں اور کیا آیت میں کچھ ایسے شواہد پائے جاتے ہیں جن سے اس مطلب کو سمجھا جا سکے؟

بعض کہتے ہیں کہ اس لحاظ سے کہ آیت میں صعق کی نسبت تمام زمین و آسمانی موجودات کی طرف دی گئی ہے **(فصعق من فی السموات و من فی الارض)** لہٰذا مستثنیٰ لوگوں کا وجود آسمان و زمین سے بلند ہونا چاہیے تاکہ وہ صعق و فزع سے محفوظ رہ سکیں۔

لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ ظاہر آیت کا مقتضا یہ ہے کہ مستثنیٰ لوگ زمین و آسمان کے موجودات میں سے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ استثنا متصل ہے نہ کہ منقطع (یعنی مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہے) اسی ظاہری مدلول کو دیکھتے ہوئے مفسرین نے اس آیت کے بارے میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ مستثنیٰ چار فرشتے ہیں (جبریل، میکایل، اسرافیل اور عزرائیل) بعض نے کہا کہ مستثنیٰ شہدا

---

[1] رسائل توحیدی ص ۲۳۰

ہیں اور بعض نے کچھ دوسرے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔[1]

آیت میں کچھ شواہد و قرائن پائے جاتے ہیں جن کے توسط سے آیت کی تفسی کرتے ہوئے مستثنیٰ کو سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جو افراد پہلے نفخہ میں خوف و ہراس میں گرفتار ہو چکے ہوں گے وہی دوسرے نفخہ کے بعد کھڑے ہو کر پروردگار کے پاس محشر میں حاضر ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ﴿٦٨﴾ (زمر: ۶۸)

فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾ (یٰس: ۵۳)

''جب وہ سارے ہمارے حضور حاضر ہوں گے''

۲۔ دوسری آیت میں محاسبہ اعمال کی خاطر میدان محشر میں حاضر ہونے والوں سے مخلصین کا استثنا کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿١٢٨﴾ (صافات: ۱۲۷، ۱۲۸)

''یعنی سب حاضر ہوں گے سوائے ہمارے مخلص بندوں کے''

ان دو آیات کو اگر آپس میں ملا کر دیکھیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مخلص لوگ وہی ہیں جو پہلے نفخہ میں خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مخلص کون لوگ ہیں؟

۳۔ شیطان قیامت کے دن اپنے پیروکاروں سے کہے گا ''تم اپنے آپ کو لعنت ملامت کرو میں نے تو تم سے صرف جھوٹے وعدے کیے تھے اور تم فریب میں آ گئے اور آج میں اس کا انکار کرتا ہوں جس کا تم شرک کرتے ہو۔[2]

۴۔ دوسری طرف سے دنیا میں خدا کے مخلص بندوں کو گمراہ کرنے سے شیطان عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔[3]

ان دو آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلصین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اعمال، عقائد اور اخلاق میں کسی قسم کا شرک نہ پایا جائے۔ بدیہی سی بات ہے کہ لوگوں میں سے صرف خدا کے برگزیدہ اولیا ہی وہ ہستیاں ہیں جن کے دامن ہر قسم کے شرک سے مبرا ہیں اور شیطان جنہیں گمراہ کرنے سے عاجز ہے۔ پس ان دونوں آیات کا مطلب بھی وہی ہے جو پہلے والی آیت میں بیان ہو چکا ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۴، ص ۸۰۵ و تفسیر الجلالین ص ۶۱۶

[2] سورہ ابراہیم آیت ۲۲

[3] سورہ حجر آیت ۴۰، ص آیت ۸۳

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کے ہر دو نفخہ سے محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ موت سے بھی محفوظ رہیں گے؟ جب کہ قیامت کے وقت پہلے صور کے بعد تمام زندہ موجودات کی موت حتمی اور کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب کلمہ اگر توصعق کی تشریح پر موقوف ہے توصعق سے مراد موت ہو تو یہ گروہ مستثنیٰ ہوگا اور اگر صعق سے مراد خوف و ہراس ہو نہ کہ موت تو پھر یہ گروہ کائنات کی اختتامی موت سے محفوظ نہیں رہے گا۔

۱۹۔ قیامت اور لوگوں کا حساب

قرآن میں قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ''یوم الحساب''[۱] بھی آیا ہے یعنی وہ دن جس میں خدا تعالیٰ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ کرے گا اور یہ مطلب اس حد تک مسلم ہے کہ حضرت علی علیہ السلام دنیا و آخرت کے بارے میں فرق یوں بیان فرماتے ہیں:

''دنیا عمل و کوشش کا گھر ہے نہ کہ حساب کا اور آخرت حساب کا گھر ہے نہ کہ عمل و کوشش کا''[۲]

آیات و روایات میں حساب کے متعلق کچھ ایسے عنادین کا تذکرہ ہوا ہے جن کی تحقیق سے نہ صرف ہماری دینی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ حساب کے بارے میں کیے جانے والے کچھ سوالات کے جوابات بھی مل جاتے ہیں ان میں سے اہم ترین عنادین یہ ہیں:

۱۔ حساب سے مراد کیا ہے؟
۲۔ کون حساب لے گا؟
۳۔ کن اعمال کے بارے میں سوال ہوگا؟
۴۔ آیا سب سے حساب لیا جائے گا؟
۵۔ خدا کے سریع الحساب ہونے کا کیا مطلب ہے؟
۶۔ سوء الحساب سے کیا مراد ہے؟
۷۔ کن لوگوں سے آسان محاسبہ ہوگا؟
۸۔ لوگوں کا حساب کے لحاظ سے متفاوت ہونا۔
۹۔ حساب کے وقت سب پر حجت تمام ہے۔
۱۰۔ گناہ کا اقرار اور مغفرت الٰہی کی اُمید

---

[۱] ابراہیم: ۴۱،ص: ۱۶، ۲۶، ۵۳ اور مومن: ۲۷

[۲] والیوم عمل ولا حساب و غداً حساب ولا عمل (نہج البلاغہ خطبہ: ۴۲)

اب ان عنادین کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں:

ا۔حساب سے کیا مراد ہے؟

اصولی طور پر حساب یعنی پہلے سے حاصل شدہ معلومات کے ذریعے کچھ مجہولات کو پا لینا یعنی حساب معلومات کے ذریعے مجہولات کو حال کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی میں حساب ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کیونکہ انسان ہمیشہ اپنی زندگی کے لیے متفکر رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے فعل و کوشش اور اپنے مادی و روحانی تجربات کے نتائج سے مطلع ہو جائے۔ اسی مطلب کی خاطر حساب کتاب شروع کرتا ہے۔

گویا جیسا کہ بنی نوع انسان میں رائج ہے حساب کی واقعیت میں ایک قسم کی جہالت و نا آ گاہی پنہاں ہے۔ اس لحاظ سے کہ خداوند تعالیٰ ہر قسم کی جہالت و نا آ گاہی سے پاک و منزہ ہے اس کے لیے ظاہر و پوشیدہ چیزیں برابر ہیں اور وہ لوگوں کے تمام افکار و اعمال سے آ گاہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ان کے اعمال کے محاسبہ کی کیا ضرورت ہے؟ وہ جب اپنے علم کی اساس پر عدل و حکمت کے ساتھ لوگوں کو اعمال کی جزا و سزا دے سکتا ہے تو ایسی صورت میں حساب کا برپا کرنا اور سوال و جواب سب کے سب لغو و عبث ہوں گے اور لغو و عبث کام حکمت الٰہی کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جواب

اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ قیامت کے دن حساب کے برپا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ سوال و جواب کے ذریعے اچھے، برے لوگوں کی پہچان کرے گا تا کہ انہیں جزا و سزا دے سکے کیونکہ خدا تعالیٰ تو سب چیزوں سے آ گاہ ہے۔ اسے حساب برپا کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا حساب سے مراد اس کے بجائے کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ اس ذریعے سے خدا کا عدل و حکمت تمام لوگوں کے لیے واضح و روشن ہو جائے یہاں تک کہ جو لوگ دنیا میں اس بارے میں شک کرتے تھے یا اسے اہمیت نہیں دیتے تھے وہ بھی اس دن عدل و رحمت الٰہی کا مشاہدہ کر لیں اور کسی کے لیے کسی عذر و اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آخرت میں حساب و محاسبہ لوگوں کے امتحان و آزمائش کے لیے ہے جیسا کہ دنیا میں لوگ اس مقصد کے لیے حساب لیتے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دنیا میں لوگ حساب لیتے ہیں دوسروں کے حالات وغیرہ جاننے کے لیے جبکہ الٰہی امتحان و حساب اس مقصد کے لیے نہیں ہوگا بلکہ اس کے اہداف اس کے بجائے کچھ اور ہیں منجملہ ایک ہدف لوگوں پر اتمام حجت ہے۔

۲۔کون حساب لے گا؟

اصول توحید کی بنیاد پر تمام اسباب و عوامل کی انتہا خدا تعالیٰ کی ذات پر ہے۔ وہی تمام موجودات کا مبدا ہے اور وہی

مسبب الاسباب ہے۔

اب کلام یہ ہے کہ جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے دنیوی نظام کو قانون علیت پر استوار کیا ہے اور اپنی کچھ مخلوقات کو مدبرات امور (فالمدبرات امرا) کے طور پر متعین فرمایا ہے کیا آخرت میں بھی قانون علیت حاکم ہوگا اور خدا تعالیٰ اپنی کچھ مخلوقات کو لوگوں کے محاسبہ کے لیے معین فرمائے گا یا اس کام کو خود انجام دے گا؟

جواب

بعض آیات کا ظاہر بلکہ صراحت اس میں ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ خود لوگوں کا محاسبہ کرے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾ (رعد: ۴۰)

''احکام کا پہنچانا تم پر ہے اور ان کا حساب کتاب ہم پر ہے''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اِلَيۡنَاۤ اِيَابَهُمۡ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا حِسَابَهُمۡ ﴿۲۶﴾ (غاشیہ: ۲۵، ۲۶)

''بہ تحقیق ان کا لوٹنا ہماری طرف ہے اور ان کا حساب ہم پر ہے''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰى رَبِّىۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ (شعراء: ۱۱۳)

''ان کا حساب خدا کے علاوہ کسی اور پر نہیں اگر تم محسوس کر سکو''

یہ بھی ارشاد ہے:

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا ﴿۶﴾ (نساء: ۶، احزاب: ۳۸)

''لوگوں کا محاسبہ کرنے کے لیے خدا کافی ہے''

لیکن کچھ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر انسان خود اپنے آپ کا محاسبہ کرے گا۔ نفس انسانی کے علاوہ کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰۤئِرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰٮهُ مَنۡشُوۡرًا ﴿۱۳﴾ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ﴿۱۴﴾ (بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴)

''ہر انسان کے عمل کو ہم نے اس کے ساتھ لازم کر دیا ہے۔ اسے قیامت کے دن کتاب کی صورت میں نکالیں گے انسان اسے کھلا ہوا پائے گا اور اسے کہا جائے گا اپنی کتاب پڑھو۔ آج کے دن یہی کافی ہے کہ تمہارا نفس تمہارے اعمال کا محاسبہ کرے''

اس آیت کا مفہوم گذشتہ آیات کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں انسان کے تمام اعمال اس کی آنکھوں کے سامنے کتاب کی صورت میں لائے جائیں گے اور انسان دنیا میں اپنے کیے ہوئے کاموں کی واقعیت کا مشاہدہ کرے گا کیونکہ ان اعمال کی واقعیت اس پر ظاہر ہو چکی ہوگی۔ اب اس کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جائے گی گویا اپنے اعمال پر وہ خود گواہی دے گا۔ اور بالفاظ دیگر سابقہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خدا کے علاوہ کوئی دوسرا لوگوں کے اعمال کے محاسبہ میں دخالت نہیں رکھتا اور اس آیت میں خدا کے حساب لینے کی کفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ خدا ہر شخص کے اعمال کو اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرے گا تا کہ وہ خود اپنے اعمال کی واقعیت کو دیکھ کر ان کی جزا و سزا کو پالے۔

روایات کا فیصلہ

بعض روایات میں بھی یہی مطلب بیان کیا گیا ہے جو آیات سے استفادہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کا حساب لینا صرف خدا پر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام عائشہ کی آپؑ سے دشمنی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ اپنے سینے میں میرے کینے کو پرورش دے رہی ہے۔ اس کے اندر میری دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہے جیسے لوہے کی بھٹی آگ سے دہکتی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کے سابقہ احترام (پیغمبر اکرمؐ کی زوجہ ہونے کی وجہ سے) کی رعایت کرتا ہوں اور ہمارا حساب خدا پر ہے''[۱]

لیکن کچھ دوسری روایات میں وارد ہوا ہے کہ شیعوں کا حساب آئمہ علیہم السلام کے ذمے ہے۔ عبداللہ بن سنان امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا شیعوں کا حساب ہمارے حوالے کر دے گا۔[۲]

ایک اور روایت میں امام صادق سورہ غاشیہ کی آیت ۲۶ کی تفسیر کرتے ہوئے اس قسم کی گفتگو فرماتے ہیں

(ان علینا حسابھم) [۳]

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۶

[۲] بحار جلد ۷، ص ۲۶۴

[۳] بحار جلد ۷، ص ۲۷۴

زیارت جامعہ کبیرہ میں بھی وارد ہوا ہے:

و ایاب الخلق الیکم و حسابهم علیکم

"کہ لوگوں کا لوٹنا تمہاری طرف ہے اور ان کا حساب تم پر ہے"

جیسا کہ آپ نے دیکھا زیارت جامعہ کے جملے کا مضمون ان روایات کی نسبت زیادہ وسعت وصراحت رکھتا ہے۔

اور چونکہ آئمہ علیہم السلام کا محاسب ہونا بھی خدا تعالیٰ کے اذن کے ساتھ ہے لہٰذا آئمہ کا محاسب ہونا محاسبہ کے ذات خدا میں منحصر ہونے کے منافی نہیں ہوگا (کہ جو مفادِ آیات مذکورہ ہے) اس قسم کی چیزیں قرآن میں فراواں پائی جاتی ہیں۔

بنابریں ممکن ہے خدا تعالیٰ تمام لوگوں یا کچھ لوگوں کا حساب آئمہ معصومین کے ذمے لگا دے اور چونکہ ان جیسے مسائل کا اثبات و نفی عقل کے دائرہ کار سے خارج ہے۔ لہٰذا ان مسائل میں وحی سے مدد لینا ہوگی اور اسی پر اعتقاد رکھا جائے جسے قطعی دلیلیں ثابت کردیں۔

۳۔ کن اعمال کے بارے میں سوال ہوگا؟

اس بحث سے مربوط آیات دو قسم کی ہیں:

ا۔ وہ آیات جن سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے جتنے کام بھی انجام دیے ہوں گے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(الف) وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴿۹۳﴾ (نحل: ۹۳)

"جو جو کام تم نے کیے ہوں گے ان کے بارے میں قطعاً تم سے سوال کیا جائے گا"

(ب) لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔلُوۡنَ﴿۲۳﴾ (انبیا: ۲۳)

"جو کچھ خدا کرتا ہے اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا جو کام وہ کرتے ہیں ان کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا"

(ج) ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ﴿۷﴾ (زمر: ۷)

"پھر تمہاری بازگشت تمہارے رب کی طرف ہوگی اور وہ تمہیں تمہارے ان کاموں کی خبر دے گا جو تم انجام دیتے رہے ہو اور وہ تمہارے دلوں سے آگاہ ہے"۔

(د) يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾ (زلزلہ: ۶)

''قیامت کے دن لوگ گروہ در گروہ قبروں سے نکلیں گے تا کہ اپنے اعمال (یا ان کی جزا و سزا) کو پالیں''۔

ان آیات کے علاوہ جزا و سزا پر مشتمل آیات بھی اس مطلب پر وسعت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں۔

ii- لیکن ان کے مقابل کچھ دوسری آیات دلالت کرتی ہیں کہ قیامت کے دن کچھ خاص چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(الف) نعمات الٰہی کے بارے میں سوال ہوگا:

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝٨ (تکاثر: ۸)

''پھر یقیناً تم سے الٰہی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا''

آیات میں نعمات الٰہی کے بارے میں سوال کا تذکرہ ہوا ہے اور چونکہ لفظ ''نعیم'' استعمال کیا گیا ہے لہٰذا ایک طرف سے تو تمام الٰہی نعمتیں اس میں شامل ہو جائیں گی اور دوسری طرف سے ہر وہ چیز جو بشر کو زندگی میں حاصل ہے اور وہ سب نعمات الٰہی شمار ہوں گی۔ لہٰذا انسان کے تمام کام مورد سوال واقع ہوں گے کیونکہ انسان کا ہر کام کسی نہ کسی طریقے سے نعمات الٰہی میں تصرف ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ آیت بھی پہلی قسم کی آیات کے زمرے میں داخل ہو جائے گی۔

(ب) قرآن کے بارے میں سوال ہوگا[1]۔

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُونَ ۝٤٤ (زخرف: ۴۴)

''بتحقیق قرآن ذکر ہے تمہارے (پیغمبرؐ) اور تمہاری قوم کے لیے اور عنقریب تم سے سوال کیا جائے گا''

(ج) گواہیوں کے بارے میں سوال:

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُونَ ۝١٩ (زخرف: ۱۹)

''ان کی گواہیاں لکھ لی جائیں گی اور ان سے سوال کیا جائے گا''

(د) بے گناہ قتل کے بارے میں:

وَإِذَا الْمَوْءُۥدَةُ سُئِلَتْ ۝٨ بِأَىِّ ذَنۢبٍ قُتِلَتْ ۝٩ (تکویر: ۸،۹)

''جب زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا کہ انہیں کس گناہ کی وجہ سے قتل کیا گیا۔

(ھ) جھوٹ اور تہمتوں کے بارے میں:

تَاللَّهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ۝٥٦ (نحل: ۵۶)

---

[1] قرآن سے متعلق حساب و سوال والی آیات کے لیے سورہ حجر کی آیات ۹۱ تا ۹۳ کی طرف بھی مراجعہ کیا جائے۔

”خدا کی قسم! تم سے ان تہمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا جو تم باندھتے تھے۔

(و) سچوں کی سچائی کے بارے میں:

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸ (احزاب: ۸)

”تا کہ خدا تعالیٰ سچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے اُس نے دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے“

البتہ چند خاص موضوعات کا سوال کے لیے خاص کر دینا سوال کی عمومیت کے منافی ہے کیونکہ یہ چیزیں اپنی اہمیت کی وجہ سے لسان وحی میں خاص طور پر ذکر کی گئی ہیں۔ اور اتفاقاً روایات میں بھی یہ تقسیم وارد ہوئی ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ تمام کاموں کے بارے میں سوال ہوگا جب کہ بعض روایات نے چند مخصوص چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”انسان جو کام اس دنیا میں انجام دیتا ہے قیامت کے دن اس کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے“[۱]

آپؑ نے جو خط اپنے ایک گورنر کو لکھا تھا اس میں ایک جگہ حضرتؑ فرماتے ہیں:

”عنقریب تمہاری عمر اختتام پذیر ہو جائے گی اور تمہیں مٹی کے نیچے چھپا دیا جائے گا اور ایسی جگہ پر کہ جہاں ظالمین کے لیے صرف حسرت وغم ہوگا تمہارے اعمال تمہارے سامنے پیش کیے جائیں گے“[۲]

اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں کہ یہاں پر جن کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

۲۔ بعض روایات میں سوال وحساب کو کچھ اعمال اور فرائض الٰہی سے مشروط کیا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ عمر

۲۔ جوانی کا زمانہ

۳۔ اعضاء وجوارح سے استفادہ کی کیفیت

۴۔ دولت کمانا اور خرچ کرنا

۵۔ محبت اہل بیتؑ

۶۔ قرآن وعترت

---

[۱] نہج البلاغہ حکمت ۶

[۲] نہج البلاغہ خط: ۴۱

۷۔ نماز

۸۔ نبوت وولایت

اب ان موارد کے بارے میں ہم کچھ روایات کو ذکر کرتے ہیں:

(الف) رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا قیامت کے دن کوئی بندہ قدم نہیں اُٹھائے گا مگر یہ کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

۱۔ اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں خرچ کی؟

۲۔ جوانی کے بارے میں کہ کہاں صرف کی اور کیسے گزاری؟

۳۔ مال ودولت کے بارے میں کہ کیسے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا؟

۴۔ محبت اہل بیتؑ کے بارے میں

۵۔ توحید ونبوت کے بارے میں [۱]

(ب) ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنا ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا:

''قیامت کے دن سب سے پہلی چیز جس کے بارے میں پوچھا جائے گا نماز ہے اگر نماز قبول کر لی گئی تو تمام اعمال قبول ہو جائیں گے'' [۲]

(ج) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

''قیامت کے دن سب سے پہلے میں خدا کے حضور حاضر ہوں گا اور پھر قرآن اور پھر اہل بیتؑ اور اس کے بعد میری امت۔ اس کے بعد امت کے اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور ان کے قرآن وعترت کے ساتھ سلوک کے بارے میں سوال کیا جائے گا''

(د) جمیل بن دراج کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ سے قرآن کی اس آیت (ثم لتسلن یومئذ عن النعیم) کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو حضرتؑ نے فرمایا:

''امت سے نعمت رسولؐ واہلبیتؑ کے بارے میں سوال کیا جائے گا''۔ [۳]

حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] بحارالانوار جلد ۷، باب ۱۱ روایات ۱، ۳، ۱۱، ۳۱

[۲] بحار جلد ۷، باب ۱۱ رویت ۳۳

[۳] بحار جلد ۷، باب ۱۱ رویت ۲۲

''مرنے کے بعد انسان سے سب سے پہلے خدا کی وحدانیت پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور خدا اور رسول کی طرف سے مومنین پر تیری ولایت (حضرت علیؑ کی ولایت) کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس جو بھی ان کا معتقد ہوگا اور اقرار کرے گا تو اسے جاوداں نعمتوں سے نوازا جائے گا''۔[1]

خدا کی دنیوی نعمتوں کا حساب روایات کی نظر میں

حساب سے مربوط بحثوں میں سے روایات میں خدا کی دنیوی نعمتوں کا حساب بھی ہے۔ اس بارے میں روایات کا مفاد و مضمون درج ذیل ہے:

۱۔ تمام دنیوی نعمات کا حساب لیا جائے گا حتیٰ کہ وہ نعمات بھی جو حلال طریقے سے حاصل کی گئی ہوں۔ حضرت علیؑ اس بارے میں یوں فرماتے ہیں:

فی حلالها حسابٌ و فی حرامها عقاب[2]

''خدا کی حلال دنیوی نعمتوں میں حساب ہے اور جو چیز حرام طریقے سے حاصل کی جائے اس پر عقاب ہے''

نیز آپؑ فرماتے ہیں:

اتقوا الله فی عبادہ و بلادہ فانکم مسئولون حتیٰ عن البقاع والبهآئم [3]

''خدا کے بندوں اور اس کے شہروں (مقدس شہروں) کے بارے میں تقویٰ الٰہی کی رعایت کرو کیونکہ تم سے سوال کیا جائے گا یہاں تک کہ حیوانات اور مکانات کے بارے میں بھی تم سے سوال کیا جائے گا''

۲۔ جو چیز بھی راہ خدا میں خرچ کی گئی ہو اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ جناب پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''قیامت کے دن خدا کی تمام نعمات کے بارے میں سوال کیا جائے گا مگر وہ چیز جو راہ خدا میں خرچ کی گئی ہو''

۳۔ مومنین سے بعض نعمات خدا کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔[4]

حلبی امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ''مومن سے تین چیزوں کا حساب نہیں لیا جائے گا''۔

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۱ روایت ۳۹

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۸۲

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۷

[4] بحار جلد ۷، باب ۱۱ روایت ۲۳

۱۔ وہ کھانا وہ کھاتا ہے۔

۲۔ جو لباس وہ پہنتا ہے۔

۳۔ وہ نیک زوجہ جو اسے گناہ سے بچائے۔[1]

ان روایات کی تحلیل وتشریح اس طرح ہوگی:

(الف) دوسری روایت کا مطلب تو بالکل واضح ہے کہ جو نعمات راہ خدا میں خرچ کی گئی ہیں۔ ان کا حساب نہیں لیا جائے گا لہٰذا ان پر مؤاخذہ و عقاب وغیرہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) اس سے تیسری روایت کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مومن سے کچھ نعمات الٰہی کا حساب نہیں لیا جائے گا چونکہ ممکن ہے مراد یہ ہو کہ مومنین اپنے بہترین اعمال کی وجہ سے خدا کی خاص رحمت ولطف کے مستحق قرار پاجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خدا کی کچھ نعمات کا ان سے حساب نہیں لیا جائے گا (یعنی وہ نعمات جو ضروریات زندگی شمار ہوتی ہوں)

(ج) اب یہیں سے پہلی روایت جس میں کہا گیا کہ تمام دنیوی نعمات کا حساب لیا جائے گا کہ استثناء کا پتہ چل جائے گا۔ چونکہ خود پہلی روایت نے جب کہا کہ تمام نعمات کا حساب ہوگا تو یہ دو لحاظ سے عمومیت رکھتی ہے۔

۱۔ چاہے وہ نعمات خدا کی راہ میں خرچ کی گئی ہوں یا اس کے علاوہ کسی اور مورد میں۔

۲۔ مومن وغیر مومن اس بارے میں فرق نہیں رکھتے۔

لیکن دوسری اور تیسری روایت نے ان دو جہات کا تذکرہ کیا ہے کہ جو نعمت خدا کی راہ میں خرچ کی جائے اس کا حساب نہیں ہوگا اور مومن سے کچھ نعمات کا حساب نہیں لیا جائے گا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ پہلی روایت کو ان دو روایات کی وجہ سے تخصیص حاصل ہو جائے گی۔

۴۔ آیا سب سے حساب لیا جائے گا

حساب وسوال کے باب میں ایک اور مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ آیا حساب وسوال سب سے ہوگا یا کچھ لوگوں کو بغیر حساب وسوال کے جزا یا سزا دی جائے گی۔ اس بارے میں چند قسم کی آیات ہیں:

(الف) سوال وحساب عمومی ہوگا

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (اعراف: ۶)

''جن لوگوں کی طرف انبیاء بھیجے گئے ان سے ہم سوال کریں گے اور رسولوں سے بھی ہم سوال کریں گے''

یہ آیت بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کررہی ہے کہ امتوں سے بھی سوال ہوگا اور جو انبیاء ان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ان سے

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۱ روایت ۱۰

بھی سوال ہوگا۔ رسولوں سے ابلاغ احکام کے بارے میں اور امتوں سے قبولیت وعمل کے بارے میں سوال ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام سوال کی عمومیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ذلك یوم یجمع الله فیه الاولین والاخرین لنقاش الحساب [۱]

''وہ دن جس میں خدا اولین و آخرین کو جمع کرے گا تا کہ ان سے دقیق حساب لیا جائے۔

(ب) کسی سے بھی سوال نہیں ہوگا:

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝۳۹ (الرحمن: ۳۹)

''جس دن جن وانس میں سے کسی سے بھی اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا''

نیز ارشاد ہے:

وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۷۸ (قصص: ۷۸)

(ج) ظالمین سے سوال کیا جائے گا:

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝۲۲ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝۲۳ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ۝۲۴ (صافات: ۲۲ تا ۲۴)

''ظالمین اور ان کے مددگاروں کو لے آؤ اور ان کو بھی جن کی وہ پرستش کرتے تھے اور دوزخ کی طرف لے چلو اور انہیں روکو کیونکہ ان سے سوال کیا جائے گا''۔

(د) صابرین کو بغیر حساب کے اجر دیا جائے گا:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰

(زمر: ۱۰)

''کہہ دو! اے مومن بندو! تقویٰ اختیار کرو، اچھائی ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی اور (تقویٰ کی رعایت کے لیے) خدا کی زمین وسیع ہے اور صرف صابرین کو بغیر حساب کے بہت زیادہ اجر دیا

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۲

جائے گا''

کلمہ ''بغیر حساب'' سے کیا مراد ہے اس بارے میں دو نظریے ہیں:

۱۔ یہ کلمہ قید ہے ''یوفی'' کے لیے یعنی صابرین کو اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا چاہے ان کا اجر کم ہو یا زیادہ یعنی ان سے حساب نہیں ہوگا۔

۲۔ یہ کلمہ ''اجرھم'' کے لیے قید ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ بغیر حساب کے اجر ملے گا۔ یعنی اگرچہ ان سے پہلے حساب لے لیا جائے گا لیکن جب اجر دینے کی باری آئے گی تو انہیں بے اندازہ اجر دیا جائے گا۔

پہلے معنی سیاق آیت کے زیادہ قریب ہیں۔ اس کی بنا پر صابرین سے قیامت کے دن حساب نہیں ہوگا۔

سیاق آیت کو دیکھتے ہوئے صابرین کا مطلب یہ بنتا ہے کہ وہ خدا پرست جو کفار کی طرف سے ڈھائے جانے والے ستم پر صبر کرتے تھے۔ جناب پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا:

''جب دفتر حساب و کتاب کھولا جائے گا تو مصیبت جھیلنے والوں اور صبر کرنے والوں کا حساب و کتاب نہیں کھولا جائے گا اور ان سے حساب نہیں لیا جائے گا''۔ [1]

تکوینی اور تدوینی حساب

ان آیات کی توضیح و تشریح سے پہلے یہ بات ذکر کر دینا ضروری ہے کہ حساب کی اصطلاح دو معنی میں استعمال کی گئی ہے:

۱۔ حساب تکوینی

۲۔ حساب تدوینی

حساب تکوینی

حساب تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ نظام خلقت ایک قسم کے نہ ٹوٹنے والے قوانین اور دقیق محاسبات پر قائم ہے۔ ستاروں کا طلوع و غروب، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، پودوں کا اگنا اور رشد کرنا اور پھر تولید مثل کرنا۔ نظام کائنات کے یہ تمام امور حساب شدہ ہیں اور ایک دقیق نظم پر مبنی ہیں۔

قرآن کریم سورج اور چاند کی منظم و باحساب حرکت کے بارے میں فرماتا ہے:

اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۪﴿۵﴾ (الرحمن: ۵)

---

[1] المیزان جلد ۱۷، ص ۲۴۵

سورج اور چاند اور ان کی حرکت حساب کے ساتھ ہے۔[۱]

یہ نظم و حساب تکوینی امور کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا بلکہ بشر کی انفرادی و اجتماعی زندگی بھی اس کے تحت ہے اور قرآن اس کا ذکر سنت الٰہی کے طور پر کرتا ہے۔[۲]

انسان کے نیک و بد اعمال اس کی انفرادی و اجتماعی سرنوشت و انجام میں موثر ہوتے ہیں اور اس کے تکامل یا انحطاط، سعادت یا شقاوت اور فتح یا شکست و ریخت کے موجب بنتے ہیں۔

یہ خدا کی مستحکم سنت انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی بلکہ اس کی اخروی زندگی میں بھی جاری ہے اور انسان آخرت میں وہی کاٹے گا جو اس نے دنیا میں بویا تھا (الدنیا مزرعة الاخرة) اور اخروی جزا و سزا کا قانون بھی بہت سی قرآنی آیات کی رو سے اسی اساس پر قائم ہے۔

حساب تکوینی کی بنیاد پر حساب کا عمومی ہونا ایک بدیہی و واضح امر ہے کیونکہ تمام انسان مومن ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بدکار اور بہ تعبیر قرآن اصحاب یمین ہوں یا اصحاب شمال سب کے سب آخرت میں اسی کی جزا و سزا پائیں گے جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا ہوگا۔

حساب تدوینی

حساب کی دوسری قسم حساب تدوینی ہے۔ حساب تدوینی کی معروف قسم تو وہی ہے جو لوگوں کی اپنی زندگی میں رائج ہے اور وہ اپنی زندگی میں سود و زیاں کا حساب کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔

اس کی ایک صورت وہ آڈٹ ٹیمیں ہیں جو حکومتی اداروں کا محاسبہ کرتی ہیں اور تمام حکومتی شعبوں اور لین دین کا حساب کرتی ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ جو بجٹ ان کو دیا گیا تھا اسے انہوں نے کیسے خرچ کیا اور انہوں نے دفتری اوقات کو کس طرح گزارا۔

ظاہراً معلوم یہ ہوتا ہے کہ آخرت میں لیا جانے والا حساب بھی حساب تدوینی ہی کی قسم سے تعلق رکھتا ہے اور وہ بھی اس دوسری صورت والا حساب کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو خلق کیا اور سرمایۂ حیات اسے دے دیا۔ اور اس سرمائے سے استفادہ کے لیے آئین و شریعت بھی انہیں بتا دی۔ اب قیامت کے دن ان سے سوال کیا جائے گا اور ان کے اعمال کا حساب ہوگا کہ قانون الٰہی کی اساس پر تم نے اس سرمایۂ حیات سے کس طرح استفادہ کیا یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے نامۂ اعمال کو کھولا جائے گا اور سب لوگ اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں گے۔ وہ نامۂ اعمال کچھ لوگوں کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور ان لوگوں کے لیے حساب دینا آسان ہوگا۔[۳]

---

[۱] اس بارے میں آیات ۳۸، ۳۹ اور ۴۰ سورہ یٰسین کی طرف مراجعہ کیا جائے۔

[۲] اس کے لیے احزاب ۳۸، ۶۲ و فاطر ۴۳ و مومن ۸۵ و فتح ۲۳ و بنی اسرائیل ۷۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۳] فاما من اوتی کتبه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا (انشقاق: ۷، ۸)

کچھ لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اسے دیکھ کر شرمندہ اور غمگین ہو جائیں گے اور آرزو کریں گے کہ کاش انہیں ان کا نامہ اعمال نہ دیا جاتا۔[1]

گذشتہ آیات کی توضیح وتشریح

سابقہ مطالب سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قیامت کے دن والے حساب اور اس کی عمومیت سے متعلق ہماری بحث تدوینی حساب کے حوالے سے ہے نہ کہ تکوینی اعتبار سے۔ کیونکہ تکوینی حساب کا عمومی ہونا بدون شک وتردد ثابت ہے کیونکہ تکوینی حساب یعنی اعمال کے مطابق جزا وسزا دینے کا قانون اور یہ چیز قطعاً کسی ایک گروہ کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ تمام افراد بشر کے لیے ہے۔ یہیں سے بعض اہل نظر کے اشتباہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

جب موضوع بحث مکمل طور پر واضح ہو گیا تو اب حساب وسوال کی عمومیت وعدم عمومیت سے مربوط آیات کی تحقیق وتوضیح کی طرف آتے ہیں۔

پہلی اور دوسری قسم کی آیات میں ظہور کے ساتھ تباین کلی کی نسبت پائی جاتی ہے کیونکہ پہلی قسم کی آیات کا مفاد یہ ہے کہ سب لوگوں سے حساب ہوگا جب کہ دوسری قسم کی آیات کا مفاد یہ ہے کہ کسی سے بھی سوال وحساب نہیں ہوگا۔

چونکہ ایسا تناقض وتباین نا قابل قبول ہے اور یہ اختلاف اس اصول کے منافی ہے کہ قرآنی آیات آپس میں ہم آہنگی ومناسبت رکھتی ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان آیات کا مطلب سمجھنے کے لیے زیادہ غور وفکر سے کام لیا جائے۔

ان دو قسم کی آیات میں جمع کرنے کے لیے مفسرین نے کئی وجوہ ذکر کی ہیں ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

i- یہ جو کہا گیا ہے کہ آخرت میں سوال نہیں کیا جائے گا اس سے مراد یہ ہے کہ جو طریقہ دنیوی عدالتوں میں رائج ہے اس کی طرح سوال نہیں کیا جائے گا مثلاً یہ کسی سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں جرم تم نے کیوں کیا بلکہ اس کے بجائے ان کے گناہوں کے آثار و واقعیت ان کے وجود میں منعکس کر دیئے جائیں گے جس کی وجہ سے وہ خود اور دوسرے لوگ ان کے مجرم ہونے سے مطلع ہو جائیں گے اور اس تفسیر پر شاہد سورہ رحمن کی آیت ۴۰ ہے۔ جہاں ارشاد ہوتا ہے:

فیو مئذٍ لا یسئل عن ذنبه انس و لا جان

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

یعرف المجرمون بسیماهم

''مجرم اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے''

---

[1] و اما من اوتی کتبه بشماله فیقول یلیتنی لم اوت کتبیه (حاقه:۲۵)

ii۔ قیامت میں بہت سے مقامات ومواقف ہیں (کہ جہاں پر انسان کو ٹھہرا کر سوال کیے جائیں گے) ممکن ہے اور بعض مواقف میں اس کے گناہوں کے بارے میں سوال کیا جائے اور بعض مواقف میں نہ کیا جائے"۔

iii۔ مقصد یہ ہے کہ ان سے زبانی سوال نہیں ہوگا بلکہ ان کے اعضاء سے سوال ہوگا اور اعضاء اپنے اعمال پر شہادت دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۶۵﴾ (یٰسین: ۶۵)

"قیامت کے دن ہم ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہوں گے"۔

iv۔ نفی سوال کا مطلب یہ ہے کہ حساب کے قطعی ہونے اور گناہگاروں کے دوزخ میں بھیجنے کے بعد ان سے سوال نہیں ہوگا۔ جو آیات سوال کو ثابت کرتی ہیں ان سے مراد گناہگاروں کی سزا کے واضح ہونے سے پہلے ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴿۲۴﴾ (صافات: ۲۴) [1]

سابقہ مطالب سے تیسری قسم کی آیات (کہ ظالمین سے سوال نہیں کیا جائے گا) پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہی سابقہ وجوہ ان آیات میں بھی جاری ہیں۔

یہ کہ صابرین کو بغیر حساب لیے اجر دیا جائے گا، اسے آپ ایک استثنا اور حساب کے عمومی ہونے والی آیات کے لیے ایک تخصیص کہہ سکتے ہیں۔

حساب کا عمومی ہونا روایات کی نظر میں

اس بارے میں روایات کے مضامین تین قسم پر تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ حساب سب سے ہوگا۔

۲۔ مشرکین بغیر حساب کے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

۳۔ کچھ مومنین بغیر حساب کے جنت میں بھیجے جائیں گے۔

ان مطالب سے مربوط روایات درج ذیل ہیں:

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۲، ص ۳۹۸ و المیزان جلد ۱۶، ص ۷۵، و جلد ۱۹، ص ۱۲۱ کی طرف مراجعہ کیا جائے۔

(الف) امام محمد باقرؑ پیغمبر گرامیؐ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اے قرآن کے قاریو! قرآن کے بارے میں تقویٰ اختیار کرو کیونکہ اللہ نے حفظ وفہم قرآن کا سنگین بوجھ تمہارے کندھوں پر ڈالا ہے اور یقیناً مجھ سے بھی سوال کیا جائے گا اور تم سے بھی۔ مجھ سے احکام الٰہی کے ابلاغ کے بارے میں اور تم سے قرآن وسنت کے بارے میں۔ [۱]

حضرت علیؑ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ سب انسانوں کو جمع کرے گا تاکہ ان کے اعمال کا دقیق حساب لے۔ [۲]

(ب) امام زین العابدینؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

اے خدا کے بندو! جان لو کہ مشرکین کے لیے کوئی میزان نصب نہیں کیا جائے گا۔ ان کے اعمال نامے کھولے نہیں جائیں گے بلکہ صرف موحدین کے اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ [۳]

جناب شیخ صدوق عیون الاخبار میں تین اسناد کے ساتھ امام رضا سے اور آنجناب اپنے آباواجداد اور پیغمبر اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ خدا تمام گنہگاروں سے حساب لے گا سوائے مشرکین کے۔ انہیں خدا بغیر حساب کے جہنم بھیج دے گا۔ [۴]

(ج) پیغمبرؐ سے ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مومنین کے تین گروہ ایسے ہوں گے جن سے حساب نہیں لیا جائے گا اور وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے:

۱۔ صابرین ۲۔ بردبار ۳۔ مخلصین

خدا کی طرف سے دوبارہ ندا آئے گی کہ آج خدا کے ہمسائے کہاں ہیں تو کچھ لوگ کھڑے ہو جائیں گے ملائکہ ان کا استقبال کرتے ہوئے پوچھیں گے کہ تم نے دنیا میں کون سا ایسا کام کیا جس کی وجہ سے آج تمہیں یہ شرف حاصل ہوا ہے۔

امام محمد باقرؑ پیغمبر اکرمؐ سے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سب لوگ خوف میں ہوں گے لیکن اس گروہ (کہ جو رحمت الٰہی کے جوار میں جگہ پا چکے ہوں گے) کہ کوئی خوف نہیں ہوگا۔ سب سے حساب لیا جائے گا، سوائے ان کے۔ [۵]

---

[۱] اصول کافی جلد ۲، ص ۲۰۶

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۲

[۳] بحار جلد ۷، باب ۱۱، حدیث ۲

[۴] بحار جلد ۷، باب ۱۱، حدیث ۷

[۵] بحار جلد ۷، باب ۸، روایت ۱

ان روایات کی توضیح و تحقیق

پہلی قسم والی روایات کا مفہوم پہلی قسم کی آیات کے موافق و ہم آہنگ ہے اور وہ یہ کہ حساب تدوینی عمومیت رکھتا ہے۔ اور تیسری قسم والی روایات کا مفہوم اس آیت کے موافق ہے جس میں صابرین کے اجر کا ذکر کیا گیا ہے اگر چہ اس روایت کا مضمون آیت کی نسبت وسعت رکھتا ہے کیونکہ روایت نے صابرین کے ساتھ مخلصین اور بردباروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لیکن جو کچھ دوسری قسم والی روایات میں آیا ہے اس کا تذکرہ آیات میں نہیں ہوا اور وہ یہ کہ مشرکین سے حساب نہیں لیا جائے گا۔

البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی قسم کے لیے حساب کا نہ ہونا افتخار و سربلندی ہے اور دوسری قسم (مشرکین) کے لیے مایۂ خفت و شرمندگی۔

دوسرے لفظوں میں، پہلا گروہ اپنے بلند مقام کی وجہ سے حساب سے مستثنیٰ و مبرا ہے اور مشرکین اپنی پستی و ذلت کی وجہ سے حساب سے مستثنیٰ ہیں یا بالفاظ دیگر پہلے گروہ کے لیے حساب کا نہ ہونا ایک قسم کا اجر ہے اور مشرکین کے لیے حساب کا نہ ہونا ایک قسم کی سزا ہے۔ یہاں پر ایک اور قسم روایات کی ایسی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے شیعہ و محبین بھی حساب سے مبرا و معاف ہوں گے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر شیعوں کا وہ گروہ مراد ہے جن کا تذکرہ تیسری قسم والی روایات میں ہوا ہے۔ اگر یہ مراد ہو تو پھر یہ روایات کی علیحدہ قسم شمار نہیں ہوگی۔

آخر میں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ مشرکین سے حساب نہیں ہوگا وہ روایات خود اس بات پر شاہد ہیں کہ حساب تکوینی اور حساب تدوینی دو الگ چیزیں ہیں کیونکہ مشرکین حساب تدوینی نہیں رکھتے اگر چہ حساب تکوینی رکھتے ہیں۔

۵۔ اللہ سریع الحساب ہے

قرآن میں حساب سے مربوط بحثوں میں سے ایک بحث خدا کا سریع الحساب ہونا ہے اور یہ سریع الحساب ہونا خدا کی ایسی صفت ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن اور روایات کے علاوہ دعائے جوشن کبیر میں بھی ہوا ہے "یا من هو سریع الحساب" جن آیات میں اس کا تذکرہ ہوا ہے۔ درج ذیل ہیں:

اَلۡیَوۡمَ تُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡیَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۷﴾ (مومن:۱۷)

"آج ہر کسی کو جو اس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دی جائے گی اور آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ بہ تحقیق خدا لوگوں کا

حساب جلدی کرنے والا ہے“[1]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جلدی حساب لینے کا کیا مطلب ہے؟

مفسرین نے اس ضمن میں مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

i۔ مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جلد ہی نیک یا بد اعمال پر جزا یا سزا دے گا یعنی اعمال کی جزا کا وقت قریب ہے جیسا کہ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ (نحل: ۷۷)

اس صورت میں حساب سے مراد اعمال کی جزا ہوگی اور لغت عرب میں حساب کفو و برابری کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے چونکہ جزا اعمال کے برابری دی جائے گی لہٰذا اسے حساب کہا گیا ہے۔

ii۔ مراد یہ ہے کہ آخرت میں خدا بندوں کا حساب جلد ہی نمٹا لے گا یعنی زیر محاسبہ افراد کی کثرت حساب کے طولانی ہو جانے کا موجب نہیں بنے گی اور نہ ہی کسی پر ظلم ہوگا اور نیک لوگ کمترین وقت میں اپنے اعمال کی جزا پا لیں گے۔ حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ خدا تعالیٰ جیسے تمام لوگوں کو اکٹھی ایک ہی وقت میں روزی دیتا ہے اسی طرح ان کا حساب بھی لے گا۔[2]

iii۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کا حساب آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اسی دنیا میں انسان جو عمل انجام دیتا ہے نیک ہو یا بد اس کی جزا و سزا سے دی جاتی ہے۔ اطاعت و عبادات کی جزا خدا کی توفیقات کے ذریعے سے اور گناہ و معاصی کی سزا خدا کی طرف سے ذلت و رسوائی کے ذریعے سے۔

بالفاظ دیگر ہر نیک کام کسی دوسرے نیک کام کا موجب بنتا ہے اور ہر برا کام شر و رسوائی کا موجب بنتا ہے۔ یہ بات ان کے لیے تو بالکل واضح ہے جو ہمیشہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے روایات میں آیا ہے:

حاسبوآ انفسکم قبل ان تحاسبوا

”اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے تم خود اپنا محاسبہ کرو“[3]

ان وجوہ کے ذکر کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کون سی وجہ زیادہ صحیح ہے اور کیا قرآن کے مطالعے سے خدا تعالیٰ کے سریع الحساب ہونے کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے؟

---

[1] بقرہ ۲۰۲ آل عمران: ۱۹، ۱۹۹، مائدہ۔ ۴، انعام: ۶۲، رعد: ۴۱، ابراہیم: ۵۱ اور نور ۳۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] مجمع البیان جلد ۱ ص ۲۹۸، الکشاف جلد ۱ ص ۲۴۸

[3] اسی وجہ کو جناب فیض کاشانی نے تفسیر الصافی میں اختیار کیا ہے۔

بہت سی وہ آیات جن میں خدا تعالیٰ کا سریع الحساب ہونا ذکر ہونا ہے بعض صریحاً اخروی حساب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں از جملہ ابتدائے بحث میں ذکر کی جانے والی پہلی آیت اور سورہ ابراہیم کی آیت ۱۵، انعام کی آیت ۶۲ ہیں۔ کچھ آیات کا ظاہری معنی یہ ہے مثلاً سورہ نور کی آیت ۳۹۔

لیکن کچھ آیات کے مفہوم میں اطلاق کے لحاظ سے دنیوی حساب بھی شامل ہے بلکہ بعض آیات میں تو ایسے قرائن بھی پائے جاتے ہیں جن سے حساب کا عام ہونا دنیوی حساب کی نسبت زیادہ موردتا کید قرار پاجاتا ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ میں ہے:

و من یکفر بایات اللہ فان اللہ سریع الحساب

''جو بھی خدا کی آیات کا انکار کرے تو بہ تحقیق خدا سریع الحساب ہے''

اس آیت میں خدا کا سریع الحساب ہونا بطور مطلق ذکر ہوا ہے لہٰذا ممکن ہے حساب دنیا مراد ہو اور ممکن ہے کہ حساب اُخروی مراد ہو۔ دنیوی سزا کا نتیجہ انسان کا انسانیت کے عالی مرتبے اور حیات معنوی سے محرومیت ہے اور بغیر کسی شک وشبہ کے کافر کو یہ سزا ملتی ہے۔ آخرت میں کافروں کی سزا دوزخ ہے اور چونکہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیک کام نہیں ہوگا لہٰذا قیامت کے دن ان پر گواہ لانے یا حساب کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ قیامت بر پا ہوتے ہی انہیں جہنم کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔

دنیوی حساب بھی حساب کی عمومیت میں شامل ہے اس پر سورہ آل عمران کی آیت ۲۲ بھی شاہد ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اولئك الذين حبطت اعما لهم فی الدنيا والاخرة و مالهم من ناصرين

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں حبط و بے قیمت ہو گئے ہیں اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے''

سورہ مائدہ کی آیت ۴ میں شکاری کتوں کے ذریعے شکار کرنے اور پھر خاص شرائط کے ساتھ اس شکار کے حلال ہونے اور رعایت تقویٰ الٰہی کے حکم کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سریع الحساب ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

''اے پیغمبرؐ! وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال ہے۔ ان سے کہہ دو تمام طیبات تم پر حلال ہیں۔ نیز وہ جو تم نے کتوں کو اللہ کی دی ہوئی تعلیم میں سے سکھایا کہ وہ تمہارے لیے شکار کریں۔ بشرطیکہ خدا کا نام اس پر لیا گیا ہو۔ تقویٰ الٰہی کی رعایت کرو۔ بتحقیق خدا جلدی حساب کرنے والا ہے''۔

اس آیت کے ظہور سے پتہ چلتا ہے کہ حساب سے مراد دنیوی حساب ہے۔ درحقیقت یہ تنبیہ ہے کہ شکار میں تقوائے الٰہی کی رعایت کریں یعنی شکار صرف معاش کی خاطر کریں نہ کہ لہوولعب وغیرہ کے لیے ورنہ خدا کا انتقام انہیں نہیں چھوڑے گا اور وہ اپنے اس ہوس آلودہ عمل کی سزا کا مزہ ضرور چکھیں گے۔

بنابریں وہ سب آیات جن میں سریع الحساب ذکر ہوا ہے ان کی چار قسمیں بنتی ہیں:

۱۔ وہ آیات جو صریحاً اخروی حساب کے بارے میں ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو اخروی حساب میں ظہور رکھتی ہیں۔

۳۔ وہ آیات جو دنیوی حساب میں ظہور رکھتی ہیں۔

۴۔ وہ آیات جو اطلاق رکھتی ہیں اور دونوں قسم کا حساب ان کے مفہوم میں شامل ہے۔

یہیں سے روشن ہوگیا کہ خدا تعالیٰ کے سریع الحساب ہونے میں ان تین احتمالات میں سے دوسرا اور تیسرا معنی قرآن کے ساتھ زیادہ ہم آہنگی و مناسبت رکھتا ہے۔

قیامت میں خدا کا سریع الحساب ہونا اس کی لامحدود قدرت و علم کو دیکھتے ہوئے بالکل آسان و سہل ہے اور خدا کے حساب لینے کو انسان کے حساب لینے کے ساتھ بالکل قیاس نہیں کیا جا سکتا اگر دنیا میں خدا کے حساب لینے کی مثال لانا چاہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ جیسے خدا ایک ہی لحظہ میں تمام دعا کرنے والوں کی دعا کو اجابت فرماتا ہے اور جیسے تمام بندوں کو روزی دیتا ہے اسی طرح ان کا حساب بھی کرے گا۔

کسی نے حضرت امیرالمومنین علیؑ سے پوچھا کہ خدا کیسے بے شمار لوگوں کا حساب لے گا تو امام نے فرمایا جیسے ان سب کو یکجا روزی دیتا ہے۔ دوبارہ سوال ہوا کہ ان سے کیسے حساب لے گا حالانکہ لوگ خدا کو نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ امامؑ نے فرمایا جیسے خدا انہیں روزی دیتا ہے اور وہ اسے نہیں دیکھتے۔ [۱]

۶۔ محاسبہ بد

بعض آیات میں محاسبہ بد سے ڈرایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ (رعد:۲۱)

''وہ ربط رکھتے ہیں اس سے جس سے ربط رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور برے حساب (سخت حساب) سے ڈرتے ہیں''

---

[۱] نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۳۰۰

دوسری آیت میں کفار کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

أُولَٰٓئِكَ لَهُمۡ سُوٓءُ ٱلۡحِسَابِ ۙ (رعد:۱۸)

سوال یہ ہے کہ حساب بد سے کیا مراد ہے؟ اگر تو حساب لینے والا خود خدا اور اس کے معصوم وصادق کارندے ہوں تو کبھی حساب بد نہیں ہوسکتا۔ اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ حساب بد کا مطلب یہ ہے کہ حساب دینے والا اس حساب سے سختی وتنگی محسوس کرے اور اسے عربی میں "الحساب الذی یسوء هم" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی وہ حساب جو انہیں برا لگے اور انہیں ناراحت کرے اور یہ ایک عرفی تعبیر ہے مثلاً جب کسی شخص پر اچھا خاصا جرمانہ ہوجائے یا بڑی سزا ہوجائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا بہت برا محاسبہ ہوا ہے یا اسے بہت بری سزا ہوئی ہے۔

البتہ روایت میں بھی یہ جملہ وارد ہوا ہے وہاں اس سے مراد محاسبہ کا دقیق اور سخت ہونا لیا گیا ہے۔ امام صادق سے روایت ہے کہ انہیں یہ خوف بالکل نہیں ہے کہ خدا ان پر ظلم کرے گا بلکہ انہیں صرف اضطراب دقیق حساب کا ہے۔ ایک شخص امام صادق کے پاس آیا تو حضرتؑ نے اسے فرمایا کہ تمہارے کسی بھائی نے تم سے شکایت کی ہے۔ تو اس نے جواب میں عرض کیا: میں نے تو کوئی ایسی غلطی نہیں کی صرف اپنا حق پوری طرح طلب کیا ہے حضرتؑ نے فرمایا: اپنے دینی برادر سے دقیق طور پر حق کا طلب کرنا بھی ایک قسم کا سوء معاملہ ہے جسے قرآن نے بھی سوء الحساب سے تعبیر کیا ہے۔[۱]

واضح سی بات ہے کہ قیامت کے دن اس قسم کا سلوک بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوگا اور روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ذمے دوسروں کے حقوق ہوں گے وہ "سوء الحساب" والوں میں شامل ہوں گے۔[۲]

۷۔ آسان محاسبہ

اگر قیامت کے دن کچھ لوگوں کے ساتھ حساب میں سختی ہوگی تو کچھ دوسرے لوگ جو نیک صفات واعمال کے حامل ہوں گے ان سے آسان حساب ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَأَمَّا مَنۡ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ ۝٧ فَسَوۡفَ يُحَاسَبُ حِسَابٗا يَسِيرٗا ۝٨ (انشقاق: ۷،۸)

"جن لوگوں کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا ان سے آسان حساب ہوگا"۔

کچھ آیات سے ان اعمال کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس سہولت حساب کے موجب ہیں مثلاً

۱۔ صلہ رحمی۔ سورہ رعد کی آیت ۲۱ جو گزر چکی ہے اس میں "الذین یصلون" کا جملہ استعمال ہوا ہے یعنی جو لوگ صلہ رحمی کرتے ہیں

---

[۱] بحار جلد ۷، باب ۱۱ حدیث ۲۶، ۲۸، ۲۹

[۲] بحار الانوار جلد ۷، باب ۱۱ حدیث ۲۱، ۳۵، ۳۶

انہیں حساب کی سختی کا خوف نہیں ہے۔اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمل کا انجام دینا ''سوالحساب'' سے نجات کا موجب ہوگا اور طبعی طور پر قطع رحمی اس کے برخلاف ہوگی اور حضرت امام صادقؑ اس آیت سے یہی نتیجہ اخذ فرماتے ہیں۔ان کا ارشاد ہے:

ان صلة الرحم تهون الحساب يوم القيامة [۱]

''صلہ رحمی قیامت کے دن حساب کو آسان کردیتی ہے''

ii۔کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات میں لوگوں کے کام آنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے قیامت کے دن رحمت الٰہی شامل حال ہوتی ہے اور حساب میں آسانی ہوجاتی ہے۔امام محمد باقرؑ پیغمبر اکرمؐ سے روایت فرماتے ہیں کہ بندہ قیامت کے دن خدا کے حضور دلیل پیش کرے گا کہ خدایا تو نے مجھے خلق فرمایا، مجھ پر اپنی رحمت ولطف کیا، اپنی نعمتیں تو نے مجھے دیں اور میں ہمیشہ تیرے بندوں کی مدد کرتا رہا اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا اس اُمید کے ساتھ کہ آج تو مجھ پر رحمت کرے اور میرے ساتھ سختی نہ کرے۔اللہ اس کی بات کی تائید فرمائے گا اور حکم دے گا کہ اسے جنت کی طرف لے جاؤ۔[۲]

۸۔حساب میں لوگوں کا متفاوت ہونا

بعض لوگوں سے بہت دقیق حساب لیا جائے گا جبکہ کچھ لوگوں سے حساب چشم پوشی کے ساتھ لیا جائے گا البتہ اس دقیق حساب اور چشم پوشی کا تعلق ان نعمات وعطایا سے ہے جو انسان کو خدا کی طرف سے دی گئی ہیں مثلاً جن لوگوں کو زیادہ عقل دی گئی ہے ان سے حساب دقیق ہوگا اور جو لوگ سادہ لوح اور سادہ فکر ہیں ان سے اس طرح دقیق حساب نہیں ہوگا۔

اس بارے میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

انما يلاق الله العباد فى الحساب يوم القيامة على قدرما اتاهم من العقول فى الدنيا [۳]

''آخرت میں دقیق حساب لینے کا معیار لوگوں کی عقل ہے جو انہیں دی گئی تھی۔گویا معاملہ فارسی کی اس ضرب المثل کا مصداق ہوگا: ہرکہ بامش بیش، برفش بیشتر (یعنی جس کی چھت بڑی ہوگی اس پر برف زیادہ گرے گی)۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تنگ دست اور تہی دست مومن سے حساب بہت جلدی لے لیا جائے گا جبکہ دولت مند لوگوں کا حساب طول کھینچ جائے گا یعنی غریب وتنگ دست کی منطق یہی ہے کہ میرے پاس کوئی عہدہ یا مال

---

[۱] بحار جلد ۷، باب ۱۴، حدیث ۶

[۲] بحار جلد ۷، باب ۱۴، حدیث ۶

[۳] بحار جلد ۷، باب ۱۱، حدیث ۳۲

نہیں تھا جس کی وجہ سے میں کسی پر ظلم کرتا یا کسی کا حق کھا تا میری روزی صرف میری کفایت کرتی تھی“[1]

۹۔ حساب کے وقت سب لوگوں پر حجت تمام ہوگی

انسان کچھ گناہ نا آ گاہی میں کرتا ہے لیکن نا آ گاہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ بالکل اس فعل میں گناہ کا احتمال نہ دے۔ اس شخص کا خدا کے نزدیک معذور ہونا کچھ شرائط کے ساتھ ممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ فعل (گناہ) کو انجام دیتے وقت اس کے حکم سے بالکل غافل نہ ہو بلکہ اسے احتمال گناہ بھی ہو لیکن اس نے کسی عالم سے جا کر اس کا حکم نہ پوچھا ہو۔ اس صورت میں اس کی نادانی و جہالت عذر شمار نہیں ہوگی اور حساب کے وقت قیامت کے دن اسے سزا دی جائے گی۔

امام محمد باقرؑ سے آیت "قل فلله الحجة البالغة" (انعام: ۱۴۹) کے بارے میں سوال ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا گناہگار شخص سے فرمائے گا کہ آیا تم اس کام کے ناجائز ہونے سے مطلع تھے؟ اگر وہ کہے گا کہ ہاں تو اسے کہا جائے گا کہ کیوں تم نے اپنے علم پر عمل نہ کیا اور اگر وہ کہے گا کہ نہیں میں مطلع نہیں تھا تو اسے کہا جائے گا "افلا تعلمت حتیٰ تعمل" کیوں اسے جا کر نہ پوچھا تا کہ اس پر عمل کرتا۔

اس طرح سے حجت و دلیل میں یہ گناہگار بندہ مغلوب ہو جائے گا۔ پس خدا کی طرف سے لوگوں پر حجت تمام ہے۔[2]

جب بھی کوئی شخص اپنی جسمانی خوبصورتی کی وجہ سے گناہ کا ارتکاب کرے یا زندگی کی مشکلات و شدائد اس کے گناہ کا موجب بنیں تو وہ اپنے حسن یا فقر و مصیبت کو گناہ کا عذر بنا کر حساب کے وقت سزا سے نہیں بچ سکتا۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اے خوبصورت عورت! قیامت کے دن وہ چہرہ جس کی خوبصورتی کی وجہ سے تم گناہ میں پڑی، حساب کی خاطر لایا جائے گا۔ وہ عورت اپنے حسن و جمال کو عذر بناتے ہوئے کہے گی پروردگار! تو نے مجھے خوبصورت خلق کیا اور یہی چیز میری گمراہی کا موجب بن گئی تو اس سے کہا جائے گا کہ مریم تم سے زیادہ خوبصورت تھیں اس کے باوجود انہوں نے اپنی پاکدامنی کی حفاظت کی۔

اس طرح گناہگار خوبصورت مرد جب اپنی خوبصورتی کو گناہ کا عذر بنائے گا تو اسے کہا جائے گا کہ یوسفؑ تم سے زیادہ خوبصورت تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو گناہ سے بچائے رکھا۔

اسی طرح جو شخص زندگی کی مشکلات و مصائب کی وجہ سے گناہ کا مرتکب ہوا ہوگا وہ اپنی ان مصیبتوں کو عذر بنائے گا تو اسے کہا جائے گا

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۱، حدیث ۴

[2] بحار جلد ۷، باب ۱۳، روایت ۱

کہ ایوبؑ تم سے یادہ مشکلات میں گرفتار رہے لیکن گناہ سے آلودہ نہ ہوئے۔ [1]

۱۰۔ گناہ کا اقرار اور عفوِ الٰہی کی اُمید

قیامت میں حساب سے مربوط جو مطالب روایات میں وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے اور خدا پر اُمید رکھتے ہوئے یا حسن ظن کرتے ہوئے اعتراف کرے تو یہ امر بھی بسا اوقات عذاب الٰہی سے چھٹکارے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں کہ ہم بحث حساب کے حسن اختتام کے طور پر ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ علی بن رئاب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام صادق کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن گناہگار بندے کو حساب کی خاطر لایا جائے گا تو اللہ اس سے کہے گا۔ کیا میں نے تمہیں اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا اور گناہوں سے روکا نہیں تھا؟ وہ کہے گا: جی ہاں! روکا تھا لیکن مجھ پر نفسانی خواہشات غالب آ گئیں اب اگر تو مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے سزا دے گا تو یہ میرے حق میں ظلم نہیں ہوگا اس وقت خدا کہے گا: اسے جہنم کی طرف لے جاؤ تو وہ بندے کہے گا: خدایا! میں تیرے بارے میں ایسا تصور نہیں رکھتا تھا اس وقت خدا حکم دے گا کہ اسے جنت میں لے جاؤ۔ اس کے بعد خدا اسے فرمائے گا: تیرا حسن ظن اس وقت تیرے لیے مفید ثابت ہوا ہے۔ [2]

۲۔ سلیمان بن خالد کہتے ہیں:

امام صادقؑ نے فرمایا: گناہگار مومن کو قیامت کے دن خدا کے حضور حاضر کیا جائے گا اور اللہ اس کا حساب لے گا اور اس کے وہ تمام گناہ مکان و زمان کا نام لے کر جہاں اس نے کیے ہوں گے اسے بتائے جائیں گے اور وہ سب کا اعتراف کرلے گا تو خدا فرمائے گا کہ دنیا میں مَیں نے تمہارے یہ گناہ پوشیدہ رکھے اور آج بھی انہیں بخش دیتا ہوں۔ اس کے بعد حکم دے گا: انہیں نیکیوں میں بدل دیا جائے۔ اس کے بعد اس کے نامۂ اعمال کو سب لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا تو سب لوگ تعجب کریں گے کہ اس شخص نے ایک گناہ بھی انجام نہیں دیا۔ [3]

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۳، حدیث ۲

[2] بحار جلد ۷، باب ۱۴، حدیث ۴

[3] بحار جلد ۷ باب ۱۴، حدیث ۵۔ نیز احادیث ۳، ۵ باب ۱۴ ہی کی طرف رجوع کیا جائے۔

روز قیامت کی طوالت اور اس کے مواقف

۱۔ قیامت کا طولانی ہونا

قیامت کے بارے میں جو مطالب قرآن میں ذکر ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک قیامت کے دن کا طولانی ہونا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ‌ۚ ۝۴

(معارج: ۴)

''فرشتے اور روح اس دن میں جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے خدا کی طرف اوپر جاتے ہیں''

بعد والی آیات شہادت دیتی ہیں کہ یہ آیت قیامت کے بارے میں ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا ۝۶ وَّنَرٰٮهُ قَرِيۡبًا ۝۷ يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۝۸ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۝۹ (معارج: ۶ تا ۹)

''کافر قیامت کو بعید سمجھتے ہیں حالانکہ ہم اسے نزدیک دیکھتے ہیں قیامت وہ دن ہے جس میں آسمان پگھلے ہوئے تانبے اور پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی مانند ہوں گے''

لیکن ایک اور آیت میں قیامت کے دن کو ایک ہزار سال کے برابر بتایا گیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝۵ (سجدہ: ۵)

''خدا امر خلقت کو آسمان سے زمین تک تدبیر فرماتا ہے۔پھر موجودات اس دن جس کی مقدار دنیوی سالوں کے لحاظ سے ایک ہزار سال ہے اس کی طرف لوٹ جائیں گے''[1]۔

اس آیت میں جو کلمہ ''مما تعدون'' استعمال ہوا ہے اس سے پہلی آیت کا مطلب بھی واضح ہو جائے گا اور پچاس ہزار سے مراد دنیوی سالوں کا حساب ہے ورنہ قیامت کا دن ایک ہی دن ہوگا اور شب و روز کا تصور نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے دن کی دو مختلف مقداریں ہوں کیونکہ دوسری آیت کے لحاظ سے اس دن کی مقدار ایک

---

[1] سورہ حج آیت ۴۷ میں بھی یہی مضمون ہے اگر چہ یہ احتمال ضعیف ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہو۔

ہزار سال کے برابر ہے جب کہ پہلی آیت کے مطابق اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

مفسرین نے اس کی توجیہ کی خاطر مختلف نظریات ذکر کیے ہیں ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن پچاس منازل و موقف دنیوی ہزار سال کے برابر ہوگا تو گویا پہلی آیت نے تمام مواقف قیامت کی مقدار کا ذکر کیا ہے اور دوسری آیت نے صرف ایک موقف کی مقدار و مدت کو ذکر کیا ہے۔

بعض روایات بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ شیخ طوسیؒ نے امالی میں اور محدث کلینی نے روضۃ الکافی میں امام صادق سے روایت کی ہے کہ اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے تم خود اپنا محاسبہ کرلو۔ کیونکہ قیامت میں پچاس موقف ہوں گے اور ہر ایک موقف کی مدت دنیوی ہزار سال کے برابر ہوگی۔ اس کے بعد حضرتؑ نے اسی دوسری منزل کو تلاوت فرمایا۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ مدت جو بتائی گئی ہے سب کے لیے اور ہے اور مومن و کافر گناہگار و نیک سب کے لیے برابر ہے یا یہ کہ یہ طولانی ہونا بعض کے لیے ہے نہ کہ سب کے لیے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قیامت کا طولانی ہونا سب کے لیے نہیں ہے کیونکہ قیامت کے طولانی ہونے اور اس کے پچاس مواقف کا مطلب یہی ہے کہ مجرمین اور گناہگاروں کا حساب لیا جائے۔ انہی کے لیے یہ مواقف ہوں گے۔ جن سے ان کا عبور کرنا ضروری ہوگا تا کہ جنت و جہنم کے لحاظ سے ان کا انجام واضح ہو سکے۔

بنا بریں جس نے دنیا میں جتنا عمل کیا ہوگا اس کے مطابق قیامت کے مواقف میں اسے ٹھہرنا پڑے گا۔ پس جس شخص نے دنیا میں احکام الٰہی کو طیب خاطر اور خوشی کے ساتھ قبول کرلیا اور انہیں بوجھ نہ سمجھا تو قیامت کے مواقف سے بھی وہ خوشی و سرور کے ساتھ گزر جائے گا اور جس نے دنیا میں احکام خدا کو بوجھ سمجھا اور کبھی کبھی نافرمانی بھی کر لی ہو تو قیامت کے مواقف سے اس کا گزر بھی سخت ہوگا اور اسے دیر بھی لگے گی۔

اتفاق سے یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے بعض روایات میں بھی اس طرح کا مطلب آیا ہے۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا گیا۔ قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: قسم اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے قیامت کا دن مومن کے لیے دنیا میں ایک واجب نماز پڑھنے سے بھی آسان ہوگا۔[2]

ہم نے حساب ے بحث میں عرض کیا ہے کہ فقیر مومن کا حساب غنی مومن سے آسان تر ہوگا اور وہ جلدی جنت میں داخل ہوگا اور پل صراط سے مربوط روایات میں وارد ہوا ہے کہ پل کی کاٹ اور باریکی بھی سب کے لیے نہیں ہوگی بلکہ مومنین کے لیے وہ کھلا اور وسیع ہو جائے گا۔

---

[1] بحار جلد ۷ باب ۶، روایت ۳۱

[2] بحار جلد ۷، ص ۱۲۳

۲۔قیامت کے مواقف ومراحل

جب یہ جان لیا کہ قیامت کے دن مختلف مواقف ہوں گے جن پر بعض گناہگاروں کا توقف دنیوی ہزار سال کے برابر ہوگا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ عرض کر دیں کہ اسلامی متکلم کبھی مواقف کو ''قنطرہ'' اور ''عقبہ'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں تاہم ''قنطرہ اور عقبہ'' کے الفاظ قرآن اور روایات میں بھی وارد ہوئے ہیں متکلمین نے بھی انہیں اپنی کلامی مباحث میں استعمال ہوتا ہے۔

کلمۂ ''موقف'' ٹھہرنے کی جگہ کے معنی میں اور ''قنطرۃ'' پل اور ''عقبۃ'' گھاٹی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

حضرت علیؑ امام حسن علیہ السلام کو وصیت فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

واعلم ان امامك عقبة كووداً المخف فيها احسن حالاً من المثقل والمبطی علیها اقبح حالاً من المسرع وان مهبطك بهالا محالة اما علی جنة او علیٰ نارٍ [1]

''اے بیٹے! جان لو کہ (مرنے کے بعد) ایک سخت گھاٹی ہے جہاں گناہوں کے لحاظ سے سبک بار لوگ سنگین بار لوگوں سے بہتر حالت میں ہوں گے۔ جو اسے سستی سے عبور کرے گا اس کی حالت اس شخص کی نسبت بری ہوگی جو اسے جلدی عبور کر لے گا۔ اس سے اترنے کے بعد جنت ہوگی یا جہنم ہوگی۔

مواقف قیامت اسلامی متکلمین کی نظر میں

بعض متکمین تو اجمالاً اس سے گزر گئے ہیں اور اس بارے میں انہوں نے بالکل کوئی وضاحت نہیں کی لیکن دو نامدار شیعہ متکلمین شیخ صدوق (م:۳۸۱) اور شیخ مفید (م:۴۱۳) نے اس کی وضاحت کی ہے۔ دونوں نے ایک ایک نظریہ ذکر کیا ہے۔ ہم آپ کی آگاہی کے لیے ان دو بزرگواروں کے نظریات ذکر کرتے ہیں:

مواقف قیامت شیخ صدوق کی نظر میں

شیخ صدوق نے دوسرے کلامی مسائل کی طرح اس مسئلے میں بھی زیادہ توجہ ظواہر پر مبذول رکھی ہے اور جو کچھ اس بارے میں روایات کا ظاہر ہے اس کے ماحصل کو کلامی نظریہ کے طور پر ذکر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ان عقبوں کے بارے میں جو محشر کے راستے میں ہیں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کسی نہ کسی

[1] نہج البلاغہ وصیت ۳۱

دینی فریضے کے نام پر نام رکھا گیا ہے۔ ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ ان سے عبور کرے۔ انسان رحمت الٰہی سے ایک عقبہ سے گزرنے کے بعد دوسرے عقبہ پر پہنچے گا وہاں سے بھی عبور کرنا ضروری ہے اور اسی طرح تمام عقبوں سے گزرنا ضروری ہوگا ورنہ دوزخ میں گر پڑے گا"۔

اس کے بعد جناب شیخ فرماتے ہیں:

"یہ سب عقبے پل صراط پر ہوں گے ان میں سے ایک عقبے کا نام "ولایت" ہے۔ تمام اہل محشر کو وہاں پر رکنا پڑے گا۔ وہاں پر ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا۔ ان عقبوں میں سے خطرناک ترین عقبہ وہ ہے جسے "مرصاد" کہا جاتا ہے۔ خدا نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھائی ہے کہ ظالمین کو وہاں پر روکے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ (فجر: ۱۴)

"تیرا رب ظالمین کی تاڑ میں ہے" [۱]

حضرت علیؑ نے بھی ظالمین کو تنبیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں:

ولئِن امهل الله الظالم فلن يغوت اخذه وهوله بالمر صاد على مجاز طريقه [۲]

"اگر خدا نے ظالم کو مہلت دی ہے تو وہ اسے چھوڑے گا نہیں بلکہ خدا اس کی گھات میں ہے، اس کے گزرنے کی راہ پر"

یہ صدوق مرحوم کا نظریہ تھا۔ عقبہ ومواقف قیامت کے متعلق جو کہ اس بارے میں وارد روایات کا خلاصہ ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند روایات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: صراط پر تین قنطرہ (پل) ہیں۔

۱۔ قنطرہ امانت

۲۔ قنطرہ نماز

۳۔ قنطرہ عدل الٰہی

---

[۱] بحار جلد ۷، ص ۱۲۹

[۲] نہج البالغۃ خطبہ ۷۱

جب انسان پہلے دو پلوں سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے گا تو تیسرے پل پر پہنچے گا جہاں پر اس سے دوسروں کے حقوق کی رعایت کے بارے میں سوال کیا جائے گا اگر اس نے کسی پر ظلم کیا ہوگا تو اسے سزا کے بغیر اس پل سے گزرنے نہیں دیا جائے گا۔[1]

۲۔ جناب شیخ صدوق نے ''ثواب الاعمال'' میں امام صادق سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے آیت ''ان ربک لبا لمر صاد'' کی تفسیر میں یوں فرمایا:

قنطرة علی الصراط لا یجوزھا عبد بمظلمة[2]

''مرصاد صراط پر ایک پل ہے جسے کوئی بندہ ظلم کے ہوتے ہوئے عبور نہیں کر سکے گا''

۳۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ پل جہنم پر سات موقف ہیں پہلے موقف میں توحید کے بارے میں سوال ہوگا جس کا عقیدہ توحید کے باب میں کامل ہوا وہ دوسرے موقف پر پہنچے گا۔ وہاں اس سے نماز کے بارے میں سوال کیا جائے گا اگر اس نے نماز کو صحیح انجام دیا ہوگا تو تیسرے موقف تک لایا جائے گا جہاں پر اس سے زکوٰۃ کے بارے میں سوال ہوگا اس کے بعد والے موقف پر روزے اور پانچویں موقف پر حج اور چھٹے موقف پر عمرہ کے بارے میں سوال ہوگا یہاں تک کہ ساتویں موقف کی باری آئے گی جس کا تعلق مظالم (دوسروں کے حقوق) سے ہے۔ اگر انسان ان مواقف سے صحیح گزر گیا تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔[3]

جیسا کہ آپ نے دیکھا ان روایات اور ان کے مشابہ روایات کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تمام مواقف پل صراط پر نصب ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک پر کسی نہ کسی دینی فریضے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

مواقف قیامت شیخ مفید کی نظر میں

جناب شیخ مفید اپنی کلامی بحثوں میں زیادہ تر عقلی ادلہ کا سہارا لیتے ہیں اور اسی اساس پر کلامی مسائل کی تشریح کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ صدوق کے کلام کی تشریح میں فرماتے ہیں:

قیامت کے عقبے دینی احکام ہی ہیں کہ قیامت کے دن جن کا جواب انسان کو دینا ہوگا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ حقیقتاً صراط پر پہاڑ اور گھاٹیاں ہوں گی جنہیں عبور کرنا مشکل ہوگا اور انسان انہیں عبور کر کے بہشت تک پہنچ سکے گا۔ بلکہ عقبہ جو قرآن و روایات میں آیا ہے اس

---

[1] بحار جلد ۷، ص ۱۲۵ روایت ۱۱ و جلد ۸ باب ۲۲ روایت ۲، ۹

[2] بحار جلد ۹، ص ۶۶

[3] بحار جلد ۸، ص ۶۴

سے مراد احکامِ الٰہی ہیں چونکہ ان کی پاسداری کی وجہ سے مشکلات ودشواریاں پیش آتی ہیں لہٰذا انہیں عقبہ سے تعبیر کیا گیا۔[1]

اس کے بعد جناب مفید فرماتے ہیں: یہ جو ''حشویہ'' کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ایسے پہاڑ خلق کیے جائیں گے جو صعب العبور گھاٹیاں رکھتے ہوں گے اور اہل محشر کے لیے ان پر سے گزرنا ضروری ہوگا، ان کا یہ دعویٰ بغیر کسی دلیل کے ہے کیونکہ نہ تو کوئی نقلی دلیل اس پر موجود ہے جو وضاحت سے اس مطلب پر دلالت کرے اور نہ ہی عقل کا یہ تقاضا ہے کیونکہ عقل کے نزدیک صرف یہ بات قطعی ہے کہ حکمت الٰہی کی اساس پر قیامت بر پا ہونی چاہیے۔ قیامت کی خصوصیات کے ضمن میں اگر چہ عقل ان کے امکان کو رد نہیں کرتی لیکن ان کے لزوم کو بھی ثابت نہیں کرتی۔[2]

شیخ مفید کے کلام کی وضاحت میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ قرآن میں بھی بعض مقامات پر عقبہ سے احکام الٰہی مراد لیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ (بلد: ۱۱ تا ۱۶)

''صعب العبور گھاٹی سے آسانی کے ساتھ گزر نہ سکا۔ تم نہیں جانتے ہو کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ غلام کا آزاد کرنا، فقرو تنگ دستی کے دن یتیم کو کھانا کھلانا یا سخت تہی دست مسکین کو کھانا کھلانا ہے''۔

قرآن کریم نے اپنے انتہائی عمیق معارف اور اعلیٰ تعلیمات کے لیے تمثیل وتشبیہ کے طریقے کو اپنایا ہے۔ اس طرح سے ان عمیق مطالب ومعارف کا سادہ اذہان کے لیے سمجھنا ممکن ہو گیا ہے۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں معارف ومطالب کو تمثیل کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ ہم یہاں اس موضوع کی تفصیل میں نہیں جا سکتے۔

یہاں پر جو آیت ذکر ہوئی ہے یہ بھی قرآن کی تمثیلی آیات میں سے ہے۔ جس میں ایک غیر محسوس حقیقت کو محسوس واقعیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ سب لوگ پہاڑ اور صعب العبور گھاٹیوں کو کسی حد تک جانتے ہیں اور دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے انہیں عبور کرنے کی دشواریاں بھی سب کو معلوم ہیں۔ قرآن نے ان آیات میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ اُخروی اور اعلیٰ انسانی مقاصد کو پانے کے لیے تحمل مشکلات ضروری ہے اور ان تک پہنچنے کے لیے الٰہی قوانین کی رعایت ضروری ہے اور چونکہ ان قوانین کی رعایت لامتناہی حیوانی خواہشات سے

---

[1] لہٰذا صرف ظاہر تعبیر پر جمود صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ایک قسم کی غیر محسوس حقائق کو محسوس حقائق سے تشبیہ دی گئی ہے تا کہ عام ذہن کے لے قابل ادراک ہو۔

[2] بحار جلد ۷، ص ۱۲۹

تضاد و تصادم رکھتی ہے لہٰذا ان قوانین کی پابندی کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی صعب العبور گھاٹی کو عبور کرنا ہے لہٰذا جو بھی دنیا میں ان گھاٹیوں پر سے آسانی کے ساتھ گزر جائے یعنی قوانین الٰہی کی پابندی اطمینان خاطر کے ساتھ کرتا رہا ہو وہ آخرت میں بھی ان عقبات سے آسانی کے ساتھ گزر جائے گا اور محاسبہ اس کے لیے آسان ہوگا۔

اس مطلب پر بعد والی آیات دلالت کرتی ہیں جن میں ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِنَا هُمْ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ○ (بلد:۲۰،۱۷)

"پھر ان انسانوں میں سے ہوگا جو ایمان لائے اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور مہربانی کی تلقین کی۔ یہ لوگ قیامت میں سعادت مند ہوں گے اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ آخرت میں بد بخت ہوں گے اور انہیں ہر طرف سے آگ گھیر لے گی۔

ان آیات میں عقبات سے گزرنے کا نتیجہ لوگوں کی سعادت و شقاوت کو بیان کیا گیا ہے اور عقبات کی تفسیر بھی ایمان کے ساتھ ساتھ غلام آزاد کرنا، یتیموں و مسکینوں کو کھانا کھلانا اور صبر و مہربانی کی تلقین کے ساتھ کی گئی ہے تو گویا عقبات سے مراد وحی خدا پر ایمان اور احکام الٰہی کی پابندی ہے نہ یہ کہ پہاڑ ہوں گے، گھاٹیاں ہوں گی جن سے گزر کر جنت تک پہنچا جا سکے گا کیونکہ گھاٹیوں سے گزرنے کے لیے جسمانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ ایمان و اعمال صالح کی حالانکہ قیامت کے دن جنت تک پہنچنے کے لیے ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہوگی اور جسمانی قوت اس میں کوئی تاثیر نہیں رکھتی ہوگی۔ لہٰذا یہ کہہ سکتے ہیں کہ عقبات کے بارے میں جو نظریہ جناب شیخ مفید کا ہے وہ زیادہ صحیح اور واقع کے موافق ہے۔

قیامت اور میزان

اب ہماری بحث قیامت کے دن مسئلہ میزان کے بارے میں ہوگی۔ قیامت کے دن لوگوں کے نیک و بد اعمال کا موازنہ کیا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میزان و موازنہ کی حقیقت کیا ہے؟ آخرت میں میزان کا ہونا نص وحی، اتفاق متکلمین اور روایات اسلامی سے ثابت ہے لہٰذا آخرت میں میزان کا اعتقاد نا قابل انکار ہے جو آیات میزان کے بارے میں آئی ہیں سب سے پہلے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

اس بارے میں آیات کی دو قسمیں ہیں۔ بعض تو وجود میزان کے بارے میں ہیں اور بعض میں میزان کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ ہم دونوں اقسام کو اکٹھا ایک جگہ ذکر کرتے ہیں:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ (انبیاء: ۴۷)

''ہم قیامت کے دن عدالت کے ترازو نصب کریں گے اور کسی انسان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا اور اگر کسی نے رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل انجام دیا ہوگا تو ہم اسے لائیں گے۔ یہی کافی ہے کہ بندوں کا حساب کرنے والے ہم ہیں''۔

اس آیت میں ''الموازین'' میزان کی جمع ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن بہت سے ترازو نصب کیے جائیں گے اور اس میزان کی صفت یہ ہوگی کہ اس سے عدالت الٰہی کے تقاضے پورے ہوں گے۔ [۱]

یہ آیت وجود میزان کے بارے میں ہے۔ اب ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو میزان کے نتیجے کے بارے میں وارد ہوتی ہیں۔ میزان سے مربوط اکثر آیات کا تعلق اسی قسم سے ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ (مومنون: ۱۰۲، ۱۰۳)

''جن کے عمل کا ترازو بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے عمل کا ترازو ہلکا ہوگا وہ لوگ گھاٹے میں ہوں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے''

۳۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ

---

[۱] ممکن ہے ''القسط'' ''الموازین'' پر عطف بیان ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کلمہ ''ذوات'' کو مقدر مان کر اسے ''الموازین'' کی صفت بنایا جائے۔ یعنی الموازین ذوات القسط کہ اس میزان کی صفت یہ ہے کہ عدل الٰہی پر پورا اترے گا۔

مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (قارعہ:٦تا٩)

''جن کا ترازو وزنی ہوگا وہ خوشحال زندگی میں ہوں گے اور جن کا ترازو ہلکا ہوگا ان کی جگہ دوزخ ہوگی''

۴۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يَظْلِمُوْنَ ۝ (اعراف:٨،٩)

''اس دن وزن کرنا حق ہے جن کا ترازو بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والا ہوگا اور جس کا ترازو ہلکا ہوگا وہ خسارے میں ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرتے تھے''

۵۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (کھف:١٠٥)

''وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور ملاقات کا انکار کیا پس ان کے اعمال باطل کردیے گئے ہیں اور قیامت کے دن ان کے اعمال کی کوئی قیمت و وزن نہیں ہوگا (یا ان کے اعمال کے لیے میزان نصب نہیں کریں گے چونکہ اعمال خیر نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال بے قیمت ہیں اور حق و حقیقت سے خالی ہیں لہٰذا ان کے لیے میزان کی ضرورت ہی نہیں ہوگی'' [1]

ان آیات کے ذکرے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ آخرت میں میزان کی حقیقت کیا ہے؟ یہاں پر کلام کے لیے دو محور ہیں:

١۔ میزان کے بارے میں مفسرین و متکلمین کے نظریات

٢۔ قرآن و احادیث کی روشنی میں میزان کی حقیقت

١۔''میزان'' دنیوی میزانوں کی طرح

متکلمین معتزلہ کا ایک گروہ اور تمام اہل حدیث میزان کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ قیامت کے دن دنیوی ترازوؤں کی طرح ترازو نصب کیے جائیں گے اور نیک کام ایک پلڑے میں اور برے کام دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں گے اس طرح سے اطاعت و معاصی کا موازنہ کیا

---

[1] اگر اس آیت میں وزن کے معنی قدر و قیمت کے ہوں تو پہلا معنی ہی درست ہے لیکن اگر وزن کے معنی ثقل اور بھاری ہونے کے ہوں تو بریکٹ والے معنی زیادہ درست ہیں۔

جائے گا جن کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو گیا وہ سعادت مند ہوں گے ورنہ وہ بد بخت ہوں گے۔[1]

''میزان'' کی یہ تفسیر صرف ظاہر کے لحاظ سے ہے نہ کہ ایک ایسا تصدیقی ظہور ہے جسے آیات اور قرائن میں دقت نظر کے بعد حاصل کیا گیا ہو۔ یہ صرف تصوری ظہور ہے۔ جو قرآن کی تفسیر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

متکلمین کے ایک گروہ نے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے اس پر کئی اشکال کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کے یہ اعمال جواہر تو ہیں نہیں بلکہ مقولہ عرض سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان میں وزن کا تصور نہیں کیا جا سکتا پس کیسے ان کا وزن کیا جائے گا۔ اگر تو اس نظریے پر صرف یہی اشکال ہو تو یہ اشکال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت انسان کے اعمال والے صحائف (نامۂ اعمال) کا وزن ہو گا یا یہ کہ اعمال تجسم پیدا کر لیں گے ان نورانی یا ظلماتی اجسام کا وزن ہو گا۔[2]

لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ نظریہ نادرست ہے کیونکہ یہ مفہوم کلمات قرآن کا تصوری ظہور ہے۔ اور ایک سطحی استفادہ ہے جو کوئی علمی قیمت نہیں رکھتا۔ ضروری ہے کہ قرائن اور دوسری آیات میں غور و فکر کرنے کے بعد ظہور تصدیقی کو حاصل کیا جائے اور اسے بطور نظریہ اپنایا جائے۔ ہم اس کی تفہیم کے لیے ایک مثال ذکر کرتے ہیں۔ کسی شخص کی سخاوت کو بیان کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں: وہ آدمی دل اور ہاتھ کا کھلا ہے۔ اس کا گھر کا دروازہ کھلا ہے۔

اس جملے کا ظہور دو قسم پر ہے:

۱۔ ابتدائی اور تصوری ظہور اور وہ یہ کہ واقعاً اس کے ہاتھ کھلے ہوں اور اس نے کسی وجہ سے گھر کا دروازہ بند نہ کیا ہو۔

۲۔ ایک تصدیقی ظہور ہے کہ ایک شخص سخی ہے اور ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس جملہ کی پہلی تفسیر غلط ہے اور یقیناً دوسرے طریقے پر اس کی تفسیر کرنی چاہیے ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ دوسری تفسیر کو خلاف ظاہر کہہ کر رد کر دیں۔ اسی طرح صحیح نہیں ہے کہ جن معارف میں میزان یا صراط کے کلمات استعمال ہوئے ہیں ہم انہیں صرف ظہور تصوری کے ساتھ تفسیر کریں اور ظہور تصدیقی کو خلاف ظاہر کہہ کر اپنانے کی کوشش نہ کریں۔

اہل حدیث کی تفسیر کا نقص یہی ہے کہ وہ ظہور تصدیقی اور ظہور تصوری میں بالفاظ دیگر ظہور ابتدائی و استمراری میں فرق نہیں کرتا اور صرف ظہور تصوری کی پیروی کرتے ہیں جو تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے زائل ہو جاتا ہے۔

۲۔ قیامت میں ''میزان'' سے مراد عدل الٰہی ہے

ایک اور گروہ نے اس بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ میزان سے مراد عدل الٰہی ہے یعنی خدا اپنے عدل و انصاف کے ساتھ لوگوں

---

[1] کشف المراد ص ۲۶۹،

[2] شرح مقاصد ج ۲ ص ۲۲۳

کے درمیان قضاوت وفیصلہ فرمائے گا گناہگاروں کو اطاعت گزاروں سے جدا کر کے ہر کسی کو اس کے اعمال کی جزا دے گا۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ مخلوق کے ساتھ عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا لیکن بات یہ ہے کہ آیا میزان کا مطلب یہی ہے یا یہ کہ میزان کے کچھ اور معنی ہیں جو آیات میں غور وفکر کرنے سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ میزان کے بارے میں پہلا نظریہ تو بالکل غلط ہے اور دوسرا نظریہ بھی میزان کی حقیقت نہیں بتاتا بلکہ میزان کے نتیجہ کو بیان کرتا ہے یعنی میزان اور حسنات وسیات کے لحاظ سے لوگوں کی حالت واضح ہونے کے بعد خدا تعالیٰ انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔ لہٰذا ایک وسیلہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے گناہ واطاعت کے لحاظ سے لوگوں کی حالت واضح کی جا سکے تا کہ بعد میں عدل کی بنیاد پر فیصلے کا مرحلہ پیش آئے۔ اس نظریے نے میزان اور اس کے نتیجے کو خلط ملط کر دیا۔

اب ہم میزان کی حقیقت بیان کرنے کے لیے دو مقدمے ذکر کرتے ہیں:

(الف) قرآن میں میزان کے معنی اپنے استعمال کے لحاظ سے

قرآن میں میزان کے اگرچہ ایک ہی معنی ہیں اور وہ ہیں: جانچنے کا آلہ لیکن یہ لفظ مختلف استعمالات رکھتا ہے۔ ہم ان کا بطور اجمال ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اشیا اور مالی معاوضات کے جانچنے کا وسیلہ

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ (هود: ۸۵)

''اے میری قوم! ناپ تول میں عدل وانصاف سے کام لو'' [1]

۲۔ نظام کائنات میں ہم آہنگی ونظم

کبھی ''میزان'' نظام کائنات میں نظم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو نظام کی استواری وبقا کی موجب ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الۡمِيۡزَانَ ۙ (رحمن: ۷)

''اور آسمان کو بلند کیا اور میزان رکھا''

دونوں جملوں کی مناسبت کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ میزان سے مراد زمین وآسمان کا نظم ہے جس کی وجہ سے کائنات میں تعادل پایا

---

[1] سورہ انعام ۵۲ واعراف ۸۵ وہود ۸۴ والرحمٰن ۹ کی آیات بھی اسی مضمون کے بارے میں ہیں۔

جاتا ہے اور کائنات باقی ہے کیونکہ اگر آفتاب کی کشش موجودہ کشش سے زیادہ ہو جائے تو حتماً دوسرے سیاروں کو اپنی طرف کھینچ لے گا اور اس سے کم تر ہو تو سیارے سورج کے مدار سے خارج ہو جائیں گے اور نظام شمسی تباہ ہو جائے گا۔

۳۔ قوانین الٰہی کی عادلانہ تشریع

قرآن میں ''میزان'' ان قوانین الٰہی کے معانی میں بھی استعمال ہوئی ہے جو معاشرے میں عدالت برپا کرنے کے موجب ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ (حدید: ۲۵)

''ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو بھیجا تا کہ لوگوں میں عدالت برپا ہو''

"انزلنا" کے قرینہ کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ میزان بھی ایک قسم کی الٰہی تشریع ہے جو کتاب کی طرح خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں میزان سے عقل وخرد کے صحیح فیصلے مراد لیے جائیں چونکہ یہ بھی خدا کی دوسری رحمتوں کی طرح نازل کیے گئے ہیں اور قرآن نے "انزلنا" لوہے (حدید) کے بارے میں بھی تو استعمال کیا ہے لہٰذا عقل کہ جو نعمات الٰہی میں سے ہے اس کے بارے میں بھی لفظ "انزلنا" استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(ب) ہر چیز اپنے لحاظ سے ایک خاص میزان رکھتی ہے

قرآن میں اوصاف قیامت میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کے مختلف مصادیق ہیں ان میں سے بعض سے تو اسی دنیا میں ہمیں آشنائی حاصل ہے یعنی وہ صفت اس دنیا میں بھی مصداق رکھتی ہے لیکن اس صفت کو اس ایک مصداق میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان الفاظ میں سے ایک لفظ ''میزان'' ہے جس کا مصداق روشن وہ ترازو ہے جس کے ذریعے مادی اشیا کو تولا جاتا ہے۔ لیکن یہ دو پلڑوں والا ترازو میزان کا تنہا مصداق نہیں ہے اگر چہ گزشتہ زمانے میں علم وتمدن کے ترقی یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ترازو کا تنہا مصداق اسی دو پلڑوں والے ترازو کو سمجھا جاتا تھا لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ترازو کے متعدد مصادیق پیدا ہو گئے ہیں، جو پہلے مصداق سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔ مثلاً آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے ایک ایسا ترازو (میزان) ایجاد ہو چکا ہے جس کے ساتھ ایسی چیزوں کو جانچا جاتا ہے جنہیں ابتدائی ترازو کے ساتھ جانچنا ممکن نہ تھا۔ یہاں تک کہ انسان آج خرچ ہونے والے پانی، گیس، بجلی اور ٹیلی فون کا تعین بھی کر سکتا ہے۔ اس طرح کہ دقیق ترین پیمانوں کے ذریعے ہوا کا درجہ حرارت، رگوں میں موجود خون کا دباؤ اور دل کی دھڑکنوں کی کیفیت کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے مسلح انسان آج کمپیوٹر کے ذریعے بڑے بڑے عجیب کام انجام دے سکتا ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہیں (مثلاً کسی حساب یا مقابلے کی غلطیوں وغیرہ کا معلوم کرنا)

بنابریں کہہ سکتے ہیں کہ ہر چیز کے میزان کا اپنا ایک طریقہ ہے اور بشر نے تدریجاً ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر لی ہیں جو گذشتہ زمانے

میں نا قابل یقین تھیں۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک میزان کی مثال یہ ہے کہ علم منطق بھی میزان ہے جس سے نادرست افکار اور صحیح افکار میں تمیز کی جاتی ہے اور صحیح و ناصحیح قضایا کو مشخص کیا جاتا ہے۔ گویا علم منطق فکر کی جانچ کے لیے میزان ہے۔

ان مطالب پر توجہ کرنے کے بعد آخرت سے مربوط میزان کی تفسیر میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور نہ اس کا دنیوی ترازوؤں کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیے اور نہ اسے عدل الٰہی کے ساتھ تفسیر کرنا چاہیے بلکہ احتیاط و عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ معارف کی تبیین کے لیے آخرت میں ایک خاص وسیلہ وآلہ ہوگا جس کے ذریعے اعمال کو جانچا جائے گا اور حسنات کو سیئات سے جدا کیا جائے گا اور گناہگار و نیکوکار کا پتہ چلایا جائے گا۔

بنابریں میزان کے بارے میں اعتقاد یہ ہونا چاہیے کہ یہ آخرت میں جانچنے کا آلہ و وسیلہ ہے اور ایک بہت ترقی یافتہ وسیلہ ہے جو ہمارے مادی اذہان کی پہنچ سے دور ہے اور اس کی واقعیت ناسوتی (مادی) انسان پر بالکل پنہاں اور غائب ہے۔

آخرت میں میزان کے کچھ نمونے

اس گذشتہ مطلب کی بنا پر اگرچہ حقیقت میزان ہمارے لیے مبہم ہے لیکن کچھ روایات وآیات ایسی ہیں جن کے ذریعے کسی حد تک رفع ابہام ہوسکتا ہے اور کسی حد تک اُخروی میزان کی حقیقت ہمیں معلوم ہوسکتی ہے۔

ا۔ قرآن میں ایک آیت میں ارشاد ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑧ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ⑨ (اعراف: ۸،۹)

''قیامت کے دن (اعمال کا) تولنا حق ہے جن کا میزان بھاری ہوگا وہ فلاح پانے والے ہیں اور جن کا میزان ہلکا ہوگا چونکہ انہوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا ہوگا وہ گھاٹے میں ہوں گے''

مفسرین نے جملہ ''والوزن یومئذ الحق'' کی اعرابی کیفیت میں اختلاف کیا ہے لیکن ان کے اختلاف سے قطع نظر کلمہ ''وزن'' میں دو احتمالوں میں سے کوئی ایک احتمال حاکم ہوگا:

ا۔ ''وزن'' سے اس کے مصدری معنی مراد ہوں یعنی تولنا اور اعمال کا جانچنا لہٰذا ''وزن''، ''توزین'' کے معنی میں ہوگا۔

۲۔ وزن سے مراد ''میزان'' ہو یعنی جانچنے کا وسیلہ وآلہ اور بہ تعبیر عربی ''مایوزن بہ'' پہلا احتمال اعمال کی جانچ کے قطعی ہونے کو بیان کر رہا ہے کہ جیسے خود قیامت حق ہے، اسی طرح وزن اعمال بھی حق ہے۔

دوسرے احتمال کی بنا پر جانچنے کا وسیلہ حق ہے یعنی ترازو کے باٹوں کا کام حق انجام دیتا ہے یعنی جو عمل بھی حق ہوگا یا زیادہ حق کا حامل ہوگا وہ میزان کے بھاری ہونے کا موجب ہوگا اور جو عمل بھی حق سے تہی ہوگا یا حق کی مقدار اس میں کم ہوگی وہ میزان کے سبک

ہونے کا موجب ہوگا۔

یہاں پر ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ جو عمل بھی حق کے مطابق ہوگا وہ بھاری ہوگا اور اس کے علاوہ دیگر اعمال سبک ہوں گے۔ اس صورت میں میزان کی کیفیت ''عمل کا حق کے مطابق ہونا یا مطابق نہ ہونا'' کے علاوہ کچھ نہ ہوگی۔ گویا قیامت کے دن حق مجسم ہوگا اور لوگوں کے اعمال کو اس سے مطابقت یا عدم مطابقت کی بنیاد پر پرکھا جائے گا۔

شاید یہی آخری معنی دوسرے معانی کی نسبت زیادہ واضح ہے اور اس معنی پر شاہد کچھ روایات بھی ہیں جن میں انبیا اور اوصیا کو قیامت کے دن میزان کی حیثیت سے شناخت کروایا گیا ہے۔ جیسا کہ امام صادق علیہ السلام آیت ''و نضع الموازین القسط'' کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں: ''ھم الانبیاء والاوصیاءُ یعنی قیامت کے دن اعمال کا ترازو انبیا و اوصیا ہوں گے۔ [1]

اس صورت میں ہر امت کے اعمال ان کے انبیا و اوصیا پر پیش کیے جائیں گے اور مطابقت وعدم مطابقت کے طریقے پر اعمال کو جانچا جائے گا۔

اس مطلب پر ایک شاہد وہ جملہ ہے جو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی مخصوص زیارت میں وارد ہوا ہے:

السلام علی یعسوب الایمان و میزان الاعمال [2]

''سلام ودرود ہو ایمان کے سردار اور اعمال کے میزان پر''

گویا حضرت علیؑ کا وجود مبارک جو مجسم حق ہے اعمال کے جانچنے کی میزان ہے جو عمل جس حد تک ان کے ساتھ شباہت رکھتا ہوگا وہ اتنا ہی سنگین ہوگا اور جو ان سے جتنا بیگانہ ہوگا اتنا ہی بے وزن و بے قیمت ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ ایسے بلند کردار اور پاک لوگ دوسروں کے لیے نمونہ و اسوہ ہیں جیسے دنیا میں ان کی گفتار و کردار حق و باطل کی پہچان کا معیار ہے آخرت میں نیک و بد اعمال میں تمیز کے لیے بھی ان کا وجود معیار ہوگا۔

اسی گفتگو سے امام سجاد علیہ السلام کے اس بیان کو سمجھا جا سکتا ہے جو آپؑ نے آیت ''و نضع الموازین القسط'' کی تفسیر میں فرمائی ہے اور وہ یہ کہ آیت اہل توحید کے بارے میں ہے۔ مشرکین کے لیے قیامت میں کوئی میزان نصب نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ انہیں اکٹھا یا گروہوں کی صورت میں جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا اور میزان کا نصب کرنا اور نامہ اعمال کا کھولا جانا صرف مسلمانوں کے لیے ہوگا۔ [3]

اس بیان کا مطلب واضح ہے۔ مشرکین چونکہ حق سے بالکل دور ہیں اور انبیا سے کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتے لہٰذا ان کے لیے میزان نصب کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۰ روایت ۶

[2] مفاتیح الجنان زیارت چہارم امیر المومنین

[3] بحار جلد ۷، باب ۱۰، حدیث ۸

اس تفسیر پر ایک اور شاہد وہ فرمان ہے جو امام سجاد علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''قیامت کے دن کسی انسان کے لیے میزان عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہوگی'' [1]

اس لحاظ سے کہ اچھا اخلاق انبیا کی واضح ترین صفات میں سے ہے لہٰذا اچھے اخلاق والا انسان اس روشن ترین صفت میں انبیا کے ساتھ شباہت رکھتا ہوگا لہٰذا منطقی طور پر اس کا عمل زیادہ قیمتی ہوگا۔

چند اہل نظر کا کلام

اس بحث کے آخر میں ہم کچھ اہل نظر حضرات مثلاً غزالی، فیض کا شانی وغیرہ کا کلام اس بارے میں نقل کرتے ہیں (اگر چہ اس کا خلاصہ پہلے بیان ہو چکا ہے) وہ کہتے ہیں:

کلی معانی ومفاہیم ایک ایسی حقیقت رکھتے ہیں جو مختلف صورتوں میں ظاہری ہوتی ہے اور دراصل الفاظ ان مفاہیم کی حقیقت کی خاطر وضع کیے گئے ہیں، اگر چہ الفاظ کو ان صورتوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو اس حقیقت کی حکایت کرتی ہیں مثلاً لفظ قلم کی حقیقت وہ آلہ ہے جو حروف اور خطوط کو صفحۂ قرطاس پر نقش کرتا ہے۔ اس حقیقت میں یہ شرط بالکل نہیں پائی جاتی کہ وہ لوہے سے بنا ہو یا سرکنڈے سے جسمانی ہو یا غیر جسمانی حتیٰ کہ اس کے نقوش میں بھی جسمانی یا غیر جسمانی ہونے کی شرط معتبر نہیں ہے۔

میزان کے بارے میں بھی بالکل صورت حال یہی ہے کیونکہ میزان یعنی وہ آلہ جس کے ذریعے اشیاء کی مقدار کو معین کیا جائے۔ اب یہ حقیقت مختلف صورتوں میں تجلی کرتی ہے کبھی مادی قالب میں اور کبھی غیر مادی قالب میں۔ مادی ترازو تو یہی عام ترازو ہے جس سے مختلف چیزوں کا وزن کیا جاتا ہے یا گھڑی جو وقت ماپنے کا آلہ ہے یا پرکار و پیمانہ جو دائرہ وخطوط کے لیے آلہ ہیں۔ اسی طرح علم عروض کے قواعد جن کے ذریعے اشعار کے اوزان کو جانچا جاتا ہے یا علم منطق جس کے ذریعے انسانی ادراکات وعلوم کو جانچا جاتا ہے۔ اسی طرح عقل جس کے ذریعے حق و باطل کو جانچا جاتا ہے۔

بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ قیامت کے دن خواص کے لیے میزان منطقی وعقلانی قوانین ہوں گے جن سے ان کے صحیح عقائد کو جانچا جائے گا اور خواص وعام کے لیے میزان انبیا واوصیا کرام کی ذوات مقدسہ ہوں گی جن کے کردار وگفتار کو معیار بنا کر لوگوں کے صحیح وغلط اعمال کا اندازہ کیا جائے گا۔

جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے انبیا واوصیا موازین قسط ہیں اور حضرت امیر المومنین خود میزان ہیں۔ [2]

---

[1] بحار جلد ۷، باب ۱۰، حدیث ۸

[2] گوہر مراد ص ۸۷ ۴ قرۃ العیون فیض کا شانی یہ رسالہ مولف کے دو اور رسالوں بنام الحقائق فی محاسن الاخلاق اور مصباح الانظار کے ساتھ اکٹھا چھپا ہے۔ اس کتاب کے ص ۴۴۵ کی طرف رجوع کریں۔

قیامت میں عدالت الٰہی کے گواہ

عموماً عدالتوں میں گواہ مدعی یا مدعا علیہ کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور اس کے بعد عدالت کا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ اسی اساس پر قیامت کے دن بھی گناہگاروں کی بداعمالیوں پر گواہ پیش کیے جائیں گے۔قرآن نے قیامت میں عدالت کی برپائی اور گواہ لائے جانے کا ذکر کیا ہے:

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (مومن:۵۱)

''قیامت کے دن گواہ کھڑے ہوں گے''

ایک دوسرے آیت میں مضمون شہادت بھی بیان کیا گیا ہے:

يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ

(هود:۱۸)

''مجرموں کو خدا کے سامنے پیش کیا جائے گا اور گواہ گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا''

قیامت کے دن دو قسم کے گواہ ہوں گے:

۱۔ خارجی شاہد (خدا و پیغمبر......)

۲۔ داخلی شاہد (مجرم کے اعضائے بدن)

یہاں پر ایک اور قسم کی گواہی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو اگرچہ ایک جداگانہ عنوان رکھتی ہے اور اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ تجسم اعمال کے باب میں بحث کریں گے اور وہ یہی اعمال کا مجسم ہونا ہے۔ تجسم اعمال کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں انسان کے نیک اعمال اچھی اور پسندیدہ صورتوں میں ظاہر ہوں گے اور انسان کے گناہ مہیب اور ڈراؤنی صورتوں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ ایک تو خود مجرم کے لیے سزا ہوگی دوسرے اس کے جرائم پر گواہی دیں گے۔

پہلے خارجی گواہی کو بیان کرتے ہیں۔قرآن میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ خداوند عالم

انسانوں کے کردار پر پہلا شاہد خود خدا تعالی کی بزرگ ذات ہے جس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (آل عمران:۹۸)

"خدا کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو۔ خدا تمہارے اعمال پر شاہد ہے"۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۱۷﴾ (حج: ۱۷)

"خدا قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ بہ تحقیق خدا ہر شے پر شاہد ہے"

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ (یونس: ۴۶)

"ان کا لوٹنا ہماری طرف ہوگا پھر خدا ان پر اس کی شہادت و گواہی دے گا جو وہ کرتے رہے ہوں گے"

۲۔ انبیاء الٰہی

قرآن وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن ہر امت میں سے ایک آدمی ان کے اعمال پر گواہی دے گا:

فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾

(نساء: ۴۱)

"پھر کیسا ہوگا جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے اور تمہیں ان (گواہوں) پر گواہ لائیں گے"

دوسری آیات میں بھی بطور کلی بیان کیا گیا ہے کہ ہر امت پر گواہ ہوگا [1]

البتہ مفسرین نے کہا ہے کہ ہر امت پر گواہ اس امت کا نبی ہوگا جیسا کہ حضرت عیسیٰ کو اپنی امت پر گواہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ﴿۱۵۹﴾ (نساء: ۱۵۹)

"کوئی اہل کتاب نہیں ہے مگر یہ کہ وہ عیسیٰ پر مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور قیامت کے دن عیسیٰ ان پر گواہی دیں گے"

یہاں پر یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ گذشتہ آیت میں (وجئنا بك علی هولاء شهيداً) خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی کو ان پر گواہ بتلایا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ھولاء (اُن) سے مراد کون ہیں؟ کیا گذشتہ انبیا پر گواہ ہونا مراد ہے یعنی انبیا اپنی امتوں پر شاہد ہوں گے اور پیغمبر اکرمؐ ان گوہوں پر گواہ ہوں گے یا پیغمبر اکرمؐ کی اپنی امت پر گواہی مراد ہے؟

---

[1] سورہ نحل کی آیات ۸۴، ۸۹ کی طرف مراجعہ کریں نیز قصص ۷۵ و نساء ۴۱

یہاں یہ دو احتمال پائے جاتے ہیں اور طبرسی مرحوم (صاحب مجمع البیان) نے صرف پہلے احتمال کو بیان کیا ہے اور دوسرے احتمال کو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اس سے کہ آیت میں لفظ "ھولاء" استعمال کیا گیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مراد خود حضور گرامیؐ کی اپنی امت ہے۔

گواہوں کا وسیع علم

یہ آیات گواہوں کے وسیع علم سے بھی نقاب کشائی کرتی ہیں یعنی امتوں کے گواہ ان کے ظاہری اور باطنی کاموں سے آگاہ ہوں گے کیونکہ شہادت تب دی جا سکتی جب انسان اس گواہی کا حامل ہو۔ شہادت کے چونکہ معنی حضور کے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ شاہد مشہود بہ (جن کاموں پر اسے گواہی دینی ہے) پر ایک قسم کا حضور رکھتا ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا معمول کے علم کے ذریعے ایک فرد کے تمام اعمال پر جو اس نے اپنی پوری زندگی میں ظاہر یا پنہاں انجام دیے ہوں گواہی دی جا سکتی ہے؟

بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ انبیا حضرات لوگوں کے اعمال پر ظاہری و باطنی احاطہ کے ذریعے ہی ایسی شہادت دے سکتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انبیا نہ صرف اپنے معاصر لوگوں کے اعمال پر گواہی دیں گے بلکہ امت کے تمام لوگوں کے اعمال پر گواہی دیں گے اور بسا اوقات امت کے لوگ پیغمبر کی وفات کے بعد متولد ہوتے ہیں۔

یہیں سے انبیا کے علم کی وسعت اور ان کی غیبی اطلاعات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ کچھ کوتاہ فکر لوگ علم انبیا کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ یہ آیات ایسے افراد کی کوتاہ فکری پر شاہد ہیں۔

۳۔ پیغمبر اکرمؐ

مذکورہ آیات کی رو سے حضور گرامیؐ بھی اپنی امت پر گواہی دیں گے لیکن اس بارے میں کچھ خاص آیات وارد ہوئی ہیں جن میں خصوصی طور پر اس جہت کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ (حج: ۷۸)

"اپنے باپ ابراہیمؑ کی راہ پر چلو۔ اس نے تمہیں پہلے سے مسلمان کہہ دیا تھا اور اس مورد میں رسول تم پر گواہ ہیں اور تم بھی دوسرے لوگوں پر گواہ ہو"

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (بقرہ: ۱۴۳)

''ہم نے تمہیں برگذیدہ امت قرار دیا تا کہ تم لوگوں پر شاہد بنو اور رسول تم پر شاہد بنیں''۔

کچھ آیات میں حضور اکرمؐ کو شاہد اور مبشر بتلایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يَآيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا (احزاب: ۴۵، فتح: ۸)

''اے نبیؐ! ہم نے تمہیں گواہ اور خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا''

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ (مزمل: ۱۵)

''ہم نے تمہاری طرف ایسا پیغمبر بھیجا جو تم پر شاہد ہے''

چونکہ گواہی اس بات پر موقوف ہے کہ انسان شہادت و گواہی کا حامل ہو اور یہ آیات خود بہترین گواہ ہیں پیغمبر اکرمؐ کے وسیع علم پر کہ آنحضرتؐ اپنی امت کے ظاہری و باطنی اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔

۴۔ خود امت کے کچھ افراد کی گواہی

سابقہ کچھ آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ امت اسلامی بھی گواہ ہوگی جیسا کہ سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ میں تھا کہ ہم نے تمہیں برگزیدہ امت قرار دیا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔ سوال یہ ہے کہ آیا تمام امت اسلامی گواہ ہوگی؟ تو ایسی صورت میں مشہود علیہ کون ہوگا؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہد تمام امت اسلامی ہے اور مشہود علیہ سابقہ امتیں ہوں گی یا یہ کہیں کہ اس امت کے کچھ افراد اسی امت کے کچھ دوسرے افراد پر گواہی دیں گے یعنی امت خود ہی شاہد اور خود ہی مشہود علیہ ہوگی۔

اس کے علاوہ یہاں ایک اور سوال بھی پیش آتا ہے وہ یہ کہ امت اسلامی کے اکثر افراد بھی سابقہ امتوں کی طرح ہیں جیسا کہ آیت کہتی ہے: ''ولا تجد اکثرھم شاکرین'' (اعراف: ۱۷)

یعنی ان میں سے اکثر کو ناشکرا پاؤ گے۔ اس لحاظ سے ان میں بھی شہادت کی شرط مفقود ہوگی اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے الفاظ میں امت اسلامی میں سے بھی کچھ لوگ ہیں جن کی گواہی ایک مشت سبزی یا ایک کلو کھجور پر بھی قبول نہیں کی جاتی تو ایسی صورت میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ تمام امت اسلامی شاہد ہوگی۔ [1]

ان مطالب کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''**وجعلنا کم**'' سے مراد تمام امت اسلامی نہیں ہے بلکہ امت کا وہ بلند مرتبہ طبقہ مراد

---

[1] امام صادق نے فرمایا: کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا نے اس آیت میں تمام مسلمانوں کی شہادت کا ارادہ کیا ہے۔ حالانکہ جس کی شہادت دنیا میں ایک کلو کھجور پر قبول نہیں کی جاتی خدا اس سے قیامت کے دن شہادت کے لیے کیسے طلب کرے گا، اس طرح نہیں ہے خدا نے اس جیسے افراد کا ارادہ قطعاً نہیں کیا۔ (تفسیر برہان جلد ا ص ۱۶۰)

ہے جس میں گواہی دینے کی لیاقت موجود ہے اور روایات کی رو سے وہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں۔[1]

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ اگر مراد صرف ائمہ معصومین تھے تو پھر شہادت کی نسبت پوری امت کی طرف کیوں دی گئی۔لتکونوا شھدآءعلی الناس

لیکن اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے۔جیسا کہ قرآن نے تمام بنی اسرائیل کو ملک (فرمانروا) کے طور پر ذکر کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا

(مائدہ:۲۰)

''اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو یاد کرو جب خدا نے تم میں انبیا بنائے اور تمہیں فرمانروا بنایا''

حالانکہ تمام بنی اسرائیل بادشاہ نہیں تھے بلکہ صرف ان میں سے چند افراد بادشاہ تھے۔مثلاً حضرت سلیمانؑ و داؤد، اس کے باوجود فرمانروا سب کو کہا گیا ہے۔اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ظاہری و باطنی اعمال پر امت اسلامی کی گواہی دینے سے بھی مراد ان خاص افراد کی گواہی ہے جو وسیع علم رکھتے ہوں اور ایسی ہستیاں ائمہ معصومین کے علاوہ نہیں ہو سکتیں اور اگر چاہیں کہ اس منزل پر امت کے دوسرے افراد کو بھی وارد کیا جائے جو تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے عالی مرتبہ رکھتے ہیں تو مجبوراً ان کے لیے بھی اس وسیع علم کا قائل ہونا پڑے گا۔تاکہ وہ دوسروں کے خفیہ کاموں سے آگاہی حاصل کر سکیں اور ان پر گواہی دے سکیں یا یہ کہ ان کی شہادت صرف اپنے معاصر افراد کے ظاہری اعمال پر محدود کر دی جائے۔

البتہ یہ خود ایک لمبی بحث ہے جسے ''حقیقت شاہد و شہادت در قرآن'' کے عنوان سے مورد بحث قرار دینا چاہیے اور ہم انشاءاللہ آئندہ صدیقین شہدا اور صالحین کے عنوانات کے تحت بحث کریں گے۔

۵۔فرشتے اعمال پر ناظر

وہ فرشتے بھی گواہ ہیں جو دنیا میں بندوں کے اعمال پر ناظر تھے اور قیامت کے دن ان کے ساتھ عرصہ محشر میں آئیں گے۔ایک فرشتہ مجرم کو عدالت میں حاضر کرے گا اور دوسرا اس کے اعمال پر گواہی دے گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ۝۲۱ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۝۲۲ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا

---

[1] کافی جلد ۱، ص ۱۴۷۔۱۴۶

لَدَیَّ عَتِیۡدٌ ﴿۲۳﴾ (ق: ۲۱، ۲۲)

''ہر انسان اس حال میں آئے گا کہ ایک اسے لانے والا اور دوسرا گواہ اس کے ساتھ ہوگا اس سے کہا جائے گا کہ تم آخرت سے غافل تھے ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا، آج تمہاری نظر تیز ہے۔ یہ دو فرشتے جو اس کے ساتھ ہوں گے اُن میں سے ایک کہے گا: اس کا حساب میرے پاس حاضر ہے۔

حضرت امیر المومنین اس آیت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

سائق یسوقها الی محشرها و شاهد یشهد علیها بعملها [1]

''سائق جو گناہگار کو میدان محشر میں لے آئے گا اور شاہد اس کے اعمال پر شہادت دے گا''

بعض دوسری آیات میں بھی ملائکہ کی گواہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾ (ق: ۱۸)

''وہ کوئی کلام نہیں کرتا مگر یہ کہ اسکے ساتھ نگہبان حاضر ہوتا ہے''

یہ بھی ارشاد ہوتا ہے:

کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ بِالدِّیۡنِ ﴿۹﴾ وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿۱۱﴾

یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ (انفطار: ۹ تا ۱۲)

''تمہارے اوپر نگہبان مقرر کیے گئے ہیں، صاحب شرف لکھنے والے وہ جانتے ہیں اسے جو کچھ تم کرتے ہو''

۶۔ زمین یا عمل کی جگہ

گواہوں میں سے ایک وہ جگہ ہے جہاں پر نیک یا بد عمل انجام پایا ہوگا۔

قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَهَا ﴿۵﴾ (زلزلہ: ۴، ۵)

''اس دن زمین ان حوادث کی خبر دے گی جو اس میں انجام پائے ہوں گے کیونکہ تیرے رب نے اس پر وحی کی ہے اور اسے آگاہ کیا ہے''

البتہ یہ کہ زمین کس چیز کے بارے میں خبر دے گی۔ آیت میں اس کے بارے میں کچھ ذکر نہیں ہوا لیکن اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۵

یہ آیت انسانوں کے روز قیامت اٹھنے کے بارے میں ہے اور وہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں گے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین انسان کے ان نیک یا بد اعمال کی خبر دے گی جو اس پر انجام پائے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد والی آیات میں انسان کے اعمال کی جزا و سزا کا ذکر ہوا ہے:

يومئذٍ يصدر الناس اشتا تاليروا اعما لهمo فمن يعمل مثقال ذرة خيرا ريره و من يعمل مثقال ذرة شرا يره

"اس دن (حساب کے بعد) انسان گروہ در گروہ لوٹیں گے تا کہ ان کے اعمال انہیں دکھلائے جائیں اور جس نے بھی ذرہ برابر نیک یا بد عمل انجام دیا ہوگا وہ اسے دیکھ لے گا"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زمین کے تمام اجزا انسان کے اعمال پر گواہی نہیں دیں گے بلکہ صرف وہی جگہ جہاں انسان نے نیک یا بد عمل انجام دیا ہوگا گواہی دے گی اور اس مطلب پر روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔

کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا نافلہ نمازوں کو ایک جگہ پر انجام دوں یا مختلف جگھوں پر تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا: مختلف جگھوں پر تا کہ یہ مختلف جگھیں قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دیں۔[۱]

اعمال انسان پر جگہ کی گواہی کے بارے میں روایات بہت زیادہ وارد ہوئی ہیں جو کتب حدیث میں مختلف ابواب میں مثلاً نماز واجب و مستحب، حج، جہاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں وارد ہوئی ہیں ان سب کی تحقیق ایک جدا بحث کا تقاضا کرتی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن زمین لوگوں کے ان اعمال کی گواہی دے گی جو اس پر انجام پائے ہوں گے اور کہے گی کہ اس نے فلاں عمل فلاں دن انجام پایا۔[۲]

اس لحاظ سے قرآن و روایات کی رو سے ایک شاہد زمین کا ہونا مسلم و نا قابل تردید امر ہے۔ یہاں صرف یہ بات قابل توجہ ہے کہ زمین جو حس و ادراک نہیں رکھتی کس طرح انسان کے اعمال کا ادراک کر سکتی ہے اور آخرت میں ان پر گواہی کیسے دی گی؟

جواب واضح ہے کہ خود ان روایات و آیات اور کچھ دوسری آیات و روایات سے ایک اور حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کے تمام موجودات میں ایک قسم کا ادراک پایا جاتا ہے اور ان کے ادراک و آ گاہی کا معیار ان کا وجودی مرتبہ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ (بنی اسرائیل: ۴۴)

---

[۱] بحار الانوار جلد ۷، باب ۱۶، روایت ۱۵

[۲] مجمع البیان جلد ۵، ص ۵۲۶

''کوئی موجود نہیں ہے مگر یہ کہ وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے''

یہ مطلب فلسفہ اسلامی میں حکمت متعالیہ کے مسلمہ اصولوں کی رو سے بلا اشکال مسلم حقیقت ہے اور یہ خود قرآن کے امتیازات اور عجائبات میں سے ہے کہ اس نے ایک بہت دقیق حقیقت سے نقاب کشائی کی ہے اور وہ بھی اس زمانے میں جب ابھی تک فکر بشر ان دقیق مطالب کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ مولانا رومی نے کیا خوب کہا ہے:

جملہ ذرات عالم درنہان

باتومی گویند روزان و شبان
ما سمیعیم و بصیریم و ھو شیم
باشمانا محرمان ماخا مشیم
چون شما سوی جمادی می روید
محرم جان جمادان کی شوید؟
از جمادی در جہان جان روید
غلغل اجزای عالم بشنوید
فاش تسبیح جمادات آیدیت
وسوسہ تاویل ھابر بایدیت
چون ندارد جان تو قندیل ھا
بہر بینش کردہ ای تاویل ھا [1]

''کائنات کے تمام ذرات شب و روز اپنے اندر تجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سمیع و بصیر اور ہوش مند ہیں مگر تم نا محرموں سے ہم کلام نہیں کرتے چونکہ تم جمادات کی طرف جا رہے ہو اور جمادات سے کب آشنائی حاصل کرو گے جب اس کائنات میں کوئی جماد پیدا ہوتا ہے تو اس کا شور وغوغا کائنات کے تمام اجزا سنتے ہیں''

۷۔ زمان یا گردش لیل ونہار کی گواہی

مکان کی طرح دن رات بھی انسان کے اعمال پر گواہی دیں گے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

''جب دن کا آغاز ہوتا ہے تو ابن آدم سے کہتا ہے کہ اچھے کام کرو تا کہ میں قیامت کے دن تمہارے حق میں

[1] مثنوی رومی دفتر ۳

گواہی دوں۔ میں ناپائیدار ہوں گذشتہ میں نہیں تھا اور آئندہ نہیں رہوں گا اور رات کی تاریکی چھاتی ہے تو وہ بھی یہی کہتی ہے"[1]

۸۔ قرآن کی گواہی

بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ قرآن قیامت کے دن ایک انسان کی صورت میں مجسم ہوگا اور خدا اسے خطاب کرے گا کہ تم نے میرے بندوں کو کیسا پایا (یعنی انہوں نے تیرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟) تو وہ جواب دے گا: پروردگارا! بعض نے میری حفاظت کی اور مجھ میں سے کچھ ضائع نہ کیا کچھ نے مجھے ضائع کیا انہوں نے مجھے سبک شمار کیا اور میری تکذیب کی اور میں تیری حجت ہوں، تمام مخلوق پر۔ اس وقت خطاب ہوگا: مجھے میری عزت وجلال کی قسم! تیری خاطر پہلی طرح کے لوگوں کو بہترین جزا دوں گا اور دوسری طرح کے لوگوں کو دردناک عذاب دوں گا۔[2]

۹۔ نامہ اعمال

روز محشر ایک گواہ خود نامہ اعمال ہوگا جس میں نیکیاں اور برائیاں لکھی ہوں گی اور قرآن کی متعدد آیات میں اس صحیفے کے وجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً:

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝۲۱ (یونس: ۲۱)

"کہہ دو! خدا ان کے مکروحیلہ کو بے اثر کرنے میں ان سے زیادہ تیز ہے۔ اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے حیلہ و فریب کو لکھ لیتے ہیں"

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝۸۰ (زخرف: ۸۰)

"وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی سرگوشی کو نہیں سنتے۔ کیوں نہیں ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہیں، وہ لکھتے رہتے ہیں"

ان دو آیات میں اگرچہ اعمال یا سرگوشی لکھنے کی بات ہوئی ہے اور قیامت میں گواہی دینے کا تذکرہ نہیں ہوا لیکن مسلماً اعمال کا لکھا

---

[1] بحار ج ۷، باب ۱۶، روایت ۲۲

[2] بحار جلد ۷ باب ۱۶، روایت ۱۶

جانا قیامت میں ان پر حجت کی خاطر ہے لہٰذا بعض آیات میں صحیفے کے بارے میں یوں ارشاد ہے:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ (کهف: ۴۹)

''جب نامہ اعمال مجرمین کے سامنے رکھا جائے گا تو وہ اس میں لکھے ہوئے اعمال کی وجہ سے ڈر جائیں گے''

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ (جاثیه: ۲۷ تا ۲۹)

''قیامت کے دن باطل والے خسارے میں ہوں گے۔ تم ہر امت کو زانو کے بل دیکھو گے کہ اسے اس کے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ انہیں کہا جائے گا یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے خلاف حق بول رہی ہے''

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس صحیفے میں اتنے چھوٹے چھوٹے کام بھی لکھے ہوں گے کہ مجرم انہیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے گا اور کہے گا:

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ (کهف: ۴۹)

''یہ کیسی کتاب ہے جس نے کسی چھوٹے یا بڑے (عمل) کو نہیں چھوڑا اس نے تو ہر ایک کو شمار کر رکھا ہے''

دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا نامہ اعمال اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳ (بنی اسرائیل: ۱۳)

''ہر انسان کا نامہ اعمال ہم اس کی گردن میں لٹکائیں گے اور قیامت کے دن اسے کتابی صورت میں نکالیں گے اور وہ اسے کھلا ہوا پائے گا''۔

یہاں یہ سوال ممکن ہے کہ ایک نامہ اعمال کس طرح کسی کے جرائم پر گواہ ہو سکتا ہے کیونکہ نامۂ اعمال تو دنیوی عدالتوں میں بنائی جانے والی فائلوں کی مانند ہوگا۔ ان میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ صرف الزام یا فرد جرم ہوتی ہے اور ملزم کو اس کے مقابل دفاع کا حق حاصل ہوتا ہے اور اس کے اثبات کا طریقہ صرف گواہوں کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ بھی اگر ممکن ہو تو؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ قیامت میں ہر گواہ ایک خاص پوزیشن رکھتا ہے۔ نامۂ اعمال کی پوزیشن آخرت میں یہ ہوگی کہ گناہگار انسان کو جو علم و بصیرت آخرت میں حاصل ہو چکا ہوگا اس کی وجہ سے اس کے لیے یہی کافی ہوگا کہ وہ اپنے تمام گناہوں کو دیکھ لے۔

اسی سے اسے اپنے تمام اعمال سے آ گاہی حاصل ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں اگر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے گا اور اپنے بارے میں عدل وانصاف سے فیصلہ کرے گا تو نامۂ اعمال اس کے لیے بہترین شاہد و گواہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان کو نامۂ اعمال دے دیا جائے گا تو اس مرحلے کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ کہا جائے گا:

تم اپنے اعمال کا محاسبہ کرو اور صحیفہ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اسے دیکھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ آیت کی عبارت یوں ہے:

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿١٤﴾ (بنی اسرائیل: ۱۴)

اب اگر گناہگار نے اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تو خداوند حکیم عدل و فضل کی اساس پر اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ لیکن اگر اس نے نامۂ اعمال دیکھنے کے بعد انکار کیا اور چاہا کہ جیسے دنیوی عدالتوں پر حیلہ و مکر کے ذریعے جھوٹ بول کر جان چھڑوا لیا کرتا تھا یہی طریقہ آخرت میں بھی اپنا لے تو الٰہی گواہ اس کے خلاف شہادت دیں گے اور اگر اس نے ان کی گواہی کا بھی انکار کر دیا تو پھر اس کے اعضائے بدن اس کے خلاف گواہی دیں گے کہ اس نے ہمارے توسط سے یہ گناہ انجام دیئے تو ایسی صورت میں اس کے لیے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔

یہ مطلب ان روایات سے بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے جو قیامت کے گواہوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان روایات میں ہے کہ فرشتے ان لوگوں کے بارے میں گواہی دیں گے جنہوں نے اپنے اعمال کا انکار کیا ہوگا اور اگر وہ فرشتوں کی گواہی کا بھی انکار کر دیں گے تو پھر ان کے منہ بند کر دیے جائیں گے اور ان کے اعضائے بدن بولنے لگیں گے۔

پس گواہی کے یہ تین مراحل ہوں گے:

۱۔ نامۂ اعمال

۲۔ نامۂ اعمال کے انکار کے بعد فرشتوں کی گواہی

۳۔ تکذیب ملائکہ کے بعد اعضائے بدن کی گواہی

یہاں تک بحث خارجی گواہوں کے بارے میں تھی، اب داخلی گواہوں کا ذکر کرتے ہیں۔

داخلی گواہ:

داخلی گواہوں سے مراد انسان کے بدن کے اجزا ہیں یا وہ چیزیں جو کسی نہ کسی طرح سے اس کے ساتھ ربط رکھتی ہیں۔

(الف) اعضائے بدن

روز قیامت کے عجائبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجرم کا ہر عضو اس کے خلاف گواہی دے گا جس کے بعد مجرم اور دوسروں کے لیے کوئی شک و تردد باقی نہیں رہے گا۔

اس بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴿۲۴﴾

(نور: ۲۴)

''اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہوگا اس کے بارے میں گواہی دیں گے''

اور ایک دوسری آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ اعضا میں سے منہ بند ہو جائے گا اور دوسرے اعضا گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴿۶۵﴾ (یٰسٓ: ۶۵)

''آج (قیامت کے دن) ہم ان کے منہ کو سیل بند دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے اور پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو کچھ انہوں نے کیا ہوگا''

(ب) بدن کی کھال کی گواہی

کچھ آیات نے ایک اور گواہ کا ذکر بھی کیا ہے اور وہ ہے بدن کی کھال کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال پر اس کے بدن کی کھال بھی گواہی دے گی۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَيَوۡمَ يُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمۡ يُوۡزَعُوۡنَ﴿۱۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوۡهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴿۲۰﴾ وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴿۲۱﴾ (حم سجدہ: ۱۹، ۲۱)

''اس دن خدا کے دشمنوں کو آگ کی طرف بھیجا جائے گا، وہ کھڑے ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ سب پہنچ جائیں جب سب آ جائیں گے تو ان کے خلاف ان کے کان، آنکھ اور ان کی کھال ان کے بُرے اعمال پر گواہی دیں گے وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی تو وہ جواب دیں گی ہمیں اس خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے ہر چیز کو قوت گویائی دی۔ وہ وہی ہے جس نے تمہیں پہلی مرتبہ خلق کیا ہے اور اسی کی

طرف تم لوٹائے جاؤ گے“

اس آیت میں کھال کی گواہی کا ذکر بطور مطلق ہوا ہے لہٰذا اس کی گواہی تمام اعضائے بدن کے اعمال پر محیط ہوگی اور اس آیت کا مدلول ان آیات سے وسیع ہوجائے گا جن میں صرف ہاتھ اور پاؤں کی گواہی کا تذکرہ ہوا تھا۔

البتہ کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں ”جلود“ کے معنی ”فروج“ (شرمگاہ) کے ہیں اور قرآن نے ادب کے پیش نظر کنائے کے ساتھ بات کی ہے۔

لیکن یہ تفسیر کوئی محکم دلیل نہیں رکھتی کیونکہ خود لفظ فروج بھی قرآن کی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ صحیح مومنین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ (مومنون: ۵)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف کھال کے گواہی دینے پر کیوں اعتراض کریں گے اور کان اور آنکھ کی گواہی دینے پر کیوں اعتراض نہیں کریں گے؟

کہا گیا ہے کہ کھال صرف ان کاموں کی گواہی دے گی جو اس کے توسط سے انجام پائے ہوں گے جبکہ آنکھ اور کان دوسرے اعضا کے اعمال کے بارے میں بھی گواہی دیں گے گویا کھال پر گناہگاروں کے اعتراض کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ کام خود تم نے انجام دیا پھر کیوں اس پر گواہی دے رہی ہو۔

یہاں تک قیامت کے بارہ گواہوں سے آشنائی حاصل ہوگئی، اب ہم اس بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں اور تجسم اعمال کی بحث جداگانہ کریں گے کیونکہ جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے۔ تجسم اعمال مجرم کے لیے سزا ہونے کے ساتھ ساتھ خود اس کے اعمال پر گواہ بھی ہے۔

قیامت وصراط

لغت میں صراط کے معنی راستے اور طریق کے ہیں۔ قرآن میں بھی صراط اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ (بقرہ: ۲۱۳)

"خدا جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے"

اسی لحاظ سے کبھی جہنم کو جانے والے راستے کے لیے بھی لفظ صراط استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ (صافات: ۲۲، ۲۳)

"ظالمین اوران کے ہمسروں کو اور انہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے اٹھاؤ اور سب کو جہنم کی طرف لے جاؤ"

راغب اصفہانی نے صراط کے معنی میں سہل و آسانی کی قید کو بھی داخل کیا ہے۔[1] طبعی طور پر جنت و جہنم دونوں کی راہیں ایک لحاظ سے آسان ہیں۔ اس لیے کہ جنت کا راستہ قوانین الٰہی پر عمل کرنے کے نتیجے میں دستیاب ہوتا ہے اور قوانین الٰہی پر عمل انسان کی خلقت اور فطرت کے مطابق ہے اور انسان کے ملکوتی پہلو سے ہم آہنگ ہے جب کہ دوزخ کا راستہ اس لیے آسان ہے کہ یہ شیطانی و بہیمانہ قوتوں کے استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو انسان کے حیوانی پہلو کے ساتھ ہم آہنگ ہے نیز کبھی صراط پل کو بھی کہا جاتا ہے جو دو راستوں کو آپس میں ملاتا ہے۔

صراط یا عمومی راستہ

آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں ایک عمومی راستہ ہوگا۔ سب لوگوں کو وہاں سے گزرنا ہوگا۔ روایات کی زبان میں اسے صراط کہا گیا ہے۔ قرآن میں اگرچہ صریحاً اس بارے میں کچھ وارد نہیں ہوا لیکن مفسرین کی نظر میں درج ذیل آیت صراط ہی کے بارے میں ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾ (مریم: ۷۱، ۷۲)

"تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جسے وہاں پر (دوزخ پر) وارد نہ ہونا پڑے اور یہ تمہارے خدا پر حتمی و یقینی ہے پھر خدا پرہیزگاروں کو نجات دے گا اور ظالمین کو وہاں پر چھوڑ دے گا تاکہ وہ گھٹنوں کے بل پڑے رہیں"۔

---

[1] مفردات راغب ۲۳۰

مثلاً حضرت موسیٰ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡيَنَ (قصص: ۲۳)

''جب وہ مدائن کے پانی پر وارد ہوئے''

مسلم ہے کہ پانی کنوئیں میں تھا اوراس کے اوپر اشراف اورنزدیکی کو ورود کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اسی آیت کے بعد ہے: وجد علیه امة من الناس یسقون یعنی حضرت موسیٰ نے وہاں پر ایک گروہ کو دیکھا وہ لوگ اپنی بھیروں کو سیراب کر رہے تھے۔ واضح ہے کہ پلانے والوں کا نظارہ وہی کرسکتا ہے جو کنوئیں کے اندر نہ ہو بلکہ باہر ہو۔

اسی طرح وہ کاروان جس نے حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں پایا اس کے بارے میں ارشاد ہے:

وَجَآءَتۡ سَيَّارَةٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَهُمۡ فَاَدۡلٰى دَلۡوَهٗ‌ؕ (یوسف: ۱۹)

''ایک قافلہ پہنچا۔ انہوں نے قافلے کے ماشکی کو پانی لانے کے لیے بھیجا اوراس نے ڈول کنوئیں میں ڈالا''

اس آیت میں لفظ ''وارد'' سقا کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو عموماً پانی لانے کے لیے کنوئیں پر جاتا ہے اورڈول کے ذریعے پانی کھینچتا ہے، خود پانی کے اندر نہیں جاتا۔

لہٰذا موردِ بحث آیت ''وان منکم الا واردها'' سے مراد یہ ہے کہ تمام جنتی اور جہنمی دوزخ پر اشراف کریں گے اوراس کے نزدیک جائیں گے۔ اس کے بعد جنت والے نجات پا جائیں گے اورجنتیوں کے لیے نجات از دوزخ کا جملہ استعمال کیا گیا ہے چونکہ جو جہنم کے کنارے پہنچ چکا ہو وہاں پر اسے آگ میں گرنے کا خوف تو ہوگا ہی لہٰذا یہاں پر نجات کا لفظ استعمال کرنا بالکل مناسب ہے۔

۲۔ اکثر مفسرین کی نظر میں آیت میں ''ورود'' کے معنی دخول کے ہیں اسی بنیاد پر انہوں نے کہا ہے کہ تمام اہل محشر (حتیٰ کہ بہشتی بھی) جہنم میں داخل ہوں گے اس کے بعد ظالمین وہیں رہیں گے اور متقین نجات پا جائیں گے البتہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ حکم خدا کے ذریعے جہنم کی آگ حضرت ابراہیمؑ کی طرح انہیں بھی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ ان افراد نے بھی اس معنی کے لیے مختلف آیات سے استفادہ کیا ہے:

(الف) قرآن نے قیامت میں دوسرے فرعونوں کے لیے مصر کے فرعون کو رہبر قرار دیا ہے جو جہنم کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا (یعنی اس کی دنیوی ظالمانہ رہبری آخرت میں تجسم پیدا کرے گی)۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ‌ؕ (هود: ۹۸)

''قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اورانہیں جہنم میں وارد کردے گا''

(ب) خدا تعالیٰ جھوٹے معبودوں اوران کے مشرک پیروکاروں کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ‌ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ۝۹۸ لَوۡ

كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ (انبیاء: ۹۸، ۹۹)

''تم اور جس کی تم خدا کے علاوہ عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں۔ تم اس میں وارد ہو گے، اگر یہ معبود ہوتے تو ہرگز جہنم میں وارد نہ ہوتے اور تم سب اس میں ہمیش رہو گے''۔

ان دو نظریوں کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں ورود کے معنی اشراف و نزدیکی کے کرنا خلاف ظاہر ہے اور داستان موسیٰ اور داستان یوسف میں ورود کا اشراف کے معنی میں آنا قرائن کی وجہ سے ہے جو وہاں پر پائے جاتے ہیں کیونکہ موسیٰ کی داستان میں کہا گیا ہے کہ موسیٰ نے ایک گروہ کو کنوئیں سے پانی نکالتے ہوئے دیکھا اور وہاں پر دو لڑکیوں کو انتظار کرتے ہوئے پایا۔ یہ مطلب خود شاہد ہے کہ موسیٰ کا ورود کنوئیں پر اشرف کے معنی میں تھا نہ کہ کنوئیں میں دخول کے معنی میں اور حضرت یوسفؑ کی داستان میں ''ادلی دلوہ'' استعمال ہوا ہے یعنی ڈول کنوئیں میں ڈالا یہ خود شاہد ہے کہ ''ورود'' کے نزدیکی کے ہیں نہ کہ دخول کے۔

اس کے باوجود آیت میں اس کی گنجائش ہے کہ ورود کی تفسیر جہنم کی نزدیکی کے ساتھ کی جائے کیونکہ جہنم میں داخل ہوں یا جہنم کے قریب ہوں دونوں صورتوں میں جہنم سے نجات صدق کرتی ہے۔

بعض نے دوسرے معنی (دخول در جہنم) کو اختیار کرنے کے باوجود کہا ہے کہ جہنم میں غیر متقی داخل ہوں گے۔ لیکن یہ قول جملہ ''ثم ننجی الذین اتقوا'' کے موافق نہیں ہے کیونکہ نجات تو ورود کی ہی صورت میں معقول ہو سکتی ہے لہٰذا اگر ورود کے معنی دخول کے ہیں تو پھر ورود کو غیر متقین کے ساتھ اختصاص دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے

بہرحال کچھ مفسرین اسی آیت کو صراط پر ناظر شمار کرتے ہیں کہ سب کو وہاں سے گزرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس میں قیامت میں صراط کا ذکر ہوا ہو یا اس کی طرف اشارہ ہوا ہو لیکن روایات میں اس بارے میں مفصل گفتگو ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم قیامت میں صراط سے مربوط روایات کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ علی بن ابراہیم نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت وجاء یومئذ بجهنم یومئذ یتذکروا الانسان وانی له الذکری (فجر: ۲۳) ''اس دن جہنم کو لایا جائے گا اس دن انسان متوجہ ہو گا لیکن اس دن متوجہ ہونا کیا فائدہ دے گا؟ کی تفسیر کے سلسلے میں یہ قول نقل کیا ہے:

امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثم یوضع علیها الصراط ادق من الشعر واحد من السیف

''اس کے بعد اس (جہنم) پر ایک راستہ بنایا جائے گا جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوگا'' [1]

۲۔ شیخ صدوق معانی الاخبار میں فرماتے ہیں جو بھی اس دنیا میں اپنے امام کو پہچان لے اور اس کی ہدایات پر عمل کرے وہ صراط سے گزر

---

[1] بحار الانوار جلد ۸، باب صراط در روایات ۲

سکے گا اور صراط دوزخ کے اوپر ایک پل ہے اور جو بھی دنیا میں اپنے امام کو نہ پہچان سکے گا اس کا قدم صراط پر سے پھسل جائے گا اور وہ جہنم میں گر پڑے گا۔[1]

ان دو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صراط کو پل صراط کہنا درست نہیں ہے اگر چہ اب مشہور یہی ہے۔علم کلام کی کتابوں میں بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔

شیخ مفید فرماتے ہیں کہ روایات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو جنت میں لے جانے والا راستہ ایک پل کی مانند ہے جسے وہ عبور کریں گے اور یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ صراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، کافر جس سے پھسل کر جہنم میں گر جائیں گے۔[2]

تفتازانی کہتے ہیں کہ صراط ایک پل ہے جو جہنم پر نصب ہوگا اور اس کو اس پر سے گزرنا ہوگا اور وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا''

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ صراط سے گزرنا ہی وہ جہنم میں ورود ہے جو آیت میں آیا ''وان منکم الا واردھا[3]

ان روایات اور متکلمین کے اقوال سے مجموعاً معلوم ہوتا ہے کہ جہنمی اور جنتی تمام لوگوں کا راستہ یہی پل یا صراط ہوگا اور وہ ایسی چیز ہے جس سے کافروں کے پاؤں پھسل جائیں گے اور وہ جہنم میں گر پڑیں گے لیکن مومن اس سے گزر جائیں گے۔

آیت ''وان منکم الا واردھا'' کا مفاد بھی یہی ہے کہ تمام انسان نیک ہوں یا بد جنتی ہوں یا جہنمی دوزخ پر وارد ہوں گے، اسکے بعد جنتی بغیر نقصان کے نجات پا جائیں گے۔

اس صورت میں جو کچھ روایات میں آیا ہے اور اسلامی متکلمین نے کہا ہے کہ وہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے اور اسی ضمن میں یہ بھی بیان کر دیا کہ انسان جہنم میں کس طرح داخل ہوں گے اور صراط جہنم پر ایک راستہ ہے جس پر سے ہر کسی کو گزرنا ہوگا متقی خدا کی عنایت سے عبور کر جائیں گے لیکن ظالم اس میں گر پڑیں گے۔

یہ کہ جہنم پر جو راستہ ہے وہ کیسا ہے؟ اس کے بارے میں دو احتمال ہیں:

۱۔　اس کے ظاہری معنی مراد ہیں یعنی پل یا راستہ جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے۔

۲۔　صراط اخروی اسی دنیوی صراط اک تجسم ہوگا یعنی پرہیز گاروں نے دنیا میں جو صراط مستقیم اختیار کیا ہوگا اس راستے کی آخرت میں تجلی یہ ہوگی کہ یہ راستہ انہیں جنت تک پہنچا دے گا اور ظالموں نے دنیا میں جو باطل راستے اختیار کیے ہوں گے آخرت میں وہی مجسم ہو جائیں گے اور انہیں جہنم تک پہنچا دیں گے۔

---

[1] یہی مدرک حدیث ۳

[2] شرح عقائد صدوق ۴۹، ص ۵۰

[3] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۲۳

جولوگ زیادہ ظواہر پر اعتماد کرتے ہیں وہ پہلے نظریے کو قبول کرتے ہیں اور جولوگ عقلی ونقلی قرائن کے ذریعے ظواہر سے گزر کر اس جیسی تعبیرات کے باطن پر نظر کرتے ہیں انہوں نے دوسرے نظریے کو قبول کیا ہے۔

اگر چہ ان جیسے مطالب کے بارے میں فیصلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو کچھ صراط کے بارے میں معصومین سے منقول روایات سے پتہ چلتا ہے وہ دوسرا نظریہ ہی ہے اور حضرت امیر المومنینؑ سے بھی منقول جملے میں دوسرے نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ امام تقویٰ اور راہِ تقویٰ سے انحراف کے بارے میں فرماتے ہیں:

الا وان الخطايا خيل شمس حمل عليها اهلها و خلعت لجمها فتقحمت بهم فی النار الا وان التقوىٰ مطايا ذلل حمل عليها اهلها واعطوا ازمتها فاوردتهم الجنة (نہج البلاغۃ خطبہ ۱۱)

"خطایا (حیوانی خواہشات) سرکش گھوڑے ہیں کہ اس کے اہل کو اس پر سوار کر دیا گیا ہے اور لگام ان کے ہاتھوں سے لے لی گئی ہے پس وہ انہیں جہنم میں ڈال دیں گے اور بہ تحقیق تقویٰ اور خواہشات پر کنٹرول مطیع ورام سواریاں ہیں کہ ان کے اہل ان پر بیٹھے ہیں اور لگام ان کے ہاتھ میں ہے پس وہ انہیں جنت میں پہنچا دیں گے"

اس روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جنت وجہنم کی راہ اسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے اور جنت یا جہنم پر منتہی ہوتی ہے۔ اس طرح نہیں کہ آخرت میں اس کے علاوہ جہنم پر ایک راستہ بنایا جائے گا اور اہل محشر کو اس پر سے گزرنا پڑے گا بلکہ جس نے اس دنیا میں تقویٰ کی مستقیم راہ کو اختیار کر لیا آخرت میں یہی راستہ مجسم ہوگا اور اسے جنت میں وارد کر دے گا اور جس نے دنیا میں کتاب وسنت کے بیان کردہ اعتدال کے صراط مستقیم سے یمین وشمال کی طرف انحراف کیا۔[1] آخرت میں یہی راستہ مجسم ہوگا اور اسے دوزخ میں پہنچا دے گا۔

اگر چہ اس حدیث سے یہ تائید ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود پہلے نظریے کی نفی پر اس حدیث کو برہان قاطع نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ حضرت علیؑ کا کلام مبارک مجاز، استعارہ وکنایہ سے بھرا ہوا ہے اور ممکن ہے کہ ان تعبیروں میں سے کچھ تعبیریں استعارۃً ہوئی ہوں اور دونوں نظریوں سے میل کھاتی ہوں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس بحث کو یہیں پر ختم کر کے دوسری بحث شروع کی جائے اور وہ ہے صراط سے لوگوں کے گزرنے کی کیفیت۔

عبور از صراط میں انسانوں میں فرق

کچھ روایات میں لوگوں کے صراط سے گزرنے کو اور خود صراط کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ صراط کی کیفیت تو درج ذیل ہے:

---

[1] حضرت علی کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: اليمين والشمال مضلة والطريق الوسطى هی الجادة عليها باقی الكتاب و اثار النبوة و منها منفز السنة واليها مصير العاقبة۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶

۱۔ بال سے زیادہ باریک (ادق من الشعر)

۲۔ تلوار سے زیادہ تیز (احد من السیف)

اس کے بعد اس صراط سے گزرنے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

۱۔ وہ جو بجلی کی تیزی کی طرح صراط سے گزر جائیں گے، یہ لوگ معصومینؑ (اہل بیت) ہیں۔

"فمنهم من یمر مثل البرق"۔ فیمضی اهل بیت محمد واله زمرة علی الصراط مثل البرق الخاطف"

۲۔ وہ لوگ جو ہوا کی طرح تیز عبور کریں گے۔(یمضی قوم مثل الریح)

۳۔ کچھ لوگ گھوڑے کی طرح تیزی سے گزریں گے۔"و منهم من یمر مثل عدو الفرس"

۴۔ ایک گروہ پیدل چلنے والے انسان کی سرعت سے گزرے گا۔(ثم یمضی قوم مثل المشی)

۵۔ کچھ لوگ ہاتھ اور سینہ پر گھسٹنے والے کی طرح گزریں گے۔(ثم قوم مثل الحبور، و منهم من یمر حبواً)

۶۔ ایک گروہ انتہائی مشکل سے اور اس کی مانند جو گھٹنوں کے بل چل رہا ہو گزرے گا۔

(ثم قوم مثل الزحف)[1]

تفسیر و توضیح

اب ان روایات کی توضیح کی طرف آتے ہیں۔

محققین نے جو اُخروی مسائل کے بارے میں تحقیق کی ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے ان روایات کی مراد واضح ہو جائے گی اور وہ یہ ہے کہ عالم قیامت کے حقائق وواقعات درحقیقت اسی دنیا کے واقعات کا نتیجہ و آئینہ ہیں اور یہ دو ایک دوسرے کے طول میں اور ان میں سے ہر ایک انسان کی ہستی، افکار اور اعمال کا خاص جلوہ و تجسم ہے۔ انسان کی خواہشات و شہوات ایسی حقیقتیں ہیں جو اس دنیا میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور آخرت میں یہ جہنم وعقاب کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اس بنیاد پر ہر شخص کو اس جہنم سے گزرنا ہوگا اور اس جہنم پر پل انسان کی الٰہی فطرت اور اس کا ملکوتی پہلو ہے اور واضح ہے کہ اس خواہش نفسانی کے جہنم پر جو یہ صراط یا پل قائم کیا گیا ہے، بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے اور الٰہی قوانین کی رعایت جو انسانی فطرت کی اساس پر مبنی ہے (ایک لحاظ سے) بہت مشکل اور جانفرسا ہے اور ان قوانین کو ملحوظ رکھنے میں انسان مختلف ہوتے ہیں ایک قسم کے وہ لوگ ہیں جن کے ذہن میں بالکل گناہ کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ لوگ پلیدی و بدکاری سے بجلی کی سرعت سے گزر جاتے ہیں۔ یہ لوگ آخرت میں بھی جنت کا راستہ اسی تیزی کے ساتھ طے کریں گے اور جہنم سے گزر جائیں گے۔ اور اس ترتیب پر

---

[1] بحار جلد ۸، باب ۲۲، روایت ۱۔۲۔۸

دوسرے افراد بھی کہ جیسے دنیا میں انہوں نے گناہ وحیوانی تمایلات کے مقابلے میں جس کردار کا مظاہرہ کیا ہوگا اور جس انداز میں انہوں نے قوانین الٰہی کے بارے میں ندائے فطرت کو لبیک کہا ہوگا آخرت میں اسی انداز میں جہنم سے گزریں گے اور جنت میں داخل ہو سکیں گے۔

عظیم شیعہ فقیہ و متکلم جناب شیخ مفید صراط کے بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مقصد یہ ہے کہ کافر شدت خوف و ہراس کی وجہ سے کانپنے لگیں گے اور ان کے پاؤں پھسلنے لگیں گے اور ان میں حرکت کی قوت نہ رہے گی ان کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز چیز پر حرکت کرنا چاہتا ہو اور درحقیقت یہ تمثیل وتشبیہ ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں کا صراط سے گزرنا کس قدر مشکل ہوگا''[۱]

علامہ مجلسی شیخ مفید کا کلام نقل کرنے کے بعد اسے صحیح نہ سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کسی مسئلے کے ظواہر کی بغیر ضرورت کے تاویل کرنا صحیح نہیں ہے''[۲]

ہم عرض کرتے ہیں کہ اگرچہ علامہ مجلسی کی بات بطور ایک قانون وقاعدہ کے صحیح ہے کہ جب کوئی شاہد و دلیل بھی نہ ہو اور عقلی تقاضا بھی نہ ہو تو ظواہر کی تاویل کرنا صحیح نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جو کچھ شیخ مفید نے فرمایا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہے کیونکہ روایات میں شواہد موجود ہیں کہ یہاں صراط کی اس توصیف سے مراد تشبیہ و تمثیل ہے۔

ایک روایت جسے خود علامہ مجلسی نے مناقب (ابن شہر آشوب) سے نقل کیا ہے، میں ارشاد ہے کہ اللہ نے پل (صراط) مومنین کے لیے وسیع و عریض بنایا ہے اور گناہگاروں کے لیے بہت تنگ اور باریک۔[۳]

حالانکہ دوسری روایات کا ظہور یہ ہے کہ صراط ایک ہی ہے اور سب کے لیے یکساں ہے صرف اس سے گزرنے میں انسانوں میں اختلاف وتفاوت ہوگا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

اس کے علاوہ ہم نے عرض کیا ہے کہ انسان کی اخروی زندگی اور وہاں کے واقعات درحقیقت اسی دنیوی زندگی میں اس کے افکار و رفتار و کردار کا جلوہ ہوں گے اور تاویل ظواہر میں بحث اصلاً صراط کے ساتھ مربوط ہی نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اخروی زندگی اس دنیوی زندگی کا جلوہ و تجسم ہے اور صراط کا وسیع یا تنگ ہونا انسان کے دنیا میں مومن و کافر ہونے اور نیک و بد ہونے کا عکس العمل ہے۔ اسی وجہ سے بعض روایات[۴] میں اہل بیت علیہم السلام (جو صراط سے بجلی کی سی تیزی سے گزریں گے) کو اس آیت کا مصداق بتایا گیا ہے:

---

[۱] شرح عقائد صدوق، ص ۸۸

[۲] بحار جلد ۸، ص ۷۱

[۳] بحار جلد ۸، ص ۶۸، روایت ۸

[۴] بحار جلد ۸، ص ۶۷

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ (حدید: ۱۲)

''قیامت کا دن وہ ہے جس میں تم مومنین ومومنات کو دیکھو گے کہ ان کا نوران کے ساتھ اور دائیں جانب جارہا ہے (انہیں کہا جائے گا) تمہیں بشارت ہو اس دن ایسے باغات کی جس کے نیچے نہریں جاری ہیں تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے''

یہاں یہ نکتے کی بات ہے کہ مومنین کو جنت کی طرف رہنمائی کرنے والا وہی نور ہے جو خود ان سے ظاہر ہوگا اور یہ نور درحقیقت ان کے دنیوی افکار و کردار و ملکات کا عکس العمل اور جلوہ ہے یہی وجہ ہے کہ تفسیر قمی میں ایک روایت وارد ہوئی ہے کہ قیامت میں ہر کسی کا نور اس کے ایمان کے مطابق ہوگا اور منافق کا نور اتنا ہوگا کہ وہ صرف اپنے پاؤں کی انگلیوں سے آگے دیکھ سکے گا۔ [۱]

ولایت صراط سے گزرنے کا پروانہ

۱۔ اس بارے میں بہت سی روایات آئی ہیں۔ ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''تم میں سے صراط پر ثابت قدم ترین شخص وہ ہوگا جو اہل بیتؑ کا زیادہ محب ہوگا''۔ [۲]

۲۔ دوسری روایت میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ قیامت کے دن میں، تم اور جبریل صراط پر ہوں گے اور اس سے کسی کو گزرنے کا حق نہیں ہوگا مگر اسے جس کے پاس جہنم سے چھٹکارے کے لیے تیری محبت کا پروانہ ہوگا۔

اس بارے میں شفاعت کے باب میں بہت ساری روایات وارد ہوئی ہیں جن کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے صرف نمونے کے طور پر ایک روایت نقل کرتے ہیں:

''قیامت کے دن ہر کسی کی پیشانی پر لکھا ہوگا کہ یہ مومن ہے یا کافر۔ اگر کوئی مومن اور محب اہل بیت اپنی کسی خطا کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے گا تو فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جو دیکھ رہی ہوں گی اس کی شفاعت کرتے ہوئے عرض کریں گی: خدایا! تو نے میرا نام فاطمہ اس لیے رکھا کہ میرے اور میری اولاد کے محبوں کو جہنم سے نجات دے اور تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ خدا کی طرف سے خطاب ہوگا: درست ہے، جو کچھ تم نے کہا ہے صحیح ہے، میں

---

[۱] المیزان جلد ۱۹، ص ۱۸۱

[۲] بحار جلد ۸، ص ۸۹

نے اسی لیے حکم دیا تھا کہ اس بندے کو جہنم میں ڈالا جائے تا کہ تم شفاعت کرو اور میں تمہاری شفاعت قبول کروں تا کہ فرشتوں، انبیا اور تمام اہل محشر پر تمہاری شان واضح ہو جائے''[1]

پس اصل مطلب میں تو کوئی شک نہیں کہ خاندان عصمت وطہارت اہل بیت پیغمبرؐ کی دشمنی صراط سے گزرنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے ساتھ صراط سے گزرنا ناممکن ہے۔

ثانیاً اس خاندان کی محبت اور دوستی صراط سے گزرنے اور کچھ گناہوں کی بخشش کا بہت بڑا ضامن وعامل ہے، لیکن یہ سوال کہ اس کا دائرہ کار کہاں تک ہے اور اہل بیت کی محبت کی وجہ سے کون سے گناہ بخشے جائیں گے یہ سوال شفاعت کی بحث سے متعلق ہے۔

[1] بحار جلد ۸، ص ۵۰، باب شفاعت روایۃ ۵۸

اعراف اور اعراف والے

اعراف کا کلمہ قرآن کریم میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ ایک مرتبہ ''وعلی الاعراف'' کی صورت میں اور دوسری مرتبہ ''اصحاب الاعراف'' کی صورت میں اور دونوں جگہوں پر یہ قیامت اور اس کی منازل سے متعلق ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ''اعراف'' کیا ہے اور اعراف والے (اصحاب اعراف) کون ہیں؟

لغتاً اعراف ''عرف'' سے لیا گیا ہے اور عرف گھوڑے کی گردن کے بالوں اور مرغ کے سر پر موجود کلغی کو کہتے ہیں اور کبھی ہر چیز کی بلند جگہ کو عرف کہتے ہیں۔ اعراف عرف کی جمع ہے۔ اس سے مراد بلند مقامات ہیں۔ [1] نتیجتاً اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جو بلند ترین جگہ پر ہوں گے۔ یہاں تک اعراف کے لغوی معنی معلوم ہو گئے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اعراف سے مواقف قیامت میں کیا مراد ہے؟

شیخ صدوق اپنی کتاب ''اعتقادات'' میں فرماتے ہیں کہ اعراف ایک بلند و مرتفع حجاب ہوگا۔ جنتی اور جہنمی لوگوں کے درمیان اس حجاب کے اوپر ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جو تمام جنتیوں اور جہنمیوں کو چہروں سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ دوزخ میں وارد تو نہیں ہوں گے لیکن دوزخیوں کو پہچانتے ہوں گے۔ اور جہنمی اس وقت تک جہنم میں نہیں جائیں گے جب تک ان کی نفرت نہ دیکھ لیں اور اسی حجاب کے دوسری طرف کچھ مستضعف (وہ لوگ جو وسیلہ نہ ہونے کی وجہ سے ادراک حق نہ کر سکے یا ان کی عقل اتنی زیادہ نہ تھی) ہوں گے جو رحمت خدا کے امیدوار ہوں گے۔ قرآن کی تعبیر میں ''المرجون لامر اللہ'' خدا انہیں معاف بھی کر سکتا ہے اور عقاب بھی کر سکتا ہے۔ [2]

شیخ مفید فرماتے ہیں کہ اعراف جنت و جہنم کے درمیان ایک پہاڑ ہے اسے حصار بھی کہا جاتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ یہ جنت کا جز ہے نہ جہنم کا۔ اس کے اوپر کچھ عالم کھڑے ہوں گے جو جہنمیوں اور جنتوں کو ان کی علامات سے پہچانتے ہوں گے۔ [3]

اعراف کے بارے میں قرآن نے یوں فرمایا ہے:

۱۔ وَبَيۡنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ يَّعۡرِفُوۡنَ كُلًّاۢ بِسِيۡمٰهُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ ۟ لَمۡ يَدۡخُلُوۡهَا وَهُمۡ يَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

(الاعراف: ۴۶)

۲۔ وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ

---

[1] اقرب الموارد جلد ۲ مادہ عرف

[2] بحار جلد ۸ ص ۳۴۰

[3] شرع عقائد صدوق، ص ۴۸، ۴۹

الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ (الاعراف: ۴۷)

۳۔ وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (الاعراف: ۴۸)

۴۔ اَهٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ (الاعراف: ۴۹)

ترجمہ:

۱۔ ''جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان ایک حجاب ہے اور اس کے اوپر کچھ مرد کھڑے ہوں گے جو سب کو چہروں سے پہچانتے ہوں گے۔ انہیں جنتی کہیں گے: تم پر سلامتی ہو جبکہ وہ (جنتی) ابھی تک جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے حالانکہ ان کی خواہش ہوگی۔ (مطلب یہ ہے کہ بہشتی ابھی تک بہشت میں وارد نہیں ہوئے ہوں گے اور ورود کی خواہش رکھتے ہوں گے۔ یہ ترجمہ ایک قرینہ کی بنیاد پر زیادہ بہتر لگتا ہے جو چوتھی آیت میں ہے اگر چہ مفسرین نے اسے خود اعراف والوں سے مربوط کہا ہے کہ وہ ابھی تک جنت میں داخل نہیں ہوئے اور اس کی خواہش رکھتے ہیں)

۲۔ جنتی جب جہنمیوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: خدایا! ہمیں ظالمین کے ساتھ قرار نہ دینا۔[1]

۳۔ اعراف والے ان سے کہیں گے جنہیں وہ چہروں سے پہچانتے ہوں گے۔ تم نے مال جمع کیا اور اس کی وجہ سے تکبیر کیا لیکن آج وہ مال تمہاری ضرورت پوری نہ کر سکے۔

۴۔ اعراف والے دوزخیوں سے کہیں گے: کیا یہ (جنتی) وہی نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ رحمت خدا اُن کے شامل حال نہیں ہوگی (اس وقت جنتیوں کو جو ابھی تک جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور داخل ہونے کے منتظر ہوں گے) حکم ہوگا: جنت میں داخل ہو جاؤ اور تم پر کوئی خوف و حزن نہیں ہے۔

اس آیت میں جملہ ''ادخلوا الجنه'' سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی آیت میں ''لم یدخلوھا'' بھی جنتیوں سے ہی متعلق تھا جو جنت کے قریب جنت میں داخلے کے منتظر کھڑے ہوں گے اور اعرافیوں اور دوزخیوں کے درمیان اس گفتگو کے بعد انہیں کہا جائے گا کہ

---

[1] یہ ترجمہ بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ''ابصارھم'' کی ضمیر اصحاب الجنۃ کی طرف لوٹے جو ابھی تک جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن کچھ مفسرین نے اسے بھی اصحاب اعراف کے متعلق جانا ہے لیکن ان کی قدر و منزلت اس سے بلند ہے کہ وہ اس طرح کہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نے اعراف والے لوگوں کی دو قسمیں کی ہیں اور کہا ہے کہ یہ آیت اعرافیوں کے متوسط طبقہ کے بارے میں ہے۔

جنت میں داخل ہو جاؤ۔

ذکر آیات اور ان کے ترجمے کے بعد اب ہم اعراف اور اعرافیوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں:

۱۔ آیات سے مجموعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت وجہنم کے درمیان اعراف ایک بلند مقام ہے جس پر کچھ مرد مسلط ہیں جو جنتیوں اور جہنمیوں کو اوپر سے دیکھ رہے ہیں۔

۲۔ اعراف جنت وجہنم کے علاوہ خود ایک مقام ہے۔ طبعی طور پر اصحاب اعراف بھی اس جگہ پر جنتیوں اور جہنمیوں سے جدا وممتاز ہوں گے۔

۳۔ اصحاب اعراف اتنی وسیع معرفت وآگاہی رکھتے ہوں گے کہ تمام اہل محشر کو ان کے سارے اعمال کے ساتھ جانتے ہوں گے او رجانتے ہوں گے کہ کسے جنت میں جانا ہے اور کسے جہنم میں یہ کہ اصحاب اعراف کون لوگ ہوں گے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں جن کی تعداد تقریباً بارہ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے بعض تو بالکل مسترد وساقط ہیں۔ ان میں سے جو قابل ذکر ہیں درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ شریف وممتاز لوگ ہوں گے رحمت خدا جن کے شامل حال ہو چکی ہوگی۔

۲۔ وہ لوگ جن کی نیکیاں اور برائیاں یکساں ہوں گی لہٰذا نہ جنت میں جا سکیں گے اور نہ دوزخ میں۔ اور آخرت میں رحمت خدا کی وجہ سے جنت میں چلے جائیں گے۔

۳۔ وہ ملائکہ ہیں جو مردوں کی شکل میں ہوں گے اور سب کو پہنچانتے ہوں گے۔

۴۔ وہ ہر امت کے عادل وانصاف پسند لوگ ہوں گے جو اپنی امت کے افراد پر گواہی دیں گے۔

۵۔ وہ صالح لوگ جو علم وفقہ کے لحاظ سے بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔

ان اقوال میں سے دوسرا قول آیت کے ظاہر کے منافی ہے۔ کیونکہ آیت نے اصحاب اعراف کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اتنی لیاقت رکھتے ہیں کہ جنتیوں اور جہنمیوں کو پہچان سکیں اور انہیں خدا حافظ کہہ کر جنت میں داخلے کا حکم دیں جبکہ دوسرے قول میں مذکور افراد یہ لیاقت نہیں رکھتے۔ اسی طرح تیسرا قول بھی ظاہر آیات کے منافی ہے اور اس پر کوئی دلیل بھی نہیں۔

اور چوتھا اور پانچواں قول ممکن ہے پہلے قول کے ساتھ قابل جمع ہو اس طرح کہ اصحاب اعراف فضائل وکمالات کے لحاظ سے مختلف مراتب پر فائز ہیں ان کا عالی ترین طبقہ انبیاء واولیائے الٰہی میں اور نیچے والا طبقہ ہر امت کے صالح وعادل افراد اور علماء وفقہا ہیں۔

۴۔ ان چار آیات کا مضمون ایک معنوی حقیقت کے تصور کو بیان کر رہا ہے اور حقائق معنوی کا ادراک اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انہیں محسوس چیزوں کے پیرائے میں بیان کیا جائے۔ البتہ اس طرح کی اصل تنزیہ (ہر چیز کا مادہ سے خالی ہونا) بھی مخدوش نہ ہو۔

گویا آخرت میں خدا کی مطلق حکومت ظاہر ہوگی اور آخرت میں بھی دنیا کی طرح تین قسم کے لوگ ہوں گے۔

(الف) کچھ لوگ نعمتوں اور سعادتوں سے بہرور ہوں گے۔

(ب) کچھ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

(ج) کچھ لوگ ارادہ خدا کے مجری ہوں گے۔

پہلی قسم والے لوگ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔ دوسری قسم والے بدرفتار و بدکرداری کی وجہ سے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ اور تیسری قسم والے جو نظام سنبھالیں گے وہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے جنتیوں کو جنت کی طرف اور جہنمیوں کو جہنم کی طرف بھیجیں گے اور خود بھی مختلف مراتب پر فاءز ہوں گے ان میں سے ہر طبقے کی اپنی حیثیت ہوگی۔

اعراف: روایات کی روشنی میں

یہاں تک جو نکات بیان ہوئے ہیں وہ آیات سے اخذ کیے گئے تھے۔ یہ مسئلہ روایات میں بھی موردتوجہ قرار پایا ہے لہٰذا اس بحث کی جامعیت کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ بطور اختصار روایات کے مضامین کی بھی تحقیق کی جائے۔ اعراف سے مربوط رویات میں دو حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے:

۱۔ اعراف کا مقام

۲۔ اصحاب اعراف

پہلے مطلب کے بارے میں روایات میں دو قسم کی تعبیر آئی ہے:

(الف) اعراف جنت و جہنم کے درمیان ایک بلند جگہ ہے:

کثبان بین الجنة والنار [۱]

(ب) جنت و جہنم کے درمیان ایک راستہ ہے:

صراط بین الجنة والنار [۲]

البتہ توجہ رہے کہ اس صراط سے مراد وہ مشہود صراط نہیں ہے جو قیامت کے منازل میں سے ہے کیونکہ جیسا کہ آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے وہ "صراط" ایسا راستہ ہے جس پر سے سب کو گزرنا ہوگا کچھ جہنم میں جائیں گے اور کچھ جنت میں جبکہ اعراف سب کی جگہ نہیں ہے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ اعراف کو کیوں صراط کہا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی روایت کے ذیل میں اور کچھ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے صراط اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ کچھ گناہگار مومنین کو اعراف کی ایک جگہ پر ٹھہرایا جائے گا اور جنتی یا جہنمی ہونے کے لحاظ سے ان کا انجام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کرنے یا نہ کرنے پر موقوف ہوگا۔ اس جہت سے اعراف صراط سے مشابہ ہے۔

---

[۱] بحار جلد ۸، ص ۳۳۵، باب ۲۵، حدیث ۲

[۲] بحار جلد ۸، ص ۳۳۵، باب ۲۵، حدیث ۳

اصحاب اعراف

روایات میں ان کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔

ائمہ معصومین علیہم السلام

اس مطلب پر دلالت کرنے والی روایات کی تعداد ۱۶ ہے جو بحار میں باب اعراف میں نقل ہوئی ہیں۔ان روایات کے نقل کرنے کے بعد علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ اس مطلب پر کہ اصحاب اعراف ائمہ معصومین ہیں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں جو فضائل ائمہ معصومین کے ضمن میں مختلف فصول میں ذکر کی جائیں گی۔لہٰذا بغیر کسی تردید کے کہا جا سکتا ہے کہ اہل شیعہ میں یہ حقیقت مسلم ہے کہ ائمہ معصومین بھی اعراف کے مقام پر موجود ہوں گے۔جو تمام دشمنوں اور دوستوں کو تمام خصوصیات کے ساتھ پہنچانتے ہوں گے۔

۲۔گناہگار شیعوں کا ایک گروہ

اس بارے میں باب اعراف میں صرف ایک روایت نقل ہوئی ہے۔یہ روایت علی ابن ابراہیم نے اپنے باپ سے،انہوں نے حسن ابن محبوب سے،انہوں نے ابوایوب سے،انہوں نے برید سے اور انہوں نے امام جعفر صادق سے نقل کی اہے کہ امام نے رجال اعراف کے بارے میں فرمایا:

وہ ائمہ ہوں گے جو (گناہگار) شیعوں کے ساتھ اعراف کے مقام پر موجود ہوں گے حالانکہ گناہوں سے پاک مومنین حساب کے بغیر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔اس وقت ائمہ ان گناہگار شیعوں سے فرمائیں گے:

تم اپنے دینی بھائیوں کی طرف دیکھو کیسے وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔آیت **سلام علیکم لم ید خلوھا و ھم یطمعون** سے مراد شیعوں کا یہی گروہ ہے جو شفاعت ائمہ کے ذریعے جنت میں داخل ہوگا۔پھر انہیں کہا جائے گا:اپنے ان دشمنوں کی طرف دیکھو جو جہنم میں جل رہے ہیں اور آیت وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۙ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴿٤٧﴾ (اعراف:۴۷) سے مراد بھی یہی گروہ ہے جس کا انجام ابھی معلوم نہ ہوگا لیکن وہ مضطرب وخائف ہوں گے کہ مبادا جہنم میں چلے جائیں۔اسی لیے خدا سے دعا کریں گے کہ خدایا ہمیں ظالمین کے ساتھ قرار نہ دینا۔

اس وقت اصحاب اعراف ائمہ علیہم السلام جہنمیوں کے ایک گروہ سے کہیں گے کہ جنہیں وہ چہروں سے پہنچانتے ہوں گے۔

مَا أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ﴿٤٨﴾ (اعراف:۴۸)

وہ مادی وسائل جن پر تم دنیا میں اتراتے تھے تمہیں کوئی نفع نہ دے سکے۔

اس کے بعد جہنمیوں کے دوسرے گروہ سے بات کریں گے۔یہ لوگ دنیا میں ان سے دشمنی کرتے تھے کہیں گے:

هولاء شیعتی واخوانی الذین کنتم انتم تحلفون فی الدنیا ان لا ینا لهم الله برحمته

یہ ہمارے گناہگار شیعہ ہیں جن کے بارے میاں تم دنیا میں قسمیں کھاتے تھے کہ خدا کی رحمت ان کے شامل حال نہ ہوگی۔

اس کے بعد اس گروہ (گناہگار شیعوں) سے کہیں گے:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ﴿۴۹﴾ (اعراف:۴۹)

''جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف وحزن نہیں ہے''

۳۔ وہ لوگ جن کی نیکیاں و برائیاں برابر ہوں گی

اس بارے میں بھی ایک روایت وارد ہوئی ہے۔ عیاشی نے امام صادق سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے رجال اعراف و اعراف کے بارے میں فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ پس اگر خدا انہیں جنت میں داخل کرے تو اپنی رحمت وفضل کے مطابق کام کرے گا اور اگر انہیں عذاب دے تو اس نے ظلم نہیں کیا۔[1]

روایات و آیات کے مضامین میں موازنہ

روایات کے مضامین سے واقفیت کے بعد اب ان مضامین کا آیات سے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں کہ ان میں کیا مناسبت پائی جاتی ہے۔

پہلی قسم والی روایات (اعراف کا مقام) آیات سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتیں کیونکہ آیات نے اعراف کا مصداق نہیں بتایا صرف ان کی کچھ خصوصیات بتائی ہیں مثلاً یعرفون کلا بسیما هم اور اس قسم والی روایات نے اصحاب اعراف کا کامل مصداق ذکر کیا ہے۔

تیسری اور چوتھی قسم والی روایات یعنی عیاشی و علی ابن ابراہیم کی روایات دونوں ایک حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کیونکہ بعید نہیں ہے کہ جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں وہ گناہگار شیعہ ہوں۔

لیکن یہ تفسیر سیاق آیات کے ظواہر سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ہماری نظر میں ''لم یدخلوها وهم یطمعون'' اور ''واذا صرفت ابصارهم'' اہل جنت سے متعلق ہے اور اعراف والوں سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں اصحاب اعراف وہ ممتاز انسان ہیں جو ہر قسم کے گناہ اور لغزش سے پاک ہیں بلکہ ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں کچھ

---

[1] بحار جلد ۸، ص ۳۳۷، حدیث ۱۱

اہل محشر کو جنت یا جہنم میں بھیجنا بھی ہوگا۔ جبکہ کچھ روایات کا مفہوم یہ تھا کہ کچھ گناہگار انسان بھی اصحاب اعراف کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔

اگر چہ ممکن ہے کہا جائے کہ جو کچھ پہلے ذکر ہوا سیاق آیات اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے لیکن آیات میں یہ گنجائش پائی جاتی ہے کہ وہ روایات کے مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہوں لہٰذا جو کچھ علامہ مجلسی نے فرمایا ہے درست ہے کہ علی ابن ابراہیم کی روایت کو مختلف روایات میں وجہ جمع بنا کر اصحاب اعراف کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ائمہ، انبیا، صالحین اور کامل انسانوں کا ایک گروہ

۲۔ گناہگار شیعوں کا ایک گروہ

دو بزرگ متکلم شیخ مفید اور شیخ صدوق بھی اصحاب اعراف کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں:

اعراف میں یا اس کے کنارے (رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے علاوہ) ایک گروہ ''مرجون لامر اللہ'' کا بھی ہوگا جو شفاعت اور رحمت الٰہی کا امیدوار ہوگا۔

بہر حال اعراف و اعرافیوں کی گفتگو صد در صد نقلی اور تعبدی ہے جس کی واقعیت اور خصوصیات کے ادراک کے لیے وحی کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔

جو کچھ قرآن سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اعراف و اصحاب اعراف کا اصل وجود مسلم ہے اور آخرت کے مسلم مراحل میں سے ایک مرحلے کے طور پر اس کا نام لیا جا سکتا ہے۔

کیا جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں

ابتدا سے یہ بحث جاری رہی ہے کہ کیا جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں یا نہیں؟ یہ بحث کلامی ہونے کے باوجود قرآنی وتفسیری بھی ہے یعنی اس بحث کو جیسے عقلی نکتہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے ایسے ہی یہ تفسیری نکتۂ نظر سے بھی مدنظر ہو سکتی ہے۔ علم کلام کی کتب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر علمائے اسلام قائل ہیں کہ یہ ابھی سے موجود ہیں اور خلق ہو چکی ہیں۔ عالی قدر محدث و متکلم جناب شیخ صدوق اس بارے میں فرماتے ہیں:

''ہمارا اعتقاد جنت و جہنم کے بارے میں یہ ہے کہ یہ دونوں خلق ہو چکی ہیں اور پیغمبر اکرمؐ معراج کے موقع پر جنت میں داخل ہوئے تھے اور آپؐ نے جہنم کو دیکھا تھا''[۱]

بزرگوار متکلم شیخ مفید اوائل المقالات میں اقوال نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں روایات اس کی تائید کرتی ہیں اور اہل شریعت اس پر اتفاق نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر معتزلہ، خوارج اور بعض زیدیہ قائل ہیں اگرچہ جنت و جہنم کا ابھی سے خلق ہونا ممکن ہے لیکن آیا وہ خلق ہو چکی ہیں، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ ابو ہاشم جبائی ان کے ابھی سے ہونے کو محال سمجھتا ہے اور اس کا اعتقاد ہے کہ قیامت سے پہلے جنت و جہنم کا خلق ہونا ممکن نہیں ہے''[۲]

علامہ حلی نے بھی کشف المراد میں متکلمین کے ایسے ہی اقوال نقل کیے ہیں البتہ قاضی عبدالجبار کو ابو ہاشم کو ہم اعتقاد شمار کیا ہے۔[۳]

تفتازانی شرح مقاصد میں کہتے ہیں: اکثر مسلمان قائل ہیں کہ جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں سوائے ابو ہاشم اور عبدالجبار کے اور ان کے پیروکار اس نظریے کے مخالف ہیں۔[۴]

البتہ جنت و جہنم کے خلق نہ ہو چکنے کے نظریے کو سید رضی (۳۵۹-۴۰۶ھ) اور زرارہ بن اعین[۵] کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن سید شبر اور کچھ دیگر علما اس نسبت کو سید رضی کی طرف صحیح نہیں مانتے۔[۶]

---

[۱] اوائل المقالات ص ۱۰۲، ۱۰۳

[۲] بحار جلد ۸، ص ۲۰۰

[۳] کشف المراد طبع صیدا، ص ۲۷۰

[۴] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۸

[۵] تعلیقات اوائل المقالات، ص ۱۰۳

[۶] حق الیقین، جلد ۲، ص ۲۰۳

تاہم سید رضی کی تفسیر (جس کی صرف ایک جلد چھپ سکی ہے) کے مطالعے سے اس نسبت کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔[1]

جو کچھ شیخ مفید نے اوائل المقالات میں فرمایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنت وجہنم کے ابھی سے خلق ہونے میں اسلامی متکلمین میں تین نظریے پائے جاتے ہیں:

۱۔ یہ ابھی سے خلق ہو چکی ہیں اور اس نظریے کو اکثر مسلمانوں نے تسلیم کیا ہے۔

۲۔ دونوں کا ابھی سے خلق ہونا ممکن تو ہے لیکن ان کی ابھی سے خلقت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ نظریہ معتزلہ، خوارج اور بعض زیدیہ کا ہے۔

۳۔ جنت وجہنم کا ابھی سے خلق ہونا ناممکن ہے۔ یہ نظریہ ابو ہاشم وعبد الجبار کا ہے۔

یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ نقلی ہے لہٰذا اس کا حکم بھی ہمیں کتاب وسنت سے حاصل کرنا چاہیے اور اگر ابو ہاسم اسے محال کہتا ہے تو اس کی مراد محال بالغیر ہے یعنی محال وقوعی ہے۔ بحث کے آخر میں ہم اس کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

اب ہم مشہور قول پر دلائل کو ذکر کرتے ہیں:

بہشت ودوزخ کو قرآنی زبان میں جنت جحیم ونار وجہنم کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن قرآن میں تمام موارد میں جہاں جنت کا لفظ استعمال ہوا ہے ضروری نہیں ہر مقام پر اس سے مراد وہ جنت موعود نہیں ہے۔

بلکہ قران میں جنت کا لفظ اسی جہان کے عام باغات کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے اور بحث کا معیار یہ آیات نہیں ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ (کھف:۳۹)

''تم نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاءاللہ کیوں نہیں کہا''

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ۖ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۱۵﴾ (سبا: ۱۵)

''سبا کی سرزمین میں ان کے لیے دائیں بائیں دو باغ تھے۔ ہم نے ان سے کہا: اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو یا پاکیزہ شہر ہے اور رب بہت بخشنے والا ہے''

ان دو آیات میں جنت کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ آیات اگرچہ کہتی ہیں کہ یہ جنت موجود تھی لیکن مراد قطعاً آخرت والی جنت میں نہیں ہے۔

---

[1] تعلیقات اوائل المقالات، ص ۱۰۳

تفتازانی نے شرح مقاصد میں اور دیگر چند علما نے آدم وحوا والی جنت کو کہ جس سے وہ نافرمانی کی وجہ سے نکالے گئے تھے سے مربوط آیات کو جنت کی خلقت پر شاہد بنایا ہے اور کہا ہے کہ ان آیات میں جنت سے مراد وہی بہشت ہے جس کا وعدہ امم عالم سے کیا گیا ہے۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں: بعض کہتے ہیں کہ آدم وحوا والی جنت دنیوی باغات میں سے ایک وسیع باغ تھا۔اس کے بعد اس قول پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس قسم کی تفسیر کرنا، دین کے ساتھ کھیل اور اتفاق مسلمین کے ساتھ مذاق اور لاپرواہی ہے۔[1]

لیکن ہماری نظر میں تفتازانی کا آدم وحوا کی جنت کو بہشت موعود قرار دینے پر اصرار بالکل غلط اور بے جا ہے اور اگر کچھ مفسرین نے اسے دنیوی جنت کہا ہے تو اس لیے کہ دوسری آیات میں بہشت موعود کے لیے خلود کو ثابت کیا گیا ہے یعنی اس جنت میں داخل ہونے کے بعد نکلنا نہیں ہوگا بلکہ جنتی وہاں پر ہمیشہ رہیں گے۔

خلود در بہشت سے مربوط آیات بہت زیادہ ہیں۔ہم نمونہ کے طور پر کچھ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن نے بہشت کو جنۃ الخلد کہا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ (الفرقان:۱۵)

”کہہ دو! کیا دوزخ اچھی ہے یا جاوداں جنت جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن نے بہت سی آیات میں جنتیوں کو خالدون کہا ہے۔

یہ آیات سبب بنی ہیں کہ آدم وحوا جنت کو بہشت موعود کے بجائے کچھ اور سمجھا جائے۔

اگر چہ خلود کے معنی میں ایک دوسرا احتمال بھی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ جنت میں خلود (ہمیشگی) ان جنتیوں کے لیے ہے جو عمل صالح کے نتیجے میں جنت میں داخل ہوں گے ان کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے:

عطاءً غیر مجذوذ (ھود:۱۰۸)

”قطع نہ ہونے والی جزا“

لیکن وہ انسان جو جنت میں پیدا ہوا یا وہ بھی ہمیشہ جنت میں رہے گا؟ آیات خلود اس پر ناظر نہیں ہیں۔بہر حال آدم وحوا کی جنت میں دونوں قسم کے احتمال ذکر کیے جاسکتے ہیں۔لہٰذا یہ جنت اس بات پر دلیل قطعی نہیں بن سکتی کہ جنت خلق ہو چکی ہے۔

برزخی جنت وجہنم

قرآنی آیات شاہد ہیں کہ برزخ میں بھی نیک اور بدکار لوگوں کے لیے جنت وجہنم موجود ہیں اور وہ دونوں ابھی سے موجود ہیں اور خلق ہو چکی ہیں لیکن ان آیات کو آخرت والی جنت وجہنم کے ابھی سے خلق ہونے پر شاہد نہیں بنایا جاسکتا۔

---

[1] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۱۸

قرآن حضرت عیسیٰ کے قاصدوں پر ایمان لانے والے شخص جو اپنے ایمان کی وجہ سے قتل ہو گیا تھا۔ کے بارے میں فرماتا ہے:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ (یٰسین: ۲۶)

''اسے کہا گیا: جنت میں داخل ہو جاؤ تو اس نے کہا کاش میری قوم کو اس کا پتہ چل جاتا''

اس آیت میں جنت سے مراد برزخی جنت ہے نہ کہ جن موعود''

قرآن فراعنہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ قیامت سے پہلے آگ پر پیش کیے جائیں گے اور قیامت کے دن سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (مومن: ۴۶)

''فراعنہ کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے اور قیامت کے دن فراعنہ کا خاندان سخت ترین عذاب سے دو چار ہوگا''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جن آیات میں صرف لفظ جنت آیا ہے یا آدم وحوا کی جنت والی آیات یا برزخی جنت سے مربوط آیات ہماری مورد بحث آیات سے بالکل خارج ہیں لہٰذا صرف ان آیات پر نظر کرنی چاہیے جن کا موضع آخرت والی موعود بہشت و دوزخ ہیں۔ اس بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ کچھ آیات سے بہشت و دوزخ کا ابھی سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾

(نجم: ۱۳ تا ۱۵)

''رسول اللہؐ نے فرشتہ وحی کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اس (سدرۃ المنتہیٰ) کے پاس جنت الماویٰ ہے''

جنۃ الماوی سے مراد وہی بہشت موعود ہے جسے دوسری آیات میں جنت عدن وغیرہ کہا گیا ہے۔ آیت نے بتایا کہ آنحضرتؐ نے جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جو جنۃ الماوی کے ساتھ ہے دیکھا۔ اگر جنت خلق نہیں ہو چکی تو اس چیز کا پتہ دینا جو ابھی تک معرض وجود میں بھی نہیں آئی فصاحت و بلاغت کے منافی ہے۔

۲۔ جن آیات میں جنت و جہنم کا متقیوں و بدکاروں کے لیے تیار ہونا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی جنت و جہنم کے ابھی سے موجود ہونے پر شاہد ہو سکتی ہیں مثلاً جنت کے بارے میں ہے:

اعدت للمتقين (ال عمران: ۱۳۳)

اعدت للذين امنوا بالله ورسوله (حديد: ۲۱)

اور جہنم کے بارے میں ہے:

واتقوا النار التی اعدت للکفرین (ال عمران: ۱۳۱)

بعض آیات میں لفظ اعد آیا ہے جس کے معنی ''تیار کیا'' کے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

واعدلھم جنت تجری تحتھا الانھار [1] **(التوبہ: ۱۰۰)**

''خدا نے ان کے لیے وہ جنت تیار کی ہے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں''

واعدلھم عذاباً مھیناً (احزاب: ۵۷)

''ان کے لیے خدا نے خوار کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

ان آیات میں لفظ ''اعد'' استعمال کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں تیار ہو چکی تھیں کیونکہ اگر یہ نزول وحی کے وقت تیار اور موجود نہ ہوتیں تو ان کے بارے میں ''اعد'' استعمال کرنا تاویل کا محتاج ہے اور جب تک تاویل پر کوئی دلیل نہ ہو آیت اور لفظ کے ظاہر کو اخذ کرنا چاہیے۔ اور صحیح تو یہ ہے کہ ان آیات کے ظواہر جنت و جہنم کے موجود ہونے پر شاہد ہیں۔

۱۔ روایات میں سے ہروی کی روایت سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ یہ روایت انہوں نے امام رضا سے نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے امام سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! آپؑ جنت و جہنم کے بارے میں ہمیں خبر دیں کیا وہ ابھی سے خلق ہو چکی ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا: ہاں، جب رسول خدا معراج پر تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے جنت و جہنم کو دیکھا تھا۔ ہروی کہتے ہیں میں نے کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں جنت و جہنم تقدیر خدا کے تابع ہیں اور آئندہ خلق ہوں گی۔ آپؑ نے فرمایا: وہ نہ ہم میں سے ہیں اور نہ ہم ان میں سے ہیں۔ جس نے جنت و جہنم کے خلق ہونے کا انکار کیا اس نے رسول اللہؐ کا اور ہمارا انکار کیا اور وہ ہماری ولایت سے خارج ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ [2]

۲۔ ابن عمارہ نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: جو چار چیزوں کا انکار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے:

۱۔ معراج رسولؐ

۲۔ سوالِ قبر

۳۔ جنت و جہنم کا خلق ہو چکا ہونا

۴۔ شفاعت [3]

---

[1] ان دونوں آیات میں لفظ ''اعدت'' استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہے: تیار کی گئی ہے''۔ مترجم

[2] بحار جلد ۸، ص ۱۱۹ بہ نقل عیون اخبار الرضا

[3] بحار جلد ۸، حدیث ۱۸۶، باب الجنہ ص ۱۹۶

۳۔ نیز حضرت امام رضا سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا جو خدا کی وحدانیت، رجعت، دو متعہ کا حلال ہونا (متعہ حج ومتعہ نسائ) معراج، سوال قبر، حوض کوثر، شفاعت اور جنت وجہنم کے ابھی سے خلق ہونے پر ایمان لائے وہی مومن ہے۔[1]

منکرین کی دلیلیں

جنت وجہنم کے ابھی سے خلق ہونے کے منکرین عقلی ونقلی دلیلوں کے ذریعے اپنے مدعا پر استدلال کرتے ہیں۔ ہم یہاں ان کی دلیلیں نقل کرتے ہیں۔

نقلی دلیل

یہ استدلال دو مطالب پر موقوف ہے:

(الف) آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جنت وجہنم ہمیشہ رہنے کی جگہیں ہیں چونکہ قرآن نے جنت کو جنگ الخلد[2] اور جہنم کو دارالخلد[3] کہا جاتا ہے اور کچھ آیات نے جنتی نعمتوں کو ہمیشہ رہنے والی نعمتیں کہا ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

اکلها دائم و ظلها (رعد: ۳۵)

''جنت کے کھانے اور سائے دائمی ہیں''

لہٰذا جنت وجہنم ابتدائے خلقت سے ضروری ہیں کہ بصورت دائم موجود ہوں اور کبھی تباہ اور ناپید نہ ہوں۔

(ب) جبکہ قرآنی آیت حاکی ہے کہ قیامت سے پہلے (صور پھونکے جانے سے پہلے) خدا کی ذات کے علاوہ سب چیزیں نابود ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

كل شيءٍ هالك الا وجهه (قصص: ۸۸)

''خدا کی ذات کے علاوہ ہر چیز تباہ ہو جائے گی''

ان دو امور کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنت وجہنم ابھی تک خلق نہیں ہوئیں کیونکہ اگر خلق ہو چکی ہوں تو پھر قیامت سے پہلے ضروری ہے کہ تباہ ہو جائیں حالانکہ پہلی آیت نے انہیں جاوداں اور دائمی کہا ہے۔ پس دونوں آیات میں ہم آہنگی نہیں رہے گی۔

لیکن اس دلیل میں خدشہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس استدلال میں جمہ ''کل شی ھالک'' شے سے مراد ماسوی اللہ تمام امکانی

---

[1] بحار جلد ۸ حدیث ۱۸۷

[2] فرقان: ۱۵

[3] حم سجدہ: ۲۸

موجودات لیے گئے ہیں چاہے وہ دنیوی موجودات ہوں یا اخروی۔ حالانکہ شے کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد صرف دنیوی موجودات ہیں اور اخروی موجودات اس میں شامل نہیں ہیں اور دنیوی موجودات میں بھی اس کا دائرہ اس طرح تنگ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ بت ہیں جن کی پرستش وہ کرتے تھے کیونکہ آیت کے ابتدا میں یوں ارشاد ہے:

ولا تدع مع الله الها اخر لا اله الا هو كل شيءٍ هالك

"خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکارو اس کے علاوہ کوئی لائق پرستش نہیں اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز نابود ہو جائے گی"

اگر ہم یہ نہیں کہیں کہ شے سے مراد جھوٹے خدا ہیں تو یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد دنیوی موجودات ہیں جو لوگوں کی نظر میں ہیں اور جو موجودات آخرت میں ہیں اور ایک خاص پاکیزگی رکھتے ہیں وہ اس آیت میں شامل نہیں ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

ما عند كم ينفد و ما عند الله باقٍ (نحل: ۹۶)

اس آیت نے اس چیز کو دائمی و جاوید کہا ہے جو کچھ خدا کے پاس ہے اور واضح ہے کہ اس سے مراد غیر خدا ہے اور ممکن الوجود ہے، اس کے باوجود خدا کی مشیت کے مطابق دائمی ہے۔ قرآن نے بعض کتابوں کو حفیظ کہا ہے جس کے معنی ہیں "محفوظ رکھنے والی" جیسا کہ ارشاد ہے:

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾ (ق: ۴)

"اور ہمیں علم ہے اس کا جو کچھ زمین مردوں میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ رکھنے والی کتاب ہے"

یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں ہے جو انسانوں کی معاد کو بعید شمار کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد بدن کے اجزا آپس میں مخلوط ہو جائیں گے اور ان کی پہچان جاتی رہے گی۔ قرآن نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ یہ تمام حوادث ایک کتاب میں محفوظ ہیں اور قیامت کے دن اس کتاب کی بنیاد پر انسان زندہ کیے جائیں گے۔ مسلماً یہ بات ماننی پڑے گی کہ "کل شيءٍ ھالک" والی آیت میں یہ کتاب شامل نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب ظاہراً قرآن کے مطابق روز قیامت انسانوں کے زندہ کرنے کا معیار بنے گی اور جب تک اس کتاب سے یہ معلوم نہ ہو چکے گا اسے نابود کرنا صحیح نہیں ہوگا بلکہ غیر معقول کام ہوگا۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل بیان ہے کہ مجرد موجودات فنا نہیں ہوں گے لہٰذا اگر یہ آیت موجودات کی اس قسم کے بارے میں ہو تو پھر مجبوراً "ھالک" کے معنی "احتیاج وفقر بے واجب الوجود" کے کرنے ہوں گے یعنی ذات کا فنا ہونا۔[1]

[1] جسے عام اصطلاح میں فنا فی اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور فلسفی و عرفانی نکتہ نظر کے مطابق یہ کمال انسانی کی آخری منزل ہے اور واجب الوجود کے مقابل ممکن کو بطور وجود مستقل نہیں دیکھا جا سکتا۔ (مترجم)

۲۔منکرین کی عقلی دلیل

منکرین کی عقلی دلیلوں میں سے قابل توجہ دلیل جنت وجہنم کی خلقت کا عبث ہونا ہے کیونکہ جنت وجہنم کی خلقت کا مقصد یہ ہے کہ وہاں پر صالح لوگوں کو جزا اور مجرمین کو سزا دی جائے اور یہ کام قیامت کے برپا ہونے کے بعد انجام پائے گا لہٰذا اس سے پہلے جنت وجہنم کی خلقت عبث ولغو ہوگی۔

جواب

اس دلیل کے جواب میں بس یہی کہنا چاہیے کہ دلیل طلب کرنے والے نے اپنی عقل پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کرلیا ہے اور جس چیز کی مصلحت اس کی عقل میں نہیں آ سکی اسے اس نے معدوم فرض کرلیا ہے جبکہ ہمارے لیے اس مسئلے کے تمام پہلو واضح وروشن نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے جنت وجہنم کی خلقت کوئی ایسی مصلحت رکھتی ہو جسے ہم نہ سمجھ سکے ہوں اور اس کے علاوہ اس قسم کی نعمت کا پہلے سے تیار کرلینا مطیع انسان کی روح میں بہت تاثیر رکھتا ہے اور اسے زیادہ اطاعت و پیروی پر آمادہ کرتا ہے اور ایک لحاظ سے بندوں پر خدا کے لطف میں بھی بہت تاثیر رکھتا ہے (مرادف لطف، مقرب ہے، نہ لطف محصل)[1]

جنت وجہنم کہاں پر ہیں

اگر جنت وجہنم خلق ہوچکی ہیں تو پھر وہ کہاں پر واقع ہیں؟ انسان کو حق حاصل ہے کہ وحی سے یہ سوال کرے کہ یہ دو مخلوق کہاں پر ہیں؟

جواب

پہلی آیت جس کے ذریعے جنت کے مخلوق ہونے پر استدلال کیا گیا ہے وہی جنت کی جگہ کا تعین بھی کرتی ہے اور وہ یہ کہ جنت سدرۃ المنتہی کے پاس ہے۔ ولقد راٰہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتہی عندھا جنۃ الماوی (نجم: ۱۳ تا ۱۵)

پس جہاں پر سدرۃ المنتہی ہوگا اسی کے پہلو میں جنت ہوگی لیکن ہمارے لیے تو سدرۃ المنتہی کی حقیقت روشن نہیں چہ جائیکہ اس کی جگہ کا علم ہو لہٰذا اس کے بارے میں اظہار نظر کرنا مشکل ہے۔

تفتازانی کہتے ہیں کہ جنت وجہنم کے مکان کے بارے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے لیکن اکثر قائل ہیں کہ جنت سات آسمانوں سے اوپر ہے اور انہوں نے یہ عقیدہ قرآن کی آیت "عند سدرۃ المنتہی عندھا جنۃ الماویٰ" اور پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث سے اخذ کیا ہے

---

[1] محقق لاہیجی نے بھی یہی بات کی ہے اور کہا ہے کہ لطف خدا میں وعدہ وعید بھی داخل ہیں (گوہر مراد، ص ۲۲، ج ۲) (لطف کی تعریف ہی یہ ہے "وہ جو عبد کو جنت کے قریب اور جہنم سے دور کرنے کا باعث ہو۔ مترجم)

جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا جنت کی چھت عرش خدا ہے اور اکثر دوزخ کا مکان زمین کے طبقات کو سمجھتے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اس بارے میں قاطعانہ اظہار نظر نہیں کرنا چاہیے اور اس کا علم خدائے دانا کے حوالے کرنا چاہیے۔[۱]

جو روایات[۲] جنت کو آسمانوں پر اور جہنم کو زمین پر بتاتی ہیں ان میں سے بعض کو ابن عباس کے شاگرد عکرمہ نے نقل کیا ہے اور عکرمہ ایک جھوٹا انسان تھا جس کی روایات ناقابل اعتماد ہیں۔

البتہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت زمین و آسمان میں موجود نہیں ہے کیونکہ کچھ آیات کہتی ہیں کہ جنت زمین اور آسمانوں سے زیادہ وسیع ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۳ (ال عمران: ۱۳۳)

"خدا کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں جتنی ہے جلدی کرو، ایسی جنت جو متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے[۳]۔

ان آیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ بہشت موعود آسمان و زمین میں موجود ہے لہٰذا جیسا کہ کہا گیا ہے یہ مسئلہ امور غیبی میں سے ہے جس سے ہم آسمانی وحی کے بغیر نہیں جان سکتے۔

علامہ مجلسی بھی جنت و جہنم کے موجود ہونے اور ان کے مقام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یہ کہ جنت و جہنم خلق ہو چکی ہیں جمہور مسلمین اسے تسلیم کرتے ہیں صرف کچھ معتزلہ قائل ہیں کہ یہ قیامت کے دن خلق ہوں گی لیکن متواتر آیات و روایات ان کے اس عقیدے کے رد کے لیے کافی ہیں اور یہ کہ وہ کہاں پر واقع ہیں اس بارے میں روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جنت کی جگہ سات آسمانوں سے اوپر ہے اور جہنم زمین کے ساتویں طبقے میں ہے اور یہی نظریہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک مورد قبول ہے"[۴]

ایک جدا کائنات کے لیے جگہ کی ضرورت نہیں

جنت و جہنم کی جگہ کے بارے میں سوال اس صورت میں صحیح ہے جب وہ ہماری اسی کائنات کا جز ہوں یعنی دونوں میں نسبت کو برقرار

---

[۱] شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۲۰

[۲] بحار جلد ۸، ص ۱۲۷، حدیث ۲۸

[۳] اسی آیت کا مضمون سورہ حدید: ۲۱ میں بھی آیا ہے۔ وجنة عرضها كعرض السماء والارض

[۴] بحار جلد ۸، ص ۲۰۵

کیا جا سکے۔اس صورت میں یہ سوال پیش آئے گا کہ جنت وجہنم اس کائنات میں کہاں پر واقع ہیں لیکن اگر نظریہ یہ ہو کہ جنت وجہنم ایک جدا کائنات ہیں اور زمین وآسمان سے جدا ہیں تو پھر یقیناً ان کی جگہ کے بارے میں سوال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اصولی طور پر فلسفی نکتہ نظر سے عالم کا زمانی پہلو مادہ کے تحول وتبدل سے پیدا ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں مادہ کی حرکت چونکہ تدریجی امر ہے لہٰذا یہ دو حقیقتوں کو ہمارے سامنے واضح کرتی ہے ایک حرکت اور دوسرا زمان۔

یعنی مادہ کے دو پہلو ہیں۔اس لحاظ سے کہ مادہ مختلف حالات وصفات رکھتا ہے حرکت انتزاع ہوگی اور اس لحاظ سے کہ مادہ میں یہ حالت وتحولات تدریجی ہیں نہ کہ دفعی مفہوم زمان انتزاع ہوتا ہے۔یہ وجہ ہے کہ علمائے فلسفہ کہتے ہیں کہ حرکت وزمان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ان میں سے ہر ایک متحول جسم کی ایک حقیقت وحالت کو بیان کرتا ہے اور مکان وجسم کی جگہ ہے اس کائنات کے اجزا میں قابل تصور ہے مثلاً ایک میز کو ایک کمرے میں رکھیں تو کمرہ مکان ہے اور میز وہ جسم ہے جو وہاں جگہ گھیرے ہوئے ہے۔(یہ تو اجزائے کائنات کے لحاظ سے ہے) لیکن اگر پوری کائنات کو مدنظر رکھیں اور اس کے ظرف ومکان کے بارے میں سوال کریں تو واضح ہے کہ جواب نفی میں ہوگا کیونکہ اس جہان کی خلقت خود اپنے لیے جگہ بھی بنا لیتی ہے نہ کہ پہلے ایک وسیع فضا ہو ایک وسیع جگہ ہو جہاں پر خدا تعالیٰ اس جہان کو خلق کرے۔

ہم یہاں پر نظریہ نسبت کشف کرنے والے کے نظریے کو نقل کرتے ہیں۔وہ قائل تھے کہ مادہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یعنی کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور بڑی ہو رہی ہے[1]۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ مادہ میں یہ اضافہ کیا اپنے لیے جگہ کا محتاج بھی ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا: کائنات وسعت کے ساتھ ساتھ اپنے لیے جگہ بھی بناتی رہتی ہے اسے پہلے سے موجود مکان کی ضرورت نہیں ہے۔یہی بیان جنت وجہنم کے بارے میں بھی درست ہے کیونکہ اگر جنت وجہنم اس کائنات سے جدا ایک اور جہان ہو تو پھر ان کی جگہ کے بارے میں سوال بے جا ہے۔البتہ اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پس جنت وجہنم کا وجود خیالی ومثالی ہے بلکہ اس تصدیق کے باوجود کہ معاد عنصری ہوگی یعنی معاد مادی ہوگی لیکن دونوں جہانوں کے اپنے احکام وقوانین ہیں اور ہرگز ایک دوسرے کے اندر واقع نہیں ہے۔

---

[1] شاید مندرجہ ذیل آیت اسی نظریے کی تائید کرتی ہو:

والسماءَ بنیناھا بِاَیدٍ و انا لموسعون (ذاریات: ۴۷)

ہم نے اپنی قدرت کے ساتھ آسمانوں کو بنایا ہے اور ہم ہی انہیں وسعت دینے والے ہیں۔

کون لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے؟

مسئلہ کا تاریخی جائزہ اور متکلمین کے اقوال

پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں مسلمانوں میں ایک مسئلہ پیدا ہوا وہ یہ کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کا شریعت میں کیا حکم ہے اور اس مسئلے کا سبب جنگ صفین کے موقع پر حضرت امیر المومنینؑ کا تحکیم کو قبول کرنا تھا۔ جبکہ آپؑ کے کچھ ساتھی اس کے مخالف تھے اور اسے حکم خدا کے خلاف سمجھتے تھے۔ اگرچہ انہی لوگوں نے حضرت علیؑ کو تحکیم قبول کرنے پر مجبور بھی کیا تھا لیکن بعد میں یہی لوگ اس بات سے پھر گئے اور اپنی اس رائے اور امام کے اس فعل کو خطا سمجھنے لگے۔ ان حالات میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کا کیا حکم ہے؟ خارجیوں نے مرتکب کبیرہ کو کافر سمجھا اور چونکہ مرتکب کبیرہ کی سزا ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے لہٰذا انہوں نے یہی نظریہ اپنا لیا۔

لیکن معتزلہ قائل ہیں کہ مرتکب کبیرہ نہ مومن ہے اور نہ کافر بلکہ ان دونوں کے درمیان حد وسط ہے لیکن اگر توبہ کے بغیر مر جائے تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ البتہ مسلمانوں کے دوسرے فرقے ان دونوں کے اس نظریے کے مخالف ہیں اور وہ ایمان کے درجات و مراتب کے قائل ہیں۔ وہ مرتکب کبیرہ کو مومن فاسق سمجھتے ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہنے والا نہیں سمجھتے بلکہ وہ قائل ہیں کہ وہ جہنم میں اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے کے بعد آگ سے چھٹکارا پا لے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا۔ [۱]

جب آپ نے مسئلہ کی تاریخی صورت سے آشنائی حاصل کر لی تو اب ہم علم کلام کی کتب سے اقوال کو نقل کرتے ہیں:

شیخ مفید فرماتے ہیں:

آگ میں خلود صرف کافروں کے لیے ہے نہ کہ اہل معرفت اور فرائض کا اقرار کرنے والوں کے لیے اگرچہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں اور یہی نظریہ علمائے امامیہ (شیعہ) کا ہے اور مرجۂ [۲]

اور اہل حدیث (احمد بن حنبل کے پیروکار) امامیہ کے ساتھ اس عقیدے میں موافق ہیں جبکہ معتزلہ ان کے مخالف ہیں اور قائل ہیں کہ کافروں کے علاوہ مسلمانوں میں سے گناہ کبیرہ کے مرتکب بھی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے (بشرطیکہ بغیر توبہ کے دنیا سے جائیں)۔

امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان بھی گناہ کی وجہ سے جہنم جائے گا وہ بالآخر نجات پا کر جنت میں داخل ہو جائے گا جبکہ معتزلہ کا نظریہ

---

[۱] علم کلام میں اس بحث کو بحث خلود کہتے ہیں۔ اس کے ضمن میں ایک سوال یہ ہے کہ کیا اس خلود اور ہمیشگی سے مراد غیر محدود مدت ہے یا محدود؟ اس سلسلے میں علما میں اختلاف ہے۔ (مترجم)

[۲] دوسری صدی ہجری میں اہل سنت میں ایک گروہ پیدا ہوا اس کے اعتقاد کے مطابق عمل کی کوئی اہمیت نہیں تھی وہ صرف ایمان کو اہمیت دیتا تھا۔ مرجبہ اسی گروہ کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

ہے کہ جو ایک بار جہنم میں داخل ہو گیا پھر وہاں سے اس کی جان چھوٹنا ممکن نہیں ہے۔[1]

مقاصد میں تفتازاتی کہتے ہیں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل جنت جنت میں مخلد ہوں گے اور اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کافر جہنم میں مخلد ہوں گے، بات مرتکب کبیرہ کے بارے میں ہیں جو خدا اور شریعت اسلام پر اعتقاد و ایمان رکھتا ہے لیکن توبہ کے بغیر مر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دو مسئلے ہیں:

۱۔ کیا یقیناً اسے عذاب ہوگا؟

۲۔ اگر معذب ہوا تو کیا وہ ہمیشہ عذاب میں رہے گا؟

پہلے مطلب کے بارے میں تفتازانی کہتے ہیں: اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے عفو و عقاب کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے تو معاف کر دے چاہے تو عذاب کرے حالانکہ مرجبہ[2] حتمی طور پر کہتے ہیں کہ گناہگار کو بالکل عذاب نہیں ہوگا۔[3]

قاضی عضد الدین ایجی قائل ہے کہ جن گناہ کبیرہ کرنے والوں نے اپنی زندگی میں کوئی نیک کام انجام دیا ہے انہیں جہنم میں مخلد نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ (زلزلہ:۷)

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مرتکب کبیرہ عمل خیر انجام دیتا ہے کم از کم خدا اور رسولؐ پر ایمان تو رکھتا ہے لہٰذا اس کی جزا اسے ملنی چاہیے اسی طرح اسے اپنے برے اعمال کی سزا بھی ملنی چاہیے لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے اسے جزا کے طور پر جنت بھیجا جائے گا اور پھر سزا کے طور پر جہنم میں داخل ہوگا کیونکہ یہ ترتیب اجماع مسلمین کے خلاف ہے۔ پس طبعی صورت میں ترتیب برعکس ہوگی یعنی پہلے جہنم جائے گا پھر جنت اور جنت میں پھر ہمیشہ رہے گا۔[4] یہاں تک اقوال کا ذکر تھا اب فریقین کی دلیلیں نقل کرتے ہیں۔

---

[1] اوائل المقالات، ص ۱۴

[2] مرجبہ کے نظریہ کے ساتھ پہلے نظریے کا فرق دو لفظوں میں یہ ہے کہ پہلے نظریے والوں کو ''راجیہ'' کہتے ہیں۔ ''راجیہ''، ''رجا'' سے ہے جس کے معنی اُمید کے ہیں یعنی وہ خدا کی عفو کے اُمیدوار ہیں لیکن بہ صورت حتمی جبکہ دوسرا گروہ ''مرجبہ'' ہے جو ''ارجائی'' سے ہے یعنی تاخیر کرنا۔ یہ لوگ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے اور ایمان قلبی کو عمل پر مقدم سمجھتے ہیں۔

[3] شرح مقاصد جلد ۸، ص ۲۲۸

[4] شرح مواقف جلد ۸، ص ۳۰۹

عدم خلود کے قائلین کی ادلہ

انہوں نے قرآن، سنت اور عقل کے ذریعے استدلال کیا ہے۔ ہم ایک ایک کو یہاں بیان کرتے ہیں:

(الف) نقلی دلیلیں

۱۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ؕ﴿۷﴾ (زلزلہ: ۷)

اس آیت سے انہوں نے کیسے استدلال کیا یہ قبل از یں بیان ہو چکا ہے۔ مزید توضیح کی خاطر عرض کرتے ہیں کہ مومن گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے ثواب وعقاب بھی ہوگا اور اس کے تحقق کے لیے تین احتمال ہو سکتے ہیں:

۱۔ پہلے اسے اجر دیا جائے اس کے بعد اسے سزا دی جائے۔ لیکن یہ اجماع کے خلاف ہے جبکہ خصوصاً جنت کے خلود میں کسی نے شک نہیں کیا۔

۲۔ دونوں (عقاب وثواب) اکٹھے انجام پائیں اور یہ ممکن نہیں ہے۔

۳۔ پس تیسری صورت ممکن ہوگی کہ جہنم میں داخلے کے بعد جنت میں داخل ہو۔

البتہ اس نکتے پر توجہ رہے کہ یہ استدلال اس صورت میں ہوگا کہ قرآن وسنت میں اس گروہ کے خلود پر کوئی دلیل ہمیں نہ مل سکے وگرنہ مندرجہ بالا آیت ان لوگوں کے لیے دلیل نہیں بن سکے گی کیونکہ بعد میں مرتکب کبیرہ کے خلود (در جہنم) پر حاکم آیات وروایات سے ہم ثابت کریں گے کہ اس کے ایمان کی جزا حبط ہو چکی ہے اور نامۂ اعمال میں لکھے جانے کے بعد ختم ہو چکی ہے جیسا کہ اس حباط کے قائل کہتے ہیں۔ یا ہم یہ ثابت کریں گے کہ ابتدا سے ان کی جزا ہی ثابت نہیں تھی چونکہ جزا مشروط تھی اور اس کی شرط ہی متحقق نہیں ہو سکی لہٰذا جزا ہی متحقق نہیں ہوئی جو احباط کے منکر ہیں ان کا نظریہ یہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ آیت ایک کلی قانون بیان کر رہی ہے اور وہ یہ کہ جو عمل خیر انجام دے گا وہ اس کا نتیجہ پا لے گا لہٰذا نتیجہ خیر تب پائے گا کہ خیر ہوگی اور جب خلود والی آیات وروایات سے ثابت ہو گیا کہ معصیت کی وجہ سے خیر نابود ہو چکی ہے یا اول سے خیر ہی نہ تھی تو پھر جزائے خیر کہاں سے ثابت ہوگی۔

ایک اور صورت میں یوں کہہ لیں کہ آیت نے صرف ایک مناسب امکان کو بیان کیا ہے اور اس امکان سے اس صورت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی دلیل اس امکان کی نابودی پر موجود نہ ہو۔

۲۔ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِہِمۡ ۚ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۶﴾ (رعد: ۶)

''تیرا پروردگار لوگوں کی مغفرت کرنے والا ہے ان کے ظلم کے باوجود اور بہ تحقیق تیرا رب سخت عذاب والا ہے''

اس آیت نے گناہگاروں کے بارے میں دو باتیں بتائی ہیں:

۱۔ مغفرت الٰہی ان کے شامل حال ہوگی۔

۲۔ انہیں سخت عذاب ہوگا۔

یعنی آیت نے لذو مغفرۃ کہہ کر امید اور وان ربك لشدید العقاب کہہ کر خوف وبیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس سے گناہگاروں کے بارے میں دو احتمال پیدا ہو گئے مغفرت یا عقاب اب مشیت الٰہی جس کے متعلق ہو جائے۔ اگر مرتکب کبیرہ خلود جہنم رکھتا ہوتا تو ہرگز اس کے بارے میں مغفرت کی امید نہیں دلائی جا سکتی تھی کیونکہ امید مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا حساب کافروں سے مختلف ہے کفار یقینا جہنم میں ہمیشہ رہیں گے جبکہ گناہگار مومن کے لیے دو صورتیں ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے جو مشیت الٰہی کے مطابق ہوئی وہی روبعمل آئے گا۔

البتہ یہ آیت گناہگاروں کے سوئے استفادہ کی موجب نہ بن جائے کہ خدا کیونکہ بخش دے گا لہٰذا گناہ کرنے لگیں چونکہ آیت میں "علی ظلمهم" سے مراد وہ خلاف ورزیاں ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے ورنہ حقوق الناس سے مربوط ظلم اس صورت میں قابل مغفرت ہو گا کہ ان مظلوموں کے حقوق کو ادا کیا گیا ہو اور بطور مسلم یہ آیت ان کے بارے میں ہے جنہوں نے توبہ نہ کی ہو ورنہ جو توبہ کر چکے ہوں وہ ظالم نہیں ہیں لہٰذا ان کے بارے میں علی ظلمهم کی تعبیر استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔

جواب

اس دلیل کا جواب بھی وہی ہے جو پہلی دلیل کے ضمن میں ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے گناہگار مشمول مغفرت ہوں یا مشمول عذاب ہوں اور آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گناہگار کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا لیکن کچھ دوسری آیات میں کچھ گناہوں کو جہنم میں خلود کا موجب بتایا گیا ہے۔ وہ آیات اس آیت کے منافی نہیں ہوں گی بلکہ وہ آیات شاہد ہوں گی اس بات پر کہ یہ گناہ غضب خدا کے ظہور کے موجب ہیں نہ کہ رحمت خدا کے اور ایسی آیات موجود ہیں جیسا کہ قتل مومن والی آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ گناہ جہنم میں خلود کا موجب ہے۔

بعبارت دیگر ایسے گناہ اسی آیت کے دوسرے حصے یعنی وان ربك لشدید العقاب کے تحت شمار ہوں گے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

(نساء: ۴۸۔۱۱۶)

"خدا شرک کے گناہ کو ہرگز معاف نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور خدا کے ساتھ شرک بہت بڑا گناہ ہے"

یہ آیت جو شرک کے علاوہ تمام گناہوں کی بخشش کے بارے میں خبر دے رہی ہے ان لوگوں کے بارے میں ہے جو توبہ کے بغیر مر جائیں۔ اس صورت میں خدا تعالیٰ مشرکین کو اپنی رحمت سے محروم رکھے گا لیکن اگر ایسے گنا ہگار توبہ کر لیں تو وہ آیت کے مصداق سے خارج ہو جائیں گے۔ کیونکہ توبہ جیسے گناہ کبیرہ کی بخشش کا سبب ہے اسی طرح شرک کی بخشش کی موجب بھی ہے اور یہ جو آیت نے مشرک وغیر مشرک میں (بخشش کے لحاظ سے) فرق کیا ہے آیت کے آغاز واختتام کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ آیت ان گناہگاروں کے بارے میں ہے جو توبہ کیے بغیر مر جائیں۔ ایسی صورت میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر ایسا انسان (جو توبہ کے بغیر مر گیا ہو) مشرک ہو تو وہ بخشا نہیں جائے گا اور اگر مشرک نہ ہو تو اس کی مغفرت کی امید ہے۔ بہرحال آیت اس بات پر شاہد ہے کہ مرتکب کبیرہ جہنم میں مخلد نہیں ہوگا کیونکہ اگر یقینی طور پر وہ جہنم میں مخلد ہوگا تو پھر اس سے بخشش کا وعدہ کرنا اگرچہ مشروط صورت میں ہو صحیح نہ ہوگا۔

ہم اس آیت سے استدلال کے بارے میں بھی اسی بات کا تکرار کریں گے جو پہلی دو آیات کے بارے میں کہہ چکے ہیں اور وہ یہ کہ اگر کچھ گناہ کبیرہ کرنے والوں کے جہنم میں مخلد ہونے پر قطعی دلیل موجود ہو تو یہ دوسری دلیلوں پر مقدم ہوگی (یعنی وہ واقعاً جہنم میں مخلد رہیں گے) اور زیر بحث آیت کہ جو خلود کی نفی کرتی ہے کی تفسیر امکان مغفرت کے ساتھ کریں گے نہ کہ مغفرت کے قطعی ہونے کے ساتھ۔

مختصر یہ کہ شیعہ عقیدہ یا غیر شیعہ عقیدہ کے مطابق ان آیات سے استدلال تب مفید ہو سکتا ہے کہ پہلے خود سے مربوط تمام آیات کا مطالعہ کیا جائے جب تک تمام آیات کی صورت حال واضح نہ ہو جائے صرف ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے چونکہ یہ آیات صرف امکان مغفرت کی خبر دے رہی ہیں اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ آیات مغفرت کے یقینی ہونے پر دلیل نہیں بن سکتیں کیونکہ اس کا نتیجہ گناہگاروں کو گناہ کی ترغیب دینا ہے اور توبہ سے اس کا فرق واضح ہے کیونکہ توبہ کرنے والے کو اس صورت میں بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے کہ جب حقیقتاً اس کی روح میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور یہ خوشخبری اسے گناہ کرنے کی ترغیب کا موجب نہ بنے جبکہ یہ آیات ان گناہگاروں کے بارے میں ہیں جو ابھی تک اپنے گناہ پر باقی ہیں اور انہوں نے توبہ نہیں کی۔ لہٰذا ان آیات میں مغفرت کی تفسیر امکان وامید مغفرت کے ساتھ کرنا پڑے گی نہ کہ اس کے قطعی وحتمی ہونے کے ساتھ۔

روایات سے استدلال

کچھ روایات بھی وارد ہوئی ہیں جنہوں نے مرتکب کبیرہ کو جہنم میں غیر مخلد بتایا ہے ہم یہاں پر ان میں سے کچھ روایات کو نقل کرتے ہیں۔

۱۔ ابن ابی عمیر کہتے ہیں: میں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ خدا کسی کو جہنم میں ہمیشہ نہیں رکھے گا مگر یہ کہ وہ کافر، حق کا منکر اور گمراہ ومشرک ہو۔[1]

---

[1] بحار جلد ۸، باب ۲۷، حدیث ۱

۲۔ عمر بن عوان امام کاظم علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ جہنمی جہنم میں داخل ہوں گے اور عفو الٰہی سے وہاں سے پھر نکل آئیں گے۔ [۱]

۳۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے ایک خط مامون کو لکھا جس میں عقائد اسلامی کی تشریح فرمائی اس میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"خدا نے جس مومن سے جنت کا وعدہ کیا ہے اسے جہنم نہیں بھیجے گا اور خدا نے جس کافر کو جہنم میں خلود کو وعیدی ہے اسے جہنم سے کبھی نہیں نکالے گی لیکن اہل توحید گناہگار جہنم میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے نکلیں گے اور مورد شفاعت قرار پائیں گے" [۲]

اصولی طور پر جو روایات شفاعت کے بارے میں بطور متواتر پیغمبر گرامیؐ اور ائمہ سے نقل ہوئی ہیں۔ وہ مکمل طور پر جہنم کے خلود کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً آنحضرتؐ کی یہ مشہور حدیث ہے:

انما ادخرت شفاعتی لاھل الکبائر من اُمتی [۳]

"میں نے اپنی شفاعت اپنی امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد کے لیے ذخیرہ کر رکھی ہے"

پس شفاعت رکھنے کا مطلب مرتکب کبیرہ افراد کو نجات دلانا ہے اگر آیات شفاعت کے ساتھ اس شفاعت کو بھی مدنظر رکھیں۔ جو جاہلی عرب یہود اور نصاریٰ کے درمیان رائج تھی تو اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ شفاعت کا مقصد گناہان کبیرہ کی بخشش ہے نہ کہ بلندی درجات اور وہ بھی صالح و پاک لوگوں کے لیے۔

اس کے علاوہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کے نتیجے میں گناہ صغیرہ خود بخود معاف کر دیے جائیں۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۱ اس مطلب پر دلالت کر رہی ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ

"اگر تم گناہ کبیرہ سے اجتناب کرو تو ہم تمہارے صغیرہ گناہ معاف کر دیں گے"

لہٰذا وہ آیت ان گناہوں کے بارے میں ماننا پڑے گی جو توبہ یا شفاعت کے بغیر بخشے نہیں جا سکتے اور چونکہ فرض یہ ہے کہ انہوں نے توبہ نہیں کی ہوگی طبعی طور پر وہ کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ شفاعت کے ذریعے بخش دیے جائیں گے۔

ایک ان موارد میں سے کہ جہاں معتزلہ نے بغیر تحقیق کے فیصلہ کیا ہے یہی شفاعت سے مربوط آیات و روایات ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ بغیر توبہ کرنے کے مرنے والا مرتکب کبیرہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں لہٰذا انہوں نے شفاعت کی روایات و آیات کو اپنے اصلی محور سے ہٹا دیا ہے اور معتقد ہو گئے کہ ان سے مراد وہ صالح و پاک لوگ ہیں جو پہلے سے جنت میں ہیں، شفاعت پیغمبرؐ کے

---

[۱] بحار جلد ۸، باب ۲۷، حدیث ۳۲

[۲] بحار جلد ۸، باب ۲۷، حدیث ۳۶، ۳۸

[۳] بحار جلد ۸، باب ۲۷، حدیث ۳۶، ۳۸

صدقے ان کے درجات اور بلند ہو جائیں گے۔

درحقیقت معتزلہ نے یہ عقیدہ اپنا کر پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث انما ادخرت شفاعتی لا ھل الکبائر من امتی کی صریح مخالفت کی ہے۔

اس استدلال کے بارے میں ہم وہی نکتہ عرض کریں گے جو پہلے عرض کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ شفاعت ایک یقینی امر ہے لیکن شفیع بھی شرائط رکھتا ہے اور جس کے بارے میں شفاعت کی جائے گی اس میں کچھ شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن و احادیث میں ان میں سے کچھ شرائط مذکور ہیں۔ لہٰذا طبعی طور پر شفاعت تمام گناہان کبیرہ کی بخشش کا موجب نہیں ہوگی خصوصاً اس گناہگار کے بارے میں جس نے شفیع سے اپنا روحانی تعلق ختم کر لیا ہو۔ لہٰذا شفاعت والی آیات و روایات کی وجہ سے سب گناہان کبیرہ کی بخشش کا قطعی و یقینی حکم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان آیات و روایات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا جو درحقیقت ان آیات و ریوات سے استثنا کی صورت رکھتی تھی کیونکہ کچھ گناہ کبیرہ مثلاً قتل مومن، ترک نماز یا ہمیشہ کی مسلسل مدہوشی (شراب پینے کی وجہ سے) ایسے ہیں جنھیں شفاعت شامل نہیں ہوگی۔

اور اگر ان کی دلیلوں کا جو بعض مرتکب کبیرہ کے خلود پر ذکر کی گئی ہیں، ان آیات و روایات (جن میں خلود کی نفی کی گئی ہے) کے ساتھ موازنہ کریں تو یہ کہنا پڑے گا کہ نفی خلود والی آیات و روایات کا مفہوم قاعدے کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ مخالفین کی ادلہ کا مفاد دلیل کا مفاد ہے اور دلیل ہمیشہ قاعدے پر مقدم ہوتی ہے۔[1]

(ب) منکرین کی عقلی دلیلیں

عدم خلود کے قائلین نے مذکورہ نقلی دلیلوں کے علاوہ عقلی دلیل بھی ذکر کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر خدا مرتکب کبیرہ مومن کو اور کافر کو ایک ہی نظر سے دیکھے اور دونوں کو جہنم میں ہمیشہ رکھے تو یہ عدل خدا کے مطابق نہیں ہے۔ (کشف المراد، ص ۲۶۱، شرح مقاصد جلد ۲، ص ۲۲۸)

اس عقلی دلیل کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ درست ہے دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا خلاف عقل ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں (کافر اور مومن مرتکب کبیرہ) کا عذاب بھی یکساں ہوگا بلکہ ممکن ہے خلود کے باوجود دونوں کے عذاب کی کیفیت میں فرق ہو۔

یہاں تک ہم منکرین خلود کی دلیلوں سے آشنا ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہ دلیلیں محکم ہونے کے باوجود عدم خلود کے قطعی ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں اور جب تک مقابل والی دلیلیں دیکھ نہ لی جائیں ان کے بارے میں واضح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] یہ علم اصول کی دو اصطلاحیں ہیں حکم واقعی کے ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں دلیل نہ مل سکے وہاں حکم ظاہری جاری ہوتا ہے اور حکم ظاہری کے ثابت کرنے کے لیے قاعدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں دلیل ہوگی وہاں قاعدے کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا اب ہم مخالفین (معتزلہ وخوارج) کی دلیلوں کو بیان کرتے ہیں۔

جہنم میں خلود کے قائلین کی دلیلیں

معتزلہ یا جو بھی مرتکب کبیرہ کے لیے جہنم میں خلود کے قائل ہیں اپنے عقیدے کے اثبات کے لیے کچھ قرآنی آیات سے تمسک کرتے ہیں۔ان کی دلیلوں کی تحقیق سے پہلے ضروری ہے کہ ان آیات کی تحقیق کی جائے جو خلود کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآن مجید میں مندرجہ ذیل مختلف گروہوں کے لیے جہنم میں خلود کا حکم لگایا گیا ہے۔

۱۔ کفار

۲۔ مشرک (نحل ۲۹، احزاب: ۶۴، ۶۵، زمر: ۷۱، ۷۲، مومن ۷۶، تغابن: ۱۰، بینہ: ۶)

۳۔ منافقین (توبہ: ۶۸، مجادلہ: ۱۷)

۴۔ مرتد (آل عمران ۸۶۔۸۸)

۵۔ آیات الٰہی کو جھٹلانے والے (اعراف: ۳۶)

۶۔ دشمن خدا اور رسولؐ (توبہ: ۶۳)

۷۔ خدا و رسولؐ کے اوامر کے نافرمان (جن: ۲۲۔۲۳)

۸۔ ظالم (یونس: ۵۲، انعام: ۱۲۸۔۱۲۹)

۹۔ اشقیا و سنگدل (ہود: ۱۰۶۔۱۰۷)

۱۰۔ مجرمین (زخرف ۷۴۔۷۵، سجدہ ۱۲۔۱۴)

۱۱۔ گناہوں میں غرق افراد (بقرہ: ۸۱)

۱۲۔ بدکار لوگ (فرقان: ۶۸۔۶۹)

۱۳۔ مومن کا قاتل (انسائ: ۹۳، فرقان: ۶۸)

۱۴۔ سودخور (بقرہ: ۲۷۵)

۱۵۔ قرآن سے منہ پھیرنے والے (طہٰ: ۱۰۰، ۱۰۱)

۱۶۔ قیامت میں جن کے اعمال ہلکے ہوں گے (مومنون: ۱۰۳، ۱۰۴)

یہ سولہ طرح کے افراد ہیں جو قرآن کی نظر میں جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سولہ طرح کے افراد کافر، مشرک، مرتد اور منافقین ہی میں آ جاتے ہیں اگرچہ عناوین مختلف ہیں یا ان چار گروہوں کے علاوہ وسیع تر مفہوم رکھتے ہیں۔اور مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ سولہ طرح کے افراد یقیناً جہنم میں خلود رکھتے ہیں؟ اس بارے میں فیصلہ دو امور پر موقوف ہے:

۱۔ ان آیات وعناوین کی تحلیل کرتے ہوئے ذہن کو عاصی ومجرم کی آج استعمال ہونے والی اصطلاح سے خالی کر کے قرآن کے عصر نزول کی طرف لوٹانا ہوگا کیونکہ ممکن ہے عصر نزول وحی میں ایک لفظ کسی اور معنی میں استعمال ہوتا ہو لیکن چودہ صدیاں گزرنے کے بعد زبان کی ترقی ووسعت کی وجہ سے لفظ کسی نئے معنی میں استعمال ہونے لگا ہو لہٰذا ایک مفسر صرف اپنے ذہن میں موجود معنی یا اہل زبان کے موجودہ محاورات پر اعتماد کرتے ہوئے آیات کی تفسیر نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ لفظ کی حقیقت معلوم کرے اور عصر نزول وحی والے معانی حاصل کرے۔

۲۔ ان مفاہیم کی تفسیر کے لیے آیات کے سیاق کو بھی مدنظر رکھے کیونکہ ممکن ہے یہ مفاہیم تو مرتکب کبیرہ کو شامل ہو جائیں لیکن آیات کا سیاق وسباق (قبل وبعد) کچھ ایسے قرائن رکھتا ہو جن سے آیات کی وسعت کم ہو جائے اور نتیجتاً آیات کے مفاد سے مرتکب کبیرہ مومن خارج ہو جائے۔

اب ان دو امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان سولہ عناوین کی تفسیر شروع کرتے ہیں ان سولہ عناوین میں سے پہلے چار عنوان مورد بحث نہیں ہیں چونکہ یہ سب کافر کے عنوان کے تحت آتے ہیں اور ان کے جہنم میں ہمیشہ رہنے میں کوئی اختلاف نظر نہیں پایا جاتا لہٰذا ان کے بارے میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ہم عناوین کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

۱۔ آیات الٰہی کو جھٹلانے والے

اس بارے میں وارد ہونے والی آیت کفار سے متعلق ہے اور یہ آدم وحوا کی خلقت کے بعد فرزندان آدم سے سب سے پہلا خطاب ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

(اعراف: ۳۵، ۳۶)

اے فرزندان آدم! اگر تم میں سے تمہاری طرف پیغمبر آئیں اور تمہارے سامنے میری آیات پڑھیں تو تم میں سے جو تقویٰ اختیار کرے اور اپنی اصلاح کرے اسے نہ خوف ہے اور نہ حزن۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ وہیں رہیں گے"

ان دو آیات کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کے حوالے سے لوگ دو طرح کے ہیں:

ایک گروہ وہ جو ان کی تصدیق کرتا ہے اور دوسرا ان لوگوں کا جو ان کی تکذیب کرتا ہے۔ پہلا گروہ جنت میں اور دوسرا عذاب

دائم میں ہوگا۔

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ دوسرا گروہ کفار اور منکرین انبیا کا ہے۔

۲۔ خدا اور رسولؐ سے دشمنی

قرآن اس بارے میں فرماتا ہے:

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ (توبہ: ۶۳)

''جس نے خدا ورسولؐ سے دشمنی کی اس کے لیے جہنم ہے اور وہاں پر وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے''

فعل ''یحادد'' حد سے لیا گیا ہے جس کے معنی کسی چیز کی انتہا واختتام کے ہیں۔ یہاں پر اس سے مراد دشمنی وعداوت ہے اور مسلماً خدا و رسولؐ کے ساتھ دشمنی ان کی تکذیب کے برابر ہے اور ایسا شخص کافر ہے۔

اس کے علاوہ آیت کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ منافقین سے متعلق ہے جو باطن میں ایمان نہیں لائے ہوتے اور صرف اوپر سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

خدا اور رسولؐ کے ساتھ ''محادہ'' کے معنی کو سمجھنے کی خاطر ان آیات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اور ان سب آیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام اس گروہ کا ہے جو خدا اور رسولؐ پر ایمان نہیں لایا ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (مجادلہ: ۲۲)

''تم کبھی ان لوگوں کو جو خدا و آخرت پر ایمان لائے ان کا دوست نہیں پاؤ گے جنہوں نے خدا اور رسولؐ سے دشمنی کی''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اہل ایمان دشمن خدا اور رسولؐ سے دوستی کریں۔ [۱]

۳۔ عاصی وسرکش لوگ

قرآن ان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[۱] سورۂ مجادلہ آیت ۵، ۲۰ کی طرف بھی رجوع کریں۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ﴿۲۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ (الجن:۲۳،۲۴)

''میں کسی چیز کا مالک نہیں، مگر یہ کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچاؤں اور جو بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ جب گناہگاروں نے خدا کی وعید دیکھ لی اس وقت وہ سمجھیں گے کہ کون کمزور ہے اور کس کے حامی کم تر ہیں''

اگر ہم صرف ''ومن یعص اللہ ورسولہ......'' کے جملے پر اکتفا کریں تو آیت کے معنی زیادہ وسیع ہو جائیں گے اور آیت کا مصداق مرتکب کبیرہ مومنین بھی ہو جائیں گے۔ لیکن آیت کے سیاق پر توجہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیت انبیا کے منکر اور ان کی تحقیر کرنے والوں کے بارے میں ہے اور اس بات پر شاہد دو چیزیں ہیں:

(الف) اس سورہ میں آیت ۱۸ سے آیت ۲۸ تک کلام کا محور مشرکین و کافرین کا گروہ ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ (جن:۱۸)

''مساجد خدا کے لیے ہیں خدا کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ (جن:۲۰)

''میں اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہیں دیتا''

چونکہ محور سخن کفار و مشرکین ہیں لہٰذا طبعی طور پر عارضی و نافرمان لوگوں سے مراد بھی وہ ہیں جو توحید کے مخالف ہیں اور دین کے اصول و فروع کو نہیں مانتے۔

(ب) آیت ۲۴ میں انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ جلد ہی تم آخرت کو دیکھ لوگے۔ تب تمہیں: پتہ چلے گا کہ کس کے حمایتی و مددگار کم ہیں اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ مخاطب کفار و مشرکین ہیں کیونکہ یہی لوگ کم حامی ہونے کے باعث انبیا کی تحقیر کرتے تھے۔

ان دو قرینوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں پر مراد ہر قسم کا عصیان و نافرمانی ہے یہاں تک کہ مومنین کا عصیاں بھی اس میں شامل ہے۔

۴۔ظالم وستم گر

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۵۲﴾ (یونس: ۵۲)

''پھران سے کہا جائے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا کہ ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزہ چکھواور یہ صرف تمہارے اعمال کی سزا ہے''

اس آیت میں ظلم کرنے والوں کو دائمی عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔اگر آیت کے سیاق سے صرف نظر کرلیں تو اس آیت کے مفہوم میں ہر قسم کا ظلم شامل ہوجاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ گناہ کبیرہ کرنے والا اپنے نفس پر یا خدا پر یا دوسروں پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے لیکن آیت کے سیاق کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روز قیامت کے منکرین کے بارے میں ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۸﴾ (یونس: ۴۸)

''وہ کہتے ہیں اگرتم سچ کہتے ہوتو پھر قیامت کب ہوگی''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۵۱﴾ (یونس: ۵۱)

''جب عذاب آچکا اب ایمان لاتے ہو(توحید پر یا رسالت پر یا قرآن پر) حالانکہ پہلے تم اس عذاب کو مانگا کرتے تھے''

زیر بحث آیت اس گروہ کو ان صفات اوران حالات میں جہنم میں خلود سے ڈرارہی ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ (یونس: ۵۲)

آیت کے سیاق کو دیکھتے ہوئے آیت کی اس کے علاوہ تفسیر نہیں کی جاسکتی۔اسی آیت سے ان دو دوسری آیات کو بھی سمجھا جاسکتا ہے جن میں ظالمین کو جہنم کے خلود سے ڈرایا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا

يَكْسِبُوْنَ۝۱۲۹ (انعام: ۱۲۸۔ ۱۲۹)

''وہ دن جب خدا سب (جن وانس) کو محشور کرے گا (تو جنوں سے خطاب ہوگا اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا۔ اس وقت انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے: ہم میں سے بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا (آدمی جنوں کے وسوسے کی وجہ سے شہوات میں غرق ہوگئے اور ہم نے جو جنوں کی پیروی کی جن بھی اس سے خوش ہوئے اور یہ کام جاری رہا)۔ یہاں تک کہ جو مدت تو نے ہمارے لیے معین کی تھی وہ آ پہنچی اس وقت خطاب ہوگا: آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں تم ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ خدا جو چاہے۔ تمہارا رب حکیم اور دانا ہے۔ ہم اس طرح ظالمین کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بعض دوسروں کا دوست بناتے ہیں۔

اگر چہ اس آیت میں ظالمین کی سزا جہنم میں خلود بتائی گئی ہے لیکن سیاق آیات کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ آیت سابقہ امتوں کے بارے میں ہے جو اپنے انبیا کی تکذیب کرتی تھیں اور اگر پیغمبر اکرمؐ کی امت سے مربوط ہو تب بھی ان لوگوں کے بارے میں ہے جو آنحضرتؐ کی رسالت کا انکار کرتے تھے مثلاً ان دو آیات سے پہلے والی آیت میں ارشاد ہے:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (انعام: ۱۲۴)

''جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہمیں بھی وہی کچھ دیا جائے جو رسولوں کو دیا گیا ہے (یعنی ہم پر بھی وحی ہو اور ہم بھی فرشتے کو دیکھ لیں)

ان دو آیات کے بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ (انعام: ۱۳۰)

''اے گروہ جن وانس! کیا ہمارے پیغمبر تمہاری طرف نہیں آئے جو تمہیں ہماری آیات سناتے ہیں؟''

پس زیر بحث آیت سے پہلے اور بعد والی آیات کو دیکھنے اور توجہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو توحید اور انبیاء کی رسالت کے منکر تھے خصوصاً پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کے منکر تھے اور ایسے افراد کفار کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتے۔

اشقیا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ۝۱۰۶ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ﴿۱۰۷﴾

(هود: ۱۰۶، ۱۰۷)

''وہ جو بدبخت ہوگئے جہنم میں ان کی چیخیں اور گریہ کی آوازیں بلند ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک زمین و آسمان رہیں گے مگر جو خدا چاہے بتحقیق تیرا پروردگار جو ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے''

آیت میں بدبخت و شقی لوگوں کو جہنم میں خلود کی وعید ہے مگر یہ کہ خدا انہیں جہنم سے نکالنے کا ارادہ کرلے۔

مفسرین نے اس آیت اور اس سے بعد والی آیت جو نیک بخت لوگوں کے بارے میں ہے کے بارے میں مختلف جہات سے بحث کی [1] ہے۔

لیکن ہمارے لیے متعلقہ بحث اشقیا کے لیے جہنم میں خلود کی تفسیر ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر گناہگار شقی ہے اور ہر گناہ ایک قسم کی شقاوت کا موجب بنتا ہے اور شقاوت سے کئی مراتب ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مندرجہ بالا آیت ہر قسم کی شقاوت و شقی پر محیط ہے یا مراد صرف کفار ہیں جو شقاوت و بدبختی کے آخری درجے کو پہنچ چکے ہیں؟ بعد والی آیت شاہد ہے کہ اس سے مراد وہ اشقیا ہیں جنہوں نے شرک کیا اور جو خدا کے بجائے مخلوق کی حمد و تعریف کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

فَلَا تَكُ فِيۡ مِرۡيَةٍ مِّمَّا يَعۡبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَعۡبُدُ اٰبَآؤُهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ غَيۡرَ مَنۡقُوۡصٍ﴿۱۰۹﴾ (هود: ۱۰۹)

''تم اس میں بالکل شک نہ کرو۔ جس کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ صرف اس لیے کہ اس کی پرستش ان کی آباء و اجداد کرتے تھے اور ہم انہیں اس کا پورا پورا حصہ دیں گے''

یہ آیت ایک قسم کی دلالت رکھتی ہے کہ اشقیا سے مراد مشرک ہیں جو اپنی شقاوت میں آخری درجے کو پہنچ چکے ہیں۔

اور دوسری آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ ''شقی'' کے بعد کذب و تولّٰی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور یہ آیت شاہد ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں شقی وہ ہے جو مفسد ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى﴿۱۴﴾ لَا يَصۡلٰٮهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى﴿۱۵﴾ الَّذِىۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴿۱۶﴾ (الليل: ۱۴، ۱۵، ۱۶)

---

[1] کبھی تو یہ بحث کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جنت و جہنم میں ہیشگی کو زمین و آسمان کی برپائی کے ساتھ مقید کیا ہے حالانکہ زمین و آسمان ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ قیامت کے ساتھ نابود ہو جائیں گے اور کبھی وہ استثناء کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو آیت میں مذکورہ ہے یعنی الاما شآءَ ربک اور ایسا استثنا خلود سے مناسبت نہیں رکھتا۔

”میں تمہیں شعلوں والی آگ سے ڈراتا ہوں جس میں بدبخت کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا وہ بدبخت جس نے رسولوں کی تکذیب کی ہو اور ان سے پشت پھیری ہو“

۶۔ مجرمین

قرآن مجرمین کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۴﴾ۚۖ لَا یُفَتَّرُ عَنۡہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡہِ مُبۡلِسُوۡنَ ﴿۷۵﴾ۚ (زخرف:۷۴، ۷۵)

”مجرم دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ عذاب ان سے منقطع نہیں ہوگا اور وہ جہنم کی آگ میں الٹے سر ہوں گے (یا رحمت حق سے ناامید ہوں گے)

اس آیت میں مجرموں کے لیے جہنم میں خلود کا ذکر ہے لیکن کیا اس سے مراد ہر وہ انسان ہے جس کے ہاتھ گناہ سے آلودہ ہوں یا صرف وہ مجرم مراد ہیں جنہوں نے فرمانِ الٰہی سے سرکشی کی ہو اور انبیا کا انکار کیا ہو؟

اس سے پہلے والی آیات سے دوسری بات ثابت ہوتی ہے کیونکہ مجموعی طور پر آیات انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں:

۱۔ آیاتِ الٰہی پر ایمان لانے والے جن کی جزا جنت ہے۔

۲۔ مجرم جن کی سزا عذاب دائم ہے۔

ان دو گروہوں میں موازنہ کرنے سے دوسرے گروہ کی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں ارشاد ہے:

یٰعِبَادِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۸﴾ۚ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۶۹﴾ۚ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ اَنۡتُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ تُحۡبَرُوۡنَ[1] ﴿۷۰﴾ (زخرف ۶۸، ۷۰)

اور دوسرے گروہ کے بارے میں یوں ارشاد ہے:

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۴﴾ۚۖ لَا یُفَتَّرُ عَنۡہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡہِ

[1] اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی تم کوئی غم کرو۔ تم وہ ہو جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور ہمارے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کیا تم اور تمہاری بیویاں نہایت خوشی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

مُبۡلِسُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡا هُمُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۷۶﴾ [1] (زخرف ۷۴ تا ۷۶)

چونکہ ان آیات میں گروہ اوّل کے بارے میں "الذین امنوا" کا جملہ استعمال ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیات الٰہی پر ایمان نہیں لائے۔ اس کے علاوہ تمام مکی سورتوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا محورِ سخن مشرک و کافر ہیں جنہوں نے آیات الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور مجرمین کی صف میں داخل ہو گئے اور مکی سورتوں میں عذاب کا زیادہ تر ذکر مشرکین و کفار کے بارے میں ہے۔

قرآن مجرمین کے بارے میں ایک اور جگہ فرماتا ہے:

وَلَوۡ تَرٰۤى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَلَوۡ شِئۡنَا لَاٰتَيۡنَا كُلَّ نَفۡسٍ هُدٰٮهَا وَلٰكِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّىۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوۡقُوۡا بِمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيۡنٰكُمۡ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡخُلۡدِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ (سجدہ: ۱۲، ۱۴)

"اگر تم دیکھتے جب مجرمین اپنے پروردگار کے پاس سر جھکائے ہوئے ہوں گے (کہیں گے) خدایا! ہم نے دیکھا اور سن لیا ہمیں لوٹ آ دے تاکہ ہم نیک عمل انجام دیں اور دعوت انبیا پر یقین پیدا کریں۔ انہیں کہا جائے گا: اس دن کی ملاقات کو بھولنے کا عذاب چکھو، اب ہم تمہیں بھول گئے، اپنے اعمال کے بدلے ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزا چکھو"۔

اس آیت میں مجرمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آخرت اور شریعت انبیا پر ایمان نہ لائے اور اس مطلب پر قرینہ خود اس آیت اور دوسری آیات میں موجود ہے مثلاً جب یہ گروہ عذاب خدا کو دیکھے گا تو کہے گا: "انا موقنون" اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے وہ قوانین الٰہی کا یقین و اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ بعد والی آیت میں مومنین کی صفات کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا يُؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِّرُوۡا بِهَا خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوۡا بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ

---

[1] مجرم ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے ان سے عذاب منقطع نہیں ہوگا وہ جہنم میں الٹے سر ہوں گے۔

وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝ (سجدہ: ۱۵)

''ہماری آیات پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب انہیں یاد دلائی جائیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور خدا کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ اس حالت میں کہ وہ تکبر نہیں کرتے''

۷۔ گناہوں میں غرق لوگ

بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝ (بقرہ: ۸۱)

''جس نے برائی کمائی اور خطا و گناہ نے اس کا احاطہ کرلیا وہ لوگ اہل جہنم ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے''

اس آیت میں ایسے لوگوں کو جہنم کے خلود کا مستحق بتایا گیا ہے جن میں دو خصوصیتیں ہوں:

۱۔ گناہ کے مرتکب ہوئے ہوں اور

۲۔ گناہوں میں اس قدر غرق ہو جائیں کہ گناہ ان کا احاطہ کرلیں

احاطہ خطا و نفسانی حالت ہے جو گناہ سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو ایسا بنا دیتی ہے کہ ہدایت کے تمام راستے اس پر بند ہو جاتے ہیں اور اس پر انبیائے الٰہی کی بات بھی اس پر بے اثر ہو جاتی ہے۔

بنابریں آیت ہر قسم کے مرتکب گناہ کبیرہ کے بارے میں نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آیت نے پہلے جملے ''کسب سیئة'' پر اکتفا نہیں کی بلکہ دوسرا جملہ بھی ذکر کیا ہے ''واحاطت به خطیئته''، یعنی خطا و گناہ نے اس کے دل کا حاطہ کرلیا ہو اور وہ انسان اتنا گناہ میں غرق ہو کہ ہدایت کے راستے اس پر بند ہو چکے ہوں اور حق نہ اس کے اندر سے اسے پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی باہر سے۔ ایسا شخص یا تو کافر ہے یا بدکاریوں کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے اور آیات الٰہی کی تکذیب کرتا ہے۔

قرآن نے کچھ بدکاروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ آخر کار وہ آیات الٰہی کی تکذیب کرنے لگ جاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيۡنَ اَسَآءُوا السُّوۡٓاٰۤى اَنۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (الروم: ۱۰)

''پھر ان کا انجام جنہوں نے بدعمل انجام دیا یہ ہے کہ وہ آیات خدا کی تکذیب کرتے ہیں''

اس پر توجہ رہنی چاہیے کہ تھوڑا گناہ ایمان کے منافی نہیں ہے لیکن جب انسان پوری طرح مادہ پرست ہو جائے اور احکام الٰہی کا احترام

---

[۱] یہ آیت قرآن کی اُن آیات میں سے ہے جن کی تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پڑھنے والے حضرات سجدہ کرنا نہ بھولیں۔

نہ کرے تو یہ اس کی عملی مادہ پرستی فکری وعقیدتی مادہ پرستی سے بڑھ کر گناہوں کو آیات الٰہی کی تکذیب میں بدل دیتی ہے۔

اس کے علاوہ آیات کا سیاق بتلاتا ہے کہ یہاں مراد بنی اسرائیل کے کافر ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ (بقرہ: ۷۹)

''ہلاکت ہے ان کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب (تورات) لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تا کہ اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچیں ہلاکت اور وائے ہے اس کے لیے جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور وائے ہے اس پر جو وہ کماتے ہیں''۔

زیر بحث آیت سے بعد والی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝(بقرہ: ۸۲)

''جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیے وہ اہل جنت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے''

والذین امنوا زیر بحث آیت میں ''بلی من کسب سیئة'' سے موازنہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں محور سخن مومن وکافر ہیں۔ مومن ہمیشہ جنت میں اور کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

۸۔ بدعمل افراد

قرآن نیک لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰــهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ (الفرقان: ۶۸، ۶۹)

''وہ جو خدا کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے اور جس جان کو خدا نے محترم شمار کیا ہے اسے قتل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ اور زنا نہیں کرتے''

اور جو بھی یہ گناہ کرے گا اسے سزا ملے گی اور قیامت کے دن اس کے لیے دوگنا عذاب ہے اور خواری کے ساتھ

وہ اس میں ہمیشہ رہے گا

اس آیت میں "ذلك" کا مشار الیہ یعنی جو گناہ ذکر ہوئے ان پر جہنم کے خلود کی دھمکی دی گئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کلمہ "ذلك" کا اشارہ کس طرف ہے۔ ابتدائے آیت میں تین عمل بتائے گئے جنہیں مومن ترک کرتے ہیں اور وہ تین عمل یہ ہیں:

۱۔ شرک

۲۔ قتل نفس محترم

۳۔ زنا

پھر کہا گیا ہے کہ جو بھی یہ کام کرے گا اسے سزا ملے گی اور اس کی سزا دوگنا ہوگی اور وہ اس میں ہمیشہ بتلا رہے گا۔

اب یہ دیکھیں کہ یہ سزا کسے ملے گی؟

یہاں تین احتمال ہیں:

(الف) مراد آیت کا آخری جملہ ہے یعنی "ولا یزنون" اس صورت میں جو شخص یہ گناہ کبیرہ انجام دے گا وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔

(ب) مراد مشرک یا قاتل نفس محترمہ ہیں

(ج) مراد یہ تینوں قبیح عمل ہیں۔

پہلا احتمال تو بہت بعید ہے کیونکہ اگر زانی مراد ہو تو پھر عذاب کا دگنا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ زنا سے بڑے گناہ بھی ہیں جن پر عذاب دگنا نہیں ہے۔

دوسرا احتمال بھی قواعد کی رو سے غلط ہے کیونکہ یہ طریقہ ہی غلط ہے کہ کوئی متکلم تین مطلب اکٹھے کہے اور پھر بغیر کسی قرینہ کے پہلے دو کی طرف اشارہ کرے اور ان کے لیے خصوصاً کوئی حکم ذکر کرے لہٰذا تیسرا احتمال صحیح ہے یعنی اگر کوئی تینوں کا ارتکاب کرے مشرک ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کو قتل کرے اور زنا بھی کرے اور ایسے شخص کا جہنم میں خلود مرتکب کبیرہ کے جہنم میں خلود پر دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ مشرک کا خلود جیسا کہ ابتدائے بحث میں کہا گیا ہے مورد اتفاق ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دو قرینوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم اس گروہ کے ساتھ خاص ہے۔ جس میں یہ تینوں اوصاف پائے جائیں۔

۱۔ عذاب کا دگنا ہونا

۲۔ خلود کے حکم کے بعد استثنا کا آنا اور اس استثنا میں ایمان، عمل صالح اور توبہ کی بات کی گئی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کے بارے میں خلود کا حکم ہے وہ ایمان اور عمل صالح نہیں رکھتے تھے اور وہ اس صورت میں عذاب سے رہائی پا سکتے ہیں کہ پہلے ان قبیح اعمال سے اپنا تعلق توڑیں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں (یعنی توبہ کر لیں) اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ

حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٧٠ (الفرقان:۷۰)

''مگر وہ فرد کہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے خدا اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا اور خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''

یہاں پر ایک سوال کا جواب دینا باقی ہے اور وہ یہ کہ شرک جب تنہا جہنم میں خلود کا موجب ہے تو پھر دوسرے دو عمل ساتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب واضح ہے کہ ان دو کا ساتھ ملانا عذاب کے دوگنا ہونے کا موجب ہے نہ کہ خلود کا۔

۹۔قرآن سے منہ پھیرنے والے

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝٩٩ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝١٠٠ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝١٠١ (طٰہٰ:۹۹ تا ۱۰۱)

''اس طرح ہم گذشتہ واقعات تم سے بیان کرتے ہیں اور ہم نے تمہیں اپنی طرف سے ذکر (قرآن) عطا کیا ہے جو بھی اس سے روگردانی کرے گا قیامت کے دن بہت بھاری بوجھ اٹھائے گا اور اس میں ہمیشہ رہے گا اور قیامت کے دن کیسا برا بوجھ ہے ان کے لیے؟

اس آیت میں ''خالدین'' فیہ'' کا کلمہ استعمال ہوا ہے اور ''فیہ'' کی ضمیر کا مرجع ''وزر'' ہے اور اس سنگین بوجھ سے مراد گناہ ہے اور ''وزر'' میں خلود کا مطلب گناہ کی سزا میں خلود ہے۔ نتیجتاً آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے منہ پھیرنے والے ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن سے روگردانی کا کیا مطلب ہے؟ آیا تلاوت نہ کرنا یا قرآن کے بعض احکام پر عمل کرنا؟ تو حتماً مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن پر ایمان نہ لانا اور اسے اہمیت نہ دینا کیونکہ ان آیات میں محور سخن کافر ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور آخرت پر ایمان نہیں لائے تھے۔

بلکہ بعض آیات میں تو قرآن سے روگردانی کو کفر و بے ایمان کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝٥٧ (الکہف: ۵۷)

”اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے آیات الٰہی کی یاد دلائی جائے اور وہ ان سے منہ پھیر لے اور گذشتہ لوگوں کے کاموں کو بھول جائے۔ہم نے ان کے دلوں پر اس کے سمجھنے سے پردہ ڈال دیا ہے اور کان بہرے کر دیے ہیں اگر انہیں ہدایت کی طرف بلایا جائے تو وہ ہرگز ہدایت نہیں پاتے“

۱۰۔قیامت کے دن جن کے میزان ہلکے ہوں گے

اس بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فِىۡ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ‌ۚ﴿۱۰۳﴾ (مومنون:۱۰۳)

”جن کے میزان ہلکے ہوں گے وہ ہوں گے جنھوں نے اپنا نقصان کیا ہے۔وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے“

اس آیت کا ظہور یہ ہے کہ ہر سبک اعمال شخص جہنم میں خلود رکھتا ہے حالانکہ اگر کوئی ایسا مسلمان ہے جس نے نیکیاں بھی کی ہیں اور برائیاں بھی لیکن اس کی برائیاں اور اس کی نیکیوں سے زیادہ ہوں تو اس صورت میں وہ بھی ہلکے پلڑے والوں میں سے ہوگا اور اسے بھی جہنم میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مرتکب کبیرہ کی اگر برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہوں تو وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا پس یہ آیت مرتکب کبیرہ مومنین کے ایک گروہ کے خلود جہنم پر دلالت کرتی ہے۔

البتہ یہ تو ظاہر آیت ہے لیکن اگر سیاق آیت پر توجہ کریں تو پتہ چلے گا کہ مراد اس سے وہ کفار ہیں۔جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کا انکار کیا اور تکذیب کی۔ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمۡ تَكُنۡ اٰيٰتِىۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَكُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ﴿۱۰۵﴾ (مومنون: ۱۰۵)

”کیا تم اس طرح نہیں تھے کہ جب تم پر ہماری آیات پڑھی جائیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے“

اس طرح اس سے پانچ آیتیں بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡ عِبَادِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَـنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ‌ۚ‌﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذۡتُمُوۡهُمۡ سِخۡرِيًّا حَتّٰٓى اَنۡسَوۡكُمۡ ذِكۡرِىۡ وَكُنۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ تَضۡحَكُوۡنَ﴿۱۱۰﴾ (مومنون ۱۰۹۔ ۱۱۰)

”جب میرے بندے میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ خدایا ہم ایمان لائے ہیں ہمیں بخش دے تو بہترین رحم کرنے والا ہے تو تم ان کا مذاق اڑاتے تھے یہاں تک کہ وہ سبب ہوئے کہ تم میرا ذکر بھول جاؤ اور تم ان

پر ہنستے تھے‘‘۔

ان آیات پر توجہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ہلکے پلڑے والوں سے مراد تکذیب کرنے والے غیر مومن افراد ہیں جو قیامت کے دن گھاٹے میں رہیں گے۔

۱۱۔سودخور (سود کی حرمت کے بعد)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷۵ (البقرہ: ۲۷۵)

’’وہ جو ربا کھاتے ہیں وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھتے مگر اس شخص کے اٹھنے کی طرح کہ شیطان نے جس کو دیوانہ کر دیا ہو اور یہ حالت اسی لیے ہے کہ انہوں نے کہا: ربا بھی بیع کی طرح ہے حالانکہ خدا نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔جس کو بھی خدا کی طرف سے وعظ و نصیحت پہنچے اور وہ اس سے رک جائے تو سابقہ حکم اس کے لیے ہے (یعنی بخش دیا جائے گا) اور اس کا معاملہ خدا پر ہے اور جو بھی سودخوری کی طرف پلٹ آئے وہ جہنمی ہے اور وہاں پر ہمیشہ رہے گا‘‘

ظاہر آیت اگرچہ مطلق رباخوروں کے بارے میں ہے جنہیں جہنم کے خلود سے ڈرایا گیا ہے لیکن جملہ ’’**وَمَنْ عَادَ**‘‘ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ سودخور ہیں جو سود کی حرمت کو سننے کے باوجود سود پر ڈٹے رہے اور ان کی منطق تحریم ربا کے بعد بھی وہی رہی جو پہلے تھے۔تحریم سے پہلے جیسے کہتے تھے بیع اور سود ایک ہی ہیں تحریم کے بعد بھی یہی کہتے تھے گویا انہوں نے خدا کی تشریع اور قانون کو قبول نہیں کیا اور وحی الٰہی کی تکذیب کی۔

بعبارت دیگر تحریم ربا کی آیت کے نزول سے پہلے سودخور دو لحاظ سے انحراف رکھتے تھے۔

۱۔ اعتقادی انحراف یعنی ربا کو بیع کی طرح سمجھتے تھے۔

۲۔ عملی انحراف کہ سود والے معاملات کرتے تھے۔

آیت کہتی ہے کہ تحریم ربا سے پہلے ان کے یہ دو انحراف عذاب نہیں رکھتے تھے لیکن تشریع کے بعد جس نے یہ دو انحراف اپنائے رکھے وہ جہنم میں خلود رکھتا ہے۔پس اگر جہنم میں خلود کا موضوع سودخوری کی حرمت کے بعد ہو تو عقیدے میں کوئی انحراف ہو یا نہ ہو کہا جا سکتا ہے کہ یہ

آیت مرتکب کبیرہ کے خلود کے قائلین کے لیے دلیل بن سکتی ہے۔لیکن اس آیت میں یا دوسری آیات میں اس مطلب پر کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ قدر متیقن جملہ "و من عاد" سے یہ ہے کہ جو تحریم ربا سے پہلے والے دونوں انحراف رکھتے ہوں یا پہلے انحراف کی طرف لوٹ جائیں اور ایسے افراد کے کفر میں کسی قسم کا شک نہیں۔ [۱]

۱۲۔ بے گناہ مومن کا قاتل

قرآن مومن کے قتل عمد کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾ (نساء: ۹۳)

''جو بھی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا خدا کا غضب اس پر ہوگا اور خدا کی لعنت اس پر ہوگی اور خدا نے اس کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''

گناہ کبیرہ کے مرتکب کے دائمی عذاب کے قائلین کے پاس یہی ایک دلیل ہے جو ان کے مدعا پر شاہد ہے اور علم کلام کی تمام کتابوں میں اس نظریے کے لیے اسی آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔ البتہ اس آیت کا ظہور گذشتہ آیات کی نسبت زیادہ اس مطلب پر دلالت کرتا ہے اور آیت کی شان نزول بھی خلود کے قائلین کی تائید کرتی ہے۔

امین الاسلام طبرسی لکھتے ہیں: "هشام بن صبابه" بنی نجار کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ ہشام کے بھائی قیس نے جناب پیغمبر اکرمؐ کے حضور شکایت کی اور آنحضرتؐ نے قیس بن ہلال فہری کو اس کے ہمراہ قبیلہ بنی نجار کی طرف بھیجا اور پیغام دیا کہ بنی نجار سے جا کر کہو کہ اگر اس کے قاتل کو جانتے ہو تو اس کا نام ہمیں بتاؤ تاکہ قیس اس سے قصاص لے اور اگر نہیں پہچانتے ہو تو مقتول کی دیت ادا کرو۔ قیس بن ہلال فہری نے آنحضرتؐ کا پیغام ان تک پہنچا دیا اور انہوں نے دیت ادا کردی اور آنحضرتؐ کا قاصد دیت لے کر قیس کے ہمراہ واپس آ گیا لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ مقتول کا بھائی وسوسہ شیطانی کا شکار ہوگیا دل میں اپنے آپ سے کہنے لگا میں تو کچھ نہیں کرسکا صرف دیت ہی لے کر آ گیا ہوں کیا یہ بہتر نہیں کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہے اسی کو قتل کر دوں تاکہ جان کا بدلہ جان ہو جائے اور دیت بھی ہاتھ لگ جائے۔ بالآخر اس نے پیغمبر اکرمؐ کے قاصد کو ایک بڑے پتھر کے ذریعے قتل کر دیا اور اونٹ پر سوار ہو کر مکہ چلا آیا۔ اب وہ اسلام سے پھر کر کافر ہو چکا تھا۔ [۲]

اس جگہ پر خلود کے منکرین نے کئی جوابات دیے ہیں ہم یہاں انہیں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ آیت میں متعمداً سے مراد یہ ہے کہ وہ مومن کو ایمان کی وجہ سے قتل کر دے۔ ایسی صورت میں واضح ہے کہ قاتل کافر ہوگا۔

---

[۱] مجمع البیان ج ۲، ص ۳۸۹، المیزان ج ۲، ص ۴۱۸ ملاحظہ کریں۔

[۲] مجمع البیان جلد ۲، ص ۹۲۔ ۹۳

۲۔ خلود سے مراد ایک بہت لمبا عرصہ ہے کہ عرفاً اتنی لمبی اقامت کو خلود سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی نے رہنے کے لیے گھر خریدا ہو تو کہتے ہیں یہ ہمارا ہمیشہ کا گھر ہے حالانکہ وہ وقتی ہوتا ہے ممکن ہے کچھ مدت بعد وہ گھر تبدیل کر لے۔

۳۔ یہ آیت صرف جہنم کے خلود میں ظہور رکھتی ہے اور خلود کے حتمی ہونے پر دلیل نہیں ہے ممکن ہے توبہ یا شفاعت یا عفو الٰہی کی وجہ سے قاتل نجات پا جائے لہٰذا مشرک کے ساتھ اس کا فرق واضح ہو جائے گا۔ قرآن نے مشرک کے بارے میں بڑی قاطعیت کے ساتھ فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ (نساء:۴۸)

لہٰذا اس آیت کے ہوتے ہوئے نہیں کہا جا سکتا کہ مشرک مشمول شفاعت ہو جائے گا جبکہ زیر نظر آیت میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ شفاعت کے ذریعے دردناک عذاب سے نجات پا جائے۔ اس کی مثال یوں لیں کہ کوئی حاکم کہے: میں فلاں آدمی کو نہیں بخشوں گا اور دوسرے سے کہے اسے عمر قید میں ڈال دو پہلے جملے کے ہوتے ہوئے اس شخص کے سفارش کے ذریعے بخشے جانے کا احتمال بالکل نہیں ہے۔ خصوصاً شفاعت خدا کی رضا کے ساتھ انجام پاتی ہے اور خدا نے مشرک کو نہ بخشنے کا کہہ کر اپنی عدم رضا مندی کا اعلان کر دیا ہے۔ حالانکہ دوسرے کے بارے میں شفاعت وسفارش کے قبول کیے جانے کا احتمال ہے۔

یہ تین جواب تو وہ جواب تھے جو مفسرین حضرات اس مقام پر دیتے ہیں لیکن ایک چوتھا جواب بھی ہے جو امکان اعتبار رکھتا ہے کہ مرتکب کبیرہ افراد میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس عظیم گناہ سے اپنے ہاتھ آلودہ کیے ہوئے ہیں یہ یقیناً جہنم میں خلود رکھتے ہیں اور ہم اس طرح کے تو نہیں ہیں کہ پہلے ایک مدعا بنا لیا پھر اس مدعا پر دلیل ڈھونڈنے چل نکلے بلکہ تمام عقائد قرآن پر پیش کرنے چاہئیں اور اس کے مطابق عقائد اپنانے چاہئیں اور جب قرآن کسی گناہگار کے لیے دائمی جہنم کا فیصلہ کر رہا ہے تو ہمیں قبول کر لینا چاہیے۔ شیخ صدوق کتاب توحید میں ابن ابی عمیر سے نقل کرتے ہیں کہ امام موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام نے فرمایا:

''کہ اللہ جہنم میں اہل کفر و شرک کے علاوہ کسی کو ہمیشہ نہیں رکھے گا بلکہ جو شخص گناہ کبیرہ نہ کرے اس کے صغیرہ گناہ بخش دیے جائیں گے اور ان سے سوال نہیں ہوگا۔

راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا شفاعت مومنین میں سے کن لوگوں کے لیے ہے؟ تو حضرتؑ نے فرمایا میرے والد گرامی نے اپنے آباء سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: شفاعت میری امت کے ان افراد کے لیے ہے جو کبیرہ کا ارتکاب کریں لیکن جو ان میں سے نیک لوگ ہیں ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے''[1]

ہمارے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ جن بارہ موارد میں خلود کے قائلین استدلال کرتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مورد قابل ملاحظہ و تامل ہے اور بقیہ گیارہ میں قرائن سے ثابت ہو گیا کہ یہ کفار و مشرکین و منافقین کے لیے مختص ہیں اور سولہ موارد میں سے پہلے چار موارد تو ویسے ہی بالاتفاق مشرکین و کفار کے ساتھ مختص ہیں اور

---

[1] توحید صدوق باب ۶۳، حدیث ۶ ص ۴۰۷

یہ گیارہ مورد بھی کنایہ واشارہ ہیں انہی چار مورد کا۔ باقی ایک مورد بچا جو مومن کے عمدی قتل کے بارے میں ہے اس میں مفسرین کے تین جوابات کے علاوہ دو مطلب ہم نے اضافہ کیے کہ:

۱۔ یہ حکم (خلود) قطعی وحتمی نہیں ہے بلکہ شفاعت کے ذریعے بخشش کی امید ہے۔

۲۔ اوپر مذکورہ روایت جو صدوق نے خالد بن در جہنم کے بارے میں نقل کی۔

بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نظریہ کہ مومن جہنم میں خلود نہیں رکھتا ثابت اور محکم ہے۔

یہاں پر صدرالمتالہین کا نظریہ قابل توجہ ہے اہل معرفت کے لیے اور ہم اظہار نظر کے بغیر اسے یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''روح انسانی کی خلقت توحید پر ہوئی ہے اور یہ چیز اس میں کبھی نابود نہیں ہوتی صرف لغزشیں اور گناہ اس گوہر کو ڈھانپ لیتے ہیں لیکن جب انسان جہنم میں داخل ہوتا ہے تو بتدریج یہ حجاب ختم ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے اس وقت وہ جہنم سے رہائی پا جائے گا اور پاک فطرت کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائے گا''[1]

یہ اجمال ہے اس کلام کا جو صدرالمتالہین اور ان سے پہلے شیخ ابن عربی فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں:

''اگر چہ اسے مکمل طور پر قبول نہ کیا جائے لیکن مرتکب کبیرہ کے بارے میں اسے قبول کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اس کی جہنم سے نجات کی توجیہ کی جا سکتی ہے''

گناہ وقتی اور سزا ابدی

یہ معروف سوال ہے کہ کافر جو عذاب میں ہمیشہ رہیں گے آخر ایسا کیوں ہے۔ آخر جرم وگناہ اور سزا میں توازن ہونا چاہیے اور سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیے۔ عقلا دنیا میں ہمیشہ اسی قانون پر عمل کرتے ہیں۔ پس کافر جس نے محدود مدت کے لیے ایک عمل کیا ہے اسے اس کی سزا دائمی صورت میں کیوں ملے گی؟

جواب

اس سوال کے مختلف جواب دیے جا سکتے ہیں:

جرم اور سزا کے درمیان توازن عقلی قوانین میں سے ہے۔ جو جعلی واعتباری قوانین کے بارے میں ہے یعنی ایک قسم کے حساب کے ذریعے ہر جرم کے لیے مختلف قسم کی سزائیں معین کی جاتی ہیں جن میں سے کچھ تو گناہ کے مطابق ہوتی ہیں اور کچھ غیر عادلانہ دکھائی دیتی ہیں اور اس

[1] اسفار جلد ۹ ص ۳۴۷۔۳۵۱

طرح کا اختلاف نظر جعلی واعتباری قوانین میں مکمل طور پر مناسب دیکھا جاتا ہے، جبکہ آخرت میں عذاب وعقاب کا تعلق گناہوں کے ساتھ جعلی و اعتباری نہیں ہے بلکہ ان دونوں میں ایک قسم کا تکوینی تعلق ہے اور سزا و عذاب اس گناہ کا تکوینی عکس العمل اور تجسم عینی ہے، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے ساتھ شرک نفسانی جڑیں رکھتا ہے اور انسان کی فکر کو تاریک وسیاہ کر دیتا ہے اور اس کا آخرت میں تجسم خلود و ہمیشگی کی صورت میں ہے۔

۲۔ اصولی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گناہ و سزا کا تعلق ہر لحاظ سے جعلی واعتباری ہے اور اسے کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اسی دنیا میں لغزش وخطا اور اس کے آثار کا رابطہ تکوینی و تولیدی ہے۔ ایک لحاظ کی خلا کے نتائج بعض اوقات دائمی ہوتے ہیں۔ انسان جو ایک لحظہ میں خودکشی کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے دنیاوی زندگی سے محروم ہو جاتا ہے یا انسان ایک لحظہ کی غلطی کی وجہ سے خود کو نابینا کر لے تو وہ ہمیشہ کے لیے بینائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ رابطہ تمام گناہوں کے بارے میں ثابت نہیں ہے بلکہ بعض میں جیسے خطا و لغزش وقتی ہوتی ہے اس کا اثر و انجام بھی وقتی ہوتا ہے جیسے انسان کوئی کڑوی شے منہ میں رکھ لے اور فوراً نکال دے تو اس کا اثر چند لحظہ کے لیے ہوگا۔

اب ہم اس طرح کے دو قسم کے رابطوں ا۔ تولیدی، ابدی ۲۔ رابطہ تولیدی موقت۔ گناہ اور اخروی آثار کے بارے میں بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کفر و شرک ان گناہوں میں سے ہیں کہ اگرچہ ان کا وقت محدود ہے لیکن خود موجب ہیں آخرت میں دائمی عذاب کی پیدائش کے اور یہ رابطہ قرآن کی بعض تعبیرات سے سمجھا جا سکتا ہے جن میں قرآن نیک و بد اعمال اور ان کے اچھے برے آثار کے بارے میں فرمایا ہے، کیونکہ انسان کے اس جہان میں اعمال بیج کی طرح ہیں جن کا نتیجہ اور پھل انسان اگلے جہان میں حاصل کرتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی معروف حدیث ہے: "الدنیا مزعة الاخرة" یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور حضرت علیؑ نے بھی فرمایا ہے:

"العمل الصالح حرث الاخرة" [1]

قرآن کریم بھی فرماتا ہے:

من کان یرید حرث الاخرة نزدله فی حرثه [2]

"جو آخرت کی زراعت چاہے ہم اس میں اضافہ کریں گے"

۳۔ منطق و فلسفہ میں معروف قاعدہ ہے: "ذاتی الشی لا یختلف و لا یتخلف" یعنی جو کسی شے کی حقیقت و ذات ہے وہ نہ تبدیل ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے جدا ہوتی ہے یعنی اسے اس کی جگہ سے زائل نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں جیسے انسان اپنی خلقت میں کچھ ذاتی خواص لے کر آتا ہے جو اس سے ہرگز جدا نہیں ہوتے، اس طرح ممکن ہے کہ دائمی کفر و شرک اس کے خواص ثانویہ میں سے ہو جائیں (خصوصاً وہ شرک جو جان بوجھ کر کیا جائے) جو اس سے جدا گانہ ہوگا۔ اور نتیجتاً آخرت میں اسے عذاب ابدی و دائمی ہونے کا موجب بن سکتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱

[2] سورہ شوریٰ، آیت ۲۰

اعمال کا تجسم اور ملکات

یہ مسئلہ اگرچہ اخروی سزا سے تعلق رکھتا ہے لیکن قیامت کے گواہوں کے طور پر بھی اس کا نام لیا جا سکتا ہے کیونکہ جب گناہگار انسان کا کردار اگلے جہان میں مجسم ہو جائے گا تو یہ اس کے جرم پر خود بہترین شاہد ہو گا اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑے گا اگرچہ ہم تجسم اعمال کے بارے میں سابقاً ایک بحث (گناہ سے زیادہ سزا کیوں؟) میں گفتگو کر آئے ہیں اور وہاں پر اس سوال کا جواب بھی دے دیا گیا ہے لیکن چونکہ وہاں پر اس سے بحث ضمناً تھی لہٰذا یہاں مسئلہ تجسم اعمال سے جداگانہ طور پر بحث کرتے ہیں۔

تجسم اعمال کا مقصد کیا ہے؟

سب سے پہلے تجسم اعمال کی حقیقت بیان کرنا ضروری ہے اس کے بعد ہم اس کی دلیلوں اور مدارک کی تحقیق کریں گے۔

تجسم (یا تمثل) کا مطلب یہ ہے کہ نسان نے اس دنیا میں جو کام انجام دیے ہوں گے وہ آخرت میں اسی فعل کی مناسب صورت میں ظاہر ہوں گے۔

بعبارت دیگر یوں کہہ لیں کہ آخرت میں جزا و سزا، نعمت و نقمت، خوشی و غمی اور تکلیف و سختی دنیوی اعمال کے ہی حقائق ہیں جو آخرت میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے نیک ہو یا بد یہ اس کی ایک دنیوی صورت ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہم دنیا میں کرتے رہتے ہیں اور ایک صورت اخروی ہوتی ہے جو ابھی سے اس عمل کے باطن میں موجود ہے قیامت کے دن یہی عمل تحولات و تغیرات کے بعد اپنی دنیوی صورت سے نکل کر اخروی صورت میں ظاہر ہو گا اور اس عمل کے انجام دینے والے کے لیے خوشی و فرحت کا موجب بنے گا یا غم واندوہ کا۔

بنا بریں اس دنیا کے نیک اعمال آخرت میں شکل تبدیل کر کے باغ و چمن، نازک اندام و خوبصورت حوروں اور پر تکلف محلوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور برے اعمال دنیوی شکل بدل کر آگ، زنجیر اور مختلف قسم کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کے اعمال کی جزا بعینہٖ اس کے خود اعمال ہوں گے اور یہ سچی اور صاف حقیقت ہے۔ اس سے بڑا عدل ممکن ہی نہیں کہ انسان کو خود اس کا اپنا عمل لوٹا دیا جائے۔ اسی مطلب کو علمی اصطلاح میں "تجسم اعمال" کا نام دیا جاتا ہے۔

تجسم اعمال جو زیادہ تر انسان کے ظاہری اعضا کے کردار سے مربوط ہو گا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا مسئلہ بھی ذکر کیا جاتا ہے اور وہ انسان کی نیت اور ملکات کا تجسم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی حقیقی صورت اس کی انہی نیتوں، خصلتوں اور نفسانی ملکات کی مرہون منت ہے لہٰذا اگرچہ ظاہری صورت میں سب لوگ یکساں ہیں لیکن ان ملکات اور خصلتوں کے صدقے باطن میں مختلف صورتیں رکھتے ہیں۔

حکیم سبزواری اس بارے میں فرماتے ہیں:

"انسان اخلاق و ملکات کے لحاظ سے یا فرشتہ ہے یا حیوان، درندہ اور شیطان ہے۔ اگرچہ دنیوی شکل میں انسان

سب ایک شکل کے ہیں لیکن اخروی صورتوں کے لحاظ سے چار نوع کے انسان ہوں گے۔ جب انسان پر شہوت و غضب کا غلبہ ہو جائے اور اس کے اعمال ہمیشہ ان دو قوتوں سے صادر ہوں تو اس کی اخروی صورت ایک درندے کی ہوگی اور اگر اس کے وجود پر مکر و فریب کی حکومت ہو اور اس کے اعمال اس کے تابع ہوں تو اس کی اخروی صورت شیطان کی سی ہوگی اور اگر اس کے نفس میں پسندیدہ اخلاق راسخ ہو چکے ہوں تو انسان آخرت میں خوبصورت بہشتی صورتوں میں ظاہر و متمثل ہوگا''[1]

اس بحث کی توضیح کی خاطر ہم دو امور کی تحقیق کرتے ہیں:

۱۔ تجسم اعمال قرآن کی نظر سے اور

۲۔ تجسم اعمال عقل و علم کی نظر سے

سب سے پہلے ہم اس مطلب پر قرآن اور روایات میں وارد ہونے والے مدارک کو ذکر کرتے ہیں۔

تجسم اعمال آیات کی روشنی میں

اس مطلب پر متعدد آیات دلالت کرتی ہیں ان میں چند ایک یہ ہیں:

۱۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ط (ال عمران: ۳۰)

''اس دن ہر شخص نے جو نیک عمل انجام دیا ہوگا اسے اپنے پاس حاضر پائے گا اور اسی طرح جو بد عمل کیا ہوگا اسے بھی حاضر پائے گا اور وہ آرزو کرے گا کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان بہت لمبا فاصلہ ہوتا (یعنی وہ اس برے عمل کو قیامت کے دن مشاہدہ نہ کرتا)[2]

جیسا کہ آپ نے دیکھا آیت کے مطابق خود عمل قیامت کے دن حاضر ہوگا اور انسان اس سے آگاہ ہوگا:

۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ (البقرہ: ۱۷۴)

''جو لوگ تھوڑا سا مال حاصل کرنے کی خاطر آیات الٰہی کو چھپاتے ہیں وہ اپنے پیٹ نہیں بھرتے مگر آگ سے''

---

[1] شرح منظومہ مقصد ۶، فریدہ ۴

[2] سورہ کہف: ۴۹ و تکویر ۱۴ بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ؑ (النساء:۱۰)

''جو لوگ ظلم کے طور پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ حقیقت میں آگ کھاتے ہیں اور عنقریب وہ جہنم میں داخل ہوں گے''

یہ دونوں آیات صریحاً کہہ رہی ہیں کہ جو لوگ آیات الٰہی کو چھپاتے ہیں یا یتیموں پر ظلم کے ساتھ مال حاصل کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ ڈالتے ہیں اور واضح ہے کہ مال کی ظاہری اور دنیوی صورت آگ نہیں تھی بلکہ مختلف دنیاوی لذتوں کی صورت تھی لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس جیسے اموال ایک دوسری صورت بھی رکھتے ہیں جو اب انسان کی ظاہر دیکھنے والی آنکھ سے پنہاں ہے لیکن آخرت میں جب پردے اٹھ جائیں گے اور ''یوم تبلی السرائر'' (مخفی راز ظاہر ہو جائیں گے) کے مطابق اس دن اعمال کا حقیقی چہرہ ظاہر ہو گا اور وہ صرف اور صرف جہنم کی آگ اور خدا کا عذاب ہے۔

اس تفسیر کے مقابل ایک گروہ نے ان آیات کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے جس میں سزا کے طور پر لوگ جلیں گے۔ جبکہ یہ تفسیر آیات کے ظاہری مدلول کے خلاف ہے۔

۴۔ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (حدید: ۱۲)

''اس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اس حال میں دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں جانب چل رہا ہوگا''

اس آیت کی دلالت یہ ہے کہ قیامت کے دن مومنین کا وجود ایک منبع نور کے طور پر ہو گا جو اپنے آپ کو اور اطراف کو روشن کر رہا ہو گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ یہ نور کہاں سے لائے گا؟ اس سوال کا جواب خود ان کے کلام سے سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس وقت منافقین ان سے درخواست کریں گے کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں تاکہ وہ بھی ان کی روشنی میں چلیں وہ منافقوں سے کہیں گے:

ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ (حدید: ۱۳)

''واپس (دنیا کی طرف) لوٹ جاؤ اور اپنے لیے نور لے آؤ''

یعنی ہم نے یہ نور دنیا میں حاصل کیا تھا اگر تم بھی ایسا کر سکتے ہو تو دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور اپنے لیے نور حاصل کر لاؤ۔

اب کس طرح یہ نور دنیا میں حاصل ہوا؟ اس میں دو احتمال ہیں:

ا۔ ان کی بلند شخصیت (اطاعت وعبادت کے نتیجہ میں) موجود خوبصورت ملکات وصفات کی صورت اختیار کر چکی ہے اور آخرت میں نور

کی صورت میں تجلی کرے گی۔

۴۔ ان کے صالح اعمال اور نیک صفات غلبہ پا چکی ہیں جو نور کی صورت میں مجسم ہوں گی۔

۵۔ جو لوگ سونے چاندی کو ذخیرہ کرتے ہیں اور انہیں معاشرے کی ترقی میں خرچ نہیں کرتے۔ قرآن انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہی ذخائر آخرت میں سرخ ہو جائیں گے اور تمہاری پیشانیوں پشتوں اور پہلوؤں پر لگائے جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾ (توبہ: ۳۴، ۳۵)

''جو لوگ سونا، چاندی اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دو۔ وہ دن جب سونا اور چاندی آگ میں سرخ ہو جائیں گے اور ان کے ذریعے ان کی پیشانیوں پشتوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔ انہیں کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم نے ذخیرہ کیا تھا اب اس کا مزہ چکھو''۔

آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ''ھذا ما کنزتم لانفسکم فرمایا یعنی یہ عذاب اور آگ وہی کچھ ہے جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا گویا سونا، چاندی، دو جہانوں (دنیا و آخرت) میں دو صورتیں رکھتے ہیں دنیا میں تو دھات کی صورت میں ہیں لیکن آخرت میں دردناک عذاب کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (ال عمران: ۱۸۰)

''جو لوگ جو کچھ خدا نے انہیں اپنے فضل و کرم سے عطا کیا ہے اس میں بخل کرتے ہیں گمان کرتے ہیں کہ یہ بخل کرنا ان کے لیے بہتر ہے حالانکہ یہ کام ان کے لیے بہت برا ہے، بہت جلدی قیامت کے دن وہی چیز جس کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہ ان کے گلے کا طوق بن جائے گی''۔

یہ آیت بھی پہلی آیت کی طرح دلالت کر رہی ہے کہ انسان نے حکم الٰہی کے خلاف جو مال اکٹھا کیا ہوگا قیامت کے دن طوق کی صورت میں مجسم ہو جائے گا اور بخیلوں کے لیے عذاب کا ذریعہ بن جائے گا۔

۷۔ جناب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ (لقمان: ۱۶)

''بیٹا! (انسان جو کام بھی کرتا ہے) اگرچہ وزن میں رائی کے ایک دانے کے برابر ہو جو کسی چٹان پر گرا ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو خدا قیامت کے دن اسے لے آئے گا''

اس آیت کا ظہور بھی یہی ہے کہ قیامت کے دن خدا خود عمل کو لے آئے گا اور اسی کو عذاب و جزا کا معیار بنائے گا۔

۸۔ اسی حقیقت کو ایک دوسری آیت میں اور طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزله: ۷،۸)

''جس نے ذرہ برابر نیک کام کیا ہوگا اس کی جزا پالے گا اور جس نے ذرہ برابر برا کام کیا ہوگا اس کی سزا پالے گا''

اس آیت میں قابل توجہ لفظ ''یرہ'' ہے اور اس کی ضمیر منصوب کلمہ عمل (جو ''یعمل'' سے حاصل ہوتا ہے) کی طرف لوٹتی ہے یا یہ ضمیر خیراً اور شراً کی طرف لوٹ رہی ہے دونوں صورتوں میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آخرت میں اپنے عمل کو دیکھے گا اور جو لوگ کہتے ہیں کہ عمل کی جزا و سزا کو دیکھے گا وہ آیت کو خلاف ظاہر پر محمول کرتے ہیں۔

۹۔ قرآن ان چیزوں کے بارے میں جن کے ذریعے دوزخ کی آگ بھڑکے گی یوں ارشاد فرماتا ہے:

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ (البقرہ: ۲۴)

''اس جہنم کی آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے [1]''

قرآن کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ (آل عمران: ۱۰)

''جنہوں نے کفر کیا قیامت کے دن ان کے مال اور ان کے فرزند انہیں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکیں گے اور وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے''

---

[1] یہی آیت کچھ اختلاف کے ساتھ سورہ تحریم میں بھی آئی ہے۔ آیت نمبر ۶

یہی تنبیہ ایک اور آیت میں بھی آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ۝۹۸

(الانبیاء: ۹۸)

”خود تم اور جن کی تم خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن بنو گے اور جہنم میں داخل ہو گے“

ان آیات کا ظہور اس میں ہے کہ جہنمی خود آگ بھڑکنے کا موجب بنیں گے یعنی کفر و شرک اور گناہوں کے نتیجہ میں نفس میں راسخ رذیل ملکات قیامت کے دن خاص شرائط میں آگ بھڑکانے والے مادے کی صورت اختیار کر جائیں گے۔

۱۰۔ جزائے اعمال کے بارے میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں جن کا ظہور یہ ہے کہ جو اعمال کسی نے دنیا میں انجام دیے ہوں گے وہی آخرت میں اس کی جزا بنیں گے، ہم ان آیات میں سے چند ایک کو ذکر کرتے ہیں:

(الف) وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۹۰ (نمل: ۹۰)

”جو قیامت کے دن گناہ کے ساتھ محشر میں آئیں گے وہ منہ کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے اور یہ صرف تمہارے اعمال کی جزا ہوگی“۔

یعنی دوزخ میں ان کی بری حالت درحقیقت ان کے برے کاموں کا تجسم ہوگی۔

(ب) فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۵۴

(یٰسین: ۵۴)

”آج (قیامت کے دن) کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمہاری جزا نہیں ہے مگر وہ اعمال جو تم نے دنیا میں انجام دیے“[1]

۱۱۔ تجسم اعمال پر صریحاً دلالت کرنے والی آیات میں سے ایک آیت یہ بھی ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۝۲۲ (ق: ۲۲)

[1] اس بارے میں بہت آیات وارد ہوئی ہیں مثلاً صافات: ۳۹، جاثیہ: ۲۸، طور: ۱۶، تحریم: ۷، قصص: ۸۴، اعراف: ۱۴۸۔۱۸۰، اور سبائی: ۳۳

''(گناہگار سے کہا جائے گا) تم اس دن سے غافل تھے ہم نے تمہارے آگے سے غفلت کا پردہ اٹھا دیا آج تمہاری نظر تیز ہے پس تم حقائق کا ادراک کر سکتے ہو''

''غفلت'' اور ''کشف غطا'' کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک چیز مسلسل انسان کے ہمراہ دنیا میں تھی جس سے وہ غافل تھا قیامت کے دن غرور کا پردہ اٹھ جائے گا اور وہ چیز دیکھی جا سکے گی۔

بنابریں اعمال کی اس دنیوی صورت کے پیچھے ایک اخروی صورت بھی ہے دنیوی ماندگی زندگی میں مشغول اور حقائق غیبی سے بے خبر انسان جس سے مکمل طور پر غافل ہے لیکن آخرت میں اس کا مشاہدہ کرے گا، مگر افسوس اس وقت یہ تنبیہ و تذکر اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾ (فجر: ۲۳)

''اس دن انسان اپنے اعمال کے حقائق سے باخبر ہوگا لیکن اس کا اب کیا فائدہ''

تجسم اعمال روایات کی نظر میں

قرآن کے ساتھ ساتھ مسئلہ تجسم اعمال روایات میں بھی بہت آیا ہے۔ ہم کچھ روایات کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے'' اتقوا الظلم فانه ظلمات یوم القیامة''[1]

اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ قیامت کے دن خود ظلم تاریکی میں مجسم ہوگا۔

۲۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

واعمال العباد فی عاجلهم نصب اعينهم فی اجلهم (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۶)

''انسان جو کام دنیا میں کریں گے قیامت کے دن وہی ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوں گے''

البتہ یہ روایت تب مطلب پر دلیل بن سکے گی کہ یہ جزا و سزا اعمال سے مربوط ہو نہ کہ افعال کے حساب و کتاب سے۔

۳۔ ابوبصیر کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ

من اكل مال اخيه ظلماً و لم يرده اليه اكل جزوة من النار يوم

[1] کافی جلد ۱، کتاب الایمان والکفر روایت ۹۔۱۱

القیامة (کافی جلد ۱، کتاب الایمان والکفر، روایت ۱۵)

''جس نے ظلم کے ساتھ اپنے بھائی کا مال کھایا اور اسے نہ لوٹایا اس نے قیامت کے دن آگ کا ٹکڑا کھایا ہے یعنی جس میں ظلم کے ساتھ تصرف کیا وہ قیامت میں جہنم کی آگ کی صورت میں مجسم ہوگا اور غاصب کو عذاب کرے گا۔

۴۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جبریل پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور ان سے کہا:

عش ماشئت فانك ميت واحبب ماشئت فانك مغارقه و اعمل ماشئت فانك ملاقيه (الكافی جلد ۳، ص ۲۵۵)

''جیسے چاہو زندگی گزارو سرانجام تمہیں مرجانا ہے اور جس سے چاہو محبت کرو سرانجام اس سے جدا ہو جاؤ گے اور جو کچھ انجام دینا چاہتے ہو دو بتحقیق قیامت میں تم اس سے ملو گے۔

اس روایت میں ہمارے مدعا کے لیے شاہد آخری جملہ ''واعمل ماشئت فانک ملاقیہ''یعنی جو کچھ تم دنیا میں اعمال انجام دو گے قیامت کے دن انہیں دیکھو گے۔

جو روایات قبر اور عالم برزخ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انہیں بھی تجسم اعمال پر دلیل سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ ان روایات میں بھی یہی ذکر کیا گیا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کے ساتھی اس کے اعمال ہی ہوں گے جو اس کی خوشی یا غمی کے موجب بنیں گے اور وہی اس کی برزخی سعادت یا شقاوت ہوں گے۔ ہم کچھ کو ذکر کرتے ہیں۔

۵۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: ''جب کسی مومن کو قبر میں رکھتے ہیں تو عالم غیب کا ایک دروازہ اس پر کھل جاتا ہے اور وہ جنت میں اپنی جگہ دیکھ لیتا ہے اس وقت وہ ایک انتہائی خوبصورت مرد کو دیکھے گا جس سے زیادہ خوبصورت اس نے نہ دیکھا ہوگا وہ اس سے پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہے گا:

انا رایك الحسن الذی كنت عليه و عملك الصالح الذی كنت تعمله

''یعنی میں تمہارا اچھا عقیدہ اور عمل صالح ہوں''

امام نے فرمایا کافر بھی اپنے بدعمل کو انتہائی بدشکل دیکھے گا (کافی جلد ۳، ص ۲۴۱)

۶۔ ایک اور روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے کہ جب لوگ قبروں سے باہر آئیں گے تو جو عمل بھی کسی نے دنیا میں انجام دیا ہوگا اس کے ہمراہ ہوگا کیونکہ اعمال قبر میں ہمیشہ اس کے ہمراہ تھے۔ (تفسیر برہان جلد ۴، ص ۷۸)

۷۔ ایک حدیث میں امام صادقؑ فرماتے ہیں: ''جب مومن قبر سے باہر آئے گا اس کے ساتھ ایک شکل ہوگی جو مسلسل اس کو خوش کرے گی

اور بزرگواری و کرامت کی بشارت دے گی اور مضطرب کر دینے والے مقامات پر اسے تسلی دے گی۔ یہاں تک کہ اسے جنت کی خوشخبری دے گی۔ اس وقت مومن اس سے پوچھے گا تم کون ہو جو اس طرح ان ہولناک مقامات پر میرے ساتھ رہی ہو؟ وہ جواب میں کہے گی:

انا السرور الذی کنت تدخله علی اخوانك فی الدنیا خلقت منه لا بشرك واونس وحشتك (بحار جلد، باب ۸، روایت ۲۹)

''میں وہ سرور و خوشی ہوں جو تم اپنے بھائیوں کو دنیا میں عطا کرتے تھے۔ خدا نے مجھے خلق کیا ہے تاکہ تمہارے ساتھ رہوں اور تمہیں رحمت الٰہی کی بشارت دوں''۔

۸۔ محاسن میں ابو بصیر امام محمد باقر یا امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ جب مومن کو قبر میں رکھتے ہیں تو چھ صورتیں اس کے ساتھ قبر میں داخل ہوں گی جو ایک دوسرے سے بڑھ کر خوبصورت ہوں گی۔

ایک دوسری سے پوچھے گی کہ تم کون ہو؟ دائیں طرف والی صورت کہے گی میں نماز ہوں۔ بائیں طرف والی کہے گی میں زکوۃ ہوں، سامنے والی صورت کہے گی، میں روزہ ہوں، پیچھے والی صورت کہے گی میں حج و عمرہ ہوں اور جو صورت اس کے پاؤں کے نزدیک ہوگی کہے گی کہ میں اس کی نیکیاں ہوں۔ ایک صورت سب سے برتر ہوگی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ تم کون ہو تو وہ کہے گی: میں اہل بیت پیغمبرؐ کی ولایت ہوں۔ (محاسن برقی، جلد ۱، ص ۲۸۸)

۹۔ پیغمبر اکرمؐ قیس ابن عاصم کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انه لا بد لك یا قیس من قرین یدفن معك و هو حی و تدفن معه و انت میت فان کان کریماً اکرمك و ان کان لئیماً اسلمك ثم لا یحشر لا معك و لا تبعث الا معه و لا تسئل الا عنه فلا تجعله الا صالحاً (امالی الصدوق۔ مجلس اوّل حدیث ۴)

''اے قیس! ضروری ہے کہ ایک زندہ ساتھی تمہارے ساتھ دفن کیا جائے اگر وہ کریم ہوا تو تمہیں بھی احترام و کرامت عطا کرے گا اگر وہ پست ہوا تو تمہیں بھی مشکلات کے سپرد کر دے گا۔ وہ ساتھی تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ دفن نہیں ہوگا اور اس کے علاوہ تجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں ہوگا۔ پس صالح ساتھی بناؤ''

تجسم اعمال عقل و علم کی روشنی میں

یہاں تک تجسم اعمال پر نقلی دلیلوں کا ذکر تھا ان تمام کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ معارف قرآن اور اسلامی عقائد کی خصوصیات میں سے ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اگرچہ ہماری کم مائیگی کی وجہ سے اس کا ادراک کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اب ہم اس مسئلے کو عقلی و علمی معیاروں پر پرکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ عقلی اصولوں کے پیش نظر کسی ایسے مسئلے کا قبول کرنا کوئی اشکال رکھتا ہے یا نہیں؟ اور کیا انسانی علم و دانش کی بنیادوں پر اس مسئلے کا واضح تصور کیا جا سکتا ہے اور اس پر شواہد قائم کیے جا سکتے ہیں؟

چند مفسرین اور متکلمین کے نظریات

بعض اسلامی مفسر و متکلم تجسم اعمال کو ناممکن سمجھتے ہیں اور اس پر دلالت کرنے والی تمام آیات و روایات کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں۔ ان کی اس بات پر اہم دلیل صرف یہ ہے کہ انسان کے اعمال مقولہ اعراض سے متعلق ہوتے ہیں اور اس کی بنیاد پر تجسم اعمال کے نظریے پر دو اشکال ہوتے ہیں:

۱۔ عرض اپنے وجود میں غیر کے ساتھ قائم ہوتا ہے لہٰذا انسان سے ظاہر ہونے کے بعد اعمال نابود ہو جاتے ہیں لہٰذا بعد میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کا اعادہ کیا جائے۔

۲۔ تجسم اعمال کے نظریے کی بنا پر خود اعمال کسی دوسرے جوہر کے توسط کے بغیر موجود ہوتے ہیں جو ناممکن بات ہے۔

طبرسی مرحوم آل عمران: ۳۰ کے ذیل میں یوم تجد کل نفس ماعملت من خیر محضرا فرماتے ہیں:

''قیامت کے دن عمل کے حضور کی کیفیت میں مختلف نظریات ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اعمال کے دفاتر ہیں جو لکھتے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اعمال کی جزا و سزا ہے اور خود اعمال چونکہ مقولہ عرض سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا انجام پانے کے بعد معدوم ہو جاتے ہیں اس لیے ان کا اعادہ ممکن نہیں ہے پس ان کا حاضر ہونا بھی قیامت میں محال ہوگا''۔ [1]

علامہ مجلسی تجسم اعمال کے بارے میں شیخ بہائی کا نظریہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس دنیا میں عرض کا جوہر میں بدلنا محال ہے اور آخرت میں اسے ممکن سمجھنا ایک قسم کی غلط فہمی ہے کیونکہ دنیا و آخرت کی دونوں خلقتوں میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ موت اور دوبارہ احیا نے ان میں فاصلہ ایجاد کر دیا ہے اور یہ چھوٹا سا فرق دونوں کے احکام میں فرق کا موجب نہیں بن سکتا''۔ [2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱، ص ۴۱۳

[2] بحار جلد ۷، ص ۲۲۹

گویا نظریہ تجسم اعمال کے مخلفین نے دو دلیلوں کا سہارا لیا ہے:

۱۔ اعمال کا تعلق مقولہ اعراض سے ہے جو انسان سے صادر ہونے کے بعد معدوم ہو جاتے ہیں اب کوئی چیز رہی نہیں جو آخرت میں مجسم ہو۔

۲۔ تجسم اعمال یعنی عرض کا جوہر میں تبدیل ہونا انقلاب ہے جو محال ہے۔

تحقیق وتنقید

حق یہ ہے کہ ان دونوں اشکالات میں سے نظریہ تجسم اعمال پر ایک بھی وارد نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے عقلی براہین سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو چیز ایک دفعہ موجود ہو جائے وہ پھر معدوم نہیں ہوتے جس ظرف میں وہ متحقق ہوتی ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے کیونکہ اس مرحلے میں اس کا معدوم ہونا اجتماع وجود وعدم کا موجب ہے جو محال ہے۔ اس کے علاوہ قرآن صریحاً کہہ رہا ہے کہ ہر چیز امام مبین میں ثابت ہے اور باقی ہے اور اعمال انسان بھی اسی کلیہ میں داخل ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ﴿٦١﴾ [1] (یونس: ۶۱)

''تمہارے رب سے کوئی چیز غائب نہیں چاہے ذرہ برابر ہو، زمین میں ہو یا آسمان میں اس سے چھوٹی یا بڑی وہ کتاب مبین میں ثبت ومحفوظ ہے''

بنابریں پہلا اشکال ختم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اعمال معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کا اعادہ ممکن نہیں۔ اس طرح دوسرا اشکال بھی صحیح نہ رہے گا کیونکہ اگرچہ ہم معاد جسمانی کے قائل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیوی نظام سے مربوط تمام قوانین اخروی زندگی میں جاری ومنطبق ہوں گے اور ان دو زندگیوں میں صرف موت اور دوبارہ احیا کا فرق ہے۔ یہ صحیح نہیں چونکہ قرآن صریحاً کہہ رہا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾

(ابراھیم: ۴۸)

''جس دن زمین وآسمان اس سے علاوہ میں تبدیل ہو جائیں گے اور انسان قبروں سے نکل کر خدا کے سامنے حاضر ہو جائیں گے''۔

نیز بہت سی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام اُخروی کے اپنے کچھ مخصوص قوانین واصول ہیں۔

البتہ کچھ مخصوص عقلی قوانین ہیں مثلاً دو نقیضوں کا اجتماع یا ارتفاع محال ہے یا ایسے امور ہیں جو دنیوی یا اُخروی زندگی سے مختص نہیں

---

[1] تھوڑے سے فرق کے ساتھ سبا: ۳، نمل: ۷۵

ہے لیکن کچھ ایسے قوانین ہیں جو خالص عقلی قوانین نہیں ہے بلکہ اسی دنیا کے حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد حاصل ہوئے ہیں ممکن ہے وہ قوانین اس طرح ہوں کہ آخرت میں ان میں سے کچھ جوہر ہوں اور کچھ عرض ہوں اور اعراض اپنی ہستی و تحقق میں جوہر کے محتاج ہیں اپنے آپ قائم نہیں ہو سکتے۔ اب اگر زندگی کی شرائط بدل جائیں تو کیا مانع ہے کہ جو چیز اس جہان میں عرض تھی اپنے پاؤں پر قائم نہیں ہو سکتی تھی اخروی نظام میں اپنے آپ پر قائم ہو اور آگ اور زنجیر یا باغ اور حور کی صورت میں مجسم ہو جائے۔

مندرجہ بالا مطلب تجسم اعمال کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جیسا کہ سابقاً بھی اشارہ ہو چکا ہے آخرت کے تمام حقائق مثلاً صراط، میزان اور اعراف وغیرہ میں بھی جاری ہے اور ان چیز کی توجیہ کے لیے دنیوی نظام کو معیار نہیں بنانا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عقلی لحاظ سے کوئی اشکال نہیں کہ اعمال آخرت میں تجسم پائیں۔ یہاں پر مناسب یہ ہے کہ کچھ صاحب نظر حضرات کے نظریات بھی ذکر کیے جائیں۔

ا۔ آخرت میں تجسم اعمال و ملکات کے بارے میں صدر المتالہین فرماتے ہیں:

جب کوئی صفت انسانی نفس میں غالب ہو جائے اور رسوخ پیدا کر لے تو اس کے آثار قہری طور پر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں لیکن دنیا و آخرت میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دنیا چونکہ حاصل کرنے اور کچھ پانے کا گھر ہے لہٰذا اس میں ممکن ہے کہ رذیل ملکات اچھے و با فضیلت ملکات میں بدل جائیں لیکن آخرت حاصل کرنے کا گھر نہیں ہے جیسا کہ قرآن بھی فرماتا ہے۔ (انعام: ۱۵۸)

لہٰذا انسان جس صفت و ملکہ کے ساتھ قیامت کے دن محشور ہو گا اس صفت یا ملکہ کے آثار کا ظہور قہری ہو گا اور اس طرح کہ اخروی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر مجسم ہو جائے گا۔ اس کے بعد صدر المتالہین اس مطلب کی وضاحت کے لیے ایک مثال ذکر کرتے ہیں کہ ماہیت رطوبت جسم میں ایک خاص اثر رکھتی ہے اور حسی و خیال ادراکی قویٰ میں یہ اور طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور ادراک عقلی کے نشاۃ میں ایک دوسری صورت میں ظاہری ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

جو بصیرت کے ذریعے فیصلہ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے جو کچھ ہم نے ذکر کر دیا ہے تاکہ وہ ایمان لے آئے اس پر جو خدا اور رسولؐ نے فرمایا کہ اخروی صورتیں عقائد حقہ اور باطلہ یا نیک و بد اعمال کا نتیجہ ہیں اگرچہ شخص خود اہل مکاشفہ و عرفان سے نہ ہو اور ان حقائق کو خود ادراک نہ کر سکے۔ [1]

البتہ جو تفصیلی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہوں اور لذت آور صورتوں یا تکلیف دہ صورتوں کے بارے میں خدا کے وعدہ و وعید کے پورا ہونے کی کیفیت کو جاننا چاہتے ہوں انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو دنیوی علائق سے آزاد کر دیں۔ عالم غیب کے ساتھ زیادہ رابطہ برقرار رکھیں نیز اپنی نفسانی صفات میں زیادہ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ ان کے آثار اس دنیا میں کس طرح کے ہیں تاکہ انہیں آخرت میں ان آثار کے تحقق کی کیفیت معلوم ہو جائے مثلاً جب کسی کو غصہ آتا ہے تو یہ صفت اگرچہ اس کے ملکوتی پہلو اور روح سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کے آثار اسی عنصری

---

[1] کلا لو تعلمون علم الیقین الترون الجحیم (تکاثر: ۵-۶)

بدن میں ظاہر ہوتے ہیں اس کا خون جوش میں آ جاتا ہے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے بدن گرمی سے جلنے لگتا ہے یہ سب اس کے ملکوتی و مادی پہلو سے متعلق ہے۔اب بعید نہیں ہے کہ یہی ناپسندیدہ صفت آخرت میں آتش جہنم کی صورت میں مجسم ہو جائے اور غصہ کرنے والے کو جلائے۔یہیں سے تمام نفسانی صفات رذیلہ نیز ملکات حمیدہ کے بارے میں حکم کیا جا سکتا ہے اور ان کے اخروی تجسم وصدور آثار کی کیفیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ای دریدہ پوستین یوسفان

گرگ برخیزی ازین خواب گراں

گشتہ گرگان ہر یکی خوھای تو

می درانند از غضب اعضای تو [۱]

''اے یوسفوں کے پیراہن پھاڑنے والے! تم اس سخت نیند سے بھیڑیے کی صورت میں اُٹھو گے تمہاری ہر ایک عادت بھیڑیا ہو چکی ہے جو غصے سے تمہارے اعضاء کو چیر ڈالیں گے''۔

۲۔ نامور اسلامی عارف وفقیہ جناب شیخ بہاءالدین عاملی اس بارے میں فرماتے ہیں:

بہت سی شیعہ وسنی روایات میں تجسم اعمال کا مسئلہ مذکور ہے۔اس کے بعد قیس بن عاصم کی مذکورہ روایت نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض اہل دل کہتے ہیں:

قبر اور قیامت کے سانپ، بچھو اور آگ درحقیقت انسان کے اچھے اور بُرے اعمال وعقائد ہی ہیں جو اُخروی نشاۃ میں اس طرح ظاہر ہوں گے۔اسی طرح حور وقصور اور روح وریحان بھی اس کے وہی اخلاق حسنہ ونیک اعمال اور عقائد حقہ ہیں جو آخرت میں اس طرح ظاہر ہوں گے۔کیونکہ ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف نشاتوں میں مختلف آثار رکھتی ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آیت ''ان جھنم لمحیطۃ بالکفرین'' میں محیطۃ کے معنی زمان استقبال کے نہیں ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ابھی سے جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے کیونکہ باطل عقائد اور بُرے اعمال اسی نشاۃ میں ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور یہی حقیقت میں ان کے لیے جہنم ہیں جو آخرت میں سانپ، بچھو اور آگ کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ [۲]

اس کے بعد وہ کچھ آیات وروایات نقل کرتے ہیں جن کا ہم پہلے تذکرہ کر آئے ہیں۔

۳۔ حکیم سبزواری کا کلام اسی بحث کے ابتدا میں نقل ہو چکا ہے رجوع کیا جائے۔

---

[۱] مبدء ومعاد ص ۳۴۱ تا ۳۴۳

[۲] بحار جلد ۷، ص ۲۲۸

اعمال کا تجسم اور بشر کا علم امروز

باوجود یہ کہ بہت سی نقلی دلیلیں تجسم اعمال کے وقوع پر شاہد ہیں لیکن تجسم اعمال کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے آج کے سائنسی علوم سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اس دقیق عقلی اور دینی مسئلے کو اس طرح سے بھی سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مادہ و توانائی کے بارے میں جدید نظریہ یہ ہے کہ مادہ و قوت ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں اور مادہ متراکم اور تہ بہ تہ ایسی قوتوں ہی سے عبارت ہے جو کچھ معین شرائط میں توانائی ہی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی ایک گرام مادہ میں متراکم توانائی تیس ہزار ٹن ڈائنامیٹ کے دھماکے کی قوت کے برابر ہوتی ہے۔ ایک گرام مٹی میں اتنی قوت پوشیدہ ہے جو ایک بجلی کے بہت بڑے کارخانے کے ایک سال کے محصول کے برابر ہے یہی مادہ انبساطی صورت میں طاقت و قوت بنتا ہے اور اگر حالت انبساط نہ رکھتا ہو تو تہ بہ تہ صورت میں صرف ایک جسم بن کر رہ جاتا ہے۔

۱۹۰۵ء عیسوی میں آئن سٹائن نے فرضیۂ تسبیت کو کشف کیا اور انتہائی چھوٹے ذرات جن کو ایک دورے سے غیر مربوط سمجھا جاتا ہے۔ ان کے درمیان رابطے کو اجاگر کیا اور یہ بتایا کہ ایٹمز اور توانائی ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ [۱]

''بقائے توانائی'' ایک بنیادی قانون ہے جو مشاہدے کی بنا پر تمام طبیعی امور میں برقرار ہے اور ان کے لیے بقائے توانائی کو لازمی قرار دیتا ہے یعنی عالم طبیعت میں جتنی تبدیلیاں پیش آئیں مجموعی توانائی تبدیل نہیں ہوتی توانائی ممکن ہے مختلف صورتوں میں وجود رکھتی ہو جو ثقلی توانائی، متحرک توانائی، حرارتی توانائی، برقی توانائی کیمیائی توانائی، شعاعی توانائی اور ایٹمی توانائی کی صورتوں میں ہوتی ہے۔ [۲]

انسان میں کام کی حقیقت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان جو خود اس مادی کائنات کا ایک جزء ہے اس میں کام کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر کام (نیک کام ہو یا بد) کے لیے اپنے بدن کے ذخائر جو توانائی کی صورت میں موجود ہیں کو خرچ کرتا ہے مثلاً اگر نماز پڑھتا ہے تو درحقیقت نماز کے تمام وقت میں اس کا کچھ حیاتی مادہ توانائی کی صورت میں خرچ ہو رہا ہوتا ہے اور اگر وہ کسی بے گناہ انسان پر کوڑے برساتا ہے تو یہ اس طریقے سے اپنے بدن کا کچھ مواد خرچ کر رہا ہوتا ہے اور اسی قبیل سے اس کے فکری و اندرونی کام بھی ہیں۔

مندرجہ بالا مطالب سے درج ذیل نکات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ انسان میں کام کی حقیقت مادہ کا توانائی میں تبدیل ہونا ہے۔

۲۔ آج کی سائنس کے مطابق توانائی کی ایک مقدار ہمیشہ ثابت رہتی ہے۔

---

[۱] چہ می دانم۔ زندگی و مرگ ستارگان، ص ۴۴

[۲] دائرۃ المعارف برٹانیکا، ص ۸۹۴، جلد ۶ مطابق نقل معاد از نظر روح و عقل

۳۔ جیسے مادہ توانائی میں تبدیل ہوتا ہے اسی طرح خاص شرائط میں توانائی بھی مادہ بھی بدل جاتی ہے۔
ان مذکورہ مقدمات کا طبیعی و منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے اعمال (جو مادہ سے توانائی میں بدل گئے تھے) قیامت کی خاص شرائط میں ممکن ہے مادہ میں بدل جائیں جیسا کہ اس دنیا میں یہ تبدیلی نہ صرف ممکن ہے بلکہ سائنس کی رو سے عالم طبیعت کے حقائق میں سے ہے۔[۱]
بنا بریں مسئلہ تجسم اعمال قرآن کے عمیق ترین بلند معارف میں سے ہے اگرچہ اس کا ادراک ظاہر بین افراد کے لیے مشکل یا ناممکن ہے لیکن صدرالمتالہین جیسے مفکر نفس انسانی کے عمیق مطالعے اور مسلم فلسفی اصول کی بنا پر اس کا ادراک کر چکے ہیں۔ البتہ آج کی سائنس بھی اس حقیقت کے ادراک میں انسان کے لیے معاون ثابت ہو سکتی ہے۔
البتہ یہ حقیقت بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ آخرت سے مربوط حقائق کا تعلق غیبی حقیقتوں سے ہے جن کا کامل طور پر ادراک مادی حصار میں محبوس و محصور بشر کے لیے ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ اس بشر کا عالم غیب کے ساتھ مستحکم رابطہ ہو اور وہ اُخروی حقائق کا قریب سے مشاہدہ کر سکے لیکن ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔

دو سوال اور ان کا جواب

۱۔ یہاں ایک دقیق سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ مسئلہ تجسم اعمال عقلی و علمی طور پر کاملاً امکان پذیر ہے اور کچھ آیات و روایات کی دلالت یہی ہے کہ جزا و سزا درحقیقت اعمال و ملکات نفسانی ہی کا تجسم ہے لیکن اس کے مقابل کچھ روایات و آیات کی دلالت یہ ہے کہ اُخروی جزا و سزا وضعی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی حکمت کی بنیاد پر مختلف گناہوں کے لیے مختلف سزائیں معین فرماتا ہے اور اسی طرح اپنی رحمت و تفضّل کی بنا پر عبادات و اطاعات پر جزا معین فرماتا ہے؟

جواب

مسئلہ قیامت اور اس سے مربوط حقائق کے بارے میں ہمیں اپنے ذہن میں مطالب کو گھڑ کر اس بارے میں آنے والی آیات و روایات کی تفسیر کا معیار نہیں بنانا چاہیے بلکہ قرآنی آیات اور وقائع قیامت کے سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے اور اس لحاظ سے کہ قرآن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔[۲] اور قرآن کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں۔[۳] اس کا قطعی نتیجہ یہ ہے کہ واقعیت و حقیقت ایک ہے اور یہ اختلافات اس واقعیت کے مختلف اطراف و جوانب سے مربوط ہے۔ اس بنیاد پر کہنا یہ چاہیے

---

[۱] اس کے لیے مجلہ مکتب اسلام شمارہ ۴، معاد انسان و جہان، ص ۳۳۹ اور معاد از نظر روح و جسم جلد ۲، ص ۱۲۰ تا ص ۱۴۶ کی طرف رجوع کریں۔
[۲] افلا یتدبرون القراٰن و لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (نساء: ۸۲)
[۳] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۳

کہ آخرت سے مربوط آیات وروایات کے بارے میں طریق وحی کے علاوہ قطعی اظہار خیال کرنا ناممکن ہے۔لہٰذا ہم یہ کہیں گے کہ ہر دو قسم کی جزاوسزا وقوع پذیر ہوگی اور کوئی مانع نہیں ہے کہ تجسم اعمال والی جزاوسزا کے ساتھ ساتھ جعلی ووضعی جزاوسزا بھی ہو جسے خدا تعالیٰ اپنے علم وحکمت اور فضل ورحمت کی بنیاد پر مقرر فرماتا ہے۔

۲۔ اگر اخروی سزائیں گناہوں کا تجسم ہوں تو گناہوں کو ختم کرنے والی چیزوں مثلاً شفاعت وغیرہ کی کیا توجیہ کی جائے گی کیونکہ تجسم اعمال کی بنیاد قانون علیت ومعلولیت ہے یا کام اور اس کا نتیجہ۔جبکہ شفاعت وغیرہ اسی صورت میں ممکن الوجود ہو سکتے ہیں کہ سزائیں جعلی ووضعی ہوں جیسا کہ اس دنیا میں بھی قابل معافی وہی سزائیں ہیں جو جرائم پر وضعی وجعلی قرار دی جاتی ہیں جبکہ جرائم کے وضعی آثار قابل بخشش نہیں ہیں مثلاً جو شخص مست کرنے والی شراب پیتا ہے اس کی قراردادی سزا سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے لیکن اس کا تکوینی اثر یعنی شرابی کا مست ہونا نا قابل بخشش نہیں ہے؟

جواب:

آیات وروایا سے جو کچھ اس بارے میں معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نیک اعمال ہوں یا بد آخرت میں خاص شرائط کے تحت دنیاوی صورت چھوڑ کر ایک دوسری صورت اختیار کر لیں گے جو ان کے کرنے والے کی خوشی یا غمی کا موجب بنیں گے۔یہ وہ قانون ہے جسے خالق کائنات نے استوار کیا ہے لیکن اس قانون کے ساتھ دوسرے قوانین بھی اس نے استوار کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ تجسم صرف کچھ معین شرائط میں انجام پائے گا۔اور واضح ہے کہ ان دو قسم کے قوانین میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

بالفاظ دیگر یہ دو قانون ذاتاً امکان رکھتے ہیں صرف ضرورت اس کی ہے کہ یہ دونوں قانون عدل وحکمت کی بنیاد پر استوار ہوں اور چونکہ یہ قوانین بنانے والا خداوند حکیم وعلیم وعادل ہے۔لہٰذا یہ شرط بھی ان میں یقیناً پائی جاتی ہے۔

یا یوں کہہ لیں کہ جو کچھ اس دنیا میں یا آخرت میں انجام پاتا ہے۔اس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ کی حکیمانہ مشیت ہے۔جیسے اس کائنات میں قانون علیت ومعلولیت خاص شرائط کی بنیاد پر مبنی ہے۔آخرت کے نظام میں بھی ایسا ہی ہے۔جیسے توبہ موت کے پہنچنے سے پہلے آخرت میں گناہ کے تجسم سے مانع ہو جاتی ہے۔اسی طرح شفاعت بھی آخرت میں ان کے تجسم سے مانع ہو جائے گی اور یہ بھی ایک قانون ہے جو خداوند حکیم کا وضع کردہ ہے۔

قیامت میں لوگوں کے مختلف حالات

معاد سے مربوط ابحاث مختلف ہیں۔ بعض کو تو عقلی برہان کی بنیاد پر وضاحت کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے جیسے مسئلہ امکان ولزوم معاد اور بعض کو صرف وحی کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا۔ دوسری قسم کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ وہ مسائل جن کی کیفیت کا عقل ادراک کر سکتی ہے جیسے صراط، میزان، حساب اور جزا و سزا سے متعلق بحثیں۔

۲۔ وہ مسائل جن کی حقیقت کی طرح ان کی کیفیت کا ادراک بھی بشر کی قدرت سے خارج ہے۔ ان مسائل پر اعتقاد ایمان بالغیب کا مشخص ترین مصداق ہے اور یہی وہ آیات وروایات ہیں جو انسان کی محشر میں حالت اور جنت وجہنم میں ورود کی کیفیت بتاتی ہیں۔

اس بارے میں قرآن میں بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں اور واضح ہے کہ قرآن کا اس نکتے پر اتنا اصرار کسی حکیمانہ سبب کی وجہ سے ہے جو قرآن کے اصلی ہدف کو پورا کرتا ہے۔

(جیسا کہ آیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے) قرآن کا اصلی ہدف انسان کی روحانی وفکری تربیت کرنا اور اسے شیطان کی پیروی اور نفسانی خواہشات کی قید سے نجات دلا کر نیکی اور اچھائی کی راہ پر گامزن کرنا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت پر ایمان رکھنا کہ جہاں انسان کی نیکی وبدی کا دقیق محاسبہ ہوگا پاک وصاف روح کی تربیت میں بہت تاثیر رکھتا ہے اور جب اس مطلب کو کھول کر ذکر کر دیا جائے وہاں پر صالح افراد اور گناہگاروں کے مختلف حالات تفصیل سے بیان کر دیئے جائیں تو یہ چیز مندرجہ بالا ہدف کے حاصل کرنے میں زیادہ موثر ہوگی۔

اسی وجہ سے ہم اس فصل میں تا حد امکان اس بحث سے مربوط آیات کی تفسیر وتحقیق کریں گے۔ تاکہ مطلب آسان ہو جائے اور کوئی بات رہ نہ جائے ہم ان آیات کو دو قسم پر تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ وہ آیات جن میں قیامت میں انسانوں کے حالات بطور کلی ذکر ہوئے ہیں۔

۲۔ وہ آیات جن میں مشخص عناوین کے ذریعے انسانوں کے حالات ذکر کیے گئے ہیں۔

اوّل پہلی قسم والی آیات ذکر کرتے ہیں:

قیامت میں انسانوں کی حالت

۱۔ ہر کوئی اپنی فکر میں ہوگا

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ (عبس: ۳۴ تا ۳۷)

”قیامت وہ دن ہے جب انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹے سے دور بھاگے گا ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی جس کی وجہ سے دوسروں سے بے پروا ہوگا“

۲۔ قیامت میں کوئی ایک دوسرے کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ (سباء: ۴۲)

”آج تم کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہو۔ ہم ظالموں سے کہیں گے: اس آگ کا مزہ چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے“

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ (انفطار: ۱۹)

”جس دن کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا خدا کے علاوہ کوئی مالک نہیں ہوگا“

دوسری آیات کے ذریعے ان آیات کے اصلی مقصود کو سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ قیامت کی علامات والی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی نظام مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گا اور ظاہری اسباب وعوامل تاثیر نہیں کر پائیں گے۔

اس کے علاوہ قرآن نے اسی مطلب کو صراحت کے ساتھ دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ (بقرہ: ۱۶۶)

”اس دن جن کی پیروی کی جاتی تھی وہ پیروی کرنے والوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے وہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کر لیں گے اور دنیوی اسباب سب بے اثر ہو کر رہ جائیں گے“

اور یہ کہ مطلق اسباب بے اثر نہیں ہوں گے بلکہ صرف دنیوی اسباب بے اثر ہوں گے اس پر شاہد وہ آیات ہیں جن میں آخرت میں مفید اور غیر مفید چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۔غیر مفید (نفع نہ دینے والی چیزیں)

(الف) مال وثروت

(ب) اولاد اور رشتہ دار

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ (شعرآء ۸۸)

"جس دن مال اور بیٹے نفع نہیں دیں گے"

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ (الممتحنہ:۳)

"تمہیں تمہارے رشتہ دار اور اولاد نفع نہیں دیں گے قیامت کے دن خدا تمہارے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا"

۴۔معذرت کرنا بے فائدہ ہوگا

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ (الروم: ۵۷)

"قیامت کے دن ظالمین کو ان کا معذرت کرنا فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان سے حق کی طرف رجوع کا تقاضا کیا جائے گا"

۵۔وہ چیزیں جو نفع دیتی ہیں

(الف) قلب سلیم

الا من اتی اللہ بقلبٍ سلیم (الشعراء: ۸۹)

"مگر وہ جو سالم قلب کے ساتھ خدا کے حضور آئیں گے"

قلب سلیم کیا ہے؟ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ مراد وہ قلب ہے جو شرک، شک اور گناہ کی آلودگی سے صاف و پاک ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں مراد وہ دل ہے جو حب دنیا سے خالی ہو۔ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث بھی اسی مطلب پر شاہد ہے آنحضرتؐ نے فرمایا:

حب الدنیا راس کل خطیئة ہر گناہ کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ [۱]

(ب) سچائی

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ (المائدہ ۱۱۹)

''خدا فرماتا ہے: آج وہ دن ہے جس میں سچ بولنے والوں کو ان کا سچ بولنا فائدہ دے گا''

۶۔ بعض دوست ایک دوسرے سے دشمنی کریں گے

آخرت میں دنیوی نظام و شرائط بدلنے کا ایک اور نمونہ یہ ہے کہ وہاں دوستیاں دشمنی میں بدل جائیں گی اور بعض لوگ جو اس دنیا میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے قیامت میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ قرآن فرماتا ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ (زخرف: ۶۷)

''آج کے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے سوائے متقین کے''

۷۔ مومنین و کفار کا ایک دوسرے سے سلوک

قرآن نے دنیا میں کفار کے مومنین کے ساتھ تمسخر آمیز سلوک کا ذکر کیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ (المطففین: ۲۹ تا ۳۲)

''مجرمین مومنین کی ہنسی اڑاتے ہیں جب بھی وہ (مومنین) ان کے پاس سے گزرتے ہیں وہ انہیں حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ جب بھی وہ (کفار) اپنے رشتہ داروں کے پاس جاتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب مومنین کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں''

یہ تو کفار کا دنیا میں مومنین کے ساتھ برتاؤ ہے لیکن آخرت میں حالت اس کے مکمل طور پر برعکس ہے وہاں مومن کافروں کی بدبختی پر

---

[۱] مجمع البیان جلد ۴، ص ۱۹۴

ہنسیں گے جو (بدبختی) خود ان کے اپنے ہاتھوں کی حاصل کردہ ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ (المطففین: ۳۴ تا ۳۶)

''اس دن مومن کفار پر ہنسیں گے اور اپنے لیے مخصوص جگہ سے کفار کو دیکھیں گے اور کہیں گے یہ عذاب انہی کاموں کا نتیجہ ہے جو تم دنیا میں انجام دیتے تھے''

ان آیات نے ایک کلی مطلب کو بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں انسان اجتماعی زندگی میں موثر اسباب وشرائط نقصان ونفع اور دوستی ودشمنی کے لحاظ سے آخرت میں مکمل طور پر بدل جائیں گے وہاں کی شرائط جدید ہوں گے جو ان کی جگہ لے لیں گے۔

یہاں ایک اور قسم کی آیات ہیں جو قیامت میں انسان کے حالات کی دگرگونی پر بطور کلی دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً:

ایک گروہ خوش وخرم [1] اور دوسرا غمگین [2] وارد ہوگا۔ کچھ سر جھکائے شرم [3] کے ساتھ اور کچھ سر اٹھا کر [4] وارد ہوں گے۔ کچھ سفید نوران [5] ی چہروں کے ساتھ اور کچھ بری شک [6] ل کے ساتھ وارد ہوں گے۔ آنے والے کچھ اصحاب یمین [7] اور کچھ اصحاب شمال [8] ہوں گے اور کچھ سابقین ومقربین [9] ہوں گے۔ کچھ کے نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ہوں گے اور کچھ کے بائیں ہاتھ میں [10] [11]۔ یہاں ہم ان آیات کا تذکرہ نہیں کر رہے چونکہ بعد ازاں ان سے بحث ہوگی۔

---

[1] عبس: ۴۰-۳۸۔ قیامت ۲۵-۲۲

[2] عبس: ۴۰-۳۸۔ قیامت ۲۵-۲۲

[3] غاشیہ: ۲،۱۰

[4] غاشیہ: ۲،۱۰

[5] آل عمران ۱۰۶-۱۰۲

[6] آل عمران ۱۰۶-۱۰۲

[7] واقعہ: ۸،۱۰

[8] واقعہ: ۸،۱۰

[9] واقعہ: ۸،۱۰

[10] [11] حاقہ: ۶۹، بنی اسرائیل ۷۱، انشقاق ۱۰-۷

قیامت میں مختلف لوگوں کی حالت

جن آیات میں مختلف قسم کے لوگوں کی حالت بتائی گئی ہے وہ دو قسم کی ہیں:

ایک وہ آیات جو نیک اور نیک بخت لوگوں کی حالت بیان کرتی ہیں اور دوسری وہ آیات جو گناہگار و بد بخت لوگوں کی حالت بیان کرتی ہیں۔ان دونوں قسم کے لوگوں کے عنوان بھی مشخص ہوں گے۔ان آیات کی مکمل تحقیق و تحلیل کرنا تو اس مختص کتاب کی گنجائش سے خارج ہے۔ہم صرف نمونے کے طور پر دونوں قسم کے لوگوں کے کچھ عنوان ذکر کرتے ہیں:

قیامت میں نیک بخت لوگ

(الف) انبیاء و مومنین

الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (تحریم:۸)

''اس دن خدا پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا (یعنی انہیں اکرام عطا کرے گا) ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب رواں ہوگا وہ کہیں گے خدایا! ہمارا نور کامل فرما اور ہمیں بخش دے۔ بتحقیق تو ہر چیز پر قادر ہے''[1]۔

(ب) متقی و پرہیز گار لوگ

قیامت میں متقین کی منزلت و مقام کے بارے میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔ ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ متقین کا گھر اور مقام اچھا ہوگا: ''ولنعم دار المتقین'' (نحل:۳۰)

۲۔ وہ مکمل طور پر امن میں ہوں گے ''ان المتقین فی مقام امین'' (الدخان:۵۱)

۳۔ ادخلوھا بسلامٍ امنین (حجر:۴۶)

۴۔ وہ باغوں، چشموں اور چھاؤں میں ہوں گے: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝

ان المتقین فی جنت و عیون (حجر:۴۵)

۵۔ جو وہ چاہیں گے انہیں ملے گا لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (نحل:۳۱)

۶۔ وہ نعمات الٰہی پر خوش و خرم ہوں گے: ''فاکھین بما اتاھم ربھم'' (طور:۱۸)

۷۔ ایک دوسرے پر کسی قسم کا حسد و کینہ نہیں کریں گے:

ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سررٍ متقبلین (حجر:۴۷)

---

[1] یہی مضمون سورہ حدید آیت ۱۲ بھی آیا ہے۔

اور انہیں کسی طرح کے رنج وغم کا احساس نہیں، نہ ہی وہ بہشت سے باہر آئیں گے:

۸۔ لا یمسھم فیھا نصب و ما ھم منھا بمخرجین (حجر: ۴۸)

متذکرہ بالا آیات قرآن متقی حضرات کی منزلت اعلیٰ کے اظہار کے طور پر جو انہیں قیامت میں حاصل ہوگی۔ بطور نمونہ و مثال پیش کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کی شان و منزلت میں بہت سی باتیں ہیں جن میں قرآن مجید کی آیات بھی شامل ہیں۔ ان سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ [1]

ج۔ صابرین

۱۔ رحمت کے فرشتے درود و سلام سے ان کا استقبال کرتے ہیں اور انہیں ان کے مقامات بلند و عالی کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہیں:

سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ؀۲۴ (رعد: ۲۴)

''تمہارے صبر و استقامت کے لیے تم پر درود و سلام ہو۔ تمہاری منزل ابدی کیا خوب ہے!''

۲۔ اللہ تعالیٰ انہیں دوگنی جزا مرحمت فرمائے گا۔

اُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا (قصص: ۵۴)

''انہیں دگنی جزا دی جائے گی کیونکہ انہوں نے (تکالیف الٰہی کے سلسلہ میں) صبر کیا ہے''۔

۳۔ انہیں بہتر و بالاتر جزا دی جاتی ہے۔

وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ؀۹۶ (نحل: ۹۲)

''اور یقیناً ہم صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال کی بہتر جزا دیں گے جو انہوں نے انجام دیے ہیں''

۴۔ وہ بہشت کے دریچوں میں بیٹھے ہوں گے اور اپنے شایانِ شان احترام پائیں گے

اُولٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُوۡا وَيُلَقَّوۡنَ فِيۡهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ؀۷۵

(فرقان: ۷۵)

''ان کی جزا ان کے صبر کے مطابق ہو، جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اختیار کیا، بہشت کے دریچے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرشتے درود و سلام کرتے ہوئے ان سے ملاقات کے لیے جاتے ہیں''

---

[1] ملاحظہ ہو سورہ نبا: ۳۱ تا ۳۶، مرسلات: ۴۱ تا ۴۳، حجر: ۴۵، ۴۸، دخان: ۵۱۔۵۷، رعد: ۳۵، فرقان: ۱۵، محمد: ۱۵، آل عمران: ۱۳۳، توبہ: ۱۳۳، نحل: ۳۱، شعرائ: ۹۰، زخرف: ۳۵، ذاریات: ۱۵، طور: ۱۷، قمر: ۵۴، قلم: ۳۴

جاننا چاہیے کہ صبر کرنے والے متقی و نیک وصالح لوگوں کی خاص جماعتوں سے نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مطیع وصالح بندوں کے مقامات و منازل بلند درجہ کے بیان کے بعد ان کے صبر و استقامت کی بنا پر ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً سورہ فرقان آیت ۷۵ میں جو صابرین کی منزل سے متعلق ہے، خدائے رحمان کے خاص بندوں کے حالات وصفات کے بیان کے بعد یا سورہ دہر میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی توصیف بیان کرنے کے بعد جو روز قیامت مسرور و شادمان ہوں گے، ارشاد ہوتا ہے:

وجزاهم بما صبروا جنة وحريراً (دھر: ۱۲)

د۔ نماز گزار

نماز گزار جو نماز کو اہمیت دیتے ہیں، (عذر کے بغیر) کبھی نماز کو ترک نہیں کرتے۔ نماز کی ادائیگی میں وقت اور دوسری شرائط کا پورا خیال رکھتے ہیں، حقیقت وروح نماز سے جن کی زندگی و کردار منور ہیں، قرآن مجید ان کو قابل تعریف و توصیف قرار دیتا ہے۔ ایسے بندگان الٰہی باغات بہشت میں بلند درجہ و صاحبان عزت ہوں گے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۙ﴿۱۹﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۙ﴿۲۱﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۲۲﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۲۳﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ﴿۲۴﴾ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿۲۷﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿۲۸﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿۲۹﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۳۴﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ ﴿۳۵﴾ (معارج: ۱۹ تا ۳۵)

''انسان اپنے منافع کے سلسلہ میں بہت حریص ہے۔ جب بھی کوئی برائی (جو اس کی منفعت کے خلاف ہوتی ہے) اسے پہنچتی ہے تو وہ جزع و بے تابی کا اظہار کرنے لگتا ہے، جب کبھی اسے نفع پہنچتا ہے (اسے خود اپنے لیے

مخصوص کر لیتا ہے) اور دوسروں کے لیے اس میں مانع ہوتا ہے لیکن نماز پڑھنے والے جو ہمیشہ (پوری شرائط کے ساتھ) نماز ادا کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو اپنے مالوں میں محروم لوگوں کے حقوق اور حصے مقرر کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو (عملاً) روز قیامت کی تصدیق کرتے ہیں (ہر کام کو بجالاتے ہوئے قیامت کو مدنظر رکھتے ہیں)، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوف زدہ ہیں (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ) کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر اس کے عذاب سے مامون نہ ہوگا وہ اپنے دامن کو غیر محرموں سے آلودہ نہیں کرتے سوائے اُن کے جو ان کی ازواج یا کنیزیں ہوں، اللہ تعالیٰ کے قانون سے تجاوز نہیں کرتے، وہ لوگ جو امانت وعہد و پیمان پر پورا اترتے ہیں (امانت میں خیانت اور پیمان شکنی نہیں کرتے)، جو گواہی دیتے ہوئے حق پر قائم رہتے ہیں، وہ لوگ جو نماز کے آداب وشرائط کا پورا خیال رکھتے ہیں، وہی لوگ قیامت کے دن باعزت ہوں گے اور باغات جنت سے فیض یاب ہوں گے''

مذکورہ آیات میں آخرت میں نماز گزاروں کے بارے میں قابل توجہ نکات کا ذکر ہو رہا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حرص ولالچ سے روح کی پاکیزگی وصفائی میں نماز کس قدر موثر ہے۔

۲۔ عفت وپاکدامنی کے قائم رکھنے عرصہ حیات کو ہر طرح کی محتاجی بوجھ اور بدکاری سے محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں نماز کی تاثیر

۳۔ محرومین اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے، ان سے حسن سلوک اور ایفائے عہد میں نماز کے اثرات

۴۔ امانت داری وایفائے عہد میں نماز کی اہمیت

۵۔ گواہی دیتے ہوئے حق پر قائم رہنے اور اس سے احتراز نہ کرنے میں نماز کا حصہ

غرضیکہ قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی روایات میں اہم ترین اور جاذب ترین ارشادات نماز اور اس کے اثرات تربیت کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔ ان سب کے بیان کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے جو اس کتاب کی مباحث سے باہر ہے۔

ھ۔ سابقون

قرآن مجید میں مومنین کی ایک جماعت کی ''سابقون'' کے عنوان سے توصیف کی گئی ہے۔ اب ہم ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں:

قرآن پاک قیامت کے دن محشور ہونے والے لوگوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ سابقون

۲۔ اصحاب الیمین

۳۔ اصحاب الشمال

اب ہم سابقون کی صفات اور ان کی بزرگی سے واقفیت حاصل کرتے ہیں:

لغت عرب میں ''سابق رہنما و پیش رو (آگے چلنے والا) کے معنی رکھتا ہے۔ اب دیکھنا ہوگا کہ ''سبق'' سے کیا مراد ہے اور سابقین کن مواقع میں دوسروں پر سبقت حاصل کر کے اس قابل بنتے ہیں کہ حیات اُخروی میں بھی دوسروں کے رہنما قرار پائیں۔

بعض آیات قرآن سے استفادہ ہوتا ہے کہ ''سبق کا تعلق نیک کاموں سے ہے جن کی انجام دہی سے سابقین کی جماعت دیگر افراد پر سبقت حاصل کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

أُولَٰٓئِكَ يُسَٰرِعُونَ فِي ٱلۡخَيۡرَٰتِ وَهُمۡ لَهَا سَٰبِقُونَ ۝٦١ (مومنون: ٦١)

''یہ وہ لوگ ہیں جو کارہائے خیر کو انجام دینے میں جلدی کرتے اور ان کے نتیجہ میں دوسروں پر سبقت حاصل کرتے ہیں''

ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ أَوۡرَثۡنَا ٱلۡكِتَٰبَ ٱلَّذِينَ ٱصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۖ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٞ لِّنَفۡسِهِۦ وَمِنۡهُم مُّقۡتَصِدٞ وَمِنۡهُمۡ سَابِقُۢ بِٱلۡخَيۡرَٰتِ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ ۚ (فاطر: ٣٢)

پھر ہم نے کتاب کو اپنے برگزیدہ بندوں کے سپرد فرمایا اور وہ تین جماعتوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

١۔ ظالم لنفسہ جو خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے۔

٢۔ و منهم مقصد...... میانہ رو جماعت

٣۔ و منهم سابق بالخیرات ... وہ جماعت جو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے نیک کام سرانجام دینے میں دوسروں پر سبقت کرتے ہیں۔

امیر المومنین علی السلام نے اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے جس کی روشنی میں اس آیہ مبارکہ کی تفسیر ممکن ہے آپؑ نے ان تین جماعتوں کی مندرجہ ذیل شکل میں تفسیر فرمائی ہے:

١۔ ساع سریع نجا — وہ جماعت جو کارہائے خیر کی جلد انجام دہی سے نجات سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔

٢۔ و طالب بطی رجا — وہ جماعت جو عمل میں سستی کے باوجود مغفرت کی امید رکھتی ہے۔

٣۔ ومقصر فی النار هوی — وہ جماعت جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہے اور ہوا و ہوس کی پیروی میں آتش دوزخ میں شرمسار ہوتی ہے۔

تاہم ہر صورت میں ''سبق'' کا تعلق نیک اعمال سے ہے اور اس نام سے سابقین کی توصیف کا باعث ان کے کارہائے نیک میں سبقت اور تیز روزی سے ہی قرار پاتا ہے۔

پھر بھی قرآن مجید سے ''سابقون'' کے مختلف معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس سے مراد اسلان کا دوسروں سے پہلے

اختیار کرنا اور دوسروں سے پہلے کفر و بت پرستی کو ترک کرنا ہے۔ درج ذیل آیت میں اسی مقصد کی طرف اس طرح اشارہ ہو رہا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ(توبه:۱۰۰)

''مہاجرین وانصار میں سب سے پہلے آگے بڑھنے والے اور لوگ نیک کام انجام دینے میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتے ہیں''

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام لانے میں سبقت بھی کارہائے خیر و نیک میں سبقت کا مصداق ہے اور درحقیقت ''سابقون'' کی یہ قسم ''کارہائے نیک میں سبقت کرنے والوں'' کا مصداق بھی ہے۔ ممکن ہے سورۂ واقعہ کی آیت ''السابقون السابقون'' ان دونوں صورتوں کی مظہر ہو یعنی وہ لوگ جو اسلام کو قبول کرنے میں دوسروں پر سبقت کرتے ہیں یا وہ لوگ جو کارہائے خیر کی انجام دہی میں دوسروں کے مقابلہ میں جلدی کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نیک کاموں کی انجام دہی میں سبقت نیز دوسرے افراد کے مقابلہ میں فرائض کے بجالانے میں پہل کرنا ایک طرح شائستگی، صفائی روح اور عقل و خرد کے صحیح استعمال کی علامت ہے۔ یہ صاحبان عقل و خرد کا خاصہ ہے جو اپنی بصیرت سے خیر و شر میں فرق کو سمجھتے ہیں اور پھر کارہائے خیر کی انجام دہی میں سبقت حاصل کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ ہم ''سبق'' کے معنی سے واقف ہوئے اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ ''سابقون'' سے کیا مراد ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید ان حضرات کی بزرگی و عظمت کی کیسے وضاحت فرماتا ہے۔ اس جماعت سابقین کی دنیا و آخرت میں عظمت و بزرگی کی توصیف میں قرآن کریم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ہم مختصراً اسے پیش کرتے ہیں:

ا۔ اس دنیا میں سابقون کی عظمت

اگر کارہائے نیک کی انجام دہی میں سبقت کو فروغ عقل و صفائی قلب کی علامت قرار دیا جائے تو فطرتاً اس عمل میں ایک اور کیفیت گوہر بے بہا کی طرح نظر آئے گی جس کا قرآن مجید ''سابقون'' کی عظمت کے بیان سے قبل اس طرح اظہار فرماتا ہے کہ ان نیک لوگوں کی بزرگی عبارت ہے مندرجہ ذیل صفات سے:

(الف)	من خشية ربهم مشفقون	جلال پروردگار سے خوفزدہ رہتے ہیں
(ب)	بآیات ربهم یومنون	آیات پروردگار پر ایمان رکھتے ہیں۔
(ج)	بربهم لا یشرکون	اپنے پروردگار سے شرک نہیں کرتے۔
(د)	یوتون ما اتوا	اپنے فرائض مال کو انجام دیتے ہیں۔

(ھ) وقلوبھم وجلۃ — اپنے قلوب میں ہمیشہ خوف خدا رکھتے ہیں۔
(و) انھم الی ربھم راجعون — یہ خوف اس لیے ہے کہ وہ معاد پر ایمان رکھتے ہیں

پھر قرآن مجید ان صفات معنوی کے مرکز واصل کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أُولَٰٓئِكَ يُسَٰرِعُونَ فِي ٱلۡخَيۡرَٰتِ وَهُمۡ لَهَا سَٰبِقُونَ ﴿٦١﴾ (مومنون: ۵۷ تا ۶۱)

''وہ لوگ کارہائے خیر کی انجام دہی میں جلدی کرتے ہیں اور ان میں دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں''۔

یہاں تک ہم سابقوں کی عظمت دنیوی سے واقف ہوئے۔ اب ضروری ہے کہ ہم ان کے مقام آخرت سے آشنائی حاصل کریں جو انہی اوصاف فکری وروحانی وعملی کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ آخرت میں مقام سابقون

کارہائے نیک کے لیے رہبروں کے طور پر سابقین کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ترین افراد شمار کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید ان حضرات کو ''مقربان'' کے نام سے یاد فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

أُولئِكَ المقربون (واقعہ: ۱۱)

''یہی لوگ (اللہ کے) مقرب ہیں''

تاہم ''مقربین'' بارگاہ پروردگار میں سابقین کے علاوہ بھی ایک جماعت شامل ہے جن پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ فرشتوں [1] کے لیے کہا گیا ہے، لیکن وہ ہماری اس بحث سے خارج ہیں۔

اب دیکھنا ہوگا کہ اس تقرب کے عوض اللہ تعالیٰ ان حضرات کو آخرت میں کیسی عظیم نعمتوں سے نوازے گا، یہ نعمات قرآن مجید جن کی توصیف کر رہا ہے، انسانی عقل وخرد مکمل طور پر ان کا ادراک نہیں کرسکتی۔ پس ہم یہاں آیات اور ان کے ترجمہ ہی کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

فِي جَنَّٰتِ ٱلنَّعِيمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٞ مِّنَ ٱلۡأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيلٞ مِّنَ ٱلۡأٓخِرِينَ ﴿١٤﴾ عَلَىٰ سُرُرٖ
مَّوۡضُونَةٖ ﴿١٥﴾ مُّتَّكِـِٔينَ عَلَيۡهَا مُتَقَٰبِلِينَ ﴿١٦﴾ يَطُوفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَٰنٞ مُّخَلَّدُونَ ﴿١٧﴾
بِأَكۡوَابٖ وَأَبَارِيقَ وَكَأۡسٖ مِّن مَّعِينٖ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُونَ عَنۡهَا وَلَا يُنزِفُونَ ﴿١٩﴾

---

[1] لن يستنكف المسيح ان يكون عبد الله ولا الملائكة المقربون (نساء: ۱۷۲) یعنی مسیح اور اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے اللہ کی بندگی سے انکار نہیں کرتے۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢١﴾ وَحُورٌ عِينٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ
اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ﴿٢٣﴾ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا
تَأْثِيمًا ﴿٢٥﴾ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿٢٦﴾ (واقعه: ۱۲ تا ۲۶)

''یعنی آرام و آسائش کے باغوں میں، بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہوں گے اور کچھ تھوڑے سے پچھلے لوگوں میں سے موتی اور یاقوت سے جڑے ہوئے سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، نوجوان لڑکے (جو بہشت میں) ہمیشہ (لڑکے ہی بنے) رہیں گے (شربت وغیرہ کے) ساغر اور شفاف شراب کے جام لیے ہوئے ان کے پاس چکر لگاتے ہوں گے جس سے نہ تو ان کو درد سر ہوگا اور نہ وہ مدہوش ہوں گے اور جس قسم کے میوے پسند کریں اور جس قسم کے پرند کا گوشت ان کا جی چاہے (سب موجود ہے)۔ اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جیسے احتیاط سے رکھے ہوئے موتی، یہ بدلہ ہے اُن کے (نیک) اعمال کا۔ وہاں نہ تو بے ہودہ باتیں سنیں گے اور نہ گناہ کی بات (فحش) بس ان کا کلام سلام ہی سلام ہوگا''۔

یہاں ہم ایک نکتہ کا ذکر کرنا گزیر سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن ایک اور جماعت کا بھی ''مقربین'' کے لفظ سے ذکر کرتا ہے۔ سورہ واقعہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۙ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾ (واقعه:
۸۸، ۸۹)

''یعنی پس اگر وہ (مرنے والا خدا کے) مقربین سے ہے تو (اس کے لیے) آرام و آسائش ہے اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ''

لہٰذا جاننا چاہیے کہ اس آیہ مبارکہ میں مقربین سے مراد ہی ''سابقون'' ہیں جن کا سورہ کی ابتدا میں ذکر ہوا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بارگاہ پروردگار میں مقرب انسانوں سے ''سابقون'' ہی مراد ہیں۔ اسی لیے اس آیت میں مقربین کے لیے جن انعامات کا ذکر ہوا ہے وہی ''سابقون'' کے لیے بھی ہیں جن کا سورہ مبارکہ کے شروع میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ سب انعامات یکساں ہیں اور دونوں مقامات پر ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کا مقام ''جنات نعیم'' (نعمات سے پر بہشت) ہے۔

قرآن مجید میں حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی مقربان ہی میں شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ (ال عمران: ۴۵)

''یعنی اور وہ دنیا و آخرت میں وجیہہ و مقرب لوگوں میں ہیں''

حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ توصیف اسی لیے ہے کہ وہ بھی دوسرے انبیا کی طرح کارہائے نیک بجالانے میں دوسرے لوگوں پر سبقت کرتے تھے، روز اوّل ہی سے انہوں نے ایمان و توحید کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور ایک لمحہ کے لیے بھی توحید کے صراط مستقیم سے ہٹے نہیں تھے۔

۳۔شان مقربین بزبان قرآن

ہم نے سابقوں و مقربین کو برابر جانا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ واقعہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو تین جماعتوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ کسی چوتھی جماعت کا ذکر نہیں کیا۔ اسی لیے مقربین ہی کو ہم نے سابقون میں شمار کیا ہے۔ لیکن قرآن مجید مقربین کی مزید صفات بزرگ کو بھی بیان فرماتا ہے جن میں سے ایک کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

نیک لوگوں کے نامہ اعمال کے شاہد

مقربین اس عظیم مقام کے حامل ہیں کہ وہ نیک لوگوں کے اعمال (یا ان کے مقام) کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں یعنی نیک لوگوں سے بلند مرتبہ کے مالک ہیں جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے:

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾ (مطففین: ۱۸ تا ۲۱)

''یعنی نیک لوگوں کی کتاب (نامہ اعمال) علیین میں ہے اور تو کیا جانے کا علیین کیا ہے؟ یہ لکھی ہوئی کتاب ہے اور مقربین اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کتاب سے کیا مراد ہے؟''

مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد نیک لوگوں کے نامہ ہائے اعمال ہیں جن کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں فاجرین کے نامہ ہائے اعمال ہیں جو ان کے لیے حسرت و اندوہ کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے سابقین و مقربین کی جماعت سے واقفیت حاصل کی۔ اب ہم اصحاب الیمین (دائیں ہاتھ والوں) کی توصیفات و فضائل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

و۔اصحاب الیمین

قرآن کریم انسانوں کی ایک جماعت کا قیامت کے دن ''اصحاب الیمین'' کے عنوان سے تعارف کرواتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾ (واقعہ: ۲۷)

''یعنی اور داہنے ہاتھ والے! (واہ) داہنے ہاتھ والوں کا کیا کہنا!''

آخر یہ اصحاب یمین کون ہیں؟

اصحاب یمین سے متعلق نعمات بہشت کے بارے میں دس آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہو رہا ہے:

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ (واقعہ: ۳۹، ۴۰)

''یعنی اصحاب یمین کچھ پہلے لوگوں اور (امت اسلامی) کے کچھ بعد کے لوگوں پر مشتمل جماعت ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اصحاب یمین سے کون سے لوگ مراد لیتا ہے۔اس سلسلہ میں مفسرین نے دو نظریات پیش کیے ہیں۔

ا۔ ان (اصحاب یمین) سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نامۂ اعمال قیامت کے دن ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔اس بارے میں قرآن فرماتا ہے:

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ (اسرائیل: ۷۱)

''یعنی جس روز ہم تمام انسانوں کو ان کے امام کے نام سے پکاریں گے، تو پس وہ لوگ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور اس میں ذرہ برابر کسی چیز کی کمی نہ کی جائے گی''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ (حاقہ: ۱۹)

''یعنی جس شخص کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا وہ (لوگوں سے) کہے گا کہ آؤ اور میرے اعمال کی اندراجات کو پڑھو''۔

پھر فرماتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿۸﴾ (انشقاق: ۷، ۸)

''یعنی جس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کا محاسبہ آسانی سے ہو جائے گا''

یہ جماعت (وہ لوگ جن کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہوگا) روزِ قیامت مقام بلند اور منزل عالیہ پر ہوں گے۔قرآن کریم ان کے مقامات اخروی کی اس طرح تالیف فرماتا ہے۔

۱۔ وینقلب الی اهله مسروراً (انشقاق: ۹)

''یعنی بعد از حساب بہت مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنے بہشت کے ہمراہیوں کی طرف واپس ہوں گے''

۲۔ فی عیشة راضیة (حاقة:۲۱)

''یعنی اپنی زندگی کا ملا خوشی وخرمی میں بسر کرتے ہیں''

۳۔ فی جنة عالیه ۝ قطو فها دانیة (حاقه: ۲۲،۲۳)

''یعنی جنت رفیع میں جہاں (ہر قسم کے) میوہ جات ان کے قریب ہیں (جن کو کھانے میں انہیں کوئی مشقت کرنا نہیں پڑتی)''۔

۴۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ (حاقة: ۲۴)

''یعنی (ان سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو، یہ نعمتیں تمہیں مبارک ہوں۔ یہ تمہارے ان اعمال کا بدلہ ہے جو تم اپنی گذشتہ زندگی (دنیا) میں بجالاتے تھے''۔

۲۔ دوسرا نظریہ ہے کہ یمین ''یمن'' کے معنی میں ہے۔اس سے مراد وہ تمام افراد ہیں جن کی قرآن کریم ''اصحاب میمنہ'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جیسا کہ سورہ واقعہ کے شروع میں تین جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو میدان قیامت میں الگ الگ انسانوں کی قرار پائیں گی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۸﴾ (واقعه: ۷،۸)

''یعنی اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے۔ (پہلی جماعت) دائیں ہاتھ والے (مبارک اور سعادت مند) ہیں''۔

ان دائیں ہاتھ والوں کے مقابلہ میں اصحاب ''مشئمه'' (بائیں ہاتھ والے) ہیں جو بدنصیب اور شقاوت مند قرار پائیں گے۔ اصحاب میمنہ (دائیں ہاتھ والوں) سے وہ سعادت مند وخوش نصیب لوگ مراد ہیں جو مبارکوں اور مسرت سے اپنے اعمال کی جزا معلوم کرتے ہیں۔

قرآن پاک کی کئی آیات میں 'اصحاب میمنہ' کی توصیف بیان کی گئی ہے اور بعض آیات میں ان کی بزرگی وعظمت کا بیان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

الْمَيْمَنَةِ۝١٨ (بلد: ۱۱ تا ۱۸)

''یعنی پھر وہ گھاٹی میں داخل نہ ہوا اور تجھے کیا معلوم وہ گھاٹی کیا ہے۔ کسی بندہ (غلام) کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن کسی قرابتدار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر و مہربانی کی وصیت کی۔ یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں۔

ان تمام آیات قرآن سے جو اصحاب یمین اور اصحاب میمنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں سے انسانوں کی ایک ہی جماعت مراد ہے جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں کیونکہ سورہ ''واقعہ'' میں جہاں افراد کی ایک قسم کا قیامت کے دن اصحاب ''میمنہ'' کہہ کر تعارف کروایا گیا ہے، جہاں اُن کے لیے آخرت کے مقامات اور بہشت کی نعمات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں انہیں ہی ''اصحاب الیمین'' کا نام دیا گیا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم نے اصحاب یمین کی تین مرحلوں میں توصیف بیان فرمائی ہے:

(الف) دنیا کی زندگی میں

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے پروردگار عالم کے اوامر و نواہی کے لیے سر تسلیم خم کر رکھا ہوتا ہے۔ استقلال و استقامت کے ساتھ فرائض دین کی بجا آوری کی خاطر گردنیں جھکائے رکھتے ہیں، علاوہ ازیں جب کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے آداب و رسوم بندگی کو خود بجالاتے ہیں دوسرے لوگوں کو بھی ان کاموں کی انجام دہی کی وصیت و ہدایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہورہا ہے:

فلا اقتحم العقبه

(ب) موت کے وقت

موت کے سامنے مکمل اطمینان و سکون و آرام سے رہتے ہیں، کسی لحظہ میں بھی کوئی ڈرانے یا وحشت زدہ کرنے کی کوئی کیفیت انہیں پریشان نہیں کرتی جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۝٩٠ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۝٩١

(واقعه: ۹۰، ۹۱)

''یعنی پس اگر وہ دائیں ہاتھ والوں میں سے ہوگا تو (اُسے کہا جائے گا کہ) تیرے لیے دائیں ہاتھ والوں کی طرف سے سلامتی و سعادت کے سوا اور کچھ نہیں۔ (ان کے لیے کوئی ناگوار بات سامنے نہیں آئے گی)''[1]

---

[1] مجمع البیان، ج ۵، ص ۲۲۸

ج۔ دوسری دنیا میں

۱۔ ان کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

۲۔ ان کا حساب وکتاب آسان ہوگا۔

۳۔ اپنے ساتھیوں کے پاس مسرت وشادمانی سے واپس ہوں گے۔

۴۔ بہشت کے بلند مراتب میں ان کا قیام ہوگا۔

۵۔ نعمات بہشت کسی قسم کی زحمت وتکلیف کے بغیر ان کے اختیار مین کی جائیں گی۔

مذکورہ بالا امور سے متعلق ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ز۔ نیک کردار لوگ (ابرار، محسنین)

''ابرار'' اور ''محسنین'' دو ایسے عنوان ہیں جن سے صالح وباایمان افراد کی توصیف کی گئی ہے۔ اگر چہ ممکن نہیں کہ ان لوگوں کو جماعتوں یا مختلف اقسام کے زمرے میں رکھا جائے کیونکہ یہ لوگ اکثر ایسے ہی درجات ومراتب کے مالک ہیں جن میں سے اکثر مقربین حضرات اور اصحاب الیمین کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن مجید نے ان کے لیے الگ الگ دوعنوانوں کو ضروری جانا ہے اس لیے ہم بھی ان سے متعلق الگ الگ آیات پیش کرتے ہیں:

قرآن مجید نے محسنین کو بڑی عظمت کے ساتھ یاد فرمایا ہے اور بہت سی آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

ان اللہ یحب المحسنین (بقرہ: ۱۳۴، ۱۴۸ اور دوسری بہت سی آیات)

''اللہ تعالیٰ نیک کردار لوگوں کو دوست رکھتا ہے''

ایک اور جگہ فرماتا ہے: ''رحمت الٰہی نیک کردار لوگوں کے نزدیک ہے''

یعنی اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۝۵۶ (اعراف: ۵۶)

پھر ارشاد ہوتا ہے: وبشر المحسنین (حج: ۳۷)

خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے ارشاد فرماتا ہے کہ نیک کردار لوگوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے لطف ومہربانی کی خوشخبری دے دیں۔

نیز ان اللہ لمع المحسنین (عنکبوت: ۶۹)

''بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف وعنایات ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں''

مزید ارشاد ہے:

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (توبہ: ۱۲۰، ہود: ۱۱۵ اور دیگر آیات)
اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ نیکوکاروں کے اعمال کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا''
علیٰ ہذا القیاس کہیں ان کی صفات دنیوی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾ (ذاریات: ۱۷ تا ۱۹)

''یعنی وہ رات کو بہت کم سوتے ہیں، علی الصبح اللہ تعالیٰ کی مناجات و استغفار میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ان کے اموال میں محروم لوگوں اور سائلوں کا حق ہوتا ہے''

آخرت میں ان کے اعمال نیک کا صلہ یہ ہے کہ وہ جنت کے خوشگوار و خوبصورت درختوں کے سایہ میں نعمات پروردگار سے سرشار، وہاں کے چشمہ ہائے زلال و باصفا سے مسرور و شادمان اپنی پسند کے ہر قسم کے میوہ جات سے بہرہ اندوز ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتگان رحمت ان سے کہتے ہیں ہوں گے یہ سب نعمات تمہیں مبارک ہوں۔ یہ دنیا میں تمہارے اعمال صالح کا صلہ ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ (مرسلات: ۴۱ تا ۴۴)

''یعنی یقیناً پرہیزگار لوگ سایوں اور چشموں اور ایسے پھلوں میں (بسر کرتے) ہوں گے جن کی وہ خواہش کریں گے۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) خوشگواری سے کھاؤ اور پیو بسبب اس عمل کے جو تم کیا کرتے تھے۔ یقیناً ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں''

غرضیکہ قرآن مجید نے ''ابرار'' (نیک کردار لوگوں) کی بہت زیادہ ستائش و توصیف فرماتا ہے۔ جب بھی عبادت گزار محو تفکر لوگوں کے بارے میں خطاب فرماتا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دست دعا بلند کیے ہوئے ہیں اور اُس سے درخواست گزار ہیں کہ انہیں ''ابرار'' کا ساتھی و ہم نشین قرار دے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا

عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ (ال عمران: ۱۹۰ ۔ ۱۹۳)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے اختلاف میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور کروٹوں پر (لیٹے ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں (اور ان کے بارے میں غور کرتے ہوئے کہتے ہیں) پروردگار! تو نے یہ جہان باطل و بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ تیری ذات پاک ہے۔ پس ہمیں آتش جہنم کے عذاب سے بچا...... اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیاں ہم سے دور فرما اور ہمیں نیک لوگوں کے ہمراہ محشور فرما''

اس طرح قرآن کریم نے ''ابرار'' کی دو مرحلوں پر توصیف فرمائی ہے:

۱۔ دنیا میں

۲۔ آخرت میں

ابرار (نیک لوگوں) کی صفات دنیا میں

(الف) یوفون بالنذر"

''جب اللہ تعالیٰ سے عہد و نذر کرتے ہیں تو اپنے عہد و نذر کو پورا کرتے ہیں''

(ب) و یخافون یوماً کان شر مستطیراً ۔ انا نخاف من ربنا یوماً عبوسا قمطریراً

''ہمیشہ قیامت کے خوف و ہراس سے خوفزدہ رہتے ہیں''

(ج) و یطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیراً

''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں''

(د) انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً [1]

---

[1] سورہ دھر: ۷۔۱۰

’’(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہی کھانا کھلاتے ہیں، نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ‘‘

(ہ) لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ (ال عمران: ۹۲)

’’جس چیز کو دوست رکھتے ہیں اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں‘‘

(و) وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِہَا ۪ (بقرہ: ۱۸۹)

’’لیکن نیکی اس کی ہے جو (اللہ کی ناراضی سے) بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو‘‘۔

قرآن مجید نے ایک آیت میں لفظ ’’بر‘‘ دنیکی کی جامع و جاذب تعریف فرمائی ہے اور اس میں مندرجہ بالا تمام صفات ’’ابرار‘‘ کے لیے بیان فرمائی ہیں یعنی ’’نیک لوگوں کی صفات اور مقام‘‘ اور نیکیاں ان چیزوں سے عبارت ہیں:

۱۔ من امن باللہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبیین

’’اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے پیغمبروں، کتب آسمانی اور قیامت پر ایمان‘‘

۲۔ واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامی والمساکین و ابن السبیل والسائلین و فی الرقاب

’’اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، سفر میں بے یار و مددگاروں، مانگنے والے محتاجوں اور قیدیوں کی رہائی کی خاطر انفاق مال‘‘

۳۔ واقام الصلوۃ قیام نماز

۴۔ واتی الزکوۃ ادائے زکوٰۃ

۵۔ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا

’’ایفائے عہد، اللہ سے (نذر) ہو یا انسانوں سے‘‘

۶۔ والصابرین فی الباسآء والضرآء و حین الباس

’’شدائد و تکالیف کے مقابلہ میں صبر و مقاومت، انجام فرائض کی راہ میں‘‘[۱]

---

[۱] سورہ بقرہ: ۱۷۷

ابرار (نیک لوگوں) کی صفات آخرت میں

اب جبکہ ہم دنیا میں صفات ابرار (نیک لوگوں) سے بزبان قرآن حکیم آشنا ہو گئے تو قیامت میں ان کی صفات وعلامات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ (دھر: ۱۱)

''قیامت کے خوف وہراس سے امان میں ہوں گے''

۲۔ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ (مطففین: ۱۸)

''ابرار'' کا نامہ عمل (مقام) علیین میں ہے''

۳۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ (مطففین: ۲۲،۲۳)

''بہشت میں تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نظارہ کریں گے''

۴۔ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ (ملففین: ۲۴)

''مسرت وشادمانی ان کے چہروں پر نمایاں ہے''

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ط (مطففین: ۲۵۔ ۲۶)

''مشک سے مہر شدہ خوشبودار شراب ناب انہیں پلائی جائے گی''

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿۵﴾ (دھر: ۵)

''یقیناً نیک لوگ اس پیالہ میں سے پئیں گے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی''

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ (دھر: ۱۷)

''اور اس میں انہیں ایسا جام پلایا جائے گا جس میں زنجبیل (سونٹھ) ملی ہوگی''

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ (دھر: ۲۱)

''اور انہیں ان کا رب پاکیزہ مشروب پلائے گا''

۶۔ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا (دھر: ۱۳۔ ۱۴)

''بہشت کے درخت ان کے سروں پر سایہ فگن ہوں گے، نہ گرمی کی کوئی تکلیف ہوگی اور نہ سردی کی''

۷۔ وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا (دھر: ۱۴)

''اور جس میوہ کو ان کا دل چاہے گا بغیر کسی طرح کی زحمت کے ان کے لیے فراہم ہے''

۸۔ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ۝ قَوَارِيرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۝ (دھر: ۱۵، ۱۶)

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُورًا ۝ (دھر: ۱۹)

''خوش شکل لطیف و درخشاں جسموں والے خدمت گار ان کے اردگرد گھومتے اور شراب کے چاندی کے جام انہیں مہیا کرتے ہوں گے''

۹۔ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ (دھر: ۲۱)

''انہوں نے حریر کے لباس زیب تن کیے ہوں گے''

۱۰۔ وَّحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ (دھر: ۲۱)

''چاندی کے زیورات (کنگن) ان کے ہاتھوں میں ہوں گے''

۱۱۔ إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا ۝ (دھر: ۲۲)

ان سے کہا جائے گا یہ دنیا میں تمہارے نیک کاموں کا صلہ ہے اور آج خدائے مہربان تمہاری کوششوں پر مہربان وشکر گزار ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ مقامات بلند اور ایسی نعمات کرامت فرمائی ہیں جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ جملہ بذات خود انعام معنوی اور لذت روحانی سے مملو ہے اور ان تمام نعمات سے ارفع واعلیٰ ہے۔

ہم قیامت میں ان سعادت مند لوگوں کے ذکر کو یہاں تمام کرتے ہیں اور اب قیامت میں اشقیا و بدبخت لوگوں کے حالات ان مختلف عناوین کے تحت رقم کرتے ہیں جو قرآن مجید نے ان کے بارے میں ذکر فرمائے ہیں:

اشقیاء و بدبخت لوگوں کی قیامت میں کیفیت

قرآن مجید نے قیامت میں اشقیا و بدبخت لوگوں کے حالات بھی مختلف عنوانات کے تحت ذکر فرمائے ہیں۔ ہم اس فصل میں ان حالات کو متعلقہ آیاتِ قرآن سمیت درج کرتے ہیں:

(الف) اصحاب الشمال

جیسا کہ ہم نے قبل ازیں بیان کیا سورۂ واقعہ میں انسانوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ''السابقون''

۲۔ ''اصحاب الیمین''

۳۔ ''اصحاب الشمال''

پہلی فصل میں ہم نے پہلی دو جماعتوں کے بارے میں آیاتِ قرآن کریم درج کیں۔ یہ دونوں جماعتیں سعادت منداور اہل بہشت حضرات پر مشتمل ہیں۔ تیسری جماعت اصحاب شمال کی ہے جو اشقیا بدانجام اور اہل دوزخ ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ (واقعہ: ۱۴)

''اور (رہے) اصحاب شمال، تو کیسے (بدانجام) ہیں اصحاب شمال''

اس کے بعد ان کے حالات دنیوی و اخروی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ہم پہلے اصحاب شمال کے حالات دنیوی سے متعلق آیات قرآن کریم پیش کریں گے اور اس کے بعد ان کے حالات اخروی سے متعلق آیات بیان کریں گے۔

اصحاب شمال کے اوصاف دنیوی

قرآن کریم اشقیا و بدبخت لوگوں کی دنیوی کیفیت کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِكَ مُتۡرَفِيۡنَ ﴿ۚ۴۵﴾ وَكَانُوۡا يُصِرُّوۡنَ عَلَى الۡحِنۡثِ الۡعَظِيۡمِ ﴿ۚ۴۶﴾

وَكَانُوۡا يَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿ۙ۴۷﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا

الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾ (واقعہ: ۴۵ تا ۴۸)

''قیام قیامت سے پہلے وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے، بڑے گناہ (شرک) پر (اڑے) رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بھلا جب ہم مرجائیں گے اور (سڑگل کر مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ہمیں اور ہمارے اگلے باپ داداؤں کو پھر اٹھنا ہے؟''

نیز دوسری آیات میں بھی ان کی فکری و عملی خصوصیات کا بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِيۡمِ ﴿ۙ۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ﴿ؕ۳۴﴾

(حاقه: ۳۳۔ ۳۴)

''وہ (جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا ہوگا اور وہ اصحاب شمال سے ہوگا) نہ تو خدائے بزرگ ہی پر ایمان لاتا تھا اور نہ ہی محتاج کے کھلانے پر (لوگوں کو) آمادہ کرتا تھا۔ (بے نواؤں کی طرف توجہ کرنے والوں سے دور رہتا تھا)

گذشتہ آیات میں ''اتراف'' (عیش وعشرت سے زندگی بسر کرنے والوں) اور اس آیت میں مساکین و بے نوالوگوں سے بے توجہی کرنے والوں سے ایک ہی جماعت مراد ہے کیونکہ ''اتراف'' سے مراد مال ودولت کی طرف بہت زیادہ مائل ہونا، جمع مال کا شوق رکھنا اور دیگر دنیوی سامانِ تعیش کے حصول میں کوشاں رہنا ہے۔ یہی کیفیت اس امر کا باعث بنتی ہے کہ انسان صرف اپنی ذات کے بارے ہی میں سوچتا رہے اور دوسرے لوگوں کے نامساعد حالاتِ زندگی کی طرف سے بالکل بے توجہ ہو جائے اور بے رخی اختیار کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اصحاب شمال کی بڑائی مندرجہ ذیل امور سے عبارت ہوتی ہے:

(الف) اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہدوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دبالینا۔

(ب) دنیا و تعیّشات دنیا سے بے پناہ دل بستگی

(ج) دوسروں کے حالات کی طرف سے بے توجہی اور مساکین وغربا کی طرف سے بے غرضی

(د) معاد وقیامت کے حالات سے انکار

اصحاب الشمال کی وضع آخرت

اصحاب شمال کی آخرت کے اوصاف کی کیفیت اس طرح ہے:

(الف) جب اپنے نامۂ اعمال کو دیکھیں گے تو آرزو کریں گے کہ کاش یہ انہیں ہرگز نہ دیا جاتا اور نہ وہ اپنے اعمال کے حساب وکتاب پر مطلع ہوتے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۝۲۵ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۝۲۶ (حاقه: ۲۵، ۲۶)

''اور جس کا نامۂ عمل اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا اے کاش! مجھے میرا نامۂ عمل نہ دیا جاتا اور مجھے نہ معلوم ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے''

(ب) وہ آرزو کرے گا کہ کاش مرنے کے بعد میں بالکل نیست ونابود ہو جاتا اور دوبارہ زندہ نہ ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

یالیتها کانت القاضیة (حاقه: ۲۷)

(ج) اُس پر پوری طرح واضح ہو جائے گا کہ اس کے مال و دولت اس کے کسی کام نہیں ائیں گے، اس کی تمام قوت و توانائی ختم ہو چکی اور وہ اب بالکل کمزور و ناتواں ہو چکا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾ (حاقه: ۲۸، ۲۹)

(د) اس کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، جیسا کہ فرماتا ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ (حاقه: ۳۰، ۳۲)

(ھ) گرم جلانے والی ہوا (یا جلا ڈالنے والی آگ) ان پر مسلط ہو گی۔

(و) (وہ) زہریلی گرم ہوا اور کھولتے پانی (میں ہوں گے)

فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ (واقعه: ۴۲)

(ز) اور وہ سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ اس میں آرام و آسائش ہو گی۔

وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾ (واقعه: ۴۳، ۴۴)

''یعنی وہ تھوہر کے درخت سے کھائیں گے اور کھولتا ہوا پانی پئیں گے''

(ح) پھر یقیناً اے گمراہوں، جھٹلانے والو! تم تھوہر کے درخ[1] ت سے کھانے والے، اسی سے اپنے پیٹوں کو بھرنے والے ہو گے، پھر اس کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی پینے والے ہو گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ (واقعه: ۵۱ تا ۵۴)

---

[1] قرآن کریم میں ایک اور مقام پر اس درخت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: "انها شجرة تخرج فی آصل الجحیم طلعها کانه رُؤس الشیاطین (صافات ۶۵:۶۴) ایک درخت ہے جو دوزخ کے درمیان میں اگتا ہے اور اس کے پھل شیاطین کے سروں کی مانند ہیں''۔ اس بارے میں کہ شیاطین سے کیا مراد ہے کئی اقوال بیان کیے گئے ہیں جن میں مناسب ترین یہ ہے کہ جس طرح شیطان انسانی ذہنوں میں ایک بھیانک و ناخوشگوار تصور رکھتا ہے، اسی طرح اس تشبیہ سے میوۂ زقوم کی بھیانک و ناخوشگوار کیفیت مقصود ہے۔ اس طرح یہ تشبیہ ایک پہلو سے مجہول قرار نہیں پاتی۔

اصحاب شمال کی اقسام ومراتب

سورہ مبارک واقعہ کی آیات کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ نیک وسعادت مند انسان دو قسموں اور دو جماعتوں میں ہوں گے، ''سابقون اور اصحاب یمین'' جبکہ اشقیا وظالمین کی ایک ہی جماعت ''اصحاب شمال'' کہلانے والی ہوگی۔ تاہم جیسا کہ آپ نے دنیا میں ان کے اوصاف اور ان کی دنیوی بڑائی کو ملاحظہ فرمایا تو یہ سب اوصاف دوزخ میں جانے والوں ہی کے نہ ہوں گے کیونکہ یہ سب مذکورہ صفات کافروں، مشرکوں اور تجاوز کرنے والوں کی ہیں۔ اس کے برعکس جو مسلمان گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے، بغیر توبہ کیے دنیا سے چلے جائیں گے اور جوان لوگوں میں شامل ہوں گے جن کی شفاعت ہوسکے گی، ان میں شامل نہیں ہوں گے۔

بالفاظ دیگر صرف کافر ومشرک ہی دوزخ میں نہیں ڈالے جائیں گے بلکہ بعض گناہگار مومنین بھی، قرآن پاک کے حکم صریح اور روایات کے مطابق وارد دوزخ ہوں گے، اگرچہ وہاں مستقل طور پر نہ رہیں گے۔ [1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سورہ واقعہ کی ان آیات کے ظاہر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب دوزخی اصحاب شمال کے زمرہ میں آتے ہیں تو پھر دوزخ میں جانے والے وہ افراد جو کافر، مشرک، منافق نہیں تھے اور نہ ان کو مترفین یعنی تجاوز کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، کس طرح اصحاب شمال کے زمرہ میں شامل قرار پائیں گے؟ (یہ ان تمام اوصاف کی بنا پر ہے جن کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے)

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اصحاب شمال میں تمام دوزخی شامل ہیں، لیکن آیات مذکورہ میں جن اوصاف وعلامات کو بیان کیا گیا ہے وہ دوزخیوں کی غالب اکثریت سے متعلق ہیں یعنی دوزخیوں کی اکثریت کافرو، مشرکوں، منافقوں اور مترفین پر مشتمل ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو بدترین کیفیت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے بہشت میں بھی مراتب مقرر ہیں۔ علی ہذا القیاس دوزخ کے بھی درجات ہیں جن کے لحاظ سے دوزخی مختلف درجات میں ہوں گے۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ (ال عمران: ۱۶۳)

''یہ لوگ (بہشتی ودوزخی) اللہ تعالیٰ کے حکم سے الگ الگ درجات میں ہوں گے''

لہٰذا متذکرہ بالا صفات کی بنا پر ''اصحاب شمال'' کی اصطلاح تین مطالب رکھتی ہیں:

۱۔ دوزخیوں کی تعداد اکثریت میں وہ افراد غالب ہوں گے جو بیان شدہ صفات کے حامل ہوں گے۔

---

[1] وہ تمام لوگ جنہیں دوزخ کی وعید دی گئی ہے، ان میں ایسے افراد شامل ہیں جو کسی بے گناہ مومن کے قتل کے مرتکب ہوئے ہوں (سورہ نساء: ۹۳) یا جنہوں نے میدانِ جہاد سے فرار کیا ہو (سورہ انفال: ۱۶) یا جنہوں نے سونے و چاندی کو خزانہ کیا ہو (سورۃ توبہ: ۳۵) وغیرہ وغیرہ

۲۔ عذاب کی کیفیت و مراتب مختلف ہوں گے کیونکہ ان کو شدید تر عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ جیسا کہ منافقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ‌ۚ (نساء: ۱۴۵)

''یعنی منافقین دوزخ کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے''

اسی طرح کافروں کے متعلق فرماتا ہے:

وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ‌ؕ (بقرہ: ۸۵)

''یعنی قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب کی طرف پھیرا جائے گا''

۳۔ ان لوگوں کے لیے عذاب کی ہمیشگی ودوام

متذکرہ بالاخصوصیات اس بات کی موجب ہیں کہ قرآن پاک ''اصحاب شمال'' کی صفات میں صرف کفر وشرک واستکبار واعتراف میں زیادتی کو ہی بیان فرماتا ہے۔

یہ سب کچھ صرف ''اصحاب شمال'' کی جملہ صفات کا بیان ہے۔ اب ہم ان لوگوں کی صفات کو بیان کرتے ہیں۔ جو ''اصحاب شمال'' کے مصادق میں شمار ہوتے ہیں۔

(ب) ظالم وستم گر

جن افراد کو قرآن حکیم نے ظالم کہا ہے ان کے بارے میں کامل بحث کے لیے جہاں ان کی جملہ صفات وحالات دنیوی واخری کو بیان کیا جائے، علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم صرف ان کی کیفیات اخروی کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:

(الف) ان میں کسی کی شفاعت یا حمایت نہیں کی جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ (بقرۃ: ۲۷۰)

''اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا''

مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ وَّلَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ؕ (مومن: ۱۸)

''ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مان لی جائے''

(ب) ''ظالمین پر دردناک عذاب ہوگا''

وَاَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۳۷﴾ (فرقان: ۳۷)

اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۲﴾ (ابراھیم: ۲۲)

(ج) ''اور ظالموں کا (بھی کیا) برا ٹھکانہ ہے''

وَبِئۡسَ مَثۡوَى الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾ (ال عمران: ۱۵۱)

''اور ان کے لیے بہت برا گھر (جہنم) ہے''

وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ (مومن: ۵۲)

(د) ''تب ایک منادی ان کے درمیان ندا کرے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے''

نَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ (اعراف: ۴۴)

(ھ) ''ہم نے ظالموں کے لیے وہ آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں گھیر لیں گی''

اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِیۡنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَا ؕ (کھف: ۲۹)

(و) ''ظلم حسرت واندوہ سے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگے گا''

وَیَوۡمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى یَدَیۡهِ (فرقان: ۲۷)

(ز) ''اُس دن ظالموں کو نہ عذرخواہی کام آئے گی اور نہ ان کی شنوائی ہوگی''

فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَا هُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۵۷﴾ (روم: ۵۷)

یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ (مومن: ۵۲)

(ح) ان سے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال کی جزا کا مزہ چکھو۔

یہ باتیں عذاب روحانی کی اقسام کے سلسلہ میں ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے اسی وقت بہشت والوں سے کہا جائے گا کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب اور انعام تمہارے ان اعمال کے نتیجہ میں ہے جو تم نے دنیا میں انجام دیئے، یہ بھی معنوی و روحانی قسم کا انعام ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ قِیۡلَ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡخُلۡدِ ۚ هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۵۲﴾ (یونس: ۵۲)

(ط) ”اور چونکہ یہ لوگ ظالم تھے ان پر (عذاب کا) وعدہ پورا ہو گیا۔ پھر یہ لوگ کچھ بول نہ سکیں گے“

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ ﴿٨٥﴾ (نمل: ٨٥)

(ی) ”(اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) جو لوگ سرکشی کرتے تھے، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اور خدا کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے تھے، ان (سب) کو اکٹھا کر، پھر انہیں جہنم کی راہ دکھاؤ“

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾ (صافات: ٢٢، ٢٣)

(ج) کافر و مشرک

۱۔ قرآن کریم نے کافروں اور مشرکوں کو ہمیشہ کے لیے دوزخی اور بدترین انسانوں کے طور پر متعارف کرایا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿٦﴾ (بینة: ٦)

”بے شک اہل کتاب اور مشرکین سے جو لوگ (اب تک) کافر ہیں وہ دوزخ کی آگ میں (ہوں گے اور) ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں“

۲۔ قیامت میں کافر بہرے، اندھے اور گونگے محشور ہوں گے اور ان پر عذاب ہمیشہ بڑھتا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (اسرائیل: ٩٧، ٩٨)

”ہم ان لوگوں کو منہ کے بل اوندھے، گونگے اور بہرے (قبروں سے) اٹھائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے کہ جب کبھی بجھنے کو ہوگی تو ہم ان لوگوں پر (اُسے) اور بھڑکا دیں گے۔ یہ سزا ان کی اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا“

۳۔ عذاب کے طوق و زنجیر ان کے ہاتھوں اور گردنوں میں ڈال دیئے جائیں گے۔

وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ (سباء: ٣٣)

”اور جو لوگ کافر ہو گئے ہم ان کی گردنوں میں طوق ڈلوا دیں گے“

إِنَّا جَعَلْنَا فِىٓ أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَٰلًا فَهِىَ إِلَى ٱلْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ ﴿٨﴾ (یٰس: ۸)

''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں کہ وہ گردنیں اٹھائے ہوئے ہیں''

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا ﴿٤﴾ (دھر: ۴)

''ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں، طوق اور دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے''

۴۔ ''غرض جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں (وہ انہیں پہنائے جائیں گے)''

فَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ ۖ (حج: ۱۹)

''اور وہ (قیامت کا) دن کافروں پر بہت سخت ہوگا''

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ عَسِيرًا ﴿٢٦﴾ (فرقان: ۲۶)

''پس وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا، آسان نہیں ہوگا''

فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾ (مدثر: ۹، ۱۰)

''اور ہم نے تو کافروں کے لیے سخت ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے''

وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٣٧﴾ (نساء: ۳۷)

''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے''

ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ (فاطر: ۷)

''اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیات سے انکار کیا ان کے لیے سخت قسم کا دردناک عذاب ہوگا''

وَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ ﴿١١﴾ (جاثیہ: ۱۱)

د۔ حقائق دینی کا انکار کرنے والے

ظالم لوگوں میں قیامت کے دن ان لوگوں کی جماعت بھی ہوگی جو حقائق دینی کی تکذیب کرتے ہوں گے۔ قرآن کریم ان کا ''مکذبین'' کے لفظ سے تعارف کرواتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عنوان کے صحیح مصداق کافر و مشرک ہی ہیں جن کو سورہ واقعہ میں اصحاب شمال کے نام سے متعارف کروایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک ''مقربان'' و ''اصحاب یمین'' کے ذکر کے بعد فرماتا ہے:

وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُكَذِّبِينَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٩٣﴾ وَتَصْلِيَةُ

جَحِیۡمٍ ﴿۹۴﴾ (واقعه: ۹۲۔۹۴)

''اور اگر جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو (اس کی) مہمانی کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں داخل کر دینا''

ایک اور مقام پر ان کا روزِ قیامت کو جھٹلانے والوں کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۱۱﴾ (مطففین: ۱۰،

۱۱)

''اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے، جو لوگ روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں''

پھر ایک اور آیت میں ان کا تعارف ان لوگوں کے طور پر کروایا گیا ہے جو گمراہی وضلالت میں بہت بڑھ گئے اور حقیقت کو کھیل سمجھنے لگے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ خَوۡضٍ یَّلۡعَبُوۡنَ ﴿۱۲﴾ (طور: ۱۱، ۱۲)

''پس اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے، جو لوگ باطل میں پڑے کھیل رہے ہیں'' (یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کا تمسخر اڑا رہے ہیں)۔

ہر صورت میں ''مکذبین'' کی حالت بہت زیادہ ناگوار و ناگفتہ بہ ہوگی۔ قرآن مجید نے متعدد آیات میں ان کے برے اور ناگوار انجام کے لیے لفظ ''ویل'' استعمال کیا ہے۔ سورہ ''مرسلات'' میں یہ لفظ دس مرتبہ آیا ہے اور سورہ ہائے ''مطففین'' و ''طور'' میں بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر ان کے انجام کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ ان کو کچھ کہنے یا عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے:

ہٰذَا یَوۡمُ لَا یَنۡطِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَ لَا یُؤۡذَنُ لَہُمۡ فَیَعۡتَذِرُوۡنَ ﴿۳۶﴾ (مرسلات: ۳۵، ۳۶)

''یہ دن (روزِ قیامت) ہے کہ وہ بول نہیں سکیں گے اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ عذر کر سکیں''

۲۔ ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی طرف روانہ ہو جائیں جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ فرماتا ہے:

اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۹﴾ (مرسلات: ۲۹)

''(ان سے کہا جائے گا) اُس چیز کی طرف چلو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے''

۳۔ انہیں اس دھوئیں کی طرف جس کا نہ سایہ ہوگا اور نہ انہیں دوزخ کی آگ سے بچا سکے گا، بھیجا جائے گا۔ ارشاد ہے:

اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیۡلٍ وَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ اللَّہَبِ ﴿۳۱﴾

(مرسلات: ۳۰، ۳۱)

''تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو وہ نہ ٹھنڈا ہے اور نہ ہی آگ کی لپیٹ سے کفایت کرے گا''

۴۔ آگ کے شعلے اڑ رہے ہوں گے گویا وہ محلوں اور زرد اونٹوں کی مانند ہوں گے۔ ارشاد ہے:

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ (مرسلات: ۳۲، ۳۳)

''یقیناً وہ (آگ) محل کی مانند چنگاریاں پھینکتی ہوگی گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں''

۵۔ ان کے شکم زقوم کے پھلوں اور دوزخ کے کھولتے ہوئے پانی سے بھریں گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ (واقعہ: ۵۱ تا ۵۴)

''پھر یقیناً اے گمراہو! جھٹلانے والو! تھوہر کے درخت سے کھانے والے، پھر اسی سے اپنے شکموں کو بھرنے والے ہو۔ پھر اُسی پر کھولتا ہوا پانی پینے والے ہو گے''

ھ۔ فاجرین و مجرمین

ظلم و ستم کرنے والوں کے لیے قیامت میں ''فاجران و مجرمان'' کے دو عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید ان کی اخروی کیفیت کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:

(الف) قیامت کے دن مجرم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں گے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ (روم: ۱۲)

''اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم نا امید ہو کر رہ جائیں گے''

(ب) وہ اترے ہوئے اور غم زدہ چیزوں سے وارد محشر ہوں گے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ (عبس: ۴۰ تا ۴۲)

''اور اس دن کئی چہرے (ایسے ہوں گے کہ) ان پر غبار (پڑا) ہوگا، ان پر سیاہی چھائے گی یہی تو (عقیدتاً) کافر اور (عملاً) فاجر ہوں گے''

(ج) اپنے مخصوص صورتوں کے ساتھ اس طرح وارد محشر ہوں گے کہ صاف پہچانے جائیں گے۔

يُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِيۡمٰهُمۡ (الرحمن: ۴۱)

''مجرم اپنی نشانیوں سے پہچانے جائیں گے''

وَنَحۡشُرُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ زُرۡقًا ﴿۱۰۲﴾ (طٰه: ۱۰۲)

''اور تمام مجرم اس دن نیلی آنکھوں کے ساتھ محشور کیے جائیں گے''

(د) ''اور اعمال نامے پیش کیے جائیں گے۔ پھر مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اُن میں (درج) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے اے ہماری خرابی یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ نہ کسی چھوٹی بات کو چھوڑتا ہے، نہ ہی بڑی بات کو، مگر یہ کہ اس نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے''

وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَيَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ

هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰىهَا ۚ (کهف: ۴۹)

''اور اگر تو دیکھے جب گناہگار اپنے پروردگار کے حضور سر جھکائے ہوئے حاضر ہوں گے''

وَلَوۡ تَرٰٓى اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ (سجده: ۱۲)

''جس دن وہ (دوزخ کی) آگ میں اپنے منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے''

يَوۡمَ يُسۡحَبُوۡنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ ؕ (قمر: ۴۸)

مجرموں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی جو اپنی نجات کی خاطر اپنے نزدیک ترین عزیزوں کو بھی دے دینے پر تیار ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ يَفۡتَدِىۡ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِئِذٍۢ بِبَنِيۡهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيۡهِ ﴿۱۲﴾

وَفَصِيۡلَتِهِ الَّتِىۡ تُـئْوِيۡهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ ثُمَّ يُنۡجِيۡهِ ﴿۱۴﴾ (معارج: ۱۱ تا ۱۴)

گناہگار خواہش کرے گا کہ کاش اس دن کے عذاب سے (بچنے کے لیے) وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے کنبہ کا جو اسے ٹھکانہ دیتا ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ان سب کا فدیہ دے دے، پھر وہ (فدیہ) اسے نجات دے''

(ح) ان کے ہاتھوں اور گردنوں میں طوق و زنجیر پڑے ہوں گے۔ فرماتا ہے۔

وَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ﴿۴۹﴾ (ابراهيم: ۴۹)

''اور اس دن مجرموں کو طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا دیکھو گے''

(ط) ان کے لباس اُس دن پگھلے ہوئے تانبے کے ہوں گے۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ (ابراھیم: ۵۰)

''ان کے کرتے تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی''

مجرموں کو دوزخ میں سقر کے مقام پر پھینکا جائے گا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ (مدثر: ۴۲)

''ان سے کہا جائے گا دوزخ کا مزہ چکھو''

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ○ (قمر: ۴۸)

''(ان سے کہا جائے گا) دوزخ کی آگ کے چھونے کا مزہ چکھو''

(ل) مجرم ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ (زخرف: ۷۴)

''یقیناً مجرم جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والوں ہوں گے''

مجرم کون ہیں

مجرموں کی جو صفات اور علامات قرآن پاک نے بیان فرمائی ہیں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ یہ لوگ کافر و مشرک تھے۔ حقائق دینی اور دین دار لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے اور قیامت و حیات بعد از موت کے معتقد نہ تھے۔ مندرجہ ذیل آیات مبارکہ اُن کی اس کیفیت کی آئینہ دار ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ (مطففین: ۲۹)

''بے شک مجرم لوگ مومنوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے''

دوزخ کو جھوٹ جانتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (الرحمن: ۴۳)

''(ان سے کہا جائے گا) یہی وہ جہنم ہے جسے مجرم جھٹلایا کرتے تھے''

ایک آیت میں مجرموں کا مسلمانوں کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مجرم کون ہیں۔ وہ مسلمانوں کے برابر نہیں

ہیں۔جیسا کہ فرماتا ہے:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ (قلم: ۳۵)

''کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے''

جب دائیں ہاتھ (میں اعمال ناموں) والے مجرموں سے پوچھیں گے کہ تم اس برے انجام کو کیوں پہنچے، تو وہ جواب دیں گے:

(الف) ''ہم نماز نہیں پڑھتے تھے'' لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۴۳﴾

(ب) ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ ﴿۴۴﴾

(ج) ہم تخریب کاری اور بے ہودگی میں (مصروف) رہتے تھے وَکُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ ﴿۴۵﴾

(د) روز قیامت کا انکار کرتے تھے وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۴۶﴾ (مدثر: ۴۳ تا ۴۶)

۵۔ ''اور وہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کے ساتھ دشمنی کرتے تھے''

وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ (فرقان: ۳۱)

''فرعون اور اس کی قوم مجرم جماعت تھے۔ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ (یونس: ۷۵)

''پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد موسیٰ و ہارونؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کے پاس بھیجا تو وہ لوگ اکڑ گئے اور وہ تھے ہی مجرم''

۷۔ مجرم نہ صرف خود گمراہ تھے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔اہل دوزخ کی ایک جماعت کہے گی:

وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۹۹﴾ (شعراء: ۹۹)

''اور ہم کو ان مجرموں نے گمراہ کیا''

ان تمام آیات (اور قرآن مجید کی دوسری کئی آیات) سے بھی روشن ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں مجرم گمراہوں ہی کی ایک جماعت ہیں جو نہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے دشمنی کا اظہار کرتے تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتے تھے، مومنوں کا مذاق اڑاتے تھے، اللہ تعالیٰ کی تمام نشانیوں کا انکار کرتے اور دنگا و فساد کے علاوہ اور کچھ نہ کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان کے قطعی منافی ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں یہ مجرمین خدا پرستی اور فضائل انسانی کے سخت ترین دشمن شمار ہوتے ہیں۔لہٰذا قیامت میں یہ لوگ شدید ترین عذاب کا نشانہ بنیں گے جیسا کہ ہم نے آیاتِ

قرآن پاک سے ان کے بعض حالات کا ذکر کیا ہے۔

و۔ قیامت میں منافقوں کی حالت

صفت منافقت انسان کی مذموم ترین صفات میں سے ہے۔ اسی لیے منافقوں کو اسلام کے خطرناک ترین دشمن شمار کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں منافقت اور منافقین کے بارے میں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں منافقین کے متعلق قرآن مجید کی آیات دو حصوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ آیات جو منافقین کی دنیوی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

۲۔ آیات جو منافقین کی اخروی کیفیت کی مظہر ہیں۔

حصہ اول کے سلسلہ میں بہت سی آیات کا چوتھی جلد میں ذکر کیا گیا ہے جو منافقین کے اعتقادات، اخلاق، سیاست، نظم وضبط وغیرہ سے بحث کرتی ہیں۔ اب جس چیز پر ہم یہاں مفصل طور پر بحث کرنا چاہتے ہیں وہ منافقین کی کیفیت دنیوی ہے جس کے بارے میں تین پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے۔

۱۔ منافقین کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے

۲۔ منافقین کا رابطہ مسلمانوں سے

۳۔ مناقفین کا رابطہ کافروں اور مشرکوں سے

منافقین اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رابطہ

منافق دل سے اللہ اور اس کے احکام کے معتقد نہ تھے لیکن بظاہر ایمان کے دعویدار تھے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے ناروا طریق نفاق پر کاملاً عمل پیرا تھے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو جھوٹ شمار کرتے اور عملاً وجودِ باری تعالیٰ کو سپرد فراموشی کیے ہوئے تھے۔ اس سلسلہ کی چند آیاتِ قرآن مجید میں اس طرح ہیں۔

۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ‏﴿۸﴾ (بقرہ: ۸)

''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو (زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ (دل سے) ایمان نہیں لائے''

۲۔ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ (نسآء: ۱۴۲)

’’بے شک منافقین (اپنے خیال سے) اللہ کو فریب دیتے ہیں‘‘

۳۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ (توبہ: ٦٧)

’’یہ لوگ اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے بھی (گویا) انہیں بھلا دیا‘‘

۴۔ وَإِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ إِلَّا غُرُوْرًا ⑫ (احزاب: ١٢)

’’اور منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جھوٹے وعدوں کے سوا اور کوئی بات نہیں کی‘‘

۵۔ وَاللّٰهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ (نساء: ٨٨)

’’اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کے سبب انہیں (گمراہی کی طرف) الٹ دیا‘‘

٦۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮ (بقرہ: ١٥)

’’اللہ تعالیٰ انہیں ان کے استہزاد کی سزا دے گا اور اُن کی سرکشی میں ڈھیل دیتا رہے گا تا کہ وہ اسی حال میں سرگرداں رہیں‘‘

منافقین اور مومنین کے درمیان رابطہ

اس کیفیت سے متعلق بہت آیات ہیں لیکن ان کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ منافقین کی جماعت ظاہری طور پر مسلمانوں کے گروہ میں اپنے آپ کو شامل کرتی تھی، تمام مقامات پر جہاں مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا، وہ بھی فائدہ حاصل کرتے، مگر جہاں کوئی خطرہ سامنے آتا یا دشوار حالات کا سامنا ہوتا تو وہ طرح طرح کے بہانے بنا کر مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیتے، مسلمانوں کے خلاف دشمنانِ اسلام کو مخبری کرتے اور اس طرح دوستی کے پردہ میں مسلمانوں کے بدترین دشمن شمار کیے جاتے تھے۔ اس بارے میں قرآن مجید میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ ۙ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ (بقرہ: ١٤)

’’اور جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ خلوت میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اس کے سوا نہیں کہ ہم مسلمانوں کی ہنسی اڑانے والے ہیں‘‘

۲۔ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى

يَنْفَضُّوْا ؕ(منافقون: ۷)

''یہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کے پاس ہیں ان پر خرچ مت کرو تا کہ وہ متفرق ہو جائیں''

۳۔ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝۴۷(توبہ: ۴۷)

''اگر وہ (منافقین) تمہارے ساتھ ہوکر (جہاد کے لیے) نکلتے تو سوائے خرابی کے اور کچھ نہ بڑھاتے اور تمہارے لیے فتنہ (پھیلانے) کی غرض سے تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے۔ اور تم میں اُن کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خوب واقف ہے''

۴۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ۝۸۱ (توبہ: ۸۱)

''(منافقین) پیچھے بیٹھ رہنے والے رسولؐ اللہ کے پیچھے بیٹھ رہنے پر خوش ہو گئے اور اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کریں اور کہنے لگے کہ گرمی میں (جہاد کے لیے) نہ نکلو۔ (اے رسولؐ) ان سے کہہ دو کہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے۔ کاش کہ وہ سمجھتے ہوتے''

منافقین اور کافروں کے درمیان رابطہ

منافقین اور کافروں کے عقیدے اور ہدف مشترک تھے کیونکہ یہ دونوں جماعتیں اللہ تعالیٰ اور قیامت پر اعتقاد نہ رکھتی تھیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر بھی ایمان نہ رکھتی تھیں، ایک طرح اسلام کو اپنی مادی و دنیوی منفعت کے لیے نقصان دہ جانتی تھیں۔ اسی لیے اسلام اور مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کرنے (یا کم از کم اسلام کے پھیلنے کے خلاف دونوں متحد اور معاہدہ کیے ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ منافقین کا کفار و مشرکین کے ساتھ دوستانہ رابطہ تھا۔ لیکن منافق چونکہ صرف اپنے مقاصد کے حصول کے بارے ہی میں سوچتے تھے اور کفار و مشرکین سے دوستی بھی اسی غرض سے رکھتے تھے کہ اپنے مقاصد کو محفوظ رکھ سکیں۔ لہٰذا ہمیشہ کوشش کرتے کہ خطرہ کے مواقع میں اپنے آپ کو محفوظ رکھیں تا کہ انہیں کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔

بالفاظِ دیگر منافقین اگرچہ کافروں اور مشرکوں کے ساتھ مشترک عقیدہ وہدف رکھتے تھے، تاہم ان کے ساتھ بھی رویہ منافقانہ ہی تھا۔

قرآن کریم کافروں کے ساتھ ان کے منافقانہ کردار کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ (حشر: ۱۱۔ ۱۲)

''کیا تو نے منافقوں کو نہیں دیکھا کہ وہ اپنے ان بھائیوں سے جو اہل کتاب میں سے کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور ہم تمہارے بارے میں کسی کی کبھی اطاعت نہ کریں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضروری تمہاری مدد کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے ان سے اگر جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اگر انہوں نے ان کی مدد کی بھی تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر وہ مدد نہیں دیئے جائیں گے''

منافقوں کی آخرت میں حالت

اب جبکہ ہم منافقین کے حالات دنیوی سے کسی قدر آگاہ ہو گئے، ان کے حالاتِ آخرت کو موردِ بحث قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی آیات قرآن مجید کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منافقین کا کفار سے رابطہ

۲۔ منافقین کا مومنوں سے رابطہ

۳۔ منافقین کی اپنی کیفیت دوسروں سے رابطہ کے بغیر

موردِ اول کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۨ ﴿۱۴۰﴾ (نساء: ۱۴۰)

''اللہ تعالیٰ سب منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں جمع فرمائے گا''

ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ (توبہ: ۶۸)

''اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے جہنم کا وعدہ فرمایا ہے''

اس جماعت کے متعلق ان آیات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ چونکہ منافق عقیدہ کے اعتبار سے کفار ہی جیسے ہیں اس لیے دونوں کا انجام ایک ہوگا اور وہ دائمی عذاب دوزخ ہے۔

قیامت میں مومنین کے ساتھ رابطہ منافقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٣﴾ (حدید: ۱۳)

''قیامت کے دن منافق مومنوں سے کہیں گے کہ ہماری نظر کرو تا کہ تمہارے چہرہ کے نور سے کسی قدر بہرہ مند ہو سکیں۔ مومنین ان کے جواب میں کہیں گے کہ اپنے پیچھے کی طرف دیکھو اور نور کی درخواست کرو۔ پس دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی اور اس میں ایک دروازہ نصب کردیا جائے گا جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور باہر عذاب الٰہی ہوگا''

اس آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے منافقین نے جس قدر دنیا میں اظہار ایمان کیا ہوگا، مومنین میں شریک وشامل رہے ہوں گے، ان تمام لطف ہائے زندگی سے بہرہ مند ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کو نصیب ہوئے، آخرت میں بھی اپنی اسی روش ومنفعت کے امیدوار ہوں گے اور مومنین سے خواہش رکھیں گے کہ اس نور سے جو انہیں (مومنین کو) بلندی عقیدہ، نیک نیت اور اعمال صالح کی وجہ سے حاصل ہوا ہے، منافقین کو بھی فائدہ حاصل ہو۔ لیکن دوسری دنیا یعنی آخرت میں چونکہ منافقین کی اس درخواست کی قبولیت ممکن نہیں اس لیے اسے رد کردیا جائے گا اور انہیں عذاب الٰہی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اب رہی تیسری صورت یعنی منافقین کی کیفیت مومنین وکفار دونوں سے قطع نظر کرتے ہوئے، تو اس کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٣٨﴾ (نساء: ۱۳۸)

''منافقوں کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ (نساء: ۱۴۵)

''یقیناً منافق دوزخ کے پست ترین درجہ میں ہوں گے''

منافقین کے لیے شدتِ عذاب کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ علاوہ اس کے کہ اللہ اور اس کے دین یعنی اسلام پر ایمان نہ رکھتے تھے، اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی رکھتے تھے، ان دو موارد میں تو وہ کفار و مشرکین کے برابر ہی تھے لیکن ان چیزوں کے ساتھ ہی ساتھ وہ منافقت جیسی ذلیل صفت کے حامل بھی تھے جس کے باعث اسلام کو کفار کی نسبت ان سے زیادہ خطرہ درپیش تھا۔

اسی بنا پر ماننا پڑے گا کہ نفسیاتی طور پر اور عمل ظاہری کے طور پر بھی یہ لوگ عداوت اسلام میں کفار سے بڑھے ہوئے تھے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ان کی اس دنیوی کیفیت کے پیش نظر عذاب آخرت ان پر کفار کی نسبت سخت تر ہوگا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تفسیر موضوعی

جلد دہم

قرآن کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

ترجمہ

مولانا قیصر عباس

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قافلہ انسانیت کے عظیم رہنما

بشری دنیا کے دگرگوں میدان میں جہاں ہر طرف خود پرستی کے سائے نظر آتے ہیں، جہاں انسانیت ہمیشہ تنگ نظری کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے، وہیں پر مختلف معاشروں میں ایسے انسان پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے انسان کو راہ نجات دکھائی۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ خودغرضی اور خود پرستی جیسی بُری صفات سے مبرا تھے بلکہ انہوں نے انسانی معاشروں کو تہذیبِ نفس، پاکیزگی روح، محبت اور کمزور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کی طرف دعوت دی۔ انہوں نے فتنوں اور جنگوں کی آگ کو ایک حد تک خاموش کر دیا۔ بسا اوقات تو انہوں نے اپنی جان کو بھی اپنے مقصد پر قربان کر دیا۔ وہ اس قربانی پر خوش وخرم تھے۔

تمام مصلحین مذکورہ بالا چیزوں میں شریک ہیں لیکن ایک لحاظ سے ان کا آپس میں فرق ہے اور یہی فرق ہے جس کی وجہ سے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

i۔ مصلحین الٰہی

ii۔ مصلحین بشری

زیر نظر کتاب تفسیر موضوعی "منشور جاوید" کی دسویں جلد ہے۔ اس میں خدائی اور الٰہی رہبروں کی خصوصیات کو قرآنی نکتہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

خدا کی طرف سے مقرر کردہ راہنماؤں کے بارے میں دو طرح سے گفتگو کی جاسکتی ہے:

۱۔ انبیاء سے متعلق کلی اور عمومی بحث، مثلاً پیغمبروں کی بعثت کا ضروری ہونا، اس بعثت میں ان کے مقاصد، عالم غیب سے ان کے رابطے کا ذریعہ ایک دوسرے سے متعلق پیغمبروں کی ذمہ داریاں، الٰہی مصلحین کی خصوصیات، ان کی معلومات کی بنیاد، جھوٹے نبیوں سے ان کے امتیاز کا ذریعہ تبلیغ کے سلسلے میں ان کا طریقہ کار اور ان کی دعوت پر لوگوں کا ردعمل وغیرہ۔ یہ سب موضوعات انبیاء سے متعلق بحث کا عمومی اور کلی حصہ ہیں۔

۲۔ انبیاء کے حالات زندگی کو قصص الانبیاء کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن کا ایک حصہ انہی تذکروں پر مشتمل ہے۔ زیر نظر کتاب پہلے حصے سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ اس تفسیر کی آئندہ جلدوں میں بیان کیا جائے گا۔ امید ہے کہ ہمیں خدا کے لطف سے ان کے لکھنے کی بھی توفیق حاصل ہوگی۔

راقم خدا کا شکر گزار ہے کہ ایک مسلسل اور طاقت فرسا کوشش کے بعد حقائق قرآن کے شیدائیوں کیلئے اس تفسیر کی دس (۱۰) جلدیں مکمل ہوگئی ہیں۔ ان کا ایک بڑا حصہ اعتقادی مسائل سے مربوط تھا۔ یہ ابحاث توحید سے لے کر قیامت تک تھیں اس کا ایک مختصر حصہ قرآن کے اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق تھا۔ ہم اس سلسلے میں اپنی پیش رفت کو اس حوصلہ افزائی اور سود بخش اور تعمیری تنقید کا مرہون منت سمجھتے

ہیں جو قارئین سے ہم تک پہنچی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سلسلہ بھی جو فارسی میں تفسیر موضوعی کے نام سے شائع ہو رہا ہے اسی سلسلہ کی طرف جو عربی میں ''مفاہیم القرآن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خدا کے قرب کا باعث اور بندگان خدا کی ہدایت کا ذریعہ بنے گا۔

آخر میں ہم حجۃ الاسلام جناب شیخ علی ربانی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں ہماری بہت مدد کی ہے۔

جعفر سبحانی

قم......مؤسّسہ امام صادقؑ

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

۱۔ انبیاء الٰہی کی بعثت اور مخالفین کے دلائل [۱]

تمام آسمانی ادیان کے برخلاف ''براہمہ'' نامی ایک گروہ خدا کی جانب سے انبیاء کی بعثت کو ایک غیر ممکن اور محال کام تصور کرتا ہے۔ ملل ونحل [۲] اور علم کلام کی کتابوں میں ان کے کمزور اور بے بنیاد دلائل کو بیان کیا گیا ہے ہم اجمالی طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔

پہلی دلیل

اُن کی پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ

عقلی حوالے سے انبیاء کا پروگرام دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

عقلی فیصلوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا

عقلی فیصلوں کے خلاف ہے۔

پہلی صورت میں تو انبیاء کی بعثت کا کوئی مقصد ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ایک بیہودہ اور فضول کام ہوگا۔

دوسری صورت میں ان کا پروگرام قابل قبول نہیں ہے۔

اس دلیل کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ انبیاء پروگرام قطعی طور پر عقل کے فیصلوں سے ہم آہنگ ہے۔ (البتہ جہاں بہتر تھا کہ اس بحث میں وارد ہونے سے پہلے ''نبی'' اور ''نبوت'' کے کلمات سے متعلق واضح اور تفصیلی گفتگو کی جاتی لیکن مقدمے میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے (کہ انسانی معاشروں میں دو طرح کے راہنما ہوتے ہیں) نیز اس بات کے پیش نظر کہ نبوت قرآن میں کے موضوع سے متعلق تفصیلی گفتگو آگے آئے گی اسے یہاں بیان نہیں کیا گیا۔)

پر عقول کوئی فیصلہ کرتی ہے) لیکن عقل جہاں پر فیصلہ کرتی ہے وہ کلیّ اور عمومی مسائل ہوتے ہیں۔ عقل ان کی جزئیات اور مصادق کو

[۱] بہتر تھا کہ اس بحث میں وارد ہونے سے پہلے ''نبی'' اور ''نبوت'' کے کلمات سے متعلق واضح اور تفصیلی گفتگو کی جاتی لیکن مقدمے میں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے (انسانی معاشروں میں دو طرح کے راہنما ہوتے ہیں) نیز اس بات کے پیش نظر کہ ''نبوت قرآن میں'' کے موضوع سے متعلق تفصیلی گفتگو آگے آئے گی، اسے یہاں بیان نہیں کیا گیا۔

[۲] ملل ونحل شہرستانی ج ا ص ۲۵۸'۲۵۹

بیان نہیں کرتی مثلاً عقل یہ تو کہتی ہے کہ مفید اور نفع بخش کام انجام دینے چاہیں اور نقصان دہ کاموں سے بچنا چاہیئے، لیکن کون سا کام فائدہ مند ہے اور کون سا نقصان وہ اس سلسلے میں عقل بالصراحت کوئی بات نہیں کرتی اس سلسلے میں وہ بیشتر شک وشبہ کا شکار رہتی ہے۔

عقل کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں ہے کہ وہ ایک کلی اور عمومی قانون کو بیان کرنے کے ساتھ اُس کی جزئیات کو بھی کسی کمی بیشی کے بغیر ذکر کر دے۔ دوسری طرف انسانی علم بھی اِن مسائل کا حل پیش نہیں کرسکتا کیونکہ ایک تو یہ کہ انسان کے علمی مطالعات محدود ہوتے ہیں اور عموماً اُن کا محور جسمانی نفع اور نقصان رہتا ہے دوسرے یہ کہ اس سلسلے میں اُن کے علم کی پہنچ محدود ہے بعثت انبیاء کے ناگزیر ہونے کے بارے میں گفتگو دلائل قرآنی کے حوالے سے ہم بعد ازاں کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان موضوعات اور جزئیات کے بیان کرنے کے لیے پیغمبروں کا آنا ایک ایسا عمومی اور کلی قانون ہے جسے عقل ہمیشہ بیان کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ انبیاء ان ڈاکٹروں کی مانند ہیں جو مریضوں سے کہتے ہیں کہ فلاں چیز کھاؤ تمہارے لیے اچھی ہے وہ چیز نہ کھاؤ تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ نظری اعتبار سے انسان لہ فلاح اور کامیابی دو چیزوں کے ساتھ ہے:

۱۔ اچھائی اور برائی کے محکم اور پائیدار قوانین کا بیان (حسن وقبح)

۲۔ اِن کلی قوانین کے مصادیق اور موارد کا بیان

پہلے حصے میں انبیاء کی بعثت کے سب سے بڑے مخالف ''براہمہ'' ہیں جو قلی فیصلوں پر اعتماد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خود انسان ان قوانین کے بیان کرنے پر قادر ہے لیکن انہیں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ شریعت اور رسالت کے احکام اور فیصلے اگرچہ عقلی فیصلوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن ایسی جگہ پر عقل کی رسائی دو جہت سے ناقص اور کمزور ہے۔ ایک تو مصادیق اور جزئیات کو بیان کرنے کے سلسلے میں اور دوسر کلی اور عمومی منابطوں اور قوانین کے سلسلہ میں عقلی فیصلوں کے محدود ہونے کے لحاظ سے۔

انبیاء کی بعثت کے مخالفین دوسرے مرحلے پر علمی کوششوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن مطالعات اور علمی کوششیں بھی اس سلسلے میں بڑی مشکل سے دوچار ہیں وہ یوں کہ علمی مباحث کا میدان محدود ہے۔ یہ کوششیں روح کے حقائق تک نہیں پہنچ سکتیں۔ فکری اور معنوی سودوزیاں کی شناخت میں بھی بے بس ہیں جب کہ انسان کی شخصیت کا اصل پہلو روح اور اُس کی خصوصیات ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ: اس دلیل کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں انبیاء کے پروگرام کو فقط دو حالتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے (عقل کے مطابق اور عقل کے مخالف) جب کہ ممکن ہے وحی کا حاصل ان دونوں کے علاوہ بھی کچھ ہو۔ یعنی اس بات کا امکان ہے کہ انبیاء وحی کے سائے میں ایک ایسا پروگرام پیش کریں جس کی بلندی پر کسی عالم اور دانش ور کی فکر کا پرندہ پر نہ مار سکے اگرچہ وہ کتنا ہی بلند پرواز کیوں نہ ہو ۔انبیاء کی شریعتوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اُن موضوعات اور مسائل پر زور دیتے تھے جن کے سلسلے میں اُس زمانے کے لوگ گمراہی اور غلطی کا شکار تھے۔ وہ توحید اور خدا پرستی کی طرف بلاتے تھے جب کہ انسانیت اُس وقت بُت پرستی اور شرک کی دلدل میں پھنسی ہُوئی تھی۔ اُس دور کے لوگ انسان کے لیے حیات بعد از ممات کو ایک امر محال یا بعید تصور کرتے تھے جب کہ تمام انبیاء نے

توحید کے بعد قیامت کو اپنی شریعت کے ایک اساسی رکن کے طور پر پیش کیا۔انہوں نے قیامت پر ایمان کے بغیر دین کو بے فائدہ قرار دیا۔

علاوہ ازیں انبیاء کی وہ تعلیمات جو عقلی فیصلوں سے ہم آہنگ ہیں وہ بھی فضول اور بے فائدہ نہیں ہیں کیونکہ یہ بھی عقلی نظریات اور حکام کی تائید کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ ایک موضوع پر پہلے ایک عقلی دلیل قائم کی جاتی ہے اور پھر اُسی کی تائید اور مضبوطی کے لیے ایک اور عقلی دلیل پیش کردی جاتی ہے یہاں پر کوئی مفکر انسان بھی دلیلوں کی تعداد کے زیادہ ہونے کو فضول اور بے فائدہ نہیں سمجھے گا (بالخصوص اگر جس موضوع پر دلیل لائی جارہی ہے وہ قابل اہمیت اور اساسی ہو) بلکہ اُسے مفید اور سودمند سمجھتے ہیں۔

دوسری دلیل

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آسمانی شریعتوں میں کئی ایسے احکام آئے ہیں جو بالکل بے فائدہ اور فضول ہیں۔ یا ان میں انسان کو کئی ایسے کاموں سے روکا گیا ہے جن میں اُس کا فائدہ ہے جیسے کعبے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا کعبے کا طواف حجر الاسود کا چومنا۔ اور بعض اوقات تو کئی کھانے اور پینے کی چیزوں سے روکا گیا ہے۔

یہ بات اُس صورت میں ان اسلامی تعلیمات کے درست ہونے میں کوئی شک پیدا کرسکتی ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان کاموں میں کوئی فائدہ اور مصلحت نہیں ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کا فائدہ اور اہمیت بالکل واضح ہے مثلاً اگر بعض چیزوں کے کھانے سے روکا گیا ہے تو اُن میں موجود نقصان اور مضر اثرات کی وجہ سے ہے۔خود انسان زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ علم اور تجربے کی روشنی میں ان کے مضر اثرات سے آگاہ ہو رہا ہے۔آج سائنس نے سور کے گوشت اور شراب کے نقصانات سے پردہ اٹھایا ہے۔معاشرے میں شرحِ اموات کے تیزی سے بڑھنے کی ایک وجہ ان چیزوں کا استعمال ہے۔

اگر دین نے یہ حکم دیا ہے کہ ایک خاص مکان کے طرف اپنی منہ کریں تو اس کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو اتحاد اور یگانگی کا درس دینا چاہتا ہے تا کہ وہ سب ایک مرکز کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔ حجر اسود کا چُومنا بُت شکن ابراہیم خلیل اللہ کے ساتھ تجدید عہد ہے کہ ہم کبھی بھی جادو توحید سے منہ نہیں پھیریں گے۔ یہ بالکل اپنے ملک کے پرچم کے سامنے تعظیم کی مانند ہے۔ یہ پرچم ظاہری طور پر تو صرف ایک کپڑا ہی ہے لیکن حقیقت میں یہ ملک کے استقلال اور آزادی کا مظہر ہے۔اس کی تعظیم ملک اور اُسکی آزادی کے احترام کے مترادف ہے۔اسلام کے عظیم راہنما نے پہلے دن سے ہی قرآن کی اتباع کرتے ہوئے ''علل الشرائع'' کنام سے ایک باب کھولا ہے جو اس طرح کے سوالوں کے جوابات دیتا ہے۔ یہاں تک ہم نے ''برہمنوں'' کے اعتراضات کو بیان کیا۔ان کے اعتراض فقط یہی نہیں ہیں جو یہاں پر ذکر کیے گئے ہیں بلکہ قاضی عبدالجبار نے ان کے اور بھی متعدد اعتراضات کو بیان کیا ہے۔ان کے متعلق تفصیلی گفتگو کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔اس کے لیے علمِ کلام کی تفصیلی کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] المغنی جلد ۱۵ ص ۱۰۹،۱۴۲

اسی طرح امکان بعثت کے منکرین فقط یہی نہیں ہیں بلکہ دو اور گروہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ تاریخ بشریت میں ایسے انبیاء کا آنا ضروری نہیں ہے۔ ان دو گروہوں میں سے ایک دہریے ہیں اور دوسرے نافیان تکلیف ہیں۔

ا۔ دہریے

دہریوں کا نظریہ (اس چیز کے برخلاف کہ جو آج اُن کے بارے میں سمجھی جاتی ہے یعنی خدا کے منکر) یہ ہے کہ خدا صرف کلی اور عمومی چیزوں کا عالم ہے جزئیات اور قابل تغیر چیزوں کے متعلق اُسے علم نہیں ہے۔ خدا کی جانب سے انبیاء پر وحی کا نازل ہونا ایک جزئی اور انفرادی بات ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس بات میں کسی قسم کا اشکال نہیں کہ خدا کی جزئیات کا بھی عالم ہو مخالفین کا اعتراض فقط یہ ہے کہ چونکہ جزئیات مسلسل تبدیل ہو رہی ہیں اگر خدا اِن کا بھی عالم ہو تو اِس کا معنی یہ ہے کہ اُس کی ذات میں بھی تبدیلی اور دگرگونی واقع ہو رہی ہے۔ [۱]

اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ تبدیلی اور دگرگونی معلوم میں ہے نہ کہ عالم میں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا کا علم جزئیات کی نسبت حضوری ہے نہ کہ حصولی۔ اس کا علم انسان کی طرح نہیں ہے کہ ایک صورت کی جگہ پر دوسری صورت آتی رہے۔ لہٰذا معلومات میں تبدیلی عالم میں کسی قسم کی تبدیلی کا باعث نہیں بنے گی۔ [۲]

۲۔ نافیانِ تکلیف

یہ گروہ انسان ہر کسی قوسم کی ذمہداری اور احکام الٰہیہ کو فضول اور بے ہودہ سمجھتا ہے کیونکہ احکام اُن چند قوانین کا مجموعہ ہے جن کی بجا آوری انسان کے لیے تکلیف دہ اور پرمشقت ہے۔ دوسری یہ بات بھی معقول نہیں کہ ان تکالیف اور احکام کا فائدہ خدا کو پہنچے کیونکہ خُدا تو غیر کی طرف سے ہر قسم کے فائدے سے بے نیاز ہے۔ [۳]

یہ جماعت احکام کے دنیوی اور اخروی فائدے کو نہیں سمجھ سکی اس لیے اس نے احکام کو فضول اور عبث قرار دیا ہے جب کہ احکام تو حقیقت میں اِس دنیا میں خوش بختی اور آخرت میں انعام کا باعث ہیں۔ اس جماعت نے ایک اور بات بھی کی ہے وہ یہ کہ یہ احکام عقل کو خُدا کی معرفت اور اس کے مقام ربوبیت کے متعلق سوچنے سے روکتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ بہت سے احکام تو خُدا کی یاد کا

---

[۱] کیونکہ اس کا علم عینِ ذات ہے (مترجم)

[۲] غزالی کا فلسفیوں پر ایک الزام ہی ہے کہ اس کے خیال میں یہ لوگ جزئیات کے متعلق خدا کے منکر ہیں جب کہ غزالی جیسے فاضل شخص سے ایسا الزام درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شرح ہدایہ اثیری صدر المتالہین ص ۳۳۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۳] شرح مقاصد ج ۲ ص ۱۷۵

باعث ہیں۔اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ نماز اور روزہ تو خدا کی یاد میں مصروف کرتے ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے عمل کی آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ یہ لوگ احکام اور قوانین اسلامی کو اپنی نفسانی آرزوؤں کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اس لیے مغالطے اور شبہات اور پیدا کرتے ہیں تا کہ قوانین کے سنگین بار سے اپنی جان چھڑوا سکیں اور اپنی نفسانی خواہشات کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کر سکیں۔

بعض اوقات تو یہ لوگ گناہ اور بڑائی میں سرتا پا غرق ہونے کے بعد اور ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی اِس طرح کے بے بنیاد اعتراضات کرتے ہیں جس سے لوگ عملی طور پر اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے مادیت پرستی کی انتہا فلسفی لحاظ سے مادیت پرستی کی سپر ہے انسان اگر ایک عمر تک گناہ اور برائی کی زندگی بسر کرے تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اصلاً شریعت کا ہی منکر ہو جاتا ہے۔جن لوگوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اخلاقی مادیت (Moral materialism) کو فلسفی مادیت (Phlosophical Materialism) سے جُدا کریں تو وہ ایسا نہیں کر پاتے۔ہم نے اپنی مختصر سی زندگی میں ایسے کئی افراد کو دیکھا ہے کہ جو زندگی کے ابتدائی دونوں میں بڑے درست اعتقادات کے حامل تھے لیکن گناہ اور برائی کی طرف ان کے رجحان نے آہستہ آہستہ اُن کو اِس مقام تک پہنچا دیا کہ وہ اصلاً دین اور ماورا طبیعت ہر چیز کا انکار کرنے لگے۔[1]

انبیاء کی رسالت کے متعلق مشرکوں کی دلیل

مشرکوں نے انبیاء کی رسالت کے انکار کے لیے ایک اور طریقہ اپنایا۔وہ خُدا کی طرف سے کسی بشر کے معبود ہونے کے منکر تھے۔دوسرے لفظوں میں یُوں کہ وہ اصل رسالت کو تو قبول کرتے تھے لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بلند مقام ایک بہت ہی بلند ہستی کو حاصل ہے جسے فرشتہ کہتے ہیں۔وہ ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہے۔اس مقام کا حامل کوئی مادی انسان نہیں ہوسکتا جو کئی لحاظ سے طہارت اور پاکیزگی نہیں رکھتا۔

قرآن نے اس اعتراض کو کئی جگہ پر دورِ رسالت اور دوسرے ادوار کے مشرکین سے نقل کیا ہے۔ہم اس میں سے کچھ بیان کرتے ہیں۔

حضرت نوح کی امت کے سلسلے میں اس بات کی یاد دہائی کروائی گئی ہے کہ اُن کا نوح پر ایک اعتراض یہ تھا کہ تم تو ہماری طرح کے ہی بشر ہو:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

نوح کی قوم کے بڑے لوگ جو اس کی شریعت کا انکار کرتے تھے اُس سے کہتے تھے تو ہماری طرح کا بشر ہے۔(ہود۔۲۷)

قرآن میں نوح علیہ السلام سے بعد والی قوموں کا بھی یہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

[1] بیست وسہ سال" کتاب کا مصنف بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔اس کی اخلاقی برائی نے اسے دین کے تمام احکام اور اعتقادات کے انکار تک پہنچا دیا یہاں تک کہ اس نے اپنی کتاب میں خُدا اور قیامت کا بھی انکار کر دیا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ
مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾

''اس نبی کی قوم میں جو سردار تھے انہوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں بہت سی نعمات بھی عطا کی تھیں۔ وہ کہنے لگے: بس یہ تو تمہاری طرح کا ایک آدمی ہے یہ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اگر تم اپنے جیسے ایک انسان کی پیروی کرو تو خسارے میں رہو گے۔'' (مومنوں۔۳۳۔۳۴)

ان آیات سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ بات کہ رسول کو انسان سے بالاتر کوئی چیز ہونا چاہیے بڑا پرانا طرزِ فکر ہے یہ عقیدہ رسول ﷺ اسلام کے دور تک آیا پیغمبر ﷺ کے زمانے کے مشرکین نے بھی آپ ﷺ پر یہی اعتراض کیا۔ اس اعتراض کے بیان کے لیے انہوں نے مختلف انداز اختیار کیے۔ ہم ان میں سے چند ایک کو یہاں نمونے کے طور پر ذکر کرتے ہیں

۱۔ کبھی تو وہ کہتے کہ فرشتے کو ہم پر نازل ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ

''جو لوگ قیامت کے امیدوار نہیں تھے وہ کہتے تھے کہ ہم پر فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟۔۔۔(فرقان۔۱۲)

سورہ فصلت کی آیت ۱۴ میں بھی یہی مفہوم آیا ہے۔

۲۔ کبھی یہ کہتے کہ نبی کے ساتھ ایک فرشتہ بھی آئے جو اس کی تصدیق اور تائید کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿٥٣﴾

''اگر وہ سچ کہتا ہے تو اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے اور اُس کے ساتھ فرشتے کیوں نازل نہیں ہوئے۔ (زخرف۔۳۵)

یہی مفہوم سورہ فرقان آیت ۷ میں بھی آیا ہے۔

۳۔ کبھی وہ فرشتے دیکھنے کا تقاضا کرتے کیونکہ پیغمبر ﷺ اس بات کے مدعی تھے کہ مجھ پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہم بھی تمہاری طرح بشر ہیں اگر تم سچ کہتے ہو تو وہ فرشتہ ہمیں بھی دکھاؤ۔

اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ

''ہمیں خدا اور فرشتے دکھاؤ۔'' (اسراء۔۲۹)

اس اعتراض کا جواب دو نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے بالکل واضح ہوجاتا ہے۔

ا۔سورہ مومنوں کی جن دو آیات کو ذکر کیا گیا ہے وہ اس انکار کی وجہ اور عامل کو واضح کرتی ہیں اور یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ خُدا اور قیامت کے منکر تھے اور مادی نعمات میں دھنسے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے کسی انسان کے نبی ہونے کا انکار کیا کیونکہ وہ دین اور قانون کو اپنے مادی اہداف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے تھے۔اگر پہلے والے عوامل ان میں موجود نہ ہوتے تو ممکن تھا وہ اس کے اعتراضات نہ کرتے۔

۲۔خدا کی جانب سے فرشتے کا نزول دو صورتوں میں ہوتا ہے یا تو وہ انسان کی صورت اختیار کرے۔اس صورت میں لوگ اسے ایک انسان ہی خیال کریں گے اور اس کی نبوت کو رد کردیں گے یا وہ اپنی اصلی صورت میں آئے کہ جو وجود مادی نہیں ہے۔اس صورت میں یہ لوگ اسے دیکھنے کی قدرت اور صلاحیت نہیں رکھتے صرف ایک صورت میں یہ اُس کے مشاہدے پر قادر ہیں جب یہ اپنی ذات سے مادی لباس اُتار پھینکیں اور جہاں مادی سے بالاتر ہوجائیں۔یہ حالت فقط موت اور دوسری دنیا کی طرف سفر کے وقت ہی حاصل ہوتی ہے۔لیکن یہ بات انبیاء بھیجنے کی غرض اور مقصد کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔اُن کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ انسان کی تربیت اِسی دنیا میں کریں نہ یہ کہ تربیت سے پہلے ہی اسے دوسری دنیا کی طرف رخصت کردیں۔ہم اس سلسلے میں انبیاء کے ساتھ لوگوں کی دشمنی کے طریقہ کار کے باب میں بھی گفتگو کریں گے۔

۲۔ اَنبیاء کی بعثت متکلمین اور فلاسفہ کی نظر میں

قرآنی نکتہ نظر سے انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے سے پہلے ہم مختصر طور پر اس سلسلے میں متکلمین اور فلاسفہ کے دلائل کی تحقیق کرتے ہیں۔

متکلمین اور بعثت انبیاء

اس بحث میں متکلمین سے مراد وہ متکلمین ہیں جو عقل کی اہمیت اور ارزش کے قائل ہیں یعنی جو حسن وقبح عقلی پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن وہ اسلامی متکلمین (اہل حدیث اور شاعرہ) جو دینی معارف میں عقل کو مستقل طور پر کوئی فیصلہ کرنے اور رائے قائم کرنے کے سلسلے میں ناتواں سمجھتے ہیں وہ ہمارے مورد نظر نہیں ہیں۔

پہلے متکلمین نے نبوت کے موضوع سے متعلق دو مطالب کو ایک دوسرے سے جُدا جُدا کیا ہے اور ان کے متعلق بحث کی ہے۔

۱۔ بعثت کا ذاتی طور پر اچھا ہونا

۲۔ بعثت کا ضروری ہونا

پہلا مطلب دوسرے مطلب کے لیے ہی راہ ہموار کرتا ہے۔ قاضی عبدالجبار نے بعثت کے ''حسن'' اور اچھے ہونے کے متعلق بحث کر نے کے بعد کہا ہے:

بِعْثَةُ الرَّسُوْلِ مِتّٰی حَسُنَتْ وَجَبَتْ [۱]

''انبیاء کا مبعوث ہونا جب اچھا اور خواب ہے تو پھر وہ ضروری اور واجب بھی ہے۔

محقق طوسی نے بھی ''تجرید الاعتقاد'' میں نبوت کے باب میں سب سے پہلے جو چیز بیان کی ہے وہ بعثت کا ذاتاً اچھا ہونا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

البعثته حسنة۔

پھر اس کے ذاتی طور پر حسن ہونے کے دلائل کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

---

[۱] المغنی جلد ۱۵ ص ۶۳

وھی واجبة۔ [۱]

اب یہ دیکھنا ہے کہ بعثت کے ضروری اور لازم ہونے پر متکلمین کیا دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس سلسلے میں مختلف دلائل پیش کیے ہیں لیکن ان تمام کا محور اور مرکزی مکتہ ''قاعدہ لطف'' ہے۔ اسے کبھی بندوں کی بھلائی کے عنوان سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ''عبدالجبار معتزلی'' نے اس بات کی تفریح کی ہے اور کہا ہے کہ:

''براہمہ'' کے مقابلے میں جو مضبوط ترین بات کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کا مبعوث ہونا بندوں پر لطف کی وجہ سے ہے بعثت کے حامی تمام لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ [۲]

وہ دوسری جگہ کہتے ہیں:

ہمارے تمام بزرگوں نے آسمانی شریعتوں کی ضرورت اور لزوم کی ملت اور وجہ بیان کی ہے اور وہ یہ کہ آسمانی ادیان بندوں کی بھلائی اور فلاح کا موجب بنتے ہیں اگرچہ اس بھلائی کی تفصیلات میں ان کے درمیان اختلاف رائے ہے۔

نبوت اور قاعدہ لطف

اِس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ متکلمین کی اِصطلاح میں لطف کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ لطف محصل

۲۔ لطف مقرب

لطف محصل یہ ہے کہ خلقت یا تکلیف کی غرض وغایت خدا کی طرف سے اُسے انجام دیئے بغیر پوری نہیں ہوئی جب کہ لطف مقرب سے مُراد وہ لطف ہے جو خُدا کی جانب سے بندوں پر ہونے کی وجہ سے بندوں کے خُدا کے قریب ہونے اور اُس کی نافرمانی سے بچنے کا ذریعہ بنے۔ یہ انسانی اختیار اور ارادہ کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بنتا۔

انبیاء کی بعثت کے ضروری اور واجب ہونے کو لطف کی دونوں قسموں (محصل ومقرب) کی بنا پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ لطف محصل کی بنا پر اس طرح کہ انسان کی خلقت کا مقصد خدا کی معرفت اور اس کے روحانی اور معنوی کمال کا حصول ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے یہ مقصد انبیاء الٰہی کی ہدایت اور رہبری کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ عقل اور فطرت میں اتنی صلاحیت اور قدرت نہیں ہے کہ وہ اس راستے کو پوری طرح ہر پہلو سے واضح اور روشن کرسکیں۔

لیکن اس سلسلے میں متکلمین کی عبارات زیادہ تر لطف مقرب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل مستقل طور پر

---

[۱] کشف المراد۔ صفحہ ۳۷۳ طبع قم مصطفوی پریس۔

[۲] اقوی مایعتمد فی مکان المة البراھیمة ھو کون بعثتھم بطفاً لانه مما فد ابار دالجع (المغنی طبع مصر جلد ۱۵ ص ۹۲۱

انسان پر ہر چند اخلاقی فرائض اور قوانین لاگو کرتی ہے مثلاً نعمت عطا کرنے والے کا شکر رفتار میں عدل کی رعایت امانت اور اس جیسے دوسرے امور کو واجب اور ضروری قرار دیتی ہے جبکہ کفران نعمت ظلم، بے انصافی، امانت میں خیانت اور اسی طرح کے دوسرے امور کو بُرا اور ناپسندیدہ قرار دیتی ہے۔

بلاشبہ انسانی کاموں میں چند کام ایسے بھی ہیں جن کی انجام دہی انسان کو ان عقلی واجبات کے نزدیک کر دیتی ہے جس سے وہ اس مرحلے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بعض ایسے کام بھی ہیں جن کو چھوڑ دینے سے وہ عقلی لحاظ سے ناپسندیدہ اور بُرے کاموں سے بچ جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف انسانی عقل تنہا ان تمام کاموں کو درک نہیں کرسکتی جب کہ خدا ان تمام سے آگاہ اور واقف ہے لہذا وہ انبیاء کو مبعوث کرنے کے ذریعے انسان کو ان کاموں سے آگاہ کرسکتا ہے۔ یہی وہ لطف ہے جو متکلمین کے نظریے کے مطابق خدا پر واجب اور ضروری ہے۔ (یعنی خدا کی حکمت یا رحمت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اس طرح کرے) چونکہ انبیاء کا مبعوث کرنا اس لطف الٰہی کا بہت بڑا مصداق ہے لہذا یہ واجب اور ضروری ہے۔

محقق طوسی نے اس سلسلے میں ایک بڑی مختصر اور گویا عبارت یوں بیان کی ہے:

وهي واجبة لاشتمالها على اللطف في التكاليف العقلية۔ [1]

''انبیاء کی بعثت واجب ہے کیونکہ یہ عقلی فرائض اور احکام میں لطف پر مشتمل ہے۔''

قاضی عبدالجبار نے بھی اسی مطلب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

اس باب (نبوت) میں قانون یہ ہے کہ ہم کہیں کہ عقل انسان عاقل پر یہ حکم لگاتی ہے کہ وہ نقصان اور ضرر کو اپنے آپ سے دور کرے۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جو چیز انسان کو واجب کام کی انجام دہی سے روکے اور برائی کی طرف چلائے وہ خود بھی قبیح اور بُری ہے۔ دوسری طرف ہمارے افعال میں کئی ایسے ہیں جن کو اگر ہم انجام دیں تو وہ ہمیں واجبات کی ادائیگی کے نزدیک کر دیتے ہیں اور برائیوں سے بچاتے ہیں۔ ہمارے کاموں میں کچھ ایسے کام بھی ہیں جن کی انجام دہی کا نتیجہ اس کے برعکس ہے یہ بات بھی واضح ہے کہ ان کاموں کی مکمل اور تفصیلی پہچان عقل کی قدرت سے باہر ہے۔ لہذا خدا پر واجب ہے کہ وہ ان کاموں کی پہچان انسان کو کروائے تاکہ بندوں پر احکام کے ضروری ہونے کا جو مقصد ہے وہ فوت نہ ہو۔ انسان کو ان کاموں کو پہنچنوانا انبیاء کی بعثت کے علاوہ ممکن نہیں ہے لہذا ان کو لوگوں کی طرف بھیجنا اور مبعوث اچھی اور پسندیدہ بات ہے تو یہ لازم ہے۔ اس وجہ سے ہمارے بزرگوں نے کہا ہے کہ:

جب انبیاء کی بعثت اچھی اور پسندیدہ بات ہے تو یہ لازم اور ضروری بھی ہے۔ یعنی اگر یہ واجب اور ضروری نہ ہو تو پھر قبیح اور بری ہوگی۔ بعثت کا موضوع اس اعتبار سے ثواب اور بدلے جیسا ہے کہ جس کی اچھائی اور پسندیدگی اس کے وجوب اور ضروری ہونے

---

[1] کشف المراد صفحہ ۲۷۳، قم ایڈیشن

سے جُدا نہیں ہے۔[۱]

انبیاء کی بعثت اور وجوب تکلیف[۲]

اسلامی متکلمین نے نبوت کے ضروری ہونے کو نہ فقط یہ کہ بلا واسطہ طور پر قاعدہ لطف پر استوار کیا ہے بلکہ اسے ''تکلیف'' کے موضوں کی طرح سے باب لطف کا مصداق اور جز بنایا ہے۔

''تکلیف'' کا موضوع افعال خدا کی بحث میں تفصیلاً بیان ہوا ہے۔عقلی اعتبار سے حسن اور قبح کا ایک نمونہ تکلیف اور ذمہ داری ہے۔متکلمین نے تکلیف اور ذمہ داری کو اچھا اور پسندیدہ قرار دیا ہے جبکہ اس کے چھوڑنے کو بُرا اور قبیح۔ چونکہ اس جہان کا پیدا کرنے والا دانا ہے۔اور وہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے مبرا ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ خدا پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ بندوں پر کوئی تکلیف اور ذمہ داری ڈالے۔(خدا کی حکمت کا تقاضا یہی ہے)

یہ بات واضح ہے کہ بندوں تک ان الٰہی فرائض کا پہنچانا اور ان کا اعلان وحی اور انبیاء کی بعثت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اس صورت میں عقلاً انبیاء کی بعثت تکالیف اور ذمہ داریوں کے ابلاغ کے لیے ایک ضروری اور قطعی شرط کے طور پر واجب ہے کیونکہ جب خود ایک چیز واجب ہو تو اس کے حصول کے لیے جن مقدمات اور شرائط کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی قلی اعتبار سے واجب اور لازم ہوتے ہیں۔

جن متکلمین نے وجوب تکلیف سے وجوب بعثت ہر استدلال کیا ہے ان ہیں سے ایک جمال الدین مقدار دسیوری حلی (م۔۸۲۶ھ) ہیں انہوں نے کہا ہے:

اس بات کے ثبوت کے لیے کہ انبیاء کی بعثت ضروری اور واجب ہے متکلمین کا کہنا یہ ہے کہ نبوت تکالیف عقلی میں لطف پر مشتمل ہے نیز تکالیف سمعی (شرع) میں ایک شرط ہے جو نیز اس خصوصیت کی حامل ہو وہ واجن ہوتی ہے۔

اس استدلال کے صغری[۳] (کہ نبوت عقلی فرائض میں لطف پر مشتمل ہے) کی وضاحت یوں ہے تمام عبادات انبیاء سے ہی انسان تک پہنچتی ہیں اس میں بھی کسی قسم کا شک نہیں کہ ان عبادات کی بجا آوری سے خدا کی معرفت اور شناخت کو تقویت پہنچتی ہیں جو خود بھی عقلی اعتبار سے واجب ہے۔لہذا نبوت بھی عقلی فرائض اور واجبات میں ایک لطف (مقرب) ہے۔اور اگر تکلیف کی شرط واجب نہ ہو تو اس کا ترک کرنا جائز ہوگا جس سے مشروط (تکلیف) کے چھوڑنے کا بھی جواز ثابت ہو جائے گا جب کہ کسی واجب میں خلل حکیم اور دانا کے لیے قبیح اور نادرست ہے۔[۴]

---

[۱] شرح اصول خمسہ۔طبع قاہرہ ص ۵۶۴

[۲] تکلیف سے مراد شرعی ذمہ داری ہے (مترجم)

[۳] منطق میں ایک استدلال کے دو مقدمے ہوتے ہیں ایک کو صغریٰ کہتے اور دوسرے کو کبریٰ۔ دونوں کو ملا کر نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے۔(مترجم)

[۴] اللوامع الالہیہ۔طبع تبریز ص ۱۶۶۔۱۶۷

لزُومِ نبوت اور فلاسفہ

فلسفی لوگوں کا راستہ اور ہے اس کے اثبات کے لیے انہوں نے اور طریقہ اپنایا ہے جو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں قانون کا ہونا ضروری ہے۔قانون ہی معاشرے اور انسانی نسل کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔اس طرح کے ایک مبنی بر حقیقت اور عادلانہ نظریات پر استوار قانون کا بنانا کسی ایک فرد یا جماعت کے بس کا کام نہیں ہے کیونکہ قانون ساز میں چند ایسی صفات کا ہونا ضروری ہے جو خدا کے علاوہ کسی میں نہیں پائی جاسکتیں۔یہ استدلال فلسفی اور گاہے کلامی کتابوں میں مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ہم اسے ذرا تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن اس کی روح اور بنیاد ایک ہی ہے۔ہم اس بُرہان کو یوں بیان کرتے ہیں۔

انسان کے لیے اجتماعی اور معاشرتی زندگی ایک ضروری امر ہے۔فی الحال یہ بات مورِدِ نظر نہیں ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ انسان کے لیے اجتماعی زندگی ایک طبیعی اور جبلی امر ہے۔ایسی زندگی کی طرف کشش اس کے اندر سے ہی پھوٹتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے؛"الانسان مدنی بالطبع"

بعض کا یہ نظریہ ہے کہ اس میلان اور رجان کی بنیاد انسان کا دوسروں سے خدمت لینے کا جبلی جذبہ ہے۔جس طرح انسان اپنے جبلی جذبے کے تحت درخت کے پھل پتوں اور شاخوں سے استفادہ کرتا ہے یا جانوروں کے دُودھ کھال اور اون وغیرہ کو اپنے فائدے اور نفع کے لیے استعمال کرتا ہے اسی طرح اس جبلت کے تحت یہ چاہتا ہے۔

اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بھی فائدہ اٹھائے۔اسی بات نے اسے مل جل کر رہنے پر ابھارا ہے۔اس اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا فائدہ اسے یہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے کاموں سے اپنا فائدہ نکالتا ہے۔

ابھی ہم ان دونوں نظریات میں کسی ایک کی تائید کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔اگرچہ دوسرا نظریہ انسان کے حیوانی اور سفلی پہلو سے صحیح معلوم ہوتا ہے انسان کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر فرد کو اپنی خدمت کے لیے استعمال کرے جب کہ انسان کا ملکوتی اور روحانی پہلو اسے عدالت ایثار اور فداکاری کی دعوت دیتا ہے۔بہر حال اس بات کا باعث کچھ بھی ہو انسان مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔یہ تو تھی ایک طرف۔

دوسری طرف اس بات پر ہزاروں تجربے گواہ ہیں کہ یہ معاشرتی زندگی ایک منظم قانون کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔اس قانون کی یہ خصوصیات ہونا چاہیں۔

ا۔معاشرے میں افراد کے حقوق وفرائض کو متعین کرے کیونکہ جب تک ان کے حقوق وفرائض کو بیان نہ کیا جائے معاشرے سے لڑائی جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔انسان جتنے بھی بلند مرتبہ ہوں اپنے حقوق اور فرائض سے ناواقفیت کی بنا پر ہمیشہ دست وگریباں رہیں گے۔

۲۔مخصوص سزاوں کی تعیین کرے اس ذریعے سے ہی سرکش اور نزاع طلب لوگوں کو قابو کیا جاسکتا ہے۔وہ خودغرضی جو اکثر افراد میں موجزن ہوتی ہے اس کے ذریعے کنٹرول ہوسکتی ہے۔جب تک یہ دو باتیں کسی منظم پروگرام کے ساتھ معاشرے میں قائم نہ کی جائیں معاشرتی

زندگی ہمیشہ جنگ وجدال میں گھری رہے گی۔

۳۔قانون ساز کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل دو شرائط کا حامل ہو:

(الف) انسان کو پوری طرح پہچانتا ہو۔اُس کے جسمانی ،نفسیاتی اور روحانی حالات داسرار سے پوری طرح آ گاہ ہو.ڈاکٹر کا نسخہ مریض کے لیے اُس وقت ہی کارآمد ہوسکتا ہے جب وہ مریض کے حالات سے پوری طرح آ گاہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں یُوں کہ قانون ساز کو انسان اور معاشرے سے پوری طرح آ گاہی ہو۔وہ انسان کی جبلت جذبات اوراحساسات سے پوری طرح واقف ہوتا کہ وہ اُن کے درمیان توازن قائم کرنے اوران کی راہنمائی کے لیے صحیح راستے اورقانون کا انتخاب کر سکے۔

(ب) قانون بنانے کے سلسلے میں قانون ساز اپنے لیے کسی قسم کا فائدہ مدنظر نہ رکھے کیونکہ خودغرضی کا جو جذبہ انسان میں ہوتا ہے ۔یہ اس کے عقل وشعور پر پردہ ڈال دیتا ہے جس سے وہ اجتماعی فائدے کو ذاتی فائدے پرقربان کردیتا ہے۔

۴۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ قانون تو کاغذ پر چند لکیروں کا نام یہ ہے یہ قانون ساز کی خواہشات پر اُس وقت ہی پورا اُتر سکتا ہے کہ جب اِس کے ساتھ اس کے اجرا کی ضمانت بھی ہو۔اگر تو قانون انسان کا بنایاہوُا قانون ہو تو اس کے اجرا اور پابندی کی ضمانت انتظامیہ اور عدلیہ کے ذمے ہوتی ہے جو اس قانون کی ظاہری طور پر خلاف ورزی (اور وہ بھی بڑی محدود صورت میں) بہت ممکن ہے کہ خود انتظامیہ اور عدلیہ بھی دھوکا کھا جائے اور قانون شکن لوگوں کا ساتھ دینا شروع کردے ۔لیکن اگر وہ قانون الٰہی ہو اور طبیعت سے ماورا ہو تو یقینی طور پر وہ زیادہ پاکیزگی کا حامل ہوگا۔خدا اور آخرت پر ایمان اس قانون کے اجرا کے مضبوط اور طاقت ور ضامن ہوں گے۔

اس طرح کا جامع آئین یہ انسانی معاشرے کو فلاح وبہبود کی راہ پر گامزن کرسکتا ہے لیکن اس طرح کا قانون صرف خُدا ہی بنا سکتا ہے۔انسان کا بنایاہُوا قانون بالکل ہی ناقص ہوگا کیونکہ انسان نہ تو معاشرے اور انسان سے پوری آ گاہی رکھتا ہے اور نہ ہی بشری احساسات اور جذبات کو پوری طرح جانتا ہے اسی وجہ سے انسانی زندگی کو منظم کرنے کے لیے جتنے بھی بشری قوانین بنائے جاتے ہیں آخر کار وہ بے بس اور شکست سے دوچار ہوجاتے ہیں۔

علاوہ ازیں انسان جتنا بھی چاہے کہ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ رکھے پھر بھی نامحسوس طور پر حُبِ ذات کے جال میں پھنس جاتا ہے ۔یہ اپنی ذات اور قوم کے فائدے کو مدنظر رکھتا ہے بہرحال اندرونی تمایلات اسے اپنے فائدے کی طرف چلاتے ہیں۔

ان دو باتوں کے علاوہ تیسری بات جو قانون کے اجرا اور پابندی کے لیے ضامن کے طور پر ہوتی ہے۔وہ بھی انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں موجود نہیں ہے اور وہ ہے قانون کا مقدس ہونا اس لیے انتظامیہ اور عدلیہ کی طاقت میں اضافہ کیا جاتا رہتا ہے۔پوری مہذب دنیا میں قید خانوں اور جیلوں کو وسعت دی جاتی رہتی ہے۔

اس اصول کی وجہ سے فلاسفہ کو اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ انسان کے کمال اور نوع بشر کی بقا کے لیے ایک جامع اور کامل قانون کا ہونا ضروری ہے اور وہ قانون آسمانی ادیان اور انبیاء الٰہی کے بغیر کوئی اور نہیں لاسکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ خدا کی جانب سے انبیا مبعوث ہوں اور

وہ الٰہی قانون کی مکمل تشریح کرنے کے ساتھ نوعِ انسانی کی بقا اور کمال کے لیے مدد کریں۔ [۱]

یہ ان دوراہوں کا بیان تھا جنہیں متکلمین اور فلاسفہ سے انبیا کی بعثت کے ضروری ہونے کے لیے بیان کیا ہے۔ ہم نے یہاں انہیں مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔ مزید معلومات کے لیے قارئین حاشیے میں مذکور کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں

گفتگو کے خاتمے پر امام جعفر صادق سے ایک حدیث کا ذکر کرنا مناسب ہے جو انبیا کی بعثت کے ضروری ہونے سے متعلق ہے۔ یہ حدیث ایک لحاظ سے متکلمین اور فلاسفہ کی دلیل کی طرف بھی اشارہ ہے۔

ہشام بن حکم کہتے ہیں: ایک زندیق نے تمام جعفر صادق سے سوال کیا:

امام نے جواب میں فرمایا: جب ہم نے یہی ثابت کر دیا کہ ہمارا ایک بلند مرتبہ خالق ہے جسے انسان دیکھ نہیں سکتے اور اس سے بلاواسطہ طور پر جسمانی رابطہ بھی قائم نہیں کر سکتے دوسری طرف وہ پیدا کرنے والا حکیم اور دانا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ اُس نے کچھ ایسی ہستیوں کو بھیجا ہے جو انسان کے فائدے اور سعادت اور ہر اُس کام کو بیان کرتے ہیں جو اس کی زندگی کا باعث بنتا ہے

اور اس کا ترک کرنا اس کی تباہی کا موجب بنتا ہے۔ یہ لوگ وہی انبیاء الٰہی ہیں جنہیں حکیم اور دانا خُدا کی خصوصی تائید حاصل ہے۔ یہ واضح دلیل اور معجزات کے ساتھ اپنی نبوت کو ثابت کرتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] اشارات، ج ۳ ص ۳۷۱، تلخیص المحصل، تہران ایڈیشن موسسہ امطالعات اسلامی ص ۳۶۳۔ کشت المراد، قم ایڈیشن ص ۳۷۱، اللوامع الالٰہیہ تبریز ایڈیشن ص ۱۶۷، المغنی مصر ایڈیشن ج ۱۵ ص ۱۹، ۹۵، شرح اصول خمسہ قاہرہ ایڈیشن ص ۵۶۳، رسالت جہانی پیامبران ص ۲۹۔ ۴۳۔

[۲] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۲۹۔ ۳۰

۳۔انبیاء کی بعثت کا لزوم قرآنی نکتہ نظر سے

پہلا حصہ

زیر بحث آیات اِن موضوعات کے بارے میں ہیں:

۱۔توحید کے ثبوت اور تکمیل سے متعلق

۲۔اختلاف مٹانے سے متعلق

۳۔رقابتوں کے فیصلے سے متعلق

(الف) توحید کے ثبوت اور تکمیل سے متعلق آیات

1۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (نحل۔۳۶)

2۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (عنکبوت۔۳۶)

3۔ لٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ (اعراف۔۶۵)

(ب) اختلاف مٹانے سے متعلق آیات

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى

اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ (بقرہ:۲۱۳)

(ج) رقابتوں کے فیصلے سے متعلق آیات

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(ص۔۲۶)

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (بقرہ۔۲۵۱)

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

(نساء۔۵۴)

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

(مائدہ۔۴۲)

(ا) توحید اور خدا کے ایک ہونے کا ثبوت

انسان کی خلقت کا مقصد اُس کا خدا اور قیامت سے آگاہ ہونا ہے۔اس معرفت سے تہی دست انسان ایک ناقص انسان ہے جو فقط حیوانیت کی حد میں ہی رہا ہے۔نباتات، حیوانات اور دوسرے موجودات اپنی اپنی جبلت کے سائے میں اپنے کمال کی حد تک پہنچتے ہیں لیکن انسان جو دو بہت ہی طاقت ور چیزوں یعنی فطرت [1] وجبلت اور عقل وخرد سے مسلح ہے وہ اپنے کمال کی حد تک نہیں پہنچ سکا۔تاریخ انسانیت اس پر گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ انحرافات اور گمراہی کے منجدھاروں میں خدا اور اس کی معرفت سے دست برداری کا اعلان کیا ہے۔اب بھی ایک ارب سے زائد انسان طرح طرح کے بتوں کی پوجا میں مشغول ہیں۔یہ بُت پتھر بھی ہیں، حیوان بھی۔ہم اس وقت بھی ہندوستان (مختلف مذاہب کی سرزمین) میں کروڑوں انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ خدا کی بجائے گائے کی پرستش کرتے ہیں۔آج بھی صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ مُلک جاپان میں ہر حادثے اور واقعے کے لیے بُت بنایا ہوُا ہے کہ جسے اس حادثے کا باعث اور خدا قرار دیا جاتا ہے۔

---

[1] مؤلف محترم نے یہاں فطرت وجبلت کو ایک ہی قوت کے طور پر ذکر کیا ہے جب کہ فطرت انسان کی ان توانائیوں اور خوبیوں سے عبارت ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے مختار کرتی ہیں اور جبلت اس کی حیوانی صلاحیتوں اور قوتوں سے عبارت ہے۔تاہم انہیں ملا کر مجموعی طور پر ایک قوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔(مترجم)

اس بنا پر ضروری ہے کہ ہر اُس زمانے اور دور میں انسان خُدا کی دعوت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اُس میں انبیاء کو مبعوث کیا جائے۔ وہ انسان کی اُس عظیم منزل کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جس میں اس کا کمال اور ترقی پانا ہے۔ اس کے بغیر انسانی خلقت کا مقصد جامۂ عمل نہیں پہن سکتا اور انسان بھی اپنی آرزوں اور مقاصد تک نہیں پہنچ سکتا۔ متعدد قرآنی آیات اس طرح کے عوامل پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہیں جن میں سے بعض آیات کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ (نحل۔ ۳۶)

''ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا تا کہ وہ ان سے کہے کہ خدا کی عبادت کرو اور غیر خدا (طاغوت) کی عبادت سے بچتے رہو، بعض لوگ ہدایت پا گئے اور بعض (عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے) گمراہ ہو گئے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

(۲) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (عنکبوت۔ ۳۶)

شعیب نے اپنی امت سے کہا کہ خدا کی عبادت کرو اور قیامت کے دن کے منتظر رہو۔

سورہ اعراف آیت ۸۵ میں بھی یہی مفہوم آیا ہے:

(۳) وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦٥﴾

عاد نے اپنی قوم سے کہا: کہ خدا کی عبادت کرو۔ تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ تم خدا کی مخالفت سے کیوں نہیں ڈرتے۔ (اعراف۔ ٦٥)

یہ مفہوم سورہ ھود میں بھی آیا ہے۔

اِن آیات سے مجموعی طور پر اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد انسان کو خدا اور قیامت سے آگاہ کرنا ہے۔ اگر انبیاء لوگوں کی طرف نہ آتے تو مذکورہ مقصد پورا نہ ہوتا جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

اتنی سائنسی ترقی اور تمدن کے باوجود انسان ابھی تک بت پرستی جیسی لعنت کا شکار ہے اور ایک ارب عیسائی عیسیٰ نامی پیغمبر کو خدا سمجھتے

ہیں۔اب اگر اس طرح کے معلمین الہٰی ظہور نہ کرتے تو خدا اور قیامت کے تعلق انسان کے نظریات کیا ہوتے،اس بات کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام اور آئمہ طاہرین کے اقوال میں بعثت کے اس عظیم مقصد کی طرف کئی اشارات ملتے ہیں۔اس مقصد کی وضاحت کے لیے ہم ان میں سے بعض احادیث کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا:

وَلَابَعَثَ اللهُ نَبِیًّا وَّ لَارَسُوْلًا حَتّٰی یَسْتَکْمِلَ الْعَقْلُ وَیَکُوْنَ عَقْلُهٗ اَفْضَلَ مِنْ عُقُوْلِ اَمِتِهٖ [1]

”خدا نے تمام انبیاء اور رسل کو اس لیے مبعوث کیا ہے تا کہ وہ عقلوں کو کمال تک پہنچانے دیں (تا کہ نبی کی عقل کامل ہو جائے) لہذا ضروری ہے کہ ہر نبی کی عقل اپنی امت کی عقلوں سے بالاتر ہو۔

اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ انسانی معاشرے میں عقل وخرد کی بلندی سے ہی توحید اور وحدانیت کا صحیح تصور اجاگر ہوسکتا ہے۔جو انسان اپنی زات اور عظمت کو نہیں پہچانتا وہی پتھر اور مٹی کے سامنے سربسجود ہوتا ہے یہ چیزیں اس کے رتبے سے بہت نیچے ہیں جب کہ عقل و خرد کے گوہر سے مالا مال انسان اس ہستی اور کائنات کے سرچشمے تک پہنچ جاتا ہے۔وہ ان چیزوں کے خالق اور بنانے والے کی حمد کرتا ہے۔

امیر المومنین پیغمبر اسلام کے زمانہ بعثت کی تشریح کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ کیسے جہالت اور گمراہی کی تاریکی میں گھرے ہوئے تھے۔وہ خدا کی بجائے کن چیزوں کی عبادت کرتے تھے۔یا یہ کہ وہ خدا کو کن مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے پیغمبر اکرم اپنے معاشرے کے عقائد کی اصلاح کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:

اِلٰی اَنْ بَعَثَ اللهُ مُحَمَّدًا(ص) لِاِنْجَازِ عِدَتِهٖ وَتَمَامِ نُبُوَّتِهٖ... وَاَهْلَ الْاَرْضِ یَوْمَئِذٍ مِّلَلٌ مُّتَفَرِّقَةٌ وَّ اَهْوَآءٌ مُّنْتَشِرَةٌ وَّ طَوَائِفُ مُتَشَتِّتَةٌ، بَیْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهٖ اَوْ مُلْحِدٍ فِیْۤ اَسْمَآئِهٖ اَوْ مُشِیْرٍ بِهٖ اِلٰی غَیْرِهٖ فَهَدَاهُمْ بِهٖ مِنَ الضَّلَالَةِ وَاَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهٖ مِنَ الْجَهَالَةِ۔ [2]

---

[1] کافی۔جلد ا باب عقل

[2] نہج البلاغہ خطبہ ا

یہاں تک کہ خدا نے ایفائے عہد اور تمام نبوت کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا۔۔۔۔اس وقت زمین پر بسنے والے لوگوں کے مسلک جُدا جُدا خواہشیں متفرق و پراگندہ اور راہیں الگ الگ تھیں، یُوں کہ کچھ اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے کچھ اس کے ناموں کو بگاڑ دیتے کچھ کراوروں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔خداوند عالم نے انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے گمراہی سے ہدایت کی راہ پر لگایا اور آپ کے وجود سے انہیں جہالت سے نکالا۔

اس گفتگو میں لوگوں کے توحید سے دور ہونے اور انحرافی راستوں کی طرف چلنے کو پیغمبروں کے بھیجنے کی وجہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے تا کہ وہ لوگوں کو گمراہی اور شرک پرستی کے ماحول سے نکال کر توحید کی نورانی فضا کی راہنمائی کریں۔

اسی مقصد کی مزید وضاحت کے لیے امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَلِيَعْقِلَ الْعِبَادُ عَنْ رَّبِّهِمْ مَّاجَهِلُوْهُ فَيَعْرِفُوْهُ بِرُبُوْبِيَّتِهٖ بَعْدَمَآاَنْكَرُوْا،وَيُوَحِّدُوْهُ بِالْاُلُوْهِيَّةِ بِعْدَ مَاعَنَدُوْا ۔ [1]

”پیغمبروں کو بھیجا گیا تا کہ خدا اور اس کی صفات کے متعلق بندے جو کچھ نہیں جانتے وہ سکھا یا جائے اور خدا اور خدا کی توحید اور ربوبیت پر ایمان لے آئیں جب کہ پہلے وہ اس کا انکار کر چکے ہیں۔“

حضرت امام جعفر صادقؑ سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔

وَلِيَعْقِلَ الْعِبَادُ عَنْ رَّبِّهِمْ مَّاجَهِلُوْهُ فَيَعْرِفُوْهُ بِرُبُوْبِيَّتِهٖ بَعْدَمَآاَنْكَرُوْا،وَيُوَحِّدُوْهُ بِالْاُلُوْهِيَّةِ بِعْدَ مَا اَضَدُّوْهُ۔ [2]

”(انبیاء کو بھیجا گیا) تا کہ بندگان جو کچھ خُدا کے متعلق نہیں جانتے اُس پر سوچیں انکار کرنے کے بعد اُس کی خُدائی کا اقرار کریں اور شرک کے بعد اُس کی وحدانیت کا اعتراف کریں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۳

[2] بحار الانوار، ج ۱۱، ص ۳۸ بحوالہ علل الشرائع ص ۵۱ "اصدوہ" کا مادہ "ضد" ہے جس کا معنی نظیر اور ہم مثل ہے۔

انبیاء کے بھیجنے کا دوسرا مقصد

اختلافات کا خاتمہ

انبیاء بھیجنے کا دوسرا مقصد اُن اختلافات اور گروہ بندی کا خاتمہ تھا جس سے بشر دو چار تھا۔ انبیاء الٰہی کی تعلیمات اور شریعتوں کا مقصد یہی تھا کہ اس گروہ بندے کو ختم کیا جائے۔ البتہ ایسا قانون ان کے لیے ہی فائدہ مند ہو سکتا ہے جو اس پر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہوں۔ وہ لوگ کہ سرکشی اور بغاوت جن کا شیوہ ہوتا ہے وہ عموماً اختلافات پیدا کرتے رہتے ہیں اور انہیں بڑھاتے چڑھاتے رہتے ہیں۔ زیر نظر آیت اس مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

”لوگ ایک ہی جماعت تھے (اوران کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب ان کے درمیان اختلاف اور گروہ بندی پیدا ہوئی تو) خُدا نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشخبری سناتے تھے اور ڈراتے تھے۔ اوران کے ساتھ کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا تا کہ وہ لوگ جس چیز میں اختلاف کرتے تھے۔ اوران میں سے ایک گروہ نے حقیقت کے آشکار ہو جانے کے باوجود فتنہ پردازی اور سرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا۔ خُدا نے باایمان لوگوں کی اپنے اذن اور معشیت کے ساتھ اُس چیز کی حقیقت کی طرف راہنمائی کی جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۱۳)

اس آیت سے درج ذیل نکات وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب سب انسان اکٹھے اور ہم فکر تھے ”كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً“ کا جملہ بشر کے ابتدائی زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب انسان کی جبلی خواہشات پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ وہ عقل و فکر کے لحاظ مکمل نہیں ہوا تھا۔ زمانہ گزر

رنے کے ساتھ ساتھ عقل و فکر اور جبلی خواہشات نے لڑائی لی جس کی وجہ سے انسان عقل و شعور اور مال و دولت کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بٹ گیا۔ لہذا ایسے مختلف طرح کے افراد کی باہمی آویزش اختلاف اور لڑائی جھگڑے سے محفوظ نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے خُدائی تعلیمات کی روشنی میں ان اختلافات کا دور کرنا ضروری ہوگیا۔ یہ مفہوم اگرچہ آیت میں واضح طور پر نہیں آیا لیکن ''بَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖن۔'' کے جملے میں جو ''فاء تفریع'' آئی ہے وہ اس طرح کے اختلافات کی نشاں دہی کرتی ہے۔

یعنی انبیاء کی بعثت سے پہلے انسانوں کے درمیان اختلاف تھا کیونکہ اختلاف ہی بعثت کا تقاضا کرتا ہے نہ کہ وحدت نظر اور اتحاد یہ ان کا مختلف جہات سے اختلاف ہی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کو مبعوث کیا جاتا ہے گویا آیت کا مفہوم یُوں بنے گا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔۔۔ فَاخْتَلَفُوْا ۔۔۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ۔۔۔

علاوہ ازیں اس کے بعد والا جملہ بھی انبیاء کی بعثت سے پہلے اختلاف کے وجود کی نشان دہی کرتا ہے جو یہ ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

ممکن ہے ان کے اتحاد کا سبب یہ ہو کہ وہ اجتماعی زندگی سے محروم تھے یا یہ کہ وہ عقل و شعور اور اندرونی خواہشات کے سلسلے میں کمال کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اس کا شاہد یہ ہے کہ آدم کی اولاد بھی پہلے زمانے کے لوگوں میں سے ہے لیکن ''ہابیل'' کی روش اور طریقہ ایک ایسے انسان جیسا ہے جو کہ عقل و شعور کے لحاظ سے کامل ہو جب کہ قابیل کی روش ایک ایسے انسان کی سی ہے جس کی جبلی خواہشات پوری طرح بیدار ہوں [1] لہذا اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ آدم کی نسل کے پہلے انسان ان دو جہات (جبلت اور عقل) کے لحاظ سے کم سطح پر تھے۔ یہ دو صفات جن سے انسان کی شخصیت تشکیل پاتی ہے، بلکہ ان کے درمیان اتحاد اس وجہ سے تھا کہ اُس وقت انسان بہت کم تھے، وہ بھی مختلف جگہوں پر الگ الگ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے ان کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا یا اختلاف پیدا نہ ہوا۔ لیکن جب انہوں نے ایک اجتماعی زندگی میں قدم رکھا اور تعاون و ہمکاری کی ضرورت پیش آئی تو طبیعی طور پر ایک دوسرے کے مفادات سے ٹکراو کا مسئلہ سامنے آیا۔

اس وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ افراد کے حقوق اور فرائض کو بیان کرنے کے لیے چند قوانین بنائے جائیں تاکہ حق دار اپنے حق پر قانع ہو جائے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے اجتناب کرے۔ اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کے لیے بھی قانونی طور پر سزا مقرر کی جائے

بہرحال قرآن انسانوں کے درمیان پہلے ایک اتحاد اور اختلاف پیدا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی وجہ سے انبیاء بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وحدت اور اُس اختلاف کا سرچشمہ کیا تھا اس سلسلے میں اس آیت سے کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ ہم نے جو دو احتمال ذکر کئے ہیں اُن کی تائید انسانی زندگی کی روش اور آیت کے جملات میں غور و فکر کرنے سے ہوتی ہے۔

(۲) خُدا کی مشیت نے اسی بات کا تقاضا کیا کہ ایک بار پھر اتحاد کی حکمرانی ہو۔ یہ چیز معلمین الٰہی کے بھیجے بغیر ممکن نہ تھی، ایسے معلمین جو خُدا کی طرف سے عطا ہونے والی جزاوں کی بشارت سنانے کے ساتھ ساتھ اُس کے عذاب سے بھی خبردار کریں۔ ارشاد ہوتا ہے

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۲۷ تا ۳۱ کی طرف رجوع کیا جائے ان آیات میں دونوں بھائیوں کی گفتگو اور ہابیل کے قتل کی وجہ بیان کی گئی ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪

(۳) انبیاء کے تعلیمی اور آئینی پروگرام کی تشکیل اُس کتاب کے ذریعے ہوتی ہے جو تمام اختلافات اور جھگڑوں کو ختم کر سکتی ہے ۔حقیقت میں وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ ان کی سند تو وہ کتاب ہوتی ہے جو ان کے ساتھ نازل کی جاتی ہے

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

(۴) انبیاء بھیجنے کا مقصد اُس اختلاف اور نزاع کا خاتمہ تھا جو لوگوں میں مختلف وجوہات کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

(۵) اس بات کی اُمید تھی کہ ان خُدائی منصفوں اور آئینِ حق کی موجودگی سے تمام اختلاف اور نزاع ختم ہو جائیں گے اور انسان اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے گا لیکن ہائے افسوس کہ انسان یہاں پر دو گروہوں میں بٹ گیا۔ گویا اس سے اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ یعنی وہ دینی تعلیمات اور کتاب جو کہ ان کے درمیان اتحاد قائم کرنے اور اختلاف ختم کرنے کے لیے نازل ہوئی تھیں خود اُس میں انہوں نے اختلاف شروع کر دیا جن لوگوں نے اختلاف کی اس آگ کو بھڑکایا وہ خُدا کی تعلیمات سے جاہل نہ تھے بلکہ وہ تو دینی تعلیمات اور احکامات کے متعلق علم رکھتے تھے۔

انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے یہ اختلاف پیدا کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ

یہاں پر اس نکتے کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ ''الذین اُوتُو ہُ'' یعنی جنہیں کتاب دی گئی ہے سے مراد کون لوگ ہیں ۔کیا اس سے مُراد پہلی امت کے وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے خُدا کے فیصلے کو قبول نہ کیا یا یہ کہ مُراد وہ علماء ہیں جو اس کتاب الٰہی سے آشنا تھے ان کے لیے دلیل قائم ہو چکی تھی؟ اگر دوسرے لوگ گمراہ ہوئے ہیں تو اپنی علماء کی پیروی کی وجہ سے یہ سرکشی اور تجاوز کی وجہ سے اخدائی تعلیمات کے سات اکڑ گئے تھے۔

بات زیادہ صحیح معلوم ہوئی کہ مُراد وہ لوگ ہیں جو اس کتاب کے متعلق علم رکھتے تھے کیونکہ کتاب خُدا سے جاہل عام لوگ ''اُتو االکتب'' کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''جائتھُمُ البینات' بلکہ یہ تعبیرات تو ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو کتاب خُدا سے سروکار رکھتے ہوں جو انبیاء کے دلائل اور براہین دیکھ چکے ہوں۔ لیکن سرکشی اور تجاوز کی روح انہیں کتاب خُدا کو فیصلہ کرنے والے کے طور پر ماننے سے روک دیتی ہے۔

یہ مفہوم سورہ آل عمران آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹

''خُدا کے نزدیک (پسندیدہ) دین اسلام (خدا کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) ہی ہے۔جن لوگوں کو خدا کی کتاب دی گئی انہوں نے اس کو جاننے اور حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد بھی اس میں اختلاف کیا اپنے درمیان سرکشی کی وجہ سے جو بھی خُدا کی آیات کو جھٹلائے تو خدا سریع الحساب ہے۔[1]

جن آیات میں ''اُوتُو االکتب یا اتینھم الکتب'' کی تعبیر ہے ان کی طرف رجوع کرنے کے بعد یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مُراد سب لوگ چاہے عالم ہوں چاہے جاہل ہوں نہیں ہیں۔ بلکہ مُراد پڑھا لکھا طبقہ ہے۔قرآن کے الفاظ میں وہ ''احبار'' اور ''رہبان'' ہیں کہ جو حقیقت کو جان لینے کے باوجود اسے چھپاتے تھے۔دنیاوی اور مادی مفادات کی وجہ سے وہ حق کو چھپانے پر زور دیتے تھے۔ارشاد ہوتا ہے

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۴۶

''وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ پیغمبر کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ حق کو جاننے کے باوجود اُسے چھپاتا ہے'' (بقرہ۔۱۴۶)

(٦) خُدا کی مشیت یہ ہے کہ جو لوگ آپ کو ہدیت کے راستے پر ڈالتے ہیں خدا بھی ان کی ہدایت کرتا ہے اور انہیں حق تک پہنچا دیتا ہے۔لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس جادے پر قدم ہی نہیں رکھا اور اس طرح کی ہدایت پانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ ہی نہیں کیا وہ و لازمی طور پر ضلالت اور گمراہی میں ہی رہیں گے۔خُدا ان کو گمراہی میں ڈالتا رہے گا۔یعنی انہیں دوسری ہدایت سے بہرہ ور نہیں کرتا ---چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] یہ مفہوم سورہ شوری آیت ۱۴ اور سورہ جاثیہ ۱۷ میں بھی آیا ہے ان میں بھی اختلاف کا عامل بغاوت اور سرکشی کو بیان کیا گیا ہے جنہیں کتاب دی گئی تھی (علماء) انہوں نے بغاوت اور سرکشی کی۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ (بقرہ)

''فَهَدَى اللّٰهُ'' سے مراد وہی ہدایت ہے جس پہلی ہدایت حق کی اتباع کرنے کے لیے آمادہ ہے اسی طرح یهدی من یشاء '' سے مراد بھی دوسری ہدایت ہے۔ گویا ایک ہدایت کے بعد دوسری ہدایت آتی ہے۔ ''لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ'' میں اختلاف سے مراد ممکن ہے پہلا اختلاف ہو جو کہ اتحاد کے بعد پیدا ہوا تھا جس کے نتیجے میں کتاب پر ایمان لانے والے تو اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے اور ہم فکر ہو گئے جب کہ کافر اختلاف میں ہی گھرے رہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ دونوں اختلافات کے بارے میں ہو کیونکہ دونوں طرح کے اختلافوں میں فقط انہی لوگوں نے ہدایت پائی جو حق پر ایمان لے آئے اور انہوں نے انبیاء کے احکام کی پیروی کی۔

لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت بھی فلاسفہ جے استدلال کے ساتھ ہم آہنگ ہے جنہوں نے معاشرے میں کسی قانون کی موجودگی کے حروری ہونے سے انبیاء کی بعثت پر استدلال کیا تھا۔ رفع اختلاف سے مُراد اجتماعی زندگی کے مختلف نشیب و فراز میں اختلاف کا خاتمہ ہے جو ایک عادلانہ قانون کے اجرا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دیگر آیات میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوُا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ

''تا کہ وہ جس چیز میں اختلاف کرتے ہیں اسے واضح کریں'' (نحل۔ ۳۹)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ

ہم نے آپ پر اس لیے قرآن نازل کیا تا کہ آپ اُس چیز کو بیان کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں ۔'' (نحل۔ ۶۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾

جب عیسیٰ نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے (لوگوں سے) کہا میں تمہارے پاس دانائی کی باتیں لے کر آیا ہوں تا کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کردوں پس تم تقویٰ اختیار کرو اور میرا

کہا مانو۔ (زخرف۔ ۶۳)

امام رضا علیہ السلام انبیاء کی شناخت اور معرفت کے ضروری ہونے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

چونکہ لوگوں کے درمیان کوئی ایسی ذات نہ تھی جو ان کے مصالح اور بھائیوں کو پوری طرح سمجھ سکی۔ خُدا بھی اس سے بالاتر ہے کہ اسے آنکھوں کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ لوگ بھی ظاہری حیات سے خُدا کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہذا انبیاء کو بھیجنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا تا کہ وہ لوگوں کو خُدا کے اوامر اور نواہی سے آگاہ کریں۔ انہیں وہ چیزیں بتاتے جن میں ان کا فائدہ ہے اور جو انہیں نقصانات سے بچاتی ہیں کیونکہ لوگوں کے درمیان کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان چیزوں کو جانتا۔ اگر انبیاء کی معرفت اور ان کی پیروی عقلی نکتہ نظر سے ضروری نہ ہوتو انبیاء کا آنا کسی قسم کے فائدے کا حامل نہ ہوتا۔ لہذا وہ پہلے والا خلا برقرار رہے گا بلکہ ان کو بھیجنا ایک بے ہودہ اور فضول کام ہوگا اور یہ کام خُدا کی حکیمانہ ذات سے دور ہے جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ خلق کیا ہے۔ [1]

انبیاء کے بھیجنے کا تیسرا مقصد

رقابتوں کا فیصلہ

بعض انبیاء تبلیغ اور احکام خداوندی کے بیان کے ساتھ ساتھ ایک الٰہی حکومت قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ کوئی حکومت بھی مندرجہ ذیل تین قوتوں کے بغیر نہیں چل سکتی:

(۱) قانون

(۲) قانون کا اجرا کرنے والے

(۳) وہ قاضی اور منصف جو اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔

ان تینوں کو مقننہ، مجریہ اور عدلیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ تینوں کے لیے حکومت کا تشکیل پانا ہے۔

قرآن نے بعض انبیاء کا ذکر کیا ہے جو تبلیغ احکام کے بلند الٰہی مقام کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان بعض امور میں لوگوں کے اختلافات بھی دور کرتے تھے۔ البتہ یہ اختلاف خُدا میں اختلاف نہ تھا۔ وہ خُدا کے حکم کو تو مانتے تھے لیکن جس موضوع پر ان کا اختلاف ہوتا تھا اُس کے متعلق خُدا کے حکم کا کیا حکم ہے اس سے وہ ناواقف ہوتے تھے۔ لہذا وہ اسکے لیے انبیاء کی طرف رجوع کرتے اور اس موضوع میں خُدا کے حکم سے متعلق سوال کرتے۔ درحقیقت انبیاء۔ کی بعثت کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ وہ اختلاف کے خاتمے کے کلی اصول کے تحت

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۴۰ بحوالہ معانی الاخبار وعیون اخبار الرضا۔

اقدامات کرتے۔اس سلسلے میں ہم قرآن کی چند آیات کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

حضرت داؤد سے خطاب ہوتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا۔پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرو کہ یہ تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا دیں گی۔ (ص۔۲۵۱)

ایک اور آیت میں خدا نے حضرت داؤد کی تعریف ان الفاظ میں کی:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

خدا نے داؤد کو مُلک (ایک مکمل حکومت) اور حکمت عطا کی اور جو کچھ اس میں چاہا اُسے سکھا یا۔(بقرہ۔۲۵۱)

جو لوگ معاشرے کے راہنما ہوتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلے بھی کریں۔یہ کام وہ یا تو خود انجام دیں یا اپنی طرف سے صالح افراد مقرر کریں جو اس کام کو انجام دیں۔بعض آیات میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے قضاوت کرنے کا طریقہ کار بیان ہُوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ؗ

''ہم نے ان دونوں کو فیصلہ کرنے کا حق اور علم عطا کیا۔ (انبیاء۔۷۹)

فقط حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ہی فیصلہ کرنے کے مقام کے حامل نہ تھے بلکہ بعض آیات سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک اور جماعت بھی اس عظیم مرتبے کی حامل تھی۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے؛

دْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝۵۴

'ہم نے اولاد ابراہیم کو کتاب اور حکمت و دانائی عطا کی اور انہیں ایک عظیم سلطنت عطا کی۔ (نساء۔۵۴)

ایک عظیم سلنت میں قطعی طور پر لڑائی جھگڑوں اور اختلاف کا فیصلہ بھی ہوتا ہوگا۔رسول اسلام جو خود بھی اولاد ابراہیم میں سے ہیں ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اِنۡ حَكَمۡتَ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ﴿۴۲﴾

اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ کرو۔ خدا عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

دو اور آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (مائدۃ۔۴۸)

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (مائدۃ۔۴۹)

ان آیات سے مجموعی طور پر اور دوسری آیات سے جو کہ انبیاء کے فیصلوں اور قضادت کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انبیاء کو بھیجنے کا ایک مقصد اور وجہ لڑائی جھگڑوں اور تنازعات میں فیصلہ کرنا تھا۔ یعنی مختلف موضوات میں اختلاف کا خاتمہ۔ فرق صرف یہ ہے کہ کبھی تو انبیاء کلی احکام کو بیان کرنے اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے آتے ہیں اور کبھی تو جزئی اور انفرادی موضوعات میں اختلاف کے خاتمے کے لیے بہر حال دونوں اختلاف ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں جن کی وجہ سے انبیاء مبعوث کیے جاتے ہیں۔

(۴) انبیاء کی بعثت کا لزوم
قرآنی نکتہ نظر سے

دوسرا حصہ

زیر بحث آیات کے موضوعات:

(۴) انسانی معاشرے میں عدل کا قیام۔

(۵) تزکیہ یا جبلی خواہشات میں توازن

(۶) کتاب وحکمت کی تعلیم

(۷) بندوں پر اتمام حجت

۱۔ انسانی معاشرے میں عدل کے قیام سے متعلق آیات

(۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید۔۲۵)

(۲) وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُو (یونس۔۴۷)

(۳) يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ (اعرف۔۸۵)

ب۔ جبلی خواہشات کے توازن سے متعلق آیات

(۱) وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ﴿۷﴾ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ﴿۸﴾ (شمس۔ ۷،۸)

(۲) وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ﴿۱۰﴾ (بلد۔ ۱۰)

(۳) اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا
بَصِيۡرًا ﴿۲﴾ (دھر۔ ۲)

(۴) فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾ (نزعت۔ ۱۸)

(۵) هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ
وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۙ﴿۲﴾
(جمعۃ۔ ۲)

(۶) رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ
الرُّسُلِ ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۶۵﴾ (نساء۔ ۱۶۵)

ج۔ کتاب و حکمت کی تعلیم سے متعلق آیات

(۱) ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ ‌ؕ (بنی اسرائیل۔ ۳۹)

(۲) رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (بقرہ۔ ۱۲۹)

(۳) وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ‌ؕ (ابرھیم۔ ۴)

(۴) وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ
يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (نحل۔ ۴۴)

د۔ بندوں پر اتمام حجت سے متعلق آیات

(۱) رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾ (نساء۔ ۱۶۵)

(۲) يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُولُوا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيرٍ وَّلَا نَذِيرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيرٌ وَّنَذِيرٌ ؕ وَاللهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۹﴾ (مائدہ۔ ۱۹)

(۳) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُونِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ (یس۔ ۶۱،۶۰)

(۴) وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ (طه۔ ۱۳۴)

(۵) وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (بنی اسرائیل۔ ۱۵)

تفسیر

گذشتہ باب میں ہم نے انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے کے متعلق قرآنی نکتہ نظر سے تین اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا۔ اس باب میں دوسرے مقاصد کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے۔

چوتھا مقصد

عدل کا قیام

بعض آیات میں انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتابیں نازل کرنیکا مقصد انسانی معاشرے میں عدل کا قیام بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ

النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا۔اوران کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بہت قوت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔'' (حدید۔۲۵)

''لیقوم الناس بالقسط'' کا جملہ جو کہ آیت کے ابتداء میں آیا ہے انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کے مقصد کی طرف اشارہ کررہا ہے۔گویا معاشرے میں عدل وانصاف کی حکمرانی قائم کرنا انبیاء کے مقاصد میں سے ہے۔کتاب اور فیصلے کے ترازو کے نزول کے بعد لوہے کے نازل کرنے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔اُس کی طاقت اور قوت کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔اس میں شاید یہ نکتہ ہو کہ عدل و انصاف کے قیام کے لیے دوطریقہ اپنانے چاہیں ایک تو تبلیغ اور تعلیم کا طریقہ یہ پاک دل لوگوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔اور دوسرا قدرت اور طاقت کا طریقہ یہ ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو دلیل کو قبول نہیں کرتے بلکہ سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس آیت میں عدل کا قیام تمام انبیاء کے اہداف میں سے ذکر کیا گیا ہے۔گویا یہ ایک عمومی اور کلی ہدف ہے

سورہ یونس آیت ۴۷ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

ہرامت کے لیے نبی ہے۔جب بھی ان کا نبی آتا تو ان کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ ہوتا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس آیت میں اگرچہ فیصلہ کرنے والے کا نام واضح طور پر نہیں لیا گیا لیکن ظاہر یہی ہے کہ وہ فیصلہ کرنے والا خدا ہے لوگوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنے کی نمائندگی کا فریضہ رسول سرانجام دیتا ہے۔

لیکن بعض آیات مین چند مخصوص نبیوں کا ذکر ہوا ہے جو لوگوں کو عدل وانصاف کی دعوت دیتے رہے۔حضرت شعیب کے متعلق ہے کہ وہ لوگوں کو توحید کے بعد عدل وقسط کی طرف بلاتے تھے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ

اے لوگو: خدا کی عبادت کرو تمہارا معبود صرف وہی ہے۔تمہاری طرف روشن نشانیاں آئی ہیں۔تم ناپ اور تول پورا پورا کیا کرو اور کم فروشی نہ کرو اور روئے زمین پر اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔
(اعراف۔۸۵)

قرآن نے اس حقیقت کو متعدد آیات میں حضرت شعیب کی زبان سے ذکر کیا ہے۔یہ مفہوم سورہ اعراف آیت ۸۵،سورہ ہود آیت ۸۴،۸۵ اور سورہ شعراء آیت ۱۸۱ تا ۱۸۳ میں بھی آیا ہے۔

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ آیا۔یہاں پر قسط وعدل سے مُراد معاشی اور اقتصادی مسائل اور لوگوں کے حقوق سے متعلق مسائل میں عدل ہے یا کہ یہ ایک وسیع تر معنیٰ کا حامل ہے کہ جس میں ایک طرح سے عدل کی تمام اقسام شامل ہیں؟ یہ ایک الگ بحث ہے جسے ''عدل'' کے عنوان کے تحت الگ سے ذکر کرنا چاہیے۔

یہاں پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے میں عدل وقسط کی حکمرانی تین چیزوں سے وابستہ ہے:

(۱) ایک ایسے قانون کا ہونا ضروری ہے جو عدل اور ظلم کی حدود و قیود بیان کرے تا کہ اس قانون کی روشنی میں عدل وانصاف کو ظلم و تجاوز الگ کیا جا سکے۔

(۲) ایک عادل اور منصف مجری کا ہونا ضروری ہے جو معاشرے میں اس قانون پر عمل درآمد کروا سکے۔

(۳) ایک منصف اور عادل قاضی کا ہونا ضروری ہے جو فیصلے کے وقت عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھے۔

انبیاء حقیقت میں کبھی تو فیصلے کے وقت اختلاف اور کبھی اُس قانون پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو اختلاف ہوتا ہے۔اُس کو ختم کرتے ہیں۔اور کبھی اپنے احکامات سے اختلاف کا راستہ بند کر دیتے ہیں۔قسط وعدل سے مربوط آیات کا مقصد اختلاف کے راستے کو مسدود کرتا ہے۔

(۵)۔تزکیہ یا جبلی خواہشات میں توازن

بعض فلاسفہ کے نظریے کے برخلاف جو انسان کی شخصیت کو صرف فکر ونظر (نفس ناطقہ) میں منحصر سمجھتے ہیں انسان کی شخصیت کا کچھ حصہ جبلی جذبات اور فطری میلانات پر مشتمل ہے چونکہ فلاسفہ کا کام زیادہ تر فکر اور ادراک سے متعلق ہے اس لیے انہوں نے انسان کو صرف اسی عینک سے دیکھا ہے۔انہوں نے انسان کی تعریف یُوں کی ہے کہ وہ ای ایسا موجود ہے جو سوچتا ہے اور غور وفکر سے کام لیتا ہے جب کہ علمائے اخلاق اور وہ لوگ جو انسان کے تزکیہ نفس پر کام کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر اس کی جبلی خواہشات اور فطریات کے متعلق جستجو کرتے ہیں۔وہ انسان کو جبلی جذبات کا ایک ڈھیر قرار دیتے ہیں۔لہٰذا انسان کی جامع تعریف یہ ہے کہ:

اُس کی شخصیت کا ایک حصہ فکر وادراک پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ جبلی جذبات وخواہشات پر۔

انسان کے اندر ہی جبلی جذبات اور فطریات کا ایک خزانہ ہے۔ہم اُن سے کسی حد تک آگاہ بھی ہیں۔اگر خُدا جوئی کے موضوع کو ایک

طرف رکھدیں کہ جو خود بھی ایک فطری امر ہے پھر بھی نیکی اور فضیلت کی طرف رُجحان اور برائی اور ناپاک صفات سے اجتناب انسان کے لیے ایک فطری امر ہے۔البتہ فطری امور صرف یہی نہیں ہیں بلکہ جنسی رجحانات لذت کی طرف میلان، مال و ثروت کی ذخیرہ اندوزی مقام اور منصب کا حصول وغیرہ بھی انسان کی ذات میں تکوینی اور طبیعی طور پر موجود ہیں۔ان جبلی خواہشات کی طرف توجہ نہ کرنا یا انہیں بالکل کچل دینا انسان کی حیات نو کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔اسی طرح ان میں افراط سے کام لینا بھی آزادی ہوس کا باعث بنتا ہے۔یہ بھی تفریط کی طرح انسان کے لیے خطرناک ہے۔لہذا ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر موجود جبلی خواہشات میں ایک صحیح توازن قائم کرے۔انہیں صحیح سمت کی طرف چلائے انسان نہ تو ایک راہب یا تارک دنیا کی مانند بن جائے جو ہر طرح کی مادی خواہشات کو کچل دیتا ہے اور نہ ہی ایک شہوت پرست انسان کی شکل اختیار کر جائے جس کا مقصد شہوت اور اپنے اندرونی جذبات کی تکمیل ہی رہ جاتا ہے۔

انسان کا وجود تو اُس پودے کے مانند ہے جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک عقل منداور ہوشیار باغبان کی ضرورت ہوتی ہے جو اُس کے راستے میں موجود رکاوٹوں کو دور کر کے اُس کے اندرونی کمالات کو پروان چڑھنے کا موقع فراہم کرے تا کہ اُس کی شاخوں پر طرح طرح کے پھل نمودار ہو سکیں۔یا انسانی وجود اُس عظیم پہاڑ کی طرح ہے جس میں مختلف طرح کی قیمتی معدن موجود ہیں۔بہت ماہر اور تجربہ کار انجینئرز کی رہنمائی کے بغیر ان معدنسے فائدہ اٹھانا ناممکن نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان جبلی خواہشات کی رہبری اور زمام کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے؟

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کام کے لیے ایسا مربی ہونا چاہے جو انسان سے پوری طرح آگاہ ہو تا کہ وہ اُس کی جبلی خواہشات اور جذبات کی تمام باریکیوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔اُسے لغزش، بھول چوک یا غلطی سے مبرا ہونا چاہیے تا کہ اس کی رہبری اور قیادت کو کامل صورت حاصل ہو اور ناقص نہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اُس رہبر اور قائد کو بھی تربیت کا ایک مکمل شاہکار ہونا چاہیے کیونکہ تربیت کرنے والے کی خصوصیات ہی سب سے زیادہ اُس کے زیر تربیت افراد پر اثر انداز ہوتی ہیں۔لوگ ہمیشہ اپنے قائدین کا رنگ ہی اختیار کرتے ہیں۔

اگر ہم یہ چاہیں کہ رہبری اور قیادت کامل ہو تو اس کے لیے زیر تربیت افراد پر اُس تربیت کے اجرا کی ضمانت بھی حاصل ہونا چاہیے تا کہ اس اجرائی ضمانت کی وجہ سے وہ ہر جگہ چاہے اکیلے ہُوں چاہے دوسروں کے سامنے تربیت کرنے والے فرد کے احکامات پر عمل کر سکیں۔

ان تین شرائط پر صرف آسانی قائدین ہی پورے اُتر سکتے ہیں۔کیونکہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم کے سائے میں مکمل انسان شناس ہوتے ہیں۔وہ انسان کی تمام جسمانی اور روحانی باریکیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔وہ خود بھی تربیت کا ایک مکمل شاہکار ہوتے ہیں۔وہ جو کچھ کہتے ہیں خود بھی اُس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔وہ لوگوں میں آخرت کی دنیا پر اعتماد پیدا کرتے ہیں کہ لوگوں کو اُس دنیا میں اپنے اعمال کی سزا یا جزا دی جائے گی۔اس سے وہ اپنے تربیتی پروگرام کو مکمل کرتے ہیں۔

لہذا انبیاء کا ایک مقصد جبلی خواہشات میں توازن قائم کرنا، تزکیہ نفوس اور انسان کو تعمیری اخلاق سے آگاہ کرنا ہے جس سے انحراف معاشرے اور فرد کی بدبختی کا باعث بن سکتا ہے۔

عیسائیت میں پادری مادی نعمات سے روک کر کچھ لوگوں کے لیے بدبختی کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ اکیلے رہنے اور ترک ازدوان سے دوسری کئی برائیوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی مادیت Moral materialism میں معاملہ برعکس ہے۔ جوان قتل و غارت اور جرائم سے بھرپور نیز رومان سے بھرپور فلمیں دیکھ کر ایک ویوکی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچھلنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں کی تربیت میں ان چیزوں کی ضرورت آشکار ہے:

(۱) ایک صحیح جامع پروگرام (جو افراط و تفریط سے محفوظ ہو)

(۲) ماہر اور درد دِل رکھنے والے مربی

(۳) ایک مضبوط قوت جو اِن قوانین کے اجراء کی ذمہ دار ہو

یہ باتیں انبیاء کے مکتب میں ہی پوری طرح مل سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں جو آیات آئی ہیں ان میں سے بعض تو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان کے اندر کچھ جبلی خواہشات ہیں اور بعض دوسری اس امر پر تاکید کرتی ہیں کہ اُن کی صحیح راہنمائی بہت ضروری ہے۔ ہم پہلے حصے کے لیے مندرجہ ذیل آیات کو ذکر کرتے ہیں

۱۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸

نفس انسان اور اُس خدا کی قسم جس نے اسے پیدا کیا، نیکیوں اور برائیوں کی اُسے ہدایت دی۔

(شمس۔ ۷،۸)

(اسی کو اخلاق کی کتابوں میں فضائل اور نیکیوں کی طرف رُجحان اور برائیوں اور رذائل سے اجتناب کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰

ہم نے حق اور باطل کی طرف اُس کی راہنمائی کی۔ (بلد۔ ۱۰)

تیسری آیت یُوں ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ ہم اُس کا امتحان لیں گے (اسی لیے) اُس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔ (دھر۔ ۲)

شاید محفوظ نطفے سے مراد وہی اچھائی اور برائی کی طرف میلان اور رُجحان ہو جس کی صلاحیت انسان کے نطفے میں موجود ہے۔

یہ آیات انسان کے اندر چند رجحانات کی موجودگی کی تائید کرتی ہیں۔ بعض آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انبیاء کوان

رُجحانات اور جبلی خواہشات کی رہبری اور راہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔

حقیقت میں تزکیہ سے مُراد بھی انسانی وجود کو پاک و پاکیزہ کرنا ہے۔ جیسے درخت کو ٹیڑھی اور غیر پسندیدہ شاخوں سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ یا اُس کے دل کی سرزمین کو گندی اور نقصان دہ جڑی بوٹیوں اور گھاس سے پاک رکھنا ہے۔ بہت سی آیات میں تزکیے کو انبیاء کا ایک مقصد قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ خُدا نے حضرت موسیٰ کو یہ حکم دیا کہ فرعون سے کہو کہ کیا تم تزکیہ کی راہ پر چلنا چاہتے ہو۔

فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ ازعات۔ ۱۸)

بہت سی آیات میں انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد لوگوں کے اخلاق کی پاکیزگی اور ان کا تزکیہ قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ

یہ جملہ کئی آیات میں آیا ہے۔ [۱] البتہ یہاں پر ایک قابل ذکر نکتہ ہے وہ یہ کہ جہاں پر خُدا نے انبیاء کی بعثت کے مقصد اور ہدف کی بات کی ہے وہاں پر تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں پر حضرت ابراہیم نے خُدا سے یہ درخواست کی ہے کہ مکہ اور اس کے اردگرد کے لوگوں کے لیے پیغمبر بھیجے وہاں پر تعلیم کو تزکیہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اس تقدم اور تاخر میں کیا راز ہے، اس کو ہم آگے بیان کریں گے۔

اس عظیم مقصد کے لیے کبھی تو ''تزکیہ'' کی تعبیر ذکر کی گئی ہے اور کبھی ''تقویٰ'' اور ''توبہ'' کی۔ لہٰذا وہ آیات جن میں انبیاء کی طرف سے تقویٰ اور توبہ کی طرف دعوت دی گئی ہے وہ اسی مقصد کو بیان کرتی ہیں۔ یعنی انبیاء کی بعثت کے ''اخلاقی مقصد'' کی وضاحت کرتی ہیں۔ [۲]

بعض آیات میں ایک ایسے رہبر اور قائد کی بات کی گئی ہے جو اس پروگرام پر عمل درآمد کرانے کا ضامن ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۶۵﴾

خدا نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبروں کو لوگوں کی راہنمائی کے لیے بھیجا تا کہ وہ خدا کے سامنے کسی قسم کا عذر پیش نہ کرسکیں۔ خُدا عزیز اور حکیم ہے۔ (نساء۔165)

مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ کے الفاظ اُس جزا اور سزا کی طرف اشارہ ہیں جو خُدا نے ان لوگوں کے لیے مقرر کی ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں یا نافرمانی کرتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی نے ایک خطبے میں اس ضامن کی طرف یُوں اشارہ فرمایا ہے:

---

[۱] بقرہ۔(129,151)(آل عمران۔164)(جمعہ۔2)

[۲] (شعراء۔108,110,124,126,177,179,184)(اعراف۔74,85,86) (ھود۔61)(نحل۔46)(عنکبوت۔36)

بَعَثَ اللهُ رُسُلَهُ بِمَا خَصَّهُمْ بِهِ مِنْ وَّحْيِهِ وَجَعَلَهُمْ حُجَّةً لَّهُ عَلٰى خَلْقِهِ لِئَلَّا تَجِبَ الْحُجَّةُ لَهُمْ بِتَرْكِ الْاَعْذَارِ اِلَيْهِمْ فَدَعَاهُمْ بِلِسَانِ الصِّدْقِ اِلٰى سَبِيْلِ الْحَقِّ فَيَكُوْنُ الثَّوَابُ جَزَآءً وَّالْعِقَابُ بَوَآءً

''خُدا نے اپنے نبی بھیجے اور انہیں اپنی وحی عطا کی اور انہیں لوگوں پر اپنی دلیل اور رہنما بنایا تا کہ لوگ خُدا کے سامنے کوئی عذر پیش نہ کر سکیں۔ تمام لوگوں کو انبیاء کے ذریعے سچی زبان حق کے راستے کی طرف بُلایا تا کہ نیک اعمال پر انہیں ثواب ملے اور برے اعمال پر عذاب۔''[۱]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور خطبے میں انبیاء کی تعلیم کے بنیادی اصولوں کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے خُدا نے جسے انسان کی فطرت اور ذات میں ودیعت کیا ہے۔ انبیاء کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان فطری رُجحانات کی نشوونما کریں۔ گویا انبیاء یاددہانی کرانے والے ہیں نہ کہ کوئی نئی چیز پیش کرنے والے، جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اُسے پہلے ہی انسان اپنے مکتب فطرت میں پڑھ چکا ہے۔ لیکن فطرت کے یہ قیمتی گوہر ایسے انجنیئر وں کے محتاج ہیں جو انہیں سامنے لا سکیں۔ اپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

وَاصْطَفٰى سُبْحٰنَهٗ مِنْ وَّلَدِهٖ اَنْبِيَآءَ، اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ ،وَعَلٰى تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ........ فَبَعَثَ فِيْهِمْ رُسُلَهٗ وَوَاتَرَ فِيْهِمْ اَنْبِيَآءَهٗ، لِيَسْتَاْدُوْهُمْ مِّيْثَاقَ فِطْرَتِهٖ وَيُذَكِّرُوْهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهٖ وَيَحْتَجُّوْا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيْغِ وَيُثِيْرُوْا لَهُمْ دَفَآئِنَ الْعُقُوْلِ۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے اُن (آدم کی) اولاد سے انبیاء چُنے، وحی پہنچانے پر اُن سے عہد و پیمان لیا۔ تبلیغ رسالت کا انہیں امین بنایا۔۔۔۔ اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کیے اور لگا تار انبیا بھیجے تا کہ اُن سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں اُس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں فطرت میں پنہاں عقل کے گوہروں کو نکالیں۔ فٹ نوٹ یہاں تک اس مقصد سے متعلق گفتگو اختتام کو پہنچی۔ حقیقت میں اس مقصد کی تشکیل دو مقدمات سے ہوتی ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ۔ خطبہ 144

[۲] نہج البلاغہ۔ خطبہ ا۔

(1) انسانی وجود جبلی خواہشات اور فطری رجحانات کا ایک ڈھیر ہے۔

(2) ان جبلی خواہشات سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو افراط اور تفریط سے محفوظ ہو ایک خطوط پر چلا سکے۔

اگر اس نتیجے کے ساتھ ایک اور مقدمے کا بھی اضافہ کر دیا جائے وہ یہ کہ ان جبلی خواہشات کی صحیح راہنمائی صرف انبیاء ہی کر سکتے ہیں اس سے نتیجہ حاصل ہوگا کہ انسان کو کمال ممکن تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ خُدا انبیاء کو مبعوث کرے تا کہ وہ ان جبلی خواہشات میں توازن قائم کر کے اِس مقصد کی تکمیل کریں۔

یہاں تک ہم نے مختلف طریقوں سے انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے کو ثابت کیا ہے ان میں سے بعض آیات الٰہی سے لیے گئے تھے اور بعض روایات سے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خُدائے حکیم کی مشیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ انسان کو اُس کی حالت پر نہ چھوڑے بلکہ اُس کی راہنمائی کے لیے اپنی طرف سے انبیاء بھیجے۔لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ پانچ دلیلیں اور طریقے جو ہم نے بیان کیے ہیں ان کی برگشت تین بنیادی اصولوں کی راہنمائی کی وضاحت کی طرف ہی ہوتی ہے وہ یہ کہ انبیاء کو لوگوں میں تین اہم باتوں کے متعلق راہنمائی اور اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہے۔

(1) خدا اور قیامت سے متعلق عقیدے کی اصلاح کے لیے (پہلا طریقہ)

(2) معاشرے کی اصلاح کے لیے یعنی عدالت پر مبنی قوانین بیان کر کے نوعِ انسانی اور معاشرے کی حفاظت کی جائے۔اِن کے ساتھ عادل اور ذمہ دار افراد کی موجودگی جو ان کے اجراء کے ذمہ دار ہوں (دوسرا، تیسرا اور چوتھا طریقہ)

(3) اخلاقی اصلاح جبلی خواہشات اور اندرونی رجحانات کے درمیان توازن قائم کر کے اُن کی صحیح راہنمائی کرنا۔

(پانچواں طریقہ)

یہاں تک ہم نے بعثت کے پانچ مقاصد اور تین اصولوں کو ذکر کیا۔اس بحث کو مکمل کرنے کے لیے چند اور مطالب کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایک لحاظ سے انبیاء کی بعثت کے مقصد سے ہی مربوط ہیں لیکن حقیقت ہیں وہ انہی تین مذکورہ اصولوں کی بنیاد اور اساس ہیں۔

پانچواں مَقصد

کتاب اور حکمت کی تعلیم

بعض آیات میں انبیاء کی بعثت کا مقصد آسمانی کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا قرار دیا گیا ہے۔البتہ ”کتاب“ سے مراد ہر پیغمبر کی کتاب ہے جس کے ساتھ اُسے مبعوث کیا گیا ہے۔جیسے حضرت نوح اور ابراہیم کے لیے ”صحف“ حضرت موسیٰؑ اور عیسٰیؑ کے لیے تورات اور انجیل اور پیغمبر اسلام کے لیے قرآن مجید۔

حکمت سے مُراد وہ حکیمانہ احکام ہیں جو دونوں جہانوں میں انسان کی سعادت اور بھلائی کے ضامن ہیں۔حکمت سے مُراد فقط فلسفہ

نظری (فلسفوں کی ایک خاص اصطلاح) ہی نہیں ہے کیونکہ قرآن چند اصول اور معارف جو مختلف معاشرتی، اخلاقی اور عقائدی جہات سے متعلق ہیں ان کے ذکر کے بعد یُوں فرماتا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

یہ محکم اور متقن اصول ہیں جو خُدا نے تجھ پر وحی کیے ہیں۔ (اسراء۔39)

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات کے مطابق انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد کتاب وحکمت کی تعلیم ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ واضح آیت یہ ہے جس میں حضرت ابراہیم دُعا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ (بقرہ.129)

خُدایا: ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیج تا کہ وہ اُن پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک وپاکیزہ کردے۔ بے شک تو طاقت والا اور دانا ہے۔

اسی حقیقت کو ایک اور انداز میں یُوں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (ابراھیم۔4)

ہم نے ہر رسول کو اُس کی قوم کی زبان میں گفتگو کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ (وہ خُدا کے احکام) کو ان کے لیے بیان کرے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (نحل۔44)

ہم نے تجھ پر قرآن کو نازل کیا تا کہ تو لوگوں کو وہ بتائے جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے شاید وہ غور وفکر کریں۔

"لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ" سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نبی کی ذمہ داری فقط قرآن کی تلاوت کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ قرآن کے بلند اور عظیم مفاہیم بھی ان کے لیے واضح کرے۔

یہاں پر ایک نکتے کی یاددہانی ضروری ہے وہ یہ کہ یہ بات درست ہے کہ کتاب وحکمت کی تعلیم انبیاء کی بعثت کا مقصد ہے لیکن یہ

مقصد گذشتہ تین اصولوں کا ہی مقدمہ ہے کیونکہ جب تک خُدا کی طرف سے کتاب وحکمت کے ذریعے تعلیم نہ ہو اُس وقت تک عقیدے کی اصلاح کا امکان نہیں ہے اور نہ ہی معاشرتی اور اخلاقی اِصلاح ہو سکتی ہے۔

لہذا کتاب وحکمت کی تعلیم ایک ایسا مخروطی قاعدہ ہے جس کی بنیاد اِن تین اصولوں پر قائم ہے۔

تعلیم سے مربوط آیات کو ہم نے روح انسانی کے تزکیہ سے متعلق باب میں بھی ذکر کیا تھا۔ یہاں پر ہم اُس سوال کا جواب دیتے ہیں جو پہلے سامنے آ چکا ہے وہ یہ کہ حضرت ابراہیم کی گفتگو میں جہاں پر خُدا سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ سرزمین تہامہ اور حجاز کے لیے ایک نبی بھیجے اس درخواست میں "تعلیم کتاب" کو تزکیہ نفوس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

لیکن تین اور آیات میں جن میں خُدا نے پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد ذکر کیا ہے۔ تزکیہ کو تعلیم سے پہلے ذکر کیا ہے۔[1]

ہم نے جو کچھ پہلے کہا کہ کتاب وحکمت کی تعلیم عقیدے معاشرے اور اخلاق کی اصلاح کا مقدمہ ہے اس کے لیے راہ ہموار کرتی ہے اس سے حضرت ابراہیم کی گفتگو میں تعلیم کو تزکیہ سے پہلے ذکر کرنے کا نکتہ واضح ہو گیا کیونکہ جب تک کتاب وحکمت کی تعلیم نہ دی جائے دوسرے لفظوں میں یوں کہ جب تک انسان خدا کے پروگرام سے پوری طرح آشنا نہ ہو جائے اُس وقت تک تزکیہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ندس کی پاکیزگی تو خُدا کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد ہی حاصل ہو گی۔ وہ دستورات اور احکام کتاب اور حکمت میں ہی ذکر ہوئے ہیں۔

لیکن چونکہ کتاب وحکمت کی تعلیم پیغمبروں کے بلند مقاصد کے پیش نظر صرف ایک مقدمے اور وسیلے کا کام دیتی ہے گویا انبیاء کی بعثت کا حقیقی مقصد اور حکمت کے نازل کرنے کا بنیادی مقصد اُن گذشتہ تین مقاصد کی تکمیل ہے جن میں سے ایک اخلاقی اصلاح ہے اس لیے ان آیات میں جن میں خدا نے اپنی طرف سے اس مسئلے کی وضاحت کی ہے تزکیہ کو تعلیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲

(جمعه۔۲)

وہ خدا ہے جس نے اُمیین کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ وہ ان پر آیات خُدا کی تلاوت

---

[1] (بقرہ-151)(آل عمران-164)(جمعہ-6) کی طرف جوع کیا جائے خلاصہ کلام یہ کہ جہاں پر پیغمبر کی ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں پر "تعلیم" کو "تزکیہ" سے پہلے ذکر کیا ہے۔ جیسے (بقرہ-129) اور جہاں پر اُن کی بعثت کے مقصد کی بات ہے وہاں پر "تزکیہ" کو پہلے لایا گیا ہے جیسے (بقرہ-151)(آل عمران-164)(جمعہ-6)۔

کرے اور انہیں (اخلاقی برائیوں) سے پاک و پاکیزہ کر دے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے

اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

بہرحال دونوں جگہ پر اس تقدیم اور ''تاخیر'' میں کوئی نکتہ موجود ہے۔

چھٹا مقصد

بندوں پر اتمام حجت

بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد لوگوں پر اتمام حجت کرنا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ (نساء۔165)

خُدا نے ایسے انبیا بھیجے جو خوش خبری سُناتے ہیں اور ڈراتے ہیں تا کہ ان کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس

خُدا کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رہے خُدا قدرت والا اور دانا ہے

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ (مائدہ۔19)

اے اہل کتاب: ایک عرصے تک بعثت کے منقطع ہونے کے بعد ہمارا نبی تمہاری طرف آیا ہے ہمارے احکام تمہارے سامنے بیان کرتا ہے تا کہ یہ نہ کہہ سکو کہ ہماری طرف کوئی خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔یہ رسول جو تمہاری طرف آیا ہے یہ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اس محرک کی وضاحت یُوں کی جا سکتی ہے کہ خُدا نے انسان سے ایک فطری عہد و پیمان لیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خُدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے۔ایک آیت میں اس کو بالکل واضح انداز میں یُوں بیان کیا ہے

اے اولاد آدم: کیا خُدا نے تم سے یہ عہد نہیں لیا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرو گئے وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔اور میری عبادت کرو کہ

یہی سیدھا راستہ ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ (یٰس۔61,60)

اے اولادآدم! کیا خدا نے تم سے یہ عہد نہیں لیا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرو گے، وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔اور میری عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔[1]

اسی طرح خُدا نے فطرت کے ذریعے انسان کو اچھے اور بُرے کام سکھائے۔ ہر انسان اپنے اندر نیک کاموں کی طرف رجحان اور بُرے کاموں سے دوری کے جذبات پاتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے اسے خیروشر کی ہدایت کی ہے۔

وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾ (بلد۔10)

ہم نے اسے خیروشر دونوں کی ہدایت کی ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَىٰهَا ﴿٨﴾ (شمس۔8)

ہم نے (انسان کو) برائیوں اور اچھائیوں کی ہدایت کی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿٣﴾ (دھر۔3)

ہم نے اسے (ہدایت کا) راستہ دکھا دیا ہے۔اب یا تو وہ شکر ادا کرتا ہے یا کفر اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن یہ اندرونی رُجحانات عموماً اُن جبلی خواہشات کے تابع ہوجاتے ہیں جن کی صحیح راہنمائی نہیں ہوئی چنانچہ جبلی خواہشات کے اس غبار آلود راستے میں وہ شمع فروزاں اور چراغ ہدایت کا کام سرانجام نہیں دے سکتے۔

اس لحاظ سے اس طرح کی حجت جس کی روشنی کم ہوچکی ہے اُس کو حساب و کتاب اور ثواب وعقاب کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔لہذا ضروری ہے کہ اس سے مظبوط تر ایک حجت اور راہنمائی بھیجی جائے جو اس باطنی اور اندرونی حجت کی مددگار رہے۔اس سے ہی انسان کے ہر عذر اور حیلے کا راستہ مسدود ہوسکتا ہے۔یہ وہی انبیاء کی بعثت ہے جس سے بندوں پر اتمام حجت ہوجاتا ہے۔اس سے ہر عذر کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔گذشتہ آیات کے علاوہ کئی اور آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

---

[1] جن آیات میں توحید اور یکتا پرستی کو ایک فطری چیز قرار دیا گیا ہے اُن کی طرف رجوع کیا جائے مثلاً (اعراف۔172)،(روم۔30)

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

اور اگر ہم ان کو رسول بھیجنے سے پہلے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجا۔ ہم ذلیل وخوار ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے۔ (طٰہٰ۔134)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

ہم کسی پر پیغمبر بھیجنے سے پہلے عذاب نہیں کرتے۔ (بنی اسرائیل۔15)

یہی بات سورہ قصص کی آیات ۴۷ اور ۵۹ میں بیان کی گئی ہے۔

لہٰذا خدا کی منصفانہ اور حکیمانہ حیثیت کا تقاضا یہی ہے کہ فطرت اور عقل جو کہ باطنی چراغ ہدایت ہیں اُن کی راہنمائی کے لیے انبیاء کو بھیجے تا کہ ان دو عظیم راہنماؤں کی پیروی کر کے انسان صراط مستقیم پر چل سکے۔

امیر المومنین بعثت کے اس محرک کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

بَعَثَ اللّٰهُ رُسُلَهٗ بِمَا خَصَّهُمْ بِهٖ مِنْ وَّحْيِهٖ وَجَعَلَهُمْ حُجَّةً لَّهٗ عَلٰى خَلْقِهٖ لِئَلَّا تَجِبَ الْحُجَّةُ لَهُمْ بِتَرْكِ الْاَعْذَارِ اِلَيْهِمْ۔ [۱]

خُدا نے اپنے رُسولوں کو وحی کے ساتھ اُن کی طرف بھیجا اور انہیں اپنے بندوں پر رحمت اور دلیل قرار دیا۔

حضرت آدم کے زمین پر اترنے سے بعد کے متعلق فرماتے ہیں:

فَاَهْبَطَهٗ بَعْدَ التَّوْبَةِ لِيَعْمُرَ اَرْضَهٗ بِنَسْلِهٖ۔ وَلِيُقِيْمَ الْحُجَّةَ بِهٖ عَلٰى عِبَادِهٖ وَلَمْ يُخْلِهِمْ بَعْدَ اَنْ قَبَضَهٗ مِمَّا يُؤَكِّدُهٗ عَلَيْهِمْ حُجَّةَ رُبُوْبِيَّتِهٖ۔ [۲]

اُس کو توبہ کرنے کے بعد زمین پر بھیجا گیا تا کہ خُدا زمین کو آدم کی اولاد کے ساتھ آباد کرے اور اُس کے ذریعے سے اپنے بندوں پر حجت تمام کرے اور اُس کی روح قبض کرنے کے بعد انہیں حجت خُدا پر تاکید کرنے والے سے خالی نہ چھوڑا۔

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ۔144

[۲] نہج البلاغہ خطبہ۔91

آخر میں اس بات کی یاددہانی کراتے چلیں کہ بعض انبیاء کی بعثت کچھ اور نتائج کے حاصل کرنے کے لیے ہوئی ہے جن کو بعثت کے لیے کلی لحاظ سے محرکات کے طور پر ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی بعثت کا ایک مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلائی جائے۔ یہ بات اگر چہ رسالت کا محرک اور ہدف تھا لیکن اس کو ایک کلی محرک شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر پیغمبر جو کسی خاص معاشرے میں آتا ہے وہ اُس معاشرے میں قطعی طور پر کچھ تبدیلیاں بھی لاتا ہے۔ عدل و قسط کی حکمرانی یا اخلاق کی تہذیب و تکمیل یقینی طور پر فرعون جیسے ظالموں کا مقابلہ کیے بغیر قائم نہیں ہو سکتی لہٰذا معاشرے کو ظالموں کی دسترس سے بچانا بھی گذشتہ اہداف کا ایک حصہ ہے

یا مثلاً پیغمبر اسلام کے متعلق ہے کہ اُن کا ایک کام پاک و پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دینا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دینا تھا۔ نیز ان وزنی احکام کو اُٹھا لینا تھا جو اہل کتاب کے کندھوں پر تھے۔ نیز کو مشکل اور دشوار کام اُنکی شریعت میں تھے ان کو ختم کرنا تھا۔ یا وہ بدعتیں جن کا اضافہ علمائے یہود نے اپنی طرف سے کر رکھا تھا ان کو بھی شریعت محمد ﷺ کے ساتھ ختم کرنا تھا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ

پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور اُس بھاری بوجھ اور طوق و زنجیر سے انہیں نجات عطا کرتا ہے۔ (اعراف۔157)

البتہ اس بھاری بوجھ یا طوق و زنجیر سے مراد وہ مشکل احکام اور ذمہ داریاں تھیں جو طوق کی طرح اُن کی گردن میں پڑی ہوئی تھیں۔ پیغمبر کی راحت اور آسانی پیدا کرنے والی شریعت نے ان تمام کو ختم کر دیا۔

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے جو انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا:

وَلِاُحِلَّ لَكُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ حُرِّمَ عَلَيۡكُمۡ

تم پر حرام شدہ بعض چیزوں کو حلال کروں۔ (آل عمران۔50)

لہٰذا اس طرح کی آیات کو انبیاء کی بعثت کے کلی محرکات کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح وہ آیات جو انبیا کے دین کے تن سے متعلق گفتگو کرتی ہیں جیسے وہ آیات جو خُدا کی اطاعت، طاغوت کی مخالف اور شیطان سے دوری [1] کا حکم دیتی ہیں، یہ سب کی سب دین انبیاء کی خصوصیات بیان کرتی ہیں۔ ان کو بھی بعثت کے محرکات اور مقاصد کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح وہ آیات جو انبیاء کی اطاعت کرنے سے حاصل ہونے والے نتیجے کے متعلق گفتگو کرتی ہیں کہ اُن کی اطاعت کا نتیجہ ایک جاودانہ زندگی کے حصول کی صورت میں نکلتا

[1] نحل۔ 36 نساء۔ 60 نور۔21، فاطر۔6، زخرف۔62

ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ

اے ایمان والو: خُدا اور رسول کی اس دعوت کو قبول کرو جو تمہیں وہ اس چیز کی طرف دیتے ہیں جو تمہاری زندگی کا باعث ہے۔ (انفال۔24)

یہ بات بنا کہے ہی واضح ہے کہ انبیاء کی پکار پر لبیک کہنے سے دل اور جان ایمان کے نور سے زندہ اور منور ہو جاتے ہیں جیسا کہ کفر اور ہوائے نفس اور شیطان کی پیروی سے دل تاریک ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی آیات شریعت کی خصوصیات کو بیان کرتی ہیں نہ کہ بعثت کے محرکات کو اسی وجہ سے ہم نے ان کو بعثت کے اہداف سے متعلق آیات کے زمرے میں شمار نہیں کیا۔

۵۔ بعثت انبیاء کا لزوم

شرعی ہے یا عقلی

بعثت کے ضروری ہونے سے متعلق متکلمین اور فلاسفی کی دلیلوں کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے جن سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان میں سے ہر کوئی کسی ایک طریقے سے انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے پر استدلال قائم کرتا ہے۔ آیات قرآن سے متعلق گفتگو کرنے سے بھی یہ نتیجہ حاصل ہُوا۔ قرآن نے تین طریقوں اور راستوں سے انبیاء کی بعثت کے ضروی ہونے پر استدلال قائم کی اہے وہ یہ کہ انسان کی عقایدی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح فقط انبیاء کی بعثت سے ہی ممکن ہے جو انسان کی تین مقاصد کے حصول کے لیے راہنمائی کرتے ہیں اگر وہ نہ آئیں تو بت پرستی اور بے دینی خُدا پرستی کی جگہ لے لیں اور معاشرہ ایک غلط قانون کی پیروی کرتے ہوئے فطرت سے دور ہوتا جائے گا اور گمراہی کے کنارے پہنچ جائے گا اور آخر کار انسانی اخلاق ایک مادی اخلاق میں تبدیل ہوجائے گا۔ ان تینوں اہداف کی مکمل تفصیل گذشتہ باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔

اب ایک اور موضوع شروع کرتے ہیں جس سے متعلق علم کلام کی کتب میں بہت پہلے سے بحث ہو رہی ہے، وہ یہ کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خُدا کی جانب سے انبیاء کا مبعوث ہونا ضروری ہے اس ضرورت اور لزوم کا حکم کون لگا رہا ہے؟ آیا یہ عقل وخرد کا فیصلہ ہے یا یہ کہ عقل تو اس مقام پر بالکل خاموش ہے، یہ تو شریعت اور دین ہے جس نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے؟

ہم اس سلسلے میں دونوں کے فیصلوں کی بات نہیں کرتے کیونکہ انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے پر جو دلیلیں پہلے ذکر کی گئی ہیں چاہے وہ کلامی ہوں یا فلسفی یا قرآنی سب کی سب اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ اس ضرورت اور لزوم کا حکم عقل نے لگایا ہے اُس نے اُن صفات کے پیش نظر جو کہ خُدا میں ہیں اور یہ کہ وہ خالق واحد حکیم اور دانا ہے اور اُس کا کوئی کام بھی فضول اور عبث نہیں ہے، ان تمام صفات کو مدنظر رکھتے ہوئے عقل نے انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے کو کشف کیا ہے خُدا کے مقام ربوبیت سے بھی یہی مناسبت رکھتا ہے۔ عقل یہ کہتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر کہ خُدا دانا اور حکیم ہے اور کوئی فضول اور عبث کام انجام نہیں دیتا۔ اس خلقت کو لغو ہونے سے بچانے اور اتنی استعدادوں اور صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جانب سے انبیاء کو بھیجے جو بشر کو اس کائنات کی تخلیق کے مقاصد سے آگاہ کریں۔ نیز معارف اور معاشرتی زندگی میں اختلاف کو خاتمہ بخشیں اور جبلی خواہشات کی تکمیل میں جو بے اعتدالی پائی جاتی ہے اُسے ختم کریں۔

اس سلسلے میں اشعری متکلمین نے جان بوجھ کر یا کبھی بغیر سوچے سمجھے یہ تصور کرلیا ہے کہ خدا کے سلسلے میں اس طرح کا حکم لگانا کہ اسے یہ کام کرنا چاہیے۔ اور یہ کام نہیں کرنا چاہیے ایک طرح سے خدا کو حکم کرنا اور اس کے لیے تکلیف کرنا ہے۔ گویا ایک ناچیز انسان خدا کی ذمہ داری کو متعین کررہا ہے۔ لیکن ہم نے معارف کی ابحاث میں کئی مرتبہ اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ یعنی اُس کے دانا ہونے اور لوگوں کی

استعداداور صلاحیتوں کو انبیاء کے بھیجنے کے ساتھ ضائع ہونے سے بچانے کے درمیان ایک تلازم اور ناگزیر تعلق ہے۔ عقل موضوع اور اِس متعلق کے تصور کے ساتھ ہی اس ملازمے اور ضرورت کو کشف کر لیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے وہ کسی عدد کے جفت ہونے اور اُس کے مساوی طور پر دوحصوں میں تقسیم ہونے کے درمیان رابطے اور ضرورت کو کشف کر لیتی ہے۔ لہٰذا معارف اور دین کے سلسلے میں تمام عقلی قواعد کو اس ملازنے کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مثلث کے تین زاویوں کا دوقائمہ زاویوں کے برابر اور مساوی ہونا ضروری ہے۔ یہ ضرورت اور تلازم حکم کو کشف کرنا ہے نہ کہ کسی حاکمانہ انداز میں حکم لگانا۔

سعدالدین تفتازانی نے شرح المقاصد میں بعثت کے ضروری ہونے پر اُن عقلی دلائل کو ذکر کیا ہے جو فلسفہ اور معتزہ پیش کرتے ہیں اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ان کی دلیلوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں انسان کو سعادت فقط انبیاء کے آنے کے ساتھ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔ معتزلہ کے نکتہ نظر سے ایسی بعثت کا تقاضا ''قاعدہ لطف'' کرتا ہے۔ اسی طرح فلاسفہ کے نکتہ نظر میں بھی بعثت ضروری ہے کیونکہ یہ ایک ایسی بڑی بھلائی ہے جسے چھوڑ دینا خُدا کی حکمت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ ''ماوراء النہر'' کے بعض متکلمین نے بھی اسی دلیل کو پسند کیا ہے۔ [1]

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ان دلیلوں کو قبول کرنا صرف معتزلی نکتہ نظر کو ہی زندہ کرنا ہے کیونکہ معتزلہ کی مُراد اس بات سے کہ خُدا پر انبیاء کا مبعوث کرنا لازم اور ضروری ہے یہ ہے کہ ایسا نہ کرنا اُس کی حکمت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس کے بعد وہ اشعری مکتبِ فکر سے اپنی وفاداری کے ثبوت کے لیے یوں رقم طراز ہیں کہ:

انبیاء کا بھیجنا ایک اچھا کام ہے لیکن ایسا نہ کرنا قبیح اور بُرا نہیں۔ [2]

یہ بات بنا کہے ہی واضح ہے کہ پہلے سے قائم شدہ ایک نظریے نے سعدالدین تفتازانی کو اس آخری فیصلے پر اُبھارا ہے وگرنہ اگر وہ شعری مکتب کی تقلید کے طوق کو اپنی گردن سے نکال پھینکتا تو یہاں پر عدلیہ کا ہم خیال ہو چکا ہوتا اور بعثت کے ضروری ہونے کو ایک عقلی وجوب اور ضرورت سمجھتا۔ لیکن اخطرے کے پیش نظر کہ کہیں معتزلی نکتہ نظر دوبارہ زندہ نہ ہوجائے اُس نے حق بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس نے حقیقت کو عقیدے پر قربان کر دیا ہے۔

کون اس بات کا انکار کرسکتا ہے۔ کہ خُدا نے انسان کو ایک مقصد اور ہدف کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس مقصد کا فائدہ بھی انسان کی ذات کو پہنچتا ہے۔ یہ ہدف ہی ہے جو خُدا کے اس کام کو عبث اور لغو ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انسان انبیا کی ہدایت اور راہنمائی کے بغیر اُس مقصد تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا یہاں پر عقل اس اصول کے پیش نظر یہ کہتی ہے کہ خُدا یقینی طور پر انبیاء کو بھیجتا ہے۔ اس واضح اور یقینی حکم کے لیے وہ ضرورت اور وجوب کی تعبیر لے آتی ہے۔ قرآن مجید بھی بعض اوقات لوگوں کی راہنمائی عقلی حکم کی طرف کرتا ہے

[1] اس سے مراد وہ متکلمین ہیں جو ابومنصور ماتریدی (متوفی ۳۳۰) کے پیروکار ہیں۔ ابومنصور کا نظریہ اشعریوں کی بجائے معتزلہ کے زیادہ قریب ہے۔ بعض اہل سنت علما اس کلامی مکتب کے پیروکار ہیں۔

[2] شرح مقاصد، ج۲، ۱۷۳، ۱۷۴

۔ارشاد ہوتا ہے:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ﴿۱۱۵﴾

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول اور عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کے نہیں آؤ گے؟ (مومنون۔115)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى﴿۳۶﴾

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اسے مہمل چھوڑ دیں گے؟ (قیامت۔36)

ان دو آیات میں سے بھی واضح تر یہ آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ﴿۲۷﴾

ہم نے زمین اور آسمانوں کو بغیر مقصد کے پیدا نہیں کیا یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے خُدا کو پہچانا نہیں اور اُس کا انکار کیا ہے کافروں پر دوزخ کی آگ کی پھٹکار ہو۔ (ص۔27)

اس طرح کی آیات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ قرآن عقلی فیصلوں کو اہمیت دیتا ہے اُس کے احکام اور فیصلوں کا احترام کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ خُدا پر جوب یا ضروری ہونے کی تعبیر خُدا کے مقام اور منزلت کے پیش نظر کوئی اچھی تعبیر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں بھی اس طرح کی تعبیرات ذکر کی گئی ہیں۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ خُدا کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے قرآن میں جوادب ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ بہترین ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عَلَيۡنَا لَلۡهُدٰى

ہدایت کرنا (انسان اور دیگر موجودات کی اُن کی تخلیق کے مقاصد کی طرف) ہم پر لازم اور ضروری ہے

6۔نبوت سے متعلق قرآنی الفاظ

(پہلا حصہ)

(1) نبوت

(2) رسالت

(3) بعثت

زیرِ نظر آیات کی فہرست

نبوت کے لفظ سے مربوط آیات

(1) قُلۡ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيۡمٌ ۙ﴿۶۷﴾ (ص۔67)

(2) وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ‌ۘ (یونس۔71)

(3) اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ (توبہ۔70)

(4) نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَـقِّ‌ؕ (کہف۔13)

(5) وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَـقِّ‌ۘ (مائدہ۔26,25)

(6) وَهَلۡ اَتٰٮكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ‌ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَۙ﴿۲۱﴾ (ص۔21)

(7) قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنِكَ‌ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاۡوِيۡلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعْ عَّلَيۡهِ
صَبۡرًا‏﴿۷۸﴾ (کہف)

(8) قَالَ لَا يَاۡتِيۡكُمَا طَعَامٌ تُرۡزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاۡتُكُمَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ-----

۔(یوسف۔37)

(9)قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ (بقرہ۔ 33)

(10)اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۱۰۵ (مائدہ۔ 105)

(11)وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ (آل عمران۔ 49)

ب لفظ ''رسالت'' سے متعلق آیات

(1)فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ (عنکبوت۔ 40)

(2)يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ (مائدہ۔ 67)

(3)الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ (احزاب۔ 39)

(4)قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ڰ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۝۱۹ (مریم۔ 19)

(5)وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَاۗءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ۝۱۳ۚ (یٰس۔ 13)

(6)فَلَمَّا جَاۗءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔــلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ

قَطَّعْنَ (یوسف۔ 50)

(7)وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ۝۳۵ (نمل۔ 35)

(8)اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ۝۲۱ (یونس۔ 21)

ج۔ لفظ بعثت سے متعلق آیات

(1)فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ (بقرہ۔ 213)

(2)رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ (بقرہ۔ 129)

(3)وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ۝۷

(حج۔ 7)

(4) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ (بقرہ۔56)

(5) فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ (بقرہ۔259)

(6) وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ (انعام۔60)

(7) فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ (نساء۔35)

(8) وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ (توبہ۔46)

(9) فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ (بنی اسرائیل۔5)

(10) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (انعام۔65)

قرآن نے نبوت اور انبیاء سے متعلق چند کلمات استعمال کیے ہیں جیسے نبوت رسالت بعثت، وحی وغیرہ۔ اب ہم قرآن کے حوالے سے ان کلمات کے معانی اور توضیح بیان کرتے ہیں۔

1۔ نبوت

''نبی'' کی لفظ ادبی نکتہ نظر سے ''صفت مشبہہ'' ہے یہ کس سے مشتق ہوا ہے اس سلسلے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ لفظ ''نبی'' ناقص وادی'' ہے جو کہ ''نبوت'' اور ''نباوت'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی بلندی اور اونچائی ہے۔ پیغمبروں کو ''نبی'' اور ''انبیاء'' کہنا اُن کے مقام کی عظمت اور بلندی کے پیش نظر ہے۔

بعض دوسرے اسے ''نبأ'' سے ماخوذ سمجھتے ہیں جو کہ ''مہموز'' ہے۔ ''نبأ'' کا معنی خبر دار اور اطلاع ہے۔ اس صورت میں نبی کا معنی ان دو معنوں سے کوئی ایک ہوگا۔ اگر تو متعدی ہو تو پھر یہ ''خبر دینے والے'' کے معنی میں ہوگا اور ''لازم'' ہو تو ''جسے خبر دی جائے'' کے معنی میں ہوگا۔ بہر حال انبیاء خبریں وصول بھی کرتے ہیں اور آگے بھی پہنچاتے ہیں۔

اکثر علماء نے دوسرے نکتہ نظر کی تائید کی ہے۔ اس کی دلیل یہ ذکر کی گئی ہے کہ یہ کلمہ ہر جگہ پر ''ہمزہ'' کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسے ''نبأ'' ''تنبأ اور متنبی وغیرہ اسی طرح یہ الفاظ ''ذریہ'' بریہ'' خابیہ جو کہ تہامی اور مکی لہجے میں ہمزہ کے بغیر بولے جاتے ہیں جب کہ دوسرے لہجوں میں

ان کے ساتھ ہمزہ کا تلفظ بھی کیا جاتا ہے۔[1]

یہاں پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ''نبا'' ہمیشہ یا عموماً اُس جگہ پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر خبر کسی خاص اہمیت کے حامل مضمون پر مشتمل ہو یا یہ کہ خاص چیز سے متعلق خبر دینے کے لیے ایک خاص وقت کا بھی خیال رکھا اور جمع حالت میں اسی طرح اضافت اور اضافت کے بغیر تقریباً پچیس مرتبہ استعمال ہُوا ہے۔ یہ تمام اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ یہ خبر کسی خاص مضمون پر مشتمل ہے۔ ہم اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ قیامت اور اٹھائے جانے کا دن۔[2]

۲۔ انبیاء کی سرگزشت۔[3]

۳۔ گذشتہ امتوں کا خوفناک انجام۔[4]

۴۔ اصحاب کہف کا قصہ۔[5]

۵۔ حضرت آدم کے بیٹوں کا تذکرہ۔[6]

۶۔ حضرت داؤد سے دو متخاصم افراد کا سوال[7]

۷۔ حضرت موسیٰ کے ساتھی کا اپنے عجیب کاموں کے متعلق بتانا۔[8]

۸۔ حضرت یوسف کا اپنے دو قیدی ساتھیوں کے خواب کی حقیقت بتانا۔[9]

۹۔ حضرت آدم کا خُدا کے اسماء سے متعلق خبر دینا۔[10] [1]

---

[1] نہایہ، ابن اثیر، مادہ نباء مزید وضاحت کے لیے مفاہیم القرآن جلد ۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] (ص۔ ۶۷)، (نبأ۔ ۲)

[3] (یونس۔ ۷۱) (شعراء۔ ۶۹) (قصص۔ ۳۲) (ھود۔ ۱۲۰)

[4] (توبہ۔ ۷۰) (تغابن۔ ۵) (ہود۔ ۱۰۰) (طٰہ۔ ۹۹) (قمر۔ ۴)

[5] نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَزِدۡنٰهُمۡ هُدًى ۖ﴿۱۳﴾ (کھف۔ ۱۳)

[6] وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا (مائدہ۔ ۲۷)

[7] وَهَلۡ اَتٰٮكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ۙ﴿۲۱﴾ (ص۔ ۲۱)

[8] قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاۡوِيۡلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ﴿۷۸﴾ (کھف۔ ۷۸)

[9] قَالَ لَا يَاۡتِيۡكُمَا طَعَامٌ تُرۡزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاۡتُكُمَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ (یوسف۔ ۳۷)

[10] [1] قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ (بقرہ۔ ۳۳)

۱۰۔ قیامت کے دن خُدا کا بندوں کے کاموں کے متعلق خبر دینا۔[۱]

۱۱۔ پوشیدہ کاموں کے متعلق خبر دینا۔[۲]

ان مواد پر جیسے کہ آپ نے خود ملاحظہ فرمایا خبر کا موضوع اور ایک بہت عظیم اور اہم بات ہے۔ قیامت سے بڑھ کے اور کون سی بڑی خبر ہوسکتی ہے۔ یا عاد، ثمود، بنی اسرائیل جیسی امتوں پر مبعوث نبیوں سے بڑھ کے کسی خبر کا مضمون کیا ہوسکتا ہے؟ اس سے عجیب خبر اور کیا ہوسکتی ہے کہ چند افراد تین سو سال سے بھی زیادہ ایک غار میں سوئے رہے اس کے بعد اٹھ کہ انہوں نے زندگی دوبارہ شروع کی۔ اسی طرح اُن امتوں کے متعلق خبر دینے سے بڑھ کے اور کیا خبر ہوسکتی ہے جو نافرمانی اور عناد کی وجہ سے خُدا کے عذاب میں مبتلا ہُوئیں؟

قیامت کی خبر کو خود قرآن نے بہت بڑی خبر قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ﴿٦٧﴾ أَنتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿٦٨﴾

وہ بہت بڑی خبر ہے۔ تم اُس سے روگردانی کرتے ہو۔ (ص۔ ۶۷۔ ۶۸)

ارشاد ہوتا ہے:

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ﴿١﴾ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ ﴿٢﴾

وہ کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں؟ کیا بہت بڑی خبر کے متعلق پُوچھتے ہیں؟ (نبا۔ ۱۔ ۲)

ممکن ہے کبھی خبر کا متن بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو لیکن خبر بیان کرنے کا انداز اُس کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے جیسے کوئی شخص ایک گھر دیکھے بغیر اُس کے اندر کی ساری جزئیات اور تفصیلات کے متعلق خبر دے۔

حضرت مسیح کے متعلق یہی ہے:

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ

جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو وہ تمہیں بتاتا ہوں۔ (آل عمران۔ ۴۹)

یہاں پر خبر دینے کے انداز کی اہمیت کے پیش نظر ایسا فعل استعمال کیا گیا ہے جو ''نبا'' کے مادہ سے مشتق ہے۔ اسی طرح نبی کا اپنی دو بیویوں کے ارادے کی خبر دینا ہے۔ اُن دونوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار کسی کے سامنے بھی نہیں کیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قَالَتْ مَنْ أَنبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٣﴾

پیغمبر کی بیوی نے اُس سے کہا کہ کس نے آپ کو اس راز سے آگاہ کیا ہے؟ فرمایا میرے آگاہ خُدا نے

---

[۱] (مائدہ۔ ۱۰۵) (انعام۔ ۶۰) اور بہت سی دوسری آیات

[۲] (آل عمران۔ ۴۹) (تحریم۔ ۳)

مجھے یہ خبر دی ہے۔(تحریم:۳)

فقط کلمہ ''نبا'' ہی اس خصوصیات کا حامل نہیں بلکہ اس سے مشتق ہونے والے باقی کلمات بھی یہی خصوصیات رکھتے ہیں۔ عربی لغت اگر کسی جگہ پر اِس سے ہٹ کے کوئی چیز نظر آئے تو اُس کی تاویل کی جاسکتی ہے۔

یہاں تک ہم لفظ ''نبی'' کی بنیاد اور حقیقت سے واقف ہوئے۔ اس بات کی بھی یاددہانی کراتے چلیں کہ ''نبا'' کا معنی قابل اہمیت خبر اور نبی کا معنی وہ ہے جس کے پاس کوئی بڑی خبر ہو یا ہو کوئی بڑی خبر دیتا ہو۔ اس بات کے پیش نظر ہر اُس شخص کو جس کے پاس کوئی اہم خبر ہو یا کوئی اہم خبر وہ دے اُسے ''نبی'' کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ لفظ ''نبی'' اور اس کی جمع (انبیائ) صرف اُن اشخاص کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ جو خُدا کی جانب سے مبعوث ہوں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے وہ خُدا کے پیغام اور تعلیمات کے حامل ہوں۔ قرآن نے لفظ ''نبی'' کو واحد اور جمع، اضافت اور بغیر اضافت کے، معرفہ اور نکرہ صورتوں میں ۷۹ بار استعمال کیا ہے۔ تمام جگہ پر اس سے مُراد وہ عظیم انسان ہیں جو خُدا کی طرف سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ اس طرح کا اختصاص یا تو قرآن کے نزول سے پہلے ہی عرب کی لغت میں پایا جاتا تھا یا پھر قرآن نے یہ مخصوص معنی لغت کو عطا کیا ہے جب لفظ ''رسول'' ایک وسعت رکھتا ہے جسے آگے بیان کیا جائے گا۔

لہذا نبوت اور نبی کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔

نبوت کا معنی لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے خدا سے خبر وصول کرنا ہے اور نبی وہ بلند مرتبہ انسان ہے جو خُدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔[1]

---

[1] ''النبی ھوالانسان المبعوث من الحق الی الخلق'' شرح تجرید قوشجی ۲۶۱ اس کے آگے اور ایک کا اضافہ کرنا بہت بہتر ہے وہ یہ کہ لھدا یتھم الی مافیہ خیرھم وصلاحھم فی الدارین فاضل مقدار نے نبی کی تعریف یوں کی ہے: النبی هو الانسان االمامور من السماء باصلاح الناس فی معاشهم و معادهم العالم بکیفیةذالك المستغنی فی علمه عن و ساطة البشر ۔پیغمبر وہ انسان ہے جو خُدا کی جانب سے لوگوں کی روش زندگی اور معاد کی اِصلاح کے لیے آتا ہے اور وہ اپنی رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے طریقہ کار سے مکمل طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ دوسرے لوگوں کا محتاج نہیں ہے اس کے بعد وہ کہتے ہیں: اس تعریف میں چند قیود کو ذکر کیا گیا ہے، اُن کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ اس تعریف میں فرشتے شامل نہیں ہوتے کیونکہ فرشتے بھی اگرچہ خُدا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں لیکن وہ انسان نہیں ہوتے۔ دوسرا یہ کہ اس نبی کے احکام اور معجزا خُدا کی جانب سے ہوتے ہیں اس سے بعض فلاسفہ کی بات کی نفی ہوتی ہے کہ جو اس کی تعلیمات اور معجزات کو اُس کی ذاتی کمال اور عالم مجردات سے اُس کے ارتباط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں کہ خُدا کے حکم کا تیسرا یہ کہ اس تعریف میں امام بھی شامل نہیں ہوگا کیونکہ امام بھی نبی کی طرح خُدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت پر ماموراور منصوب ہوتا ہے لیکن کسی انسان کے وسیلے اور واسطے یعنی پیغمبر کے ذریعے اُسے منصوب کیا جاتا ہے۔ (اللوامع الالھیہ۔۱۶۵)

قاضی عبدالجبار نے مغنی جلد ۱۵۔ ۱۴ پر لفظ ''نبی'' کو اس انسان کے لیے مخصوص قرار دیا ہے جو خُدا کی طرف سے خبر دیتا ہو، لیکن ہمارے نظریے کے برعکس اُس نے نبی کو ''نبوت اور ''نباوت'' سے ماخوذ سمجھا ہے۔ یہ بات اس کلمے کے تمام مشتقات، چاہے وہ اسم کی صورت میں ہوں یا فعل کی صورت میں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

2۔رسالت

لفظ''رسول'' عربی لغت میں ''نرمی'' اور ''رافت'' کے معنی کی حکایت کرتا ہے۔راغب مفرات میں کہتے ہیں:

''اصل الرسل (بروزن کبر) هوال نجاث علی التوة یقال ناقته مرسلته سهلة المسیرومنه الرسول النبعث''

رسد کا معنی احتیاط اور آرام کے ساتھ کسی کو بھیجنا ہے۔عرب کہتے ہیں''ناقة مرسلة''یعنی آرام سے چلنے والی اونٹنی اور اسے چلانے والا شخص ایسا ہے جو نرمی اور احتیاط سے کام لیتا ہے۔

شاید''رسول'' کے معنی میں اس چیز کا انکار نہ کیا جا سکے لیکن بعض اوقات اس کے بہت سے مشتقات میں اس خصوصیات کا لحاظ نہیں رکھا جا تا۔خُدا نے عذاب کے نازل کرنے کو بھی ایک جگہ پر''ارسل'' کے لفظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ

بعض کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہم نے طوفان بھیجا اور بعض دوسروں کی تباہی کے لیے آسمانی چنگھاڑ۔

(عنکبوت۔۴۰)

لیکن اس کلمے کے مادے سے قرآن میں مجموعی طور پر جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے رسالت کسی کی طرف سے ایک طرح کی ذمہ داری قبول کرنا ہے چاہے اس کی نوعیت یہ ہو کہ اُس کا پیغام دوسروں تک پہنچایا جائے گا یا یہ کہ کسی کام کی انجام دہی ہو قرآن کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

لفظ''رسول''قرآن میں، چاہے وہ معرفہ کی صورت میں آیا ہو یا نکرہ کی اضافت کے ساتھ ہو یا بغیر اضافت کے واحد ہو تثنیہ ہو جمع ،مرفوع ہو یا منصوب، مجموعی طور پر (۳۲۸) بار استعمال ہوا ہے۔

1۔تمام جگہوں پر آیات میں غور وفکر سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں رسول ایک ایسی ذات ہے جسے کوئی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

2۔کبھی یہ ذمہ داری پیغام پہچانے کی ہوتی ہے جیسے

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ

اے رسول: جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اُسے آگے پہنچاؤ۔اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو تُو نے رسالت کی اپنی ذمہ داری پوری نہ کی۔(مائدہ۔٦٧)

یا جیسے:

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

جو خُدا کی جانب سے پیغام لیتے ہیں اور آگے پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ (احزاب۔۳۹)

اکثر جگہ یہ کلمہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور کبھی یہ ذمہ داری کسی عمل کی انجام دہی ہے۔ جیسے

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۞

فرشتے نے مریم سے کہا: میں تیرے پروردگار کی طرف سے بھیجا گیا ہُوں تا کہ تجھے ایک پاک و پاکیزہ بچہ عطا کروں۔ (مریم۔۱۹)

رہی یہ بات کہ یہ فرشتہ حضرت مریم کے حاملہ ہونے میں کس طرح موثر تھا۔ یہ الگ موضوع ہے جو ہماری گفتگو سے متعلق نہیں ہے۔

3۔ اس ذمہ داری کا حامل شخص کبھی تو خُدا کی جانب سے مامور ہوتا ہے۔ قرآن میں لفظ ''رسول'' کا استعمال زیادہ تر اسی معنی میں ہے۔ گذشتہ آیات اسی معنی کی مثالیں تھیں۔ اور کبھی وہ شخص پیغمبر کی جانب سے مامور ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی جانب سے ماموروں پر لفظ ''مرسلون'' بولا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۞

ان کے لیے بستی کے لوگوں کی سرگزشت بیان کرو جن کی طرف رسول آئے۔ (یٰس۔۱۳)

تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے شاگرد تھے جنہیں حضرت عیسیٰ نے انطاکیہ یا کسی اور طرف بھیجا تھا۔

کبھی وہ کسی عام شخص کی طرف سے اس بات پر مامور ہوتا ہے کہ کوئی پیغام آگے پہنچائے یا کوئی کام انجام دے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۞

جب بادشاہ کی طرف سے بھیجا ہوا شخص زندہ ان میں حضرت یوسف سے ملاقات کرنے کے لیے آیا تا کہ اُسے رہا کر کے بادشاہ کے پاس لے جائے تو یوسف نے کہا: اپنے بادشاہ کے پاس جاؤ اور اُس سے پوچھو کہ کیا ہوا تھا کہ اُن عورتوں نے (پھل کاٹتے وقت) چھریوں کے ساتھ اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ میرا رب اُن کے حیلے سے آگاہ ہے۔ (یوسف۔۵۰)

یہاں پر رسول سے مُراد ایک قبطی شخص ہے جو بادشاہ مصر کی طرف سے حضرت یوسف کو آزاد کرنے پر مامور تھا۔

''ملکہ سبا'' کے قصے میں بھی جن لوگوں کو حضرت سلیمان کی طرف بھیجا گیا تھا انہیں ''مرسل'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنِّیۡ مُرۡسِلَۃٌ اِلَیۡہِمۡ بِہَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

میں ان کی جانب ہدیہ بھیجتی ہُوں پھر اس بات کا انتظار کروں گی وہ پیغام رساں کیا جواب لے کر آتے ہیں

۔اس آیت میں ملکہ سبا نے خود کو ''مرسلۃ'' اور اپنی جانب سے بھیجے گئے افراد کو ''مرسلون'' کے لفظ سے یاد کیا ہے۔(نمل۔۳۵)

لفظ ''رسول'' میں ایک اور اعتبار سے بھی وسعت ہے جو کہ لفظ نبی میں نہیں ہے وہ یہ کہ لفظ ''نبی'' صرف انسان کے لیے استعمال ہوسکتا ہے جب کہ لفظ ''رسول'' انسان اور فرشتے دونوں پر بولا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ رُسُلَنَا یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

تمہاری سب فریب کاریوں کو ہمارے رسول لکھتے ہیں۔ [۱]

اس بیان سے یہ واضح ہوگیا کہ لفظ ''رسول'' میں ایک ایسی عمومیت اور وسعت پائی جاتی ہے جو کہ لفظ ''نبی'' میں موجود نہیں۔ مثلاً:

1۔ نبی کو صرف خُدا ہی اپنی طرف سے بھیجتا ہے لیکن اس کے برعکس رسول میں اسطرح کی خصوصیت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ رسول خُدا کے علاوہ بھی کسی کی طرف سے بھیجے جانے والے کو کہا جائے۔

2۔ نبی وہ بلند مرتبت انسان ہے جسے لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے بھیجا جائے جب کہ رسول کوئی فرشتہ یا عام شخص بھی ہوسکتا ہے۔

یہاں اس نکتے کی یاددہانی ضروری ہے کہ خُدا نے نعمت اور عذاب کے نازل ہونے کے لیے بعض اوقات ''ارسال'' کی تعبیر ذکر کی ہے۔ مثلاً اصحاب [۲] فیل کو تباہ برباد کرنے والے پرندوں اور بارش اور ہوا [۳] کے تیز جھکڑ کے لیے اور اسی طرح بنی اسرائیل [۴] کو نابود کرنے والے طوفان اور جانوروں اور حشرات کے متعلق ''ارسل'' کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بھی خُدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور ان کے کندھوں پر ایک ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق ''ارسل'' اور اسی طرح کے دوسرے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔

---

[۱] سورہ (ھود۔۸۱)،(حج۔۸۵)،(انعام۔۶۱) کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] (فیل۔۳)

[۳] (احزاب۔۹)،(فرقان۔۴۸)،(حجر۔۲۲)،(نوح۔۱۱)۔(انعام۔۶)

[۴] (اعراف۔۱۳۳)

بعض اوقات تو شیاطین [1] کے لیے بھی ''ارسل'' وغیرہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بھی اسی لیے ہے کہ وہ خاص قسم کی ذمہ داریاں انجام دیتا ہے۔

خاتمے پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان جو فرق بیان کیا گیا ہے وہ اس کے لغوی معنی اور قرآنی استعمالات سے مربوط ہے لیکن یہاں پر ایک اور بحث بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی جگہ پر اس چیز پر شاہد آجائے کہ رسول سے مراد وہی خدا کے انبیاء ہیں تو اس صورت میں ایک اور بحث سامنے آئے گی کہ آیا جب رسول سے یہ دوسرا معنی مراد ہو تو اُس صورت میں نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق ہوگا یا نہیں اور کیا یہ دونوں آپس میں مترادف ہیں یا ان کے درمیان کچھ فرق ہے؟ یہ الگ بحث ہے جو ہماری موجودہ گفتگو کے دائرکار سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک اور جگہ پر گفتگو کی ہے۔ [2]

3۔ بعثت

قرآن نے ''بعثت'' کا لفظ مختلف صورتوں میں ۶۶ جگہوں پر استعمال کیا ہے۔ ہم ترتیب سے ان امور کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کا بھیجنا۔ اس کے لیے ۱۴ جگہوں پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (بقرہ۔۲۱۳)

(۲) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ (بقرہ۔۱۲۹) [3]

ایک نئی زندگی کے لیے مُردوں کو اٹھایا جانا اس معنی میں ۳۳ جگہوں [4] پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ (حج۔۷)

اور قیامت کی گھڑی آئے گی۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ جو لوگ قبروں میں ہیں خدا انہیں آٹھائے گا۔

بعض دفعہ قرآن نے اس دنیا میں بھی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

---

[1] (مریم۔۳۸)

[2] مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ ''خاتمیت از نظر قرآن و حدیث و عقل۔'' مفاہیم القرآن ج ۴، ۳۱۷ تا ۳۷۰

[3] (آلعمران۔۱۶۴)، (اعراف۔۱۰۳)، (یونس۔۷۴، ۷۵) (نحل۔۳۶)، (بنی اسرائیل ۱۵۔ ۹۴) ، (فرقان۔۱۴) ، (قصص۔۵۹)، (مومن۔۳۴)، (جمعہ۔۲) کی طرف رجوع کیا جائے۔

[4] (انعام۔۳۶، ۶۰)، (اعراف۔۱۴)۔ (ھود۔۷)، (حجر۔۳۶)، (نحل۔۱۲، ۸۴)، (بنی اسرائیل ۴۹۔۹۸)، (مریم۔۳۳، ۵۱)، (حج۔۵)، (مومنوں۔۱۶، ۳۷، ۸۲، ۱۰۰)، (شعرائ۔۸۷)، (نحل۔۶۵)، (روم۔۵۶)، (لقمان۔۲۸)، (یٰس، ۵۲)، (صافات۔۱۶، ۱۴۴)، (ص۔۷۹)، (واقعہ۔۴۷)، (مجادلہ، ۶، ۱۸)، (تغابن۔۷)، (جن۔۷)، (مطففین۔۴)۔

جیسا کہ جب نبی اسرائیل اپنے عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گئے تھے۔ پھر خُدا نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝٥٦

پھر تمہیں موت کے بعد اٹھایا تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ (بقرہ۔۵۶)

حضرت عزیر کو سوسال کے بعد دوبارہ زندہ کرنے سے متعلق فرمایا:

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ

اُسے سوسال تک مارے رکھا پھر زندہ کیا۔ (بقرہ۔۲۵۹)

اس سلسلے سے متعلق آیات حاشیے میں دیکھی جاسکتی ہیں۔[1]

3۔ نیند سے بیدار ہونا

ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ بِالَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبۡعَثُكُمۡ فِيۡهِ (انعام۔۶۰)

وہ ہے جو تمہاری روح کو رات میں قبض کر لیتا ہے، جو کچھ تم دن میں کرتے ہو وہ اُسے جانتا ہے پھر تمہیں دن کے وقت اُٹھا دیتا ہے۔

4۔ کسی بڑے کام کی ذمہ داری یا انجام دہی

میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ختم کرنے سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے جو یہ تقاضا کیا تھا کہ اُن کے لیے کسی لائق اور باصلاحیت کمانڈر کو مقرر کریں تا کہ وہ اُس کے زیر قیادت خُدا کی راہ میں جہاد کریں۔ (نساء۔۳۵)

تو ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] (سورہ کہف۔۱۲، ۱۹) جو کہ اصحاب کہف کے ایک لمبی نیند سے بیدار ہونے سے متعلق ہیں۔

اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (بقرہ۔۲۴۶)

اس سلسلے میں حاشیے میں مذکورہ آیات کا مطالعہ کریں۔[1]

5۔ جہاد کے لیے نکلنا

قرآن میں منافقوں کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے کہ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ بھی مومنوں کی طرح جہاد کے لیے نکلیں۔

وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ (توبہ۔۴۶)

بنی اسرائیل کے زمین پر دو مرتبہ افساد اور تباہی پھیلانے سے متعلق ارشاد ہوتا ہے خُدا نے اپنے لائق اور طاقت ور بندوں کو اس فساد کے روکنے اور ان کی بالا دستی کی خواہش کے خاتمے کے لیے بھیجا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ

جب اُن دو وعدوں میں سے پہلے کی میعاد آ گئی تو ہم نے تمہارے مقابلے میں اپنے طاقتور بندے بھیجے

۔(بنی اسرائیل۔۵)

ان آیات سے مجموعی طور پر ''بعثت'' کے معنی کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ ایک طرح سے بھیجنا ہے جو ہدایت اور کسی وجہ (مقصد) سے ہو۔[2] مذکورہ تمام قرآنی آیات میں یہ خصوصیات موجود ہے۔ ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ

کہہ دیجئے وہ (خُدا) اس بات پر قادر ہے کہ اوپر اور نیچے سے تم پر عذاب نازل کر دے۔(انعام۔۶۵)

تو اس کا معنی بھی یہی ہے کہ عذاب بھی خُدا کی ہدایت اور راہنمائی کی روشنی میں اپنا سفر طے کر کے منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ لہذا بعثت کا معنی صرف بھیجنا نہیں ہے بلکہ کسی ہدف اور مقصد کے لیے بھیجنے کو بعثت کہتے ہیں یعنی لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے بھیجا جائے۔

---

[1] (مائدہ۔۱۲، ۱۳)، (انعام۔۶۵)، (کہف۔۱۹)، (شعرائی۔۳۶)، (شمس۔۱۲)،۔(بنی اسرائیل۔۷۵)

[2] راغب کہتے ہیں: ''البعث اثارۃ الشیء و توجیهه''

نبوت سے متعلق قُرآنی الفاظ

(دوسرا حصہ)

لفظ وحی اور اس کی قسمیں

(۱) ہدایت تکوینی

(۲) ادراک جبلی

(۳) القاء روحی

(۴) مددِ غیبی

(۵) وحیِ تشریعی

الف۔ ہدایت تکوینی سے متعلق آیات

(۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ (حٰم سجدة۔ ۱۲)

(۲) یَوْمَىٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾ (زلزلة۔ ۴۔ ۵)

ب۔ ادراک جبلی سے متعلق آیات

(۱) وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۙ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ

(نحل۔۶۸۔۶۹)

(۲)وَحَرَّمۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ(قصص۔۱۲)

ج۔القاءِ وحی سے متعلق آیات

(۱)وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ
وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ۝۷
(قصص۔۷)

(۲)وَاِذۡ اَوۡحَيۡتُ اِلَى الۡحَوَارِيّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِىۡ وَبِرَسُوۡلِىۡ ۚ (مائدہ۔۵۔۱۱۱)

(۳)وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ لَـتُنَـبِّـئَـنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ۝۱۵
(یوسف۔۱۵)

(۴)اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰۤـئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا ؕ(انفال۔۱۲)

(۵)وَاِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ لَيُوۡحُوۡنَ اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓـئِهِمۡ لِيُجَادِلُوۡكُمۡ ۚ (انعام۔۱۲۱)

(۶)وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ
اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ (انعام۔۱۱۲)

د۔مددِ غیبی سے متعلق آیات

(۱)وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَيۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوۡا
لَنَا عٰبِدِيۡنَ۝۷۳(انبیاء۔۷۳)

ھ۔وحی تشریعی سے متعلق آیات

(۱)نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ۙ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

(الشعراء۔۱۹۳۔۱۹۴)

(۲)اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ (یونس۔۲)

(۳) كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِىۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتۡلُوَا۟ عَلَيۡهِمُ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ(رعد۔۳۰)

آیات کی تفسیر

قرآن نے انبیاء سے متعلق جو کلمات استعمال کیے ہیں اُن میں سے ایک کلمہ ''وحی'' ہے۔ہم خُدا سے نبیاء کے رابطے سے متعلق گفتگو کے وقت ''وحی تشریعی'' کے بارے میں تفصیلی بحث کریں گے۔یہاں پر اس لفظ کے معانی اور قرآن میں اِس کے استعمالات کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔یہاں پر وحی کی اقسام کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔سب سے پہلے لغت عرب میں اِس کے کیا معنی اور مفہوم ہیں، اِس کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔

ابن فارس مقائیس میں کہتے ہیں:

وحی کا معنی پوشیدہ اور مخفی طور پر کوئی بات سکھانا ہے۔[۱]

راغب کہتے ہیں:

وحی کا معنی ایک تیز رفتار اشارہ ہے۔لفظ ''وحی'' کے مفہوم میں جو تیزی اور سرعت پنہاں ہے اس کے پیش نظر بعض اوقات کنائے اور اشارے والی باتوں کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔[۲]

ابن منظور کہتے ہیں:

---

[۱] معجم مقائیس اللغۃ ج ۶، ص ۹۳

[۲] مفردات، ص ۵۱۵

وحی کا معنی ہے اشارہ، لکھنا، الہام، راز والی بات اور دوسری چیز جو کسی کے دل میں ڈالی جائے۔[1]

عرب کے ان ماہرین لغت کی آراء سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وحی کا معنی دوسرے کے دل میں کوئی بات ڈالنا ہے، جس میں دو عناصر ضروری ہیں۔

(۱) راز دانی

(۲) سرعت اور تیزی

انبیاء کا خُدا سے جو رابطہ ہوتا ہے اور جو احکام اور تعلیمات وہ اُس سے لیتے ہیں اس کو بھی وحی کہنے کی وجہ یہی ہے۔ یہ ایک قسم کی پوشیدہ اور راز دارانہ تعلیم ہوتی ہے جو سرعت اور تیزی کے ساتھ انجام پاتی ہے۔

شیخ مفید مرحوم نے لفظ ''وحی'' کے استعمال کے لیے جس عنصر کی موجودگی کو ضروری قرار دیا ہے وہ پوشیدہ اور مخفی طور پر سکھانا ہے۔ اس میں سُرعت بھی ضروری ہے۔

وحی کا لغوی معنی تو واضح ہو گیا، اب اس کے قرآنی استعمالات کو دیکھتے ہیں:

قرآن نے ''وحی'' کے استعمال کے وقت کسی خاص اصطلاح کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اسے جہاں بھی استعمال کیا ہے اس کے لغوی معنی کو مدنظر رکھا ہے۔ اس کے باوجود چند اور امور کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ممکن ہے انسانی علم کی محدودیت کے پیش نظر انہوں نے لفظ ''وحی'' ان جگہوں پر استعمال نہ کیا ہو۔ قرآن چونکہ اس کائنات کو ایک وسیع نظر سے دیکھتا ہے اور وہ پوری کائنات کو سمجھدار، دانا و بینا اور سننے والی سمجھتا ہے اس لیے اُس نے حیوانات اور جمادات کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے، کیونکہ ان تمام کو مخفی طور پر کچھ سکھایا گیا ہے، گویا قرآن نے ''وحی'' کے لیے نئے مصادق بیان کیے ہیں نہ کہ ''وحی'' کے معنی اور مفہوم میں کوئی ردوبدل کیا ہے۔ اب ہم قرآن میں اس کے استعمالات کو بیان کرتے ہیں۔

(۱)۔تکوینی ہدایت یا کائنات پر حکم فرما نظام

قرآن نے ''آسمانوں'' کے لیے بھی ''وحی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُوپر کی دنیا ایک خاص قانون اور مخصوص نظام کے ساتھ چل رہی ہے۔ اگر یہ قوانین اور اُصول اُس سے لے لیے جائیں تو اُس کا پورا نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ خُدا آسمانوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

فَقَضٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ وَاَوۡحٰى فِىۡ كُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ ۖ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۝۱۲ (حٰم سجدۃ۔۱۲)

---

[1] لسان العرب، ج ۱۵، ص ۳۷۹

ہم نے ان کو دونوں (دو دوروں) میں سات آسمانوں کی صورت میں بنا دیا اور ہر آسمان کی ذمہ داری اُسے بتا دی ۔ہم نے نیچے والے آسمان کو چراغوں سے سجایا (شہاب کے ذریعے) ہم نے انہیں شیطانوں کی دخلت سے محفوظ رکھا۔ یہ قدرت منداوردانا خُدا کی طرف سے (مقرر کردہ) تقدیر ہے۔

اس آیت میں وحی سے کیا مُراد ہے؟ یہاں پر دو باتیں کہی جاسکتی ہیں جو حقیقت میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

(ا) آسمانوں کو ’’وحی‘‘ کرنے کا مقصد اُن میں ایسے قوانین اور اصول وضوابط پیدا کرنا ہے جو خود بخود جاری وساری رہیں اور اپنی ذمہ داری انجام دیتے رہیں۔اس بات کا شاہد ذیل کی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

’’ذلك تقدير العزيز العليم‘‘ یہ مقدار اوردانا خُدا کی اندازہ گیری ہے:

یہ بات قطعی ہے کہ ’’ذلک‘‘ تینوں جملوں (آسمانوں کو وحی، آسمانوں کو ستاروں کے ساتھ سجائے اور آسمانوں کو شیاطین کی دخالت سے محفوظ رکھنے) کی طرف اشارہ ہے۔ان میں سے ایک جملہ آسمانوں کی طرف وحی کرنے کا ہے۔اس صورت میں آسمانوں کی طرف وحی کرنے کا معنی یہ ہوگا کہ اس اوپر والی دُنیا کی خُدا نے یُوں اندازہ گیری کی ہے اور ایک خاص قسم کا نظام اور قانون اس میں پیدا کیا ہے جس کے تحت یہ آسمان برقرار ہیں ۔ یہاں پر قرآن نے جونئی بات کی ہے وہ آسمان کے متعلق لفظ وحی کا استعمال ہے۔گویا آسمانوں کی دنیا خُدا کی عالمانہ اور قدرت مندانہ تقدیر کے تحت پیدا کی گئی ہے ایک باشعور جہان کی طرح ہر چیز اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داری انجام دے رہی ہے

۲۔ممکن ہے یہاں ایک اور بات بیان کی گئی ہو جو پہلے والی بات سے بھی بڑھ کے ہو وہ یہ کہ یہ پوری کائنات سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔ یہ تو ہم ہیں جو اسے اندھا، بہرا اور ناسمجھ خیال کر رہے ہیں۔اس کی شاہد یہ آیت ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ؕ

کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خُدا کی تسبیح اور تعریف نہ کر رہی ہو۔لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ۔(بنی اسرائیل ۔ ۴۴)

لہذا یہ باشعور، شنوا اور بصیر دنیا ایک مخفی اور رازدارانہ طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کے انہیں انجام دے رہی ہے۔قرآن نے جو ایک نیا پہلو متعارف کروایا ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے ایک ایسی دنیا ہمارے سامنے پیش کی ہے جو اس کے نکتہ نظر سے سمجھ دار اور بینا ہے۔اگرچہ انسانوں کے نکتہ نظر کے مطابق وہ شعور اور سمجھ سے عاری ہے۔[1]

بالکل یہی بات قیامت کے دن زمین کی حالت سے متعلق بیان کی جاسکتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ان دونوں نظریوں کا فرق یہ ہے کہ پہلی صورت مین لفظ ’’وحی‘‘ کا استعمال مجازی ہے جب کہ دوسری صورت میں حقیقی ہے کیونکہ لغت میں وحی کا معنی سمجھ کے ساتھ کوئی چیز سیکھنا ہے۔پہلی میں یہ تعلیم سمجھ اور شعور کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ تو قدرت کی تقدیر ہے جس نے اسے تسخیر کیا ہوا ہے جیسے مشین کی حرکات کہ جو انجینئروں کے ارادے اور انداز سے پیدا ہوتی ہیں جب کہ دوسرے نظریے کے مطابق اس حرکت کا سرچشمہ ایک قسم کی آگاہی اور شعور ہے۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿١﴾ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ﴿٢﴾ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ﴿٣﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿٥﴾

جب زمین پر ایک خاص قسم کا لرزہ (زلزلہ) طاری ہوجائے گا جو کچھ اُس کے اندر ہے وہ اسے اگلنا شروع کردے گی انسان اپنے آپ سے کہے گا زمین کو کیا ہوگیا ہے؟ (زلزلہ۔ ا تا ۵)

اس دن زمین اپنی خبریں دے گی۔

ا۔ زمین اُن کاموں کے بارے میں بتائے گی جو اُس پر انجام دیئے گئے۔

۲۔ یہ باتیں سنانے اور خبریں بتانے کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اسے وحی کی ہے۔

یہ آیت قیامت کے دن اور ثواب وعقاب کی دنیا مربوط ہے۔ زمین کے خبریں دینے سے مراد یہ ہے کہ انسانوں نے اِس زمین پر جو کچھ بھی نیک یا بُرے کام کیے ہیں زمین نے انہیں وحی کے ذریعے سے سیکھ لیا ہے۔

اگر ہم آیات کے ظاہر کو باقی رکھیں تو یہ دوسرے نظریے سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس صورت میں کائنات کی خلقت نظام کائنات اور تکوینی اصولوں سے مربوط نہیں ہوں گی۔ بلکہ (مراد یہ ہوگا) خُدا نے اس کائنات کی ہر چیز کو ایک خاص قسم کا شعور اور سمجھ عطا کی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں کو سمجھ سکتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اعمال اور افعال کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ انسان کے اعمال کو اُس کا سمجھنا ایک خاص قسم کی تعلیم کے پیش نظر ہے جس کا نام وحی ہے۔ گویا خدا نے زمین کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ ان تمام واقعات کو ریکارڈ کرتی جارہی ہے اور ایک دن وہ یہ سارا ریکارڈ پیش کردے گی۔ یہاں پر لفظ ''وحی'' استعمال کرنے کی وجہ اور جواز دہی رازدارانہ اور مخفی تعلیم ہے جو تیزی اور سرعت کے ساتھ دی گئی ہے۔

2۔ ادراک جبلی

بہت سے جانداروں بالخصوص جانوروں کی زندگی کا دارومدار اُن کی جبلی فعالیتوں پر ہے۔ علم اور سائنس نے جو کچھ ثابت کیا ہے وہ یہ ہے کہ شہد کی مکھی کا کام اور مکڑی کا جالا بننا یہ سب کچھ اُس تقاضے کی بنا پر ہے جو اُن کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تقاضا اُنکی مدد کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کسی قسم کا شک نہیں اور باہر سے کسی مدد کے بغیر اپنی زندگی کے لیے متعین راستے پر گامزن ہیں۔ اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں کہ ایک حیون کی زندگی اور وہ عجیب وغریب کام جو اُس سے سرزد ہوتے ہیں اور انسان اُن کی انجام دہی پر قادر نہیں ہے یہ سب کام کسی علت اور وجہ کے بغیر نہیں ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ وہ غور وفکر سے اور نفع ونقصان کا حساب لگا کر اور اُن کاموں کے مستقبل کے متعلق پوری طرح سوچ کر انہیں انجام دیتے ہیں۔ لہذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ان دو باتوں میں سے کسی ایک کو قبول کیا جائے۔

ا۔ جانوروں کی خلقت کے ساتھ ہی اُن میں چند قوتیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ قوتیں اُن جانوروں کو خود کارا ور نا آگاہانہ طور پر چند متعین اہداف کی طرف چلاتی ہیں۔ ایسی قوت یقینی طور پر مادی نہیں ہوسکتی بلکہ ایک طرح کی مجرد قوت ہے جو اس حیوان کے وجود اور جسم سے

ہم آہنگ ہے۔

۲۔ چند ایسے غیبی الہامات ہیں جو حیوان کو ہر روز کے کاموں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ وہ حیوان ان الہامات کو وصول کرتا ہے لیکن اپنے ادراک کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بعض اوقات انسان سے متعلق بھی ایسی تعبیر لائی جاتی ہے کہ وہ ادراک رکھتا ہے لیکن اپنے ادراک کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہیں۔

ان دونوں نظریوں میں سے ہر نظریہ لفظ ''وحی'' سے ہم آہنگ ہے کیونکہ بہرحال خفیہ اور پوشیدہ طریقے سے تعلیم حیوان کو دی جارہی ہے قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے:

وَاَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِیۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور بلند جگہوں پر اپنے گھر بنالو۔ پھر ہر طرح کے میوے کھاؤ اور اپنے رب کے راستے پر سیدھی چلتی رہو۔ (نحل۔۶۸۔۶۹)

لہذا حیران کن جیومیٹریکل انداز میں چھت بنانا، اُس کا نظام چلانا، بدبودار اور مردہ مکھیوں کے داخلے کو روکنے کے لیے اس کی حفاظت، پھر دن رات باغوں، بستانوں میں اُن کا اڑنا، پھولوں اور درختوں سے رس چوس کر اُسے شہد میں تبدیل کرنا، پھر اسے مخصوص شکل و صورت اور خانوں میں رکھنا یہ سب کام جبلت کی اساس پر ہیں جو گزشتہ دو شکلوں میں سے کسی ایک شکل میں انہیں ودیعت کیے گئے ہیں۔

حضرت موسیٰ کلیم اللہ جب فرعون کی بیوی آسیہ کے دامن میں آئے تو قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے:

وَحَرَّمۡنَا عَلَیۡهِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ

ہم نے اس سے پہلے دودھ پلانے والی عورتوں کے پستان کو اس پر حرام کر دیا تھا۔ (قصص۔۱۲)

جو عورت بھی اسے دودھ پلانے کے لیے آتی وہ اسے پیچھے دھکیل دیتا۔

یہ ایک تشریعی حرمت نہیں ہے کیونکہ بچے میں تکلیف کی شرائط ایک دو دن تو نہیں تھیں بلکہ خُدا کی قدرت سے اُس میں تمام عورتوں کے سینوں سے ایک بے غبتی سی پیدا ہوگئی۔ یہ ایک طرح کی آ گاہی تھی جسے وحیِ تکوینی (پہلی قسم) یا جانداروں کے لیے وحی (دوسری قسم) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اِس آیت کے سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ اس بچے کی خلقت اور پیدائش حضرت عیسٰی کے مانند دوسرے بچوں سے مختلف طریقے سے ہوئی اس لیے اُس کی بے رغبتی ایک طرح کی آ گاہی اور علم کی وجہ سے تھی۔

جیسا کہ اُن (حضرت عیسٰی) کا گھوارے میں گفتگو کرنا بھی ایک ایسی آ گاہی اور علم کی وجہ سے ہے جو حیوانی علم سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ اَلقاءِ رُوحی

بعض اوقات لفظ "وحی" روح اور دل پر کوئی چیز الہام کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی کوئی شخص اس بات کے بغیر کہ وہ کسی دوسرے کو دیکھے یا اس کے زیر تعلیم آئے ایک بات کو اندرونی طور پر محسوس کرتا ہے۔ یہ دو سبب سے ہوتا ہے۔

۱۔ بعض اوقات انسان طہارت، پاکیزگی اور باطنی نورانیت کے سبب اُس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ جہاں پر وہ نورانی اساتذہ اور عظیم ہستیوں یہاں تک کہ ذات حق سے حقائق اور علم حاصل کرتا ہے۔ ایسی صورت میں روح کی برتری اور بالیدگی اس طرح کے الہام لینے کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ کبھی انسان ظلمت اور تاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔ اس کی پستی اس درجے تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے جیسے موجودات کے ساتھ مرتبط ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بے بنیاد اور فریب دہندہ مطالب اُس کے دل میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔

اگر ان دونوں جگہوں پر لفظ "وحی" استعمال کیا ہے تو اس کا معیار وہی مخفی ہونا اور تیزی کے ساتھ انجام پذیر ہونا ہے۔ البتہ پہلی قسم کے لیے الہام اور اشراق کی تعبیر جب کہ دوسری کے لیے شیطانی وسوسہ کی تعبیر زیادہ مناسب ہے۔

اپنے مطلوب کی طرف کا انتقال دو صورتوں میں انجام پذیر ہوتا ہیں:

۱۔ کبھی تو وہ موضوع انسان کے فکر اور ذہن میں آتا ہے لیکن مناسب حالات کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ متحیر اور سرگرداں رہتا ہے۔ اس حالت میں ہی وہ بغیر اس بات کے کہ اس کام کے لیے ضروری شرائط اور ماحول کو فراہم کرے وہ چیز اُس کی فکر میں پوری طرح حل ہو جاتی ہے۔

۲۔ کبھی انسان اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوتا ہے اُس کا ذہن ہر قسم کے خیال اور فکر سے خالی ہوتا ہے یا وہ کسی ایسے موضوع پر سوچ رہا ہوتا ہے جو القاشدہ موضوع کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا۔ جب یہ بات قطعی ہے کہ کوئی واقعہ بھی کسی سبب کے بغیر نہیں ہوتا تو یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے ذہن میں یہ سوچ ڈالنے والا کون ہے خود نفس تو اس طرح کی سوچ کا حامل نہیں تھا کہ وہ ذہن میں یہ سوچ ڈالتا۔ کسی دوسرے شخص نے بھی اس سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی کہ اِس گفتگو کی وجہ سے یہ سوچ اُس کے ذہن میں آئی ہو۔ اس کا سرچشمہ مطالعہ وغیرہ بھی نہیں ہے۔

لہٰذا یقینی طور پر ایک غیبی قدرت اور فاعل ہے جو یہ سوچ ہمارے دل اور ذہن میں ڈال رہا ہے، جو انسان کی طرف الہام کر رہا ہے۔ اس کا نام آپ حدس رکھ لیں یا الہام اِس سے ہمارے موضوع پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اہم صرف یہ ہے کہ یہ سوچ پیدا کرنے والی قوت کوئی غیبی قدرت ہے نہ کہ خود انسان کیونکہ فرض یہ ہے کہ خود انسان نے یا تو اس موضوع پر اصلاً سوچا ہی نہیں یا آگر کچھ غور و فکر کیا بھی ہے تو اس نتیجے تک بغیر کسی مقدمے کے پہنچا ہے، خود انسان اس فکر کا خالق نہیں ہو سکتا کیونکہ فرض یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں یہ فکر نہیں تھی۔ جو خود کسی کمال سے تہی دست ہو وہ یہ کمال دوسرے کو کیسے عطا کر سکتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷﴾

ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اسے دودھ دو اور جب ڈر جاؤ تو اسے دریا میں ڈال دو کسی قسم کا خوف اور غم نہ کرو۔ ہم اسے تیری طرف لوٹائیں گے اور اسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔ (قصص۔۷)

یہ پانچ طرح کے خیالات:

۱۔ بیٹے کو دودھ دینا

۲۔ اسے دریا میں پھینکنا

۳۔ بیٹے کے انجام کے متعلق کسی قسم کا غم نہ کرنا

۴۔ بچے کو یقینی طور پر واپس پلٹانا

۵۔ اُسے رسول بنانا

جو کہ مادرِ موسیٰ کے ذہن اور دل میں ڈالے گئے یہ اُس کی ذات کے پیدا کردہ نہیں تھے بلکہ ایک غیبی عامل نے انہیں اس سے آگاہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ بتانا اور آگاہ کرنا مخفی طور پر اور تیزی کے ساتھ انجام پایا ہے اس لیے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اس توضیح سے اُن دوسری آیات کا مطلب بھی واضح ہو گیا جن میں ''وحی'' کا لفظ استعمال ہُوا ہے جیسے

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جب ہم نے حضرت موسیٰ کے) حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے بھی کہا کہ ہم ایمان لائے۔ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ (مائدۃ۔۱۱۱)

وحی سے مراد ایک طرح کی غیبی تعلیم اور عالم بالا سے الہام ہے جس کا علم فقط حواریوں کو ہو سکا۔ دوسروں کو اس سے کوئی خبر نہ تھی۔ اسی لیے ''وحی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

جب حضرت یوسف کنویں میں تھے تو خُدا نے انہیں یہ بات سمجھائی کہ تم جلد ہی انہیں اس ظلم سے آگاہ کرو گے۔ یہاں پر بھی لفظ ''وحی'' استعمال کیا گیا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

یہاں پر بھی لفظ ''وحی'' استعمال کرنے کا معیار وہی مخفی تعلیم ہے کہ یوسف کے بھائی جس سے آگاہ نہیں ہو

سکے تھے۔صرف یوسف کو ہی اس بات کی آگاہی حاصل ہوئی تھی۔(یوسف۔۱۵)

فرشتوں سے متعلق لفظ ''وحی'' کا استعمال بھی اسی معنی میں ہے جیسے:

اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ

جب تیرے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لہذا مومنوں کو استوار اور ثابت قدم رکھو۔(انفال۔۱۲)

مذکورہ بالا موارد کے علاوہ بھی قرآن میں بھی لفظ ''وحی'' استعمال ہوا ہے جو کہ شیاطین کے بارے میں سے یہاں پر وحی کی حقیقت وہی ہے،صرف مورد اور مقام کا فرق ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓـِٕہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

شیاطین اپنے پیروکاروں کو القا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہارے ساتھ مجادلہ کریں اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو پھر تم مشرک قرار پاؤ گے۔(انعام۔۱۲۱)

چونکہ وحی کرنے والے شیاطین اور وصول کرنے والے مشرکین ہیں لہذا یہ اُن کے دل پر ہی القاء ہو رہی ہے۔نہ یہ کہ آہستہ آہستہ گفتگو کی صورت (کان بھرنے کی حالت میں) بعض آیات میں اسے سینوں میں شیطان کے وسوسے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

ایک اور آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے مقابلے میں اُس کا دشمن جن وانس کے شیاطین میں سے قرار دیا۔یہ دو طرح کے شیطان بہت فریب اور دھوکے والی باتیں ایک دوسرے کو القا کرتے ہیں۔(انعام۔۱۱۲)

اِس آیت میں دو احتمال ہیں:

۱۔جہاں پر بات کرنے والا جن ہو تو وہ بات کو دل میں ڈالتا ہے۔

۲۔جہاں پر بات کرنے والا انسان ہو تو وہ سرگوشی کی حالت میں یہ بات کرتا ہے۔

[1] الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ﴿۪ۙ۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ (ناس۔۴، ۵)

۴۔ مددِ غیبی

خُدا بعض انبیاء کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ہم نے انہیں راہنما بنایا ہے جو ہمارے فرمان اور حکم کے مطابق انسانوں کی ہدایت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ پھر ان کی یوں تعریف کی جاتی ہے:

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَيۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءَ الزَّكٰوةِ‌ ۚ وَكَانُوۡا لَـنَا عٰبِدِيۡنَ ۚ‏ ﴿۷۳﴾

ہم نے انہیں نیک کاموں کی انجام دہی کی وحی کی اسی طرح نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کی وہ پہلے بھی ہماری عبادت کرتے تھے۔ (انبیاء۔ ۷۳)

اس آیت میں ''وحی'' کس معنی میں ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں وحی تشریعی مُراد ہے جو کہ تمام انبیاء پر نازل ہوتی تھی جو اُن کے اور دوسرے لوگوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بیان کرتی ہے۔ لہذا مذکورہ بالا آیت وحی تشریعی کو ہی بیان کر رہی ہے (جس کی بحث آگے آگے آئے گی) لیکن یہاں پر ایک نکتے کی یاددہانی ضروری ہے، وہ یہ کہ قرآن نے اِس سے ملتی آیات میں مصدر (فصل الخیرات) کی بجائے فعل امر استعمال کیا ہے۔ مثلاً

۱۔ وَاَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِىۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا (نحل۔ ۶۸)

۲۔ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ (قصص۔ ۷)

۳۔ وَلَقَدۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى ۙ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡ (طه۔ ۷۷)

۴۔ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰى وَاَخِيۡهِ اَنۡ تَبَوَّاٰ (یونس۔ ۸۷)

۵۔ فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ (المومنون۔ ۲۷)[1]

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تعبیر کے اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ علم بلاغت کے ایک ماہر استاد عبدالقادر جرجان نے اپنی کتاب دلائل الاعجاز میں اس سے متعلق یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب بھی شخص اور مکلف کو اس سے پہلے کسی کام کا امر نہ دیا گیا ہو اور وہ اسی خطاب کے ذریعے ہی کسی کام پر مامور ہو۔ اس صورت میں دوسری قسم کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا آیات بھی اسی مورد سے مربوط ہیں۔ لیکن اگر پہلے سے وہ مامور ہو اور اُسے انجام دیتا رہا ہو تو ایسی صورت میں ''مصدر'' استعمال کیا جاتا ہے، فعل الخیرات کی تعبیر لائی جاتی ہے۔ اس صورت میں آیہ کا

---

[1] بعض جگہ پر خود فعل بھی استعمال کیا گیا ہے لفظ ''امر'' اسکے ساتھ ذکر نہیں ہوا جیسے وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ لَـتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا (یوسف۔ ۱۵)

مطلب یہ ہوگا کہ یہ انبیاء گذشتہ شرائع کی روشنی میں نیک کام انجام دیتے تھے۔اس کام کو جاری رکھنے کے لیے ان پر وحی نازل ہوئی۔اس وحی سے کیا مُراد ہے؟اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام پہلے والی شریعت میں بھی آچکے تھے اور وہ انہیں انجام دے رہے تھے۔اس پر گواہ آیت ذیل ہے کہ

''وَكَانُوا لَنَا عٰبِدِيْنَ'' وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔اب اس بات پر غور وفکر کرنا چاہیے کہ وحی سے مراد کیا ہے؟ یقینی طور پر وحی تشریعی مراد نہیں ہے کیونکہ فرض یہ ہے کہ وہ اس کے حکم اور تشریع سے پہلے بھی آگاہ تھے اور اسے انجام بھی دے رہے تھے۔لہذا اس وحی سے مراد ایک غیبی مدد ہے جو انہیں اس کام کی طرف چلاتی ہے۔چونکہ اس غیبی مدد کی تاثیر بہت مخفی اور پوشیدہ ہے اس لیے لفظ ''وحی'' استعمال کرنا بالکل مناسب بلکہ بلیغ ہے،ایک ایسی وحی جس کی وجہ سے انسان چند غیبی طاقتوں کے زیر اثر ہوجائے جو اُسے کمال اور سعادت کی طرف لے جائیں۔اس طرح کی وحی کی برتری دوسری اقسام پر واضح ہے۔

۵۔وحی تشریعی

معمولی انسان حسیات اور تجربے یا تفکر اور استدلال کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔لیکن جب بھی کوئی انسان شناخت کے ایسے ذرائع سے کام لے جو ان دو طرح کی معرفت سے مربوط نہ ہوں بلکہ ایک تیسری قسم کی معرفت اور آگاہی ہو جو کہ عالم بالا سے اُس کا مقصد انسانی معاشرے کو کمال اور سعادت کی طرف لے کر جانا ہو۔اسے وحی تشریعی کہتے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ درحقیقت و ماہیت کے اعتبار سے گذشتہ اقسام سے کوئی تفاوت نہیں رکھتی،فقط یہ فرق ہے کہ وحی تشریعی میں انسانوں کو مبداء معاد کی طرف لے جانے کی قید لگائی گئی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

جبرائیل نے اسے تیرے دل پر نازل کیا تا کہ تم ڈرانے والوں میں سے ہوجاؤ۔(شعراء۔۱۹۳۔۱۹۴)

لہذا انبیاء اگر چہ حس اور عقل سے بھی استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کی لائی ہوئی شریعت کا منبع یہ نہیں ہیں بلکہ وہ کسی اور دنیا سے مربوط ہے جو خُدا کے حکم سے اُن کی روح اور دل پر نازل ہوتی ہے۔وحی لینے اُسے یاد کرنے اور حفظ کرنے یا اُسے آگے پہنچانے میں کسی قسم کی غلطی نہیں کرتے۔لہذا یہ فکر درست نہیں ہے کہ انبیاء کی تعلیمات اور ہدایت کے لیے ان کا پروگرام حسیات،عقل یا اُن کی ذاتی صلاحیت کا ثمرہ ہے ایسی فکر کے حامل لوگ کسی مقصد تک نہیں پہنچ پاتے۔چونکہ یہ لوگ اس مادی دنیا سے بالاتر کسی اور دنیا پر اعتقاد نہیں رکھتے اس لیے وہ تمام واقعات کو مادی اور بشری رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے لیے مادی عوامل اور اسباب کی تلاش میں رہتے ہیں۔

خدا سے انبیاء کے رابطے کے عنوان سے آنے والی بحث میں ہم اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ

کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب آور نہیں ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی (اور ہم نے اُس سے کہا کہ) لوگوں کو (خدا کے عذاب سے) ڈراؤ، اور مومنوں کو خوشخبری دے دو کہ ان کے رب کے پاس نیک جزا ہے۔ (یونس۔ ۲)

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

اسی طرح ہم نے تجھے ایک اُمت میں بھیجا کہ جس سے پہلے بھی کئی اقوام تھیں تا کہ تجھ پر جو ہم نے وحی کی ہے اُسے ان کے سامنے تلاوت کر۔[1]

مذکورہ مطالب کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وحی صرف ایک معنی ہی رکھتی ہے اور قرآن میں بھی لفظ "وحی" اُسی ایک معنی میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ اِس کے متعلقات مختلف ہیں۔ اِن تمام میں استعمال کا معیار ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

تمام جگہوں پر یہ سکھانا مخفی طریقے اور تیزی سے سکھانا ہے، جسے سکھایا جا رہا ہے وہ انسان ہو یا جانور یا جمادات، یہ تعلیم چاہے انسان کی ہدایت اور رہبری سے متعلق ہو یا غیر انسان سے، وہ تعلیم دینے والا خدا ہو یا کوئی اور۔

[1] وحی تشریعی سے متعلق آیات بہت زیادہ ہیں۔ مذکورہ امور میں ہی منحصر نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات بھی اسی سلسلے سے متعلق ہیں (انعام۔ ۱۹۔ ۱۴۵)، (بنی اسرائیل۔ ۳۹۔ ۷۳۔ ۸۶)، (نحل۔ ۱۲۳) (فاطر، ۳۱)، (شوریٰ۔ ۱۳)

۸۔ کیا تمام انسانوں کی طرف انبیاء بھیجے گئے ہیں؟

زیر نظر آیات کی فہرست

۱۔ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (رعد۔ ۷)

۲۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (فاطر۔ ۲۴)

۳۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل۔ ۳۶)

۴۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ (اعراف۔ ۲۶)

۵۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (اعراف۔ ۲۷)

۶۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ (اعراف۔ ۳۱)

۷۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (اعراف۔ ۳۵)

۸۔ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ڏ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ (طٰہٰ۔ ۱۲۳)

۹۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ ...... (انعام۔ ۱۳۰)

۱۰۔ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

(مائدۃ۔۲۵)

۱۱۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ

(نساء۔۱۶۴)

۱۲۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ

(مومن۔۷۸)

آیات کی تفسیر

انسان کی گذشتہ تاریخ کے بارے میں کوئی فیصلہ اور گذشتہ اُمتوں کی تاریخ پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں اُن کو اُٹھانا ایک بہت مشکل کام ہے۔ اندازوں پر مبنی فیصلے بھی قابل اطمینان نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک اہم موضوع پوری تاریخ بشر اور ہر دور کے انسانوں میں انبیاء کا آنا ہے۔ آدم سے لے کر خاتم تک مشرق و مغرب میں بسنے والے تمام انسانوں کی طرف خُدا کے بھیجے ہوئے رسول آتے رہے ہیں جو رسالت الٰہی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ہماری گفتگو کا محور صرف تاریخ ہی نہیں ہے کہ ہمیں تاریخ کے جنجالوں میں پڑنا پڑے اور انسان کی پیدائش اور چھوٹے بڑے تمدنوں کے وجود میں آنے سے متعلق ماہرین کی آرا کو زیر بحث قرار دینا پڑے۔ بلکہ ہماری بحث کا محور قرآن اور عقل ہے کہ جنھیں کلی طور پر یہاں زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کی ضرورت نہیں ہے اگر چہ اس طرح کی عقلی اور قرآنی گفتگو کو تاریخی نکتہ نظر سے بھی سامنے رکھا جائے تو اس کی اہمیت اور قدر دو چند ہو جاتی ہے۔ لہذا ہم دونوں اعتبار (عقل، نقل) سے اس کی تحقیق کریں گے۔

ا۔ عقلی نکتہ نظر

عقلی نکتہ نظر سے انبیاء کی بعثت کا ضروری اور لازم ہونا ثابت کیا جا چکا ہے عقلی استدلال کا محور یہ تھا کہ اگر اس طرح کے فیضان کا راستہ انسان پر بند کیا جائے تو انسان کی خلقت اور پیدائش بے ہودہ اور بے نتیجہ ہو جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ یہ خلقت اُس وقت عاقلانہ اور خدا کے مقام ربوبیت کے لائق ہو سکتی ہے جب کسی ہدف اور مقصد کے پیش نظر کیا جائے۔ وہ ہدف انسان کا علمی اور عملی لحاظ سے انفرادی اور اجتماعی تکامل ہے۔ یہ مقصد انبیاء کے بھیجنے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس ہدف کی تکمیل اور حصول کے لیے انبیا کا مبعوث کرنا ضروری ہے۔

بعثت کے ضروری ہونے سے متعلق دلیل کا محور اگر ہم بُرھان کو قرار دیں تو یہ ایک لامحدود استدلال ہوگا جسے کسی خاص زمانے مقام کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اِس فیضان الٰہی کے نزول کا زینہ جہاں پر بھی فراہم ہو وہاں یہ نزول یقینی ہے۔

۲۔قرآنی نکتۂ نظر سے بعثت کی عمومیت

قرآنی آیات کو سامنے رکھتے ہوئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیض نبوت ایک عام اور عالمگیر فیض ہے۔ جہاں پر بھی امت یا کوئی گروہ تھا وہاں خدا کے نمائندے آئے ہیں۔ اِس بات کو دو طرح کی آیات سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(الف) جو آیات واضح طور پر یہ کہتی ہیں: ہر قوم اور ملت کے لیے ہادی اور راہنما بھیجے گئے ہیں۔ ہر اُمت میں ڈرانے والے لوگ بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۷

ہر قوم کے لیے ہادی اور راہنما ہے۔ (رعد۔۷)

ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝۲۴

کوئی اُمت ایسی نہیں تھی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہو۔ (فاطر۔۲۴)

واضح ترین آیت یہ ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا تا کہ وہ خُدا کی عبادت کریں اور طاغوت کی پرستش سے اجتناب کریں۔ (نحل۔۳۶)

یہ آیات واضح طور پر ملتوں، اُمتوں اور قوموں کو ہادی، نذیر اور رسول کے ساتھ ملاتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ جہاں پر بھی چند انسان ایک ''قوم'' یا اُمت کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے وہاں رسول بھیجا گیا ہے۔

اگر یہ تصور کیا جائے کہ کسی دور میں انسان انفرادی صورت میں یا ایک بہت چھوٹے معاشرے کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے تو مذکورہ بالا آیات اِس دور کے بارے میں نہیں ہوں گی۔

ب۔ وہ آیات جو انسان کی خلقت کی ابتدا کو بیان کرتی ہیں وہ بھی اِس نعمت اور فیض کی وسعت کی نشان دہی کرتی ہیں، سورہ اعراف کی آیات ۲۶ تا ۳۵ اِسی سلسلے سے متعلق ہیں۔ یعنی جب حضرت آدم اور حوا ترک اولی کی وجہ سے جنت سے نکل کر اس زمین پر سکونت پذیر ہو گئے، خُدا اولادِ آدم کو چند لرزا دینے والے الفاظ کے ساتھ مخاطب کرتا ہے۔ ان کو اصطلاح میں ''آغاز خلقت'' کے خطاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیات کا ظاہر یہی ہے کہ اولادِ آدم کو ''فترت''[1] کے بغیر موردِ خطاب قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ خطاب ایک رسول اور نبی کے وجود کی نشاں دہی کر رہے ہیں۔ ہم اِن آیات کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے آدم کی اولاد ہم نے تمہاری طرف لباس بھیجا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور آرائش کے کپڑے اور پرہیزگاری کا لباس نازل کیا۔ وہ سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تا کہ وہ لوگ غور کریں۔ (اعراف۔۲۶)

۲۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے اولادِ آدم تمہیں شیطان نہ بہکائے جیسا کہ اُس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا اُن کے کپڑے اُن کے بدن سے اتار دیے تا کہ اُن کی شرمگاہ کو دکھائے وہ اور اُس کے ساتھی تمہیں دیکھتے ہیں جب کہ تم انہیں نہیں دیکھ رہے۔ ہم نے شیاطین کو اُن کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ فوٹ نوٹ: (اعراف۔۲۷)

۳۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

اے اولادِ آدم ہر عبادت گاہ کے پاس اپنی آرائش کر لو کھاؤ پیو اور بیجا خرچ نہ کرو۔ خدا فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (اعراف۔۳۱)

۴۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾

---

[1] فترت سے یہاں مراد زمانہ ہے جو ایک نبی کے جانے کے بعد اور دوسرے نبی کے آنے سے پہلے کا ہوتا ہے۔ مترجم

اے اولادِ آدم جب بھی تمھاری طرف تم میں سے رسول آئیں اور تم پر میری آیات پڑھیں پس جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اور نیک کام انجام دیں تو قیامت کے دن اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم ۔(اعراف۔۳۵)

ایک اور سُورہ میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

خطاب ہوا سب کے سب جنت سے زمین پر آ جاؤ ایک دوسرے کے دشمن رہو جب میری جانب سے تمہاری طرف کوئی ہدایت (پیغمبر) آئے تو تم میں سے جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی تکلیف میں پڑے گا۔(طٰہٰ۔۱۲۳)

ارشاد ہوتا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اے انسانوں اور جنوں کی جماعت: کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے جو تم پر میری آیات پڑھتے اور تمہیں ڈراتے آج (قیامت) کے دن کے (عذاب سے)؟ وہ کہیں گے کہ ہم اپنی زبان کے ساتھ گواہی دیتے ہیں۔ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکا دیا اور انہوں نے اپنے اوپر اِس بات کی گواہی دی کہ وہ کافر تھے۔ (انعام۔۱۳۰)

یہ سب آیات اولادِ آدم کو ڈرا رہی ہیں اور انہیں انبیاء کی پیروی اور شیطان سے دوری کا حکم دے رہی ہیں۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ اِن قرآنی خطابات کے آنے کے بعد انسان پر کئی صدیاں ایسی گزریں جن میں اُن کی طرف کوئی رسول نہیں آیا بلکہ ایک بہت طویل عرصے کے بعد انسان پر بعثت کا دروازہ کھولا گیا ہے تو یہ بات آیات کے ظاہر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

فرض کریں ایک باپ نے اپنے بیٹے کو نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا تو اُس نے گھر کا نظام چلانے کے لیے چند کلی اور عمومی اصول بنا لئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جو بچہ بھی اس گھر میں آئے گا یہ قانون اور اصول اُس کے لیے بھی ہوں گے نہ یہ کہ بعض بچوں پر یہ قانون

لاگو نہیں ہے اور کچھ عرصے بعد دوسرے بچوں پر یہ قانون نافذ ہوگا۔

آدم کے بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے درمیان ہونے والی گفتگو اور ان میں سے ایک نے جو بہت بُرا عمل انجام دیا اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم پہلے دن سے ہی ایک کمال کی حامل تھی۔ وہ پیغمبروں کے زیرِ تربیت آسکتی تھی۔ لہٰذا جب ایک بھائی نے اپنے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی تو اُس نے جواب میں کہا:

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞٢٨ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۞٢٩

میں ہرگز تیرے قتل کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھاؤں گا میں عالمین کے رب اللہ سے ڈرتا ہوں اب جب کہ تو نے میرے قتل کا پکا ارادہ کرلیا ہے) تو میں چاہتا ہوں کہ تم میرے قتل کے گناہ کے ساتھ اور اپنے گناہ کے ساتھ خدا کی طرف جاؤ اور اہل دوزخ میں سے ہو جاؤ اور یہی ستم پیشہ لوگوں کی سزا ہے ۔(مائدۃ۔۲۸۔۲۹)

یہ طرزِ گفتگو اُن کا ہے جو بہشت اور دوزخ پر یقین رکھتے ہیں، ظالم اور عادل کے انجام کار سے بھی آگاہ ہیں جن کا فکری معیار یہ ہو وہ یقینی طور پر انبیاء کی دعوت اور ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب یہ کہنا کہ بعد والے انسانوں کا فکری معیار اِس سے کم تھا اور وہ فکری اعتبار سے اِس بات کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ انبیاء کی تعلیمات کو سمجھ سکیں۔ اِس بات کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔

اگر ہم اِن آیات کو مجموعی طور پر بعض روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیرِ بحث لائیں تو اس سے یہی نتیجہ حاصل ہوگا کہ فیضِ نبوت انسان کی خلقت کے ساتھ شروع ہو چکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے کا جو معیار آیاتِ قرآن سے حاصل ہوتا ہے وہ معیار پہلے دِن سے ہی انسان کے ساتھ ہے۔ یہ معیار انسان کے عقیدے، معاشرے اور اخلاق کی اصلاح سے مربوط ہے۔ اِن دونوں بھائیوں کا آپس میں جھگڑا اور ان کا طرزِ گفتگو اِس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُس وقت کا انسان بھی توحید پرستی کے عقیدے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اُس وقت بھی اختلاف، لڑائی جھگڑے اور دوسرے اعمال جو جبلی خواہشات کی بنا پر انجام پاتے ہیں۔ (جیسے حسد اور بخل) کے لیے ماحول سازگار تھا۔ لہٰذا مذکورہ تینوں جہات سے انسان کی تربیت کے لیے انبیا کا آنا ضروری ہے۔ اگرچہ دونوں بھائیوں کی گفتگو میں توحید سے انحراف کے متعلق تو کوئی بات نہیں آئی لیکن دو اور معیار جو انبیاء کی بعثت کے لیے اہم محرکات شمار کیے جاسکتے ہیں وہ ان کی گفتگو میں واضح طور پر موجود ہیں۔ وہ عوامل نزاع اور کشمکش (اختلاف) اور غیر سنجیدہ اور ناپسندیدہ جبلی خواہشات (حسد اور بخل) کی پیروی کرنا ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی کا کوئی دور انبیاء سے خالی نہیں رہا تو اُن انبیاء کے نام اور خصوصیات کیا ہیں جو دور دراز علاقوں میں رسالت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ قرآن یہ بات واضح طور پر کہتا ہے کہ اس نے صرف چند انبیاء کی سرگذشت کو بیان کیا ہے۔ دوسروں کے حالاتِ زندگی بیان نہیں کیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ

ایسے پیغمبر کہ جن کی زندگی کی داستان کو ہم نے اس سے پہلے تیرے لیے بیان کیا ہے اور ایسے پیغمبر کہ جن کی زندگی کی سرگذشت کو ہم نے تیرے لیے بیان نہیں کیا۔ (نساء۔ ۱۶۴)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ

اُن میں سے بعض پیغمبر ایسے ہیں جن کی داستان ہم نے تیرے لیے بیان کی ہے اور بعض کی بیان نہیں کی۔ (مومن۔ ۷۸)

لہٰذا قرآن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ ان تمام کے ناموں اور خصوصیات کو بیان کرتا ایک نے جا اُمید ہے۔ روایات میں انبیاء کی تعداد سے متعلق جو کچھ بتایا گیا ہے وہ بھی اِسی بات کی تائید کرتا ہے کیونکہ تقریباً ۱۲۴۰۰۰ پیغمبر فقط خاورمیانہ اور خاور نزدیک میں ہی آئے ہوں، کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ اُن میں سے کچھ دور دراز علاقوں میں بھی آئے ہیں۔

احادیث سے استدلال

حضرت علی تبلیغ کے سلسلے میں انبیاء کی ذمہ داری کو بیان کرتے ہُوئے یہ کہتے ہیں کہ اُن کے آنے کا مقصد انسان کے فطری افکار کو بیدار کرنا ہے۔ پھر اُن کے متعلق یُوں فرماتے ہیں:

وَلَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ خَلْقَهٗ مِنْ نَّبِيٍّ مُّرْسَلٍ اَوْ كِتٰبٍ مُّنْزَلٍ اَوْ حُجَّةٍ لَّازِمَةٍ اَوْ مَحَجَّةٍ قَآئِمَةٍ، رُسُلٌ لَّا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهٗ مَنْ بَعْدَهٗ اَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهٗ مَنْ قَبْلَهٗ۔ عَلٰى ذٰلِكَ نُسِلَتِ

الْقُرُونَ وَمَضَتِ الدُّهُورُ. وَسَلَفَتِ الْاٰبَآءُ وَخَلَفَتِ الْاَبْنَآءُ. [1]

اللہ سبحانہ، نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر یا آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا۔ ایسے رسول جنہیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت درماندہ و عاجز نہیں کرتی تھی اُن میں سے کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام و نشان بتایا۔ کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا۔ اِسی طرح مدتیں گزر گئیں۔ زمانے بیت گئے باپ داداؤں کی جگہ ان کی اولادیں بس گئیں۔

امیر المومنین حضرت آدم اور ان کے زمین پر اُترنے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَاَهْبَطَهٗ بَعْدَ التَّوْبَةِ لِيَعْمُرَ اَرْضَهٗ بِنَسْلِهٖ وَلِيُقِيْمَ الْحُجَّةَ بِهٖ عَلٰى عِبَادِهٖ وَلَمْ يُخْلِهِمْ بَعْدَ اَنْ قَبَضَهٗ، مِمَّا يُؤَكِّدُ عَلَيْهِمْ حُجَّةَ رُبُوْبِيَّتِهٖ وَيَصِلُ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَعْرِفَتِهٖ بَلْ تَعَاهَدَهُمْ بِالْحُجَجِ عَلٰۤى اَلْسُنِ الْخِيَرَةِ مِنْ اَنْبِيَآئِهٖ وَمُتَحَمِّلِيْ وَدَآئِعِ رِسَالَاتِهٖ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى تَمَّتْ بِنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ حُجَّتُهٗ وَبَلَغَ الْمَقْطَعَ عُذْرُهٗ وَنُذُرُهٗ [2]

اور اُسے توبہ کے بعد زمین پر بھیجا تاکہ اپنی اولاد (نسل) کے ساتھ مل کر زمین کو آباد کرے اور اُس کے ذریعے سے اپنے بندوں پر اتمام حجت کیا۔ اس کے بعد اُس کی روح کو قبض کر لیا اور لوگوں کو خُدا کی حجت کی تاکید کرنے والے اور خُدا کے معرفت کے ساتھ متصل کرنے والے سے خالی نہ چھوڑا۔ فقط یہی نہیں کیا بلکہ انہیں واضح نشانیوں کے ساتھ کہ جو بہترین مخلوقات اور اُس کی رسالت کے حامل افراد کی زبان سے بیان ہوتی ہیں، ہر زمانے میں مورد لطف و کرم قرار دیا۔ خُدا کی حجت ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے اختتام کو پہنچی اور لوگوں کے لیے دلائل اور انہیں ڈرانے کے وسائل اپنی آخری منزل تک پہنچ گئے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام ایک اور جگہ پر ارشاد فرماتے ہیں:

زمین کبھی بھی حجت خُدا سے خالی نہیں رہی۔ البتہ کبھی تو وہ حجت واضح اور آشکارا ہوتی ہے اور کبھی مخفی اور پنہاں۔ خُدا اِس کے ذریعے بندوں پر اتمام حجت کرتا رہا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۹۱۔

کمیل رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ بَلٰى! لَا تَخْلُوا الْاَرْضُ مِنْ قَآئِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ: اِمَّا ظَاهِرًا مَّشْهُوْرًا وَاِمَّا خَآئِفًا مَّغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَيِّنَاتُهٗ ـ وَكَمْ ذَا وَاَيْنَ اُولٰٓئِكَ؟ اُولٰٓئِكَ ـ وَاللّٰهِ ـ الْاَقَلُّوْنَ عَدَدًا، وَالْاَعْظَمُوْنَ عِنْدَاللّٰهِ قَدْرًا، يَحْفَظُ اللّٰهُ بِهِمْ حُجَجَهٗ وَبَيِّنَاتِهٖ حَتّٰى يُوْدِعُوْهَا نُظَرَآءَ هُمْ وَيَزْرَعُوْهَا فِيْ قُلُوْبِ اَشْبَاهِهِمْ ـ [1]

ہاں: مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خُدا کی حجت کو برقرار رکھتا ہے چاہے وہ ظاہر ومشہود ہو یا خائف و پنہاں تا کہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں اور وہ ہیں ہی کتنے اور کہاں پر ہیں۔ خُدا کی قسم وہ تو گنتی میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور اللہ کے نزدیک قدر ومنزلت کے لحاظ سے بہت بلند۔ خُداوند عالم ان کے ذریعہ سے اپنی حجتوں اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان کو اپنے ایسوں کے سپرد کر دیں اور اپنے جیسوں کے دلوں میں انہیں بو دیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات سے مجموعی طور پر وہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے جو کہ آیات سے حاصل ہوا تھا۔ شاید امیر المومنین نے بھی یہ بات قرآنی آیات سے اخذ کی ہو اور اسے اِس پیرائے میں بیان کیا ہو۔ یہ سب آپس میں ہم آہنگ ہو کر ایک نکتے پر ہی تاکید کر رہی ہیں کہ خدا نے آدم کو زمین پر بھیجنے کے بعد اُس کی اولاد کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے وہ تمام حجت کرتا رہا ہے اور ان کے عذر کے راستے کو ختم کرتا رہا ہے۔ یہ حجت کون لوگ تھے؟ اس سلسلے میں دو احتمال ذکر کیے گئے ہیں:

۱۔ ان حجتوں سے مُراد جو کہ توحید اور خُدا کی ربوبیت پر واضح نشانیاں بیان کرتے رہے ہیں انبیاء ہی ہیں حضرت امیر المومنین کے پہلے اور بالخصوص دوسرے ارشاد سے اسی بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ البتہ ان میں سے بعض کسی شریعت کے پایہ گزار تھے اور بعض کسی شریعت کو آگے پھیلانے والے۔ ان کے درمیان زمانے کے اعتبار سے فرق بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی زمانہ بھی ایک ہی رہا ہے۔

مثلاً بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے انبیاء تمام کے تمام شریعت تورات کو آگے پھیلانے والے ہیں۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے بعد ہی آئے ہیں۔ جبکہ حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ایک تھا لیکن اس کے باوجود حضرت لوط حضرت ابراہیم کی شریعت کے پیروکار تھے۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر تو نبی ہی تھے لیکن "فترت" کے زمانے میں ان کے جانشین لوگوں کو حقائق

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۱۴۷

سے آگاہ کرتے رہے ہیں اوران پر تمام حجت کرتے رہے ہیں اگر چہ یہ خود نبی اور پیغمبر نہیں تھے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کے بعد حضرت رسولِ اسلام کے ظہور تک خُدا کی حجتیں حضرت مسیح کے جانشینوں کی شکل میں ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔حضرت علی کا تیسرا ارشاد ممکن ہے اس بات کی طرف ہی اشارہ ہو۔بالخصوص حضرت موسیٰ کے مصاحب کہ جن کی داستان سورہ کہف میں بیان کی گئی ہے وہ خُدا کی مخفی اور پنہاں حجتوں میں سے تھے (خائفاً مغمورا) البتہ بعض روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ وہ نبی اور پیغمبر تھے۔لقمان حکیم خُدا کی ایک حجت تھے اور اُس کی راہ کی طرف بلاتے تھے اُن کے افکار کی بلندی اور عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن نے اُن کے حکیمانہ کلمات کو اپنے کلمات اور رسولوں کی باتوں کے ہم صف قرار دیا ہے۔ایک سورہ بھی ان کے نام سے ہے۔روایات کے مطابق یہ نبی نہیں تھے بلکہ تزکیہ نفس کے سبب وہ اس عظیم مقام تک پہنچے تھے۔

بہر حال اِس گفتگو سے جو نتیجہ لیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے جانشینوں کے ذریعے ہدایت کا سلسلہ ہر دور کے لوگوں کے لیے جاری رہا ہے۔ہر وہ مکان جہاں انسان بستے تھے یا ہر وہ زمان جس میں انسان پائے جاتے تھے وہاں خدا کا یہ فیضان پہنچا ہے گذشتہ آیات و روایات سے یہ بات واضح طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔ممکن ہے یہاں ایک اور نظریہ پیش کیا جائے، وہ یہ کہ نبوت سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے لوگ فکری، روحانی اور جسمانی لحاظ سے آمادہ ہوں۔بعثت کے لیے یہ ایک شرط ہے۔جہاں یہ شرائط اور آمادگی موجود نہ ہو وہاں بعثت کے ضروری ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

بعض کا خیال یہی ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ فکری اور روحانی اعتبار سے اس درجے پر نہیں تھے کہ وہ نبوت سے فیض یاب ہو سکتے بلکہ فکری لحاظ سے وہ حیوانات کی طرح تھے۔البتہ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ حیوان نما انسان تھے بلکہ وہ انسان تھے جیسے کہ صحرا یا جنگل میں بسنے والے انسان ہوتے ہیں ماہر عمرانیات افراد یہ کہتے ہیں کہ جنگلوں میں بسنے والے انسان اسی انسان کی باقیات شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی فکر اتنی جامد اور ابتدائی ہے کہ وہ سب سے بڑا عدد جسے وہ شمار کر سکتے ہیں ان کے ہاتھوں کی انگلیوں کی تعداد ہے۔

دوسری طرف اُن کی زندگی معاشرتی اور اجتماعی نہیں تھی بلکہ وہ غاروں، پہاڑوں اور درختوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے۔وہ جنگلی درختوں کے پتوں اور پھلوں سے گزارہ کرتے تھے۔اس وجہ سے ان کے درمیان کسی قسم کا لڑائی جھگڑا ہی نہیں ہوتا تھا کہ انبیاء بھیجنے کی ضرورت پیش آتی۔لیکن دوسری طرف اِس بات کے پیش نظر کہ یہ آفرینش فضول نہ ہو سالم فطرت اور عقل سلیم انہیں مبداء معاد اور عدل کے قیام کی طرف دعوت دینے کے لیے کافی تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا کے بعض حصوں اور تاریخ کے کئی ادوار میں ایسا وقت آیا ہے جب انبیاء کی بعثت کے ضروری ہونے کے عوامل ناپید رہے ہیں۔خلقت کے مقصد کی تکمیل کے لیے اندرونی ہدایات اور باطنی راہنمائی کافی رہی ہے۔لہٰذا فیضان ہدایت اِسی شکل وصورت میں اُن کی طرف آتا رہا۔باہر سے کوئی شخص ان کے لیے مبعوث نہیں ہُوا۔

اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ مذکورہ آیات روایات انسانوں کے بڑے بڑے معاشروں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو اس فیض نبوت کو وصول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور بعثت کے ضروری ہونے کے لیے جن عوامل کی ضرورت ہے وہ اُن معاشروں میں پائے جاتے تھے۔

البتہ معاشرہ شناس لوگ اور وہ لوگ جو گذشتہ اقوام کے حالات زندگی کے متعلق تحقیق کرتے ہیں وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ انسان کی سب سے قدیم اور دیرینہ فکر خُدا اور اُس کی عبادت کے متعلق غور وفکر ہے (چاہے وہ حقیقی خُدا ہو یا جھوٹا) یہ فکر جیسے کہ بیرونی دعوت سے پھوٹ سکتی ہے اس کا سرچشمہ فطری اور باطنی دعوت کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہر حال پہلی رائے اور احادیث سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

(۹) انبیاء اور میثاق الٰہی

زیر نظر آیات کی فہرست

۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ﴿۸۱﴾ (آل عمران۔۸۱)

۲۔ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ﴿۶﴾ (الصف۔۶)

۳۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴿۱۴۶﴾ (بقرہ۔۱۴۶)

۴۔ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ (مائدہ۔۴۸)

۵۔ وَالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ﴿۳۱﴾ (فاطر۔۳۱)

۶۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۣالْمُرْسَلِیْنَ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ﴿۱۰۶﴾ (شعراء۔۱۰۵۔۱۰۶)

۷۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا﴿۷﴾ (احزاب۔۷)

۸۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶
اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝۲۷
لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ
عَدَدًا ۝۲۸ (الجن۔ ۲۶ تا ۲۸)

آیات کی تفسیر

قرآن آیات کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء سے تین طرح کے پیمان لیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر پیمان ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہے۔ آیات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ان سے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ بعد میں آنے والے انبیا پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا

بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے گذشتہ انبیاء سے بڑی تاکید سے یہ پیمان لیا ہے کہ جب بھی کوئی نبی ان کے بعد آئے وہ ان کی شریعت کی بھی تصدیق کرنے والا ہو تو اس پر ضرور ایمان لائیں اور اُس کی مدد کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱

انبیا سے لیے گئے اُس پیمان کو یاد کرو جب ہم نے انہیں کتاب وحکمت عطا کی۔ پھر ایک رسول آیا جس نے اُس چیز کی طرف تصدیق کی جو تمہارے ساتھ ہے (اور تم سے وعدہ لیا) کہ اُس پر ایمان لانا اور اُس کی مدد کرنا (پھر خُدا نے انبیاء سے) کہا: کیا تم نے اِس کا اقرار کیا ہے (اور اپنی اُمتوں سے بھی اس طرح کا بیان لیا ہے؟) تمام نے کہا: ہاں ہم نے اقرار کیا۔ خُدا نے فرمایا: تم گواہ رہنا میں بھی اس پر گواہ ہوں میں سے ہوں۔ (آل عمران۔ ۸۱)

خُدا نے انبیاء اور ان کی امتوں سے بعد میں آنے والے نبی کی تصدیق اور اُس کی مدد کرنے کا کس طرح سے وعدہ لیا: اِس کے لیے ہم آیت کے مختلف حصوں کی تفسیر کرتے ہیں۔

ا۔ ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ'' ''نبیین'' سے مُرادوہ انبیاء ہیں جن سے وعدہ لیا گیا ہے مُرادوہ انبیاء نہیں ہیں جن کے لیے وعدہ لیا گیا ہے۔اِس بات پر گواہ مندرجہ ذیل آیت ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

''ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ'' کیا تم نے اقرار کیا اور اپنی امت سے بھی اس امر کا وعدہ کیا؟ لہٰذا آیت کے ابتدا میں جس نبی کا تذکرہ کیا گیا۔اور جس نبی کا ذکر آیت کے آخر میں آیا ہے وہی ہے جس کے لیے میثاق لیا گیا ہے اُس سے کسی کے لیے میثاق نہیں لیا گیا۔

وہ انبیاء کہ جو درمیان میں آئے ہیں ان سے دوسرے انبیاء کے لیے پیمان لیا گیا ہے اور دوسروں سے بھی ان کے لیے پیمان لیا گیا ہے۔اس تفصیل کی دلیل قرآن کا یہ فرمان ہے کہ:

ہر نبی سے دو وعدے یا دو چیزوں سے متعلق ایک ہی وعدہ لیا گیا ہے:

ا۔ایمان کا وعدہ (لتومنن به)

۲۔مدد کا وعدہ (لتنصرن نه)

یہ دو پیمان یا ایک پیمان جو کہ دو چیزوں پر مشتمل ہے اُن پیغمبروں کے بارے میں ہی سوچے جا سکتے ہیں جو سلسلہ انبیاء کے وسط میں واقع ہیں نہ کہ اول یا آخر میں۔لہٰذا جب بھی کوئی پیغمبر اس سلسلے کے درمیان میں واقع ہونے والے پہلے نبی کی زندگی میں ہی مبعوث ہو جائے تو پہلے پیغمبر کی یہ ذمہ داری ہے کہ پہلے وہ اپنی اُمت سے اس پر ایمان اور اس کی مدد کا وعدہ لے۔اس کے مبعوث ہونے کے بعد ضروری ہے کہ اُس پر ایمان لائیں اور اُس کی مدد کریں۔

زیر نظر آیت کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ تمام گذشتہ انبیاء اور ان کی امتوں سے یہ وعدہ لیا گیا ہے کہ بعد میں آنے والے انبیاء پر ایمان لائیں اور اُن کی مدد کریں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی امتوں سے پیغمبر اسلام کے متعلق بھی ایسا وعدہ لیا گیا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی کے ارشادات میں بھی ایک ایسے وسیع پیمان کی تصریح ہوئی ہے۔آپ ارشاد فرماتے ہیں:

بَعَثَ اللّٰہُ مُحَمَّدًا رَّسُوْلَ اللّٰہِ لِاَنْجَازِ عِدَتِہٖ وَاِتْمَامِ نُبُوَّتِہٖ مَاْخُوْذًا عَلَی النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقُہٗ مَشْھُوْرَۃً سِمَاتُہٗ، کَرِیْمًا مِّیْلَادُہٗ۔ [1]

خُدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا تا کہ اپنے وعدے کو پورا کردے اور سلسلہ نبوت کو اختتام تک پہنچا دے جب کہ تمام انبیاء سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق عہد و پیمان لیا گیا تھا۔آپ کی علامات مشہور اور آپ کا تشریف لانا بابرکت تھا۔

[1] نہج البلاغہ خطبہ ا

۲۔ ’’ءَ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ ‘‘۔ یہ جملہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایسا پیمان نہ فقط یہ کہ انبیاء سے لیا گیا ہے بلکہ اُن کی اُمتوں سے بھی اس طرح کا وعدہ لیا گیا ہے۔ اس پر گواہ ہوا آخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ کا جملہ ہے۔

۳۔ ’’قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ‘‘ لیکن جواب میں فقط انبیاء کے وعدے کی بات کی گئی ہے نہ کہ انکی امتوں سے لیے گئے وعدے کی بھی۔ گویا پیمان کے ایک حصے کی بات کی گئی ہے نہ کہ دوسرے کی بھی اِس میں کیا نکتہ ہے؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعد میں آنے والے جملے نے اس کی جگہ بھی پوری کر دی ہے۔ وہ جملہ یہ ہے:

۴۔ ’’قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ‘‘۔ اب جب کہ خدا اور انبیاء دونوں گواہ ہیں تو ضروری ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جن پر یہ گواہی دی جا رہی ہے اور وہ ہر نبی کی اُمت کے لوگ ہی ہیں۔ اگر اُمت کے متعلق ایسا نہ ہو تو شاہد، مشہود علیہ کے بغیر رہ جائے گا۔۔

یہاں تک ہم نے آیت کے مختلف حصوں کی تفسیر بیان کی۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم بھی شامل تھے اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اس آیت میں انبیاء کے جس وعدے کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک کلی اور عمومی وعدہ ہے۔ اب ہم ان آیات کو بیان کرتے ہیں جو گذشتہ انبیاء کے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ایمان کا تذکرہ کرتی ہیں۔

قرآن نے واضح طور پر یہ بات بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیغمبر خاتم کے آنے کی خوش خبری سنائی ہے:

وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝۶

حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا: میں ’’احمد‘‘ نامی پیغمبر (کے آنے) کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا لیکن انہوں نے اس بات کو واضح جادو قرار دیا۔ (صف۔۶)

ایک اور آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ انبیاء نے حضرت رسول اکرم کے بارے میں اتنا بتایا تھا کہ اہل کتاب آنحضرت کی جسمانی خصوصیات تک کو بھی ویسے ہی جاننے لگے تھے جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَـقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۴۶

جنہیں ہم نے کتاب دی وہ پیغمبر کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں اور اُن میں سے ایک جماعت حق کو جاننے کے باوجود چھپاتی ہے۔ (بقرہ۔۱۴۶)

’’یعرفونہ‘‘ کی ضمیر آیت کے سیاق وسباق کے پیش نظر پیغمبر کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ کتاب کی طرف کیونکہ بیٹوں کی طرح پہچانے

کے ساتھ تشبیہ دینے کا تقاضا یہی ہے کہ وہ پیغمبر کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے تھے نہ کہ کتاب کو۔

کیونکہ یہ کہنا کچھ مروج اور مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ میں فلاں کتاب یا گھر کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتا ہوں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ میں فلاں آدمی کو ایسے پہچانتا ہوں جیسے میں اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہُوں۔

حاصل کلام

تمام گذشتہ انبیاء اپنے سے بعد میں آنے والے انبیاء پر ایمان بھی لاتے رہے ہیں اور ان کی مدد بھی کرتے رہے ہیں۔ دنیا سے اِٹھتے وقت اپنی امت کو ان دونوں چیزوں کی طرف بلاتے رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام کے سلسلے میں اس عمومی پیمان کے علاوہ ایک خصوصی پیمان بھی اُن سے لیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی آیات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

اس موقع پر ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ ''ثُمَّ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مُعَكُمْ'' کے جملے سے مراد آنحضرت ہوں نہ کہ وہ سارے نبی جو سلسلہ انبیاء کے درمیان میں واقع ہیں گو یا خُدا نے پہلے دن سے ہی آنحضرت پر ایمان لانے اور اُن کی مدد کرنے کا وعدہ لیا ہے اور امتوں کو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی مدد کرنے کی طرف بلایا ہے اگر چہ یہ بات ایک کلی اور عمومی انداز میں لفظ ''رسول'' کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

ا۔ امیر المومنین حضرت علی فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ اَخَذَ الْمِيْثَاقَ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ قَبْلَ نَبِيِّنَآ اَنْ يُّخْبِرُوْٓا اُمَمَهُمْ بِمَبْعَثِهٖ وَرِفْعَتِهٖ وَيُبَشِّرُوْهُمْ بِهٖ وَيَاْمُرُوْهُمْ بِتَصْدِيْقِهٖ [1]

خُدا نے ہمارے نبی کی بعثت سے پہلے انبیاء سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اپنی امتوں کو اُس کی بعثت کے مکان اور مقام سے آگاہ کریں اور اس کے آنے کی خوش خبری دیں اور اپنی امت کو اُس کی تصدیق کرنے کا حکم دیں۔

۲۔ طبری اور سیوطی نے امیر المومنین کے اس ارشاد کی حکایت کی ہے کہ:

خُدا نے آدم کے زمانے سے لے کر آج تک کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ اُس سے آنحضرت کے بارے میں وعدہ لیا۔ اگر وہ تمہاری زندگی میں مبعوث ہوئے تو ان پر ایمان لاؤ اور اُن کی مدد کرو، اور ہر نبی کو یہ حکم دیا کہ اپنی امت سے بھی آپ کے متعلق پیمان لے۔ امام نے یہ جملات کہنے کے بعد اس آیت کی تلاوت کی:

[1] مجمع البیان، مطبوعہ صیدا ج ۲ ص ۴۶۸

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ... [۱]

۲۔تمام پیغمبروں سے پیمان

جس عہد و پیمان کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔اس کی دو خصوصیات تھیں۔

ا۔گذشتہ انبیاء سے آئندہ آنے والے انبیاء کے متعلق پیمان اور وعدہ لیا گیا تھا۔

۲۔عہد و پیمان دو چیزوں سے متعلق تھا۔ایک ایمان اور دوسرے نصرت اور مدد سے متعلق۔

لیکن اب جس عہد و پیمان کا تذکرہ کیا جارہا ہے وہ دونوں اعتبار سے پہلے والے عہد و پیمان سے مختلف ہے کیونکہ ایک تو یہ آئندہ آنے والے انبیاء سے گذشتہ انبیاء کے متعلق ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اس میں صرف ایک ہی بات کا وعدہ لیا گیا ہے اور ان کی نبوت پر ایمان اور اعتقاد ہے۔یعنی تمام انبیاء سے یہ وعدہ لیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے پیغمبروں پر ایمان بھی لائیں اور ان کی شریعت اور کتاب کا بھی اپنی شریعت اور کتاب کی طرح احترام کریں۔اس عہد و پیمان کا راز بھی وحی اور آسمانی شریعتوں کے حقیقت میں ایک ہونے اور تمام انبیاء کے ایک ہی ہدف کی تکمیل کے لیے آنے میں مضمر ہے۔اس سلسلے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔اس عہد و پیمان کی طرف بھی کئی آیات میں اشارے کیے گئے ہیں جنہیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

ا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں تو انہوں نے گذشتہ انبیاء پر اپنے ایمان کا اظہار کیا اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ میں پہلے والی آسمانی کتاب کی تصدیق کرتا ہوں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ... [۲] (صف۔۶)

۲۔پیغمبر اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدۃ۔۴۸)

کتاب (قرآن) کو ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ نازل کیا جو کہ گذشتہ کتاب کی تصدیق کرنے والا اور اس پر حاکم ہے (اختلاف کے وقت یہ کتاب حجت ہے)۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] تفسیر طبری ج ۳ ص ۲۳۷،درمنثور ج ۲ ص ۴۷ فخر رازی نے اس حدیث کو مفاتیح الغیب ج ۲ ص ۵۰۷ پر ذکر کیا ہے اور طبرسی نے البیان ج ۲ ص ۴۶۸ پر اسے ذکر کیا ہے۔

[۲] سورہ آل عمران آیت ۵۰ اور سورہ مائدہ آیت ۴۶ میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱

وہ کتاب جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے وہ حق ہے اور پہلے کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے بے شک خُدا آگاہ اور بصیر ہے۔[1] (فاطر۔۱۳)

یہ آیات اگر چہ حضرت عیسیٰ اور رسول اسلام کے بارے میں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پہلے انبیاء کی تصدیق کرنے والا ہے۔لیکن اِس بات کے پیش نظر کہ اس لحاظ سے ان دونوں نبیوں کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام بعد میں آنے والے انبیاء سے پہلے آنے والے انبیاء کے متعلق ایسا وعدہ اور پیمان لیا گیا ہے کہ وہ ان کی تصدیق کریں۔تمام انبیاء کے ایک دوسرے پر ایمان لانے اور ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرنے کی حکمت شاید یہ ہو کہ الہٰی اہداف کی تکمیل اُن کی آپس میں ہم آہنگی اور اتحاد سے ہی امکان پذیر ہے۔ان کی تبلیغ اور ہدف میں ہم آہنگی سے ہی یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔قرآن ایک پیغمبر کے جھٹلانے کو تمام انبیاء کو جھٹلانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔مثلاً قومِ نوحؑ کہ جس نے صرف اپنے نبی کو جھٹلایا تھا انہیں تمام انبیاء کو جھٹلانے والی قوم قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۰۵ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۰۶ۚ

(شعراء)

جب نوح نے اپنی قوم سے کہا کہ تم گناہوں سے پرہیز کیوں نہیں کرتے ہو۔ان کی قوم نے انبیاء کی تکذیب کی۔

۳۔وحی کے پہنچانے میں امانت کا وعدہ

یہاں انبیاء سے ایک اور عہد و پیمان بھی لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ الہٰی مکتب کے ان معلمین کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحی حاصل کرنے کے بعد اسے اچھی طرح یاد رکھیں اور آگے لوگوں تک پہنچائیں۔بعض قرآنی آیات سے اِس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۷ۙ (احزاب۔۷)

جب انبیاء سے متعلق عہد و پیمان اُن سے لیا گیا نیز آپ سے نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے

---

[1] (احقاف۔۳۰) جہاں پر ارشاد ہوتا ہے: اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ نیز بقرہ۔۹۷،آل عمران۔۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۔ہم نے تمام سے ایک سخت عہد و پیمان لیا۔

اس آیت میں اگرچہ اُس چیز کا ذکر نہیں ہوا جس سے متعلق عہد و پیمان لیا گیا ہے لیکن اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اِس سے مُراد خُدا کا پیغام آگے پہنچانے اور اُسے آگے پھیلانے کے لیے پوری کوشش کرنا اور اس میں کسی قسم کا تصرف نہ کرنا ہے۔ تمام انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد پانچ نبیوں کے خصوصی طور پر نام ذکر کرنے کی وجہ اِن نبیوں کے مرتبے کی بلندی اور اُن کی ذمہ داری کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

البتہ یہاں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت ایمان (دوسرے پیمان) سے متعلق پیمان کو بیان کرتی ہے۔ لیکن اس بات کے پیش نظر کہ یہاں ''میثاق'' بطور مطلق ذکر کیا گیا ہے اور اس کے متعلق کو بیان نہیں کیا گیا یہ بہتر معلان ہوتا ہے کہ یہاں دونوں معانی مُراد لیے جائیں۔ یعنی ایمان سے متعلق وعدہ بھی اور وحی کو آگے پہنچانے کے سلسلے میں امانت داری کا عہد بھی۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝٢٦ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝٢٧ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝٢٨ (جن)

خُدا غیب (وحی) کو جانتا ہے (اور غیب کا علم ذاتاً خُدا کے ساتھ مخصوص ہے) پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا مگر برگزیدہ رسول کو کیونکہ خُدا اُس کے آگے اور پیچھے اُس پر نگہبان مقرر کرتا ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان انبیاء اور رسولوں نے خدا کی رسالتوں کو پوری طرح پہنچا دیا ہے اور جو کچھ اُن کے پاس ہے خُدا اُس پر احاطہ علمی رکھتا ہے اور ہر چیز کی تعداد کو جانتا ہے۔

اگرچہ اس آیت میں لفظ ''میثاق'' نہیں آیا لیکن اُس کی حقیقت کو یہاں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے آیت میں کلمہ ''میثاق'' کے اطلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی دلالت مقصد اور مدعی پر بالکل واضح ہے اس آیت سے ایک اور نکتے کا بھی استفادہ ہوتا ہے اور وہ وحی پہنچانے کے مرحلے میں انبیاء کی عصمت ہے۔ اس سلسلے میں آئندہ گفتگو کی جائے گی۔ امیر المومنین حضرت علیؑ انبیاء سے اس عہد و پیمان لینے کے متعلق یُوں فرماتے ہیں:

وَاصْطَفٰى سُبْحٰنَهٗ مِنْ وُّلْدِهٖ اَنْبِيَآءَ ۔ اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ وَعَلٰى تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ ۔ [1]

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد میں کئی پیغمبروں کو چنا اور وحی لینے اور خُدا کے پیغام کو آگے پہنچانے سے متعلق اُن سے امانت داری کا وعدہ اور پیمان لیا۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱

۱۰۔ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف (اٰل عمران۔ ۱۹)

۲۔ مَا کَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ط وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۶۷﴾ (اٰل عمران۔ ۶۷)

۳۔ وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ط یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (بقرۃ۔ ۱۳۲)

۴۔ وَجَعَلَهَا کَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ (زخرف۔ ۲۸)

۵۔ وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ط تِلْکَ اَمَانِیُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ (بقرۃ۔ ۱۱۱)

۶۔ وَقَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ط قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ط (بقرۃ۔ ۱۳۵)

۷۔ بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص (بقرۃ۔ ۱۱۲)

۸۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ج لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ صلے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ (بقرۃ۔ ۱۳۶)

۹۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج (بقرۃ۔ ۱۷۷)

۱۰۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ (بقرۃ۔۲۸۵)

تفسیر آیات

خداوندِ کریم کی حکیمانہ مشیت یہ ٹھہری کہ بشر کو جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے وہ صرف ایک دین قرار دے۔ اس کی تبلیغ کے لیے پیغمبروں کو بھیجے۔ یہ دین وہی دینِ اسلام ہے جو پہلے دن سے ہی انبیاء کی تبلیغ کا محور رہا ہے۔ تمام انبیاء اس کی تعلیمات کو ہی آگے پھیلانے کے لیے بھیجے جاتے رہے ہیں۔ قرآن درج ذیل آیات میں اس حقیقت کو بالکل کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے:

۱۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟

دین خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران۔۲۷)

۲۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی۔ وہ تو مسلمان تھے جو آئین توحید کے پیروکار تھے۔ اور وہ ہرگز مشرک نہ تھے۔ (آل عمران۔۶۷)

۳۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

ابراہیم اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو ابراہیم علیہ السلام کے راستے پر چلنے کی وصیت کی۔ اور یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا: خدا نے تمہارے لیے اپنے دین کو چنا ہے (بقرۃ۔۱۳۲)
کوشش کرو کہ اسلام کے بغیر اس دنیا سے نہ جانا۔

۴۔ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

اُس (ابراہیم) نے کلمہ توحید کو اپنی نسل میں ایک باقی رہنے والی سنت کے طور پر چھوڑا، شاید وہ خدا کی طرف لوٹ آئیں۔ (زخرف۔۲۸)

یہ آیات اور اسی طرح کی دوسری آیات یہ بتاتی ہیں کہ تمام آسمانی شریعتیں ایک دین واحد (توحید) کے بدن پر مختلف لباسوں کی

حیثیت رکھتی تھیں۔ خُدا نے صرف ایک ہی دین بنایا ہے۔ البتہ دین خُدا کے اول سے لے کر ازل تک ایک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام آسمانی شریعتیں ہر زمانے اور دور میں لائق اطاعت اتباع ہیں بلکہ اِس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ دین کے ایک ہونے کے باوجود شریعتیں مکمل طور پر مختلف ہیں یہ آسمانی شریعتیں تاریخ کے مختلف ادوار میں لوگوں کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق بھیجی جاتی رہی ہیں۔ حقیقت میں ان میں سے ہر ایک شریعت اپنی جگہ پر ایک کلاس تھی انسان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے تکامل کے لیے اس کلاس میں بیٹھے آخری امت کے لیے آخری کلاس ہے اور وہ وہی شریعت ہے جو پیغمبر گرامی اسلامؐ کے ذریعے سے دُنیا کے سامنے پیش کی گئی اگر ہم یہ کہیں کہ یہ تمام شریعتیں برحق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کلاس اپنے زمانے کے طالب علموں کے لیے مناسب ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ شریعت حق صرف محمدیؐ شریعت ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلی کلاسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ اب وہ اس کلاس میں آ جائیں۔ اگر اب بھی وہ گزشتہ شریعتوں کی پیروی کرتے ہیں تو یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایک طالب علم پچھلی کلاس سے التحصیل ہونے کے بعد دوبارہ اُسی کلاس میں جا بیٹھے ۔قرآن نے اس حقیقت کی طرف اِس آیت میں یوں اشارہ کیا ہے

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے گھاٹ اور راستہ مقرر کر دیا اور اگر خُدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت قرار دے دیتا۔ (مائدۃ۔۴۸)

گویا دین فیضان الٰہی کا وہ سرچشمہ ہے جو لوگوں کی طرف بہہ کر آ رہا ہے اور ہر آسمانی شریعت ہر امت کے لیے ایک ایسا خاص راستہ ہے جو اسے اس سرچشمے تک پہنچا رہا ہے۔ جس سے اُن کی روح اور فکر سیراب ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا آیات تمام آسمانی شریعتوں میں دین ایک ہی ہے کہ پیش نظر ایک اور مطلب بھی سامنے آتا ہے اور وہ تمام انبیاء پر ایمان لانے کے ضروری ہونے سے متعلق ہے کیونکہ بعض انبیاء پر ایمان لانے اور بعض کو جھٹلانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک شریعت کے کچھ حصے کو قبول کر رہے ہیں اور کچھ کا انکار کر رہے ہیں اور یہ بات درست نہیں ہے۔ لہذا تمام انبیاء پر ایمان لانے کی ایک دلیل آسمانی شریعتوں کی حقیقت اور پیغمبروں کی ذمہ داریوں کا محور ایک ہی چیز کا ہونا ہے۔

تمام انبیاء پر ایمان لانے کے ضروری ہونے پر دوسری دلیل آیات میثاق ہیں جن سے متعلق گذشتہ باب میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے کیونکہ جیسا کہ ہر نبی سے دوسرے انبیاء پر ایمان لانے سے متعلق عہد و پیمان لیا گیا ہے اسی طرح اُن کی امتوں سے بھی یہ ہی وعدہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر تیسری دلیل قرآن کی چند اور آیات ہیں جو اسی سلسلے میں ہی نازل ہوئی ہیں۔ اِس باب میں ہمارا اصل مقصد انہی آیات کی تفسیر بیان کرنا ہے۔ ان آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے ہم آپ کی توجہ اس نکتے کے طرف مبذول کراتے ہیں کہ:

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ غلط اور بے بنیاد عقیدہ تھا کہ اُن کے دین اور پیغمبر کے علاوہ کوئی دین بھی قابل قبول نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ سعادت اور نجات پا کر جنت میں جائیں گے جو ان کے پیغمبر پر ایمان لائیں گے اور اُس کی شریعت کی پیروی کریں گے۔ قرآن اس سلسلے میں

یُوں کہتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ بہشت میں صرف یہودی یا نصرانی ہی جائیں گے۔(بقرۃ۔۱۱۱)

وَقَالُوا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ

یہود و نصاریٰ کہتے تھے۔یہودی یا نصرانی بن جاؤ تا کہ ہدایت پا جاؤ۔(بقرۃ۔۱۳۵)

قرآن کریم نے اس بے بنیاد اور غلط اندازِ فکر کا ذکر کرنے کے بعد اس کے شدید مذمت کی ہے اور اسے بچگانہ اور فضول آرزوؤں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ (بقرہ۔۱۱۱)

وہ(عقیدہ) تو ان کی آرزو ہے کہہ دیجئے کہ اگر تم اِس عقیدے میں سے سچے ہو تو اِس پر بُرھان لے کر آؤ۔

اس کے بعد آسمانی شریعتوں کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (بقرۃ۔۱۱۲)

یعنی نجات کا عامل اور اخروی نعمتوں کا راستہ فقط خُدا کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا اور احکام الہٰی کو تسلیم کرنا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہر اُمت کے لیے اسلام اور احسان یہی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے پیغمبر پر ایمان لائیں، اُس کے دستورات اور احکامات کو خلوصِ دِل سے قبول کریں اور نیک کام کریں اور احسان کو اپنا وطیرہ بنالیں۔اہل کتاب پر یہ بات اُس وقت ہی صادق آسکتی ہے جب وہ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لائیں آپؐ کی شریعت کی پیروی کریں۔

اہل کتاب کے اس بے بنیاد عقیدے پر اصرار کے پیشِ نظر تمام انبیاء پر ایمان لانے سے متعلق زیادہ تر آیات اہل کتاب کی طرف زیادہ توجہ مبذول کر رہی ہیں۔یہ بات اِن آیات کی عمومیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

اب ہم اِن آیات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَآ أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ (بقرہ)

(اے پیغمبرؐ اور اے مسلمانو تم یہود و نصاریٰ سے) کہہ دو: ہم خُدا پر اور جو (قرآن) ہم پر نازل ہُوا ہے اور جو ابراہیم اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اسباط پر نازل ہُوا ہے اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء الٰہی کو دیا گیا ہے اُس پر ایمان رکھتے ہیں اُن پیغمبروں کے درمیان (ایمان کے لحاظ سے) ہم کسی کے فرق کے قائل نہیں ہیں اور ہم خُدا کے امر کے سامنے تسلیم ہیں۔ پس اگر وہ (یہود و نصاریٰ) اُس چیز پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پا جائیں گے اور اگر اس سے منہ موڑ لیں تو پھر وہ تم سے جھگڑیں گے اور جنگ کریں گے۔ جلد ہی خُدا تمہیں اُن کے شر سے نجات دے گا (تمہیں اُن پر غلبہ عطا کردے گا) وہ سننے والا اور دانا ہے۔

۲۔ دوسری آیت بھی تمام انبیاء پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتی ہے۔ یہ سورہ آل عمران کی آیت ۸۶ ہے چونکہ یہ آیت سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۶، جسے پہلے ذکر کیا ہے، کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور یکساں ہے لہذا اسے الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے

۳۔ اس سلسلے کی تیسری آیت یہ ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (بقرہ۔ ۱۷۷)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے رُخ مشرق او مغرب کیطرف پھیر [1] لو لیکن نیکوکار (نیکی اُس شخص کی نیکی ہے) وہ ہے کہ جو خُدا، قیامت، ملائکہ آسمانی کتابوں اور انبیاء الٰہی پر ایمان لائے۔

[1] مشرق کی طرف منہ کرنے سے مراد مدینے کے عیسائیوں کا نماز کے وقت مشرق کی طرف رُخ کرنا ہے اور مغرب سے مُراد مدینے کے یہودیوں کا بیت المقدس کی طرف منہ کرنا ہے۔ یہ آیت قبلہ کے بیت المقدس سے کعبے کی طرف تبدیلی کے بعد نازل ہوتی ہے کیونکہ اس تبدیلی کے بعد قبلہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک مستقل بحث کا موضوع بن گیا گو یا خُدا سے متعلق اہم ترین مسئلہ نماز کا پڑھنا تھا اور وہ بھی مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر کے۔ اسی لیے اس آیت نے ایمان کے بنیادی ارکان اور سعادت و نجات کے اہم ترین عوامل کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے بے بنیاد طرز تفکر اور عقیدے پر بھی کاری ضرب لگی ہے۔ (مجمع البیان ج ۱ ص ۲۶۳)

اس آیت میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں لفظ ''کتاب'' کو بطور مفرد ذکر کیا گیا ہے۔ جمع کا کلمہ یعنی ''کتب'' استعمال نہیں کیا گیا ۔اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تمام آسمانی کتابوں کی روح اور جان ایک ہی ہے۔ تمام الٰہی شریعتیں عقیدہ توحید اور معاد پر استوار ہیں۔ بہر حال اِس آیت میں تمام آسمانی کتابوں اور تمام پیامبروں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی انسان نیک لوگوں کے زمرے میں شمار ہوسکتا ہے۔

۴۔ چوتھی قرآنی آیت جو اِس قرآنی اصول (تمام انبیاء پر ایمان لانے کے ضروری ہونے) کو بیان کرتی ہے وہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۵ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟

رسول خاتم اُس پر ایمان لائے ہیں جو اُن پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہُوا ہے اور تمام مومنین (اسکے پیروکار) خُدا، ملائکہ، کتب الٰہی اور پیامبران الٰہی پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم (پیغمبروں پر ایمان لانے کے سلسلے میں) اُن کے درمیان کسی فرق کے قائل نہیں ہیں (اور ہم ان تمام پر ایمان رکھتے ہیں)۔ (بقرہ۔ ۲۸۵)

ان آیات کے مجموعی مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن نے تمام انبیاء پر ایمان لانے کی بہت تاکید کی ہے۔ اِس لحاظ سے اُن کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں۔ ان آیات کا محور اگر چہ اُمت اسلامی اور گذشتہ انبیاء پر ایمان لانا ہے جس سے یہ بعد والے انبیاء کے بارے میں نہیں ہے لیکن دو باتوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام انبیا پر ایمان رکھنے کے ضروری ہونے والا قانون گذشتہ باب اُمتوں کے بعد میں آنے والے پیغمبروں پر ایمان رکھنے کے بارے میں بھی ہے۔

۱۔ آیات میثاق جو کہ گذشتہ باب میں بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ ''میثاق'' سے متعلق آیات کا مفہوم یہ تھا کہ ہر ایک پیغمبر سے یہ عہد و پیمان کیا گیا ہے کہ وہ بعد میں آنے والے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اپنی اُمت سے بھی بعد والے پیغمبر پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کا وعدہ اور عہد و پیمان لے۔

۲۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ان میں سے اکثر آیات یہود و نصاری کے اُس زعم باطل کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دین مقبول اور نجات کا راستہ فقط موسیٰ اور عیسیٰ پر ہی ایمان لانا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اپنے اس خیال باطل میں اُن کی نظر بعد میں آنے والے نبی پر تھی نہ کہ گذشتہ نبی پر۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرتؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور عیسائی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ساتھ پیغمبر اِسلام پر بھی ایمان نہیں رکھتے تھے۔ قرآن نے اس غلط طرز تفکر کا مقابلہ کیا اور یہ اعلان فرمایا کہ ایک پیغمبر پر ایمان لانا اور دوسرے پر نہ لانا (چاہے وہ پہلے والا پیغمبر ہو یا بعد والا) کامل ایمان نہیں ہے۔ خُدا کی بارگاہ میں اِس طرح کا ایمان قابل قبول نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ پیغمبرانِ الٰہی پر ایمان کے سلسلے میں تبعیض وتفریق ایک پیغمبر کے آئین اور شریعت میں تبعیض کے مترادف ہے۔جیسے دوسری تفریق نامعقول اور ناپسندیدہ ہے۔اسی طرح پہلی تفریق بھی غلط اور باطل ہے۔

اِس قرآنی قانون کا فلسفہ بھی گذشتہ بیان سے واضح ہو گیا۔تمام آسمانی شریعتوں کی روح اور جان ایک ہی ہے۔بعد میں آنے والی شریعت گذشتہ شریعت کو ہی تکمیل اور کمال کی منزل تک پہنچاتی ہے۔لہذا سابق یا لاحق شریعت پر ایمان نہ لانا حقیقت میں اُس شریعت کی روح اور حقیقت کے بھی منافی ہے جس پر ظاہری طور پر ایمان لایا گیا ہے۔

۱۱۔ انبیاء کی تعداد

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ (مومن۔ ۷۸)

۲۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا (بقرۃ۔ ۲۴۶)

۳۔ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِیَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ (بقرۃ۔ ۲۵۹)

۴۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ (کھف۔ ۶۵)

۵۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ (ال عمران۔ ۱۹)

۶۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ (مائدۃ۔ ۴۸)

۷۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (شوریٰ۔ ۱۳)

آیات کی تفسیر

خُدا کی حکیمانہ مشیت۔ جیسے کہ پہلے بیان کی گئی ہے۔ یہ ٹھہری کہ وہ انبیاء بھیج کر انسان کو جادہ توحید کی طرف بلائے۔ نیز عادلانہ قوانین وضع کر کے وہ ان کے حقوق وفرائض اور حدود کار بھی متعین کر دے اور ان کے اندرونی میلانات کی صحیح سمت میں راہنمائی کرے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مسائل زیر بحث آ سکتے ہیں:

۱۔ پیامبرانِ الٰہی کی تعداد

۲۔ انبیاء کے زیادہ اور متعدد ہونے کی حکمت

۳۔ پیغمبروں کے اسمائے گرامی

۴۔ پہلا صاحبِ شریعت پیغمبر

مذکورہ مسائل جو حقیقت میں نبوت عامہ سے متعلق چند تاریخی مباحث کی حیثیت رکھتے ہیں ہم انہیں اِس باب میں مختصر طور پر بیان کریں گے۔

۱۔ پیامبرانِ الٰہی کی تعداد

قرآن نے انبیاء کی تعداد ذکر نہیں کی لیکن ضمنی طور پر اُس نے ان کی کثرت اور تعداد کے زیادہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ (فاطر۔ ۲۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا (النحل۔ ۳۶)

ارشاد ہوتا ہے:

وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ (الرعد۔ ۷)

ان آیات کا واضح معنی تو یہی ہے کہ ہر اُمت، قوم اور انسانی معاشرے میں پہلے دن سے لے کر پیغمبر اسلامؐ کے زمانے تک ہمیشہ خدا کی جانب سے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ ایک زمانے یا تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں اور اقوام کی کثرت سے یہ نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ خُدا کی جانب سے بہت سے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ اگر چہ قرآنی نکتۂ نظر سے ان کی تعداد متعین نہیں کی گئی لیکن روایات کی تعداد کوئی ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔

شیخ صدوق (ت ۳۰۶۔ م ۳۸۱) جو مشہور روایت شناس شیعہ ہیں، نے اپنی کتاب عقائد میں جو کہ روایات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے کہا ہے کہ:

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ۱۲۴۰۰۰ پیغمبر خُدا کی جانب سے مبعوث کیے گئے ہیں ۔ ہر پیغمبر کا ایک وصی اور جانشین تھا جسے وہ اپنے بعد ہدایت کی ذمہ داری سونپ دیتا۔ ہم اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ تمام کے تمام ایک برحق اور محکم پروگرام کے ساتھ خُدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ان کی بات خدا کی بات اور ان کا حکم خُدا کا حکم ہے۔ اسی طرح ان کی پیروی اور اطاعت خُدا کی مخالفت ہے۔ ان کی تمام باتیں خُدا کی جانب سے اور اُس کی وحی سے ہیں۔ اس سلسلہ انبیاء میں پانچ پیغمبر خاص مقام کے حامل ہیں ۔ چرخ نبوت کا محور وہ ہیں ۔ وہ تمام صاحب

شریعت تھے اور ہر ایک کی شریعت بعد والی شریعت کے ذریعے نسخ ہو گئی ہے۔ پانچ افراد یہ ہیں:

حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمدؐ۔

یہ اولوالعزم انبیاء ہیں۔ ان تمام پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ پیامبر خاتمؐ ان کے سردار اور ان سب سے اعلیٰ و افضل ہیں۔ آپ آئین حق کے کر آئے ہیں اور آپؐ نے گذشتہ انبیاء کی تصدیق کی ہے۔

''اعتقادات'' میں شیخ صدوق کی یہ گفتگو اُن روایات کا خلاصہ اور نچوڑ جو اس سلسلے میں منقول ہیں اگر یہ روایات متواتر ہوں یا قرآن کے ساتھ نقل ہوئی ہوں تو عقیدے کی بنیاد اور اساس واقع ہو سکتی ہیں۔

۲۔ کثرت انبیاء کی حکمت

انبیاء کی تعداد کے زیادہ اور کثیر ہونے کا فلسفہ اور حکمت بالکل واضح ہے۔ مجموعی طور پر ان دو عوامل کو انبیاء کی تعداد کے زیادہ ہونے کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے:

۱۔ انسان کے تکامل اور حالات کی دگرگونی

۲۔ قوموں اور ملتوں کا الگ الگ ہونا

انسان نے مختلف تاریخی ادوار میں اپنے کمال کا سفر جاری رکھا ہے۔ اُس کی فکر اور دانش کا معیار بتدریج بلند ہوتا گیا ہے۔ قدیم انسان فکر و نظر کی اُس بلندی اور وسعت کا حامل نہیں تھا جو جدید انسان کو حاصل ہے۔ یہ تو ایک طرف جب کہ دوسری طرف مختلف تاریخی ادوار میں اور مختلف جغرافیائی حالات میں زندگی کے تقاضے الگ الگ رہے ہیں۔ اخلاقی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور دوسرے پہلوؤں سے حالات مختلف رہے ہیں۔ ان مشکلات و مسائل کے حل کے لیے بھی طبعی طور پر خاص پروگراموں کی ضرورت تھی۔ اسی وجہ سے انسانی معاشروں کے مختلف مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے مختلف ادوار میں خُدا کی طرف سے پیغمبر بھیجے جاتے رہے ہیں۔ انبیاء زیادہ ہونے کا ایک سبب بھی یہی ہے۔

ایک ہے زمانے اور تاریخی دور میں ابنیاء کے زیادہ ہونے کے لیے جو ایک اور عامل ہے وہ قوموں اور انسانی ملتوں کا الگ الگ جگہ پر رہنا ہے۔ دوسری طرف آپس میں رابطے کے بھی کوئی وسائل نہ تھے۔ بعثت کی عمومیت کے ضروری ہونے پر جو دلائل ہیں ان کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام قوموں اور انسانی معاشروں میں انبیاء کا مبعوث ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا تاریخ کے ایک دور میں بھی اور مختلف ادوار میں بھی خُدا کی جانب سے متعدد انبیاء بھیجے گئے ہیں۔ اب یہ بعثت کا یہ سلسلہ پیغمبر اسلامؐ پر آ کر کیوں ختم ہو گیا، یعنی نبوت کا کیا راز ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔ ہم نے اسے اپنی عربی کی تفسیر ''مفاہیم القرآن'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے[1]

---

[1] مفاہیم القرآن، ج ۳ ص ۷۲، ۱۸، ۳ ''خاتمیت'' سے متعلق باب کا ترجمہ فارسی میں ہمارے دوست جناب آقا استادی نے کیا ہے جو کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

۳۔قرآن میں انبیاء کے اسمائے گرامی

قرآن نے جیسے انبیاء کی کثرت کو ضمنی طور پر بیان کیا ہے اسی طرح یہ بھی کہا ہے کہ ان میں سے بعض کی سرگذشت تو قرآن نے بیان کی ہے۔اور بعض کے حالات زندگی بیان نہیں کئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ ؕ

ہم نے پہلے کئی پیغمبر بھیجے ۔بعض کی سرگذشت تو ہم نے آپ کے لیے بیان کی ہے اور بعض کی نہیں ۔(مومن۔۷۸)

قرآن میں چھبیس (۲۶) سے زیادہ انبیاء کے نام ذکر نہیں ہوئے۔[1]

آدم علیہ السلام،نوح علیہ السلام، ادریس علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام،لوط علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، الیسع علیہ السلام، ذوالکفل علیہ السلام، الیاس علیہ السلام، یونس علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، اسماعیل صادق الوعد[2] عیسیٰ علیہ السلام، محمدؐ

البتہ بعض پیغمبروں کے دو نام ہیں جیسے ذوالکفل وہی یوشع بن نون ہیں اور یعقوب وہی اسرائیل ہیں یونس وہی ذوالنون اور عیسیٰ وہی مسیح ہیں۔پیغمبر اسلام کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ''احمد'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کہا گیا ہے یہاں تک کہ بعض کے نزدیک ''یٰس''، ''طٰہٰ'' جیسے الفاظ بھی آنحضرت کے اسمائے گرامی ہیں۔اِس بات کا احتمال بھی ہے کہ یہ الفاظ حروف مقطعہ میں سے ہوں۔

بعض انبیاء کے باقاعدہ قرآن میں نام آنے کے ساتھ ساتھ بعض کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ نبی اسرائیل (کے وڈیروں) کی ایک جماعت نے اپنے پیغمبر سے کہا: ہمارے لیے ایک کمانڈر مقرر کرو۔(بقرۃ۔۲۴۶)

---

[1] بحار الانوار ج ۱۱ باب ۱، روایات ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۴۳، ۴۸، ۶۱، ۶۷، ۶۸، کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] علامہ طباطبائی مرحوم نے اسماعیل صادق الواحد اور حضرت ابراہیم کے فرزند اسماعیل کو دو الگ شخصیتیں قرار دیا ہے۔ پہلے والے اسماعیل حضرت حزقیل کے بیٹے ہیں جو خُدا کے پیغمبر تھے اور جنہوں نے تبلیغ حق کی راہ میں بہت سی مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا، یہاں تک کہ ان کی قوم نے ان کے چہرے اور سر کی کھال تک اُتار دی (المیزان ج ۱۴ ص ۶۷)

مفسیرین کا کہنا ہے کہ اس نبی سے حضرت شمعون یا یوشع بن نون یا اشموئیل (اسماعیل) مُراد ہیں۔[1]

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَۃٍ وَّهِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا ۚ

یا اُس شخص کی طرح جو ایک ایسی بستی کے پاس سے گزرا کہ جس کی چھتیں گری پڑی تھیں۔(بقرۃ۔۲۵۹)

اس سے مُراد ''عزیز'' یا ''ارمیا'' یا ''خضر'' ہیں۔[2]

پھر ارشاد ہوتا ہے:

فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَیۡنٰهُ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ﴿۶۵﴾

انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک کو پایا کہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی تھی اور اپنے پاس سے اُسے علم سکھایا تھا۔(کہف۔۶۵)

مفسرین کہتے ہیں اس عبد سے مراد ''حضرت خضرؑ'' ہیں۔[3]

۴۔صاحب شریعت انبیاء

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام انبیاء کا ہدف اور مقصد ایک ہی تھا اور وہ ہدف انسان کے عقیدے کی اصلاح، جبلی خواہشات میں توازن اور اجتماعی زندگی کے مختلف حالات میں اُس کی ہدایت اور اصلاح تھی۔ ہدف کے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دو چیزوں میں بھی متحد اور ہم آہنگ ہیں، ایک تو یہ کہ اُن تمام کی تعلیمات خُدا کی طرف سے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان تمام انبیاء کے پروگراموں کا محور عقیدہ توحید اور معاد ہے تمام انبیاء انسان کو توحید پرستی اور خُدا کے ارادے اور مشیت کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کی دعوت دیتے تھے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۟

اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔(ال عمران۔۱۹)

لیکن مذکورہ اہداف کی تکمیل کے لیے، نیز بشر کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تمام مراحل میں خدا کے سامنے تسلیم ہونے کی روح پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ چند خاص پروگرام اور احکام نازل ہوں۔ انہیں ''شریعت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہاں تک انبیاء کے مقاصد اور ان کی رسالت کی ذمہ داریوں کے درمیان رابطے سے متعلق دو چیزیں بیان کی گئیں ایک دین اور دوسری شریعت دین وہی اعتقادی اصول ہیں جن

---

[1] مجمع البیان ج ۱ ص ۳۵۰

[2] مجمع البیان ج ۱ ص ۳۷۰

[3] بحار الانوار ج ۱۱ باب ۱ حدیث ۶۵ میں بعض انبیاء کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔

کے لیے قرآن ''اسلام'' کی تعبیر استعمال کی ہے جب کہ اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین اور آدابِ زندگی سے متعلق تعلیمات کو قرآن نے شریعت کا نام دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط

ہم نے ہر ایک کے لیے خاص راہ وروشن قرار دی۔(مائدۃ۔۴۸)

یہ بات یقینی ہے کہ انبیاء کی رسالت کے دوران ''دین'' ایک ہی رہا ہے لیکن شریعتیں یکساں اور ایک نہیں تھیں۔گذشتہ شریعت کا کچھ حصہ بعد میں آنے والی شریعت کے ذریعے منسوخ ہوتا رہا ہے۔اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خُدا کی جانب سے مبعوث ہونے والے تمام انبیاء شریعت کے حامل تھے یا یہ کہ صرف چند ایک ہی صاحبِ شریعت تھے اور دوسرے اُن کی شریعت کو آگے پھیلانے والے تھے۔

اگر چہ سورہ مائدہ کی آیت ۴۸

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر صاحب شریعت تھا لیکن قرآن کی بعض دوسری آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صاحب شریعت انبیاء صرف پانچ تھے: نوحؑ، ابراہیمؑ ،موسیٰؑ ،عیسیٰؑ ،حضرت محمدؐ۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط

تمہارے لیے وہی دین تشریع کیا گیا جس کی نوح کو وصیت کی گئی تھی اور وہی کہ جو تیری طرف (اے پیغمبر اسلام) وحی کیا گیا ہے اور (وہی) کہ جس کی سفارش ہم نے ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، کو بھی کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور گروہ گروہ نہ ہو جاؤ۔(شوریٰ۔۱۳)

آیت کے آغاز میں پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے (شرع لکم)۔یہاں دین سے مُراد مبداء، معاد اور معارف جیسے ثابت امور اور عقائد نہیں ہیں کیونکہ اگر مُراد یہ ہوتے تو پھر صرف چند انبیاء کا ذکر نہ کیا جاتا کیونکہ یہ امور تو تاریخ میں تمام انبیاء کی رسالت کے رہے ہیں۔اس صورت میں یہ کہنا مناسب تھا کہ:

''شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ النَّبِيِّينَ مِن قَبْلِكَ''

لہٰذا یہاں دین سے مُراد شریعت ہے۔صرف چند انبیاء کے نام لیے گئے ہیں اور حضرت نوح سے پہلے کے کسی نبی کا نام نہیں لیا گیا ۔اس سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

ا۔صاحب شریعت انبیا پانچ تھے (نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمدؐ)

۲۔سب سے پہلے صاحب شریعت نبی حضرت نوحؑ تھے۔

اِس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی شریعت سے متعلق لفظ ''وحی'' (اوحینا) یعنی ہم نے وحی کی) استعمال ہُوا ہے جب کہ دوسرے انبیاء کی شریعتوں سے متعلق لفظ وصیت (وصی، سفارش کرنا) (اوصینا ہم نے سفارش کی) استعمال کیا گیا ہے۔شاید اس کی وجہ وہی ہو جسے علامہ طباطبائی نے بیان کیا ہے کہ کلمہ ''وصیت'' اُس جگہ پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر جس چیز کے بارے میں وصیت کی جا رہی ہو وہ خاص اہمیت کی حامل ہو۔گذشتہ انبیاء کی شریعتیں اپنے دور کے اہم امور کی طرف زیادہ توجہ دیتی تھیں۔اسی لیے ان کیلیے لفظ ''وصیت استعمال ہوا ہے جب کہ لفظ ''وحی'' ان تمام احکام کے بارے میں ہے جن کا سامنا فرد کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔یہ اہم اور غیر اہم تمام مسائل پر محیط ہے۔اسلامی شریعت کی جامعیت کے پیشِ نظر ہی یہ کلمہ ''وحی'' استعمال ہُوا ہے۔[1]

انبیاء کی تعداد اور ان کے تفاوت سے متعلق کئی اور سوالات بھی سامنے آتے ہیں لیکن انہیں یہاں بیان کرنا کلام کے طولانے ہونے کا باعث بنے گا۔اکثر متکلمین اور محدثین نے اس سلسلے میں حضرت ابوذر سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے،شیعہ اور سنی محدثین نے اسے ذکر کیا ہے۔ہم اِس حدیث شریف کا ترجمہ یہاں بیان کرتے ہیں۔اگر چہ یہ خبر واحد ہے اور عقائد کے دائرکار میں خبر واحد کافی نہیں ہوتی (جب کہ وہ مفید یقین نہ ہو)۔اس حدیث میں ابوذر آنحضرت سے سوال کرتے ہیں اور آپؐ جواب دیتے ہیں:

ابوذر : خُدا کی طرف سے کتنے پیغمبر آئے ہیں؟

آنحضرتؐ : ایک لاکھ چوبیں ہزار خُدا کی جانب سے مبعوث ہوئے ہیں۔

ابوذر : ان میں سے کتنے مرسل تھے؟

آنحضرت : ۳۱۳

ابوذر : سب سے پہلے نبی کون تھے؟

آنحضرت : حضرت آدمؑ

ابوذر : کیا وہ بھی مرسلین میں سے تھے؟

آنحضرت : ہاں

پھر آپؐ نے فرمایا:

چار پیغمبر سریانی زبان بولتے تھے اور وہ آدمؑ، شیثؑ، ادریس، اور نوحؑ ہیں۔ان میں سے چار پیغمبر عرب تھے اور وہ ہودؑ، صالحؑ، شعیب اور پیغمبر توحید حضرت محمدؐ ہیں۔ نبی اسرائیل میں سب سے پہلے نبی حضرت موسیٰؑ تھے اور آخری نبی حضرت عیسیٰ۔ان کے درمیان چھ سو

---

[1] المیزان ج ۱۸ ص۲۷

(۶۰۰) انبیاء آئے۔[۱]

ابوذر: کتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں؟

آنحضرتؐ: ایک سو چار کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں ادریس، ابراہیم کی کتابیں صحیفہ کے نام سے ہیں۔ تورات انجیل، زبور اور فرقان کو بھی اللہ نے نازل کیا ہے۔[۲]

البتہ حضرت ابوذر والی حدیث اس طرح کے سوالوں کے جواب میں ایک تفصیلی حدیث ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی احادیث ہیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی سوال کا جواب مہیا کرتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے حاشیہ میں ذکر شدہ احادیث کی طرف رجوع کیا جائے۔[۳]

---

[۱] مجلسی مرحوم نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ ۶۰۰ نبی حضرت عیسیٰ کے بعد بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے یہ احتمال دیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بڑے نبی تھے دگر نہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعداد چھ سو سے زائد ہے۔

[۲] بحارالانوار ج ۱۱ ص ۳۲ بحوالہ معانی الاخبار اور خصائل۔ دونوں شیخ صدوق کی معتبر کتابیں ہیں

[۳] بحارالانوار ج ۱۱ باب اول۔ احادیث ۲۱۔ ۲۵۔ ۳۳۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۶۱۔ ۶۷۔ ۶۸۔

(۱۲) نبوت ایک خدائی عطیہ ہے

علم کلام کی ایک قدیم بحث یہ ہے کہ آیا نبوت ایک عطیہ اور فیض خداوندی ہے یا کہ استحقاقی ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ نبوت ایک معنوی نعمت ہے کہ خُدا جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ (البتہ اُس شخص کی صلاحیت اور استعداد کے پیش نظر) جب کہ دوسرے متکلمین اسے استحقاقی سمجھتے ہیں۔ [۱]

یہاں دو باتوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ضروری ہے۔

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت ایک ایسا عظیم رتبہ اور مقام ہے جو خُدا کی جانب سے خاص خاص لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے چاہے ہم یہ کہیں کہ وہ نعمت خُدا کا عطیہ ہے۔ یا یہ کہیئے کہ اس انسان کی صلاحیت اور لیاقت یہ تقاضا کرتی ہے کہ خُدا اُسے ایسی نعمت سے نوازے۔ بہر حال رسول کی بعثت خُدا کا کام ہے۔ خُدا کا کوئی کام اُس کے حکیم ہونے کی وجہ سے عبث اور لغو نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں نظریوں کا لازمہ یہ نکلتا ہے کہ نبی بننے والے شخص کو اُس حقیقی اور واقعی معیار پر پورا اُترنا چاہیے۔

۲۔ کیا نبی میں وہ معیار اس حد تک موجود ہے جس کا تقاضا یہ بنتا ہے کہ خُدا کی جانب سے اُسے ایسا مقام عطا کیا جائے اس طرح کا ظلم ہوگا (استحقاق) یا یہ کہ اس معیار پر پورا اترنے کے باوجود اس نعمت کے حصول کے لیے صرف ایک راہ ہموار ہُوئی ہے اسی وجہ سے خُدا اِن کو یہ نعمت عطا کرتا ہے اور دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں (تفصیل)؟

دونوں نظریات کے مطابق جب تک اِن افراد میں ایک لیاقت اور صلاحیت پیدا نہ ہوجائے اُس وقت تک یہ نبوت کے شرف سے محروم رہتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ تفصیل کے قائل لوگوں کے نزدیک یہ معیار فقط ایک راہ ہموار کرتے ہیں جب کہ دوسری جماعت کے مطابق یہ معیار نبوت کے عطا ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اِن دونوں نظریات میں سے کون سا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے درج ذیل بیان سے یہ واضح ہوجائے گا۔

مقامِ نبوت ورسالت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ہر انسان کو عطا کردی جائے کیونکہ اِس مقام کا عطا کرنا کچھ ذمہ داریوں کا باعث ہے۔ جب تک افراد میں اِن ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت واستعداد نہ ہو تب تک یہ مقام انہیں عطا کرنا بے حاصل اور عبث کام ہوگا۔ اِس قانون کا تقاضا یہی ہے کہ خُدا کی طرف سے بھیجے جانے والے افراد میں اتنی صلاحیت اور لیاقت ہو کہ وہ اِس امانت (رسالت الٰہی) کو قبول کرسکیں اور پھر اسے جامہ عمل پہنا سکیں۔

ا۔ بعض استعداد اور لیاقت تو طبعی اور پیدائشی ہوتی ہے جو کہ وراثت یا کسی اور ذریعے سے پیغمبر تک منتقل ہوتی ہے جیسا کہ ایک بیٹا

---

[۱] شیخ مفید نے ''اوائل المقالات'' نامی کتاب میں صفحہ ۳۲ پر نبوت کو خُدا کا فضل اور فیضان قرار دیا ہے۔ انہوں نے اسے اہل اجابت اور فقہاء شیعہ کے درمیان مشہور بات کے طور پر بیان کیا ہے۔

والدین کی ظاہری صفات وخصائل کو میراث میں پاتا ہے اس طرح اُن کی روحانی لیاقت اور استعداد بھی وراثت کے ذریعے اس کی طرف منتقل ہوتی ہے۔لہٰذا انبیاء روح کی ترقی اور کمال کے لیے کچھ صلاحیتیں اپنے آباؤاجداد سے میراث میں پاتے ہیں۔

انبیاء کی زندگی کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ نیک اور صالح گھرانوں میں پیدا ہوئے انکی تربیت انہی گھرانوں میں ہوئی۔گویا روحانی کمالات نسل بہ نسل منتقل ہوتے رہے اور چند مراحل طے کرنے کے بعد وپ مکمل صورت میں مبعوث نبی میں جلوہ افروز ہوئے۔

البتہ فضائل کے پروان چڑھنے اور کمالات سے متصف ہونے کے لیے صرف وراثت ہی کافی نہیں ہے بلکہ وراثت کے ساتھ ساتھ تربیت کے اثر سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے کیونکہ تربیت بھی اندرونی اور فطری کمالات کو ہی پروان چڑھاتی ہے۔پیغمبروں کے سلسلے میں تو وراثت اور فطرت کے ساتھ ساتھ تربیت جیسا اہم عامل بھی موجود ہے۔امیرالمومنینؑ رسول اکرمؐ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِهٖ ۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ ۔ مِنْ لَّدُنْ اَنْ كَانَ فَطِيْمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِّنْ مَّلٰٓئِكَتِهٖ يَسْلُكُ بِهٖ طَرِيْقَ الْمَكَارِمِ [1]

جب پیغمبر نے دودھ چھوڑا تو خُدا نے اپنے سب سے بڑے فرشتے کو اُن کی راہنمائی کے لیے مقرر کیا تا کہ انہیں اخلاقی اقدار کے راستوں پر چلائے۔

ان دوقوانین (وراثت وتربیت) کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انبیاء میں چند کمالات اور صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔اس سلسلے میں رسالت اور نبوت سے پہلے خود انبیاء کی زحمت اور کوشش کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

ان کی ذاتی کوششیں اور روحانی اور اخلاقی ریاضتیں ان معنوی صفات کے کمال کے لیے ایک بہت اہم عامل کا کام دیتی ہیں جو صفات وراثت کے ذریعے ان تک منتقل ہوئی ہیں ایسی تربیت کے زیرسایہ انہیں تائید حاصل ہوتی رہتی ہے بلکہ اصولی طور پر اس سلسلے میں جسے ایک اختیاری عامل شمار کیا جاسکتا ہے وہ یہی خودسازی اور ریاضیت ہے۔

۲۔انبیاء نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی جب کہ وہ نفس اتارہ سے جہادومبارزہ کرسکتے ہیں یہ کام شروع کردیا۔انہوں نے نفس کے کمال کے لیے پوری پوری کوشش کی۔اس سلسلے میں یوسف صدیق کی زندگی کی داستان سے آگاہی ہی کافی ہے کہ انہوں نے گھر کا درواز بند ہونے کے باوجود نامحرم کو پیچھے دھکیل دیا اور نجات پائی۔اِس کشمکش سے ندس یقینا ایک خاص نورانیت اور پاکیزگی کا حامل ہوجاتا ہے۔پھر وہ عالم ملکوت میں اپنی درخشندگی ظاہر کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام تقریباً چالیس سال تک تزکیہ نفس اور شرعی ریاضت میں مصروف رہے۔انہوں نے ایسے کمالات حاصل کیے جن تک کسی انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی۔یہ اور اس طرح کی دوسری مثالیں انبیاء کی خاص صلاحیتوں کی تربیت کے سلسلے کو ایک قاعدہ کلیہ عطا کرتی ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ نمبر شمار ۱۹۲

اس طرح کی کوششیں کہ جو کمال آفریں ہیں انسانی روح میں کئی طرح استعداد پیدا کر دیتی ہیں جن کی وجہ سے وہ انسان دوسرے انسانوں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہی اس امر کا باعث بنتی ہے کہ امت کی راہنمائی اور تربیت کے لیے خُدا اس طرح کے افراد کا انتخاب کرے۔

علامہ طباطبائی نے یہاں ایک ایسی بات ذکر کی ہے جو اختیار سے باہر فقط ایک معیار کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ جو معیار اختیاری اور انسان کی توان میں ہے اس کا ذکر انہوں نے بالکل نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں:

خُدا نے پہلے دن سے ہی بعض انسانوں کو فطرت مستقیم اور معتدل خلقت پر پیدا کیا۔ یہ لوگ شروع سے ہی ایک ذہن فروزاں، فکر مستقیم، روح ظاہر اور قلبِ سلیم کے ساتھ پروان چڑھتے رہے۔ خلقت کی اس پا کیزگی اور طہارت نفس کی وجہ سے وہ ''اخلاس کی نعمت سے اس طرح بہرہ مند ہیں جیسے کہ دوسرے لوگ کوشش اور محنت سے اُس تک پہنچتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے قرآن نے ''مخلصون'' کا لقب استعمال کیا ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

ہم نے انہیں چن لیا اور صراط مستقیم کی طرف ان کی راہنمائی کی۔[1] (انعام۔۸۷)

جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کیا ہے انہوں نے ایک غیر اختیاری معیار کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ ان معیارات میں سے بعض اختیاری طریقے سے حاصل ہوتے ہیں۔

۳۔ انبیاء پر اس عظیم نعمت کے فیضان کا ایک تیسرا سبب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خُدا یہ جانتا ہے کہ اگر اس طرح کی عظیم معنوی نعمت ایسے افراد کو عطا کر دی جائے تو وہ اس کو اپنی اور معاشرے کی بھلائی اور فائدے کے لیے استعمال کریں گے۔ جب کہ دوسرے لوگ اس طرح نہیں کر پائیں گے۔ ممکن ہے وہ اس کو غلط راستوں میں ہی استعمال کرنا شروع کر دیں، الٰہی راستے میں اسے استعمال نہ کریں۔ یہ معیارات جن میں سے بعض غیر اختیاری (وراثت و فطرت) اور بعض اختیاری اور کسبی ہیں، اس طرح کے افراد کو عظیم نعمت عطا کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ خُدا کی یہ چناؤ لغو اور فضول نہ ہو بلکہ ایک حکیمانہ انتخاب ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک طرف تو خُدا کے کام حکیمانہ ہیں اور مقام نبوت کے لیے افراد کا چناؤ فضول یا کسی معیار کے بغیر نہیں ہے دوسری طرف خُدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسانوں کے لیے خود انہی میں سے راہنماؤں کا انتخاب کرے۔ ان افراد کو باقی لوگوں کی نسبت ایک برتری اور افضلیت کا حامل ہونا چاہیے معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہونا چاہیے۔ ہر انسان کا نفس چونکہ فی ذاتیۂ ہر قسم کے کمال اور فضلیت سے بِالفعل خالی ہے لہٰذا اِس کائنات کی پیدا کرنے والی ہستی کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو ان کمالات سے نوازے۔ لہٰذا انبیاء کے یہ کمالات بھی خُدا کے عطا کردہ ہیں۔

---

[1] المیزان ج ۱۱ ص ۱۷۷

یہ عوامل مجموعی طور پر بعض انسانوں کے انبیاء بننے کی دلیل بن سکتے ہیں۔ چونکہ ان عوامل کا ایک بڑا حصہ انسانی اختیار سے باہر ہے لہٰذا نبوت ایک ''استحقاقی'' امر نہیں ہوسکتا اب ضروری ہے کہ ہم ان دونوں نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر رکھیں اور اس سلسلے میں اُس سے راہنمائی لیں ۔قرآن نظریہ تفضّل کا طرفدار ہے۔

یہ بات مندرجہ ذیل امور سے سمجھی جاسکتی ہے:

ا۔نبوت اور انتخاب الٰہی

قرآن نے انبیاء کے سلسلے میں ''اصطفاء'' اور ''اجتباء'' کے کلمات استعمال کیے ہیں۔ یہ بات تو بن کہے ہی واضح ہے کہ انتخاب اور چناؤ کے الفاظ ''تفضّل'' سے ہم آہنگ ہیں نہ کہ استحقاق سے کیونکہ استحقاق کی بنیاد پر تو جو انسان بھی پیغمبری کے لیے ضروری معیار پر پورا اترتا ہو وہ خود بخود اپنے لیے یہ مقام متعین کرسکتا ہے اس کے لیے چناؤ یا انتخاب کی ضرورت نہیں رہتی۔[1] بعض انبیاء کا نام لینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

ہم نے ان کا چناؤ کیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی۔ (انعام۔۸۷)

پھر ارشاد ہوتا ہے؛

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ [2]

وہ (ان انبیاء کی جماعت جن کے نام پہلی آیات میں آئے ہیں) ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں خُدا نے اپنی نعمت عطا کی انبیاء جو کہ آدم کی اولاد سے اُن کی اولاد جو نوح کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اور ابراہیم اور اسماعیل کی اولاد سے تھے اور اُن کی اولاد کہ جن کو ہم نے ہدایت کی اور چن لیا۔(مریم۔۵۸)

بعض آیات میں انبیاء سے متعلق ''لفظ ''اصطفاء'' استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾

---

[1] لیکن ممکن ہے یہ کہا جائے کہ چناؤ اور انتخاب استحقاق کے ساتھ منافی تو نہیں ہے کیونکہ جو استحقاق کا قائل ہے وہ بھی یہ بات قبول کرتا ہے کہ انبیاء کا انتخاب خُدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے وہ تو اس انتخاب اور چناؤ کے حق دار ہیں۔

[2] اس آیت سے استدلال اس بات پر مبنی ہے کہ ''ممن ھدینا'' کے جملے کو ''من النبیین'' والے جملے پر عطف کریں نہ کہ اسے ایک الگ اور نیا کلام سمجھیں۔

خُدا فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول چنتا ہے۔ خُدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔[۱] (حج۔۷۵)

ب۔ خدا کی طرف سے خاص رہنمائی

خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے عمومی ہونے کے باوجود انبیاء کے سلسلے میں ایک خاص ہدایت کا ذکر ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاجۡتَبَيۡنٰهُمۡ وَهَدَيۡنٰهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۸۷﴾

ہم نے انہیں چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی ہدایت کی (انعام۔۸۷)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقۡتَدِهۡ ؕ

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خُدا نے ہدایت کی ہے پس اُن کی ہدایت کی پیروی کرو۔ (انعام۔۹۰)

چونکہ یہاں ہدایت کی نسبت خُدا نے اپنی طرف دی ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبوت کی نعمت ہی ہے جس میں ہدایت کے تمام مراحل شامل ہیں۔

ج۔ نبوت، نعمت، رحمت اور رزق خدا ہے

بعض آیات میں نبوت کو خُدا کی ایک رحمت اور بعض دوسری آیات میں رزق الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ بعض اور آیات میں اسے نعمت قرار دیا ہے۔ ان تمام الفاظ سے "تفضّل" کا آہنگ ہی پھوٹ رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ

اے میری قوم کیا تم دیکھتے ہو کہ میرے پاس اپنے خُدا کی جانب سے دلیل ہے اور اُس نے مجھے اپنی جانب سے رحمت عطا کی ہے[۲] (هود۔۸۲)

ایک اور آیت میں رحمت کے بجائے "رزق حسن" کی تعبیر لائی گئی ہے کہ جو نبوت کے لیے ہی کنایہ ہے ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَرَزَقَنِىۡ مِنۡهُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ

اُس نے کہا: اے قوم کیا تم دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس خُدا کی جانب سے شاہد اور گواہ ہے اور اُس نے

---

[۱] اجتباء" کے لیے مندرجہ ذیل آیات کی طرف رجوع کریں۔ حج۔۷۸، طہ۔۱۲۲، قلم۔۵۰۔ یوسف۔۶۔۔۔

[۲] یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶۳ میں بھی آیا ہے۔

مجھے نیک رزق عطا کیا ہے۔۔۔۔؟ (ھود۔۸۸)

شاید گذشتہ آیات میں ''انعم اللہ'' کی تعبیر لائی گئی ہے وہ بھی اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے۔ نیز نعمت سے مُرادنعمت نبوت ہی ہے یہاں اِس بات کی یاددہانی ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس طرح کا اختلاف نظر ایک لفظی اختلاف بھی ہوسکتا ہے نہ کہ حقیقی کیونکہ بعثت کے ضروری ہونے پر قائم شدہ دلائل یہ بتاتے ہیں کہ بشر کی ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ خُدا چند افراد کو بھیجے۔ اُس کی حکیمانہ مشیت کے پیش نظر ایسا ہونا ایک حتمی اور یقینی امر ہے

دوسری طرف مختلف انسانوں کے درمیان ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو مقام نبوت کے لائق اور مناسب ہو، برتر کے ہوتے ہوئے کم تر کو ترجیح نہ دی جائے۔

ان دو باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے لائق اور اہل افراد کا انتخاب ایک یقینی اور قطعی امر ہے۔ جو لوگ نبوت کو استحقاقی سمجھتے ہیں شاید اُن کی مراد بھی یہی ہو نہ یہ کہ اِن شرائط سے قطع نظر صرف اندرونی فضائل و کمالات اِس مقام نبوت کے حامل ہونے کا سبب بنتے ہوں۔

(۱۳) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ اول)

انبیاء کی عصمت اور متکلمین کا نکتہ نظر

۱۔ عصمت کے مراحل اور متکلمین کی آرا

عصمت کہ جو غلطی اور گناہ سے محفوظ ہونے کے معنی میں ہے کئی درجات اور مراحل رکھتی ہے۔

۱۔ وحی الٰہی کی تبلیغ کے سلسلے میں عصمت

۲۔ اِس مرحلے کے خود مزید تین مرحلے ہیں۔

(الف) وحی وصول کرنے کا مرحلہ

(ب) وحی یاد رکھنے اور اُس کی حفاظت کا مرحلہ

(ج) وحی آگے پہنچانے اور بیان کرنے کا ماحلہ

مرحلہ ''الف'' اور ''ب'' میں عمداً غلطی اور خطا کا تصور نہیں ہے۔ ان میں صرف سہو اور نسیان کا تصور آسکتا ہے۔ عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ پیغمبر ہر طرح کی غیر عمدی خطا (نسیان بھو) سے ان دونوں مرحلوں میں محفوظ ہو۔ اس سلسلے میں کوئی اختلافی رائے موجود نہیں ہے۔

لیکن مرحلہ ''ج'' میں سہواً غلطی کے ساتھ ساتھ عمداً غلطی کا تصور بھی آسکتا ہے اس طرح کہ وحی الٰہی کو چھپا لیا جائے اور اُسے آگے تک نہ پہنچایا جائے یا کہ اُس میں کچھ کمی بیشی کرکے آگے بیان کیا جائے۔ لیکن یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہاں پر بھی انبیاء کی عصمت ایک قطعی اور نا قابل شک بات ہے اس سلسلے میں بھی کوئی اختلافی رائے موجود نہیں ہے۔ صرف ایک اشعری عالم قاضی ابوبکر باقلانی کی طرف یہ نسبت دی گئی ہے۔ وہ تبلیغ کے سلسلے میں سہواً ''غلطی کو نبوت کے مقام اور مقاصد کے منافی قرار نہیں دیتے۔

۲۔ احکام الٰہی پر عمل میں عصمت

جیسا کہ انبیاء لوگوں تک خُدا کے احکام پہنچانے کی ذمہ داری رکھتے ہیں اسی طرح وہ خود بھی اِن احکام پر عمل پیرا ہونے کے مکلف ہیں۔ اس مرحلے میں عصمت کے تقاضے کے مطابق وہ خُدا کے احکام کے سامنے مکمل مطیع اور فرماں بردار تھے۔ کسی واجب کام کو ترک نہیں

کرتے تھے اور کسی حرام کام کے نزدیک نہیں جاتے تھے۔ اگرچہ اس مرحلے میں بھی انبیاء کی عصمت پر تمام متکلمین (سوائے حشویہ اور اصحاب الحدیث کے) کا اتفاق ہے لیکن اس کی کیفیت اور مراتب میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

ا۔ شیعہ متکلمین

ان کے نکتہ نظر کے مطابق عصمت کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ اس میں بعثت سے پہلے والا زمانہ بھی شامل ہے اور بعد والا بھی انبیاء گناہان کبیرہ سے بھی محفوظ ہیں اور صغیرہ سے بھی چاہے یہ عمداً ہو یا سہوًا اور چاہے یہ تاویل وغیرہ کی وجہ سے ہوں۔ [۱]

ب۔ حشویہ اور اصحاب الحدیث

یہ لوگ ہر قسم کے گناہ کو خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ بعثت سے پہلے ہو یا بعد میں عمداً ہو یا سہوًا پیغمبر کے لیے ممکن قرار دیتے ہیں۔ اس مرحلے میں گویا یہ عصمت کے مخالف ہیں۔ لیکن ایسے صغیرہ گناہوں کا ارتکاب جو باعث نفرت نہ بنتے ہوں انہیں نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی ممکن سمجھتے ہیں ان میں سے بعض صغیرہ گناہوں کے عمدی ارتکاب کو جائز قرار دیتے ہیں جب کہ بعض ایسا عمداً کرنا درست نہیں سمجھتے لیکن یہ گناہ کے معنی کی تاویل کر کے اسے جائز قرار دے دیتے ہیں۔

ج۔ معتزلی متکلمین کی اکثریت

یہ لوگ پیغمبر کو ہر اُس گناہ سے معصوم سمجھتے ہیں جو عام لوگوں کی نفرت کا باعث بنے چاہے وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ چاہے وہ بعثت سے پہلے ہو یا بعد میں۔

د۔ اشعری متکلمین کی اکثریت

ان کے نزدیک پیغمبر سے صغیرہ کبیرہ گناہ کا عمداً یا سہوًا البعثت سے پہلے سرزد ہونا جائز ہے لیکن نبوت کے بعد گناہ صغیرہ کو مطلقاً (عمداً اور سہواً) جائز نہیں سمجھتے اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو جائز سمجھتے ہیں اگر وہ سہواً سرزد ہوا ہو۔ لیکن اگر وہ عمداً ہو تو اسے جائز نہیں سمجھتے۔ [۲]

---

[۱] یہ فاضل مقداد کا قول ہے۔ لیکن شیخ مفید یہ کہتے ہیں کہ نبوت سے پہلے ایسے صغیرہ گناہوں کی بجا آوری جو فاعل کو لوگوں کی نظروں سے گرائے نہیں، ان کا نبی سے سہوًا سرزد ہونا ممکن ہے۔

[۲] شرح مقاصد ج ۲ ص ۱۹۳ اللوامع الالہیہ ۱۷۰، ۱۷۱

۳۔عام اور انفرادی و اجتماعی امور میں عصمت

یہاں جو کچھ متصور ہے وہ وہی غیر عہدی بھول چوک ہے جو اُن موضوعات و مصادیق کی تشخیص کے سلسلے میں سرزد ہوتی ہے جو مختلف امور میں پیغمبر کے فیصلوں سے مربوط ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہ یہ بحث انبیاء کے علم کے دائرکار میں آتی ہے۔ نیز یہ کہ کیا ان کے علم اور آگہی کا دائرہ احکام کلی سے بھی وسیع تر ہے۔ یہاں تک کہ موضوعات و مصادیق کے سلسلے میں ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی یا یہ کہ وہ اس سلسلے میں غلطی سے معصوم نہیں ہیں بلکہ جہاں پر ان کی غلطی خُدا کے کلی احکام کو کوئی نقصان نہ پہنچائے وہاں پر اُن سے ایسی غلطی کا ارتکاب اشتباہاً ممکن ہے۔

شیعہ متکلمین میں سے شیخ صدوق مرحوم نے اس سلسلے میں پیغمبر سے غلطی اور سہو کو ممکن قرار دیا ہے۔

انبیاء کی عصمت پر دلائل

عصمت کے مراحل اور اس سلسلے میں متکلمین کی آراء اور نظریات سے آگاہ ہونے کے بعد ہم عصمت کے دلائل پر نظر ڈالتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون سی رائے درست ہے اور کون سی غلط۔ اس سلسلے میں قرآن نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کے بیان سے پہلے مختصر طور پر کلامی نکتہ نظر سے پیش کیے گئے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

عصمت کے ضروری ہونے پر متکلمین کے دلائل

اس سلسلے میں انہوں نے جو سب سے واضح اور عمدہ دلیل پیش کی ہے اُس کا خلاصہ ہم محقق طوسی زبانی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

وَ يَجِبُ فِي النَّبِيِّ الْعِصْمَةَ لِيحصل الوُثُوقُ فَيحصلَ الْغَرَضُ۔ [1]

نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے تا کہ اُس پر اعتماد کیا جا سکے اس سے ہی بعثت کا مقصد پورا ہو سکے گا۔

اس دلیل کی وضاحت کچھ یُوں ہے کہ دنیا کی بعثت کا ایک اہم ترین مقصد یہ ہے کہ انسان کی تربیت اور راہنمائی کے لیے مکمل طور پر راہ ہموار کر دی جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ لوگ انبیائے الہی پر اطمینان رکھتے ہوں۔ انہیں سچا اور امین سمجھتے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ پھر انہیں شک و شبہ کی نظر سے ہی دیکھتے رہیں گے۔ لہٰذا اُن کے تربیتی پروگرام کو دل و جان سے قبول نہیں کریں گے جس سے بعثت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جیسے انبیاء کا امین اور سچا ہونا ضروری ہے اس طرح اُن کے قول و فعل کا ہم آہنگ ہونا بھی اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اس دلیل سے چاروں مراحل میں انبیاء کی عصمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اگر ہم یہ احتمال دیں کہ انبیاء وحی لینے اُسے یاد رکھنے اور آگے

---

[1] کشف المراد ص ۲۱۷ مطبوعہ صیدا

پہنچانے کے سلسلے میں عمداً یا سہوا کچھ تبدیلی کر دیتے ہیں تو اس صورت میں لوگوں کا اُن سے اعتما اٹھ جائے گا۔لوگوں کا رجحان اُن کی طرف کم ہوجائے گا، بالکل اس ڈاکٹر کی طرح جس کے بارے میں انسان کو یہ شک ہی پڑ جائے کہ یہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے نسخہ لکھنے میں غلطی کر جاتا ہے اس ڈاکٹر کے پاس آنے والے لوگوں کی تعداد یقیناً کم ہوجائے گی، کم ہوتے ہوتے یہ تعداد صفر پر پہنچ جائے گی۔

اس بات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء نہ صرف یہ کہ وحی آگے پہنچانے کے سلسلے میں کسی غلطی اور خطا کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ شریعت پر عمل کے سلسلے میں بھی خُدا کے دیئے ہوئے پروگرام سے ذرہ بھر ادھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ وہ خود اس پر پوری طرح (سو فیصد) عمل کرتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو لوگوں کا اعتماد اُن سے اُٹھ جائے جس سے بعثت کے مقاصد کا فوت ہونا لازم آتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یُوں کہ کسی مربی سے گناہ کا واقع ہونا اُس پر اعتماد کو ختم کر دیتا ہے اُس کے زیر تربیت افراد یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ خُدا کی جانب سے بھیجا گیا ہے اور اپنی باتوں کی سچائی اور حقانیت پر خود بھی ایمان اور اعتقاد رکھتا ہے تو وہ خود ان پر عمل کیوں نہیں کرتا؟ یہ کہیں جھوٹا اور فریبی نہ ہو؟ لہٰذا بعثت کا مقصد پُورا نہیں ہوگا۔

اس دلیل سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر نہ زندگی کے معاملات میں خطا اور غلطی سے محفوظ ہوتے بلکہ وہ موضوعات و مصادیق کے سلسلے میں بھی معصوم ہوتے ہیں ایک مربی کی کامیابی کے لیے اُس پر لوگوں کا اعتماد ایک بنیادی شرط ہے۔ اس بات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جسے خُدا کے احکام وصول کرنے، انہیں آگے پہنچانے اور خود ان مذہبی اور دینی احکام پر عمل کرنے کے سلسلے میں معصوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اس بات کا تقاضا بھی ہے کہ انبیاء کو اُن روزمرہ کے معمولات اور انفرادی و اجتماعی معاملات میں بھی معصول جانیں خُدا کے احکام بیان کرنے میں بھی غلطی کرے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک انسان احکام اور معارف کے بیان کرنے میں معصوم ہو لیکن روزمرہ کے باقی کاموں میں اُس سے غلطی ہو جاتی ہو۔ ان کاموں میں غلطی دینی احکام کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔ صاحب نظر اور حقیقت بین انسان کے لیے اِن دونوں میں فرق کرنا بالکل آسان ہے لیکن اکثر لوگ اِن دونوں موضوعات کو بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے جُدا کر پاتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ روزمرہ کے اور دوسرے معمولی کاموں میں اُس کی غلطی کو دیکھ کر اُس کی تعلیمات سے بھی بدظن ہو جاتے ہیں اور ان کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ یہ عدم بھی آخر کار بعثت کے مقاصد کے لیے نقصان دہ امر ہے۔

متکلمین کے چند اور دلائل

متکلمین کی واضح ترین اور رساترین دلیل عصمت انبیاء پر وہی ہے جو پہلے بیان کر دی گئی ہے۔ متکلمین نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے چند اور دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ ہم اُن میں سے چند ایک بیان کرتے ہیں۔

ا۔ دو متضاد باتوں کی طرف بلانا محال ہے

یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ انبیاء کی پیروی اور اتباع ایک واجب اور ضروری امر ہے کیونکہ اُن کے مبعوث ہونے کا مقصد تب ہی

پورا ہوسکتا ہے جب اُن کی اتباع لازم اور واجب ہو۔ اب اگر ہم فرض کریں کہ پیغمبر گناہ سے معصوم نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ گناہ کے مرتکب ہوبھی سکتے ہیں تو اِس قانون کے تحت کہ اُن کی تباع ضروری ہے اس عمل میں بھی اُن کی اتباع کی جائے گی حالانکہ اِس عمل میں ان کی پیروی کرنے کا معنی یہ ہوا کہ گویا خودخُدا اپنے بندوں کو دعوتِ گناہ دے رہا ہے۔ اس بات کا باطل ہونا بالکل واضح ہے۔

محقق طوسی نے یہ بُرہان یوں بیان کیا ہے:

"ولو جوب متابعته وضدها۔"

یعنی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوتو دو متضاد امر لازم آتے ہیں اور وہ ان کی پیروی کا واجب ہونا اور حرام ہونا ہے

(کیونکہ اِس لحاظ سے کہ وہ پیغمبر ہیں ان کی پیروی ضروری اور واجب ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ عمل ناروا ہے۔ اُن کی پیروی حرام ہے)

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ پیغمبر کے کردار اعمال کی پیروی اُن کے معصوم ہونے کی بنا پر ہے لہٰذا اگر ہم نے اس سلسلے میں انہیں معصوم نہ جانا تو پھر ہم پر اُن کے کردار کی اتباع ضروری نہیں ہے بلکہ صرف اُن کی گفتار پر عمل کرنا ہی ہماری ذمہ داری ہے۔ اِس جگہ پر عصمت مرحلہ تبلیغ سے مربوط ہے نہ کہ اُس پر عمل کرنے سے۔

ہاں: اِس استدلال کی تکمیل یوں کی جاسکتی ہے:

۱۔ قرآن نے پیغمبر کی اتباع اور اطاعت کو ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ۱ [۱]

۲۔ اس کا اطلاق عملی اتباع کے بارے میں بھی ہے۔

۳۔ خُدا نے انسانوں کو گناہ کی دعوت نہیں دی بلکہ اُس نے تو گناہ سے روکا ہے۔ [۲]

گویا یہاں پر دو مذہبی حکم موجود ہیں:

(الف) گفتار و کردار میں پیغمبر کی اتباع کا لازم ہونا۔

(ب) گناہ کی پیروی کا حرام ہونا

اب اگر پیغمبر معصوم نہ ہو اور گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا لازمہ خدا کا لوگوں کو دو متضاد باتوں کی طرف بلانا نکلتا ہے۔

۱۔ نبی کی ہر معاملے میں پیروی

۲۔ حرام کام کرنے سے ممانعت جس کا نتیجہ پیغمبر کی اتباع نہ کرنا ہے۔

یہ برھان "علم منطق" کے لحاظ سے "قیاسِ استشنائی" کی صورت میں یُوں بیان ہوسکتا ہے:

---

[۱] وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (ال عمران ۔ ۱۳۲)۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء ۔ ۸۰)۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (ال عمران ۔ ۳۱)

[۲] وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (نحل ۔ ۹۰)

الف۔ پیغمبر کے گناہ سے معصوم نہ ہونے کا لازمہ دو متضاد باتوں کی طرف بلانا ہے۔

ب۔ دو متضاد باتوں کی طرف بلانا محال ہے۔

نتیجہ ۱: پس پیغمبر کا معصوم نہ ہونا ضروری اور لازم ہے۔

نتیجہ ۲: پس اُس کا معصوم ہونا ضروری اور لازم ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ کلامی دلیل ''مستقلات عقلیہ'' میں سے نہیں ہے کیونکہ اس کا ایک مقدمہ قرآن سے ماخوذ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ ''مقدم'' اور ''تالی'' کے درمیان جو ''ملازمہ'' قائم کیا گیا ہے یہ شرع'' سے ماخوذ ہے۔ لیکن ''لازم'' کا محال ہونا ایک عقلی امر ہے۔

پس پہلی دلیل جس کے دونوں مقدمے عقلی تھے وہ دلیل برھانی'' ہے جب کہ دوسری دلیل استدلال جدلی'' کے طرز پر ہے۔

ب۔ پیغمبر کو اذیت پہنچانا حرام ہے

اگر پیغمبر گناہ سے معصوم نہ ہو بلکہ گناہ کا ارتکاب اس کے لیے جائز ہو تو جس وقت کسی بُرے کام کا مرتکب ہوگا تو پھر بھی دو متضاد امروں کی طرف بلانے والا اشکال لازم آئے گا کیونکہ ایک طرف تو ''متکلمین'' پر ''نہی ازمنکر'' واجب ہے۔ اس صورت میں اگر وہ ''نہی ازمنکر'' کریں گے تو یہ چیز پیغمبر کی اذیت کا باعث بنے گی۔

دوسری طرف خُدا نے پیغمبر کو اذیت [1] پہنچانے سے روکا ہے، لہٰذا پیغمبر کے سلسلے میں نہی ازمنکر واجب بھی ہو جائے گا اور حرام بھی، جب کہ واجب اور حرام کام کا جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

اگر چہ اس دلیل میں بھی ''متضادین کی طرف بلانے'' والا اشکال پیش کیا گیا ہے لیکن اس سے ہٹ کے بھی پیغمبر کو اذیت پہنچانا حرام ہے۔ زیر بحث مقام میں اس اذیت کا سرچشمہ پیغمبر کا معصوم نہ ہونا ہے۔ لہٰذا انبیاء کا معصوم ہونا ایک ضروری اور لازمی امر ہے۔

''والا نکار علیه'' پیغمبر پر انکار کے واجب ہونے (نہی ازمنکر) کا لازمہ یہ نکلتا ہے کہ پیغمبر گناہ سے معصوم ہو۔ وگرنہ نہی ازمنکر کے واجب ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُسے بُرائی سے روکا جائے اور یہ بات اُسے اذیت پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ [2]

یہ وہ تین ادلہ تھیں جو نامور شیعہ ماہر علم کلام نے تجرید الاعتقاد میں پیش کی ہیں۔ ہم بھی انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگلے باب میں عصمت سے متعلق قرآنی دلائل پیش کریں گے۔ [3]

---

[1] اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۵۷﴾ (احزاب۔۵۷) جو لوگ خُدا اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں خُدا انہیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔ ان کے لیے اُس خوار کنندہ عذاب تیار کر رکھا ہے۔

[2] کشف المراد ص ۲۱۷ مطبوعہ صیدا۔

[3] متکلمین کی مزید دلیلیں دیکھنے کے لیے اللوامع الالہیہ ص ۱۷۲ مطبوعہ تبریز اور شرح مقاصد ج ۲ ص ۱۹۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۱۴) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ دوم)

عصمت انبیاء اور قرآنی نکتہ نظر

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ
فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا
رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

(جن۔ ۲۸،۲۷،۲۶)

۲۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ
وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

(بقرۃ۔ ۲۱۳)

۳۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴿۴﴾ (نجم۔ ۴،۳)

۴۔ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام۔ ۹۰)

۵۔ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ

(زمر۔ ۳۶۔ ۳۷)

۶۔ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِیْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا

كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٢﴾ (يٰس۔٦٠۔٦١۔٦٢)

۷۔اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۤ وَمِمَّنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَاۗءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ (مريم۔۵۸)

۸۔اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۹ غَيْرِ
الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۷﴾ (حمد۔۶۔۷)

۹۔وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا
وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾(مريم۔۵۸)

۱۰۔فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ
يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (مريم۔۵۹)

۱۱۔قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾
(اعراف۔۲۸)

۱۲۔قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اٰل عمران۔۳۱)

۱۳۔لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ
الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ۭ (احزاب۔۲۱)

۱۴۔قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ (ممتحنه۔۴)

۱۵۔مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (نساء۔۸۰)

۱۶۔وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۵۲﴾
(نور۔۵۲)

۱۷۔لَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ
لَعَنِتُّمْ (حجرات۔۷)

۱۸۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾

(ص۔ ۸۲۔ ۸۳)

۱۹۔ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ (ص۔ ۴۵۔ ۴۶)

تفسیر

گذشتہ باب میں انبیاء کی عصمت پر کلامی دلائل پیش کیے گئے۔ اب اس موضوع کو قرآنی نکتہ نظر سے زیر بحث لاتے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن کی رائے معلوم کرتے ہیں۔

ا۔ قرآن اور وحی سے متعلق انبیاء کی عصمت

قرآن کی متعدد آیات سے وحی سے مربوط تمام امور (وحی لینے، یاد رکھنے اور آگے پہنچانے) میں انبیاء کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

ا۔ انبیا اور غیبی محافظ

۱۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

۲۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ [1] رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ [2] مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّ

۳۔ يَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ (جن۔ ۲۶۔ تا ۲۸)

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ خدا غیب سے باخبر ہے وہ کسی کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر یہ کہ جسے وہ چن لے یعنی انبیاء اس صورت میں خدا ان رسولوں کے آگے پیچھے محافظ مقرر کر دیتا ہے تا کہ خدا یہ جان لے (یعنی یہ ثابت ہو جائے) کہ انبیاء نے اپنے پروردگار کے

---

[1] من رسول' کے جملے میں لفظ 'من'' بیانیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جسے غیب سے اگاہ کرنے کے لیے چنا گیا ہے وہ پیغمبر ہے۔

[2] یسلك ''''یجعل'' کے معنی میں ہے۔ اس کا فاعل خدا ہے۔ یعنی اُس رسول کے آگے اور پیچھے محافظ متعین کرتا ہے۔

پیغامات کو پوری طرح آگے پہنچا دیا ہے جو کچھ انبیاء کے پاس ہے وہ اُس پر احاطہ رکھتا ہے اور اُس نے سب چیزوں کو اچھی طرح شمار کرلیا ہے۔

اِن آیات سے وحی سے مربوط تمام مسائل میں چاہے وہ وحی وصول کرنے سے متعلق ہوں یا اُس کی حفاظت اور آگے پہنچانے سے متعلق ہوں انبیاء کی عصمت ثابت ہورہی ہے۔''فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِۦ رَصَدًا'' کا جملہ اِس بات کی واضح گواہی دے رہا ہے کہ پیغمبر کے لیے ہر طرف سے محافظ اور نگہبان مقرر کیے گئے ہیں۔

''بین یدیه'' کا جملہ عربی زبان میں ''سامنے سے'' اور ''من خلفه'' ''پیچھے سے'' کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں لفظ اس بات کے لیے کنایہ ہیں کہ انبیاء ہر طرف سے خُدا کی جانب سے مقرر کردہ محافظوں اس بات کی تائید تیسری آیت ہے جس میں یہ محافظ اور نگہبان کرنے کی وجہ اس جملے کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا۟ رِسَٰلَٰتِ رَبِّهِمْ

پیغمبر کے اطراف میں محافظ متعین کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنی رسالت کی ذمہ داری کو صحیح طریقے سے پورا کرسکیں۔ ''لیعلم ۔لیتحقق ۔ کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ایک اور آیت میں ارشاد ھوتا ہے۔:

فَلَيَعْلَمَنَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ وَلَيَعْلَمَنَّ ٱلْكَٰذِبِينَ ۝٣

تا کہ سچے لوگوں کو جھوٹے لوگوں سے جُدا کیا جا سکے۔ (عنکبوت ۔ ٣)

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے لیے محافظ اور نگہبان مقرر کیے گئے ہیں بلکہ خُدا بھی انبیاء پر نظر رکھے ہوئے ہے وہ چیزوں کے حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے۔

اس آیت کے مضمون کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء غیب اور وحی سے مربوط مسائل میں ہمیشہ اور دائمی طور پر خُدا کی طرف سے متعین شدہ فرشتوں کے زیر حفاظت رہتے ہیں تا کہ ان کے کندھوں پر جو عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہے اُسے بخوبی پُورا کرسکیں۔ یہ وحی لینے اُسے حفظ رکھنے اور پہچانے کے سلسلے میں ان کی عصمت کے متعلق ایک اور تعبیر تھی کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک مرحلے میں بھی عصمت کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ رسالت الٰہی پوری طرح ادا نہیں ہو سکے گی۔

٢۔ برحق قضادت

قرآن کی بعض آیات یہ بتاتی ہیں کہ خُدا نے انبیاء کے ساتھ کتاب بھی بھیجی ہے تا کہ وہ لوگوں کے درمیان حق و انصاف سے فیصلے کر سکیں۔

یہ وہ مقاصد اُس وقت ہی پورے ہو سکتے ہیں جب دنیاوی مسائل میں بھی انبیاء کی عصمت کا اعتراف کیا جائے۔ ارشاد ھوتا ہے

كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ؕ

لوگ ایک ہی اُمت تھے پھر خُدا نے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور اُن کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں میں اُس چیز کا فیصلہ کریں جس میں وہ لوگ اختلاف کرتے ہیں۔۔۔(بقرۃ۔ ۲۱۳)

یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں منصف کتاب کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ فعل مفرد آیا ہے۔(لیحکم)۔

آسمانی کتاب کو بھی طبعی طور پر عین حقیقت اور ہر قسم کی غلطی سے محفوظ ہونا چاہیے۔لیکن یہ کتاب صامت کتاب ناطق کے ذریعے ہی بولتی ہے۔اگر کتاب ناطق (پیغمبر) وحی لینے، اُسے یاد کرنے اور آگے پہنچانے جیسے مسائل میں کسی غلطی کا شکار ہو جائے تو خود کتاب بھی قطعی طور پر اس غلطی کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے گی۔

۳۔وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے

انبیاء اِس زمین پر خُدا کے نائب اور جانشین ہیں۔ان کی گفتگو خواہشات نفسانی کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ وہ جو کچھ خُدا سے لیتے ہیں اُسے آگے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ﴿۳﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى ﴿۴﴾

پیغمبر ہوائے نفس سے کوئی بات نہیں کہتا بلکہ اُس کی بات تو وحی الٰہی ہے جو اس تک پہنچتی ہے (نجم۔۳۔۴)

یہ آیت پیغمبر کی ہر گفتار کو خواہ وہ قرآن کی صورت میں ہو یا حدیث کی شکل میں عصمت کی سند عطا کر رہی ہے۔لہٰذا پیغمبر نہ صرف یہ کہ قرآن کے ذریعے دین کو بیان کرنے میں ہر قسم کی غلطی (عمداً ہو یا سہواً) سے معصوم ہیں بلکہ حدیث کے ذریعے دین کو بیان کرنے میں بھی یہی اصول برقرار رہتا ہے۔

ان سلسلوں میں پیغمبر کی عصمت کو ثابت کرنے کے لیے یہی آیات ہی کافی ہیں۔بات لمبی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بالخصوص اس لیے بھی کہ اس سلسلے میں کوئی اختلافی نکتۂ نظر بھی موجود نہیں ہے۔بلکہ شریعت کے بیان کرنے میں نبی کے معصوم ہونے پر تمام اسلامی فرقوں کے درمیان اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔زیادہ اہم عصمت کا ایک اور مرحلہ جس سے متعلق ہم اب گفتگو شروع کرتے ہیں۔

قرآن اور عصمت انبیاء

قرآن نے تمام انبیاء کو ان کی پوری زندگی میں گناہ سے معصوم قرار دیا ہے یہ بات چند آیات سے ثابت ہوتی ہے۔

ا۔انبیاء ایسے ہدایت یافتہ انسان ہیں جو کبھی گمراہ نہیں ہوتے

تین طرح کی آیات سے مجموعی طور پر گناہ سے انبیاء کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۱۔اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

وہ (انبیاء) ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے پس اُن کی ہدایت کی پیروی کر۔ کہہ دیجئے میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ یہ قرآن عالمین کے لیے یاد آوری کے ذریعے کے علاوہ کچھ نہیں۔(انعام۔۹۰)

۲۔يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ

جسے خُدا گمراہ کردے اُس کے لیے کوئی ہادی نہیں ہے اور جسے خُدا ہدایت دے دے اُسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔(زمر۔۳۶۔۳۷)

۳۔اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

اے اولادِ آدم: کیا میں نے تمہارے ساتھ یہ عہد نہیں باندھ رکھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرو گے۔ بے شک وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور میری عبادت کرو یہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ شیطان نے تم میں سے بہت بڑے گروہ کو گمراہ کیا ہے سوچتے کیوں نہیں ہو؟۔(یٰس۔۶۰۔۶۱۔۶۲)

تینوں آیات کے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے انبیاء کی عصمت کا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پہلے آیت ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ'' کے جملے سے یہ معنی ماخوذ ہو رہا ہے کہ انبیاء خُدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ ان کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

دوسری آیت یہ بتاتی ہے کہ ان ہدایت یافتہ افراد کو کوئی راستے سے گمراہ نہیں کر سکتا۔

تیسری آیت ''وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا'' کا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ لوگوں کی گمراہی شیطان کی پیروی کرنے کی وجہ سے

ہے۔وہ جس قدر بھی شیطان کی اتباع کریں گے اتنا ہی خُدا کی نافرمانی کرتے جائیں گے اور صراط مستقیم سے دور ہوتے جائیں گے گناہ اور نافرمانی کا نتیجہ ضلالت اور گمراہی اور صراط مستقیم سے دور ہوجانے کی صورت میں نکلتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انبیاء ہدایت یافتہ ہیں اُن کے لیے کسی قسم کی گمراہی متصور نہیں چونکہ ہر قسم کی نافرمانی اور گناہ کا نتیجہ دور ہیں، تیسری آیت انہیں گناہ اور نافرمانی سے معصوم ومحفوظ قرار دے رہی ہے۔

ب۔انبیاء نعمت یافتہ ہیں

قرآن نے انبیاء کو ان لوگوں کے زمرے میں شمار کیا ہے جنہیں نعمت عطا کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

وہ (انبیاء کہ جنکے نام پہلی آیات میں ذکر کیے گئے ہیں) ایسے لوگ ہیں جن پر انبیاء میں سے نعمت عطا کی گئی ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ

آدم کی اولاد سے، نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار ہونے والوں کی اولاد سے اور ابراہیم اور اسماعیل کی اولاد میں سے۔[1] (مریم۔۸۵)

دوسری طرف جنہیں نعمت عطا کی گئی ہے ان کی راہ کو صراط مستقیم قرار دیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کر اُن لوگوں کا راستہ جنہیں تو نے نعمت عطا کی ہے۔(حمد۔۶۔۷)

صراط مستقیم کے مقابلے میں راہ ضلالت اور خُدا کے غضب کی راہ کا ذکر ہوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

اس بات کے پیش نظر کہ ہر قسم کا گناہ اور معصیت ضلالت اور گمراہی ہے جو کہ غضب الٰہی کا باعث بنتے ہیں، لہٰذا انبیاء جنہیں خُدا کی خاص نعمت سے نوازا گیا ہے، وہ صراط مستقیم پر ہیں وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے (چاہے وہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا) کیونکہ گناہ ضلالت اور خدا کے غضب کا باعث بنتا ہے جب کہ ان کی راہ تو مستقیم ہے جو گمراہ اور غضب الٰہی کے شکار لوگوں کی راہ کے مقابلے میں ہے۔

---

[1] سورہ نساء کی آیت ۶۸ میں بھی اُن چار طرح کے لوگوں کا ذکر آیا ہے جنہیں خُدا نے نعمت عطا کی ہے ان میں سرفہرست انبیاء ہیں۔

ج۔ خدا کے حضور تسلیم محض

مندرجہ بالا بیان سے آیات کے دوسرے حصے کی عصمت انبیاء پر دلالت واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاء خُدا کی نافرمانی اور گناہ سے معصوم ہیں۔ یہ وہ آیات ہیں جو انبیاء کو ہدایت یافتہ اور خُدا کی جانب سے برگزیدہ افراد شمار کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ

وہ انبیاء ایسے لوگ ہیں جو خُدا کی جانب سے ہدایت یافتہ ہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩

(انبیاء) وہ لوگ ہیں کہ ہم نے جنہیں ہدایت عطا کی ہے اور چن لیا ہے جب بھی خدا کی آیات اُن پر پڑھی ہیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔ (مریم۔۵۸)

خدا کے سامنے جن کے تسلیم ورضا کی گواہی خود قرآن ان الفاظ میں دے رہا ہے کہ وہ خُدا کی آیات کے سامنے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ خُدا کے احکام کی پیروی کے سامنے اظہار تسلیم اور اطاعت کے لیے زمین پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کبھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ ان آیات میں احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے انبیاء کی تعریف وتمجید کی گئی ہے۔ اس درجے کی تعریف وتمجید احکام الٰہی کی بجا آوری کے سلسلے میں انبیاء کی عملی عصمت پر ایک واضح دلیل ہے۔

اس بات کی تائید بعد والی آیات سے بھی ہوتی ہے۔ اُس میں لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انبیاء کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ رحمٰن کی اطاعت کی بجائے ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ۝۵۹

اُن کے بعد خلف اولاد آتی جس نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی جلد ہی وہ اپنی گمراہی کے نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ (مریم۔۵۹)

ان دونوں گروہوں کے آپس میں تقابل سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاء مقام عمل میں کبھی بھی خواہشات نفس کی پیروی

نہیں کرتے۔ یہ ہی احکام الٰہی پر عمل کرنے کے سلسلے میں عصمت کا معنی و مفہوم ہے۔

د۔ گفتار و کردار میں اُسوہ حسنہ

قرآن کی بہت سی آیات میں نبی اکرمؐ کی پیروی اور اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور ان کی نافرمانی قرار دیا ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم انہیں دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ وہ آیات جن میں لفظ ''اتباع'' استعمال ہوا ہے۔

۲۔ وہ آیات جن میں لفظ ''اطاعت'' لایا گیا ہے۔

لفظ ''اطاعت'' معمولاً رہبروں، لیڈروں اور مربی حضرات کی گفتار کی پیروی کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ لفظ ''تبعت'' اُن کے کردار اور عمل کی اتباع کے لیے۔

اس بات کے پیش نظر کہ اِن آیات میں پیغمبر کی بلاقید و شرط اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پیغمبر خود بھی گفتار و کردار میں ہر طرح کی لغزش اور غلطی سے محفوظ ہو۔ اُس کے تمام اعمال خُدا کی مرضی اور پسند کے مطابق ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر اُس کی اطاعت کا حکم دینا گویا گناہ کے ارتکاب کے جواز کا حکم فراہم کرنا ہے جب کہ خُدا تو کبھی بھی گناہ اور غلطی کے ارتکاب کا حکم نہیں دیتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾

کہہ دیجیے خُدا برائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا خُدا کی طرف اُس چیز کی نسبت دیتے ہو جسے تم نہیں جانتے ہو؟ (اعراف۔۲۸)

پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کو نمونہ قرار دینے والی آیات میں بھی یہی بات ہے۔ ایک انسان کو بدونِ قید و شرط اسوہِ کامل قرار دینے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان معصوم ہو۔ اگر وہ گفتار و کردار میں معصوم نہ ہوا تو پھر اسے اسوہ عمل قرار دینے کا معنی گناہ کے ارتکاب کا حکم دینے کے مترادف ہوگا جب کہ خُدا اِس سے منزہ ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے ذریعے سے وجوبِ اطاعت سے متعلق آیات سے بھی انبیاء کی عصمت کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیات تو فقط گفتار میں اطاعت کا حکم دے رہی ہیں۔ (یعنی صرف انبیاء کے قول اور حکم کو ماننا ضروری ہے) تو پھر اِن آیات سے گفتار میں ان کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اطاعت میں کردار بھی شامل ہے تو پھر یہ آیات کردار کی عصمت کو بھی ثابت کر سکتی ہیں۔ چند ایک آیات کو ہم بطور نمونہ یہاں بیان کرتے ہیں۔

''اتباع'' کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۞۳۱

کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری اتباع کرو۔اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(آل عمران۔۳۱)

بعض آیات پیغمبر اکرمؐ کو گفتار و کردار میں اسوہِ کامل قرار دیتی ہیں۔ارشاد ہوتا ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لَـكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا ۞۲۱

تمہارے لیے پیغمبر خدا کی رفتار و گفتار) میں اسوہ حسنہ خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو خُدا اور یوم آخر پر اُمید رکھتے ہیں اور خُدا کو بہت یاد کرتے ہیں۔(احزاب،۲۱)

نہ صرف یہ کہ نبی اسلام کو نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے بلکہ ایک باایمان معاشرے کے لیے قرآن نے حضرت ابراہیم کو بھی نمونہ عمل کے طور پر متعارف کروایا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدۡ كَانَتۡ لَـكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا

تمہارے لیے ابراہیم اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے اُن میں اُسوہِ حسنہ ہے،جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ہم تم سے خُدا کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو اُن سے بیزار ہیں۔[1] (متحنہ۔۴)

پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

جس نے پیغمبر کی اطاعت کی اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔(نساء۔۸۰)

ایک اور آیت میں خُدا اور رسول کی اطاعت کے فائدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

[1] البتہ پہلی آیت کی دلالت زیادہ قوی اور روشن ہے کیونکہ اس میں اُسوۂ عمل ہونے کے دائرکار کو بہت (وسعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جب کہ دوسری آیت میں ایسا نہیں ہے۔

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَخۡشَ اللّٰهَ وَيَتَّقۡهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ﴿۵۲﴾

اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے اور خدا سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے تو وہ لوگ کامیاب ہیں۔(نور۔۵۲)

ایک اور آیت میں مومنین کو یہ تنبیہ کی جارہی ہے کہ مبادا وہ چاہنے لگیں کہ پیغمبران کی پیروی کریں یہ کہا جارہا ہے کہ اگر پیغمبر تمہاری اطاعت کریں گے (تو تمہارے گناہ سے معصوم نہ ہونے کی وجہ سے) گمراہ ہو جائیں گے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ؕ لَوۡ يُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ

جان لو پیغمبرِ خُدا تمہارے درمیان ہے اگر بہت جگہ پر وہ تمہاری بات سننے لگے تو زحمت میں مبتلا ہو جائے گا۔(حجرات۔۷)

ھ۔شیطان کی گمراہی سے محفوظ

بعض قرآنی آیات یہ بتاتی ہیں کہ جب شیطان کو دربارِ الٰہی سے نکال دیا گیا تو اُس نے یہ قسم کھائی کہ وہ تمام بندگان خُدا کو گمراہ کرے گا۔البتہ بندگان مخلَص (لام پر زبر کے ساتھ) کو شیطان گمراہ نہیں کرسکتا۔لہٰذا وہ ہر قسم کے گناہ اور غلطی سے مبرا اور معصوم ہیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَۙ‏ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ‏ ﴿۸۳﴾

تیری عزت کی قسم میں ان تمام کو تیرے مخلص بندوں کے سوا گمراہ کروں گا۔(ص۔۸۲۔۸۳)

یہی مفہوم سورہ حجر کی آیات ۴۰ اور ۴۱ میں بیان کیا گیا ہے۔

اس بات کو ایک اور بات کے ساتھ ملائیں کہ انسان سے جو گناہ بھی سرزد ہوتا ہے۔اُس میں شیطان کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے وہ اپنے وسوسے کے ذریعے اسے گمراہی کی طرف دھکیلتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر غلط قسم کی گفتار اور کردار چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی اُس کا سرچشمہ شیطان کی تحریک اور دعوت و ترغیب ہی ہے۔

ان دونوں مطالب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو شیطان کی گمراہی سے پوری طرح محفوظ ہیں وہ یقیناً گناہ اور غلطی کے ارتکاب سے محفوظ ہوتے ہیں۔اُن کی ذات سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔گویا یہ مخلَص جماعت ہر لحاظ سے معصوم ہوتی ہے۔

ایک اور آیت میں انبیاء کو خدا کے مخلَص بندے قرار دیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۝٤٥ اِنَّآ
اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝٤٦ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ
الْاَخْيَارِ ۝٤٧ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝٤٨

ہمارے صاحبان نعمت اور بابصیرت بندوں ابراہیم اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو ہم نے انہیں دوسری دنیا کے یاد رکھنے کی وجہ سے خالص اور پاک دل قرار دیا۔ وہ ہمارے نزدیک منتخب شدہ اور خوب لوگوں میں سے ہیں اور اسماعیل، یسع اور ذوالکفل کو کہ یہ سب نیکوکار لوگوں میں سے تھے۔ (ص۔ ۴۵ تا ۴۸)

جن انبیاء کے نام آیات میں ذکر کیے گئے ہیں یہ "اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ" کے جملے کے مطابق خدا کے مخلص (لازم پر زبر) بندوں میں سے ہیں۔ یہ شیطانی گمراہی سے محفوظ ہیں لہٰذا یہ ہر قسم کے گناہ سے بھی معصوم ہیں۔ اگر چہ ان آیات میں تمام انبیاء کے نام ذکر نہیں کیے گئے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ تمام انبیاء "وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٨٧ (انعام۔ ۸۷)" کی آیت کے ذریعے سے خدا کی جانب سے منتخب شدہ اور ہدایت یافتہ ہیں لہٰذا عصمت کے حکم میں یہ بھی انہی کے مانند ہیں

(۱۵) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ سوم)

عصمت انبیاء اور قرآنی نکتہ نظر

آیات مورد بحث

۱۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا
تَكُنۡ لِّلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۞ (نساء۔۱۰۵)

۲۔ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآٮِٕفَةٌ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّضِلُّوۡكَ ؕ وَمَا
يُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ
وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ۞
(نساء۔۱۱۳)

۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ
الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ (بقرۃ۔۱۴۳)

۴۔ وَاِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ
حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنۡسِيَنَّكَ الشَّيۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرٰى مَعَ
الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۞ (انعام۔۶۸)

۵۔ وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَاىۡءٍ اِنِّىۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۞ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ
اِذَا نَسِيۡتَ وَقُلۡ عَسٰٓى اَنۡ يَّهۡدِيَنِ رَبِّىۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ هٰذَا رَشَدًا ۞

(کھف۔۲۳۔۲۴)

۶۔سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓىۙ‏ ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ‌ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَـهۡرَ وَمَا يَخۡفٰىؕ‏ ﴿۷﴾

(اعلیٰ۔۶۔۷)

۷۔وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِىَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰہٰ۔۱۱۵)

۸۔فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَيۡنِهِمَا نَسِيَا حُوۡتَهُمَا (کھف۔۶۱)

قضاوت اور موضوعات میں انبیاء کی عصمت

انبیاء کرام یا پیغمبر اسلامؐ کے سہواً کسی غلطی کے ارتکاب سے معصوم ہونے پر علمائے اسلام کے درمیان اتفاق نظر نہیں ہے۔بعض محدثین اس طرح کی غلطی کے ارتکاب کو ممکن سمجھتے ہیں اور اسے مقام نبوت کے منافی قرار نہیں دیتے حالانکہ قرآنی آیات سے تو قضاوت اور موضوعات کی تشخیص کے سلسلے میں بھی پیغمبر کی عصمت ثابت ہو رہی ہے۔پیغمبرؐ اسلام کی قضاوت سے متعلق قرآنی آیات کو ہم بیان کرتے ہیں۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ دو افراد کے درمیان قضاوت کرتے وقت پیغمبر اسلام وہی فیصلہ سناتے ہیں جو خُدا انہیں بتاتا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾

ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ تجھ پر نازل کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اُس چیز کے ساتھ فیصلہ کرو جو خُدا نے تمہیں سکھائی ہے اور خائن لوگوں کے ہرگز مدافع کار نہ بننا۔(نساء۔۱۰۵)

آیات کا سیاق وسباق اور ''خائنین'' اور ''خصیم'' جیسے کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دعووں سے متعلق ہے چاہے یہ دعویٰ مال سے مربوط ہو یا عزت وجان سے۔بہر حال پیغمبر کی عدالت کا محور خدا کا تعلیم کردہ امر ہی رہتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مذکور جملے (بما اراك الله) سے مُراد خُدا کا پیغمبر کو ان کلی احکام کی تسلیم دینا ہے جو قرآن میں آئے ہیں تو اس سورت میں یہ آیت ہمارے مدعا پر دلالت نہیں کرے گی۔لیکن اگر یہ کہا کہ اس سے مُراد جھگڑے اور نزاعی واقعے میں حقیقی صورت حال دکھانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ کون سا فریق سچا ہے اور کون سا جھوٹا تو اس سورت میں یہ آیت عصمت پر بھی دلالت کرے گی۔اگرچہ بہت سے مفسرین نے یہاں ''ارائه'' کو احکام کلی کی تعلیم دینے کے معنی میں لیا ہے۔

ایک اور آیت موضوعات کے سلسلے میں نبی اکرمؐ کی عصمت پر واضح تر دلالت کر رہی ہے یہ آیت بھی نزاع اور دعویٰ کرنے کے سلسلے

میں ہی نازل ہوئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَىْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اگر تجھ پر خُدا کا فضل وکرم اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو اُن (اہل کتاب) میں سے ایک جماعت یہ ارادہ کر چکی تھی کہ تجھے گمراہ کردے درحقیقت وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے ۔خدا نے تجھ پر کتاب وحکمت نازل کی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے اور تجھ پر خدا کا بہت بڑا فضل ہے۔(نساء۔۱۱۳)

آیت کے مختلف جملات پر غور وفکر ہماری راہنمائی اس امر کی طرف کرتا ہے کہ نسیان اور خطا کے سلسلے میں نبی کی عصمت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔اب ہم اس آیت کے مختلف جملات کی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

۱۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَىْءٍ ؕ

۲۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

۳۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ

۴۔ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا

پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ خود پیغمبر کی ذات تنہا گمراہی سے بچنے کے لیے کافی نہیں ہے۔گمراہی سے مُراد یہاں غلط فیصلہ کرنا ہے۔یہ خُدا ہے جو اپنی رحمت اور لطف کے سائے میں اُسے غلط فیصلے سنانے سے محفوظ رکھتا ہے جب کہ خُدا کی یہ رحمت تو پیغمبر کی ولادت کے ساتھ اُن پر سایہ فگن ہوگئی تھی اور آخری دم تک اِس سے نبی کو اپنے حصار میں لیے رکھا۔لہٰذا خُدا اِس بات کی یاددہانی کروا رہا ہے کہ وہ لوگ تو اپنے آپ کو ہی گمراہ کررہے ہیں وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

دوسرا جملہ قضاوت کرنے کے لیے صرف کلی قوانین اور احکام سے آگاہی ہی کافی نہیں بلکہ موضوع کی تشخیص بھی ضروری ہے تاکہ حکم اُس کے مطابق کیا جا سکے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ حق دار کو غاصب سے، امین کو خائن سے اور زانی کو عضیف سے علیحدہ کیا جائے۔۔

خُدا تیسرے جملے میں پیغمبر کے علم کی وسعت بیان کررہا ہے کہ:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ

یہاں علم سے مُراد کتاب وحکمت کا علم نہیں بلکہ یہاں جزئیات سے آگاہی مُراد ہے کیونکہ منصفانہ فیصلے کے لیے جزئیات سے آگاہی ایک اساسی اور بنیادی امر ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ جملہ احکام کلی کی تعلیم سے متعلق ہے تو اس صورت میں ''معطوف'' اور ''معطوف'' علیہ ایک ہو جائیں گے کیونکہ دوسرے فقرے میں اِس حقیقت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اُسے دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آیت کے اختتام میں ایک بار پھر خُدا نے فضل وکرم کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ مخالفین جو پیغمبر کو گمراہ اور ورغلا نہیں سکتے تو یہ خُدا کے اُس فضل وکرم کا نتیجہ ہے جس نے پیغمبر کو اپنے سائے میں لیا ہُوا ہے جو انسان خُدا کے فضل وکرم کے حصار میں ہو وہ یقیناً خطا سے مبرا اور معصوم ہوتا ہے۔

آیت کے سلسلے میں دی گئی مذکورہ توضیحات کے ساتھ اگر ہم اِس آیت کے شان نزول کو بھی ملا دیں تو پیغمبر کی عصمت پر اس آیت کی دلالت اور واضح ہو جائے گی۔

طبری نے اس آیت کا شان نزول یہ ذکر کیا ہے:

''ایک شخص نے ایک زرہ چوری کی اور پھر اسے ایک یہودی کے گھر میں پھینک دیا زرہ کے مالک نے یہودی کو پیغمبر کی عدالت میں گھسیٹ لیا۔ اُس کے ہمسائے بھی اس عدالت میں حاضر ہوئے انہوں نے یہودی کے خلاف پیغمبر کو بھڑکانے کی کوشش شروع کر دیں تا کہ یہودی کو یقینی طور پر سزا دلائی جا سکے پیغمبر اسلامؐ اُس یہودی کے خلاف فیصلہ سنانے ہی والے تھے کہ یہ آیت کریمہ نازل ہُوئی۔ [1]

یہ شان نزول صحیح ہو یا نہ اس آیت کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات سے مجموعی طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ وہ شخص متخاصم کے عنوان سے پیغمبر کے پاس آئے۔ اس عدالت میں ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی کوشش تھی کہ پیغمبرؐ کے جذبات اور احساسات کو اُبھار کے عدالتی فضا کو یہودی کے خلاف کر دیا جائے تا کہ یقینی طور پر فیصلہ اُس کے خلاف نہ ہو سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکم کلی کے سلسلے میں نبی سے خطا یا غلطی کے سرزد ہونے کا اصلاً امکان نہیں ہے اُبھارنے والوں کی بھی یہ کوشش نہیں تھی کہ وہ ماحول اس طرح کا پیدا کر دیں کہ پیغمبر اسلامؐ خُدا کے حکم کے سلسلے میں غلطی کا اارتکاب کر بیٹھیں بلکہ اُن کی کوشش تو یہ تھی کہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کے سلسلے میں نبی کو غلطی میں ڈال دیا جائے لیکن خُدا کے فضل وکرم کی وجہ سے نبی اِس طرح کی غلطی سے محفوظ اور مصئون رہے۔

گواہی میں عصمت

اگر مذکورہ آیت کے مطابق نبیؐ اسلام فیصلے سنانے کے سلسلے میں خطا اور غلطی سے محفوظ ہیں تو دوسری آیات کے مطابق وہ

---

[1] تفسیر طبری ج ۴ ص ۱۷۲

لوگوں پر گواہی دینے کے سلسلے میں بھی خطا اور غلطی سے معصوم ہیں۔قرآن پیغمبر اسلامؐ کو قیامت کے دن اعمال پر گواہ کے طور پر متعارف کروا رہا ہے جو اپنی امت کے اعمال پر گواہی دیں گے۔قیامت کے دن اعمال پر گواہی اُس وقت ہی دی جا سکتی ہے جب کہ وہ اِس دنیا میں خطا اور غلطی سے معصوم ہوں۔اگر ایسا نہ ہُوا تو پھر وہ جگہ جہاں غلط گواہی دی گئی ہوگی وہاں فیصلہ عادلانہ اور منصفانہ نہیں ہوگا۔

علاوہ ازیں بعض اعمال کی اچھائی اور برائی ظاہری اعتبار سے ایک طرح ہی ہے ۔صرف نیت اور قصد کے ساتھ ہی ان کی نیکی اور برائی کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا نبی کے گواہ ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اعمال کی ظاہری شکل وصورت سے آگاہ ہو بلکہ ان کے حقائق اور محرکات سے بھی پوری طرح آگاہ ہوتا کہ وہ حقیقی اور سچی گواہی دے سکے۔

قرآن نے متعدد آیات میں پیغمبرؐ کو امت پر گوہ قرار دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ممتاز اُمت قرار دیا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو گا۔(بقرۃ۔۱۴۳)

تمام لوگوں کے اعمال پر گواہی دینا وروہ بھی ایسی گواہی کہ جو قیامت کے دن قابل قبول بھی ہو پوری اُمت کا کام نہیں ہے کیونکہ امام جعفر صادق کے بقول[1] اُمت میں تو ایسے افراد بھی ہیں جن کی گواہی تھوڑی سی سبزی کے بارے میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔قیامت کے دن پوری اُمت کیسے دوسروں کے اعمال پر گواہ بن سکتی ہے۔ایک خاص جماعت تمام لوگوں پر گواہی دے گی اور پیغمبر بھی اُن پر گواہ ہوں گے۔

''معاد'' کی بحث میں قیامت کے گواہوں سے متعلق گفتگو ہو چکی ہے۔وہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اور امت کے برگزیدہ افراد جیسے ائمہ معصومین لوگوں کے ظاہری اور باطنی اعمال پر گوہی دیں گے۔قیامت کے دن ایسی سچی گواہی دینا صرف گواہ کی عصمت اور خطا سے مصون ہونے کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہے۔کیونکہ گواہی سچی اُسی وقت ہی ہوتی ہے جب مورد شہادت واقع کو دیکھنے اور پھر گواہی ادا کرنے کے مقام پر ہر طرح کی لغزش اور خطا سے محفوظ رہا جائے کیونکہ یہ گواہی قیامت سے مربوط ہے نہ کہ دنیا سے قیامت کے دن تو حقائق کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے نہ کہ ظواہر کی بنا پر۔

لہٰذا گواہی اور فیصلہ اُسی وقت ہی برحق ہوگا جب وہ حقیقت اور واقع کے عین مطابق ہوا یسا اِس وصورت میں ہی ہو سکتا ہے جب گواہ ہر قسم کی خطا سے عمداور سہواً دونوں معصوم ومحفوظ ہو۔

البتہ اِس طرح کی آیات صرف عدالتی فیصلے اور گواہی کے سلسلے میں پیغمبر کی عصمت کو ثابت کرتی ہیں۔دوسرے مراحل میں عصمت

---

[1] تفسیر بُرھان، ج ا ص ۱۶۰

کے اثبات کے لیے عقلی دلائل یا اُن روایات [1] کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر کی حفاظت روح القدس کر رہا ہے اور وہ ہر طرح کی لغزش سے محفوظ ہیں۔

مخالفین عصمت کے دلائل

جیسا کہ پہلے باب میں ہم نے بیان کیا ہے انبیاء کی عصمت کے تین مراحل قابل بحث ہیں:

۱۔ وحی لینے اور اُسے آگے پہنچانے کا مرحلہ

۲۔ دینی احکامات پر عمل پیرا ہونے کا مرحلہ

۳۔ قضاوت اور موضوعات کی تشخیص کا مرحلہ

یہاں تک ہم نے اُن لوگوں کی ادلہ کو بیان کیا جو ان تینوں مراحل میں انبیاء کی عصمت کے قائل ہیں۔ یہ دلائل کچھ عقلی تھے اور کچھ نقلی۔ اب ہم مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں اسلامی فرقوں کے درمیان اتفاق نظر پایا جاتا ہے۔صرف قاضی ابوبکر باقلانی کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ وہ اس مرحلے میں سہواً غلطی کے ارتکاب کو مقامِ نبوت کے منافی نہیں سمجھتا۔اس نظریے کا بطلان مذکورہ دلائل سے بالکل واضح ہوگیا۔لہٰذا اسے الگ سے زیر بحث قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے جو بات زیر بحث آنا چاہیے وہ باقی دو مراحل میں مخالفین کے دلائل ہیں۔

دوسرے مرحلے میں جو لوگ عصمت کے منکر ہیں انہوں نے دو طرح کی دلیلیں پیش کی ہیں۔کبھی تو ان آیات سے استدلال کیا ہے جو تمام انبیاء سے مربوط ہیں اور کبھی ان آیات سے جو چند مخصوص انبیاء جیسے حضرت آدمؑ،حضرت نوح،حضرت ابراہیم وغیرہ سے متعلق ہیں ہم نے ان تمام آیات کا اپنی اس تفسیر کی پانچوں جلد میں (۱۵۰۔۱۵۷) ہر لحاظ سے جائزہ لیا ہے۔ان آیات کو مجموعی طور پر ایک کتابچے کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

تیسرے مرحلے میں انبیاء کی عصمت سے انکار کے لیے قرآن کی چند آیات سے استدلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ہم ان میں سے تین آیات کو یہاں زیر بحث لاتے ہیں۔

۱۔ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۶۸

اور جب بھی تو انہیں دیکھے جو میری آیات کا مذاق اڑاتے ہیں تو ان سے منہ موڑ لے تاکہ وہ کوئی اور بات

[1] کافی ج ا ص ۲۶۱، ۲۷۳

کریں اور اگر شیطان نے تجھے بھلا دیا تو یاد آنے کے بعد ستم پیشہ لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔(انعام۔۶۸)

مخالفین کی رائے کے مطابق یہ آیت اس بات پر گواہ ہے کہ پیغمبر پر فراموشی طاری ہوتی ہے اس لیے خُدا یہ حکم دے رہا ہے کہ تذکر (یاددہانی) کے بعد اِن تمسخر اڑانے والوں کی محفل سے چلے جاؤ۔

استدلال کرنے والوں نے ایک نکتے کی طرف توجہ نہیں دی، وہ یہ کہ اس طرح کی آیات جو پیغمبر کو مخاطب کر رہی ہیں وہ تو ''ایاك اعنی واسمعی یا جارہ'' کی مصداق ہیں یعنی بات تو آپ سے کہتا ہوں تا کہ ہمسایہ سُن لے (یعنی ہمسائے کو سنانے کے لیے آپ سے بات کہہ رہا ہوں) فارسی میں کہتے ہیں:

بہ دختری گو یا عروس بشنود[1]

ان آیات میں اگر چہ ظاہری طور پر لحن خطاب پیغمبر کی طرف ہے لیکن حقیقت میں اسے مخاطب نہیں کیا جا رہا بلکہ اِس کا مقصد باایمان معاشرے کو سمجھانا ہے کہ تمسخر اڑانے والوں کی محفل میں نہ بیٹھو۔ اگر بھول کر ان کی محفل میں آ بھی گئے ہو تو یاد آنے کے بعد فوراً اس محفل سے اٹھ جاؤ۔

گویا مقصد تو مومنین کو سمجھانا ہے لیکن ظاہری طور پر مخاطب پیغمبر کو کیا جا رہا ہے اس کی وجہ اس امر کی اہمیت اور اس پر تاکید ہے۔ یعنی بالفرض اگر پیغمبر بھی اس سلسلے میں کسی قسم کی غلطی کا شکار ہو جائے تو متوجہ ہونے کے بعد اُسے بھی چاہیے کہ فوراً اِس مجلس کو ترک کر دے اُن کے ساتھ نہ بیٹھے، تو دوسروں کو بدرجہ اولیٰ وہاں نہیں بیٹھنا چاہیے۔

۲۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

یہ ہرگز نہ کہو کہ میں یہ کام کل انجام دوں گا مگر یہ کہو کہ اگر اللہ نے چاہا تو اور خُدا کو یاد کرو اُس وقت جب بھول جاؤ اور کہو مجھے یہ اُمید ہے کہ میرا خُدا مجھے اس سے روشن تر راستے کی ہدایت کرے گا۔(کھف۔۲۳۔۲۴)

اس آیت سے بھی طرز استدلال وہی پہلی آیت کی طرح ہے۔ ہمارا جواب بھی وہی پہلے والا جواب ہے یہ بات صحیح ہے کہ خُدا فرماتا ہے ''وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ'' اے پیغمبر جب خُدا کو بھول جاؤ تو یاد کرو لیکن اس آیت کا مقصد ایک عمومی حکم بیان کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی انسان یہ نہ سوچے کہ وہ خُدا کی مرضی اور ارادے کے بغیر کوئی کام انجام دے سکتا ہے اس سلسلے میں نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں۔ پوری کائنات خُدا کی قوت اور طاقت سے ہی توانائی حاصل کر رہی ہے۔ اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔

---

[1] ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ: کہنا بیٹی سے سنانا بہو کو (مترجم)

۳۔ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى ؕ﴿۷﴾

ہم قرآن کو تجھ پر پڑھیں گے پھر تم اسے بھولو گے نہیں مگر یہ کہ خُدا چاہے، بے شک وہ ظاہر اور مخفی کو جانتا ہے۔(اعلیٰ ۔٦۔٧)

اس آیت سے استدلال یوں کیا گیا ہے کہ یہ بات ذکر کرنے کے باوجود کہ پیغمبر قرآن کو نہیں بھولتے یہ کہا گیا ہے کہ جب خُدا کا ارادہ ہو کہ وہ کچھ بھول جائیں تو پھر بھول سکتے ہیں لیکن اس استدلال کا جواب بالکل واضح اور روشن ہے وہ یہ کہ

اولاً: آیت کا ظاہر ہر طرف اتنا ہی ہے کہ خُدا کی مشیت ہونے کی صورت میں پیغمبر پر فراموشی اور نسیان طاری ہو سکتا ہے لیکن کیا خُدا یہ ارادہ کر چکا ہے یا نہیں، آیت اِس بارے میں کچھ نہیں کہتی۔ یقینی طور پر یہ استثنا کا امکان پر دلالت کر رہا ہے نہ کہ وقوع پر۔

ثانیاً: اس طرح کے جو استثناء لائے جاتے ہیں اُن کا مقصد اُن کا وقوع پذیر ہونا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ہوتے ہیں وہ یہ کہ یہ تصور نہ کیا جائے کہ اگر کسی ایک چیز کے بارے میں خُدا نے ارادہ کر لیا تو وہ چیز اُس کے دائرہ اختیار سے باہر چلی جائے گی اور اُس میں دوبارہ کوئی تبدیلی محال ہوگی۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ پہلے کی طرح اختیار اب بھی اُس کے قبضہ قدرت میں ہے وہ جس طرح کی تبدیلی چاہے کر سکتا ہے۔

مفسرین نے بالکل یہی بات درج ذیل آیت کے بارے میں کہی ہے کہ جس میں خُدا نے خوش، بخت لوگوں کو جنت کی خوش خبری سنائی ہے لیکن آخر میں استثناء کر دیا یہ کہہ دیا کہ اِلَّا مَاشَآءَ۔۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ سُعِدُوۡا فَفِى الۡجَـنَّةِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ ﴿۱۰۸﴾

وہ جو سعادت مند ہیں وہ جب تک زمین و آسمان برقرار ہیں، بہشت میں جاوداں طور پر رہیں گے مگر یہ کہ تیرا خُدا چاہے یہ عطا ختم نہیں ہوگی۔(ھود۔١٠٨)

اس آیت میں استثناء کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ان کے ہمیشہ جنت میں رہنے کا حکم خُدا سے اُس کا اختیار سلب نہیں کر سکتا۔ وہ انہیں جنت میں لے جانے کے بعد وہاں دوبارہ واپس بھی پلٹا سکتا ہے

البتہ یہ کہ یہ مشیت واقع بھی ہوگی یا نہیں، اس بات پر آیت کسی قسم کی دلالت نہیں رکھتی۔ بلکہ آیت کا ذیل جو کہ بہشت کے ایک دائمی اور ہمیشگی انعام اور عطیے ہونے کا اعلان کر رہا ہے وہ اس طرح کے انعامات کے دائمی اور جاودانی ہونے پر شاہد ہے۔ خُدا انہیں جنت سے نکالنے کا اردہ نہیں کرے گا۔

اس طرح کی آیات سے ایسا استدلال ان میں موجود ادبی، فلسفی اور علمی نکات سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہے یہاں تک ''مخطئہ'' کے محکم ترین دلائل ختم ہوئے۔ البتہ بعض انبیاء سے متعلق اور بھی کئی آیات آئی ہیں جو ان کی طرف نسیان کی نسبت دیتی ہیں۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

ہم نے اس سے پہلے آدم سے وعدہ لیا، وہ بھول گئے۔ ہم نے اُن میں (ارادے کی) اُستواری نہ پائی۔(طٰہٰ۔ ۱۱۵)

حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا

جب دونوں دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے۔ (کہف۔ ٦١)

مفسرین نے اس طرح کی آیات کے متعلق کئی توضیحات پیش کی ہیں۔ مثلاً دوسری آیت کے متعلق یہ کہا ہے یہاں بھولنے والا حضرت موسیٰؑ کا ساتھی تھا نہ کہ خود حضرت موسیٰ۔ علاقہ مقارنت اور مصاحبت کے قرینے سے فراموشی کو دوسرے شخص کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس بات پر شاید یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے خدا کو پکارا تو اُن کے ساتھی نے کہا:

فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ

میں مچھلی کو بھول گیا شیطان کے سوا یہ مجھے کسی نے نہیں بُھلائی۔ (کہف۔ ٦٣)

اسی طرح حضرت آدم سے متعلق آیت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ نسیان کا معنی خُدا سے کیے ہوئے وعدے پر عمل نہ کرنا ہے کیونکہ نسیان کا لازمہ ترک کرنا ہے۔ گویا ملزوم کہہ کر لازم کا ارادہ کیا گیا ہے۔ شاید آیت کا ذیل بھی اسی بات کی تائید کرے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا

ہم نے آدم میں عہد و پیمان پر استواری عمل نہ دیکھی۔ لہٰذا یہ وعدہ یاد کرانے اور اُس پر عمل نہ کرنے کی یاددہانی کرانے سے زیادہ ہم آہنگ ہے نہ کہ نسیان اور فراموشی سے۔

صرف ایک مقام باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ آیت ہے جس میں حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی سے گفتگو کے وقت نسیان اور فراموشی کی نسبت اپنی طرف دی ہے۔ جب ان کے دوسرے ساتھی (روایات کے مطابق حضرت خضر) نے اُن سے یہ وعدہ لیا کہ اُن کے تعجب خیز کاموں سے متعلق کوئی سوال نہ کریں اور حضرت موسیٰ نے اسے قبول بھی کرلیا۔ لیکن حیرت ناک کام مثلاً کشتی میں سوراخ کرنے کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ

ہی اعتراض کرنا شروع کر دیا۔اُن کے ساتھی نے انہیں اُن کا گذشتہ وعدہ دلایا تو انہوں نے معذرت کے طور پر کہا:

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيْتُ

جو کچھ میں بُھول گیا ہوں اُس پر میرا مواخذہ نہ کریں۔(کہف۔۷۳)

اس کی توجیہہ بھی گذشتہ بیان سے واضح ہوگئی وہ یہ کہ کبھی عمل میں تنزل کے لیے بھی ''نسیان'' کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے جسے کہ حضرت آدم سے متعلق آیت میں اسے بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ سہوالنبی''

اس موضوع پر حامی اور مخالف لوگوں کے دلائل سے آگاہی کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور مسئلہ بیان کیا جائے جو کہ متکلمین اور اسلامی فقہا کے درمیان ''سہوالنبی'' کے عنوان سے زیر بحث آتا ہے۔اسلامی فقہ اور کلام میں اس مسئلے کا بیان اُن احادیث کی وجہ سے سامنے آیا ہے جنہیں فریقین نے نقل کیا ہے اس سلسلے میں شیعہ اور اہل سنت سے منقول روایات کی تعداد بارہ سے تجاوز نہیں کرتی۔[1]

امامیہ فقہا اور متکلمین اس سلسلے میں دو نظریات رکھتے ہیں:

الف)اکثریت نے سہو کو جائز اور ممکن قرار دیا۔اس سلسلے میں شیخ مفید، شیخ طوسی، خواجہ نصیر الدین طوسی۔محقق صاحب شرائع، شہید اول اور علامہ حلی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ان میں سے نامور متکلم اور فقیہہ شیخ مفیدؒ نے سب سے زیادہ اس بات پر تاکید کی ہے انہوں نے نبی کے بارے میں سہو کو جائز قرار دینے والے علماء کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے۔علامہ مجلسی نے اس کتاب کا ذکر بحارالانوار میں کیا ہے۔[2]

اس سلسلے میں مذکورہ علماء کی آراء کے چند ایک نمونے ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔محقق طوسی تجرید الاعتقاد میں رقم طراز ہیں کہ عصمت کا نبی میں ہونا ضروری اور واجب ہے تاکہ اُس کی بات سے وثوق اور اطمیان حاصل ہو نیز یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبرؐ سہو کا مرتکب نہ ہو۔[3]

۲۔علامہ حلیؒ خواجہ کے کلام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پیغمبر کے لیے سہو جائز نہیں ہے تاکہ جس بات کی تبلیغ پر اسے مامور کیا گیا ہے۔اُس میں سہو کا شکار نہ ہو سکے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری، ج ۲ ص ۶۸، بحارالانوار ج ۱۷ ص ۹۷، ۱۲۹

[2] بحارالانوار ج ۱۷۔ص ۲۲۱، ۹۲۱

[3] کشف المراد ص ۱۹۵

[4] کشف المراد ص ۱۹۵

۳۔محقق حلی مختصر النافع میں لکھتے ہیں:

''حق بات تو یہ ہے کہ امامت کا منصب اس سے بالاتر ہے کہ عبادات میں وہ سہو کا شکار ہو سکے۔[۱]

۴۔علامہ حلی اپنی بعض فقہی کتابوں میں دو سجدہ سہو کی تعبیر کے مسئلے میں کہتے ہیں:

مخالفین نے ابو ہرہ ؓ کی اُس حدیث سے استدلال کیا ہے جو اُس نے پیغمبر اسلامؐ سے روایت کی ہے۔وہ یہ ہے کہ پیغمبر سجدہ اول کے بعد تکبیر کہتے تھے اور دوبارہ سجدے میں چلے جاتے تھے۔

لیکن ہمارے نکتہ نظر سے یہ حدیث درست نہیں ہے کیونکہ پیغمبرؐ کے لیے سہو محال ہے

علامہ حلی ایک اور مسئلے کے ذیل میں کہتے ہیں کہ:

شیخ (طوسی) نے کہا ہے چونکہ پیغمبرؐ سے سہو کا سرزد ہونا محال ہے اس لیے مالک کی بات صحیح نہیں ہے۔[۲]

شہید اپنی کتاب ''ذکری'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''ذی الیدین'' والی حدیث امامیہ کے نزدیک متروک ہے کیونکہ سہو سے نبی کے معصوم ہونے پر عقلی دلیل قائم ہو چکی ہے۔[۳]

ب) شیخ صدوق (م ۲۸۱)اور ان کے استاد محمد بن حسن ولید (م ۳۴۳) نے نبی کے لیے سہو کو جائز قرار دیا ہے۔اس کا انکار کرنے والے کو انہوں نے غالی قرار دیا ہے، لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ وہ پیغمبر کے لیے بطور مطلق سہو کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے بعض حالات اس کے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ مشترک امور جیسے مشترک۔جو اُس کے ساتھ مختص ہیں جیسے احکام الٰہی کی تبلیغ وغیرہ اُن میں سہو اور فراموشی درست اور ممکن نہیں ہے لیکن مشترک امور جیسے عبادات وغیرہ ان میں نبی کے لیے سہو ممکن ہے۔لیکن اس جگہ پر دوسرے انسانوں کے سہو اور پیغمبر معصومینؑ کے سہو کی وجہ کا ارادہ اور مشیت ہے معصومینؑ کے متعلق انساءاللہ ہے نہ کہ انساءالشیطان۔[۴]

ج) سید مرتضیٰ (م ۴۳۶) نے اس مقام پر ایک اور تفصیل بیان کی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ احکام اور شرعی مسائل کی تبلیغ نیز دوسرے ایسے امور جن میں سہو و نسیان ایک نفرت عمومی کا باعث ہو اُن میں پیغمبرؐ خُدا کے لیے سہو اور نسیان ممکن نہیں ہے جب کہ دوسرے موادد پر سہو کسی قسم کا اشکال نہیں رکھتا۔[۵]

د) امین الاسلام طبرسی مئولف مجمع البیان بھی تفصیل کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں:

---

[۱] المختصر النافع ص ۴۵

[۲] منتھی المطلب ص ۴۱۸،۴۱۹

[۳] الذکری ص ۲۱۵

[۴] ممن لا یحضرہ الفقیہہ ج ۱ ص ۲۳۲

[۵] تنزیہ الانبیاء، ص ۸۷

احکام الٰہی کی تبلیغ کے سلسلے میں انبیاء کے لیے سہو اور نسیان ممکن نہیں ہے۔ لیکن دوسرے موارد میں جہاں پر حکم عقل کے مخالف نہ ہو تو سہو کسی قسم کا اشکال نہیں رکھتا اور امامیہ اسے ممکن اور جائز قرار دیتے ہیں۔[1]

ھ) علامہ مجلسی اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

یہ ایک بہت پیچیدہ موضوع ہے کیونکہ بہت سی روایات اور آیات انبیاء کے متعلق سہو کو ممکن قرار دے رہی ہیں جب کہ دوسری طرف ہمارے علما کی اکثریت نے صرف چند ایک کو نکال کر سہو کے عدم جواز پر اتفاق رائے قائم کیا ہوا ہے۔ بعض آیات، روایات اور کلامی و اصولی دلائل بھی اسی سے ہم آہنگ ہیں۔ علاوہ ازیں سہو سے متعلق روایات میں بھی ایک ضعف اور غلل پایا جاتا ہے۔ سہو پر دلالت کرنے والی آیات بھی قابل تاویل ہیں خُدا ہی صحیح راستے کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔[2]

چونکہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی یقینی اور قطعی رائے کا اظہار نہیں کیا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے انہوں نے اس مسئلے میں ''توقف'' کیا ہے لیکن اُن کے کلام کے ذیل کو مدنظر رکھتے ہُوئے یہ معلوم ہوتا ہے وہ ''سہو النبی'' میں مخالفین کے ہم نوا ہیں۔[3]

تحقیق

اس موضوع پر اسلامی محققین کی آراء سے آگاہ ہونے کے بعد ہم اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ صدوق مرحوم کی بات (جب کہ اصول عقائد میں انکی بات حجت اور صحیح بھی ہو تو) واقفیت کے قریب ہے کیونکہ بسا اوقات ممکن ہے کہ خُدا نے مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ پیغمبر پر سہو اور نسیان طاری ہو جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ایسا لوگوں کو غلو سے اور انبیاء کی الوہیت کے قیدے سے بچانے کے لیے ہو۔ اس طرح کا کام بہت زیادہ مصلحت پر مشتمل ہے لہٰذا مسئلہ انساء اللہ ہے نہ کہ شیطان کے غلب یا پیغمبر پر دنیوی افکارات کے غلبے کا۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ روایات حجت بھی ہیں؟ یعنی کیا باب عقائد میں ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ محقق معاصرہ جناب آقا شوستری نے قاموس الرجال'' ج ۱۱ کے آخر میں ایک پورے رسالے میں ان تمام روایات کا ذکر کیا ہے۔ مزید تحقیق کے خواہاں حضرات مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ج ۲ ص ۳۱۷

[2] بحار الانوار ج۔ ۱۷ ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

[3] یعنی وہ بھی قائل ہیں کہ نبی کے لیے سہو جائز اور ممکن نہیں ہے۔ (مترجم)

(١٦) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ چہارم)

بیکراں علم ودانش

زیر بحث آیات کی فہرست

١۔ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (بقرۃ۔٢٥١)

٢۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ (یوسف۔٢٢)

٣۔ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء۔٧٤)

٤۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ (قصص۔١٤)

٥۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾ (مائدۃ۔٩١)

٦۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (عنکبوت۔٤٥)

٧۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾ (نمل۔١٥)

٨۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾ (نمل۔١٦)

۹۔ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ
فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾ (نساء۔۱۱۳)

۱۰۔ وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل۔۸۵)

۱۱۔ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّوۡا
عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ (نوح۔۲۶۔۲۷)

۱۲۔ وَاُوۡحِىَ اِلٰى نُوۡحٍ اَنَّهٗ لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ
بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾ (ھود۔۳۶)

۱۳۔ يٰبُنَىَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰٓى اِخۡوَتِكَ فَيَكِيۡدُوۡا لَكَ كَيۡدًا ؕ اِنَّ
الشَّيۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۵﴾ وَكَذٰلِكَ يَجۡتَبِيۡكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنۡ
تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ وَيُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعۡقُوۡبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰٓى
اَبَوَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶﴾
(یوسف۔۵۔۶)

۱۴۔ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِيَنِىۡ بِهِمۡ جَمِيۡعًا ؕ (یوسف۔۸۳)

۱۵۔ اِنِّىۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾ (یوسف۔۹۴)

۱۶۔ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ؕ (ال عمران۔۴۹)

۱۷۔ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ؕ (صف۔۶)

۱۸۔ وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِىُّ اِلٰى بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِيۡثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِهٖ وَاَظۡهَرَهُ اللّٰهُ
عَلَيۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ
هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۳﴾ (تحریم۔۳)

۱۹۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰۤـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ

بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۱ (بقرۃ۔۳۱)

۲۰۔ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳۲ (بقرۃ۔۳۲)

۲۱۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝۳۳ (بقرۃ۔۳۳)

تفسیر۔

انبیاء کی ایک خصوصیات اُن کا مختلف مسائل میں علم و آ گہی سے سرشار ہونا ہے۔ہم اس باب میں اُن کے علم اور آ گہی کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لائیں گےاور قرآنی نکتہ نظر سے ان پر گفتگو کریں گے۔

(الف) الٰہی قانون سے کامل آ گاہی

انبیاء کے علم کا پہلا مرحلہ جو کہ اُن کے مقام نبوت کا بھی اٹوٹ انگ ہے، وہ خُدا کے قانون اور شریعت سے پوری آ گاہی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہ بعثت کے اہداف کی تکمیل کے لیے جن چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔پیغمبراُن سے پوری طرح آ گاہ ہوتا ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد تعلیم وتربیت، معاشرے میں عدل وانصاف کی حکمرانی اور لوگوں کو یکتا پرستی اور توحید کی طرف بُلانا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس موضوع میں ان کا علم آ گہی بھی جامع ہوتا کہ وہ اس عظیم ہدف کی ذمہ داری کو پورا کرسکیں۔

اصولاً یہ بات کوئی معنیٰ نہیں رکھتی کہ خُدا بعض لوگوں کو چند مخصوص اہداف کے لیے مبعوث کرے لیکن اس کام کے لیے ضروری وسائل ان کے اختیار میں نہ دے۔

انبیاء کے علوم سے متعلق آیات پرغور وفکر کرنے سے اس حقیقت کو پوری طرح درک کیا جاسکتا ہے بعض آیات میں چند انبیاء کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ انہیں حکمرانی اور فرماں روائی کے مقام سے نوازا گیا۔اس کے بعد اُن کے علم ودانش کو بیان کیا گیا۔گویا یہ بتایا گیا ہے کہ حکمرانی اور انصاف کرنے کے وسائل جو کہ علم ہی ہے اُن کے اختیار میں دیے گئے۔اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ خُدائی حکمران حق یا حکم یا ذمہ داری سے جاہل ہوں۔البتہ اس بات کا امکان ہے کہ مسئلے کی وضاحت اور ذمہ داری اور کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے خدا کی طرف سے وحی کے منتظر ہیں لیکن خدا کی طرف سے وحی کے آنے کے بعد اُن کے لیے کوئی چیز مجہول اور نامعلوم نہیں رہتی۔اس سلسلے میں زیر نظر آیات پرغور کیا جائے۔

۱۔حضرت داوٗد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ

خُدا نے حکومت اور حکمت داوٗد کو عطا کی اور جو کچھ وہ چاہتے تھے انہیں سکھایا۔(بقرۃ۔۲۵۱)

۲۔حضرت یوسف کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ط

جب وہ بلوغ تک پہنچے تو ہم نے انہیں حکومت اور علم عطا کیے۔(یوسف۔۔۲۲)

۳۔حضرت لوط کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا

لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا کیے۔(انبیاء۔۷۴)

۴۔حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰىٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا

جب وہ عمر کے لحاظ سے کمال کی حد تک پہنچے تو انہیں فیصلے کرنے اور علم کا مقام عطا کیا۔(قصص۔۱۴)

ان آیات میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ مقام ''حکم'' اور ''ملک'' عطا کرنے کے بعد علم و دانش کی بات کی گئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے بیان اور اجر کے مقام کے لیے ضروری علم سے بہرہ مند ہیں [1]۔

ب) فلسفہ تشریع سے آگاہی

تشریع سے آگاہی ایک سکہ کے دورخوں کی مانند ہے ایک رُخ تو احکام پر مشتمل ہے جب کہ دوسرا احکامات کے معیار اور موازین پر۔چونکہ خُدا کا کوئی کام عبث اور لغو ہونے سے مبرا ہے۔لہٰذا یقینی طور پر قانون گزاری جو کہ اُس کے افعال میں سے ایک فعل ہے وہ بھی کسی معیار اور میزان کی بنیاد پر ہے۔انبیاء پر ہے۔انبیاء اُن معیارات اور موازین سے واقف تھے۔اگرچہ اس سلسلے میں قرآنی آیات سے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی جاسکتی لیکن بعض آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔نیز بعض روایات پر بھی غور وخوض کرنے سے انبیاء کے ان معیارات سے

---

[1] اس کے باوجود حضرت یوسف، حضرت لوط اور حضرت موسیٰ کے متعلق آیات میں ایک اور نظریہ بھی دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ ''حکم'' سے مراد وہی حکیمانہ تعلیمات ہیں جو انہیں عطا کی گئی ہیں۔پیغمبر اسلامؐ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ (بنی اسرائیل۔۳۹)

آگاہ ہونے پر استدلال قائم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے خُدا کے بعض احکام کا معیار بیان کیا ہے اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خُدا نے پیغمبرؐ اکرم کو اپنے احکام کے معیار اور میزان سے آگاہ کیا ہے۔ چونکہ یہ چیز آپ کی خصوصیات میں سے شمار کی گئی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے انبیاء بھی ایسے علم کے حامل تھے۔ قرآن نے شراب خوری اور جوئے کی حرمت کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٩١﴾

شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرے اور خُدا کی یاد اور نماز سے تمہیں روک دے۔ کیا تم اس بُرے کام سے رُکتے نہیں ہو؟ (مائدۃ۔۹۱)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ

نماز قائم کرو۔ بے شک نماز انسان کو برائیوں سے روکتی ہے۔ (عنکبوت۔۴۵)

بعض دوسری آیات میں کئی اور احکام الٰہی کے معیارات بیان کئے گئے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ سے جو روایات احکام کا فلسفہ بیان کرنے کے لیے ذکر ہوئی ہیں ان سے بھی اس بات پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء احکام کے معیارات اور فلسفہ سے آگاہ تھے۔ اس بات کے پیش نظر کہ ان کا علم پیغمبر اکرمؐ کے علم پر منتہی ہوتا ہے لہٰذا پیغمبر اکرمؐ بھی اُن سے آگاہ ہیں گذشتہ مطلب کی بنیاد پر انبیاء کے علم پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔

شیخ صدوق مرحوم نے اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب بنام ''علل الشرائع'' لکھی ہے جس میں انہوں نے شریعت کا فلسفہ اور احکام کی حکمت بیان کی ہے ہم نمونے کے طور پر چند ایک کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

الف) امام خون پینے کی حرمت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خون پینا اکھڑپن اور سنگ دِلی کا باعث بنتا ہے اس بات کا خطرہ ہے کہ باپ بیٹے تک کو قتل کر دے۔[1]

(ب) شراب خوری کے متعلق فرماتے ہیں:

''شرابی لوگ بت پرستوں کے مانند ہیں۔ آخر کار وہ رعشہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جوانمردی جیسی صفت

[1] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۸۷۲

اُن سے دور ہو جاتی ہے۔ اس بات کا خطرہ بھی ہے زشت کردار کی وجہ سے خون ریزی تک پر اتر آئیں۔ [۱]

یہ مثالیں نبی اکرمؐ کے معصوم جانشیوں کے علم کے ذریعے سے ہماری راہنمائی پیغمبر اسلامؐ کے علم کی وسعت کی طرف کرتی ہیں۔ مزید تفصیل کے خواہش مند حضرات مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ اس بُرھان کا نتیجہ علم پیامبر کے بارے میں کلی اور عمومی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو فی الجملہ اور اجمالی طور پر علم پیامبر کو ثابت کرتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ہماری گفتگو ثبوت اور امکان کے مرحلے میں نہیں ہے بلکہ گفتگو اثبات اور وقوع کے مرحلے میں ہے۔ مقام نبوت اور امکان میں تو کسی قسم کی تردید نہیں پائی جاتی۔

بعض آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض اولیائے خدا معیارات اور موازین کی بنیاد پر فیصلے سناتے تھے۔ اور حکم کا اجر کرتے تھے۔ اس کی مثال حضرت موسیٰؑ کے ساتھی ہیں جنہوں نے تین حیرت ناک کام سرانجام دیے۔ پھر ان کی تشریح و تفسیر کی اور واضح کیا کہ اُس کے کاموں کی اساس عالم تکوین کے متون سے آگاہی اور ان پر پیدا ہونے والے مصالح و مفاسد کے پیش نظر تھی۔ مثلاً

الف۔ لوگوں کی کشتی میں سوراخ کر دیا۔

ب۔ دیوار جو گرنے کے قریب تھی اُس کو از سرنو تعمیر کر دیا۔

ج۔ ایک نوجوان کو بے گناہ قتل کر دیا۔

جب حضرت موسیٰ نے اُن سے ان تعجب خیز کاموں کے متعلق پوچھا تو انہوں نے ان کاموں کا فلسفہ اور حکمت بیان کی اور اپنے آپ کو اُن معیارات کے مطابق حکم جاری کرنے پر مامور قرار دیا۔ فرمایا:

''میں نے کشتی میں اس لیے سوراخ کیا تا کہ آگے بادشاہ کے کارندوں کو اس میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو کیونکہ ان کا کام قیمتی اشیاء کی لوٹ مار تھا۔ نوجوان کو قتل کیا کیونکہ اس کے ماں باپ مومن تھے۔ ہمیں خطرہ ہوا کہ وہ اپنے ماں باپ کو کفر اور طغیان کے راستے پر نہ لے جائے۔ [۲]

دیوار کی تعمیر کا کام مفت کیا کیونکہ دیوار کے نیچے ایک خزانہ تھا۔ جو ایک یتیم کی ملکیت تھا۔ دیوار گرنے کے ساتھ وہ خزانہ سب لوگوں کی نظروں میں آ جاتا اور وہ لوٹ لے جاتے۔ خُدا نے یہ چاہا کہ اس طریقے سے وہ خزانہ پوشیدہ رہے اور اُس تک کوئی ہاتھ نہ پہنچے جب وہ بڑے ہو جائیں تو وہ خزانہ نکال کر اُس سے بہرہ مند ہوں۔

یہ تمام جوابات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے ساتھی کو ان احکام کی حکمت اور فلسفے سے پوری پوری آشنائی تھی۔ علاوہ ازیں ان کاموں میں موجود مصلحت سے حضرت موسیٰ کی عدم آگاہی ان کے ساتھی کے لیے تعجب کا باعث بن رہی تھی

---

[۱] بحارالانوار جلد ۱۴ ص ۲۷۸

[۲] ۔اس حکمت سے متعلق آیت اس طرح ہے ''فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا'' اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے۔

ج۔ پرندوں کی زبان سے واقفیت

پرندوں کی زبان سے واقفیت ایک ایسا کمال ہے جو خدا نے حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ کو عطا فرمایا۔ سورہ نمل کی آیت ۱۵ اور ۱۶ میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ اِن دو آیات کے تحلیل و تجزیہ سے ان دونوں نبیوں کے علم کی وسعت اور اس کے نتیجے میں پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے انبیاء کے علم کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

''ہم نے داؤد اور سلیمان کو خاص علم عطا کیا وہ دونوں کہتے تھے تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ (نمل۔ ۱۵)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

سلیمان نے داؤد سے میراث پائی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: اے لوگو (خُدا کی طرف سے) پرندوں کی بولی مجھے سکھائی گئی ہے اور ہر کمال مجھے عطا کیا گیا ہے۔ یہ واضح اور عظیم فضل ہے۔ (نمل۔ ۱۶)

اس آیت کے مختصر سے جملات کے متعلق غور و فکر کرنے سے ہمیں انبیا کے علم کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

الف۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ عَلْمًا

اس جملے میں ''علم'' بطور نکرہ ذکر کیا گیا ہے جو تعظیم پر دلالت کر رہا ہے نہ کہ تحقیر پر کیونکہ یہ پیغمبر کی تعریف کے مقام کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔

ب۔ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

''ہم پرندوں کی زبان جانتے ہیں''

''پرندوں کی مختلف بولیوں کے پیش نظر یہ علم بھی وسیع اور بے کراں ہوگا۔''

ج۔ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ

''ہمیں ہر کمال عطا کیا گیا ہے۔''

یہ جملہ ایک خاص قسم کی وسعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ یہ دو پیغمبر ہر کمال سے بہرہ مند تھے۔ کوئی ایسا کمال نہیں تھا جو انہیں عطا نہ کیا گیا ہو۔ صرف وہی کمال نہیں عطا کیا گیا جس کے عطا نہ کرنے میں کوئی مصلحت ہو جیسا کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ (یس۔۶۹) اور ''وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ'' (عنکبوت۔۴۸)

کی آیات یہ بتاتی ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام شعر کہنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ نیز وہ بعثت سے پہلے لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے ۔ایسا ایک عظیم تر مصلحت کی وجہ سے تھا۔ اُس مصلحت کی وجہ سے خُدا نے یہ دو کمال آنحضرت کو عطا نہ کیے کیونکہ اگر وہ شعر کہتے ہوتے تو یہ تہمت لگائی جا سکتی تھی کہ قرآن بھی اُس کا ایک ادبی شاہکار ہے۔ اسی طرح اگر وہ لکھنا اور پڑھنا جانتے ہوتے تو مخالفین کا یہ اعتراض ان پر وارد ہو سکتا تھا کہ آپؐ نے قرآن گذشتہ علماء کی کتب اور یہود و نصاریٰ سے اخذ کیا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اپنی آیات کے ذریعے اُن کے اِن بے بنیاد اعتراضات کو رد کر دیا ہے۔

قرآن نے پیغمبر اسلامؐ کے علم کی وسعت بیان کرنے کے لیے ایک خاص تعبیر استعمال کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (نساء۔۱۱۳)

خُدا نے آپ پر کتاب و حکمت نازل کی۔

چونکہ آخری جملہ ''وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾'' ہے گویا علم پیغمبر کو بیان کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا یہ یقینی طور پر پیغمبر کے علم کی عظمت اور وسعت پر دلالت کر رہا ہے۔ جہاں پر خدا انسان کے علم کی وسعت بیان کرے وہاں ایسا ہی ہوگا۔ (اس اجمال کی تفصیل آپ خود ہی حاصل کر سکتے ہیں) جب کہ اسی قرآن نے تمام انسانوں کے مجموعی علم کو بھی معمولی شمار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل۔۸۵)

د۔ انبیاء اور غیب کا علم

انبیاء کے علم کا ایک حصہ پوشیدہ اسرار سے اُن کا آگاہ ہونا ہے۔ گویا اصطلاحی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ علم غیب رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں بہت آیات ہیں۔ ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔ نوحؑ آئندہ آنے والی نسل کی خبر دے رہے ہیں

ہزاروں سال تبلیغ کرنے کے بعد جب حضرت نوح اپنی قوم کے ہدایت پانے سے مایوس ہو گئے تو ان کو بد دعا دی اور کہا:

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾

اے خدا کسی کافر کو زمین پر نہ چھوڑ کیونکہ اگر تو نے انہیں باقی رکھا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور بدکار اور کافر اولاد کے سوا کچھ پیدا نہیں کریں گے۔ (نوح۔۲۶،۲۷)

حضرت نوح نے آئندہ سے متعلق دو امور کے متعلق خبر دی ہے:

۱۔ کافر ایمان نہیں لائیں گے اور وہ بندگان الٰہی کو گمراہ کریں گے۔

۲۔ اِن کافروں سے پیدا ہونے والے بچے بھی بے دین اور فسادی ہوں گے۔

حضرت نوح کو یہ دو غیبی خبریں کیسے معلوم ہوئیں؟

ممکن ہے یہ جواب دیا جائے کہ پہلی بات تو انہوں نے اپنی قوم کے اُس کردار و گفتار کے مطالعے اور مشاہدے سے معلوم کی جو انہوں نے کئی سال ان کے درمیان رہ کر حاصل کیا۔ لہٰذا اس کا تعلق غیب اور ماوراء طبیعت سے نہیں ہے۔ لہٰذا اسے ایک امتیاز کے طور پر ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ہم قرآن کی طرف رجوع کریں تو یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اس سلسلے میں حضرت نوح کی آ گاہی اور علم کا سرچشمہ وحی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

نوح پر وحی ہوئی جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اُن کے علاوہ تیری قوم میں سے کوئی تجھ پر ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا اُن کے کاموں سے آزردہ خاطر نہ ہو۔ (هود۔۳٦)

واضح ہوتا ہے کہ انہیں اِس بات پر آ گاہی کہ اُن کی قوم کے کافر ایمان نہیں لائیں گے اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ خُدا نے انہیں اپنی قوم کے مستقبل سے پوری طرح آ گاہ کر دیا تھا۔

یہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے موضوع (کافروں کی بعد والی نسل) سے حضرت نوح کی آ گاہی کا سرچشمہ بھی وحی الٰہی ہے۔ غیب کا یہ علم خُدا نے انہیں عطا کیا ہے۔

۲۔ یوسفؑ کے مستقبل سے حضرت یعقوب کی آ گاہی

جب حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں تو انہوں نے یہ بات اپنے باپ

حضرت یعقوب کو بتائی تو انہوں نے کہا:

يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝۵ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝۶

اے میرے بیٹے: اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا تا کہ وہ تیرے ساتھ مکر وفریب نہ کریں۔ بے شک شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔اسی طرح تجھے کلام کی تاویل کے لیے منتخب کرے (تعبیر خواب کا علم تجھے عطا کرے گا) اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر تمام کرے جیسے کہ تیرے آباء ابراہیم اور اسحاق پر تمام کی بے شک تیرا رب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔(یوسف۔۵۔۶)

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں حضرت یعقوبؑ نے چند غیبی باتوں کے متعلق پوری قاطعیت کے ساتھ خبر دی ہے۔

۱۔ بردران یوسف۔کوتعبیر کی سازش کی خبر

۲۔حضرت یوسف کوتعبیر خواب کے علم کے عطا ہونے کی خبر

۳۔انہیں نبوت اور پیغمبری کے عطا ہونے کی خبر

ایسی غیبی چیزوں پر آ گاہی تو خُدا کے ایک خاص فضل وکرم کی وجہ سے ہی ہوتی ہے جو حضرت یعقوبؑ پر کیا گیا تھا۔

چنانچہ ایک اور آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ

یعقوب کو جو کچھ ہم نے سکھایا ہے اُس کی وجہ سے وہ اہل علم ودانش ہے۔ (یوسف۔۶۸)

اس آیت میں حضرت یعقوبؑ کے علم سرچشمے کو واضح طور پر بیان کیا ہے وہ سرچشمہ اور منبع خُدا کی خاص تعلیم ہے۔

خُدا کی اسی خاص تعلیم کی وجہ سے وہ کئی اور مقامات پر بھی غیب کی خبر دیتے ہیں:

الف۔ یوسفؑ کے بھائیوں کی اس خبر کو جھٹلانا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ بلکہ انہیں خبر دینا کہ یوسفؑ زندہ ہیں۔

ب۔یوسفؑ کے بھائیوں کی دوسرے بھائی (بنیامین) کے متعلق خبر کو جھٹلایا جب یوسفؑ نے اسے اپنے پاس ٹھہرالیا تھا جب کہ بھائیوں نے باپ سے کہا: وہ چوری کے جرم میں گرفتار ہوگیا ہے۔حضرت یعقوبؑ نے ان سے کہا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ

اُمید ہے کہ خدا ان دونوں (یوسف اور اس کے بھائی) کو میری طرف پلٹائے گا۔ (یوسف۔ ۸۳)

ج۔ جب وہ کارواں یوسف کی قمیص لے کر مصر سے باہر نکلا تو حضرت یعقوب نے کہا:

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴿۹۴﴾

میں یقینی طور پر یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اگر تم مجھے جھٹلاؤ نہیں۔ (یوسف۔ ۹۴)

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کا غیب کی باتیں سُنانا

قرآن نے حضرت عیسیٰ اور اُن کی غیبی خبروں کا تذکرہ دو مقام پر کیا ہے:

الف۔ لوگوں نے جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ

تم جو کچھ کھاتے ہو اور تم نے جو گھر میں ذخیرہ کر رکھا ہے اُس سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں۔ (ال عمران۔ ۴۹)

ب۔ خاتم النبیینؐ کی نبوت کی خبر۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ

میں تمہیں اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ (صف۔ ۶)

۴۔ پیغمبر اسلامؐ اور غیب کی خبریں

قرآن کریم نے کئی مقامات پر پیغمبر اسلامؐ کا غیب کی خبریں سنانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ہم صرف ایک نمونہ یہاں پیش کرتے ہیں:
پیغمبر اکرمؐ نے اپنی ایک بیوی سے چند باتیں کی اور اُسے کہا کہ ان کی ایک راز کی طرح حفاظت رکھنا۔ کسی کو نہ بتانا لیکن اُس نے پیغمبرؐ کی اس ہدایت پر عمل نہ کیا بلکہ افشائے راز کر دیا۔ خدا نے پیغمبرؐ کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ رسولؐ اسلام نے افشا کرنے والی کو چند باتیں بتا دیں جن کا اُس نے افشا کیا تھا۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئی اور دریافت کیا کہ آپؐ کو یہ کس نے بتایا ہے؟ پیغمبر اسلامؐ نے اسے جواب دیا: آگاہ اور دانا خُدا نے مجھے اس سے باخبر کیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ
عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ

قَالَ نَبَّاَنِيَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ③ (تحریم۔ ۳)

گذشتہ موارد انبیاء کے غیب سے مطلع ہونے کے چند ایک نمونے ہیں جنہیں قرآن نے بیان کیا ہے۔ قرآن میں اس کی کئی اور مثالیں بھی ہیں لیکن ہم اختصار کے پیش نظر انہیں یہاں بیان نہیں کرتے ہیں۔ [1]

ھ۔ انبیاء اور حقائق خلقت سے آگاہی

بعض آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء خلقت کے رازوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ گویا ان کی روح قوانین خلقت اور سنن آفرنیش کا آئینہ تمام نما تھی۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تین آیات پر غور و فکر ہی کافی ہے۔

۱۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ㉛ (بقرۃ۔ ۳۱)

۲۔ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ㉜ (بقرۃ۔ ۳۲)

۳۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ㉝ (بقرۃ۔ ۳۳)

ترجمہ:

۱۔ اس نے آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے اس کے بعد وہ فرشتوں کے سامنے پیش کیے اور کہا اگر تم سچ کہتے ہو تو مجھے ان ناموں کے متعلق بتاؤ۔

۲۔ فرشتوں نے کہا: تیری ذات سبحان ہے ہم صرف وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ تو جاننے

---

[1] مثلاً حضرت صالح کے متعلق یہ ملتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ ⑥⑤ (ھود۔ ۶۵) تین دن اپنے گھروں میں رہ لو، اس کے بعد تم نابود ہو جاؤ گے اور یہ قطعی خبر ہے۔

والا اور حکمت والا ہے۔

۳۔اس کے بعد آدم سے کہا: فرشتوں کو ان ناموں سے آگاہ کرو۔ جب اُس نے انہیں ان ناموں سے آگاہ کیا تو خُدا نے کہا میں نے تمہیں یہ نہیں کہا کہ میں زمین وآسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں؟ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہواُسے جانتا ہوں۔

ان تین آیات کا مضمون ان مضامین میں سے ہے جو قرآن میں صرف ایک بار آئے ہیں کلام خُدا میں ان کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی کہ جس کے ساتھ انہیں ملا کر مجموعی طور پر تفسیر کی جائے۔ اور بعض کا ابہام بعض دوسرے کی مدد سے دور کیا جائے۔ لہٰذا مفسرّین نے ان تین آیات کی تفسیر کے سلسلے میں مختلف اقوال وآرا اور نظریات بیان کیے ہیں۔ یہ صرف احتمالات کے زمرے میں آتے ہیں جن پر کوئی شاہد دلیل موجود نہیں۔ آیات کے کلمات اور جملات کے درمیان ربط کو برقرار رکھتے ہوئے اِن آیات کی تفسیریوں کی جاسکتی ہے:

الف۔ آیات کی ابتداء میں ''تعلیم اسماء'' کی بات کی گئی ہے ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ'' اس سے متبادر موجودات کے اسماء ہیں۔ لیکن یہ ابتدائی (تبادر والا) معنی مراد نہیں ہے تین وجوہات کی بناپر۔

ا۔اس دور میں کوئی لغت اور زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی کہ آدم ایک مروج لغت کے سہارے اشیا کے ناموں سے آگاہ ہوتے۔ اگر خُدا نے بہشت میں آدم سے گفتگو کی ہے یا اُسے زمین پر اتارنے کے بعد اُس سے مخاطب ہوُا ہے تو اس گفتگو اور خطاب کی کیفیت ہمارے لیے واضح نہیں ہے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ خُدا کی گفتگو انسان کے درمیان مروج گفتگو کے مانند تھی یعنی اُس نے الفاظ آواز پیدا کر کے اُس سے گفتگو کی یا یہ کہ اس طرح نہیں تھی۔

۲۔صرف ناموں کی تعلیم دینا ایک لغت کی تعلیم کے مانند کسی افتخار اور اعزاز کا باعث نہیں ہوئی کہ جس کی وجہ سے آدم فرشتوں پر برتری حاصل کر سکتے۔

۳۔اگر مُراد اسماء کی تعلیم تھی تو پھر ''ھا'' کی ضمیر لانا چاہیے تھی کیونکہ یہ اُن تمام اشیاء کے لیے استعمال ہوتی ہے جو عقل وشعور سے تہی ہوتے ہیں۔ یہ کہنا چاہیے تھا ''ثم عرضھا'' و ''باسماھا'' جب کہ ان موارد پر ''ھم'' کی ضمیر لائی گئی ہے جو کہ عقل وشعور کی حامل موجودات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسماء سے مراد الفاظ اور نام نہیں ہیں بلکہ مُراد ان کے اندر موجود حقائق ہیں دوسرے الفاظ میں ان اسماء کے ''مسمیات'' مُراد ہیں اور مقصود موجودات کے حقائق اور ان پر حکم فرما قوانین کا جاننا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال سامنے آئے کہ اگر مُراد مسمیات اور موجودات ہیں تو وہ بھی تو تمام کے تمام عقل وشعور سے بہرہ مند نہیں ہیں۔ لہٰذا یہاں عقل وشعور کے حامل موجودات والی ضمیر کیوں لائی گئی ہے۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی نکتہ نظر سے پوری کائنات اور تمام موجودات اپنے رتبہ وجودی کی مناسبت سے ایک علم وآگہی سے بہرہ مند ہیں۔ لہٰذا اُسی حد تک خُدا کی حمد اور ستائش میں بھی مشغول ہیں چنانچہ

ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط

ہر چیز خُدا کی تسبیح کر رہی ہے یہ تم ہو جو ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔ (بنی اسرائیل۔ ۴۴)

یہ آیت واضح طور پر مذکورہ بات کی تائید کرتی ہے۔

مذکورہ تفسیر پر ایک اور شاہد یہ جملہ ہے:

إِنِّيْٓ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

یہ جملہ فرشتوں کو حضرت آدم کے تعلیم اسماء دینے کے بعد آیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مراد الفاظ اور اسماء کی تعلیم نہیں ہے بلکہ زمین و آسمان کے رازوں کی تعلیم دینا مقصود ہے۔ وہ تمام کے تمام یا بعض آدم کو عطا کر دیئے گئے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات کے رازوں سے آگاہی کی وجہ سے آدم کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ زمین پر اُترے اور زمین کو آباد کرنے کی سعی و کوشش کرے کیونکہ علم ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا

اُس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس کے آباد کرنے پر تمہیں مامور کیا۔ (ھود۔ ٦١)

آیات سے مجموعی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ خُدا کی طرف سے آدم کو خلافت عطا کرنے کا معیار وہی تعلیم اسماء تھا۔ اس سے یہ نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ خُدا کے تمام خلفاء یعنی انبیاء اور ان کے اوصیا اس علم سے فیض یاب تھے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ آیات میں غور وفکر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ خاندان عصمت وطہارت سے مروی روایات بھی اسی نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ مشہور شیعہ مفسر عیاشی جو کہ کلینی مرحوم (م ۳۲۹) کے معاصر تھے۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ خُدا نے آدم کو کیا سکھایا تھا؟ آپ نے فرمایا: زمینیں، پہاڑ۔ درے، بیابان۔ پھر آپ نے اپنے نیچے بچھی ہوئی بساط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

میرے قدموں میں بچھی ہوئی بساط تک کا علم بھی انہیں عطا کیا تھا۔ [۱]

یہ نظریہ جو ہم نے بیان کیا ہے یہ تفسیر کی کتب میں بھی اجمالی طور پر آیا ہے۔ طبرسیؒ نے اسے سب سے بہتر قول قرار دیا ہے۔ [۲]

---

[۱] تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۳۲ اُس نے اس مضمون کی دو اور احادیث بھی بیان کی ہیں۔ رجوع کیا جائے۔

[۲] مجمع البیان ج ۱ ص ۷٦

(۱۷) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ پنجم)

ان کے رُوحانی اور جسمانی کمالات

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ (هود۔ ۷۵)

۲۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ (نحل۔ ۱۲۰)

۳۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (انبياء۔ ۵۱)

۴۔ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ (نجم۔ ۳۷)

۵۔ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾
(ص۔ ۴۵)

۶۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ (ص۔ ۴۶)

۷۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾
(انعام۔ ۸۶)

۸۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (انبياء۔ ۸۵)

۹۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مريم۔ ۵۴)

۱۰۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا
مِنْ حَوْلِكَ ۪ (ال عمران۔ ۱۵۹)

۱۱۔لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ
عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ۔ ۱۲۸)

۱۲۔وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ﴿۴﴾ (قلم۔ ۴)

۱۳۔قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرۡ لِىۡۤ اَمۡرِىۡ ﴿۲۶﴾ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ
لِّسَانِىۡ ﴿۲۷﴾ يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِىۡ ﴿۲۸﴾ (طٰہٰ۔ ۲۵ تا ۲۸)

تفسیر۔

گذشتہ ابواب میں انبیاء کی دو اہم ترین خصوصیات یعنی عصمت اور علم کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی گئی۔ عصمت اور علم حقیقت میں انبیائے الٰہی کی روحانی اور معنوی خصوصیات میں سے شمار ہوتی ہیں۔ اس باب میں ہمارا مطمحِ نظر انبیاء کے دوسرے روحانی اور جسمانی کمالات کو بیان کرنا ہے۔ البتہ اختصار کے ساتھ ہماری بحث دو حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔روحانی کمالات

۲۔جسمانی کمالات

دونوں پہلوؤں کو ہم عقل اور وحی کے نکتہ نظر سے زیر بحث لائیں گے۔

الف۔ انبیاء کے روحانی کمالات اور عقل کا فیصلہ

انبیاء کی بعثت کے مقصد (جیسا کہ ہم نے کئی بار اسے ذکر کیا ہے) کو ہم تین کلی محوروں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔انسان کی فکر اور عقیدہ کی اصلاح

۲۔جبلی خواہشات میں توازن یا معاشرے کی اخلاقی اصلاح

۳۔معاشرے میں مختلف جہات سے عدل و مساوات کا قیام (معاشرتی اصلاح)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی عظیم آرزوؤں کی مکمل اور جامع تکمیل تب ہی ممکن ہے جب انسان خُدا کے انبیاء پر پورا پورا اعتماد رکھتا ہو۔

اُن پر اعتماد تب ہی ہو گا جب ہر قسم کی فکری اور روحانی لغزش سے محفوظ و مبرّا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبوت کے بلند ترین اہداف کی تکمیل تب ہی ہو سکتی ہے جب اس کے لیے ضروری وسائل و شرائط مہیا ہوں اور حالات ساز گار ہوں اور اس مقام کے حامل لوگ اُن سے پوری طرح فیض یاب ہوں۔ یہ شرائط دو طرح کی ہیں

۱۔تکوینی شرائط

۲۔کسبی شرائط

فی الحال ہم تکوینی شرائط کو زیر بحث لاتے ہیں۔اسے ہم انبیاء کے روحانی اور جسمانی کمالات سے تعبیر کرتے ہیں مذکورہ بات کے پیش نظر اس سلسلے میں عقل کا فیصلہ بالکل واضح اور روشن ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء میں کسی قسم کا روحانی نقص نہیں ہونا چاہیے۔انہیں ہر قسم کے روحانی کمال سے متصف ہونا چاہیے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ جیسا کہ انبیاء کے لیے عصمت اور علم جیسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ضروری ہے کہ وہ صابر ،شجاع ،حلیم، بردبار، متواقع، دل سوز، مہربان، مصلحت اندیش، خیرخواہ، زاہد، پارسا، دوراندیش اور بلند نظر انسان آرزوؤں کو اگر جامہ عمل پہنانا چاہیں تو جب ان کے لیے ان صفات کا ہونا ضروری ہے خُدا کی طرف سے مبعوث کیے گئے راہنماؤں کی بات تو پھر بالکل واضح ہے۔

لہٰذا نبوت کے عظیم مقام کی مناسبت سے اور ان کے خُدا کی طرف سے بھیجے جانے کا لازمہ یہی ہے کہ انبیاء ہر قسم کے فکری اور روحانی کمالات کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں۔اس بات کے پیش نظر کہ انبیاء کے درمیان وجودی کمالات کے اعتبار سے فرق ہے لہٰذا وہ سب فکری اور روحانی کمالات کے لحاظ سے یکساں درجے پر نہیں ہیں، بہرحال اُن میں سے ہر ایک اپنے زیر تربیت افراد سے بالاتر اور والاتر ہے۔

انبیاء کے روحانی کمالات قرآنی نکتہ نظر سے

قرآن کریم نے متعدد آیات میں انبیاء کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے ان کی روحانی صفات اور اخلاقی خصوصیات بیان کی ہیں ۔ہم یہاں چند ایک نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔قرآن نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حلیم، منیب [۱]، قانت [۲]، رشی [۳] داور اپنے عہد و پیمان کو نبانے [۴] والا قرار دیا ہے۔

۲۔ایک اور جگہ پر انہیں اُن کے بیٹے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب کو قدرت مند اور بابصیرت افراد کے طور پر ذکر کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاذۡكُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ اُولِى الۡاَيۡدِىۡ وَالۡاَبۡصَارِ ۝۴۵

ہمارے بندوں ابراہیمؑ،اسحاق ؑ اور یعقوبؑ جو کہ صاحب قدرت اور بصیرت تھے،کو یاد کیجئے

---

[۱] اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ۝۷۵ (ھود۔۷۵)

[۲] اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا ؕ (نحل۔۱۲۰)

[۳] وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ (انبیاء۔۵۱)

[۴] وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰىٓ (نجم۔۳۱)

۔(ص۔۴۵)

پھر ان کے ''اخلاص'' کا تذکرہ کیا ہے اور اسے ایک اخلاقی قدر و منزلت کی بنیاد اور اساس قرار دیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ۚ﴿۴۶﴾

ہم نے انہیں اپنے خالص بندگاں کے طور پر چن لیا کیونکہ وہ قیامت کو خالصانہ طور پر یاد کرتے تھے ۔(ان کی نظریں قیامت پر تھیں اور وہ دنیا کی زندگی سے لگاؤ نہیں رکھتے تھے)(ص۔۴۶)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ ایک عالی ترین روحانی صفت کہ جسے انبیاء کی خصوصیات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ ان کا زہد اور دنیا کی چمک دمک سے وابستہ نہ ہونا ہے۔ یہ اُس قرب الٰہی تک پہنچنے اور خُدا کی طرف سے ان کے انتخاب کا ذریعہ بنا ہے۔ انہیں قدرت اور بصیرت عطا کی گئی ہے۔

۳۔اسماعیل، الیسع ، یونس اور لوط کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۸۶﴾

ہم نے ہر ایک کو عالمین پر برتری دی۔(انعام۔۷٦)

مراد یہ ہے کہ ان میں سے ہر نبی اپنے زمانے کے لوگوں سے برتر تھا۔اس برتری کا معیار وہی معنوی صفات اور روحانی کمالات ہیں۔

۴۔ایک اور آیت میں حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل کا صابر انسانوں کے طور پر ذکر کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ(انبیاء۔۸۵)

۵۔ایک اور جگہ پر حضرت اسماعیل کو صادق الوعد (سچے وعدے والا) قرار دیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِسۡمٰعِيۡلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ

قرآن میں اسماعیل کو یاد کیجئے کہ وہ صادق الوعد تھے۔(مریم۔۵۴)

ایک روایت میں حضرت امام رضا سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''حضرت اسماعیل کو ''صادق الوعد'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے ایک اور جگہ پر ایک شخص سے وعدہ کیا اور ایک سال تک اُس جگہ پر اُس کے منتظر رہے۔[1]

آنحضرت نے بھی کسی شخص سے دعدہ کیا۔لیکن وہ شخص اپنا وعدہ بھول گیا۔تین روز گزرنے کے بعد اُسے اپنا وعدہ یاد آیا۔لہٰذا وہ

[1] تفسیر برھان ج ۳ ص ۱۵

پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا اور معافی طلب کی ۔ رسول اکرمؐ اپنے وعدے پر عمل کرنے کے لیے تین دن تک کعبے کے پاس ٹھہرے رہے ۔ [۱]

ان دو آیات کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طباطبائی نے چند ایک باتیں ذکر کی ہیں جنہیں ہم یہاں بیان کرتے ہیں

صفت وفا ایمان ارادے ، عزم ، توکل ، اور تسلیم کی طرح روحانی صفات میں سے ہے ۔ یہ تشکیک کے مقولے سے ہے ۔ مختلف مراتب کی حامل ہوتی ہے ۔ ایمان کا سب سے نیچے والا درجہ گناہ اور نافرمانی کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے ۔ ایمان کا بلندترین مرتبہ ہر قسم کے گناہ سے محفوظ اور مبرا ہونا ہے ۔ یہاں تک کہ شرک خفی بھی اس میں نہیں آسکتا ۔ اس مرتبے میں قلب اور دل خُدا کے علاوہ کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ۔

وعدہ وفا کرنا بھی اسی طرح ہے ۔ اس کے ایک مرتبے میں تو وعدہ کرنے والا تھوڑی سی دیر تک بھی صبر نہیں کرسکتا ۔ جب بھی کوئی دوسرا اہم کام سامنے آ گیا تو وہ اپنے وعدے کو فراموش کر دیتا ہے اور انتظار نہیں کرتا عہد کے وفا کہ یہ درجہ وہی ہے جو عام لوگوں کے درمیان رائج ہے ۔ اس سے عالی تر مرتبہ یہ ہے کہ کچھ دیر انتظار کرے جب تک دوسروے کے آنے سے نا اُمید نہ ہو جائے ۔ اس طرح وعدے کے اطلاق کو مقید کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسرے کا مقصد صرف اتنی مدت ہی تھا ۔

لیکن اِس کا سب سے بلند مرتبہ یہ ہے کہ کلام کے اطلاق کو بھی محفوظ رکھے اور عمل بھی اُس پر مطلق طور پر کرے ۔ اتنی دیر ٹھہرا رہے جب تک دوسرا آ نہ جائے یہاں تک کہ اگر ایک سال ہی کیوں نہ ٹھہرنا پڑے ۔ [۲]

مذکورہ آیت کریمہ (مریم ۔ ۵۴) اور مذکور روایات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ انبیائے الٰہی روحانی کمالات کے عالی ترین درجے پر فائز تھے ۔

الف ۔ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ

خُدا کی رحمت کی وجہ سے تم ان کے لیے نرم خو اور مہربان ہوگئے ۔ اگر تم درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ ضرور تمہارے اردگرد سے بھاگ جاتے ۔ (آل عمران ۔ ۱۵۹)

ب ۔ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾

بے شک تمہاری طرف خود تمہارے نفسوں میں سے ایک رسول آیا ہے ۔ تمہارا تکلیف اٹھانا اُس پر شاق گزرتا ہے تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے ۔ مومنوں پر تو نہایت ہی شفیق ، بڑا مہربان ہے ۔ (توبہ

---

[۱] تفسیر المیزان ج ۱۴ ص ۶۸

[۲] المیزان ج ۱۴ ص ۶۸

۱۲۸۔)

ج۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞ (القلم۔ ۴)

بے شک تو خلق عظیم پر فائز ہے۔ [۱]

اخلاق انبیاء روایات کی نظر سے

اب جب کہ ہم انبیاء کی اخلاقی خصوصیات اور روحانی کمالات سے قرآنی نکتہ نظر سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انبیاء کے اخلاقی خصائص کو بیان کرنے والی احادیث کا کچھ تذکرہ کیا جائے۔

۱۔ اکثر انبیاء کو قوت جو کی روٹی کھانے سے حاصل ہوتی تھی۔

اَبَى اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ يَّجْعَلَ قُوتَ اَنْبِيَآئِهِ اِلَّا الشَّعِيْرَا۔ [۲]

۲۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيًّا اِلَّا بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَاَدَآءِ الْاَمَانَةِ اِلَى الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ۔ [۳]

۳۔ ہشام بن سالم نے امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث روایت کی ہے۔ امام نے فرمایا:

اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ بَلَآءً الْاَنْبِيَآءُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ [۴]

خدا کے امتحان کے لحاظ سے سخت ترین بندے انبیاء تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ جو ان کے بعد والے مرتبے میں ہیں (انبیاء کے اوصیاء) پھر ہر وہ شخص جو ان کے ساتھ وحی اور فکری مماثلت رکھتا ہو۔

---

[۱] خلق جمع ہے خلق کی اور خُلق (خا پر پیش اور لام کے سکون کے ساتھ) غیر محسوس کمالات اور قوتوں کے معنی میں ہے اور خَلق (خا پر زبر کے ساتھ) اُن خصوصیات اور شکلوں کے معنی میں ہوتا ہے جو قابل حس ہوں (مفردات راغب) ''خلق'' کے معنی کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں ایک یہ ہے کہ دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ اُن کے آداب معاشرت مراد ہیں کہ پیغمبر کے خلق کی عظمت سے مراد ہے کہ وہ تمام مکارم اخلاق کے جامع تھے۔ مجمع البیان ج ۵ ص ۳۳۳ کی طرف رجوع کیا جائے

[۲] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۶۶

[۳] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۶۷

[۴] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۶۹

انبیاء کے جسمانی کمالات

یہاں تک ہم نے انبیاء کی روحانی صفات سے متعلق عقل اور وحی کا نکتہ نظر پیش کیا۔اب ہم ان کے جسمانی کمالات سے گفتگو کرتے ہیں۔اس سلسلے میں عقل واضح طور پر جو کچھ کہہ سکتی ہے وہ یہ بات ہے کہ انبیاء کا ایسے جسمانی عیوب سے سالم ہونا ضروری ہے جو ان کے اہداف میں مانع اور عمومی نفرت کا باعث بنتے ہوں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر نقص غرض لازم آئے گا جب کہ خُدائے حکیم اس سے منزہ مبرا ہے۔

اسلامی متکلمین (امامیہ متکلمین) نے ان تمام صفات کو قاعدہ لطف پر استوار کیا ہے۔حکیم طوسیؒ نے درج ذیل صفات کو صفت عصمت کے ساتھ اضافہ کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

"ولمال العقل،ولذكاء والفطنة و قوه الراى وعدم السهو و كلما ينفرعنه من دناءة الاباء وعهر الامهات والفظاظة و...وشيهها والاكل على الطريق و شبهه۔"[۱]

پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب عقل، ذکاوت و ہوشیاری کا حامل اور قوت فکر ونظر سے مالا مال ہو۔سہو ونسیان اور وہ چیزیں جو انسانوں کی نفرت کا باعث بنتی ہیں ان سے محفوظ ہو جیسے آباؤ اجداد کی پستی، ماؤں کی بدکاری، بداخلاقی اور جنسی بیماریوں وغیرہ سے صحیح وسالم ہو۔اسی طرح وہ کام (جو کہ نفرت کا باعث بنتے ہیں جیسے) چلتے ہوئے کھانا وغیرہ ان سے بھی پرہیز کرے

دوسرے لفظوں میں یوں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ثبوتی اور سلبی صفات سلبی بھی دو طرح کی ہیں روحانی صفات اور جسمانی صفات قاعدہ لطف خُدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء صفات ثبوتی سے مالا مال ہوں اور صفات سلبی اور روحانی وجسمانی نقائص سے مبرا اور سالم ہوں۔

لہٰذا انبیاء روحانی کمالات کے حامل ہیں اور تمام بُری صفات اور عیوب سے پاک ہیں چاہے وہ عیب جسمانی ہو چاہے وہ روحانی۔[۲]

آیا صفات مدنی کے سلسلے میں نقائص اور عیوب سے صحیح وسالم ہونے کے ساتھ ساتھ کمالات جسمانی کا حامل بھی ہونا چاہیے جیسے خوبصورت ترین ہوں، ان کی آواز سب سے اچھی ہو اور بدنی لحاظ سے سب سے اکمل ہوں؟ نہ تو عقلی لحاظ سے اور نہ ہی قرآنی نکتہ سے اور نہ ہی روایات میں اس بات پر کوئی دلیل ہے۔ہم یہاں چند روایات نقل کرتے ہیں:

---

[۱] کشف الراد طبع صیدا ص ۲۱۸

[۲] اللوامع الالٰهیه ص ۲۱۱

۱۔امام ہشتمؑ نے فرمایا:

پاکیزگی خوشبو لگانا اور بدن سے زائد بالوں کا اتارنا انبیاء کے اخلاق میں سے ہے۔[۱]

مذکورہ روایت میں بیان کی گئی صفات اگرچہ ان کے انفرادی اور اجتماعی آداب و اخلاق سے مربوط ہیں لیکن چونکہ یہ ان کے جسم اور بدن سے متعلق ہیں اس لیے انہیں اس باب میں ذکر کر دیا ہے۔

۲۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

مسواک کرنا انبیاء کے آداب میں سے ہے۔[۲]

۳۔امام جعفر صادقؑ نے ہی فرمایا:

خُدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا مگر وہ خوش آواز تھا۔[۳]

اس میں کوئی شک نہیں کہ آواز کا سنگین، درشت اور بُرا ہونا نفرت کا باعث بنتا ہے انسان ایسی آواز سننے کے مشتاق نہیں رہتے۔ دوسری طرف انبیاء کی تبلیغ کا ایک اہم ترین ذریعہ اُن کی زبان اور کلام ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انبیاء اچھی آواز رکھتے ہوں۔ یعنی زبان سے متعلق نقائص جسمانی سے صحیح و سالم ہوں۔ اسی درجہ سے حضرت موسیٰ خُدا سے کہتے ہیں کہ گفتگو کے وقت زبان کی لڑکھڑاہٹ اور لکنت سے محفوظ رہیں۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾

اے میرے پرودگار میرا سینہ کھول دے میرا کام آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ (طٰہٰ۔ ۲۵ تا ۲۸)

ہم اس آیت کو حسن ختام کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دامن گفتگو کو سمیٹتے ہیں۔

---

[۱] بحارالانوار جلد ۱۱۔ص ۶۶

[۲] بحارالانوار جلد ۱۱۔ص ۶۷

[۳] بحارالانوار جلد ۱۱ ص ۶۶

(۱۸) انبیاء کی خصوصیات

(حصہ ششم)

وحی۔۔انبیاء کے جہان غیب سے رابطے کا واحد ذریعہ

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ (الشعراء۔ ۱۹۳ تا ۱۹۴)

۲۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ (یونس۔ ۱۵)

۳۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ (یونس۔ ۱۶)

۴۔ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (البقرۃ۔ ۳)

۵۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ (انعام۔ ۵۰)

۶۔ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ (حاقۃ۔ ۴۱)

۷۔ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ (ہود۔ ۶۵)

۸۔ الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ
سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ (روم۔ ۱ تا ۴)

۹۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (انبیاء۔ ۵)

۱۰۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً

أُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ
مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾
(نجم۔۱۱ تا ۱۸)

۱۱۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿۷﴾ (طٰہٰ۔۷)

۱۲۔ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾
(شوریٰ۔۳)

۱۳۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ
حَوْلَهَا (شوریٰ۔۷)

۱۴۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ
وَلَا الْاِيْمَانُ (شوریٰ۔۵۲)

۱۵۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ (مجادلة۔۱)

تفسیر۔

''وحی'' ایک اہم اور حساس قرآنی اور کلامی موضوع ہے۔ علم کلام سے متعلق کتب میں اس کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ مفسرین نے بھی اس موضوع پر کوئی جامع گفتگو نہیں کی حالانکہ وحی کے امکان کا اثبات اور اُس کی حقیقت نمائی انبیاء کی نبوت کے لیے اساس اور بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اگر وحی کی اصالت ثابت نہ کی جاسکے تو اس زمین پر بسنے والے انسان کا رابطہ اس غیبی دنیا سے منقطع ہو جائے گا۔ جہاں غیب اور عالم بالا کی خبریں اس تک نہیں پہنچیں گی۔ ایک پہلو تو یہ تھا۔

جب کہ دوسری طرف معاملہ یُوں ہے کہ وحی چونکہ انبیاء کی خصوصیات میں سے ہے اور دوسرے لوگ اس وسیلے سے محروم ہیں لہٰذا اگر اس سے محروم انسان اس کی حقیقت اور واقفیت بیان کرنا چاہیں تو یہ ایک بہت دشوار اور کٹھن کام ہوگا۔ اس کے باوجود وحی دیگر غیبی مسائل کے مانند ہے جنہیں اُن کے آثار اور علامات دیکھ کر کسی حد تک پہچانا جاتا ہے۔ اس باب میں ہم وحی کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کی حقیقت کو زیر بحث لائیں گے۔ نبوت سے متعلق قرآنی الفاظ کی بحث میں ہم نے ''وحی'' سے متعلق کئی حوالوں سے گفتگو کی تھی۔ انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ ''وحی تشریعی'' کی حقیقت اور اس کے بارے میں کون کون سے نظریات پائے جاتے ہیں۔

اس زندگی میں انسان شناخت کے لیے دو وسیلے رکھتا ہے حس اور عقل دیکھنے والی چیزوں کو آنکھ کے ذریعے دیکھتا سننے والی باتوں کو کان کے ذریعے سنتا ہے اور اسی طرح دوسرے محسوسات کا ان کے لیے مخصوص حواس کے ذریعے ادراک کرتا ہے۔ اگر امور حسی کو وہ اس خمسہ کے ذریعے درک کرتا ہے تو علمی اور عقلی مسائل کے لیے استدلال اور برھان سے استفادہ کرتا ہے جو فکر اور عقل کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

معمولاً انسانی ادراکات کی برگشت انہی مذکورہ دو وسائل کی طرف ہوتی ہے۔ ایک اور طرح کے ادراکات بھی ہیں جو عام افراد کے لیے واقع ہوتے ہیں انہیں "فطرت" یا "وجدانیات" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کا دائرکار کبھی تو امور مادی سے متعلق ہوتا ہے۔ اور کبھی امور معنوی سے۔ دونوں جگہ پر ادراک فطری اُس آواز کا نام ہے جو انسان اپنے اندر سے سنتا ہے۔ تمام انسان اپنے اندر سے والدین کی خدمت کے خوب ہونے اور پیمان شکنی کے قبیح ہونے کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ بُھوک اور پیاس محسوس کرتے ہیں۔

یہ تمام ادراکات (حسی، عقلی، وجدانی) تمام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض انسان ایک اور بھی خاص قسم کے ادراک اور معرفت سے بہرہ مند ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہ یہ ہے کہ انسان شناخت اور معرفت کے ان ذرائع کو استعمال میں لائے بغیر یعنی بغیر اس کے کہ وہ حسی ذرائع یا فکر و خرد کو کام میں لائے بعض معانی و مفاہیم کا ایک سلسلہ یا چند ذمہ داریوں اور احکامات کی آواز اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اسے ان کے بارے میں جزم و یقین پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ یہ ادراکات حسی یا فکری کاوشوں کا نتیجہ بھی نہیں ہیں۔ وجدان اور فطرت بھی ان میں کسی قسم کی دخالت نہیں رکھتے بلکہ یہ ایک مخفی آگاہی ہے جسے انسان اپنے اندر پاتا ہے اور جس میں کسی قسم کا شک و شبہ بھی نہیں کرتا۔

یہ وہی مخفی اور مرموز ادراک ہے جس کے بعض مراتب سے گفتگو گذشتہ ابواب میں کی گئی۔ اگر یہ دریافت و معلومات انسانوں پر خُدا کی طرف سے عائد وہ ذمہ داریوں اور تکالیف سے مربوط ہو تو اس کا نام وحی تشریعی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ اگر یہ دریافت اور ادراک انفرادی اور شخصی پہلو پر مشتمل ہوں تو اس کا نام الہام ہے۔ اور اگر اجتماعی پہلو پر مشتمل ہوں تو اسے "وحی یا "وحی تشریعی" کہتے ہیں۔ لہٰذا وحی اُس قطعی اور یقینی دریافت کا نام ہے جو پیغمبر کو شناخت کے مروجہ ذرائع استعمال میں لائے بغیر حاصل ہوتی ہے جس کی سچائی اور حقانیت میں کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔ چونکہ کوئی کام (phenomenon) بھی (اگر وحی کو ایک کام فرض کریں) علت کے بغیر نہیں ہوتا لہٰذا اس کے لیے بھی علت ہے جو کہ عالم غیب سے رابطے کے سوا) کچھ نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم نے متعدد آیات میں وحی کی اس خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم یہاں دو آیات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ

تمہارے دل پر یہ قرآن روح الامین لے کر آیا ہے۔ (شعراء۔ ۱۹۳ تا ۱۹۴)

وحی کے نزول کا مقام دل کو قرار دیا گیا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وحی ایک ایسی چیز ہے جو عالم بالا سے قلب پیغمبر میں داخل ہوتی ہے شناخت کے عام ذرائع کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یہ درست ہے کہ پیغمبر نزول وحی کے وقت فرشتہ وحی کو دیکھتا ہے اور اس کی بات بھی سنتا ہے لیکن فرشتے کو دیکھنا اور اس کی باتوں کو سننا آنکھ اور کان کے استعمال کی وجہ سے نہیں ہے اس پر شاہد یہ امر ہے کہ پیغمبر کے پاس بیٹھے ہوئے حضرات بھی وہی کان اور آنکھ رکھتے تھے لیکن نزول وحی کے وقت نہ تو وہ کسی فرشتے کو دیکھتے اور نہ ہی اس کی کوئی بات انہیں سنائی دیتی۔

۲۔ جب مشرکین یہ تجویز پیش کرتے تھے کہ وہ اپنی دعوت کا طریقہ کار تبدیل کرے اور قرآن کے معانی میں تغیر و تبدیل کر لیا کرے تو خدا سورہ یونس میں اس تجویز کو نقل کرنے کے بعد پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ اُن کے جواب میں کہو:

قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ‌ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ‌ ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوۡتُهٗ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَدۡرٰٮكُمۡ بِهٖ ‌ۖ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ‌ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

کہہ دو کہ مجھ سے تو نہیں ہوسکتا کہ میں قرآن کو اپنی طرف سے بدل دوں میں تو صرف اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ میں اپنے پروردگار کی نافرمانی میں یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں اسے تمہارے لیے نہ پڑھتا اور نہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا کیونکہ میں تو تمہارے درمیان نزول قرآن سے پہلے ایک عمر رہا ہوں (اور کتاب میں سے کچھ تمہارے لیے نہیں پڑھا کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (یونس۔ ۱۵۔۱۶)

یہ دونوں آیات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ دوسرے انبیاء کے مانند اپنے علم اور معرفت کا سرچشمہ جس چیز کو قرار دیتے تھے اُس کا نام ''عالم غیب'' کے علاوہ کچھ نہیں ایسا عالم جسے انسان اپنی کمزور اور چھوٹی سی عقل کے ساتھ نہیں جان سکتا۔ انسان کی ذمہ داری صرف اتنی ہی ہے کہ وہ صرف اس پر ایمان لائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ (بقرہ۔۳)

لہٰذا وحی انبیاء کے عالم غیب سے رابطے کا نتیجہ ہے۔ اس رابطے کو انسان کے عام ادراکات کا نتیجہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لہٰذا انبیاء کی نسبت وحی کو مادی اور طبعی عوامل کی بنیاد پر بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا صرف وہی لوگ اسے قبول کر سکتے ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہوں۔ جو لوگ عالم غیب اور ماوراء طبیعت کے منکر ہیں وہ اس طرح کی چیز کے لیے مادی عوامل کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی بے بنیاد اور کمزور سے نظریات بیان کیے ہیں لیکن ان کے ساتھ اس عظیم واقفیت کو محدود مادی عوامل میں منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ مادی نظریات کے حامل لوگوں کے چار مفروضوں کو ہم یہاں بیان

کرتے ہیں۔ بعض سادہ لوح حضرات نے بھی خوش بینی کے ساتھ انہیں نقل کیا ہے۔

۱۔وحی انسانی نبوغ کا نتیجہ

بعض کا یہ نظریہ ہے کہ انفرادی بنوغ افراد کے اندر چند افکار کا سبب بنتا ہے جسے ہم نبوت اور وحی کہہ سکتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں:

''کارخانہِ خلقت اپنے دامن میں نابغہ اور خیر خواہ افراد کی پرورش کرتا ہے۔ وہ لوگ اپنے ذاتی نبوغ اور بلند افکار کی وجہ سے معاشرے کو نیک اخلاق، اچھے اعمال اور عدالت اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں اس طریقہ سے وہ انسان کی سعادت کے لیے بُرے موثر اقدامات کرتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے جو کچھ وہ دستور اور قانون کے نام سے پیش کرتے ہیں وہ ان کے نبوغ اور وسعت فکری کا نتیجہ ہی ہوتا ہے۔ ان کا رابطہ کسی اور دنیا سے نہیں ہوتا۔

وحی کا سرچشمہ صرف انسانی عقل ہی ہے وحی بشری نبوغ کا نتیجہ ہے۔ بشریت کی تاریخ میں ہر صدی میں ایسے نابغہ روزگار افراد سامنے آتے رہے ہیں جو افکار انسانی کی علی ترین تجلیات کے مظہر ہوتے تھے۔ انہوں نے عالم انسانیت کے لیے بڑی خدمات سرانجام دیں۔

بعض تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور انہوں نے نبوغ کو چند نفسیاتی واقعات اور اتفاقات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنی وہمی اور خیالی تحقیقات کے ذریعے سے انبیاء کی زندگی میں بھی ان عوامل کی موجودگی کو ثابت کریں۔

ان کے نزدیک جو عوامل استعداد کے قوی ہونے اور نبوغ کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔عشق

یہ عامل نہایت قوی اور مضبوط افکار کو وجود میں لاتا ہے کیونکہ ایک طویل عرصے سے کا عشق عاشق کو تصوراتی اور خواب کی دنیا میں بسنے کا عادی بنا دیتا ہے جس سے اس دوران اُس کی قوت فکر تیز اور توانائی سے بھرپور ہو جاتی ہے۔

۲۔طویل دور مظلومیت

طویل دور مظلومیت بھی اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ستم رسیدہ انسان اپنی فکر کو اس ظلم کے خاتمے کے لیے کام میں لائے اور ایک لحظ بھی آرام نہ کرے۔

۳۔اقلیت میں ہونا

ناسازگار سماجی حالات بھی افکار کے رُشد کا باعث بنتے ہیں کیونکہ ایک اقلیت کے لیے ضروری ہے وہ اپنے درمیان موجود فاصلے کو پاٹنے کے لیے اپنی فکر کو استعمال میں لائے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرے۔

۴۔بچپن کا زمانہ

کیونکہ بچہ اس زمانے میں مشکلات کے سامنے ڈٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔مشکل حالات میں وہ اپنے اندر کھو جاتا ہے۔اس طرح سے بچے کے افکار پروان چڑھتے ہیں۔

۵۔تنہائی

تنہائی بھی انسانی افکار کے رُشد کا باعث بنتی ہے کیونکہ جب ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیں تو مجبور ہیں کہ اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اپنے فکر و ذہن کو ان کے اختیار میں دے دیں۔

٦۔خاموشی اور بے کاری

خاموشی اور بے کاری بھی اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ ارادے کی فعالیت کم ہو جائے اور غیر ارادی افکار آزادانہ پروان چڑھنا شروع کر دیں۔

۷۔ابتدائی پرورش

ابتدائی پرورش بھی نبوغ کے پیدا ہونے میں بہت موثر ہے۔تمام مذکورہ اسباب اور ایک فاسد اور بے قانون معاشرے کا وجود مل کر اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ اجتماعی مسائل سے متعلق انبیاء کے افکار رُشد پائیں لوگوں کو زندگی گزارنے کے لیے وہ نئے نئے راستوں اور طریقوں سے آشنا کریں۔[1]

اس تفسیر پر اشکالات

اس تفسیر پر اشکالات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں بیان کیا جائے کیونکہ:

اول:اس تفسیر کے حامی لوگوں نے پہلے ایک مُدعا کو یقینی اور مسلم پر مان لیا ہے اب اس کوشش میں ہیں کہ اُس کے لیے کوئی دلیل ڈھونڈ کر لائیں۔وہ پہلے یہ قبول کر چکے ہیں کہ وحی مادی علت رکھتی ہے اور غیب کی دنیا سے مربوط نہیں ہے۔اس کے بعد وہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ اس کے لیے مادی عوامل ڈھونڈ سکیں۔ان کے سامنے یہی بات آئی ہے کہ انبیاء کو ایسے نابغہ افراد کی صف میں قرار دے دیا جائے جو اپنے نبوغ کے باعث ایسے بلند اور وسیع افکار کے حامل تھے۔لیکن انبیاء معاشرے میں جو تبدیلیاں لائے ہیں ان کی توجیہ نبوغ کے ساتھ کرنا ایسے ہی

---

[1] تلخیص از کتاب نبوغ وعلل آن،تالیف وکتر عزت اللہ مجید پور۔

ہے جیسے آرمینیا میں آنے والے شدید زلزلے کی وجہ اس کے قریب موجود لکڑی کے ایک دروازے کا گرنا قرار دیا جائے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی یہ بات بطلان اور ضعف میں اس سے بڑھ کے ہے۔

دوم: دُنیا میں دو طرح کے مصلحین آئے ہیں۔ بعض اپنے اصلاحی پروگرام کو عالم بالا سے منسوب کرتے ہیں اور بعض اپنے پروگرام کو اپنے افکار کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

پہلا گروہ خدا پر ایمان، قیامت پر ایمان اور خدا کے وعدہ وعید کے ذریعے اپنے پروگرام کے اجر کی کوشش کرتا ہے جب کہ دوسرا گروہ کسی اور راستے سے اپنے ہدف تک پہنچنے کی تدبیر کرتا ہے۔

اب اگر وحی کا سرچشمہ نبوغ ہے تو پھر پہلے گروہ نے اس کی نسبت دنیائے غیب کی طرف کیوں دی ہے؟

یہ تصور کرنا کہ اتنے زیادہ لوگوں نے پہلے سے طے شدہ بات کی بنیاد پر اپنے نبوغ کے ثمرات کو دنیائے غیب کی طرف منسوب کیا ہے تو یہ ایک بے بنیاد اور باطل تصور ہے۔ یہ کیسے ممکن اور متصور ہے کہ مختلف علاقوں اور مختلف ادوار میں آنے والے مختلف لوگ ایک ہی شعار بلند کریں، خود کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا قرار دیں اور کہیں:

اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی

میں اپنے اُوپر نازل ہونے والی وحی کے علاوہ کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا۔ (انعام۔۵۰)

سوم: یہ نظریہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے زمانہ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے غیر علمی انداز میں بیان ہوتا تھا اور جاہلیت کے دور والے عرب فصاحت و بلاغت کے میدان میں پیغمبر اسلامؐ کی ندرت کو آنحضرت کے اچھے شعری ذوق اور اسلوب کا نتیجہ قرار دیتے تھے اور آپ کو شاعر کہتے تھے۔ خدا نے اس بات کی حکایت یوں کی ہے: ''بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ'' (انبیاء۔۵)

پھر ان کی بات کو جھٹلایا ہے اور قرآن کو اس امر سے بالاتر قرار دیا ہے کہ وہ شعری ذوق کا نتیجہ ہو یا مقام نبوت کسی شاعر کو حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۝۴۱

''اور کسی شاعر کا قول نہیں ہے لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو'' (الحاقہ۔۴۱)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهٗ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ ۝۶۹

''ہم نے اُسے شعر نہیں سکھایا یہ اس کے لائق بھی نہ تھا، بلکہ قرآن یاددھانی کرانے والی کتاب اور قرآن مبین ہے۔ (یٰس۔۶۹)

چہارم: نابغہ لوگ مستقبل کے متعلق کبھی بھی قطعی اور یقینی طور پر خبر نہیں دیتے۔ اگر مستقبل کے متعلق کوئی خبر دینا بھی چاہیں تو شاید، میرا

خیال یہ ہے وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جب کہ انبیاء اپنی امتوں کے متعلق انداز میں خبر دیتے ہیں ۔ جیسے وہ روز روشن کی طرح ان واقعات کو دیکھ رہے ہوں ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ۝۶۵

صالح نے اپنی قوم سے کہا تین تک اپنے گھروں میں عیش و آرام سے رہ لو، تین دن کے بعد سب کے سب مارے جاؤ گے ۔ یہ ایک قطعی خبر ہے ۔ (ھود ۔ ۶۵)

کوئی نابغہ بھی کیسی امت کے متعلق اس طرح کی حتمی خبر نہیں دے سکتا کہ حادثہ کے وقوع پذیر ہونے کا وقت تج متعین کر دے ۔ جس دن ایران کی مشرک ملت بظاہر موحد عیسائی ملت پر غالب آئی کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تھوڑے عرصے میں ہی ورق الٹ جائے گا ۔ کامیاب ملت ناکامی کا شکار ہو جائے گی اور مغلوب ملت غالب آ جائے گی ۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ نے یہ خبر ایک یقینی اور حتمی انداز میں بیان فرمائی ۔ فرمایا:

الٓمّٓ ۝۱ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝۲ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝۳ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ

رومی تمہارے قریب مغلوب ہو گئے اور وہ مغلوب ہونے کے بعد چند ہی سالوں (دس سالوں بھی کم) میں غالب آ جائیں گے ۔ (روم ۔ ۱ تا ۴)

اس طرح کی قطعی خبریں دینا انبیاء کی خصوصیات میں سے ہی ہے جو کہ مبدئے کائنات سے اپنے رابطے کے طفیل آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے متعلق خبر دیتے ہیں ۔ اس طرح کی غیبی اخبار کے کئی نمونے ہم نے انبیاء کے علم سے متعلق باب میں ذکر کیے ہیں ۔ یہ بھی واضح ہوا کہ ان غیبی خبروں کا سرچشمہ اور مدرک وحیالٰہی کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے ۔

البتہ بعض ریاضت کش افراد مستقبل کے متعلق کوئی خبر دے سکتے ہیں لیکن یہ ان کے نبوغ سے مربوط نہیں ہے کیونکہ وہ بابغہ تو نہیں ہیں بلکہ جہان طبیعت سے اپنا رابطہ منقطع کرنے اور عالم روح وروان میں ڈوب جانے کے باعث چند ذرائع سے یہ خبریں دے سکتے ہیں ۔ لیکن وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ معلومات ان کی فکری اور عقلی کاوشوں کا ثمرہ ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان لوگوں کے علم کا سرچشمہ بھی دنیائے غیب اور ماورائے طبیعت ہے ۔ البتہ ان کا انبیاء سے کیا فرق ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے جسے آئندہ زیر گفتگو لایا جائے گا ۔

۲ ۔ وحی نفسی

وحی نفسی ایک ایسا موضوع ہے کہ آج مغرب وحی کی تفسیر کرتے ہوئے اس تک پہنچا ہے ۔ وہ اس طریقے سے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کی توجیہہ تفسیر کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

انبیاء لوگوں سے منقطع ہو کر اور خدا کی طرف متوجہ ہو کر خلوت ہو کر خلوت وتنہائی میں انسان دوستانہ اور بلند و بالا مقاصد پر غور وفکر

کرتے تھے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ خُدا نے انہیں جو پروگرام دیا ہے اس کے ذریعے وہ اپنی امت کی اصلاح کریں۔ اس طرح کی ایک دائمی فکر اور وہ بھی تنہائی میں اس بات کا باعث بنی کہ ان کی قوت تخیل بہت بلندی تک پہنچ گئی۔ انبیاء جو کچھ سوچتے اسے اپنے عقل کے حضور حاضر اور تیار دیکھتے۔ اچانک وہ یہ آواز سنتے کہ تم خُدا کے رسول ہو۔ اُس وقت وہ اپنے سامنے ایک صورت کا مشاہدہ کرتے اور وہ یہ سمجھتے کہ یہ خُدا کی جانب سے وحی لے کر آنے والا ہے۔ وہ مناسب اور بلیغ جملات سُن کر یہ گمان کرتے کہ یہ کلام خُدا ہے جو ان کے دل پر نازل ہو رہا ہے۔ درحقیقت وہ یہ سوچتے تھے کہ یہ تمام مطالب عالم بالا سے اُن پر نازل کیے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ یہ تو اُن کی قوت نفس و تخیل کا کمال ہے جس سے یہ فیض حاصل ہو رہا ہے اور یہ مسائل اُن کے سامنے مجسم کر رہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام خواب اور صورتیں جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے وہ ان کے ذہنی تصورات کا نتیجہ ہی ہوتی تھیں جو نفس پیغمبر کو یہ قوت اور طاقت بخش دیتے تھے کہ جس چیز کا وہ کئی سال تک آرزومند رہا ہے اُسے اپنے سامنے دیکھ لے۔ [1]

ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک ایرانی مصنف جو حقائق کی تحریف کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے اُس نے اس نظریے کو ایک افسانوی اور خیالی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے:

''خورشیدِ سوزاں ہمیشہ چمکتا، محمدؐ کی حساس اور خواب آفرین روح میں ہمہمہ سا برپا ہوتا جو رات کے آنے پر خاموش ہو جاتا۔ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی یہ طبیعتیں اور اندرونی خوابوں کی تصوراتی دنیا میں مدہوش یہ لوگ جو زندگی کے شور غل سے دور ہوتے اور خاموشی کے ایک بیکراں صحرا میں اپنے آپ میں اور زیادہ کھو جاتے، یہاں تک کہ ایک غیر مترتب سا ہیولا ظاہر ہوتا۔ وہ اپنے اندر ایک آواز سنتے، ایک بیکراں اور مجہول سمندر کی لہروں کی طرح۔

چند سال اسی طرح گزر گئے پھر ایک واقعہ رونما ہوُا جس نے اس کی روح پر ایک اور نیا اثر چھوڑا۔ ۱۱ سال کی عمر میں وہ حضرت ابو طالب کے ساتھ شام گئے جس نے اس اندرونی شور کو مہمیز کیا۔ ایک نئی اور روشن دُنیا ان کے سامنے آئی جس میں جہالت اور خرافات کا نشان تک نہ تھا جس میں ساکنان مکہ کی خشونت اور سختی کا نشان تک نہ تھا۔''

یہ بات قابل توجہ ہے کہ وحی کی تفسیر و تحلیل ایک عیسائی مصنف بنام ''درمنگام'' کی ہے جس نے مختلف تصورات کے ذریعے رسالت اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ ایرانی مصنف نے بھی اس کی تقلید میں قلم اُٹھایا ہے۔ اُسی کے مطالب کو لے کر پیغمبر اسلامؐ کی نبوت سے متعلق لولی لنگڑی تحلیل و تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے۔

نبوت یا خواب آشفتہ؟

یہ نظریہ آج کل مغرب میں ایک سائنسی نظریے کے لباس میں بیان کیا جا رہا ہے اور علم نفسیات کے قواعد اور فارمولوں کا سہارا لے کر

---

[1] الوحی المحمدی۔ ص ۶۶، ط ۶

اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ وہی مشرکین جاہلیت والا نظریہ ہے۔ اس وقت یہ ایک سادے سے انداز میں بیان کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی سادہ اندیشی کی وجہ سے اپنے مُدعا کو سادہ انداز میں بیان کرتے تھے۔ وہ اسے ایک سائنسی انداز میں بیان نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی وحی کو ایک خواب آشفتہ سمجھتے تھے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ

وہ کہتے تھے قرآن خواب آشفتہ و پریشان ہے۔ (انبیاء۔ ۵)

یہ بات بن کہے ہی واضح ہے کہ خواب آشفتہ انسانی تخیل کی پیداوار ہیں جو کہ قوہ عقل کو اپنے زیر اثر لے کر ذہنی فضا کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ جو کچھ خارج میں واقفیت اور حقیقت سے محروم ہے وہ اسے حقیقت کا لباس پہنا دیتا ہے۔

آج کل مغرب میں یہ نظریہ ایک خاص سائنسی رنگ و روپ میں بیان کیا جاتا ہے تا کہ اس سے افکار کو ایندھن فراہم کر سکیں۔ حقیقت میں یہ زہر کو قند میں ملا کے دینے سے مترادف ہے تا کہ سادہ لوح افراد اسے آسانی سے قبول اور ہضم کر سکیں۔

انبیائے الٰہی تو عاقل ترین دلسوز ترین اور حقیقت بین افراد تھے۔ وہ ہمیشہ پند و نصیحت اور عقل و استدلال کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کرتے رہے۔ اس طرح کے افراد اُن گوشہ نشین انسانوں کی طرح نہیں ہوتے جو لوگوں سے کٹ کر خیالی قوتوں کو پروان چڑھاتے رہتے ہیں تا کہ اس طرح سے اپنی خواہشات اور مقاصد کو پورا کر سکیں (نعوذ باللہ) اس اونٹ کی طرح جو کہ خواب میں روئی کو بیج دیکھ رہا ہو۔ قرآن نے بعض آیات میں کنایۃً اس نظریے کو رد کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ⑫ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ⑬ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ⑭ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ⑮ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ⑯ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱

(نجم۔ ۱۱ تا ۱۸)

جو کچھ آنکھ نے دیکھا دل نے اُسے نہیں جھٹلایا پھر کیا تم اس کے ساتھ اس پر جھگڑتے ہو جو کچھ (جبرائیل) کہ وہ دیکھتا ہے اور یقیناً اُس نے جبرائیل کو ایک بار اور سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک دیکھا کہ اس کے نزدیک ہی جنت ماویٰ ہے۔ جب کہ سدرہ کو ڈھانپ رہا تھا جو کچھ کہ ڈھانپ رہا تھا۔ اُس کی نظر نہ لڑکھڑائی اور نہ اس نے خطا کی۔ اُس نے اپنے پروردگار کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔

پیغمبر نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اگر اس نظریے کے مطابق اُسے غیر واقعی اور اُس کے نفس کی پیداوار قرار دے کر اسے ایک غیر حقیقی چیز سمجھا گیا ہے تو قرآن نے ان تمام کو حقیقت قرار دے دیا ہے قرآن نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ پیغمبر نے معرفت کے لیے جو ذرائع بھی استعمال

کیے ہیں چاہے وہ حواس ہو (چشم) یا عقل ان میں سے کوئی بھی غلطی نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ وحی کی تفسیر ''وحی نفسی'' کے ساتھ کرنا حقیقت میں تو جنون کے لیے ذرا محترم سا لفظ استعمال کرنے کے مترادف ہے جس کی تہمت ہمیشہ انبیا کے مخالف ان پر لگاتے رہے بات صرف اتنی ہے کہ گذشتہ زمانے کے لوگ واضح طور پر یہ بات کہتے تھے اور یہ زمانہ چونکہ دھوکا بازی اور حیلہ گری کا زمانہ ہے اس لیے تلخ اور مہلک افکار کو چالاکی اور ایک خاص قسم کی ملمع کاری کے ساتھ معاشرے کی فکری غذا بنایا جاتا ہے۔

۳۔ باطنی شعور کی تجلی اور ناخودآگاہ ضمیر

یہاں وحی کی تفسیر کے سلسلے میں ایک اور نظریہ بھی بیان ہوا ہے جو کہ دوسرے نظریے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں پر تخیل وغیرہ نہیں کی گئی بلکہ باطن نفس نے ظہور حاصل کیا ہے۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

جدید علم نفسیات جو کہ فرائڈ وغیرہ کے توسط سے وجود میں آیا ہے اس سے پہلے روح انسانی کے لیے صرف ایک پہلو اور حصے کے قائل تھے۔ لیکن جدید زمانے کے نفسیاتی تجزیات[1] کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی روح ۲ حصوں پر مشتمل ہے، ایک ظاہر اور ایک پنہاں گویا انسان ایک تربوز کے مانند ہے جسے پانی میں ڈال دیا جائے تو اس کا تھوڑا سا حصہ سامنے ہوتا ہے اور بہت بڑا حصہ پانی میں پنہاں اور مخفی ہوتا ہے۔ انسانی روح کے پہلے حصے کو خودآگاہ اور دوسرے حصے کو ''ناخودآگاہ'' کہتے ہیں۔ خودآگاہ روح، روح کے ان حصوں سے متعلق ہے جسے انسان اپنے آپ میں محسوس کرتا ہے۔ ان کے وجود سے آگاہ ہے جیسے حسی اور تعلقی معرفت وشناخت واضح تر عبارت میں یوں کہ انسان کی وہ معلومات جو حواس خمسہ کے ذریعے اُسکی روح میں داخل ہوتی ہیں یا عقل کے توسط سے روح کی دسترس اُن تک ہوتی ہے یا وجدانی ادراک کی وجہ سے وہ روح کو حاصل ہوتی ہیں ھ، اسی طرح وہ علمی مفاہیم اور صورتیں جو روح حافظے میں جمع کر لیتی ہے اور خاص مواقع پر اُن کی یاد آوری کرتی ہے۔ یہ سب کے سب ''خودآگاہ روح'' کا حصہ ہیں۔

خودآگاہ روح اگرچہ روح کی ایک قسم اور حصہ ہے اور جسم کے ساتھ اس کو کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے باوجود یہ حسی، وجدانی اور عقلی ادراک کے دائرکار سے باہر ہے۔

جب نفس انسان ظاہری ادراک کی قوت اور خودآگاہ روح کے اثر اور تسلط سے باہر نکلتا ہے تب ہی ناخودآگاہ روح اپنا کام شروع کرتی ہے۔ اور اپنے آثار نمایاں کرتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ ''ناخودآگاہ روح'' ''خودآگاہ روح'' پر حکمرانی اور فرماں روائی رکھتی ہے۔ بعض اوقات انسانکے سینے میں ایک راز ہوتا ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اُس کے فاش ہونے کے خوف سے اُسے بھلا دیتا ہے۔ لیکن ناگہاں طور پر وہ راز کی بات اُس کی زبان پر آجاتی ہے اور وہ اپنا راز فاش کر بیٹھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ راز ''ناخودآگاہ'' ''دنیا سے'' ''خودآگاہ'' دنیا کی سلطنت میں آجاتا ہے اور

---

[1] psycho.analysis of modern times.

ناخودا آگاہ حصے کے فرمان دینے کی وجہ سے ''خود آ گاہ حصہ'' اپنے اختیار کے بغیر اسے قبول کر لیتا ہے اور زبان کے ذریعے ظاہر کر دیتا ہے۔

شاید امیر المومنینؑ کا یہ قول کہ

''کوئی شخص بھی کسی راز کو پنہاں نہیں کرتا مگر یہ کہ (چند مواقع پر) یہ راز اُس کے چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے یا اُس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے''[1]

بھی اسی بات کی طرف ہی اشارہ ہو۔

قرآن نے خُدا کو راز پنہاں کرنے والا دانا اور پنہاں تر (سر و اخفی) ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى ۞

اور اگر تم اپنی بات کو آشکار کرو (یا چھپا لو تو خُدا کے علم میں کوئی فرق نہیں ہے) کیونکہ وہ مخفی اور مخفی تر کو جانتا ہے۔ (طٰہٰ۔ ۷)

حضرت امام جعفر صادقؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اَلسِّرُّ مَآ اَخۡضَيۡتَهٗ فِيۡ نَفۡسِكَ وَاَخۡفٰى، مَا خَطَرَ بِبَالِكَ ثُمَّ اَنۡسِيۡتَهٗ [2]

راز وہ چیز ہے کہ جسے تو نے اپنے دل میں چھپا رکھا ہے اور اخفی وہ چیز ہے جو ذہن میں آتی ہے لیکن اسے تو نے فراموشی کے سپرد کر دیا ہے۔

یہ لوگ انسان کے لیے اس طرح کی ایک نامرئی شخصیت ثابت کر کے وحی کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وحی انبیاء کے اُسی مخفی وجدان کی تراوش اور باطنی شخصیت ان کے ناخود آ گاہ ''ذہن'' کے صفحے پر ظاہر ہوتی تھی اور اس کے بعد ''وہ خود آ گاہ ذہن'' میں چلی جاتی تھی۔

اس نظریے کا جائزہ

یہ نظریہ بھی گذشتہ نظریے کی طرح بالکل بے بنیاد ہے گذشتہ نظریے میں وحی کو انسانی تخیل کی پیداوار قرار دیا گیا تھا اور اس نظریے میں وحی کو اُن افکار کے ظہور کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو انسان کے 'خود آ گاہ ذہن' میں آتے ہیں۔ بہر حال یہ دونوں نظریے وحی کو انسانی ذات کی پیداوار قرار دیتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے پر کچھ زیادہ علمی ملمع کاری کی گئی ہے اس سلسلے میں ہم چند مطالب پیش کرتے ہیں۔

---

[1] ما اضمر احد شيئا الا ظهر فى صفحات وجهه و فلتات لسانه (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار نمبر ۲۶

[2] مجمع البیان ج ۷۔ ص ۳

۱۔ اگر ہم انسان کے لیے ایک مخفی شعور اور نا خود آ گاہ ضمیر کے قائل ہوں تو اس پر کیا دلیل ہے کہ وحی کو بھی نفس کے اندرونی افاضے کا ثمرہ اور حاصل قرار دے کر خدا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیں؟ یہ نظریہ پیش کرنے والے افراد نے ان دونوں باتوں کے درمیان رابطے کو بیان نہیں کیا۔ وہ کس دلیل کی بنیاد پر یہ کہہ رہے ہیں کہ وحی ''ضمیر نا خود آ گاہ'' کی ترواش کا نام ہے؟ اس طرح کی تحلیل کا سرچشمہ فقط علمی غرور ہی ہوسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی تمام مجہولات کو ایک زمانے میں حل کر لے، آئندہ کے لیے سوال اور ابہام باقی نہ رہے یہ کیسی فکرِ خام اور کیسا کمزور اور بے بنیاد خیال ہے؟

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔

۲۔ ''نا خود آ گاہ ضمیر'' کی تجلیات صحیح و سالم افراد میں بہت کم ہیں ''نا خود آ گاہ ضمیر'' عموماً بیمار، کمزور، پریشان اور شکست خوردہ افراد میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا ذہن روزمرہ کی مصروفیات سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

ہزاروں علماء میں سے ایک عالم کے لیے اور وہ بھی اس کی پوری زندگی میں صرف ایک دو بار ایسا اتفاق سامنے آتا ہے کہ وہ ناخود آ گاہ طور پر کسی نظریے کے بُرھان تک پہنچ جائے، خلاصہ یہ کہ شعور باطن کی تجلی انسان کی زندگی میں بہت کم ہے یہ تو خاص حالات میں ہی جلوہ نمائی کرتی ہے جیسے خواب یا زندگی میں پیش آنے والی، دوسری تبدیلیاں جو انسان کی توجہ باہر کی دُنیا سے کم کر کے باطنی ضمیر کی طرف لگا دیتی ہیں۔

لیکن انبیاء کی زندگی میں حالات اور تبدیلیاں رونما نہیں ہوتی ہیں۔ قرآن تقریباً ۲۳ سال کے عرصے میں پیغمبرؐ پر نازل ہوا ہے۔ اس عرصے میں اُن کا خود آ گاہ ضمیر بھی سیاسی اور تبلیغی مسائل و فعالیت اور دوسری ہزاروں طرح کی مصروفیات کے باعث پوری طرح مشغول رہا ہے۔ ان کی تمام توجہ ان مصروفیات پر مرتکز تھی جہاد سے متعلق بہت سی آیات میدان جنگ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس وقت اُن کی روحانی شخصیت جنگی اور سیاسی مسائل میں سرگرم ہوتی تھی۔

اگر انبیاء گوشہ نشین، بیمار، کمزور، اور شکست خوردہ افراد ہوتے اور باطنی شعور کے فعال ہونے کی شرائط اُن میں موجود ہوتیں اور اُن کا خود آ گاہ ضمیر بھی باطنی اور نا خود آ گاہ ضمیر کے زیراثر ہوتا نہ کہ اہم معاشرتی واقعات کے زیراثر تو اس صورت میں وحی کے متعلق اس طرح کا خیال اور تو ہم سامنے آسکتا تھا۔ لیکن انبیاء تو اپنی نبوت کے دوران مجاہد اور مبارز افراد میں سے تھے جن کی فکر کا محور لوگوں کی اصلاح ان کی راہنمائی، مشکلات کا حل اور ان کی معنوی و روحانی سطح کو اوپر لے جانا ہوتا تھا۔ ان حالات میں انسان کی دوسری شخصیت کیسے اپنا کام دکھا سکتی ہے۔ کہ وہ ضمیر باطن سے بڑے اہم حقائق لے کر ''روح خود آ گاہ'' کو القا کرے؟

۳۔ وحی کے دعویدار نیک مصلحین، مخلصین اور ہر قسم کے جھوٹ سے مبرا و معصوم تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیمات کو مبدئے آفرینش کی طرف کیوں منسوب کیا، ان کی باتوں میں شخصیت باطنی کی تجلی کی طرف کوئی معمولی سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③ [1]

اس طرح خدائے عزیز و حکیم نے تیری طرف اور تجھ سے پہلے والوں کی طرف وحی کی۔(شوریٰ۔۳)

۴۔سب سے بڑھ کے یہ ''ناخود آگاہ ذہن'' خود معلومات کا منبع اور سرچشمہ نہیں ہوتا وہ اس طرح نہیں ہے کہ اس کے اندر سے بلند اور ثمر بخش افکار پھوٹتے ہوں اور پھر ''خود آگاہ ذہن'' کے ذریعے وہ معاشرے تک پہنچائے جاتے ہوں

بلکہ ناخود آگاہ ذہن'' بھی'' ذہن خود آگاہ سے مسائل اور معلامات اخذ کرتا ہے۔لہٰذا اب آسمانی شریعتوں اور بالخصوص آخری او رمکمل ترین شریعت کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ہم قرآن میں کئی ایسے حقائق دیکھتے ہیں جنہیں کوئی انسانی ذہن ایجاد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ایسے افکار ملتے ہیں جو انسانی علوم کی سرحدوں سے کوسوں آگے ہیں۔

یہ نظریہ پیش کرنے والوں نے یہ سوچا ہے کہ باطنی شخصیت علوم کا منبع ہے جس سے ہر وقت خاص علوم اور معارف پھوٹتے رہتے ہیں۔وہ ایک خاص سرحد پار کرنے کے بعد 'خود آگاہ ذہن' میں آجاتے ہیں حالانکہ ''ناخود آگاہ ذہن'' خود بھی ''خود آگاہ ذہن'' کی معلامات کو فقط ذخیرہ کرتا ہے۔اپنے پاس سے اُن میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرسکتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ حقیقت وحی کے سامنے ہم ضروری اور حقیقی خضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہیں کہ وحی ایک مرموز اور مخفی ادراک اور مخفی شعور ہے جو انبیاء کو حاصل ہے دوسرے اس سے محروم ہیں۔اگر دوسروں کو حاصل ہے بھی تو وہ خُدا کے القاء سے مربوط ہے جس سے وہ اپنے اولیاء کے قلوب کو فیض یاب کرتا ہے۔اسے کرامت بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔مکتبِ مشاء کے فلاسفہ کا عقیدہ

فلاسفہ مشاء وجودِ صانع کے اثبات کے بعد عقول عشرہ کے معتقد ہیں۔دسویں عقل کا نام وہ ''عقل فعل'' رکھتے ہیں۔عقل فعال کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نفوس انسانی کو قوۃ کے مقام سے فعل کے مقام تک پہنچاتی ہے اور جہان مادہ کے ہیولوں کی اس طبعی درخواست کا جواب دیتی ہے جو کہ زبان حال سے وہ جوہری صورکا تقاضا کررہا ہوتا ہے۔

مکتب مشاء میں عقل فعال، القائے حقائق اعطائے معارف اور تکمیل نفوس کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔اولیاء اور بزرگان کے قلوب پر جو معارف اتارے جاتے ہیں یہ تمام کے تمام اسی کا کرشمہ ہیں۔

نفوس ضعیف ہمیشہ حواس ظاہری اور قوائے باطنی کے اسیر رہتے ہیں۔[2] وہ بلند مقام کی طرف جانے کی قدرت و توانائی نہیں رکھتے

---

[1] سورہ شوریٰ اُن سورتوں میں سے ہے جن میں باقی سور کی نسبت وحی کے مسائل زیادہ زیر بحث لائے گئے ہیں یہ مضمون اور اسی سے ملتا جلتا مضمون آیت ۷۔۱۳۔اور ۵۲ میں بھی آیا ہے۔

[2] قوائے باطنی سے مراد قوت وہمیہ ہے جو کہ جزئیہ معانی کو درک کرتی ہے،قوہ عاقلہ کہ مدرک کلیات ہے یہاں صرف قوۃ وہمیہ مُراد ہے۔

جب کہ قوی اور مضبوط نفوس، وہ نفوس جو کہ ایک مکمل پاکیزگی کے حامل ہیں، وہ چاہے نیند کی حالت میں ہوں چاہے بیداری کے عالم میں وہ عقل فعال سے رابطہ قائم کر کے اُس سے حقائق ومعارف حاصل کرتے ہیں۔

چونکہ انسان کی اندرونی قوتیں حالت حکایت رکھتی ہیں بالکل ان آئینوں کی مانند جو ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیے جائیں۔ یہ معارف عقلی کا قوۂ خیال میں ایک مناسب اور فصیح کلام کی صورت میں ادراک کرتے ہیں۔ پھر قوۂ مناسب کلام اُس حالت حکایت کی وجہ سے مرحلہ خیال سے تنزل کرتے ہیں اور حس مشترک میں کلام کی صورت میں سنائی دیتے ہیں۔

پھر یہ علمی حقائق اور معارف الٰہی عقل فعال البتہ خُدا کے اذن اور مشیت سے) کے ذریعے سے صلاحیت رکھنے والے اور آمادہ نفوس کو عطا کئے جاتے ہیں جس سے ہر انسانی قوت میں یہ ایک خاص شکل اور اس سے مناسب حالت میں ظاہر ہوتے ہیں

دوسری طرف عقل فعال جسے شریعت کی زبان میں فرشتہ الٰہی اور ملک قدسی کہا گیا ہے وہ ان حقائق علمی اور معارف الٰہی کا فیضان کرتا ہے۔ عالم مثال میں وہ فرشتے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی وہ عالم طبیعت میں اپنے مرتبے سے کچھ نیچے آ کر انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کامل اپنی ظاہری آنکھوں کے ساتھ اُس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

نفوس انسانی کے ان علمی حقائق کو غیب سے دریافت کرنے کے بارے میں جب یہ قاعدہ کلیہ ہمیں معلوم ہو گیا تو اس سے نبوت 'وحی کلام الٰہی اور فرشتہ وحی کی واضح تفسیر کی جاسکتی ہے۔ حقیقت ''نبوت''، نفس نبوی کا 'عقل فعال' کی منزل تک پہنچنا ہی ہے جہاں وہ اپنے پاک ضمیر کی بدولت اس کائنات کے حقائق کا ادراک کرسکتا ہے۔ یہ حقائق اُس سے معارف وعلوم کی صورت میں اُس کے آئینہ روح میں منعکس ہوتے ہیں۔ نیند اور بیداری کے عالم میں اُس سے رابطہ قائم کرتا ہے وہ کلام الٰہی جو قلب پیغمبر پر نازل ہوتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ قوۂ خیال ان حقائق کا اس مرحلے سے جس کا نام عالم اشباح وصور ہے لے کر ایک فصیح وبلیغ کی شکل میں جو کہ ان کے وجود عقلی کے زیر سایہ جاتا ہے اور ادراک ہے پھر حس مشترک میں ان کی محسوس شکلیں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا نفس نبوی خود اپنے کانوں سے کلام الٰہی سنتا ہے۔ فرشتہ وحی جو کہ عقل فعال ہی ہے وہ عالم مثال میں ایک مثالی موجود کی شکل وصورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی عالمِ طبیعت میں انسانی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

لہٰذا وحی علم کی ایسی حقیقت ہے جو تین مرحلوں میں واقعیت اور عینیت رکھتی ہے لیکن ایک قابل تشکیک '(ذات مراتب) حقیقت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر مرحلے میں اُس مرحلے کے مناسب حال میں تجلی کرتی ہے۔ مثلاً وحی عالم عقل میں وجودِ عقلی اور معارف کلی شکل میں رونما کرتی ہے۔ عالم مثال جو کہ کائنات کا ایک سایہ اور شبح ہے اس میں یہ الفاظ اور مثالی اصوات میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں گویا یہ حقیقتاً موجود ہے۔ حس مشترک میں یہ مسموع الفاظ اور آوازوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مرحلے میں ایک حقیقی وجود سے بہرمند ہے یہ ذات نبی یا اُس کے فکر وگمان کی پیداوار نہیں بلکہ اُس کی روح یہ صلاحیت اور استعداد پیدا کر لیتی ہے کہ حقیقت وحی اپنے تینوں مراحل میں اُس عقل، خیال اور حس مشترک میں ظاہر ہو جائے چونکہ اس نظام ہستی کا سلسلہ خُدا پر منتہی ہوتا ہے لہٰذا حقیقت وحی بھی مبدے خلقت سے نفس پیغمبر پر فیضان کی جاتی ہے۔

فرشتہ وحی بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے لیکن ہر مرحلے میں وہ اس مرحلے کی مناسبت سے ظہور کرتا ہے۔ عالم مثال وخیال میں وہ

فرشتہ وحی وجود مثالی رکھتا ہے۔ یہ وہی عقل وفعل ہے کو اپنے لیے ایک نا قابل تردید حقیقت رکھتا ہے۔ اسی طرح نبی کی آنکھوں کے سامنے اُس کا جسمانی حالت میں آنا ایک حقیقت اور واقعیت رکھتا ہے جو کہ اس مرحلے کی مناسبت سے ہے۔[1]

اس نظریے کی تحلیل

وجود کے اس طویل نظام میں عقول عشرہ کا نظریہ مکتب مشا کے فلاسفہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے ساتھ انہوں نے علت اور فاعل بسیط من جمیع الجہات یعنی واجب الوجود سے کثرت کے صدور والے فلسفی سوال کو حل کیا ہے اس کا بیان ایک دقیق فلسفی بحث کا متقضی ہے جو کہ ہماری گفتگو کے دائرکار سے باہر ہے۔ اس بحث سے جو کچھ مربوط ہے وہ عالم مادہ سے برتر ایک عالم عقل کا موجود ہونا ہے جسکا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ متعدد عقلی براہین اس کے وجود کی تصدیق وتائید کرتے ہیں۔ یہ فلسفی کتب میں بیان ہُوئے ہیں۔ البتہ یہ کہ حقیقت وحی نبوت اور فرشتہ وحی کی تفسیر بھی اس نظریے کی بنیاد پر کی جائے یہ بات قابل غور وتامل ہے۔ اسے بالکل آنکھیں بند کرکے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس سلسلے میں دو نکات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ فلاسفہ مشاء نے وحی اور نبوت کی تفسیر میں جو کچھ کہا ہے یہ فقط ایک مفروضہ ہے۔ اس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ عقل مفارق اور فرشتہ وحی معارف الٰہی کے القا اور قلب پیغمبر پر شریعت کے نزول کے درمیان مطابقت اور یگانگی پائی جاتی ہے۔

۲۔ وجود کے کئی مراتب بنا کر اُن کی اساس پر وحی کی تفسیر کرنا اور یہ کہنا کہ وحی عالم عقل میں وجود عقلانی عالم مثال میں وجود مثالی اور عالم حس میں الفاظ اور آوازوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض آیات کے لیے یہ صحیح اور ثابت ہے معارف واحکام سے متعلق آیات کے لیے ایک عقلی، مثالی اور حسی وجود متصور ہوسکتا ہے۔ لیکن آسمانی کتابوں میں بالعموم اور قرآن مجید میں بالخصوص چند ایسے مطالب بھی ہیں جو کہ پیغمبر کے اہل کتاب سے جدل کے ساتھ مربوط ہیں۔ اسی طرح مشرکین کی انبیا کے ساتھ گفتگو سے متعلق ہیں۔ انبیاء پر انہوں نے جو تہمتیں لگائی ہیں اور افترا باندھے ہیں ان کا ذکر ہے۔ اسی طرح مختلف لوگوں کے ساتھ انبیاء کی گفتگو کا تذکرہ ہے۔ ان سب میں وہ تین مراحل متصور نہیں ہیں۔ مثلاً یہ آیت:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ

خُدا نے سنا کہ ایک مرد اپنی بیوی کے سلسلے میں تم سے جھگڑ رہا ہے۔ (مُجادلۃ، ۱)

اور اسی طرح کی دوسری آیات میں کیسے تین طرح کے وجود عقلی، مثالی اور حسی متصور ہو سکتے ہیں اور پھر وحی کو وجود عقلی کا ان میں تنزل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ تنزل اور وجودی مراتب تو معارف، احکام اور ان کی مبادی سے مربوط ہیں جن کے وجود کے تین مراتب بنائے جا سکتے ہیں۔

ہاں: البتہ اس نظریے کی محکم بات یہ ہے کہ اس نے وحی کے دنیائے غیب سے رابطے کو محفوظ رکھا ہے اسے نفس نبی کی پیداوار قرار نہیں

---

[1] اشارات ج ۳، نمط دہم، ص ۴۰۳۔ اسفار، ج ۷ فصل ۷ ص ۲۳۔۲۸۔ جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اسی فصل سے اقتباس ہے۔

دیا کہ جوان تین مراحل میں آتی، لہٰذا اس نظریے کے قائلین کو اس اعتبار سے موردِ تنقید قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آخر میں اس بات کی یاد آوری کراتے چلیں کہ ایسے عالم اور کوشش کرنے والے افراد جو ہمیشہ علمی مسائل کے حل میں مصروف رہتے ہیں ان کا حساب دوسرے لوگوں سے جُدا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے کام میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ یہ لوگ تو علمی بلندیوں کو فتح کرنے کے لیے کمر بستہ ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ اُسی پستی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تن کی راحت کو کام کی مشقت پر ترجیح دیتے ہیں۔

(۱۹) انبیاء کے مشترکات اور مختصات

(حصہ اول)

اولو العزم انبیاء کون ہیں؟

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء۔ ۸)

۲۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ (رعد۔ ۳۸)

۳۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ
(فرقان۔ ۷)

۴۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ (یوسف۔ ۱۰۹، نحل۔ ۴۳)

۵۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ
بَعْضَهُمْ ۶۔ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ
الْقُدُسِ ؕ (بقرۃ۔ ۲۵۳)

۷۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى
وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (احزاب۔ ۷)

۸۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا
وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا
(شوریٰ۔ ۱۳)

۹۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ
يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ
إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٣٥﴾ (احقاف۔۳۵)

۱۰۔ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ (محمد۔۲۱)

۱۱۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ (ال عمران۔۱۵۹)

۱۲۔ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (بقرۃ۔۲۲۷)

۱۳۔ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (بقرۃ۔۲۳۵)

۱۴۔ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾ (ال عمران۔۱۸۶)

۱۵۔ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾ (لقمان۔۱۷)

۱۶۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ (طٰہٰ۔۱۱۵)

۱۷۔ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ (یٰس۔۶۰۔۶۱)

۱۸۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ
وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ (قلم۔۴۸)

۱۹۔ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ
(زخرف۔۶۳)

۲۰۔ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (ال عمران۔۵۰)

۲۱۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ (انعام۔۹۰)

۲۲۔ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾ (انعام۔۸۷)

تفسیر

انبیاء الٰہی سے متعلق ایک اور قرآنی بحث جو قابل غور ہے وہ انبیاء الٰہی کے مشترکات اور مختصات کا موضوع ہے انبیاء کے مشترکات اور مختصات سے متعلق ابحاث دو حصوں پر مشتمل ہیں:

۱۔انبیاء کے مشترکات اور مختصات دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتے ہوئے۔

۲۔انبیاء کے مشترکات اور مختصات ایک دوسرے کی نسبت۔

سب سے پہلے ہم بحث کے پہلے حصے پر روشنی ڈالتے ہیں۔یہ بحث بھی دو پہلوؤں پر مشتمل ہے:

الف۔انبیاء اور دوسرے انسانوں کے درمیان مشترک امور،

ب۔انبیاء کے مختصات۔

ہم دونوں پہلوؤں کو باہم زیر بحث لائیں گے۔

تربیت اور ہدایت سے متعلق قانون کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء اپنے زیر تربیت افراد کے ساتھ بہت سے پہلوؤں مثلاً جسمانی اور روحانی پہلوؤں میں مشابہت رکھتے ہوں ورنہ رسالت کا مقصد پورا نہیں ہو پائے گا۔ہم نے پہلے بھی اس سے متعلق ایک انداز سے گفتگو کی تھی۔

قرآن نے بہت سے مقامات پر اس مشابہت کا ذکر کیا ہے۔ہم انہیں بیان کرتے ہیں:

۱۔وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧

''ہم نے انہیں غذا سے بے نیاز بدن قرار نہیں دیا اور ان کیلئے جاودانہ زندگی مقرر نہیں کی۔(انبیاء۔۸)

۲۔ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ

ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسولوں کو بھیجا اور ان کے لیے بیویاں اور اولاد مقرر کی۔(رعد۔۳۸)

۳۔قرآن نے مشرکین کا ایک اعتراض اسی ظاہری مشابہت کو قرار دیا ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ

''اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔(فرقان۔۷)

جب کہ دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ استاد شاگرد پر ایک خاص برتری اور فوقیت رکھتا ہو جس کی وجہ سے وہ اُس کی تربیت کر سکے اور اُس کا اعتماد حاصل کر سکے اس قانون کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء ایک خاص برتری کے حامل ہوں تا کہ وہ الٰہی تعلیمات آگے پہنچا سکیں۔انبیاء کے دوسروں پر امتیاز کا یہ ایک پہلو ہے۔ایک اہم امتیاز انبیاء پر وحی کا نزول ہے۔دوسرے لوگ اس سے محروم ہوتے ہیں۔درحقیقت یہ امتیاز کئی باقی

اعزازات کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس کو اٹھا لیا جائے تو انبیاء اور باقی انسان ایک سطح پر آ جائیں گے۔ قرآن نے متعدد آیات میں اس نکتے کو صراحت سے بیان فرمایا ہے۔ سورہ کہف آیت نمبر ۱۱۰ اور سورہ حٰم سجدۃ آیت نمبر ۶ میں اس مشابہت اور امتیاز کو دو لفظوں میں بیان فرما دیا ہے۔

مشابہت کے بارے میں فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۔

کہہ دیجئے میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔

اور امتیاز کے بارے میں فرمایا:

یُوۡحٰۤی اِلَیَّ

میرا جہان بالا سے رابطہ ہے۔

اس امتیاز میں باقی سب امتیازات پنہاں ہیں۔ جو اُوپر سے رابطہ قائم کر سکے اور وحی الٰہی کو وصول کر سکے اُسے تمام روحانی اور جسمانی کمالات سے مالا مال ہونا چاہیے تا کہ وہ خدا کا پیغام وصول کر سکے اسے یاد رکھ سکے اور اسے عملی صورت دے سکے۔ لہٰذا یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے کہ قرآن نے ''وحی'' کے اعزاز کو اتنی اہمیت دی ہے اور دوسرے امتیازات کو بیان نہیں کیا کیونکہ جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے یہ اعزاز باقی سب امتیازات پر حاوی ہے۔ نوے سو کے اندر ہی موجود ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ [1]

ہم نے تجھ سے پہلے افراد کو نہیں بھیجا مگر یہ ان پر وحی نازل کی۔ (یوسف۔ ۱۰۹)

اب یہ کہ وحی کی حقیقت کیا ہے اور یہ امتیاز کیسے باقی سب امتیازات پر حاوی ہے اس سے متعلق ہم نے گذشتہ باب میں گفتگو کی ہے۔ ایک اور آیت میں معترضین کی زبانی نقل ہوتا ہے کہ وہ انبیاء سے کہتے ہیں:

اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا

انبیاء یہ قبول کرنے کے ساتھ کہ وہ بشر ہیں اپنے اس امتیاز کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں اور کہتے ہیں:

اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نَّاۡتِیَکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ

[1] یہی مضمون سورہ نحل ۴۳ اور انبیاء میں بھی آیا ہے۔

انبیاء کہتے تھے۔ہاں ہم تمہاری طرح بشر ہیں لیکن خُدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کر دیتا ہے (اُسے خلقت وحی سے نواز دیتا ہے) ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ خُدا کے اذن کے بغیر تمہارے لیے معجزہ لائیں۔(ابراہیم۔۱۱)

اس آیت میں انہوں نے تصریحاً اور کنایۃً اپنے اس امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے۔کنایۃً یوں فرمایا کہ: خُدا جس پر چاہے احسان کر دیتا ہے۔یعنی اُس نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں اپنا پیغام آگے پہنچانے کی ذمہ داری سونپی۔

تصریحاً یوں فرمایا کہ ہم معجزہ رکھتے ہیں۔یہ معجزہ ہمیں خُدا کے اذن سے عطا کیا گیا ہے جب کہ تم اس کمال سے تہی دست ہو۔

انبیاء کے ایک دوسرے سے امتیازات

یہاں تک انبیاء اور ان کی امتوں کے درمیان امتیازات بیان ہوئے۔اب اس امر کی باری ہے کہ انبیاء کو جو خود ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت حاصل ہے اُسے قرآنی نکتہ نظر سے بیان کیا جائے۔

آیات یہ بتاتی ہیں کہ انبیاء فضلیت اور برتری کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں بلکہ اس کے باوجود کہ وہ سب کے سب منصب نبوت اور عالم وحی سے رابطے میں برابر ہیں بعض دوسرے معیارات اور فضائل میں ایک دوسرے سے مختلف درجے پر ہیں۔ان کے نام، کتابیں اور شریعتیں تمام انبیاء کے لیے درخشندگی کی حامل ہیں۔اسی برتری کی وجہ سے بعض صاحب کتاب ہیں اور بعض کو کتاب عطا نہیں کی گئی۔بعض صاحب شریعت ہیں اور بعض ان کی شریعت کے تابع اور پیروکار۔ان کی فضیلت کے مختلف درجات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات سے مدد لیتے ہیں۔

۱۔تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا کی (اس دلیل کے ساتھ) خُدا نے بعض سے گفتگو کی اور بعض کے درجات کو بلند کیا ہے اور عیسیٰ ابن مریمؑ کو بنیات (معجزہ) عطا کی ہیں اور روح القدس کے ساتھ اُس کی تائید کی ہے۔ (بقرۃ۔۲۵۳)

اس آیت میں انبیاء کے درجات کے درمیان فرق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس اختلاف مراتب کی کئی علامتیں اور شواہد بھی بیان ہوئے ہیں وہ یہ کہ خُدا نے حضرت موسیٰؑ سے تکلم کیا، حضرت مسیحؑ کو بہت سے معجزات عطا فرمائے اور ان کی مدد روح القدس کے ذریعے سے کی یہ

بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ تمام انبیاء اس طرح کی خصوصیات کے حامل نہ تھے۔

۲۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝

اُس وقت کو یاد کرو جب ہم نے انبیاء سے، تجھ سے، نوحؑ سے، ابراہیمؑ سے، موسیٰؑ سے اور عیسیٰ بن مریم سے ایک خاص وعدہ لیا اوران سے ایک سخت عہد و پیمان لیا۔(احزاب۔۷)

اس آیت مین اجمالی طور پر اس بات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ انبیاء سے ایک عہد و پیمان لیا گیا ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے ۔''من النبین''اس کے بعد پیغمبرؐ اسلام اور چاردوسرے انبیاء کا بالخصوص ذکرکیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے''ہم نے آپ سے اوران سے پیان لیا ''انبیاء میں سے ان پانچ افرادکو جوالگ سے ذکرکیا ہے اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک خاص برتری اوراہمیت کے حامل ہیں جس کی وجہ سے ان کا ذکرخصوصی طور پر کیا جارہا ہے۔اب یہ کہ وہ پیمان کس کے بارے میں تھا۔اس سلسلے میں اس آیت نے کچھ نہیں بتایا لیکن ایک اور آیت (آل عمران۔۸۱) نے اسے بیان کیا ہے۔

۲۔ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا

تمہارے لیے دین میں سے وہ تشریع کیا گیا جس کی نوح کوسفارش کی گئی تھی اور جو تیری طرف وحی کیا گیا اورجس کی سفارش ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی گئی (اوروہ یہ ہے کہ) دین کو قائم کرواوراُس میں تفرقہ بازی نہ کرو۔(شوریٰ۔۱۳)

یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں پانچ انبیاء کے درمیان ایک مشترک ضابطے کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ ضابطہ صرف ان پانچ انبیاء کے آئینوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء کی امتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ضابطے کی حفاظت کریں۔ان پانچ انبیاء کو اُن کی امتوں کے ساتھ خاص طور پر جومخاطب کیا جارہا ہے تو اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن خاص برتری اس خصوصیات کا باعث بنی ہے۔

ان آیات کی تحلیل وتفسیر سے برتر انبیاء کو متعین کیا جاسکتا ہے یہ وہ انبیاء ہیں جنہیں شریعت عطا کی گئی ہے۔ان کے ہم عصر یا بعد میں آنے والے انبیاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی نئی شریعت کے آنے تک اسی شریعت کی پیروی کریں۔

اولوالعزم انبیاء

قرآن نے بعض انبیاء کو اولی العزم (محکم اور استوار ارادے والے) قرار دیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلْ لَّهُمۡ ؕ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنۡ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

صبر کر جیسا کہ اولوالعزم انبیاء نے استقامت کی اور کافروں کے لیے جلدی نہ کر جس دن وہ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے تو وہ ایسا خیال کریں گے گویا کہ دن کا ایک حصہ (قبر میں) رہے ہیں قرآن پیام ہے اور فاسقوں کے علاوہ کوئی ہلاک نہیں ہوگا۔ (احقاف۔ ۳۵)

اس آیت میں خُدا اپنے پیغمبر کو یہ حکم دے رہا ہے کہ اولی العزم انبیاء کے مانند دشمن کے سامنے استقامت کا مظاہر کریں۔ ضروری ہے کہ لفظ ''عزم'' کے معانی قرآن ولغت سے بیان کیے جائیں۔

لغت میں ''عزم'' صرف ایک معنی ہی رکھتا ہے وہ قطع کرنے اور کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اگر پختہ ارادے کو عزم کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ارادہ شک اور حیرت کو کاٹ کے رکھ دیتا ہے (ختم کر دیتا ہے)۔

عرب کے مشہور لغات سے یہی معنی ظاہر ہوتا ہے۔[1]

قرآن میں عزم اُسی پختہ ارادے کے لیے استعمال ہوا ہے جسے لغت عرب میں ''عقد القلب'' کہتے ہیں۔

قرآنی آیات اسی بات پر گواہی دے رہی ہیں۔

۱۔ فَاِذَا عَزَمَ الۡاَمۡرُ ۟

جب ارادہ پختہ ہو گیا۔ (محمد۔ ۲۱)

۲۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ

جب بھی ارادہ کرلو تو اللہ پر توکل کرو۔ (آل عمران۔ ۱۵۹)

۳۔ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

اور اگر طلاق کا ارادہ کرلو۔ (بقرۃ۔ ۲۲۷)

۴۔ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ

نکاح کا قطعی ارادہ نہ کرو جب تک ان کی عدت تمام نہ ہو جائے۔ (بقرۃ۔ ۲۳۵)

---

[1] المقائیس ج ۴۔ ص ۳۰۸

۵۔ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾

اگر صبر اور تقوی اختیار کرو تو یہ ان امور میں سے ہے جو پختہ اور محکم ارادے سے ہیں۔ (آل عمران ۔١٨٦)

اس آخری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''صبر اور عزم'' آپس میں مترادف نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک دوسرے کا لازمہ ہیں۔ یہی بات ایک اور آیت سے بھی معلوم ہو رہی ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٧﴾

تجھ پر جو مصیبتیں آتی ہیں اُن پر صبر کر کیونکہ صبر کرنا اُن امور میں سے ہے جن کے بارے میں پختہ ارادہ کرنا چاہیے۔ (لقمان۔١٧)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾

جو کوئی بھی استقامت کرے اور معاف کر دیا کرے یہ ضروری امور میں سے ہے۔ (شوریٰ۔ ٤٣)

یہ آیات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ ''صبر'' اور ''عزم'' ''مفہوم کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔لیکن زمخشری نے ان دونوں کو آپس میں مترادف قرار دیا ہے۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اولو العزم ای اولو الجد والثبات و الصبر''

کوشش، استواری اور صبر کرنے والے

اس بیان سے مندرجہ ذیل آیت کا معنی واضح ہو جاتا ہے کہ

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

''ہم نے پہلے آدم سے عہد و پیمان لیا پھر وہ بھول گئے۔ (طٰہٰ۔ ١١٥)

پس ''عزم'' لغت میں قطع (مقابل وحمل) کے معنی میں ہے۔قرآن میں یہ اسی مناسبت سے محکم اور پختہ ارادے کے لیے استعمال ہوا ہے جسے ''عقد القلب'' کہتے ہیں۔

لہٰذا عزم تمام موارد میں قطعی ارادے کے معنی میں ہے۔ اولو کا معنی صاحبان اور حاملان ہے۔لہٰذا اولوالعزم کے معنی محکم اور پختہ ارادے کا مالک اور صاحب ہونا ہے۔

جو کبھی عمل سے ہٹ کے نہیں ہو سکتا۔ اس کے مصادیق کون کون سے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اب گفتگو کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں تفاسیر میں کئی احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔ہم انہیں مختصر طور پر یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔وہ انبیاء جو عالمی دین لے کر آئے

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اولوالعزم سے مُراد انبیاء کی وہ جماعت ہے جن کا آئین اور شریعت عالمگیر تھی۔مشرق ومغرب اور جن وانس کے آئین کے تابع تھے۔[۱] البتہ یہ تفسیر ان لوگوں کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہے۔جو گذشتہ انبیاء کے آئین کو اسلام کے آئین کی طرح عالمگیر اور جہانی سمجھتے ہیں حالانکہ عالمگیر آئین صرف اسلام ہی ہے گذشتہ انبیاء اس خصوصیات سے محروم تھے۔یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کے آئین بھی اس وسعت کے حامل نہ تھے۔اس کی تفصیل ہم نے کئی اور مقامات پر ذکر کی ہے۔[۲]

۲۔تمام انبیاء اولی العزم ہیں

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اولوالعزم سے مُراد تمام انبیاء ہیں کیونکہ وہ سب خُدا کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں محکم ارادہ اور پختہ عزم رکھتے تھے۔کوئی کوشش اور مجاہدہ بھی محکم ارادے کے بغیر امکان پذیر نہیں ہوتا۔لہٰذا اولوالعزم من الرسل'' کے جملے میں لفظ'من'' بیانہ ہے۔آیت کا معنی یوں ہے:

استقامت کرو جیسے کہ عزم راسخ کے حامل افراد نے استقامت کی یعنی جیسے کہ انبیاء نے۔

یہ عنوان تمام انبیاء کو شامل ہے۔اس پر شاہد یہ ہے کہ تمام سے عہد و پیمان لیا گیا ہے اور عہد و پیمان پر عمل عزم استوار کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں سورہ احزاب آیت ۷ پر غور کیجئے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۷ (احزاب۔۷)

یاد کرو اُس وقت کو جب ہم نے انبیاء سے عہد و پیمان لیا اور تجھ سے نوحؑ سے ابراہیمؑ سے،موسیٰؑ سے اور عیسیٰؑ بن مریم سے پیمان لیا اور تمام سے سخت اور محکم عہد و پیمان لیا۔

ابھی ہماری گفتگو اس بارے میں نہیں ہے کہ اس عہد و پیمان کا محور کیا تھا۔لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ایک محکم عہد و پیمان پر عمل استقامت اور پختہ ارادے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔انبیاء میں سے ان پانچ افراد کا خصوصی طور پر کیوں ذکر ہوُا ہے یہ اُن کی عظمت کے پیش نظر

---

[۱] حق الیقین۔ص ۱۱۱

[۲] مفاہیم القرآن ج ۳۔ص ۷۷،۱۰۶

ہے۔یہی مضمون اور بھی کئی آیات میں آیا ہے۔[1] ممکن ہے یہاں یہ پوچھا جائے کہ اگر یہ عنوان تمام انبیاء پر صادق آتا ہے تو پھر قرآن نے حضرت آدم کے بارے میں یہ کیوں فرمایا ہے کہ وہ پختہ ارادہ نہیں رکھتے تھے:

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِىَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾

ہم نے اس سے پہلے آدم سے وعدہ لیا لیکن وہ بھول گئے ہم نے اُس میں عزم نہ پایا۔ (طٰہٰ۔۱۱۵)

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق ''ہبوط'' سے پہلے ہے جب کہ ہماری گفتگو جہان تکلیف سے مربوط ہے۔اس دنیا میں آدم نے عزم الٰہی کو بُھلا دیا ہو، اس پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔

اس کے باوجود یہ نظریہ چند ایک شکایات رکھتا ہے۔

اول: ''من الرسل'' میں لفظ 'من' 'تبعیض' میں ظہور رکھتا ہے نہ کہ تبیین میں۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُن میں سے بعض اس بلند مقام ''اولوالعزمی'' پر فائز تھے نہ کہ سب کے سب، پس یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔کہ تمام انبیاء اولوالعزم تھے۔

دوم: تمام انبیاء سے عہد و پیمان لینے کو بنیاد بنا کر اس بات پر استدلال کرنا کہ وہ سب کے سب اولی العزم تھے درست نہیں ہے کیونکہ عہد و پیمان لینا تو اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ مقام عمل میں عزم راسخ کے حامل ہوں گے۔خُدا نے تو انسان سے بھی ابتدائے خلقت میں عہد و پیمان لیا ہے اس کے باوجود اکثر انسان اس پر عمل نہیں کرتے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ‌ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ‏ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ‌ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ‏ ﴿۶۱﴾

اے بنی آدم کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور میری عبادت کرو۔یہی صراط مستقیم ہے۔(یٰس۔۶۰۔۶۱)

۳۔وہ انبیاء کہ جن میں استقامت زیادہ تھی

ایک اور رائے یہ ہے کہ مُراد تمام انبیاء نہیں ہیں بلکہ انبیاء کی وہ جماعت مُراد ہے جو آئین الٰہی کی تبلیغ زیادہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتی تھی۔مخالفوں کی طرف سے اذیت و آزار اور تکذیب کے باوجود وہ پہاڑوں کی طرح استوار رہتے تھے۔

اس نظریے میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

ا۔تمام انبیاء اس صفت کے حامل نہ تھے۔

---

[1] شوریٰ۔۱۳، آل عمران، ۸۱

۲۔مُرادانبیاء کی وہ جماعت ہے جو تبلیغ دین کی راہ میں پہاڑوں جیسی استقامت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

البتہ دوسرے کاموں میں صبر واستقامت اس صفت کے لیے معیار نہیں بن سکتا۔ گویا آیت کا معنی یہ ہوُا کہ:

''صبر کیجئے جیسا کہ عزم واستقامت کے حاملین انبیاء نے اپنی پیامبر کی راہ میں صبر کیا۔''

قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس کے ذریعے سے اس جماعت کو متعین کیا جا سکے اگرچہ بعض احادیث میں چار انبیاء کا نام لیا گیا ہے۔ وہ نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ بن مریم ہیں [۱] جب کہ ظاہر یہ ہے کہ تبلیغ دین کی راہ میں اُن کی استقامت مُراد ہے۔ بعض احادیث اس آیت کی تطبیق بعض ایسے انبیاء پر کرتی ہیں جن کی استقامت اور صبر کا دائرہ کار اُن کی تبلیغ کے دائرہ کار سے باہر تھا۔ جیسے حضرت یعقوب جنہوں نے اپنے بیٹے یوسف کی جدائی میں اتنا صبر کیا کہ آنکھوں سے نابینا ہو گئے یا حضرت یوسفؑ جنہوں نے اپنے پاکدامنی کی حفاظت کے لیے قید و بند قبول کر لی یا حضرت داؤد کہ جو اپنی غلطی پر چالیس سال تک روتے رہے یا حضرت مسیح کہ جنہوں نے کوئی جاگیر نہیں بنالی اور کہا کہ یہ دنیا تو ایک گزرگاہ ہے اس کی تعمیر میں وقت برباد نہ کرو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ:

آدم وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کے تحت ایسی استقامت کا مظاہرہ نہ کر سکے یا حضرت یونس

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾

اُس مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جاجب کہ اس نے غصے میں اپنے رب کو پکارا (قلم۔۴۸)

کے تحت عزم استوار کے حامل نہ تھے۔

لیکن یہ روایت آیت کے ظہور کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی روایت اس سے زیادہ استحکام کی حامل ہے۔ بالخصوص اس بات کے پیش نظر بھی کہ دوسری روایت میں اسماعیل کی بجائے اسحاق کے متعلق یہ بات کی گئی ہے کہ انہوں نے قربان ہونے کے سلسلے میں استقامت اور صبر کا مظاہرہ کیا جب کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ اُن یہودی روایات کے مانند ہے جو کسی طرح سے اسلامی احادیث میں داخل ہو چکی ہیں۔ [۲]

۵۔صاحب شریعت نبی

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ اولوالعزم سے مراد انبیاء کی وہ جماعت ہے جو صاحب شریعت تھی جنہوں نے گذشتہ شریعت کو اپنی شریعت کے ذریعے نسخ کر دیا۔ وہ حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ ہیں اور ان کے بعد ان سب کے سید و سردار پیغمبر گرامی اسلام ہیں جو کہ رسالت کا

---

[۱] مجمع البیان ج ۵ ص ۱۶۹۔ مفاتیح الغیب ج ۷۔ ص ۴۶۸

[۲] بعض مفسرین نے اس کی تفسیر ان انبیاء کے ساتھ کی ہے جنہیں خُدا کی جانب سے دین کی ترقی اور آگے پھیلانے کے لیے جہاد اور قتال پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ تفسیر بھی اس نظریے کے ساتھ ہم آہنگ ہے بلکہ اسی کا ایک زاویہ ہے۔ لہٰذا ہم نے اسے ایک الگ نظریے کے طور پر ذکر نہیں کیا۔

محور ہیں[1] یہ تفسیر بعض شیعہ احادیث میں بھی آئی ہے۔

کلینیؒ نے سند موثق کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور شیخ صدوق نے بھی سند موثق کے ساتھ حضرت امام رضاؑ سے اس طرح کی روایت بیان کی ہے۔[2]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہر بعد میں آنے والی شریعت تو پہلی شریعت کے لیے ناسخ نہ تھی۔ مثلاً حضرت عیسٰیؑ کی شریعت نے حضرت موسیٰؑ کی شریعت کا نسخ تو نہیں کیا تھا بلکہ اُس کا مقصد تو بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے اختلافات کے درمیان فیصلہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ

میں حکیمانہ سخن لے کر تمہارے پاس آیا ہوں تاکہ تمہارے اختلافات حل کروں۔ (زخرف۔ ۶۳)

مگر یہ کہ نسخ سے مُراد چند احکام کی تجدید ہو حضرت مسیح نے ان قیود کو ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (ال عمران۔ ۵۰)

۴۔ مُراد اٹھارہ انبیاء ہیں

قرآن نے سورہ انعام آیات ۸۲ تا ۸۶ میں اٹھارہ انبیاء کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

ابراہیم، اسحاقؑ، یعقوبؑ، نوحؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسماعیل، الیسع، یونسؑ، لوطؑ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔

یہ ہدایت یافتہ ہیں، ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

---

[1] مجمع البیان ج ۵، ص ۱۹۴

[2] تفسیر بُرہان ج ۴ ص ۱۷۸، ۱۷۹۔ کلینی کی سند یہ ہے:۔ عدة من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد عن عثمان بن عیسٰی عن سماعة بن مهران قال: قلت لابی عبدالله قول الله عزوجل "فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل فقال نوح و ابراهیم، شیخ صدوق کی سند یوں ہے: حدثنا محمد بن ابراهیم بن اسحاق الطالقانی قال حدثنا ۔ ین الکونی الهمدانی قال حدثنی علی بن الحسن علی بن فضال عن ابیه عن ابی الحسن الرضا قال: انما سی اولوا العزم لا نهم کانو اصحاب العزائم و الشرائع۔۔۔۔۔۔۔۔

اور زیر بحث آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ۔

صبر کرنا بھی اولوالعزم سے ایک طرح کا درس ہدایت لینا ہے۔

لیکن یہ نظریہ اولوالعزم کی تفسیر میں سب سے کمزور نظریہ ہے کیونکہ خود قرآن نے بھی ہدایت لینے کے لیے صرف ان اٹھارہ انبیاء کو مخصوص نہیں کیا بلکہ ان اٹھارہ نبیوں کا نام لینے کے بعد اُن کے آباء اور اولاد اور بھائیوں کا بھی کلی طور پر ذکر کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ (انعام۔۸۷)

پھر اس آیت کے بعد ارشاد ہوتا فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔

لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انبیاء سے ہدایت کا پھوٹنا ان اٹھارہ نبیوں کے ساتھ ہی مخصوص ہو۔

علاوہ ازیں ان اٹھارہ نبیوں میں تو حضرت یونس کا نام بھی شامل ہے۔حالانکہ خُدا نے اپنے نبی کو اس کی روش کی پیروی کرنے سے روکا ہے۔اارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ

ان پانچ نظریات میں سے تیسرا اور چوتھا نظریہ کچھ زیادہ درست دکھائی دیتا ہے۔وہ یہ ہے کہ مُراد انبیاء کی وہ جماعت ہے جو تبلیغ دین کے لیے ایک پہاڑ کی مانند صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتی تھی۔سخت اور تلخ حوادث کے سامنے وہ کسی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ان میں سرفہرست نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، اور پیغمبر اسلامؐ ہیں۔

گویا تیسرے اور چوتھے نظریے میں ایک جہت سے مطابقت پائی جاتی ہے۔وہ یہ کہ یہ صاحب شریعت انبیاء اولوالعزم انبیاء میں سے تھے۔

ان دونوں نظریات میں تفاوت اس لحاظ سے ہے چوتھے نظریے کے مطابق اولوالعزم کا انحصار ان انبیاء میں ہے جب کہ تیسرا نظریہ ایک عام عنوان کی بات کر رہا ہے جو دوسرے ایسے انبیاء پر بھی آتا ہے جو احکام دین کی تبلیغ کے سلسلے میں عزم محکم اور ارادہ استوار کے حامل تھے۔لیکن اُن دو روایات کی بنا پر جو کہ چوتھے نظریہ کی تائید کر رہی تھیں۔یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ نظریہ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حق کے زیادہ قریب ہے۔

(۲۰) انبیاء کے مشترکات اور مختصات

حصہ دوم

رسول اور نبی کون ہے؟

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۔۔۔۔(اعراف۔۱۵۷)

۲۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (حج۔۵۲)

۳۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ (مریم۔۵۱)

۴۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (بقرۃ۔۲۱۳)

۵۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ (فرقان۔۳۱)

۶۔ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ (مریم۔۵۴)

۷۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ (حدید۔۲۵)

۸۔ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ (فتح۔۲۷)

۹۔ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ (بنی اسرائیل۔۶۰)

۱۰۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ (نساء۔۱۶۳)

۱۱۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ (انبیاء۔۲۵)

۱۲۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (مائدہ۔۶۷)

۱۳۔ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ (مریم۔۱۹)

۱۴۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ (نحل۔۳۵)

۱۵۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ (عنکبوت۔۱۸)

۱۶۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾ (تغابن۔۱۲)

۱۷۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ (جن۔۲۳)

۱۸۔ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ (احزاب۔۳۹)

۱۹۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ (اعراف۔۶۲)

۲۰۔ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ (احقاف۔۲۳)

۲۱۔ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا

بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (صف۔۶)

۲۲۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (انعام۔۶۱)

۲۳۔ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ (یوسف۔۵۰)

۲۴۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴

(مریم۔ ۵۴)

تفسیر

قرآن نے انبیائے الٰہی کو عموماً لفظ ''نبی'' اور ''رسول'' کے ساتھ یاد کیا ہے۔ بعض آیات میں صرف لفظِ ''نبی'' لایا گیا ہے اور بعض میں صرف لفظ ''رسول'' اور بعض میں یہ دونوں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض آیات کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ

اور ہم نے تم سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر یہ کہ جب بھی وہ (اپنے مقاصد کی تکمیل کی) تمنا کرتا تو شیطان اُس کی تمنا میں مداخلت کرتا اور دھوکا دیتا۔ (حج۔۵۲)

یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ کچھ افراد نبی تھے اور کچھ رسول۔ البتہ یہاں کچھ اور آیات بھی ہیں لیکن وہ دلالت کے اعتبار سے اس درجے کی نہیں ہیں۔ جیسے یہ آیت:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اُس نبی اُمی کی جسے وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں ۔ (اعراف۔۱۵۷)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ ۡاِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾

قرآن میں موسیٰؑ کو یاد کیجئے بے شک وہ ہمارا مخلص بندہ اور رسول و نبی تھا۔ (مریم۔۵۱)

یا ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡاِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾

قرآن مجید میں اسماعیل کو یاد کرو بے شک وہ سچے قول والے اور رسول و نبی تھے۔(مریم۔۵۴)

ان آیات میں رسول اور نبی اکٹھے لائے گئے ہیں۔

ان دونوں الفاظ کو آپس میں مترادف قرار دینے کا احتمال بہت کمزور ہے۔دوسرے یہ احتمال کہ رسول سے مُراد ''نبی'' کے علاوہ کوئی اور ہے، بھی ظاہر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں ایک انسان کے لیے دو کلمے ''نبی'' اور ''رسول'' استعمال کیے گئے ہیں پہلی آیت میں موصوف پیغمبر اسلامؐ ہیں اور تیسری آیت میں حضرت اسماعیل جبکہ سورہ حج آیت ۵۲ میں ان دونوں کلمات کا ایک دوسرے پر عطف لفظ ''او'' کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا ظاہر تقسیم اور جُدائی ہے یعنی وہ الگ الگ ہیں۔بعض انبیاء ہیں اور بعض رسول

اسی وجہ سے مفسرین نے ''رسول'' اور ''نبی'' کے درمیان فرق بیان کرنے کے لیے کئی نظریات اور اقوال پیش کیے ہیں۔ان تمام اقوال میں ایک مشترک بات نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

''رسول نبی سے خاص تر ہے۔ان اقوال کے درمیان فرق کی وجہ یہ ہے کہ رسول نبی سے خاص تر ہے۔ پہلے ہم ان اقوال ونظریات کو بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد ہم اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔

ا۔رسالت کا لازمہ تبلیغ ہے

رسول وہ ہے جس پر وحی آئے اور وہ تبلیغ پر بھی مامور ہو جب کہ ''نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہو اگر چہ اُسے تبلیغ کی ذمہ داری نہ سونپی جائے۔یہ وہی مشہور معنی ہے کو اکثر تفاسیر میں بیان ہوا ہے۔[1]

اس نظریے کی تشریح و توجیہہ کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ''نبی'' ادبی نکتہ نظر سے صفت مشبہ'' ہے جو '' آگاہ'' اور خبر رکھنے والے '' کے معنی میں ہے۔یہ بات بن کہے ہی واضح ہے کہ کسی خبر سے آگاہ ہونے کا یہ لازمہ نہیں کہ اُسے آگے بھی پہنچایا جائے لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ ''نبی'' ''منبی'' کے معنی میں ہے جس کا مطلب ''خبر دینے والا ہوتا ہے۔تو اس صورت میں شاید اس کا لازمہ ابلاغ ہو۔البتہ لفظ ''رسول'' اس کے ساتھ مخصوص ہے جو کسی کی طرف سے کسی ذمہ داری کو قبول کرے۔یہ واضح ہے کہ رسالت قبول کرنا اور کلام کو آگے پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرنے کا لازمہ ہی یہ ہے کہ اُسے آگے پہنچایا جائے لیکن یہ نظریہ اس توجیہہ کے باوجود چند جہات سے مخدوش ہے۔کیونکہ:

---

[1] تبیان ج۷،ص ۳۳۱۔مجمع البیان ج۴،ص۹۱ تفسیر جلالین، سورہ حج تفسیر آیت ۵۲، المنار، ج۹ ص ۲۲۵

ا۔ قرآن نے انبیاء کو ڈرانے والے'' اور'' ''خوش خبری'' سنانے والے قرار دیا ہے۔ اسے تمام انبیاء کے لیے ایک عمومی صفت کے طور پر ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ضروری ہے کہ تمام انبیاء تبلیغ پر مبعوث ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

مگر یہ کہا جائے کہ ''وانزل معھم الکتاب'' کے قرینے کی وجہ سے تمام انبیاء مراد نہیں ہیں بلکہ وہ مُراد ہیں جن کے ساتھ کتاب نازل کی گئی ہے۔ اس صورت میں مذکورہ نظریے پر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ (بقرۃ۔ ۲۱۳)

۲۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ تمام انبیاء کے کئی جن وانس دشمن تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے گنہگاروں میں سے ایک دشمن قرار دیا اور تمہارا پروردگار ہدایت دینے والا اور نصرت کرنے والا کافی ہے۔ (فرقان۔ ۳۱)

یہ بات واضح ہے کہ اس دشمنی کی وجہ اُن کا تبلیغ کرنا ہے۔ اگر کوئی نبی اپنے دین کی تبلیغ نہ کرے تو کوئی اُس سے دشمنی نہیں کرے گا۔ ان سب کے دشمن ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام توصیف میں ''رسول'' کا ذکر الٰہی کو بیان کرنے والے تھے۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو مقام رسالت کو مقام نبوت سے بلند تر ہونا چاہیے اور رسول کو بھی نبی سے برتر اور اشرف ہونا چاہیے حالانکہ قرآن میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خُدا نے مقام توصیف میں رسول کا ذکر نبیؐ سے پہلے کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ (مریم۔ ۵۴)

اور اسی طرح کئی اور آیات ہیں جن میں یہ دو لفظ آئے ہیں وصف بیان کرتے ہوئے ہمیشہ کمزور سے قوی کی طرف جاتے ہیں۔

بعض نے اس اعتراض سے بچنے کے لیے ''نبی'' کی ''تفسیر'' رفیع'' اور بلند مرتبہ کے معنی کے ساتھ کی ہے نہ کہ خبر سے آگاہ یا خبر آگے بیان کرنے والے کے معنی کے ساتھ،

حالانکہ قرآن میں یہ لفظ اپنے اُسی مشہور معنی میں ہی استعمال ہُوا ہے نہ کہ رفیع کے معنی میں کیونکہ لفظ ''نبی'' ''نبا'' سے ماخوذ ہے جو خبر کے معنی میں ہے نہ یہ کہ یہ نبوت سے مشتق ہے جو رفعت اور بلندی مرتبت کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ تفسیر بعض آیات میں صحیح نہیں ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ

اُمْنِيَّتِهٖ

ہم نے تم سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر یہ کہ جب اُس نے تمنا کی تو شیطان نے اُس کی تمناؤں میں مداخلت کی۔۔۔۔ (حج۔۵۲)

کیونکہ اگر ''نبی'' سے مراد ایسا فرد ہو جسے تبلیغ کی ذمہ داری نہ سونپی گئی ہو تو اس صورت میں یہ ''وما ارسلنا'' کے جملے سے ہم آہنگ نہیں ہوگا کیونکہ آیت کا آغاز یہ بتا رہا ہے کہ نبی اور رسول دونوں بھیجے گئے ہیں۔اور شیطان اُن کی خواہشات اور امیدوں (تبلیغی پروگرام) میں مداخلت کرتا ہے۔

ب۔''رسول'' صاحب کتاب پیغمبر ہیں

زمخشری اس آیت ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ'' کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''رسول وہ ہیں جو معجزے کے ساتھ ساتھ کتاب بھی اپنے ہمراہ لے کر آئے ہوں جب کہ 'نبی' ممکن ہے ایسا پیغمبر ہو جس کے ساتھ کتاب نازل کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔[1]

اس نظریے پر کوئی دلیل اور شاید نہیں ہے۔ایک فرد کے ''رسول'' ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ حامل رسالت ہے۔، انجام فعل یا بیان کلام ہو یا نہ ہو۔اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے ساتھ یقیناً کتاب بھی ہو۔لیکن ممکن ہے بعض اس نظریے پر سورہ حدید آیت ۲۵ سے استدلال لائیں جس میں انزال کتاب کو ارسال رسل پر عطف کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان تلازم پایا جاتا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

ہم نے اپنے رسولوں کو گواہوں اور شواہد کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان بھیجے۔(حدید۔۲۵)

لیکن یہ توجیہہ درست نہیں ہے کیونکہ انبیاء کو بینات کے ساتھ بھیجنا اور کتاب وحکمت اور میزان اُتارنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ اُن میں سے ہر ایک پر کتاب نازل کی گئی ہے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ ایک جماعت کے ساتھ کتاب نازل کی جائے اور بعض کو اُس کتاب سے بہرہ مند ہونے کا حکم دیا جائے۔اگر اس آیت میں عطف کو اس بات پر شاہد بنایا جائے کہ ہر رسول کے ساتھ کتاب نازل کی گئی ہے تو پھر سورہ بقرہ آیت ''۲۱۳'' کو اس بات کا شاہد بنایا جا سکتا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ بھی کتاب نازل ہوئی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] کشاف ج ۲۔ص ۱۶۵ ا تفسیر نیشاپوری، ج ۲۔ص ۵۱۳ تفسیر بیضاوی ج ۴، ص ۵۷، مفاتیح الغیب ج ۲۳، ص ۴۹، بحار الانوار ج ۱۱ ص ۳۲

فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ...

علاوہ ازیں اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام رسول صاحب کتاب تھے۔ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے بلکہ بعض روایات تو یہ بتاتی ہیں کہ رسول ۳۱۳ تھے جب کہ آسمانی کتب کی تعداد ۱۰۴ ہے۔[۱]

ان روایات کے پیش نظر جو کہ آسمانی کتابوں کی تعداد رسولوں کی تعداد سے کم بتاتی ہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رسول وہ ہے جس کے ساتھ کتاب نازل کی جائے۔

ج۔ رُسول وہ ہے جو کہ ایک نئی شریعت لائے

بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول کی خصوصیات یہ ہے کہ وہ ایک نئی شریعت لے کر آئے۔ گویا خُدا کے رسولوں سے مُراد صاحب شریعت پیغمبر ہیں۔ لیکن نبی اس اعتبار سے عام ہے۔[۲] (نئی شریعت لے لا یا ہو یا کسی پہلی شریعت کے تابع ہو۔)

یہ نظریہ بھی گذشتہ نظریات کے مانند کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ روایات کے مطابق عالمگیر شریعتیں صرف پانچ ہی ہیں جب کہ رسولوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے پہلے یہ بات ذکر کی تھی۔ کہ بعض آیات[۳] سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پانچ پیغمبر ہی مستقل شریعت لے کر آئے ہیں۔ باقی انبیاء چاہے اُن کے ہم عصر ہوں یا اُن کے بعد آئے ہوں وہ اُن کی شریعت کے پیروکار ہی شمار ہوں گے۔

د۔ رسُول وہ ہے جو فرشتہ وحی کو دیکھے اور اس سے باتیں کرے

بعض نے یہ کہا ہے کہ نبی وہ ہے جس پر عالم خواب میں وحی نازل ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے غیب کے امور سے باخبر ہوتا ہے جب کہ رسول وہ ہے جو عالم بیداری میں فرشتے کو دیکھتا ہے اور اس سے باتیں کرتا ہے۔

یہ نظریہ کسی دلیل کے بغیر بیان ہُوا ہے بہائی فرقہ جو کہ حسین علی مازندانی کے نبی ہونے کا دعوٰی کرتا ہے اور اُسے بہا اللہ کہتا ہے ،نبوت" جو کہ خواب میں مشاہدہ کرنے کے معنی میں ہے ختم ہو چکی ہے لیکن باب رسالت ابھی تک کُھلا ہے جو کہ عالم بیداری میں مشاہدہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اسلام کی خاتمیت کی توجیہہ کی ہے۔

ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ تمہاری مراد کیا ہے؟

اگر مراد یہ ہے کہ حقیقت نبوت وحی کے عالم خواب میں آنے کا نام ہے اور حقیقت رسالت فرشتہ وحی کو بیداری میں دیکھنے کا نام ہے تو

---

[۱] معانی الاخبار ص ۵۹، خصال ج ۲ ص ۱۰۴، بحار ج ۱۱ ص ۶۰

[۲] تفسیر مراغی ج ۱۷ ص ۱۲۷، تفسیر بیضاوی ج ۴ ص ۵۷

[۳] سورہ شوریٰ آیت ۱۳، بحار الانوار ج ۱۱ ص ۳۵، اور عیون الاخبار ص ۲۳۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس بات پر کوئی چھوٹی سے چھوٹی دلیل بھی نہیں ہے کیونکہ ''نبی غیب سے آگاہ فرد کو کہتے ہیں چاہے یہ غیب خواب کے ذریعہ سے اُسے معلوم ہو یا اسکی روح وقلب پر القا سے یا پہاڑ، درخت سے آواز سننے یا فرشتے کی گفتگو سننے سے اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کا راستہ صرف خواب میں منحصر ہے۔ اسی طرح رسول صاحب رسالت ''فرد کے معنی میں ہے چاہے یہ رسالت خواب کے ذریعے اُس پر فرض ہو چاہے بیداری کے عالم میں۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ جہاں پر بھی خُدا نے پیغمبر کو ''یاایھا النبی'' کے لفظ سے خطاب کیا ہے وہاں خواب میں وحی والا پہلو مراد ہے تو یہ بات بھی دلیل سے خالی ہے کیونکہ بہت سی جگہوں پر پیغمبر کو ''یاایھا النبی'' خطاب میں فرشتہ دیکھنے یا اُس کے ساتھ گفتگو کرنے کی قید ملحوظ خاطر ہو۔

علاوہ ازیں پیغمبر پر عالم خواب میں وحی کا نزول بہت کم اور ندرت رکھتا ہے۔قرآن نے فقط دو اموذ کر کیے ہیں۔ایک تو صلح حدیبیہ کا مورد ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے خواب میں یہ دیکھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں۔دوسرا امور شجرۂ ملعونہ سے مربوط ہے جس کی تفصیل مفسرین نے اپنی تفسیر کی کتب میں بیان کی ہے۔

غزوہ حدیبیہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ

خُدا نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔اگر اللہ نے چاہا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے جب کہ تم اپنے سر منڈوا چکے ہو گے اور ناخن کتروا چکے ہو گے۔(فتح۔۲۷)

شجرۂ ملعونہ'' جس سے مفسرین کی رائے کے مطابق بنی امیہ کی اسی سالہ حکومت مُراد ہے۔اس کے متعلق یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾

اور وہ خواب جو ہم نے تمھیں دکھایا ہے اور قرآن میں شجرۂ ملعونہ کو لوگوں کی آزمائش کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔اور ہم انہیں ڈراتے ہیں مگر وہ (ڈرانا) ان کی سرکشی میں اضافہ کر رہا ہے۔(بنی اسرائیل۔۶۰)

بہر حال عالم خواب میں نبی پر نزول وحی کے مواقع بہت کم ہیں۔لہٰذا نبی اور رسول کے درمیان یہ فرق بتا کر ''نبی'' کے مصادیق کو فقط دو مذکورہ موراد میں منحصر کر دینا صحیح نہیں ہے۔

ر۔ دونوں الفاظ کسی جدا خصوصیات کے لیے ہیں

یہاں تک ہم نے ''رسول'' اور ''نبی'' کے درمیان فرق کے سلسلے میں مختلف نظریات سے آگاہی حاصل کی۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ان میں سے کوئی نظریہ اور رائے بھی کسی قابل قبول اور محکم دلیل کی حامل نہیں۔ یہاں ایک اور رائے بھی ہے جس کی بنیاد پر نبی اور رسول کے درمیان فرق کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ وہ رائے یہ ہے کہ نبی اور رسول جو خُدا کی طرف سے مبعوث ہو۔ دونوں کا اطلاق ایک فرد پر ہوتا ہے۔ ان کے درمیان اکثر جگہ پر تساوی[1] پائی جاتی ہے۔

لیکن افراد کو ''نبی'' کہنا ایک معیار کے مطابق ہے اور ''رسول'' کہنا ایک دوسرے معیار کی وجہ سے ہے کیونکہ نبی 'نبأ'' سے مشتق ہے جو خبر کے معنی میں ہے۔ ''نبی'' اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو اوپر سے خبر دریافت کرے، چاہے خواب کے ذریعے ہو چاہے کسی اور ذریعے سے جس کی تفصیلی سورہ شوریٰ[2] میں آئی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ نبی کی حقیقت اُس کی خبر وصول کرنے اور خبر دینے کی حقیقت سے عبارت ہے۔

یعنی وہ اوپر سے خبر حاصل کرتا ہے۔ اُس کے اور دنیائے غیب کے درمیان ایک اور رابطہ موجود ہے۔ جو شخص اس حیثیت کا حامل ہو اُسے قرآن کی زبان میں نبی کہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ایک آگاہ انسان پیغام کو آگے پہنچانے یا کسی عمل کی انجام دہی کی ذمہ داری بھی رکھتا ہے اس لحاظ سے اس شخص کو رسول کہتے ہیں۔ نبی جو ''نبأ'' سے مشتق ہے اور رسول جو رسالت سے مشتق ہے اس کے پیش نظر نیز اہل لغت نے ان کلمات کے متعلق جو تفصیلی بیان کی ہے اُس سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔

لہٰذا جہاں پر بھی ایک شخص کو نبی کہا جاتا ہے اس کا معیار اس کا غیب سے آگاہ ہوتا ہی ہے اور جب غیب سے آگاہ اور مطلع انسان کو رسول کہتے ہیں اس وقت اس پیغام کو آگے پہنچانے اور خُدا کی طرف سے تفویض شدہ ذمہ داری پوری کرنے کی جہت مدنظر ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ ہر پیغام لینے والے انسان کو ''نبی'' نہیں کہتے ہیں بلکہ اہم آسمانی خبریں لینے والے اُس انسان کو نبی کہتے ہیں جسے یہ خبریں خُدا کی طرف سے موصول ہوں۔ اس طرح رسول (وہ رسول جو وحی تشریعی سے ارتباط رکھتا ہے نہ کہ لغوی اعتبار سے رسول) آسمانی خبروں سے آگاہ اُس شخصیت کا نام ہے جو اس بات پر مامور ہے کہ اپنے تک پہنچنے والی خبروں کو آگے پہنچانے اُن کی ابلاغ کرے اور انہیں جامہ عمل پہنائے قرآن میں جس جگہ پر بھی لفظ ''نبی'' استعمال ہوا ہے وہاں پہلی جہت مدنظر رکھی گئی ہے اور جہاں پر لفظ ''رسول'' استعمال ہوا ہے وہاں یہ دوسری جہت پیش نظر رہی ہے۔

---

[1] مختلف چیزوں اور مفاہیم وغیرہ کے مابین کل چار نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نسبت کو تساوی کہتے ہیں۔ جو مساوی ہونے سے عبارت ہے۔

[2] آیہ ۵۱: وما کان بشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء ی حجات او یرسل رسولا فیوحی باذنه...

اسی وجہ سے لفظ نبی اور ''نبین'' کے ساتھ ہمیشہ لفظ ''وحی'' لایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ كَمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰ نُوحٖ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعۡدِهِۦۚ وَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيۡمَٰنَۚ وَءَاتَيۡنَا دَاوُۥدَ زَبُورٗا ﴿١٦٣﴾

ہم نے تجھ پر وحی نازل کی جیسے کہ نوح اور اس کے بعد والے نبیوں کی طرف وحی بھیجی۔ نیز ابراہیم ،اسماعیل ،اسحق ،یعقوب ،اسباط ،عیسیٰ ،ایوب ،یونس ،اور ہارون کی طرف وحی بھیج اور داؤد کو زبور عطا کی ۔(نساء۔ ۱۶۳)

ہاں: جہاں پر لفظ ''رسول'' کے ساتھ کلمہ ''وحی'' استعمال ہوا ہے وہاں ایک اور نکتے کی وجہ سے اس قانون سے عدول کیا گیا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيۡهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدُونِ ﴿٢٥﴾

ہم نے تجھ سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کی طرف یہ وحی کی کہ خُدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ پس میری عبادت کرو۔(انبیاء۔ ۲۵)

یہاں پر کلمہ ''نبی'' کی بجائے ''رسول'' کی وجہ وما ارسلنا' کا جملہ ہے اگر اس جملے کی بجائے ''وما اوحینا من قبلك'' ہوتا تو یقیناً یہاں پر جس شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے اُسے ایک سخت کام کی تبلیغ کی ذمہ داری سونپی جائے وہاں پر بھی لفظ ''رسول'' استعمال ہوتا ہے نہ کہ لفظ نبی یہ خود اس بات پر شاہد ہے کہ رسول اور نبی انبیاء کی دو الگ الگ جماعتوں کی طرف اشارہ نہیں بلکہ قرآنی نکتہ نظر سے یہ ایک ہی جماعت ہے لیکن وہ مختلف حیثیتوں اور جہات کی حامل۔ ایک حیثیت سے اُسے نبی کہا جاتا ہے اور دوسری جہت سے رسول مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغۡ مَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ (مائدہ۔ ٦٧)

اے رسولؐ جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف آیا ہے اسے آگے پہنچا دیجئے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمٗا زَكِيّٗا ﴿١٩﴾

کہا میں تیرے پروردگار کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں ۔(مریم ۔۱۹)

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ دونوں آیات میں لفظ ''رسول'' لایا گیا ہے پہلی آیت میں اُس کی ذمہ داری پیغام پہچانا ہے اور دوسری آیت میں اُس کی ذمہ داری ایک عمل کی انجام دہی ہے۔

ہمارے مدعٰی پر ایک اور واضح دلیل یہ ہے کہ خُدا نے جہاں اپنے پیغمبروں کی ذمہ داری کو محدود اور معین کیا ہے اور کہا ہے کہ تمہاری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے وہاں پر لفظ ''رسول'' استعمال کیا گیا ہے۔لفظ رسول کے ساتھ کلمہ ''ابلاغ'' لایا گیا ہے ہم اس سلسلے کی چند آیات آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

۱۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

کیا پیغمبر پر واضح ابلاغ کے علاوہ بھی کوئی ذمہ داری ہے؟(نحل ۔۳۵)

۲۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

پیغمبر پر بلاغ مبین کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں۔(عنکبوت ۔۱۸)

۳۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾

اگر تم منہ موڑلو تو ہمارے رسول تو واضح بیان کرنے کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔(تغابن ۔۱۲)

۴۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾

کہہ دیجیے میری ذمہ داری صرف خُدا کے پیغامات پہنچانا ہے جو کوئی بھی خدا اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہے گا۔(جن ۔۲۳)

۵۔ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

وہ جو خُدا کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں۔(احزاب ۔۳۹)

۶۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ

میں اپنے خُدا کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں۔(اعراف ۔۶۲)

۷۔ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ

کہہ دیجیئے علم خدا کے پاس ہے میں جس کے بیان کے لیے مبعوث ہوا ہوں اُس کی تبلیغ کرتا ہوں
۔(احقاف۔۲۳)

۸۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ
اے نبی اسرائیل میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے پیغام رساں ہوں اور تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے نازل کی گئی ہے۔(صف۔٦)

یہ آیات اور دوسری وہ آیات جن میں لفظ نبی اور رسول آئے ہیں وہ اس حقیقت کا اعلان کررہی ہیں کہ نبوت کے صادق آنے اور ''نبی'' بولے جانے کا معیار خدا سے رابطہ ہے جب کہ ''رسول'' کہنے کا معیار اُن کا ان احکامات کو آگے پہنچانے کا ذمہ داری ہونا ہے۔
یہاں پر قاعدے کا تقاضا تو یہ تھا کہ لفظ ''نبی'' لایا جائے لیکن وہاں ایسا نہیں کیا گیا تو یہ بھی کسی نکتے کی وجہ سے ہے وگرنہ حقیقت میں تو یہ دونوں کلمات الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور ایک (نبوت) دوسرے (رسالت) پر مقدم ہے۔
لہٰذا یہاں سے واضح ہوگیا کہ ان دونوں لفظوں کو مفہوم کے اعتبار سے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ دو الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔
البتہ مصداق کے اعتبار سے عموماً ان کے درمیان تساوی پائی جاتی ہے، یعنی ہر نبی اور پیغمبر (جس پر وحی نازل ہوتی تھی) رسول تھا یعنی وہ اس پیغام کو آگے پہنچانے کی ذمہ داری رکھتا تھا۔ یا کسی عمل کی انجام دہی کی ذمہ داری کے کندھوں پر ہوتی تھی۔
اس طرح ہر رسول خدا کی جانب سے انسان کی رسالت) نبی تھا اور اُس پر وحی نازل ہوتی تھی لیکن پہلا لحاظ ایک اکثریتی حکم کا درجہ رکھتا ہے یعنی اکثر انبیاء جن پر وحی نازل ہوتی تھی اُن پر ذمہ داری بھی ہوتی تھی اگر چہ بہت کم موارد پر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُس کی نبوت صرف اُسی کی ذات تک محدود ہو جیسا کہ بعض روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء کی نبوت کا دائرہ کار صرف ان کی ذات تک تھا۔ دوسرے لوگوں کے بارے میں انہیں کوئی ذمہ داری نہیں سونپی جاتی تھی۔ [١]
ہاں: ہمارا موضوع گفتگو تو اُس نبی اور رسول کے درمیان موازنہ ہے جو خدا کا پیغام پہنچانے یا کسی کام کی انجام دہی کی ذمہ داری رکھتا ہو۔ اگر اس سے ہٹ کر دیکھیں تو پھر لفظ ''رسول'' فرشتے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ٭ۖ لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ﴿۱۹﴾
میں تیرے خدا کی جانب سے بھیجا گیا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔(مریم۔١٩)

---

[١] کافی ج ا۔ باب طبقات الانبیاء والرسل والائمہ ص ۱۷۴ البتہ ایسے افراد کو نبی یا پیغمبر کہنا لفظ کے اطلاق میں ایک وسعت دینے کے مترادف ہے وگرنہ اس نبوت کو تو کوئی معنی نہیں جو اپنی ذات تک محدود ہو مگر یہ کہا جائے کہ یہ نبی ہے خبر لینے کے اعتبار سے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو ہمارے بھیجے ہُوئے اُس کی جان لے لیتے ہیں
۔(انعام۔۶۱)

اسی طرح کبھی لفظ ''رسول'' اُس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک عام انسان کی جانب سے کوئی ذمہ داری لے کر آئے جیسا کہ سورہ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ(یوسف۔۵۰)

جب بادشاہ کی طرف سے بھیجا ہوا شخص زندان میں یوسف کے پاس آیا تو انہوں نے۔اُس سے کہا کہ اپنے بادشاہ کی طرف لوٹ جاؤ اور اُن عورتوں کی داستان کے متعلق تحقیق کرو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

''لفظ'' رسول'' کے دو طرح کے استعمال کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''رسول'' اور نبی کے درمیان تساوی ہے بلکہ یہ بات قطعی ہے کہ رسول چونکہ نبی کی نسبت زیادہ مصادیق رکھتا ہے لہٰذا یہ مفہوم کے اعتبار سے بھی اس سے وسیع تر ہے۔لہٰذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان چار نسبتوں میں سے نسبت عموم خصوص مطلق پائی جاتی ہے یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ ہر نبی اور پیغمبر (صرف اُس نبی کو نکال کر جس کی نبوت صرف اُس کی ذات تک محدود ہے) رسول ہیں جب کہ بعض رسول ہیں جیسے فرشتے اور وہ عام لوگ جو عالم انسانوں کی جانب سے مامور ہوتے ہیں لیکن یہ نبی نہیں ہیں۔

البتہ یہ بات ہماری گفتگو کے دائرہ کار سے خارج ہے کیونکہ ہماری گفتگو اصطلاحی رسول سے متعلق ہے نہ کہ لغوی اور عرفی سے۔

حاصل سخن

اس بیان سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔نبوت اور رسالت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ایک تو دنیائے غیب سے رابطے کا نام ہے اور دوسری پیغام پہنچانے یا عمل انجام دینے کا نام ہے جس کی بھی یہ توصیف کی گئی ہے وہ انہی دو الگ معیاروں کی وجہ سے۔

۲۔مقام نبوت مقام رسالت سے بالاتر اور برتر ہے کیونکہ نبوت خُدا سے رابطے کی حیثیت کا نام ہے جب کہ رسالت انجام ذمہ داری کی حیثیت کا نام ہے۔ایک (نبوت) میں پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہ خُدا کا پیغام وصول کرتا ہے اور دوسرے (رسالت) میں اُسے کسی کام کی انجام دہی پر مامور کیا جاتا ہے۔جب ''نبوت'' ''رسالت'' سے برتر ہے تو مصادیق پر انطباق کے وقت طبعاً ''نبی'' ''رسول'' سے برتر ہوگا۔اس معنی میں کہ اگر ایک شخص نبی بھی ہو اور رسول بھی تو اُس کی بزرگی اور برتری اُس کی نبوت کی وجہ سے ہے نہ کہ رسالت کی وجہ سے۔اگر

اُس کی رسالت کسی فضیلت کی حامل ہے تو پھر بھی نبوت کی وجہ سے اُسے حاصل ہونے والی فضیلت اس رسالت والی فضیلت سے زیادہ برتر ہوگی ۔

۳۔خُدا کی جانب سے رسالت کی اساس نبوت ہی ہے کیونکہ جیسے کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ رسالت سے مراد خدا کی جانب سے انسان کو کسی ذمہ داری کا سونپا جانا ہے نہ کہ فرشتے یا کسی اور کو اور یہ نہ ہی ہر ایک کی طرف سے رسالت اس مفہوم میں شامل ہے، چاہے وہ عام انسانوں کی طرف سے عطا کردہ ذمہ داری ہو بلکہ مراد خُدا کی جانب سے انسان کو رسالت کا سونپا جانا ہے۔لہٰذا اس صورت میں نبوت اور غیب سے رابطہ پہلے درجہ پر ہے۔اس کے بعد ہی رسالت کا مرتبہ آتا ہے۔

۴۔نبی اور رسول کے درمیان مصدق کے اعتبار سے نسبت تساوی پائی جاتی ہے۔یعنی ہر وہ مقام جہاں پر نبوت تھی اُس کے بعد رسالت بھی عطا کی گئی ہے۔اسی طرح یہ بھی واضح کیا گیا کہ ایسے پیغمبر جنہیں دوسروں کی نسبت کوئی رسالت نہ سونپی گئی ہو اُن کی تعداد بہت کم اور انگشت شمار ہے۔ایسے نادر اور کم موارد کو نسبت قائم کرنے کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔علاوہ ازیں ایسی نبوت جس کے ساتھ رسالت نہ ہو کوئی واضح معنیٰ نہیں رکھتی۔

اس بیان سے یہ واضح ہوگیا کہ ''ختم نبوت اور ''ختم رسالت'' کے درمیان ملازمہ پایا جاتا ہے۔ختم نبوت اور ختم رسالت میں خاتم النبین اور خاتم الرسل میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ مفروض یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان تساوی قائم ہے۔اگر بالفرض نبی رسول سے عام بھی ہو اور ایسے انبیا کو بھی شامل ہو جو رسول نہ تھے تو پھر باب نبوت کے بند ہوجانے کا لازمہ باب رسالت کا بند ہوجانا ہے۔ایک اور نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے خاتم النبین کہا ہے کہ ''خاتم الرسل'' اس کی وجہ یہ ہے کہ رسالت کی اساس نبوت ہے لہٰذا باب نبوت کے بند ہوجانے سے باب رسالت بھی یقینی طور پر بند ہوجائے گا۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ اگر خُدا کی جانب سے پیغام لینے والا منصب ختم ہوجائے تو پیغام رسانی کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

ایک سوال کا جواب

گذشتہ بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نبوت اور رسالت خُدا کی جانب سے بھیجے جانے والے افراد کے لیے دو الگ الگ منصب اور مقام ہیں۔ان میں سے ہر ایک منصب معلمان الٰہی کے مقام ومنزلت کی حکایت کرتا ہے۔لیکن یہ بات اُس جگہ پر صحیح ہے جہاں پر یہ دونوں لفظ الگ الگ ذکر ہوں جب کہ ہمارے سامنے کئی آیات بھی ہیں جن میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ لایا گیا ہے۔ایک ہی پیغمبر کے لیے یہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔مثلاً حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۞۵۴

''قرآن میں اسماعیلؑ کا ذکر کیجئے۔ بے شک وہ اپنے وعدے پر عمل کرتے تھے اور رسول و نبی تھے ۔(مریم۔ ۵۴)

پیغمبرِ اسلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ

وہ لوگ جو اس اُمیّ رسول و نبی کی پیروی کرتے ہیں۔(اعراف۔۱۵۷)

جس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان آیات میں نبی اور رسول کے درمیان کیا فرق ہے؟

جواب

وہ آیات جن میں لفظ ''نبی'' اور ''رسول'' آئے ہیں انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا۔وہ آیات جن میں صرف لفظ ''رسول'' آیا ہے۔

آیات جن میں صرف لفظ ''نبی'' آیا ہے۔

۲۔وہ آیات جن میں یہ دو لفظ یک ہی شخص کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

ان تینوں حصوں سے متعلق آیات گزشتہ ابحاث میں گزر چکی ہیں۔ یہ بھی بیان ہو چکا کہ ان میں سے ہر ایک لفظ ایک مقام اور منصب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ان تینوں حصوں کی آیات کے درمیان کوئی فرق نہیں چاہے یہ لفظ اکٹھے آئیں چاہے جُدا جُدا۔ اصل مسئلہ چوتھے حصے کی آیات میں ہے جسے ہم اب بیان کرتے ہیں۔

۴۔وہ آیت جس کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ معلمین الٰہی دو طرح کے ہیں۔ بعض رسول ہیں اور بعض نبی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ

''ہم نے تجھ سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ جب بھی آرزو اور تمنا کرتا تو شیطان اُس کی آرزو میں مداخلت کرتا۔''(حج۔ ۵۲)

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے۔ کیا واقعاً پیغمبر دو گروہوں میں تقسیم ہیں ایک گروہ مقام نبوت رکھتا ہے اور دوسرا مقام رسالت یا یہ کہ اس آیت کا مطلب کچھ اور ہے؟

دوسرے الفاظ میں یوں کہ آیات کا پہلا اور دوسرا گروہ تو معنی و مفہوم کے اعتبار سے اُسی طرح ہے جیسے کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے یعنی نبوت اور رسالت پیغمبروں کے منصب اور مقام کی طرف اشارہ ہیں۔ ان آیات کی تفسیر میں کوئی مشکل نہیں ہے۔

اسی طرح تیسرے حصے سے متعلق آیات کی تفسیر یوں کی جا سکتی ہے ہ اسماعیل ان دونوں مقامات کے حامل تھے، وحی وصول کرتے تھے اور اُسے آگے پہنچانے پر بھی مامور تھے۔ "رسول" کو نبی پر جو یہاں مقدم کیا ہے تو یہ مقام نبوت کی اُس عظمت اور فضلیت کے پیش نظر ہے جو اُسے مقام رسالت پر حاصل ہے لہٰذا انہی بھی رسول سے برتر ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مقام تعریف میں ہمیشہ ضعیف سے قوی کی طرف جایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مصنف ومحقق ہے۔ مسئلہ چوتھے حصہ کا ہے جس میں ظاہری طور پر پیغمبروں کی دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں پر زیادہ وقت نظر کی ضرورت ہے۔ قرآن میں ایسی آیت یہ صرف ایک ہی ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

جب بھی یہ دو لفظ اکٹھے ذکر ہوں اور ظاہری طور پر دو گروہوں کی طرف اشارہ کر رہے ہوں تو پھر ان کے درمیان ایک فرق قائم کرنا پڑے گا۔ اس جگہ پر مختلف فرق بیان کیے گئے ہیں جو قابل تائید نہیں ہیں۔ ہم پہلے ان تمام کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ چکے ہیں۔ صرف یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں پر یہ دونوں لفظ کورہ آیت کے انداز میں اکٹھے ذکر ہوں تو وہاں 'نبی' 'اُس شخص کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اپنی تعلیمات کو اُس مقام غیب سے کسی واسطے کے بغیر حاصل کرے۔ خُدا کسی وسیلے کی بغیر اُس پر تجلیات کرے۔ جب کہ رسول وہ ہے جو خُدا کے پیغامات کئی واسطوں اور مخصوص ذرائع سے حاصل کرے جیسے فرشتے وغیرہ کے ذریعے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ رسول وہ ہے کو خُدا کی رسالت کو آسمانی پیامبروں کے ذریعے سے وصول کرے۔ جبرائیل اُسے خُدا کے امرونہی سے آگاہ کرے۔ جب کہ نبی وہ ہے کہ جو اس کے علاوہ بھی کسی اور طریقے سے خُدا کا کلام وصول کرے مثلاً اُس کے دل پر الہام ہو۔

بعض روایات میں بھی اسی طرح کے فرق کی طرف اشارہ ہوا ہے جنہیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

زرارہ امام جعفر صادقؑ سے سوال کرتے ہیں:

وہ حالت غش (یا) اپنے آپ سے بے خود ہو جانا) جو رسولؐ خُدا پر نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی کیا تھی؟

زرارہ جعفر صادقؑ نے جواب دیا:

یہ ایک عمومی حالت نہ تھی۔ یہ حالت صرف اُس وقت پیش آتی جب نزول وحی کے وقت آپ کے اور خُدا کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہوتا۔

پھر فرمایا:

اے زرارہ یہ ہے نبوت! پھر آپؐ نے احترام کے لیے اپنے سر کو نیچے جھکا لیا۔[1]

یہاں یہ کہنا چاہیے کہ نبوت جو کہ پیغام وصول کرنے کے معنی میں ہے ایک ایسی حقیقت ہے جو مختلف مراتب رکھتی ہے چاہے جہاں پر پیغام خدا کی طرف سے بلا واسطہ آئے یا واسطے کے ساتھ آئے۔ دونوں جگہ پر "نبوت" موجود ہے۔ تمام انبیاء ان مراتب میں نبی ہیںؑ۔ لیکن ان

---

[1] قلت لابی عبدالله جعلت فداك الغشية التی تصیب رسول الله اذا انزل علیه الوحی قال، فقال: ذلك اذا لم یکن بینه و بین الله احد ذاك اذا تجلی الله له قال، ثم قال تلك النبوة یازرار۔ واقبل یتخشع (فاخذ یتخضع) توحید صدوق۔ ص ۱۱۵

مراتب میں فرد کامل وہ ہے جو خُدا کا کلام بغیر کسی واسطے کے دریافت کرے۔۔۔خُدا کی تجلیات اُس پر جوں امام جعفر صادق نے جو یہ فرمایا ہے کہ ایسا فرد نبی ہے اور یہ نبوت کی حقیقت ہے تو یہ بھی دراصل اُس فرد کامل اور نبوت کے سب سے بلند مرتبے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اگر اس خصوصیات کا لحاظ نہ بھی رکھیں۔تب بھی ان تمام مراتب میں ''نبوت'' موجود ہے۔تمام پیغمبر اس کے مصادیق ہیں۔

اس بنیاد پر یہ کہنا چاہیے کہ جب نبی اور رسول اکٹھے ذکر ہوں اور لفظ ''اَوْ'' کے ساتھ انہیں عطف کیا جائے تو وہاں نبی سے مُراد پیغمبروں کی وہ جماعت ہے جو کسی واسطے کے بغیر ہی وحی وصول کرتے تھے۔اگرچہ اس ذریعے کے علاوہ بھی کسی اور طریقے سے وہ خدا کا پیغام وصول کرتے ہوں۔

نبوت اور رسالت کے درمیان فرق سے متعلق ہماری گفتگو یہاں تمام ہوتی ہے۔اس بات کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ احادیث میں ان کے علاوہ لفظ ''محدث'' بھی آیا ہے۔اس سے مراد وہ بلند مرتبہ انسان ہیں جن سے فرشتے گفتگو کرتے ہیں۔اگرچہ نہ تو انہیں شریعت عطا کی گئی ہو اور نہ ہی کوئی رسالت اُن کے ذمہ ہو۔

چونکہ اس سے متعلق بحث ہمارے موضوع سے ہٹ کے ہے لہٰذا ہم دامن سخن کو سمیٹتے ہیں۔لیکن یہ یاددہانی کراتے چلیں کہ بعض بے بضاعت مصنفین نے انسان محدث کو نبی اور رسول کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔اور رسول اکرمؐ کی دختر نیک اختر یا اُن کی معصوم اولاد کے محدث ہونے کے عقیدے کو اُنکی نبوت اور رسالت کے عقیدے کے مترادف قرار دیا ہے جس نکتے کو ہم نے ذکر کیا ہے۔اس کے پیش نظر اس کا جواب واضح ہوجاتا ہے۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں مفاہیم القرآن ج ۴۔ص ۳۰۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۲۱) اثبات نبوت کی راہیں

حصہ اوّل

اثبات کی راہیں

انسان کی سرشت میں ہی تحقیق وجستجو کی حس اور دعوی پر دلیل طلب کرنے کی بات رکھی گئی ہے۔ یہ کوئی انسان بھی پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی دعوی کو بغیر دلیل کے قبول کرے یا کسی شخص کی عظمت اور برتری کا ادراک کیے بغیر اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ اس بارے میں ''شیخ الرئیس'' (بوعلی سینا) یوں کہتے ہیں:

> ''جو شخص بھی دوسرے کے دعویٰ کو بغیر کسی دلیل و بُرہان کے قبول کرے تو ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ سالم اور صحیح فطرت انسانی سے محروم ہو چُکا ہے۔ فطرت کے سیدھے راستے سے اس کی طبیعت دور ہو چکی ہے۔''

وہ کتاب شفا میں کہتے ہیں:

''سفیران الٰہی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس ایسے امتیازات اور نشانیاں ہوں جن کی وجہ سے وہ پہچانے جاسکیں اور لوگ ان کے اور جھوٹے اور دروغ گو انبیاء کے درمیان تمیز کر سکیں۔''[1]

کسی مقام و منصب جیسے سفیر، وزیر مُشیر وغیرہ کے دعوی دار جب تک اپنی حکمرانی کے ثبوت کی کوئی زندہ سند لوگوں کے سامنے پیش نہ کریں اُس وقت تک لوگ اُن کے مقام و منصب کو قبول نہیں کرتے تو پھر کہاں مقام رسالت اور خُدا کی طرف سے نمائندگی کے دعویداروں کی بات جو کہ معمولی مناصب کے لوگوں کے ساتھ اصلاً قابل قیاس ہی نہیں۔ اس سے بڑھ کے اور کیا مقام و منصب ہوسکتا ہے کہ ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں زمین پر خُدا کا نمائندہ اور سفیر ہُوں اور لوگوں کو بے چون و چرا میری اطاعت و پیروی کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں تاریخ بھی اس بات پر گواہی دیتی ہے۔ گذشتہ ادوار میں کئی جاہ طلب افراد نے اپنی چندروزہ مادی خواہشات کی تکمیل کے لیے نبوت و رسالت کا دعوٰی کیا۔ انہوں نے سادہ لوح افراد کو فریب دے کر اور کبھی مکر و فریب اور ڈرامہ بازی سے ایک چھوٹے سے معاشرے کو اپنے زیر اثر کر لیا اور ان سادہ لوح افراد کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا لیا۔

لہٰذا ان دو جہات کی وجہ سے نبوت کے دعویٰ دار کے ہمراہ ایک قطعی اور محکم دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے عقائد کے ماہرین

[1] الٰہیات شفاء مقالہ وہم، فصل دوم، البغاہ۔ ص ۳۰۴

نے انبیاء کی پہچان کے لیے کئی ایک علامات راہیں اور نشانیاں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ان کے دعوی کی صحت پر ا یک زندہ گواہ بن سکتی ہے۔ یہ راہیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ معجزہ

یعنی خارق العادۃ امور کی انجام دہی جیسے کہ اس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

۲۔ گذشتہ نبی کی آئندہ آنے والے نبی پر نص

۳۔ وہ قرائن اور شواہد جو مدعی نبوت کے دعویٰ کو یقینی طور پر ثابت کرسکیں۔ ہم ان تینوں راہوں کو زیر بحث لائیں گے۔

معجزہ یا اثبات نبوت کی عمومی راہ

ماہیت معجزہ کی تحقیق

موردِ بحث آیات

۱۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷ (آل عمران۔ ۳۷)

۲۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ (النمل۔ ۴۰)

۳۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝۴۷ (طٰہٰ۔ ۴۷)

۴۔ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝۵۸ (طٰہٰ۔ ۵۸)

۵۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝۵۱

(مؤمن ۔ ۵۱)

۶۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۱﴾ (مجادلۃ ۔ ۲۱)

معجزہ یا اثبات نبوّت کو عمومی راستہ

علم کلام کے ماہرین نے معجزے کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔اس سلسلے میں جو جامع تعریف پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ

"امر خارق للعادۃ مقدون بالدعوی والتحدّی مع عدم المعارضۃ ومطابقۃ الدعوّی۔"

برخلاف عادت ایسا امر جو کہ دعوی نبوت کے ساتھ تحدی اور مبارزہ کے اعلان کے ساتھ ہو اور دعوٰی سے ہم آہنگ ہو۔کوئی اُس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس تعریف میں معجزے کے لیے کئی قیود ذکر کی گئی ہیں۔ہم ہر ایک کو اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں۔

۱۔اعجاز خارق العادہ کام ہے (خارق للعادہ) معجزہ اس کے باوجود کہ ایک مظہر خارجی ہے اور اپنے لیے علت بھی رکھتا ہے لیکن ہرگز یہ امور معمولی کی طرح نہیں ہے بلکہ قوانین متعارف کے برخلاف ہے۔مثلاً ایک چھوٹا سانپ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک اژدھے کی صورت اختیار کرتا ہے۔یا بیمار لوگ ڈاکٹری نگہداشت کے تحت صحت یاب ہوتے ہیں۔زمین کے نیچے موجود پانی گہرا کنواں کھودنے یا زمین کھودے سے باہر آتا ہے لیکن جب اس طرح کے نتائج اُن کے مادی اسباب وعلل کے بغیر حاصل ہوں تو یہ خارق العادہ کام ہوگا۔مثلاً ایک خشک لکڑی ایک لحظے میں اژدھے کی شکل اختیار کرلے۔مریض کے بدن یا درد کی جگہ پر ہاتھ رکھنے سے وہ شفا پا جائے، زیر زمین موجود پانی زمین پر مارنے مارنے سے پھوٹ پڑے، تو یہ کام یقیناً معجزہ (خاق العادۃ) ہیں۔

البتہ ممکن ہے چند کام ایک زمانے میں خلاف عادت اور خارق العادہ شمار ہوئے ہوں لیکن دوسرے میں معمول کے کام شمار ہوں۔مثلاً سل یا کینسر کی بیماری میں مبتلا لوگوں کا علاج پہلے عادی لحاظ سے ممکن نہ تھا لیکن اب یہ کسی حد تک عام حالت پیدا کر چکا ہے۔آسمان پر انسان کا پرواز کرنا گذشتہ دور میں ایک خلاف عادت کام تھا لیکن اب یہ ایک متعارف بات ہے۔ہاں! یہ معمول کا کام ہے لیکن خارق العادہ نہیں کیونکہ اس میں واضح اور معین طبعی اسباب سے مدد لیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ امور غیر عادی ممکن ہے۔رفتہ رفتہ عادی حالت پر آجائیں جیسے تپ دق وغیرہ اور اسی طرح دوسری پیچیدہ امراض کا علاج۔اگر کوئی پہلے دور میں ان کا علاج کر دیتا تو اسے یہ کہا جاتا کہ اس نے فوق العادہ کام انجام دیا ہے جب کہ معجزے کے ذریعے انجام پانے والا کام ہمیشہ غیر عادی ہی رہتا ہے یہاں تک کہ علوم کی اتنی ترقی اور نئے نئے انکشافات کے سامنے آنے کے باوجود حضرت مسیح کے ہاتھ لگانے سے مریض کا شفا پانا معجزہ اور غیر معمولی کام شمار ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔اس میں نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ دور میں ایک کام کے معمولی

ہونے اور اب اُسی کام کے معمولی کے مطابق ہونے کا سرچشمہ خاص طبعی اسباب وعوامل ہیں۔علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہی ان کا غیر معمولی ہونا ختم ہوتا گیا جبکہ معجزہ کا سرچشمہ ہمیشہ غیر معمولی اسباب وعوامل ہیں۔لہٰذا ایسے اسباب کبھی بھی عادی نہیں ہوسکتے۔اس وجہ سے معجزے کی غیر عادی حالت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

ا۔کسی مقام ومنصب کا دعویٰ کرے (مع الدعوٰی)

خارق العادۃ کا انجام دینا اُس وقت معجزہ شمار ہوگا جب اُس کے لانے والا خُدا کی جانب سے عطا کردہ منصب کا دعویٰ بھی کرے۔اگر اس طرح نہ ہو تو اُسے کرامت کہیں گے۔بلند مرتبت اور خُدا کے بعض مقرب بندے بغیر اس کے کہ دعویٰ نبوت کریں ایسے کام سرانجام دیتے ہیں جن کی توجیہہ عادی اسباب وعوامل کے ذریعے نہیں کی جاسکتی۔اس کے باوجود نہ تو وہ انبیاء ہیں اور نہ ہی ان کے اس کام کا نام معجزہ ہے۔قرآن حضرت مریم کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

”جب بھی زکریا اُس کے پاس آتے تو اس کا رزق محراب کے نزدیک موجود پاتے وہ تعجب سے پوچھتے یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ مریم نے جواب دیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔“ (ال عمران۔۳۷)

گذشتہ امتوں اور امت مسلمہ میں ایسے باعظمت لوگ تھے اور ہیں جو سیر وسلوک اور تہذیب نفس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اپنے بدن پر حاکمیت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ وہ امور تکوینی میں بھی تصرف کر سکتے ہیں

اور اپنے ارادے کی قوت سے ایسا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

قرآن نے حضرت سلیمانؑ کے ایک پیروکار کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔قبل اس کے کہ آپ آنکھ جھپکیں میں تخت بلقیس کو آپ کے سامنے حاضر کر دیتا ہوں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ (نمل۔۴۰)

یہ کام اگرچہ خارق عادت اور بہت حیرت ناک ہے لیکن چونکہ یہ حضرت سلیمانؑ کی طرف سے انجام نہیں پایا اس لیے اسے معجزہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس عمل کو اصطلاحاً ”کرامت“ کہتے ہیں۔

۳۔مقابلے کی دعوت دے (مع التحدی)

اعجاز کی تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا والوں کو مقابلے اور مبارزے کی دعوت دے۔اس منصب کا دعوٰی دار انسان جب کوئی خارق العادہ کام انجام تو دے لیکن دنیا والوں کو دعوت مقابلہ نہ دے تو اس کا نام بھی معجزہ نہیں ہوگا۔البتہ جب وہ کسی منصب کا دعوٰی کرے اور اخارق عادت کام بھی انجام دے تو اس کا لازمہ دعوت مقابلہ ہی ہے کیونکہ اگر ایک فرد خدا کی جانب سے کسی منصب کا دعوٰی کرے اور اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے ایک خارق عادت کام انجام دے تو اس کا معنٰی یہ ہوگا یہ منصب خُدا نے اُسے عطا کیا ہے۔یہ سارا پروگرام خُدا کی طرف سے اُسے دیا گیا ہے اور اگر تم یہ سوچتے ہو کہ اُس کے ذہن اور فکر کی پیداوار ہے تو آؤ اور اس کی مثل لاؤ۔

۴۔دنیاوالوں کی ناتوانی (مع عدم المعارضہ)

ایک خارق العادہ کام گذشتہ قیود کے ساتھ ساتھ اس وقت ہی مدعی کی صحت گفتار پر گواہ بن سکتا ہے جب اسے لانے والا دنیا سے مغلوب نہ ہو سکے۔نوع انسان اس کا مبارزہ اور مقابلہ کرنے سے عاجز و ناتواں ہو۔یہاں تک کہ اگر دنیا بھر کے علماء اور ماہرین جمع ہو جائیں تو پھر بھی وہ اُس کی مثل نہ لا سکیں۔اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ کام معجزہ شمار نہیں ہوگا بلکہ انسان کا کام شمار ہوگا۔

ایک دن دل اور آنکھوں کے قرنیے کی پیوند کاری ایک فوق العادہ کام شمار ہوتا تھا۔تھوڑے ہی عرصے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اس کام کی کوششیں شروع کر دیں اور وہ اس میدان سے فاتح بن کر نکلے۔لہٰذا یہ معجزہ نہیں ہے۔یہ معجزہ کی ایک بہت اہم قید ہے۔قرآن میں بھی کئی آیات نے اس کی طرف اشارات کیے ہیں کبھی خصوصی اور کبھی عمومی اشارے۔حضرت موسیٰ کا واقعہ حق و باطل اور جادو اور معجزے کے درمیان مبارزے کا میدان تھا۔موسیٰؑ نے فرعون اور اُس کے ساتھیوں سے کہا:

قَدۡ جِئۡنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ‌ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰى ﴿۴۷﴾

''میں تیرے پرودگار کی طرف سے تیرے پاس معجزہ لے کر آیا ہوں ۔ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر سلامتی ہو۔(طہ۔۴۷)

چونکہ حضرت موسیٰؑ کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے لوگ اس معجزے کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا فرعون نے جواب میں یہ کہا

فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

''ہم بھی تیرے جادو کی مثل لائیں گے۔پس اس کام کے لیے ایک وقت اور جگہ معین کرلو تاکہ ہم اور آپ کی خلاف ورزی نہ کریں۔'' (طٰہٰ۔۵۸)

نیز قرآن مجید نے خُدا کی حکیمانہ اور قاہرانہ مشیت کو بیان کیا ہے۔ کہ انبیاء کے مخالفین سے مقابلے کے وقت خُدا اپنے رسولوں کو دشمنوں پر ہمیشہ غالب رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ ﴿۵۱﴾

''ہم اپنے رسولوں اور مومنین کی دنیاوی زندگی میں اور جس دن گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے ضرور مدد کریں۔'' (مؤمن۔۵۱)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيۡزٌ ﴿۲۱﴾

''خُدا کا قطعی ارادہ یہ ٹھہرا ہے کہ میں (خُدا) اور میرے رسول کامیاب ہوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا قوت والا اور زبردست ہے۔ (مجادلۃ۔۲۱)

۵۔ عمل اور دعویٰ میں مطابقت (مع مطابقة الدعوی)

جب بھی کوئی کام ان چار قیود کے ساتھ انجام پائے لیکن یہ کام خود اس کے دعوی کی تکذیب کررہا ہو تو یہ کام نہ صرف یہ کہ اُس شخص کی حقانیت پر دلیل نہیں بن سکے گا بلکہ یہ اس بات کی دلیل بن جائے گا کہ اُس نے خُدا پر بہتان باندھا ہے اور خُدا اسے اس طریقے سے رسوا کرتا ہے۔ مثلاً نبوت کا دعوی دار یہ کہے کہ میرے دعوی کی سچائی پر میرے پاس ثبوت یہ ہے کہ میں جب بھی کسی بیمار کے جسم پر ہاتھ پھیروں تو وہ شفایاب ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ کام کرے تو مریض مرجائے یا اُس کی بیماری اور بڑھ جائے تو یہ معجزہ نہیں ہوگا جیسا کہ مسلمہ کذاب کے بارے میں ملتا ہے کہ اُس نے اپنا معجزہ دکھانے کے لیے اپنا لعاب دہن کنوئیں میں گرایا تا کہ پانی اوپر چلا گیا یا قبیلہ بنی حنیفہ کے بچوں پر اُس نے ہاتھ پھیرا تو وہ مریض ہو گئے۔

یہاں تک ہم معجزہ اُس کی حدود وقیود اور تعریف سے آگاہ ہوئے۔ لیکن آج نبوت کی اس دلیل (معجزے) کے بارے میں بہت سے سوالات سامنے آرہے ہیں جن کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔

یہاں تک معجزے کی حقیقت اور مسلم متکلمین نے اس کی جو تعریف کی ہے، اُس سے ہم نے واقفیت حاصل کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اس کی تعریف میں جن پانچ قیود کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے یہ دو شرطیں بنیادی کردار اور اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔ اُس کام کا خارق عادت ہونا۔

۲۔ دوسروں کا اُس کی مثل لانے سے عاجز ہونا۔

لیکن دوسری تین شرائط اعجاز کی حقیقت میں کسی قسم کی دخالت نہیں رکھتیں کیونکہ مفروض یہ ہے کہ وہ کام بھی خارق عادت ہے اور کوئی

اُس کا مقابلہ کرنے کی توانائی بھی نہیں رکھتا۔صرف اولیاء کی کرامات اور انبیاء کے معجزات کے درمیان فرق بیان کرنے کے لیے تیسری اور چوتھی قید لائی گئی تھی۔یعنی خارق عادت کام انجام دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ

ا۔وہ نبوت اور پیغمبری کا دعوٰی دار ہو۔

۲۔مخالفوں کو مقابلے کی دعوت دے (تحدی کرے)۔

اگر دعوٰی نبوت والی شرط نہ ہو تو اس عمل کو اصطلاحاً معجزہ نہیں کہتے ہیں لیکن اُس کی ماہیت معجزہ جیسی ہے۔اسی طرح اگر آخری شرط (عمل اور دعوٰی میں مطابقت) موجود نہ ہو تو پھر بھی اسی طرح ہے کیونکہ معجزے کے دعوٰی کے مطابق ہونے کی شرط کام کے خارق عادت ہونے کی شرط نہیں ہے۔بلکہ یہ بھی اعجاز کی ایک قسم ہے۔لیکن چونکہ ہماری بحث فعلاً اُس معجزے سے متعلق ہے جسے لانے والا اُس کی تصدیق بھی کرے۔اگر چہ اس خارق عادت کام کو معجزے کا نام بھی دے دیا جائے تو پھر بھی یہ ہمارے محل بحث سے خارج ہے۔

(۲۲) اثبات کی راہیں

حصہ دوم

اعجاز سے متعلق چند سوالوں کے جواب

آیات مورد بحث

۱۔ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (مؤمن۔۷۸)

۲۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ (النّمل۔۴۰)

۳۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ (بقرۃ۔۱۰۲)

۴۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ (بقرۃ۔۱۰۲)

۵۔ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ (اعراف۔۱۰۵)

۶۔ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ (اعراف۔۱۰۶)

۷۔ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ (ال عمران۔۴۹)

۸۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ (حاقة۔۴۴تا۴۷)

۹۔ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (ابراهيم۔۱۰)

۱۰۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (انبیاء ۔ ۲۲)

۱۱۔ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ (طور ۔ ۳۵)

۱۲۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (مائدہ ۔ ۷۵)

۱۳۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (مؤمنون ۔ ۱۱۵)

۱۴۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (بنی اسرائیل ۔ ۸۸)

۱۵۔ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ (اٰل عمران ۔ ۶۱)

۱۶۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ (اعراف ۔ ۱۰۷)

۱۷۔ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ (البقرۃ ۔ ۶۰)

۱۸۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ (شعراء ۔ ۶۳)

۱۹۔ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ (نمل ۔ ۱۲)

۲۰۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل ۔ ۱۰۱)

۲۱۔ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ (اٰل

(عمران۔ ۴۹)

۲۲۔ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ (الصفت۔ ۱۷۱،۱۷۲،۱۷۳)

۲۳۔ مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ
الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾

(یونس۔ ۸۱)

تفسیر

گذشتہ باب میں ہم معجزے کی حقیقت اور اس کی تعریف سے آگاہ ہوئے۔ نبوت کی اس عمومی دلیل سے متعلق کئی سوال سامنے آتے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۔ کیا معجزہ بغیر علت کے ہوتا ہے؟

علیت اور معلولیت کا قانون اور یہ کہ کوئی بھی ممکن الوجود علت کے بغیر موجود نہیں ہوسکتا ایک قطعی، عمومی اور عقلی قانون ہے۔ یہ کسی لحاظ سے بھی قابل تخصیص نہیں ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا معجزہ ایک ایسا کام ہے جو کسی علت اور سبب کے بغیر ہے یا یہ کہ ایسا نہیں ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کی علت کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ معجزہ ایسا کام نہیں ہے جس کی کوئی علت نہ ہو، یہ قانون علیت سے باہر اور اُسے توڑنے والا نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں جانے پہچانے طبعی اسباب وعلل نہیں پائے جاتے بلکہ اس کے مخصوص اسباب ہیں۔ عادی اور طبعی علت کا نہ ہونا تو اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہاں پر اصلاً کوئی علت ہے ہی نہیں۔ صرف وہ لوگ جو کہ وجود کو مادہ کے مساوی قرار دیتے ہیں اور اسباب وعلل کو جانے پہچانے طبعی اسباب وعلل میں منحصر سمجھتے ہیں وہ معجزہ کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ معجزے کو تسلیم کرنے سے ''علیت'' کا عقلی قانون ٹوٹ جائے گا۔

یہ لوگ علل کے سلسلے میں پہلے سے قائم کردہ ایک رائے کی بدولت یہ سوچتے ہیں کہ ہر چیز کے لیے علت طبیعی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی چیز اس طرح کی علت نہیں رکھتی تو وہ بدون علت ہے۔

ان کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

اوّل: وجود مادہ کے مساوی نہیں ہے بلکہ اُس سے وسیع تر ہے۔ لہٰذا اگر کوئی چیز ایک مادی علت نہ رکھتی ہو تو اسے اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ اصلاً علت ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ تو صرف اس بات پر گواہ ہے کہ چیز مادی علت نہیں رکھتی۔ اخص (علت مادی) کا فقدان

اعم (اصلِ علت) کے فقدان پر دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک چیز کوئی مادی علت نہ رکھتی ہو لیکن اس کے باوجود وہ محروم علت نہ ہو۔ بلکہ اُس کی علت ایک موجود مجرد ہو جو حس اور تجربہ کی پہنچ سے دور ہوتا ہے۔

یہاں ایک اور جواب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ طبعی علل دو قسم کی ہوتی ہیں:

ا۔ معلوم علل طبعی

۲۔ ناشناختہ علل طبعی

علم کا کام ہمیشہ دوسری قسم کے کشف سے متعلق ہے۔ اب اگر معجزہ جانی پہچانی طبعی علل سے خالی ہو تو اسے اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ علت طبعی رکھتا کیونکہ ممکن ہے کہ انبیاء اور پیغمبروں نے اُن علل طبعی سے استفادہ کیا ہو جو ناشناختہ ہیں۔ البتہ یہ صرف ایک احتمال ہی ہے اور اُس عقلی اعتراض کے جواب کے لیے کافی ہے اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں۔

مُعجزے کی علت کیا ہے؟

جو کچھ بیان ہوا ہے اُس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معجزہ ایسا کام نہیں ہے جو کوئی علت نہ رکھتا ہو اگر چہ اس کی علت طبعی علل کی مانند انسان کے لیے پہچانی ہوئی نہیں ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی علت کیا ہے؟

اس سلسلے میں تین نظریات پائے جاتے ہیں:

ا۔ معجزے کے عوامل غیبی ہیں

ممکن ہے معجزہ چند غیبی عوامل کا معلول ہو۔ مثلاً یوں کہ اس کا عامل خُدا کے فرشتے ہوں جب پیغمبر خُدا اسے کوئی خارق عادت کام طلب کرے تو یہ غیبی عامل (فرشتے) خُدا کے اذن اور مشیت سے مصروف کار ہو جائیں اور معجزہ وجود میں لائیں۔

۲۔ معجزہ ان طبیعی عوامل کا نتیجہ ہے جو ناشناختہ ہیں

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ معجزات کی علت ناشناختہ طبیعی عوامل ہیں۔ چونکہ انبیاء ایک وسیع اور سرشار علم کے حامل ہیں اور اسرارِ کائنات سے آگاہ ہیں لہٰذا وہ اُن ناشناختہ عوامل سے کام لے کر اس طرح کا خارق عادت کام سرانجام دیتے ہیں۔

۳۔ معجزے کا عامل انبیاء کی ذات اور ان کا مستحکم ارادہ ہے

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ انبیاء کے معجزات ان کی ذات اور مستحکم ارادے کا ثمرہ ہیں۔ لہٰذا انبیاء کے خارق عادت کام نہ تو امور غیبی کا نتیجہ ہیں اور نہ ہی ناشناختہ عادی اور طبیعی عوامل کا ثمرہ ہیں بلکہ یہ تو انبیاء کے توجہ نفس اور ارادہ قطعی کا نتیجہ ہیں۔ اُنکی ذات اور نفس تہذیب وتزکیہ کے سائے میں مادی دُنیا سے قطع تعلق کی بنا پر خُدا سے تقرب اور کمال واقتدار کی اُس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ موجودات کائنات میں تصرف

کر کے انہیں اپنے کام میں لاتے ہیں۔موجودات بھی اُن کے سامنے تسخیر ہیں اور ان کی اطاعت کرتی ہیں۔جیسا کہ عام انسان اپنے وجود میں تصرف کر کے اپنے بدن کی مادی قوتوں سے خدمت لے سکتے ہیں اسی طرح کامل انسانوں کے نفوس دوسرے موجودات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔وہ دوسرے موجودات سے خدمت لے سکتے ہیں۔

ابن سینا اور صدر المتالہین جیسے بعض فلاسفہ الٰہی اس آخری نظریے کے حامی ہیں شیخ الرئیس اس سلسلے میں کہتے ہیں:

۱۔خارق عادت کاموں کو ناممکن اور بعید نہیں سمجھنا چاہیے۔اور نہ ہی انہیں جھٹلانا چاہیے بلکہ عام طبیعت میں ان کے کئی اسباب وعوامل ہیں اگرچہ وہ انسان کے ظاہری حواس سے پوشیدہ اور پنہاں ہوں۔[۱]

۲۔نفس اور بدن کا رابطہ حلول اور انطباع کی قسم میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا رابطہ ایک اور قسم سے ہے (تدبیر) جس کی وجہ سے وہ بدن پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔نفس کے بعض توہمات بدن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔جبھی وہ جسم کو مریض کر دیتے ہیں اور کبھی تندرست۔یہ بعید نہیں ہے کہ کبھی نفس کی قدرت وتوانائی اس سے بھی بڑھ جائے اور وہ دوسرے اجسام پر بھی اثر انداز ہوتا شروع کر دے۔اُس کی قدرت اتنی بڑھ جائے، چند نفوس کے برابر اس کی توانائی پہنچ جانے بالخصوص اُس وقت جب وہ بدنی قوتوں کو اپنا تابع بنا لے اور شہوت[۲] وغضب کو کنٹرول کر لے[۳]

۳۔اس نفسانی قوت کے لیے حالات سازگار کرنے والے عوامل واسباب مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱۔خاص بدنی اور طبعی مزاج جو شروع سے کئی لوگوں کے لیے پیدا ہوتا ہے۔

۲۔خاص بدنی اور جسمانی مزاج کو جو تدریجاً حاصل ہوتا ہے۔

۳۔خاص نفسانی حالات کہ اولیائے خُدا جیسے بعض نفوس انہیں حاصل کرتے ہیں۔[۴]

شیخ الرئیس نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے صدر المتالہین نے ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

---

[۱] ولعلك قد يبلغك من العارفين اخبار يكاد تأتي بقلب العادة فتبادر الى التكذيب ...فتوقف وَلاَ تعجل فان لا مثال هٰذه الاشياء اسباباًفي اسرار الطبيعة (شرح اشارات جلد ۳۔ص ۴۱۳)

[۲] یہاں پر لفظ شہوت کا مفہوم خواہشات نفسانی کے مترادف ہے۔لہذا یہاں اس کا معنی ہمارے ہاں مروج معنی سے وسیع تر ہے۔ (مترجم)

[۳] انّ النفس النّا طقة ليس علا قتها مع البدن علاقة انطباع بل ضر بأمن علائق اُخر ...ويتبع اوهام النّاس تغير المزاج وابتداء امراض اوافراق منها فلا تستبعدان يكون لبعض النّفوس ملكة يتعدّى تأثيرها بدنها ويكون لقوّتها كانها نفس مالللعالم..لا سيما اذا كانت قد شحذت ملكتها بقهر قواها البدينة التي لها فتقهر شهوة او غضبا ... (شرح اشارات ج ۳ ص ۴۱۴)

[۴] هذه القوة ربما كانت للنفس بحسب المزاج الا صلي لما يفيده من هيئة نفسانية تصير للنفس الشخصيه وقد تحصل لمزاج يحصل ،قد تحصل بضرب من الكسب يجعل النفس كالجردة لشدة الذكاء كما يحصل لا ولياء الله الابرار۔(شرح اشارات ج ۳ ص ۴۱۴)

اس پر تعجب نہ کرو کہ بعض نفوسِ الٰہی رکھتے تھے اور ایسی قدرت کے حامل تھے گویا پوری عالم طبیعت کا وہ نفس ہیں۔ نفوس کی جیسے بدن اُن کی اطاعت کرتا ہے عالم طبیعت کے عناصر بھی اسی طرح اُن کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ مبادی عالیہ سے نفس کی شباہت جتنی بڑھتی جائے جہان مادہ پر اُس کے اثر انداز ہونے کی قدرت اور توانائی بھی اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ [1]

اس سلسلے میں قرآنی رہنمائی

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قرآن نے بھی اس سلسلے میں کسی رائے کا اظہار کیا ہے یا نہیں! اگر اُس نے رائے کا اظہار کیا ہے تو مذکورہ بالا نظریات میں سے کسی کی تائید میں ہے؟

جو بات قطعی اور مسلم ہے وہ یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کے معجزات کو اذنِ الٰہی کی طرف منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ اُنکی نسبت خود انبیا کی طرف بھی دی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

''کوئی پیغمبر معجزہ نہیں لاتا مگر یہ کہ خُدا کے اذن کے ساتھ۔'' (مؤمن۔۷۸)

اس آیت میں ''آیہ'' اور ''اذن'' بطور مطلق ذکر ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس میں تشریعی آیہ بھی شامل ہے اور تکوینی آیات (معجزات) بھی شامل ہیں اسی طرح یہ خُدا کے تشریعی اذن اور تکوینی اذن کی طرف اشارہ ہے۔ اس بنا پر اس کے باوجود کہ انبیاء کے معجزات خُدا کے تکوینی اور تشریعی اذن کے بغیر انجام نہیں پاتے خود انبیاء کا وجود بھی ان معجزات کی پیدائش میں مؤثر ہے۔

یہ آیت معجزات کے اسباب کی تفسیر کے لیے بیان شدہ مذکورہ تینوں مفروضوں کے ساتھ مخالفت نہیں رکھتی۔

پہلے مفروضے کی بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبر خُدا کے اذن سے اُس غیبی قوت کو کام میں لاکر خارق عادت کام انجام دیتا ہے لہٰذا مبدۓ فعل وہی غیبی موجود اور عامل ہے لیکن اس شرط کے ساتھ پیغمبر جب ایسا کام چاہے تو۔

دوسرا مفروضہ جو یہ کہتا ہے کہ معجزے کی علت ناشناختہ طبعی عوامل ہیں یہ نفس پیغمبر ہے جو اسرار کائنات سے آگاہی کی بدولت ان ناشناختہ طبعی عوامل کو کام میں لاتا ہے اور یوں معجزہ وجود میں آتا ہے۔

نیز تیسرا مفروضہ جو کہ اس خارق عادت کاموں کو عامل نفس کو قرار دیتا ہے ممکن ہے نفس بغیر کسی واسطے کے اثر انداز ہو اور ممکن ہے وہ خاص طبیعی عوامل کو تسخیر کر کے معجزہ وجود میں لائے۔ شیخ الرئیس اور صدر المتالہین کی عبارات سے دوسرا نظریہ اخذ ہوتا ہے۔ شیخ جو یہ کہتے ہیں کہ

---

[1] لا عجب ان یکون لبعض نفوس الهیة یکون بقوتها کانها نفس العالم لیطیعها العنصر طاعته بدنها فکلما ازدادت النفس تجردًا و تشبها بالبادی القصوی ازدادت قوۃ و تاثیرا فی مادونها۔ (مبدء ومعاد ص۔۳۵۵،۳۵۶)

خارق عادت کاموں کے لیے اسرار طبیعت میں اسباب موجود ہیں یا یہ کہ نفس جس طرح بدن میں تصرف کرتا ہے۔ یہ باتیں اس مطلب سے زیادہ ہم آہنگ ہیں کہ بعض ناشناختہ طبیعی عوامل موجود ہیں کہ نفس قوی انہیں جاننے کی وجہ سے اپنے زیر اثر لے کر آتا ہے اور معجزہ آفرینی کرتا ہے۔ اس صورت میں تینوں نظریات کے درمیان ایک مشترک نکتہ مل جائے گا وہ یہ کہ خارق امور کی پیدائش میں نبی کا نفس اور ارادہ مؤثر ہے، فرق صرف اس نفس کی اس تاثیر کی کیفیت کے سلسلے میں ہے۔

خارق عادت کام میں علم کا کردار

قرآن کی بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خارق عادت کاموں کی انجام دہی میں علم ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دو نمونے ذکر کرتے ہیں:

ا۔ نمونہ اوّل

جب حضرت سلیمانؑ نے اپنے پیروکاروں اور ساتھیوں سے یہ چاہا کہ اُن میں سے کوئی ایک ملکہ سبا (بلقیس) کے تخت کو تھوڑے سے وقت میں ان کے سامنے حاضر کردے تو اُن میں سے ایک [1] نے کہا میں آنکھ جھپکنے سے پہلے یہ کام انجام دے دوں گا۔ قرآن نے مذکورہ فرد کا تعارف یوں کروایا ہے کہ یہ وہ تھا جو علم کتاب رکھتا تھا۔ اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ اس خارق عادت اور شگفت آمیزہ کام کی انجام دہی کا عامل اُس کا علم کتاب سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ

جس کے پاس کتاب میں سے کچھ علم تھا اُس نے کہا قبل اس کے کہ آپ آنکھ جھپکیں میں تخت بلقیس کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا۔ (نمل۔ ۴۰)

اب یہ کہ کتاب سے کیا مراد ہے اور کتاب کا وہ علم جو اس شخص کو حاصل تھا۔ کون سا علم تھا اس سلسلے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ قرآنی آیات میں ان اقوال پر کوئی قرینہ اور دلیل موجود نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بعید نہیں ہے کہ وہ علم خدا شناسی اور توحید تھا وہ شخص خدا سے معنوی رابطہ رکھتا تھا جس کی وجہ سے مستجاب الدعوہ بن گیا تھا۔ وہ جب بھی خُدا سے کوئی درخواست کرتا وہ پوری ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ وہ جب

---

[1] یہ شخص کون تھا اس سلسلے میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے وزیر اور بھانجے آصف بن برخیا تھے۔ (مجمع البیان جلد ۴ ص ۲۱۳)

بھی کسی چیز کا ارادہ کرتا تو خُدا بھی ارادہ کر لیتا۔[1]

نمونہ دوم

دوسری مثال بھی حضرت سلیمانؑ کے زمانے کے جادوگروں سے مربوط ہے جو ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں سے جادوگری سیکھتے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ اسے نیک کاموں کے لیے استعمال کرتے اور اس سے شیطانی ساحروں کے سحر کو توڑتے انہوں نے اسے غلط راستے میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کی گھریلو زندگی میں دخالت کرتے، میاں اور بیوی کے درمیان اختلاف پیدا کرتے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ

''ان دو فرشتوں (ہروت اور ماروت) سے ایسی چیزیں سیکھتے جن کے ذریعے وہ بیوی اور شوہر میں جُدائی ڈالتے۔ (بقرہ۔۱۰۲)

عورت اور مرد کے درمیان اختلاف ڈالنا عائلی زندگی کی ایک خارجی واقعیت ہے۔ یہ چند عادی اور جانے پہچانے عوامل رکھتی ہے جن کی اساس عقیدے، اقتصاد اور اخلاق وغیرہ پر ہوتی ہے۔

لیکن وہ جادوگر ان عوامل سے کام لیے بغیر ایسا کام کرتے جس سے بیوی اور شوہر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو جاتے۔ جو راستے دوسرے لوگوں کے لیے نامعلوم تھے اُن کے ذریعے سے یہ ان میں جدائی ڈالتے۔ اس اعتبار سے اُن کا کام خارق عادت تھا۔ اس کا عامل بھی خود قرآن کی تصریح کے مطابق وہ علم تھا جو وہ دو فرشتوں سے سیکھتے تھے[2]۔ لہٰذا وہ جادوگر اس علم و دانش کی وجہ سے چند ایسے عوامل سے آگاہ ہو گئے تھے جنہیں دوسرے نہیں جانتے تھے۔

ب۔ معجزہ اور نظم آفرینش

کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معجزہ خلقت میں موجود نظم کے برخلاف ہے کیونکہ اصل نظم یہ ہے کہ ہر موجود چند خاص اسباب و عوامل کی بنا پر خُدا کی جانب سے وجود میں آیا ہے جبکہ معجزے کی بنیاد یہ ہے کہ ایک کام طبیعی عوامل کے بغیر وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا معجزے اور نظم کائنات میں ہم

---

[1] وبذلك كله يتحصل انه كان له من العلم بالله والارتباط به ما اذا سأل ربه شيئاً بالتوجه اليه لم يتخلف عن الاستجابه وان شئت فقل إذا شاء الله سبحانه... (الميزان ج ۱۵ ص ۲۸۷)

[2] البتہ یہ دو الٰہی فرشتے سحر کا علم سکھاتے وقت یہ بتاتے کہ یہ کام صرف انسانوں کی آزمائش کے لیے کیا جا رہا ہے۔ مبادا راہ کفر پہ چل نکلو۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ (بقرۃ۔۱۰۲)

آہنگی نہیں پائی جاتی۔ دوسری طرف چونکہ اس جہان کے خالق کے وجود ایک اہم استدلال بُرھان نظم ہے اور انبیاء کے معجزات اگرچہ ان کی نبوت کو ثابت کرتے ہیں لیکن وجود خُدا کے اثبات پر ضرب لگاتے ہیں۔

جواب:

پہلے سوال کا جواب دینے سے اس سوال کا جواب بالکل واضح ہو گیا کیونکہ اُس بحث میں ہم نے یہ ثابت کیا تھا کہ معجزہ ایسا کام نہیں ہے جو علت کے بغیر ہو بلکہ تمام خارق عادت کام چند خاص عوامل و اسباب رکھتے ہیں، چاہے اُن کے اسباب ناشناختہ طبیعی عوامل ہوں، چاہے پیغمبر کا نفس اور ارادہ قوی یا دوسرے عوامل جو غیبی اور غیر مادی ہوں۔ بہر حال مذکورہ عوامل بھی اس کائنات کے نظام کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے طبیعی عوامل کی مانند یہ بھی حساب و کتاب رکھتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یُوں کہ خارق عادت کاموں میں نہ تو قانون کلی پر کوئی خدشہ وارد ہُوا ہے نہ ہی عقلی قانون میں کوئی اشتشناء ہوا ہے اور نہ ہی خلقت میں جاری و ساری نظام کے خلاف کوئی بات واقع ہوئی ہے معجزات اور خارق عادت کاموں میں صرف اتنا ہوا ہے کہ جہان ہستی میں قانون علیت کے دامن کو کچھ وسیع کر دیا گیا ہے۔

گذشتہ بے بنیاد وہم کا باعث قانون علیت کو مادی اسباب و علل میں منحصر کر دینا ہے۔ انبیاء کے معجزات اس بے بنیاد وہم کو رد کر رہے ہیں اور ''قانون علیت'' کو زیادہ استحکام بخش رہے ہیں۔

ہاں: اگر اپنے معجزات کی وجہ سے جہان آفرینش میں جاری نظام میں بے نظمی پیدا کر دیتے اور قانون علیت کو توڑ دیتے تو مذکورہ بالا اعتراض وارد ہو سکتا تھا اور انبیاء کے معجزات قانون علیت اور نظام خلقت کے منافی قرار پاتے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے یہ بات بیان کی ہے کہ انبیاء کے معجزات اور تمام خارق عادت کاموں کے متعلق ایسی سوچ صرف ایک وہم کا درجہ رکھتی ہے جس کا سرچشمہ مادہ پرستی کی تنگ نظری ہے جس کے مطابق عالم وجود کو مادہ میں منحصر کر دیا جاتا ہے۔

اصولاً انبیاء کے معجزات نہ فقط یہ کہ وجود خُدا کے اثبات کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُسے مزید واضح اور ثابت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت میں عالم غیب کی ایک جھلک ہے کیونکہ اعجاز کا معنی یہ ہے کہ نظام عالم ایک عظیم عقل کے زیر نظر کام کر رہا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی اس کلی اور عام روش کو چند مصلحتوں کی وجہ سے تبدیل کر دے۔ اگر اس عالم پر حکم فرما طاقت مادہ اور اُس کے خشک، غیر لچکدار اور طبیعی (physical) قوانین ہوتے اور پوری کائنات روابط طبیعی کے پنجوں میں گرفتار ہوتی تو پھر کبھی انہیں انسانی ارادے اور خواہش سے تبدیل نہ کیا جا سکتا۔

ج۔ معجزہ۔ صاحبِ اعجاز کی صداقت پر گواہ؟

پوری تاریخ کے دوران انبیاء انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اُس میں معجزہ ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں انبیاء کی صداقت پر گواہ رہا ہے۔ لہٰذا جب بھی خُدا کی طرف سے کوئی نبی بھیجا جاتا تو لوگ فوراً اُس سے یہ پوچھتے کہ اگر تم سچے ہو تو معجزہ پیش کرو

۔مثلاً حضرت صالح کی قوم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

مَآ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۖۚ فَاۡتِ بِاٰيَةٍ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۵۴﴾

''تم تو ہماری طرح صرف بشر ہو۔ اگر اپنی بات میں سچے ہو تو معجزہ لاؤ۔(شعراء۔ ۱۵۴)

کبھی انبیاء لوگوں کے مطالبے سے قبل ہی یہ کہہ دیتے کہ ہم معجزے لے کر آئے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے متعلق اسی طرح ہے:

حضرت موسیٰ نے فرعون اور اُس کے پیروکاروں کی طرف رُخ کر کے کہا:

حَقِيۡقٌ عَلٰٓى اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ ؕ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِبَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِىَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾

''مجھ پر ضروری ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں ۔ بے شک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی دلیلیں (معجزہ) لے کر آیا ہوں پس تو بنی اسرائیل کو آزاد کر دے فرعون نے جواب میں کہا: اگر سچ کہتے ہو تو اپنا معجزہ لاؤ۔(اعراف۔ ۱۰۵،۱۰۶)

حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا:

اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙ

''میں تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے معجزہ لے کر آیا ہوں۔'' (آل عمران۔ ۴۹)

اس کے بعد اپنے معجزے کا ذکر کیا جس کا آیت میں تذکرہ ہے۔ لہٰذا گذشتہ ادوار میں معجزہ ہمیشہ نبی کے دعویٰ کی حقانیت اور سچائی پر ایک دلیل سمجھا جاتا رہا ہے، مخلص افراد جسے دیکھتے ہی انبیاء پر ایمان لے آتے۔

یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے کہ آیا انبیاء کے معجزات اُن کے دعویٰ کے ساتھ کوئی عقلی اور منطقی رابطہ رکھتے ہیں، ایسے کہ عقل وفطرت اُسے دیکھنے کے ساتھ انبیاء کے دعویٰ کی صداقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ یا یہ کہ ان کے درمیان ایسا کوئی منطقی اور عقلی رابطہ نہیں ہے بلکہ معجزہ ایک نفسیاتی تاثیر رکھتا ہے۔ اسی لیے عقل مند اور مفکر حضرات کے لیے معجزہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اُن کے سامنے دلیل اور بُرھان قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔معجزات کا دائرہ کار فقط وہ انسان ہیں جو فکر کی اعلیٰ منزلوں پر فائز نہیں۔ اُن کے لیے صرف ظاہری آنکھ ہی حق و باطل کی تشخیص کا معیار ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک مصری مصنف نے اسی دوسرے نظریے کو قبول کرتے ہوئے لکھا ہے۔ معجزہ دعویٰ کی سچائی پر کوئی علمی اور عقلی دلیل ہے جو صرف لوگوں کو قانع کرنے کی حد تک ہوتی ہے جو ایمان کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔ اصولاً عام لوگ جب بھی کوئی خارق عادت کام

دیکھتے ہیں تو فوراً اُس کے زیر اثر آجاتے ہیں، اُس سے عقیدت پیدا کر لیتے ہیں۔اس کے باوجود معجزے اور اُس کے لانے والے کی سچائی کے درمیان کوئی منطقی اور عقلی رابطہ نہیں ہے جو لوگ معجزے کو اُس کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ ان دو کے درمیان کسی منطقی رابطے پر دلیل پیش کریں وگرنہ اُن کی بات اور دعوٰی تو ایسے ہی ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں ڈاکٹر نے جو پہلی بار دل کی پیوندکاری کی ہے۔یہ اُس کی نبوت کی دلیل ہے۔

لہٰذا انبیاء کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ دانشور اور مفکر لوگوں کے سامنے دلیل و برھان پیش کریں نہ کہ خارق عادت کام یہ عام لوگوں کے لیے ہی قوت جذب رکھتے ہیں۔

اس نظریے کے دو جوابات دیئے جاسکتے ہیں جنہیں ہم ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

پہلا جواب

یہ بات اس امر کی حکایت کرتی ہے کہ مذکورہ صاحب معجزہ کے صاحب اعجاز کی حقانیت پر دلالت کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکے اسی وجہ سے انہوں نے اسے ایک اقناعی دلیل شمار کیا ہے نہ کہ ایک علمی دلیل جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے معجزے کی دلالت اُسکے لانے والے کی حقانیت پر ایک علمی اور بُرھانی دلالت ہے جسے ہم بیان کرتے ہیں۔

اس بُرھان میں ایک بات قطعی اور مسلّم کی گئی ہے وہ یہ کہ خُدا حکیم ہے اور خُدائے حکیم نقص غرض نہیں کرتا۔اس قانون کے پیش نظر معجزے کی دلالت بُرھائی نبوت کے دعوٰی کی صداقت پر واضح ہوجاتی ہے جس کا بیان کچھ یُوں ہے:

نبوت کا دعوے دار وہ شخص جو ایک درخشاں ماضی کا حامل ہو اور جس نے اپنی پوری زندگی میں اخلاقی اصولوں کے خلاف کوئی کام نہ کیا ہو جب بھی ایسا شخص ایسی شرائط کے ساتھ ایک خارق عادت کام کرے اور دنیا والوں کو مبہوت کردے تو اس وقت لوگوں کے اس کی طرف میلان کے حالات سو فیصد سازگار ہوجاتے ہیں۔اگر ایسا فرد اپنی باتوں میں صادق ہو تو پھر تو معاملہ واضح ہے لیکن اگر بالفرض ایسا شخص اپنے دعوٰی میں کاذب اور جھوٹا ہو تو خُدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دن سے ہی ایسی قوت اور قدرت اُسے عطا نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا نقص غرض اور انبیاء کی بعثت کی حکمت کے منافی ہے۔

اگر نبوت کا دعوے دار ایک تاریک اور بُرا ماضی رکھتا ہو یا اس کا پروگرام عقل وفطرت کے خلاف ہو تو اُس کی زندگی اور دین اُس کے جھوٹے ہونے پر گواہی دیں گے۔عام لوگ اُس کے اس بُرے سابقے کے پیش نظر اُس کی طرف نہیں آئیں گے کیونکہ اُس کے دعوی کے بطلان کی دلیل خُود اُس کے ساتھ ہوگی۔

لیکن اگر اُس کی زندگی اور اُس کے مکتب کی تعلیمات درخشاں ہوں اور اُن کے ساتھ ساتھ وہ معجزہ بھی لے کر آئے جو عام لوگوں کی عقل کو مبہوت کردے تو اس وقت اگر وہ سچا ہے تو غرض رسالت پوری ہورہی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بعثت کی غرض کے منافی ہے اور خُدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دن سے ہی اُسے ایسی قوت اور طاقت عطا نہ کرتا کیونکہ خُدا کو معلوم ہے کہ یہ قدرت اور توانائی لوگوں کے اس جھوٹے

شخص کی طرف آنے کا باعث بنے گی۔ جھوٹے انسان کی طرف میلان انسانوں کی ہدایت کے مقصد کے منافی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ دلیل اور مدلوں کے درمیان رابطہ کبھی تو ایک خصوصی رابطہ ہوتا ہے مثلاً عقل وخرد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ نظم اور عقل وشعور کی دخالت کے درمیان ایک بلا واسطہ رابطہ موجود ہے۔ یا بُرھان امکان یہ ثابت کرتا ہے کہ وجود ممکن اور واجب الوجود کی طرف اُس کے اسناد دینے کے درمیان ایک بلا واسطہ رابطہ موجود ہے ان دو مقامات پر اور اسی طرح کئی اور مقامات پر دلیل اور مدلول کے درمیان ایک بلا واسطہ اور خصوصی رابطہ موجود ہوتا ہے جو رابطہ دوسری دلیلوں اور اُن کے مدلولوں کے درمیان نہیں پایا جاتا۔

لیکن کبھی دلیل اور مدلول کے درمیان ایک عمومی رابطہ'' پایا جاتا ہے یعنی بہت سے قیضے ایک دلیل کے تحت آتے ہیں یہ قضا یا عمومی صورت میں ثابت ہوتے ہیں اگر چہ ہر قضیہ خود اپنی ذات کی حد تک ایک خاص دلیل بھی رکھتا ہو مثلاً اگر ہم نے ایک شخص کو کئی مرتبہ آزماتے کے بعد سچا قرار دیا پھر اس شخص نے ہمیں مختلف باتیں آ کر بتائیں۔ ہم ان تمام موارد میں اُس کی بات کے سچا ہونے پر ''علم شخصی'' رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بات اس امر سے مانع نہیں ہے کہ اُن میں سے ہر بات اپنی سچائی پر ایک مشکل اور خاص دلیل بھی رکھتی ہو۔ مثلاً اگر اُس نے ایک اجتماعی واقعے سے متعلق خبر دی تو ہم نے یہاں طبیعی تجربے کے بارے میں بتایا یا ایک نفسیاتی حالت یا کیمیاوی ترکیب کے متعلق ہمیں خبر دی تو ہم یہاں پر اس بات کی وجہ سے کہ وہ ایک سچا شخص ہے، اُس کی باتوں کو مان لیں گے لیکن یہ اس سے مانع نہیں ہے کہ مذکورہ باتوں اور قضایا میں اُس کی گفتار کی سچائی پر ایک اور حسّی یا عقلی یا تجربی دلیل بھی رکھتے ہوں۔

مثلاً خُدا کا حکیم ہونا ایک کلی اور عمومی بُرہان ودلیل ہے اس بات پر کہ انبیاء اصول وفروع سے متعلق جو کچھ کہتے ہیں سچ کہتے ہیں یہ خلاف حقیقت نہیں ہوتا کیونکہ وہ معجزہ رکھتے ہیں اور حکیم مطلق کسی جھوٹے شخص کو معجزہ عطا نہیں کرتا۔ لیکن یہ اس امر سے مانع نہیں ہے کہ شریعت کی بعض باتوں اور قضایا کو نظری اور علمی میدان میں کسی اور راہ سے ثابت کیا جا سکے۔

قرآن کی آیات میں اس بُرہان کی طرف کئی اشارے ملتے ہیں۔ قرآن انبیاء کی راستگوئی یوں بیان کرتا ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾

''اگر یہ محمدؐ ہماری طرف بے بنیاد باتیں منسوب کرتا تو ہم ضرور اسے پوری قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے، اُس کی رگ حیات کاٹ ڈالتے پھر تم میں سے کوئی بھی اس کی طرف سے روکنے والا اور دفاع کرنے والا نہ ہوتا (حاقة۔ ۴۴ تا ۴۷)

آیت اس بات کی حکایت کرتی ہے کہ پیغمبر خُدا کی طرف کوئی خلاف واقع بات منسوب کرے گا تو اُس سے نعمت حیات چھین لی جائے گی۔ کیوں؟ نبی دوسروں سے کیا فرق رکھتا ہے جبکہ ہزاروں لوگ خُدا کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں لیکن انہیں کچھ نہیں ہوتا اور برس یا برس جیتے رہتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کی طرف لوگوں کے آنے کے لیے تمام شرائط اور حالات موجود تھے درخشاں ماضی کے ساتھ

ساتھ اُس کے پاس جادوانی معجزہ بھی تھا جس سے لوگوں کے اُس کی طرف آنے کا ماحول پوری طرح سازگار تھا۔لہٰذا اس صورت میں اُس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی باتوں میں سچا ہو۔اگر ایسا نہ ہُوا تو خُدا کے حکیمانہ ارادے کا تقاضا یہ ہے کہ اُس سے یہ قدرت چھین لے تا کہ لوگوں کی گمراہی کا ذریعہ فراہم نہ ہو سکے۔

لہٰذا آیت ہر اس انسان سے متعلق نہیں ہے جو خُدا پر جھوٹ باندھے تا کہ اس کے ذریعے سے نبوت کے ہر دعوے دار کی بات خود بخود ثابت ہو سکے بلکہ یہ آیت پیغمبر اسلامؐ جیسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جن کی طرف لوگوں کے آنے اور جذب ہونے کے عوامل موجود تھے۔اس طرح کا بندہ بالفرض محال۔۔جھوٹ بُولے تو اُسے خُدا کے فیض وغضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قرآن نے انبیاء کے معجزات کو''بینہ''اور''آیت''جیسے کلمات کے ساتھ بیان کیا ہے۔''بینہ''لغت میں حقیقت کو واضح کرنے والے کے معنی میں ہے جب کہ''آیت''حقیقت کی علامت اور نشانی کے معنی میں ہے۔ایسا اُس وقت ہی ہو سکتا ہے جب معجزے اور دعویٰ نبوت کے درمیان ایک منطقی اور حقیقی رابطہ پایا جاتا ہو نہ کہ مجازی اور ظاہری رابطہ۔

لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انبیاء کے معجزات اور اُن کے دعویٰ نبوت کے درمیان ایک منطقی اور عقلی رابطہ موجود ہے۔

دوسرا جواب

مذکورہ نظریے کے لیے ایک دوسرا جواب بھی ہے جو یہ ہے:

انبیاء کا یہ دعویٰ تھا کہ اُن پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے۔وہ اسے دیکھتے بھی ہیں اور غیبی آوازیں بھی سنتے ہیں۔گویا ایک خاص ادراک بنام وحی کے حامل ہیں جو انسان کے دوسرے حسی اور عقلی ادراکات کے ساتھ اصلاً قابل موازنہ نہیں ہے۔وہ کہتے تھے کہ ہم غیبی شکلیں اور ماورائے طبیعت آوازیں سنتے ہیں۔یہ ایسے ادراکات ہیں جو صرف ہمیں دیے گئے ہیں نہ کہ عام لوگوں کو۔

اس موقع پر اعتراض کرنے والوں کی یہ آواز بلند ہوتی کہ تم ایک غیبی ادراک کے دعویٰ دار ہو اور اسے اپنی خصوصیات میں سے شمار کرتے ہو۔ہم کہاں سے سمجھیں کہ تم اپنے اس دعویٰ میں سچے اور راست گو ہو جبکہ فرض بھی یہ ہے کہ دوسرے ان غیبی اور غیر معمولی چیزوں سے محروم ہیں۔پس اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی خارق عادت کام انجام دو جسے ہم بھی دیکھ سکیں جو وحی اور فرشتے کی مانند نہ ہو کہ جنہیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔ضروری ہے کہ ہمیں ایسے خارق عادت کام دکھاؤ جنہیں دیکھ کر ہم یہ سمجھیں کہ تم اس غیر معمولی ادراک کے دعویٰ میں سچے ہو۔ایک مشابہ کو دیکھکر دوسرے مشابہ سے آگاہ ہوں۔اس وجہ سے انبیاء اپنی بعثت کے اولین مرحلے میں اعجاز سے مسلح تھے اور اس کے ذریعے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے تھے۔

ہر نبی کے پیروکار اس ذریعے سے اُس کی راستگوئی اور صداقت پر یقین حاصل کرتے تھے۔لہٰذا عقل عملی اور عقل نظری کے میدان میں اُس سے جو کچھ بھی سنتے اُس پر یقین اور ایمان لے آتے۔

دوسرے الفاظ میں پیغمبر کی صداقت پر ایک یقین حاصل کرنے کے ساتھ وہ اُس کی تمام شریعت پر یقین پیدا کر لیتے تھے۔بالکل

اُس خبر گزار کی طرح جو ہزاروں خبریں ہمارے سامنے بیان کرتا ہے اور ہمیں یہ یقین ہے کہ وہ ایک پاکباز اور سچا انسان ہے۔ اس اجمالی یقین کی وجہ سے اُس کی تمام خبریں ہمارے لیے یقین اور علم کا درجہ رکھتی ہیں۔

البتہ یہ یقین اجمالی جو ہمیں پیغمبر کی باب کی سچائی پر ہے یہ اس بات سے مانع نہیں ہے کہ عقائد اور عقل نظری کے سلسلے میں اُس کی باتیں بُرہان اور دلیل سے بھی ثابت ہوں۔ لہٰذا قرآن نے اکثر معارف وعقائد کو بُرہان و استدلال سے ثابت کیا ہے اور مبدأ اور معاد سے متعلق مسائل میں عقل کے فیصلے کی بات کی ہے مثلاً:

۱۔ پیدا کرنے والے کے وجود کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

کیا خدا میں تمہیں شک ہے جو زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے والا ہے؟ (ابراہیم۔۱۰)

۲۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ

اگر زمین وآسمان میں دو معبود ہوتے تو نظامِ آفرینش تباہ ہو کے رہ جاتا۔ (انبیاء۔۲۲)

۳۔ انکارِ خُدا کا لازمی نتیجہ خلف اور دور قرار دیا گیا ہے [1] چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵

کیا وہ بغیر کسی سبب (علت) کے پیدا کئے گئے ہیں یا خود اپنے پیدا کرنے والے ہیں؟ (طور۔۲۵)

۴۔ جو لوگ حضرت عیسیٰ کو خُدا سمجھتے تھے ان کی بات کے رد کے لیے ارشاد ہُوا:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ

حضرت عیسیٰ رسول کے علاوہ کچھ نہ تھے اُس سے پہلے بھی کئی انبیاء آئے اور چلے گئے۔ اور اُس کی ماں صدیقہ تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ (مائدہ۔۷۵)

۵۔ قیامت ضروری ہونے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱۵

---

[1] دور اور خلف دونوں علمی اصطلاحات ہیں۔ دور سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز کا وجود دوسری چیز پر موقوف ہو اور دوسری کا وجود بھی پہلی پر موقوف ہوا سے دور کہتے ہیں۔ ایسا ہونا عقلاً محال ہے۔ (مترجم)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث (فضول) پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے؟ (مومنون۔ ۱۱۵)

ان تمام آیات میں اُس دعویٰ پر جوان میں کیا گیا ہے ایک دقیق عقلی استدلال قائم کیا گیا ہے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فلسفی وعقلی براہین سے صرف ایک خاص طبقہ ہی استفادہ کرسکتا ہے۔ عام لوگوں کی ذمہ داری ایک شریعت کی نسبت کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ عام لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس شریعت کے لانے والے شخص کی باتوں پر یقین واطمینان پیدا کرلیں۔اس اجمالی یقین کے سائے میں وہ شریعت کی تمام باتوں پر تفصیلی یقین پیدا کرلیں گے۔

ان دو بیانات سے معجزہ اور نبوت کے مدعی شخص کی سچائی اور حقانیت کے درمیان ایک عقلی اور منطقی رابطہ واضح ہوگیا۔

ھ۔کیا اس دور کے لوگ معجزے سے محروم ہیں؟

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ فکرونظر کی ترقی کے لحاظ سے انبیاء کے زمانے کے لوگوں سے کہیں آگے ہیں۔اب جبکہ دنیا کے لوگوں پر نبوت اور رسالت کا باب بند ہو چکا ہے لہٰذا اس زمانے کے لوگ معجزے سے محروم ہیں جو یقین آفرین اور ایمان کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔یہ محرومیت خُدا کے فضل وکرم سے کیسے ہم آہنگ ہے؟

جواب

اس زمانے کے لوگ اور اسی طرح آئندہ آنے والے زمانوں کے لوگ معجزے جیسی نعمت سے محروم نہیں ہیں کیونکہ پیغمبرؐ اکرم کا آئین جاودانہ ہے لہٰذا انہوں نے انسانیت کے سامنے ایک معجزہ بھی جاودانی پیش کیا ہے۔یہ تابناک خورشید قیامت تک چمکتا رہے گا۔اور انسانیت کی فکرو روح کو منور کرتا رہے گا۔اس سے بڑھ کے اور کیا معجزہ ہوسکتا ہے کہ قرآن نے تمام محصروں اور زمانوں میں تحدی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸

”کہہ دیجئے اگر تمام انس وجن جمع ہوجائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ پھر بھی اس کی مثل نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ (اسراء۔ ۸۸)

ہم سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ قرآن کی ظاہری شکل عربی کے انہی الف با سے تشکیل پاتی ہے۔یہ الفاظ سب لوگوں کے اختیار میں ہیں ۔اگر قرآن کی شکل وصورت پیغمبر کی بنائی ہوئی ہے نہ کہ خُدا کی تو اے لوگو پھر اٹھو اور اسی مواد ووسائل کو کام میں لا کر اس کتاب کی مثل بنا لاؤ۔اگر تم

نے اس سلسلے میں اپنی ناتوانی کا احساس کرلیا تو پھر مطمئن ہوجاؤ کہ یہ کتاب دنیائے غیب سے مربوط ہے اور خُدا کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

البتہ قرآن کا اعجاز صرف ظاہری شکل وصورت (فصاحت و بلاغت) کے اعتبار سے ہی نہیں ہے بلکہ یہ معانی و مفاہیم کے اعتبار سے بھی ایک ابدی معجزہ ہے۔ معارف، فکری ہدایت، اخلاق معنوی ہدایت، اجتماعی اور عادلانہ معاشرتی قوانین بیان کرنے کے سلسلے میں یہ جامع ترین اور حقیقت بین کتاب ہے اس گفتگو کی تفصیل ''نبوت خاصہ'' کی بحث میں آئے گی۔

مباہلہ۔ ایک اور اعجاز جاوداں

مباہلہ لغت عرب میں اعتقاد کے مخالف پر عذاب نازل کرنے کی درخواست کرنے کے معنی میں ہے نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے نجران کے عیسائی راہنماؤں کے ساتھ مباہلہ کی تیاری کی یہاں تک کہ آپؐ نے حضرات حسنؑ و حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی بیٹی (حضرت فاطمہؑ) اور داماد (حضرت علیؑ) کو ساتھ لیا اور صحرا میں آگئے۔ آپ اس بات کا انتظار کررہے تھے کہ مسیحی پوپ اور پادری مباہلہ کے لیے آئیں۔ لیکن وہ پیغمبرؐ کی سچائی کی علامات دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے مباہلہ کی بجائے جزیہ دینا قبول کرلیا۔ [1]

عقائد کے میدان میں نبی کے دعوی کی سچائی پر یہ مباہلہ ایک جاوداں اور دائمی معجزہ ہے۔ مباہلہ کا یہ چیلنج اب بھی برقرار ہے۔ ضروری ہے کہ یہ مخالفین کے کانوں تک پہنچے وہ جس فرقے اور گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں اگر خُدا پر ایمان رکھتے ہیں تو آبادی سے دور کسی سرزمین پر مباہلے کے لیے تیار ہوجائیں۔ طرفین ایک دوسرے کے خلاف خُدا سے عذاب نازل کرنے کی درخواست کریں۔ پھر دیکھیں کہ خُدا کا عذاب نازل ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نازل ہوتا ہے تو کس پر نازل ہوتا ہے؟

علامہ طباطبائی مرحوم مباہلہ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

ہر مومن شخص نبی اسلامؐ کی اتباع کرتے ہوئے اسلام کے حقائق کے اثبات کے لیے اپنے مخالفین سے مباہلہ کرے اور خُدا سے اُس پر عذاب کے نزول کی درخواست کرے۔

جو عیسائی بھی خُدا کے اس معجزے کو نزدیک سے دیکھنا چاہے وہ مومن شخص سے اسلام کی حقانیت کے سلسلے میں مباہلہ کرے اور پھر اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ [2]

حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے صحابیوں کو یہی حکم دیتے تھے کہ مخالفین کو دعوت مباہلہ دو امام کے ایک صحابی ''ابومسروق'' نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ:

---

[1] اکثر مفسرین نے 'فمن حاجك فيه من بعد ما جائك من العلم (آل عمران۔۶۱) کی تفسیر میں مباہلے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

[2] بحوالہ رسالہ علامہ طباطبائی پیرمون اعجاز جو المیزان جلد ۱ کے ترجمے کے آخر میں شائع ہوا ہے۔

میں مخالفین پر آیہ "وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ"[1] کے ساتھ آپ کی فضیلت اور رہبری پر استدلال کرتا ہوں۔
وہ کہتے ہیں یہ آیت تو لشکر کے کمانڈروں سے متعلق ہے اور جب بھی آیہ (انما ولیکم الله ورسوله،[2] کے ساتھ حضرت علیؑ کی امامت پر استدلال کرتا ہوں تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ آیت تمام باایمان لوگوں سے مربوط ہے نہ کہ کسی خاص شخص سے اور جب میں آیہ "الا المودة في القربى"[3] کے ذریعے استدلال کرتا ہوں تو مخالفین کہتے ہیں یہ آیت پیغمبر اسلامؐ کے تمام رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔
امام جعفر صادقؑ نے اس صحابی کے جواب میں فرمایا:
اس صورت میں انہیں مباہلہ کی دعوت دو۔
اس کے بعد امامؑ نے اُسے مباہلے کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا:
تھوڑا وقت بھی نہیں گزرے گا کہ تم مباہلہ کے آثار (نزول عذاب) دیکھو گے۔[4]

و۔ معجزے اور جادو میں فرق

اعجاز کے سلسلے میں ایک اہم موضوع معجزے اور سحر و جادو کے درمیان فرق بیان کرنا ہے۔ یہ سب امور خارق عادت کاموں کے زمرے میں آتے ہیں۔ سرزمین ہند کے بعض ریاضت کش لوگوں کے کام انسان کو مبہوت کر دیتے ہیں کہ وہ کیسے کیسے عجیب وغریب شعبدے دکھا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نفس کش تو تیز اور نوکدار کیلوں پر لیٹ جاتے ہیں۔ ایک بہت بڑا پتھر اُن کے سینے پر رکھ کر توڑا جاتا ہے اور انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کبھی ریاضت کش شخص ایک ہفتے تک قبر میں لیٹا رہتا ہے بغیر اس کے کہ اُس قبر میں باہر سے ہوا وغیرہ کے جانے کے لیے ایک سوراخ تک بھی ہو۔ پھر مٹی ہٹانے کے بعد اُس کے سر اور منہ پر گرم خاک ڈالتے ہیں جس کے بعد وہ اس گہری نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی دوبارہ پالیتا ہے۔
خود ہمارے ملک (ایران) میں "درویش" اور باصطلاح اہل حق لوگ کئی خارق عادت کام انجام دیتے ہیں۔ ساحر اور جادوگر ایسے کام کرتے ہیں جو معمولی کاموں کی حدود سے باہر ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ معجزے کو دوسرے خارق عادت کام سے کیسے جُدا کیا جائے؟

جواب

ان دو طرح کے خارق عادت کاموں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لیے کئی راہیں ہیں جو مجموعی طور پر اطمینان بخش اور مشکل کشا

---

[1] نساء۔ ۵۹۔
[2] مائدہ۔ ۵۵
[3] شوریٰ۔ ۲۳
[4] کافی، جلد ۲، کتاب مباہلہ باب دعا

ہیں:

۱۔ ریاضت کش اور ساحر لوگوں کے کام تعلیم اور تمرین کا بلاواسطہ نتیجہ ہوتے ہیں۔

وہ تعلیم اور طولانی تمرین و مشقت کے سائے میں ایسے کام سرانجام دیتے ہیں۔ سحر اور جادو کی تعلیم کا ایک خاص طریقہ ہے۔ اگر انسان اُسے نہ سیکھے تو اُس میں اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں رہتا جبکہ انبیاء نہ تو تعلیم اور تمرین کا سابقہ رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں بلکہ اُن کے کام بے سابقہ اور نئے ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی تاریخ اس بات پر گواہی دیتی ہے۔۔۔۔

حضرت موسیٰ بن عمران کو مدین سے مصر واپس آتے ہوئے مقام رسالت عطا کیا گیا۔ انہیں ''عصا'' نامی معجزہ عطا کیا گیا[۱]۔ اُن کے فکر و خیال میں ایسے کام کا تصور نہیں تھا۔

حضرت عیسیٰ نے کسی میڈیکل کالج میں اساتذہ سے سبق پڑھے بغیر اور کوئی تمرین و مشق کیے بغیر کئی انوکھے معجزات پیش کیے۔ مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، نابینا لوگوں کو شفا عطا کرنا۔۔۔[۲]

۲۔ چونکہ ریاضت کش اور جادوگروں کا کام ان کے علم کا نتیجہ ہے لہٰذا یہ قابل مقابلہ و مبارزہ ہے ان کے کام ایک خاص طریقے سے سرانجام پاتے ہیں۔ لہٰذا سمجھدار لوگ بھی اُسی طریقے سے وہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

۳۔ اُن کے کام ان کی تعلیم کا نتیجہ ہیں اور یہ راستہ سب لوگوں کے لیے کھلا ہے۔ ساحر اور ریاضت کش شخص کی زندگی تحدی اور چیلنج نہیں رکھتی جب کہ انبیاء تو پہلے ان سے چیلنج اور مقابلے کی دعوت دیتے ہیں، دوسروں کو عاجز کر کے اپنی حقانیت ثابت کرتے ہیں۔ قرآن علی الاعلان پیغمبر اسلامؐ کے جاوداں معجزے کے بارے میں ارشاد فرما رہا ہے:

لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

تم ہرگز اس کی مثل نہیں لا سکتے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جاؤ۔ (اسراء۔ ۸۸)

حضرت موسیٰ بن عمران نے میدان مبارزہ میں جادوگراں کے کام کو بہت چھوٹا قرار دیتے ہُوئے ارشاد فرمایا:

مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ

''تم جو لائے وہ یہ جادو ہے خُدا معجزے کے ذریعے اسے باطل کر دے گا۔'' (یونس۔ ۸۱)

جب اُن کا جادو باطل ہو گیا تو پھر اُس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی جادوگر ہی تھے کیونکہ جادو میں انہیں جو مہارت حاصل

---

[۱] قصص۔ ۳۱

[۲] آل عمران۔ ۴۹

تھے اُس کی وجہ سے انہیں یہ یقین پیدا ہوگیا کہ حضرت موسیٰ کا خارق عادت کام جادو نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ کچھ اور ہے۔ سحر پر اعجاز کی برتری کی وجہ یہ ہے کہ ساحر محدود انسانی قوت پر اعتماد کرتے ہیں جبکہ انبیاء خُدا کی لامحدود قوت سے مدد لیتے ہیں۔

۴۔ جادوگر اور ریاضت کش لوگوں کے کام چونکہ تعلیم اور مشق کا نتیجہ ہیں لہٰذا ان کا دائرہ کار بھی محدود ہے یہ متنوع کام پیش نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک ریاضت کش اپنی ریاضت کی بنا پر چلتی ہوئی گاڑی کو روک لیتا ہے لیکن وہ دوسرے ایسے خارق عادت کام سرانجام نہیں دے سکتا جن کے بارے میں اُس نے تمرین اور ریاضت نہیں کی جبکہ انبیاء کے معجزات متنوع اور گوناگوں ہوتے ہیں کیونکہ وہ زمانے کے تقاضوں اور لوگوں کی مختلف درخواستوں (جبکہ شرائط بھی فراہم ہوں) کے پیش نظر معجزہ پیش کرتے ہیں۔ طبعاً اُن کے معجزات متنوع اور گوناگوں ہیں۔

حضرت موسیٰ کے بارے میں ملتا ہے کہ اُن کا عصا اُن کی مرضی سے اژدھے میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ [۱]

جب انہوں نے اپنا عصا پتھر پر مارا تو اُس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ [۲]

یہی عصا مارنے سے دریا کا پانی ایک طرف ہوگیا اور کف دریا نظر آنے لگی [۳]۔

جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالتے تو اردگرد کا پورا ماحول منور ہوجاتا۔ [۴]

قرآن نے حضرت موسیٰ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ نو معجزے رکھتے تھے۔ [۵]

حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے اپنی پہلی ملاقات میں ایسے معجزات دکھائے جو طرح طرح کے تھے فرمایا:

۱۔ میں مٹی سے پرندے کی شکل بناؤں گا۔ اُس میں پھونکوں گا۔ خُدا کے اذن سے وہ پرندے کی شکل اختیار کرے گا۔

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ

۲۔ میں نابینا اور کوڑھ کے مریضوں کو شفا بخشوں گا۔

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ

۳۔ مردوں کو خُدا کے اذن سے زندہ کروں گا۔

وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ

---

[۱] فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (اعراف۔۱۰۷)

[۲] فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ (بقرۃ۔۶۰)

[۳] فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ (شعراء۔۶۳)

[۴] وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ (النمل۔۱۲)

[۵] لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (اسراء۔۱۰۱)

۴۔ جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھتے ہو ان کے بارے میں تمھیں بتاؤں گا۔ [1]

اُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ‌ؕ

جادوگروں اور ریاضت کشوں کے کاموں کی محدوددیت اور انبیاء کے معجزات کی لامحدودیت کی وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ وہ الگ اپنی محدود بشری قوت پر اعتماد کرتے ہیں جب کہ انبیاء خُدا کی بے پایاں قدرت سے مدد لیتے ہیں۔

۵۔ انبیاء اور جادوگر مقصد اور ہدف کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے پوری طرح جُدا ہیں۔ انبیاء لوگوں کو بیدار کرنے، انہیں مبدأ و معاد سے آشنا کرنے اور انسانی معاشرے کو اخلاقی فضائل سے لوگ ایک مادی مقصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ یا تو مال و زر اور حکومت کے خواہاں ہوتے ہیں یا مقام و شہرت کے طالب۔

۶۔ جیسا کہ انبیاء اور جادوگر مقصد اور ہدف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پوری طرح جُدا ہیں اسی طرح اخلاق، ملکات اور روحانی صفات کے اعتبار سے بھی یہ دو مخالف سمتوں میں ہیں۔ انبیاء کرامات کے حامل ایسے والا اور عظیم المرتبت انسان ہیں جن کی زندگی میں کوئی تاریک پہلو نہیں ہے جب کہ ساحر اور مرتاض لوگوں کی زندگی اس کے برعکس ہے۔

ایک سوال کا جواب

گذشتہ گفتگو سے ایک سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا اور وہ یہ کہ اگر خارق عادت کاموں کا سرچشمہ انسان کا نفس اور قوی ارادہ ہے تو پھر انبیاء کے معجزات جادوگروں کے جادو کو کیوں باطل نہیں کرتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ معجزات اور دوسرے خارق عادت کام دو باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں اور ایک بات میں وہ ایک دوسرے سے جُدا جُدا اور متفادت ہیں۔ اُن کی مشترکہ باتیں یہ ہیں:

۱۔ نفس اور قوی ارادہ خارق عادت کام سرانجام دینے میں مؤثر ہے۔

۲۔ کوئی خارق عادت کام بھی خُدا کے اذن تکوینی کے بغیر واقع نہیں ہوتا۔

یہ دونوں باتیں قرآن کی دو آیات سے بالکل واضح طور پر حاصل ہوتی ہیں۔

قرآن معجزات کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ ۚ

کوئی پیغمبر بھی خُدا کے اذن کے بغیر معجزہ نہیں لاسکتا۔ (مؤمن۔۷۸)

جب کہ سحر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] آل عمران۔۴۹

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

"جادوگروں کا کام کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر خُدا کے اذن سے۔" (بقرۃ۔۱۰۲)

پہلی آیت میں معجزہ انبیا کا کام قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں دوسروں کو نقصان پہنچانا (سحر کی حقیقت بھی یہی ہے) جادوگروں کا کام شمار کیا گیا ہے۔ یعنی اُن کی ذات معجزہ اور جادو کی پیدائش میں مؤثر اور کارساز ہے۔

دونوں آیات میں خارق عادت کام کے واقع ہونے کو خُدا کی مشیت اور اذن پر موقوف قرار دیا گیا ہے۔ یہ نسبت ممکن کی واجب سے نسبت ہی ہے کہ جو ضروری اور اجتناب ناپذیر ہے۔ یعنی ہر بشری یا طبعی فاعل آخرکار فاعل الٰہی پر منتہی ہوتا ہے۔

بقول شاعر

اگر تیغ عالم بجنبد زجای
نبرد رگی تا نخواہد خُدا ی

(اگر کسی جگہ دُنیا کا خنجر چلے تو اُس وقت تک وہ کسی رگ کو کاٹ نہیں سکتا جب تک خُدا یہ چاہے)

لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ انبیاء اور اولیائے خُدا کی ذات اس ضروری رابطے کے علاوہ ایک اور رابطے کی حامل ہے جو کہ کسی اور اختیاری ہے۔ چونکہ وہ اپنی خود پرستی کا بُت پاش پاش کر کے خُدا کی چاہت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں اور اُس کی مرضی کے علاوہ کسی چیز کے طلبگار نہیں ہیں لہٰذا وہ اس کی خاص حمایت اور پشت پناہی کے بھی حامل ہو گئے ہیں۔ خُدا کی قدرت ہمیشہ اُن کی حامی و یاور ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ وہ خُدا کے تکوینی اور تشریعی ارادے کے سائے میں آ چکے ہیں۔ خُدا نے ان سے متعلق ایک خاص سنت قائم کی ہے اور وہ اُن کا خُدا کی نصرت وحمایت کے سائے میں ہمیشہ غالب اور کامیاب ہونا ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں خُدا کی اس دائمی سنت کو بیان کیا ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے انبیاء سے متعلق مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ۚۖ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ۖ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

ہماری مشیت ہمارے بھیجے ہُوئے لوگوں کی حمایت سے متعلق ہے۔ ان کی مدد کی گئی ہے اور ہمارا لشکر غالب اور کامیاب ہے۔ (صافات۔۱۷۱ تا ۱۷۳)

جادوگروں کے متعلق حضرت موسیٰ کی زبانی یُوں بیان کیا:

مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

''جو کام تم نے کیا ہے وہ جادو ہے۔خُدا اسے باطل کر دے گا۔بے شک خُدا مفسدین کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا۔(یونس۔۸۱)

ان دو جملوں:

۱۔ وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا -----

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبۡطِلُهٗ ؕ ----

کے پیش نظر کی جادوگروں پر کامیابی کا راز بالکل واضح ہو جاتا ہے۔انبیاء پر ہمیشہ خُدا کی خاص عنایت رہی ہے اور وہ ہمیشہ اُس کے قاہر اور غلبے والے ارادے سے مدد لیتے ہیں جب کہ دوسری طرف جادوگروں کے بارے میں خُدا کا قانون اور سنت یہ رہی ہے کہ اُن کا کام باطل اور بے اثر رہے۔لہٰذا انبیاء کی ذات اور ارادے کی برتری اور اسی طرح اُن کی کامیابی اور جادوگروں کی ناکامی سے متعلق خُدا کا حکیمانہ ارادہ ہی انبیاء کی کامیابی اور جادوگروں کی شکست کی وجہ ہے۔

(۲۳) اثبات نبوت کی راہیں

حصہ سوم

انبیاء کی پہچان کی دو اور راہیں

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ (صف۔۶)

۲۔ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ (طٰه۔۲۹تا ۳۲)

۳۔ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ (طٰه۔۳۶)

۴۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ (مریم۔۵۳)

۵۔ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ (النمل۔۳۵)

۶۔ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ (نمل۔۳۶)

تفسیر۔

بعض اوقات یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سچے اور جھوٹے انبیاء میں امتیاز صرف معجزہ ہی ہے جب کہ حقیقت ایسے نہیں ہے بلکہ معجزہ تو ایک عمومی راہ ہے جس سے تمام افراد فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ دو اور راستے بھی ہیں جن کے ذریعے سے نبوت کے دعوی کی سچائی کو

پرکھا جاسکتا ہے۔

ان میں سے ایک راستہ قرآنی بنیاد کا حامل ہے جب کہ دوسری راہ وہ ہے جس پر عقلائے عالم اپنے فیصلوں میں اعتماد کرتے ہوئے حق وباطل کو ایک دوسرے سے جُدا کرتے ہیں۔ البتہ قرآن نے بھی اسے ایک خاص طریقے سے بیان کیا ہے جس کی وضاحت آگے آئے گی۔

ا۔ گذشتہ نبی کی نص

جب ایک شخص نبوت قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت ہوجائے اور وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی خصوصیات اور علامات بیان کردے اور وہ خصوصیات بعد میں آنے والے شخص پر پوری طرح صادق بھی آتی ہوں تو اس طریقے سے بعد والے نبی پر نص اور اُس کی ذات کا تعارف یا اس کی علامات وخصوصیات بیان کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا تقاضا نبوت اور مقصد نبوت کررہا ہے تاکہ حقیقت پسند افراد کے انبیاء کی طرف آنے کی راہ ہر طرح سے ہموار ہو جس کے نتیجے میں بعثت کا مقصد پورا ہوگا۔ چنانچہ آئمہ معصومین کی زندگی میں بھی یہ بات واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ پہلے والے امام اپنے بعد والے امام کو کبھی ایک خاص طریقے سے متعارف کرواتے اور کبھی اُس کی علامات اور نشانیاں بیان کردیتے۔ قطعی طور پر یہ طریقہ انبیاء کے پیش نظر بھی رہا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں خود قرآنی صراحت اس بات کی تائید کرتی ہے۔ اگرچہ تاریخ میں تحریف ہونے کے باعث تمام انبیاء سے متعلق یہ بات ہمیں نہ مل سکے۔

مسلمان اس بات کے دعویدار ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ نے اپنے بعد آنے والے نبی کو ''احمد'' کے نام سے متعارف کروایا ہے۔ قرآن نے یہ حقیقت مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

''اُس وقت کو یاد کرو جب عیسٰی بن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا: میں خُدا کی جانب سے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں۔ اُس تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوں اس نبی کی جو میرے بعد آنے والا ہے اُس کا نام ''احمد'' ہے۔ (صف۔٦)

حضرت عیسٰی نے اس گفتگو میں بعد میں آنے والے نبی کا تعارف کروایا ہے جس کا نام تک بھی بیان کیا ہے۔ جب یہ نص کسی شخص پر بغیر کسی شک وتردید کے منطبق ہو تو پھر تمام لوگوں پر حجت تمام ہوجاتی ہے۔ اُن کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اُسے اپنے زمانے اور دور کے پیغمبر کے طور پر تسلیم کرلیں۔

مذکورہ آیت نے حضرت عیسٰی کی صراحت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے وقت انجیل موجود تھی لہٰذا قرآن نے تفصیل بیان نہیں کی۔ لیکن انجیل یوحنا'' فصل (۱۴، ۱۵، ۱۶) کی طرف رجوع کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کا نام ذکر

کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی دوسری خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ اُن خصوصیات کے پیغمبر اسلام پر پوری طرح صادق آنے کے پیش نظر اس نص کی اس مورد پر تطبیق میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا۔

چونکہ ہماری بحث نبوت عامہ میں کلی انداز سے ہے لہٰذا اس سلسلے میں ہم اس سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے۔ اس کی تفصیل ''نبوت خاصہ'' کی بحث میں آئے گی۔

آخر میں ایک اور نکتہ بیان کرتے چلیں وہ یہ کہ اگر حضرت عیسیٰ نے پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی صراحت کی ہے۔ تو حضرت موسیٰ نے بھی اپنے زمانے کے نبی کا تعارف کروایا ہے۔ انہوں نے خُدا سے یہ درخواست کی کہ اُن کے بھائی ہارون کو نبوت کے معاملے میں اُن کا شریک کار بنا یا جائے۔ انہوں نے یہ کہا:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾

''میرے رشتہ داروں میں سے میرے لیے مددگار قرار دے یعنی میرے بھائی ہارون کو۔ اس کے ذریعے سے میری کمر مضبوط کردے اور اُسے میرے تبلیغ کے کام میں شریک کردے۔ (طٰہٰ۔ ۲۹ تا ۳۲)

خُدا نے ان کی درخواست قبول کی اور ہارون کی نبوت کا اعلان بھی خود حضرت موسیٰ کے ذریعے کرایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾

''اے موسیٰ: تم نے جو درخواست کی ہم نے اُسے قبول کیا۔'' (طٰہٰ۔ ۳۶)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾

''اپنی رحمت کے ذریعے ہم نے موسیٰ کی مدد کے لیے اُس کے بھائی ہارون کو نبوت عطا کی۔'' (مریم۔ ۵۳)

یہاں ایک نکتے کا بیان ناگزیر ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ نبی کی تصریح اور اس کی باتوں کا انطباق بعد میں آنے والے نبی پر اس حد تک واضح اور روشن ہو کہ حق جو افراد کے لیے کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔

لہٰذا کبھی یہ جو دیکھا جاتا ہے کہ استعمار کے ایجنٹ تحریف اور جھوٹ کے ذریعے بہت سی آیات کو باب و بہار جیسے بعض افراد پر منطبق کرتے ہیں تو مسلمان ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں دے۔ ہم نبوت خاصہ کی بحث میں اُن کی تحریفات کی طرف کچھ اشارہ کریں گے۔

۲۔قرائن اور شواہد کی جمع آوری

سچے نبی اور جھوٹی نبوت کے دعویدار شخص کے مابین فرق پیدا کرنے والی تیسری راہ یہ ہے کہ انسان قرائن اور شواہد کی جمع آوری سے نتیجے تک پہنچے تو نبوت کے مدعی شخص کی زندگی اور اُس کے پروگرام کو دیکھ کر حقیقت معلوم کرسکتا ہے۔ یہ قرائن کبھی مثبت نتیجہ بخشتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ مدعی سچا ہے، اور کبھی ان کا نتیجہ منفی ہوتا ہے اور اُس شخص کے دعوٰی کی تکذیب کرتے ہیں۔

اس زمانے میں دُنیا کی عدالتوں میں مجرم اور بے گناہ شخص کے مابین فرق کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔فرض کریں ایک قتل ہوا ہے۔F.i.R درج ہوجاتی ہے۔ چندلوگوں کو پکڑ لیا جاتا ہے۔تفتیش کے ماہرین تفتیش کے مختلف طریقوں سے مجرم اور بے گناہ کو ایک دوسرے سے جُدا کرسکتے ہیں۔مثلاً اگر کوئی پیغمبرؐ اسلام سے متعلق قرائن اور شواہد کی جمع آوری کرنا چاہے تو اسے مندرجہ ذیل موضوعات پر تحقیق کرنا چاہیے۔

۱۔بعثت سے پہلے آپؐ کی زندگی کا مطالعہ یہ کہ آیا اس عمر میں وہ پاک و پاکیزہ انسان تھے یا گنہگار؟

۲۔اس معاشرے کا مطالعہ جس میں وہ بھیجے گئے ہیں۔آیا یہ ایک علمی اور متمدن معاشرہ تھا یا یہ کہ علم ودانش سے دور ایک معاشرہ؟ اگر دوسری صورت، حال تھی تو جو کتاب قرآن وہ لایا ہے وہ اُس کے علمی معاشرے کی پیداوار نہیں ہوسکتی۔اگر وہ کسی علمی اور پڑھے لکھے معاشرے میں آتے تو ان کی تعلیمات اور پروگرام پر اُس معاشرے کے اثرات ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا۔

۳۔اگر ان کے دین کے مطالب اصول وفروغ میں بہت بلند درجے کے ہوں تو یہ اس بات کی شہادت ہوں گے کہ اس دین کے لانے والا غیب سے مدد حاصل کر رہا ہے۔چنانچہ اگر خُدا خدا کی صفات اور فوجی سیاسی اور قانونی مسائل سے متعلق وہ بے بنیاد اور کمزور نظریات پیش کریں اور اخلاقی مسائل کے بیان اور خدا داد نعمتوں سے استفادہ کرنے میں وہ شہوت پرست لوگوں کے ہم فکر ہوں تو اس صورت میں ان کے پروگرام کو ایک الٰہی مکتب اور عقیدہ سمجھا جاسکتا۔

۴۔تبلیغ کی راہ میں ان کے اثبات قدم اور اپنے مقصد کی راہ میں اپنی جان ومال تک کے فدا کرنے کے جذبے سے ان کے خلوص کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہ بخوبی واضح کرتا ہے کہ شریعت کی تبلیغ کسی مادی مقصد کے حصول کے پیش نظر نہ تھی۔

۵۔اپنے دین کو آگے بڑھانے کے لیے آپؐ نے جو ذرائع استعمال کیے ہیں (اس سے بھی آپ کی حقانیت کا پتہ مل سکتا ہے) کیا دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت وہ جنگ کے اخلاقی اصولوں کی پاسداری کرتے تھے یا یہ کہ اپنے مقصد تک پہنچے کے لیے وہ ہر ذریعہ بروئے کار لے آتے تھے۔اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کے غزوات اور ان کے تبلیغی پروگرام کا جائزہ ہماری راہنمائی کرسکتا ہے

۶۔اُس کے ساتھیوں اور پیروکاروں کا اخلاقی اور روحانی کردار اس مدعی نبوت کے کردار کی عکاسی کرسکتا ہے۔کیونکہ انسان اگرچہ چھپ کر بھی کوئی کام کرے پھر بھی وہ اپنی زندگی کی خصوصیات کو اپنے پہلے درجے کے ساتھیوں رشتہ داروں اور ارادت مندوں سے نہیں چھپا سکتا۔لہٰذا اگر اُس کے پیروکار فکری اور روحانی اعتبار سے بہت بلند مرتبے کے حامل تھے تو اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ نبوت کا دعویدار وہ شخص بھی ایک عظیم المرتبت اور پاکیزہ انسان تھا۔

۷۔اس کے پروگرام میں تناقص اور متضاد باتوں کا نہ ہونا بھی اس بات کی نشاں دہی کرتا ہے کہ اُس کا پروگرام خُدا کے زیرِ نظر ہے وگرنہ ایک معمولی اور خطا کار انسان تو روزانہ ایک اور ہی راگ الا پتا ہے۔وہ ہمیشہ تناقص گوئی کرتا ہے۔لیکن اپنے مقصد اور ہدف کے بیان کے سلسلے میں اس کی بات کا ایک ہونا چاہیے، وہ قوی ہو چاہے کمزور، اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ صدق وصفا کا حامل ہے۔مثلاً پیغمبرِ اکرمؐ نے پہلے دن جب کہ اُن کا صرف ایک پیروکار تھا اپنے آپ کو خُدا کے بندے اور رسول کے طور پر متعارف کروایا اور جس دن وہ پورے عرب پر حاکم تھے پھر بھی انہوں نے اسی بات کا اعادہ کیا اور کہا:

"انی عبد اللہ ورسولہ"

یہ چند ایک شواہد تھے جنہیں بطور نمونہ بیان کیا ہے۔قرائن اور شواہد صرف یہی نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت زیادہ ہیں۔ہم قرآنی نکتہ نظر سے پیغمبر اسلام کی نبوت سے متعلقہ بحث میں ان قرائن کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلے جس شخص نے یہ راہ اختیار کی وہ روم کا بادشاہ قیصر تھا۔جب اُسے رسول اسلامؐ کا خط مال تو اُس نے پیغمبر اسلام کی شناخت اور پہچان کے لیے آپؐ کے کچھ قریبیوں کو جو شام میں تجارت کی غرض سے آئے ہُوئے تھے اپنے دربار میں بُلایا۔پھر سات سوالات اُن کے سامنے رکھ کے نتیجے تک پہنچ گیا۔ہم یہ واقعہ تفصیلاً آگے بیان کریں گے۔[۱]

قرآن کریم پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ راستہ ایک طویل سابقے کا حامل ہے کیونکہ جب حضرت سلیمان کا خط بلقیس کے پاس پہنچا تو اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں سلیمان کے لیے ہدیہ اور تحفہ بھیجتی ہوں اور اُس کے ردِ عمل کا انتظار کرتی ہوں ۔چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

میں سلیمان کو تحفہ بھیجتی ہوں تاکہ دیکھوں کہ میرے نمائندے اُس کے پاس سے کیا جواب لے کر آتے ہیں؟ (نمل۔۳۵)

اُس نے یہ سوچا تھا کہ سلیمان ایک بادشاہ ہے اور دنیوی مقاصد رکھتا ہے۔لہٰذا اُسے لالچ کے ذریعے سے چپ کرایا جا سکتا ہے ۔لیکن جب اُس کے بھیجے ہوئے حضرت سلیمان کے پاس پہنچے اور انہوں نے وہ تحفے آپ کی خدمت میں پیش کیے تو انہیں ان کی سختی کا سامنا کرنا پڑا۔حضرت سلیمان نے کہا کیا، تم اپنے خیال میں) میری مدد دنیا کے مال کے ساتھ کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ مجھے خدا نے عطا کیا ہے یہ اُس سے کہیں بڑھ کے ہے جو تم لائے ہو۔یہ تو تم ہو جو مال دنیا کے ساتھ خوش ہو جاتے ہ[۲] و:

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۹

[۲] فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ (نمل۔۳۶)

انبیاء اور خُدا کے بندوں کا جواب اسی طرح ہوتا ہے جبکہ اہل دنیا تو ایسے مواقع پر کچھ لو کچھ دو کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ امر باعث افسوس ہے کہ یہ طریقہ اسلامی متکلمین کے درمیان رائج نہیں ہے۔ وہ اس سے بہت کم استفادہ کرتے ہیں۔ صرف دو افراد کا نام لیا جاسکتا ہے جنھوں نے اس راہ پر چلنے کو دوبارہ رواج بخشا ہے۔

۱۔ ''میزان الموازین فی امر الدین'' کے مصنف مولوی نجف علی تبریزی جو شیعہ عالم کے طور پر استنبول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں جو کہ ۱۲۸۸ھ ق میں شائع ہوئی ہے اس طریقے سے استفادہ کیا ہے۔ صفحہ ۲۳۱ سے ۲۳۴ تک انہوں نے اسی بات کو بیان کیا ہے

۲۔ کتاب ''الوحی االحمدی'' کے مؤلف سید محمد رشید رضا نے اس کتاب میں پیغمبر اسلام کی حقانیت سے متعلق قرائن و شواہد کی جمع آوری میں کوئی وقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا۔ جہاں تک ہمیں فرصت ملی ہے ہم نے بھی اپنی کتاب ''الالہیات'' میں اس سلسلے میں کچھ باتیں بیان کی ہیں اور شواہد و قرائن کی جمع آوری سے نتیجہ لیا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم نے بیان ہے کہ یہ آخری دو راہیں عمومی اور سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں بلکہ صرف محقق اور مفکر لوگ ہی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لہٰذا خُدا کی رحمت نے بندوں کے اختیار میں یہ تین راستے دیے ہیں۔ ہر شخص اپنی استعداد اور لیاقت کے مطابق ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(۲۴) انبیاء اور ایفائے رسالت

(۱) دعوت انبیاء کی اساس

زیر بحث آیات

۱۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (بقرۃ۔۸۰)

۲۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ (یوسف۔۸۷)

۳۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ (بقرۃ۔۲۱۳)

۴۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ
الرُّسُلِ ؕ (نساء۔۱۶۵)

۵۔ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا
وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ (ھود۔۵۲)

۶۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ (اعراف۔۹۶)

۷۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ
مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ
اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ (نوح۔۱۰تا۱۲)

۸۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾
(شوریٰ۔۳۰)

۹۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝ (انفال۔۲۵)

۱۰۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط
(نساء۔۷۹)

۱۱۔ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ
قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ط وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ۝ (هود۔۸۹)

۱۲۔ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ط (قصص۔۳۲)

۱۳۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۝ (فاطر۔۲۴)

۱۴۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ۝ (شعراء۔۲۰۸)

۱۵۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ (رعد۔۸)

۱۶۔ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ص وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۝ (ملک۔۲۶)

۱۷۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ز اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۝ (هود۔۲۵)

۱۸۔ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ط قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۝ (اعراف۔۱۰۵)

۱۹۔ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ج جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ (فاطر۔۲۵)

۲۰۔ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ
عِنْدِهٖ (هود۔۲۸)

۲۱۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْمِيْزَانَ (حدید۔۲۵)

۲۲۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ج قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ

الْاٰفِلِيْنَ۝ (انعام۔۷۶)

۲۳۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ۝ (انعام۔۷۷)

۲۴۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝ (انعام۔۷۸)

۲۵۔ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ (انبیاء۔۶۶،۶۷)

۲۶۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ۝ (یٰس۔۷۹)

۲۷۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ (نحل۔۱۲۵)

تفسیر

انبیاء کی دعوت کی اساس وبنیاد دو باتیں ہیں:

ا۔ بشارت وانداز (خوش خبری دینا اور ڈرانا)

۲۔ حجت و بُرہان ان کی بُرہان کبھی تو خارق عادت کام معجزہ ہوتی ہے اور کبھی دلیل واستدلال اگر ہم ان دونوں باتوں کو ایک مختصری عبارت میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یوں ہوگی کہ وہ اندرونی اور بیرونی دوعوامل سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بیرونی عوامل تو آخرت سے متعلق وعدے اور وعید تھے جو افراد کو اپنی ذمہ داری اور فرائض پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار کرتے تھے

۔اندرونی عوامل: وہ واضح اور محکم دلائل تھے جو فکروں اور عقل کو نورانیت عطا کرتے تھے۔البتہ جہاد کا عامل اور آئین توحید کی ترویج کے لیے اس کا کردار ایک الگ بحث ہے جسے ہم بعد میں بیان کریں گے۔

پہلا عامل

بیرونی عامل۔ بشارت ونذارت

تربیتی اصولوں کے مطابق ایک انسان کی تربیت کے لیے سب سے خطرناک طریقہ یہ ہے کہ صرف اُمید یا صرف ڈرانے سے کام لیا جائے۔ جو تربیت ایک عامل پر استوار ہوگی وہ یا تو طغیان وسرکشی کا باعث بنے گی یا مایوسی وناامیدی کا۔ حد سے زیادہ اُمید انسان کو سہل پسند دیتی ہے، بلکہ ممکن ہے زیرتربیت فرد اپنی ذمہ داری بھی پوری نہ کرے۔ اولاد بنی اسرائیل نے حد سے بڑھی ہُوئی اُمید کی وجہ سے طغیان اور سرکشی کی راہ اختیار کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو خُدا کی پسندیدہ قوم قرار دیا ہُوا تھا۔ خُدا کی بخشش کی اُمید پر وہ ہر قسم کے گناہ کا ارتکاب کر ڈالتے اُن کا نعرہ یہ تھا:

لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً ؕ

''جہنم کی آگ ہمیں صرف چند دنوں کے لیے ہی جلائے گی۔'' (بقرۃ۔۸۰)

اسی طرح صرف ڈرانا بھی کارساز نہیں ہے کیونکہ یہ بھی بعض اوقات مایوسی اور نااُمیدی کا باعث بنتا ہے اسی لیے خُدا کی رحمت سے مایوس ہونے کو کافروں کی خصوصیات قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۷﴾

''خُدا کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔'' (یوسف۔۸۷)

اسی وجہ سے آج کے تربیتی پروگراموں میں دونوں عوامل میں لائے جاتے ہیں یہ ایک دوسرے کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ مثلاً اگر ترقی یافتہ معاشروں میں زندان، جلاوطنی، قید بامشقت اور آخرکار پھانسی جیسی سزائیں ہیں تو وہاں پر معاشرے کے خدمت گذار لوگوں کی تشویق ،تعریف اوران کے مقام کی عظمت کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ انبیاء کے تربیتی پروگرام میں بھی بشارت وانذار اور اُمید وخوف دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ انبیاء کا تعارف یُوں کرایا گیا ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ ۪

''خُدا نے انبیاء مبعوث کیے جو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے۔'' (بقرۃ۔۲۱۳)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ

خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے تا کہ لوگوں کی خُدا پر کوئی حجت نہ رہے۔ (تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہوجائے۔) (نساء۔ ۱۶۵)

یہی مفہوم سورہ انعام آیت ۴۸ اور کہف آیت ۵۶ میں بھی آیا ہے۔ ان آیات میں اُمید اور ڈرانے کو عمومی اور کلی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری آیات میں یہ کلیات ایک جزئی انداز اختیار کرگئی ہیں۔ ان جزئی خوش خبریوں اور ڈرانے کی فہرست یُوں ترتیب دی جاسکتی ہے:

۱۔ دنیاوی نعمات کی خوش خبری

۲۔ دنیاوی سزاؤں سے ڈرانا

۳۔ اخروی نعمات کی خوش خبری

۴۔ آخرت کے عذاب سے ڈرانا

انبیائے الٰہی کی خوش خبریوں اور ڈرانے کا مجموعی انداز انہی چار باتوں کے گرد گھومتا ہے جو آیات ان چاروں موضوعات سے متعلق ہیں ہم اُن کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ دنیوی نعمتوں کی بشارت

قرآنی نکتہ نظر سے خُدا پر ایمان اور تقوی اس عالم کائنات میں مؤثر ہے۔ اس کی تشریح یوں ہے کہ ایک مادی شخص انسان کے عمل کو اس جہان خلقت سے علیحدہ اور کٹا ہُوا سمجھتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ انسانی کردار صرف جہان آفرینش سے متاثر ہوتا ہے لیکن عالم آفرینش اور بالخصوص دور والے جہانوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑتا جب کہ ایک الٰہی انسان اور بالخصوص قرآن کا پیروکار ان دونوں کے درمیان رابطے کو اس سے کہیں بڑھ کے سمجھتا ہے کہ صرف انسان ہی جہان خارج پر یک طرفہ طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر انسان خدا کی نعمات جیسے روشنی، پانی اور دوسری طبیعی نعمات سے استفادہ کرتا ہے تو اسی طرح اُس کے کردار و اعمال بھی اس صفحہ گیتی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جہان آفرینش اُس کی روش زندگی سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ یہ ایک حسیّ رابطہ نہیں ہے کہ جسے لیبارٹری میں دیکھا جاسکے بلکہ یہ رابطہ تو جہان غیب سے بیان ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے: اے انسان! تیرا ایمان اور کفر بارش برسنے یا نہ برسنے اور نعمت کی کمی یا فراوانی پر اثر رکھتا ہے۔

اسی بنیاد پر انبیاء نے دنیوی نعمتوں کے اضافے کی بشارت دینے کو اپنے ایک تبلیغی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا تقویٰ اور پاک دامنی رحمت الٰہی کے نزول کا باعث بنتے ہیں: اس سلسلے کی چند آیات ملاحظہ کریں:

۱۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا:

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا

وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اے لوگوں خُدا سے مغفرت طلب کرو پھر تم اُسکی جانب لوٹ آوٴ۔ وہ تمہاری طرف برسنے والے بادل بھیجے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ کردے گا۔ مجرم بن کر خُدا سے منہ نہ موڑو۔'' (ھود۔ ۵۲)

۲۔ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾

اگر آبادی اور شہروں کے لوگ ایمان لاتے اور گناہ سے بچتے تو ہم اُن پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے انبیائے الٰہی کو جھٹلایا اور ہم نے اُن کے اعمال کے مطابق اُن کا مواخذہ کیا۔ (اعراف۔ ۹۶)

۳۔ خُدا حضرت نوح کی زبانی یوں نقل کرتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾

نوح کہتے ہیں: خُدایا! میں نے لوگوں سے کہا: خُدا سے مغفرت طلب کرو اور گناہ بخشنے والا ہے (اس صورت میں خُدا) بارش برسانے والے بادل تمہاری طرف بھیجے گا اور مال اور اولاد کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا، باغات اور نہریں تمہارے اختیار میں دے گا۔ (نوح۔ ۱۰ تا ۱۲)

یہ تینوں آیات اور دوسری آیات انسان کے ہر کام کو چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا اس کائنات میں موٴثر قرار دیتی ہیں۔ گویا جہان خلقت ایک زندہ موجود ہے جو دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور انسانی کاموں سے متاثر ہوتا ہے، اُن پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے، انبیاء انسان کو اس طرح کے بُرے اور اچھے نتائج کی طرف متوجہ کرنے سے جو خواہ ناخواہ اُسے دامن گیر ہوتے ہیں اُسے ایمان، تقوی اور نیک اعمال کی طرف بُلاتے ہیں۔

۲۔ دنیوی عذاب

گذشتہ آیات سے یہ معلوم ہُوا کہ نہ فقط یہ کہ انسان کے نیک کام رحمت الٰہی کے نزول کا باعث بنتے ہیں بلکہ اُس کے بُرے کام بھی جہان آفرینش پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بھی کئی نتائج رکھتے ہیں۔ اس سلسلے سے متعلق آیات ملاحظہ کریں:

دنیوی عذاب سے متعلق آیات دو طرح کی ہیں۔

الف۔وہ آیات جو کلی انداز میں یہ بتاتی ہیں کہ انسان کے بُرے اعمال اس دُنیا میں ناگوار نتائج کا باعث بنتے ہیں۔اس دُنیا میں انسان کو جو تکلیف اور رنج بھی پہنچتے ہیں یہ اُس کے عمل کا نتیجہ ہی ہیں۔

ب۔وہ آیات ہیں جو ان لوگوں پر خُدا کے عذاب کے نازل ہونے کی بات کرتی ہیں جنہوں نے اپنے انبیاء کی مخالفت کی اور ان کی رسالت کو جھٹلایا۔

اس سلسلے کی عمومی اور کلی آیات یہ ہیں:

(ا) دنیوی عذاب سے عمومی انذار

اس سلسلے کی آیات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں یہاں بیان کیا جائے۔نمونے کے طور پر صرف چند ایک آیات ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

ا۔وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ﴿۳۰﴾

تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔وہ بہت سے بُرے کاموں سے در گزر کرجاتا ہے۔(شوریٰ۔۳۰)

ب۔وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اُن عذابوں سے بچو جو صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچیں گے اور جان لو کہ خُدا کا عذاب شدید ہے ۔(انفال۔۲۵)

یہ عذاب جو مجرم اور غیر مجرم دونوں پر نازل ہوگا قطعاً یہ صرف دنیوی عذاب ہے جس میں خشک و تر دونوں جل جائیں گے۔ورنہ آخرت کا عذاب تو ہر ایک کو اپنا اپنا ملے گا۔بہرحال یہ ایک دنیوی عذاب اور ایک معاشرے کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ج۔مَآ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ

اگر دنیا کی زندگی میں تمہیں کوئی نیکی پہنچے تو یہ خُدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچے تو یہ تمہارے اپنے کاموں کا نتیجہ ہے۔(نساء۔۷۹)

بعض وہ آیات جو دنیوی نعمات کو بیان کر رہی ہیں وہ بھی ایک لحاظ سے اس موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

خاص دنیوی عذابوں کے ذریعے ڈرانا

انبیاء ہمیشہ لوگوں کو اُن دنیوی عذابوں سے ڈراتے رہے جو گنہگاروں پر نازل ہوتے ہیں۔لیکن باعث تاسف ہے کہ اُن میں سے بہت سے لوگ گناہوں میں غرق آلودہ ہونے کی وجہ سے اس انذار کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے اور ہمیشہ یہ کہتے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنے اس انذار کو عملی جامہ پہناؤ۔قوم نوح،قوم صالح،قوم شعیب اور قوم فرعون کی ہلاکت سے متعلق نازل ہونے والی آیات ہماری بات کی تائید کرتی ہیں۔ہم چونکہ ان آیات سے متعلق گفتگو قرآنی نکتہ نظر سے انبیا کی زندگی پر بات کرتے ہوئے کریں گے لہٰذا یہاں اُن کی تفسیر بیان نہیں کرتے ہیں ۔صرف نمونے کے طور پر حضرت شعیب کی اپنی قوم سے گفتگو کو ذکر کرتے ہیں:

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾

اے میری قوم میری مخالفت تمہیں (ایسا) مجرم نہ بنادے کہ تمہیں وہی (عذاب) پہنچے جیسا کہ نوح کی قوم ، یا ہود کی قوم، یا صالح کی قوم کو پہنچا تھا اور لوط کی قوم تم سے دور نہیں۔(هود۔۸۹)

اب ہم دو اور تبلیغی وسیلوں یعنی آخرت کی نعمات کی خوش خبری اور آخرت کے عذاب سے ڈرانے کی بحث کرتے ہیں۔

۳۔اخروی خوف ورجاء

ابنیاء اپنی تبلیغ رسالت میں جن دو اور ذرائع سے کام لیتے تھے وہ آخرت کے متعلق ڈرانا اور خوش خبری دینا ہے۔یہ دونوں باتیں گذشتہ دونوں باتوں کی نسبت زیادہ مورد توجہ رہی ہیں وہ اپنے دین کی دعوت دینے کے سلسلے میں ہمیشہ لوگوں کو بشارت سناتے رہے ہیں کہ نیک اور مومن لوگ آخرت میں بہشت میں داخل ہوں گے۔جہاں وہ خُدا کی نعمات سے بہرہ ور ہوں گے۔اسی طرح انہیں اس بات سے ڈراتے رہے ہیں کہ خُدا کے دین کی مخالفت ایک بُرے نتیجے کا باعث بنتی ہے کہ جو آتش دوزخ میں جلنا ہے۔

لہٰذا بہشت اور دوزخ سے متعلق آیات بلکہ برزخ میں شہدا کی زندگی اور گنہگاروں کے معذب ہونے سے متعلق آیات بھی انذار اور بشارت کا ایک ذریعہ رہی ہیں۔چونکہ اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں اور اکثر قارئین بھی اُن سے آگاہ ہیں لہٰذا دامن سخن ہم یہاں سمیٹ لیتے ہیں۔لیکن یہ بات یاد کراتے چلیں کہ آخرت کی نعمات اور عذاب صرف جسمانی نعمات اور عذاب نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ معنوی نعمات اور عذاب بھی ہیں۔ہم نے معاد سے متعلق اس سلسلے کی تفسیری ابحاث (منشور جاوید) میں ان سے متعلق گفتگو کی ہے۔

اس بحث کے اختتام پر یہ بات بتاتے چلیں کہ اگرچہ انبیا اپنی رسالت کے ابلاغ کے لیے ان دونوں ذرائع کو استعمال میں لاتے تھے لیکن انذار بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔قرآنی آیات کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جہاں پر بھی

بشارت دی گئی ہے۔ وہاں انذار بھی کیا گیا ہے لیکن بعض موارد ایسے ہیں جہاں صرف انذار کی بات ہے۔ بعض آیات نے انبیاء کو ''منذر'' اور ''نذیر'' کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ ان آیات کا نمونہ ملاحظہ ہو:

۱۔ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾ (فاطر۔ ۲۴)

۲۔ وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴿۲۰۸﴾ (شعراء۔ ۲۰۸) [1]

قرآنی نکتہ نظر سے انذار اور ڈرانے کی اہمیت اس درجے کی ہے کہ بہت سی آیات میں آخری پیغمبر کی ذمہ داری فقط انذار قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ

تم فقط ڈرانے والے ہو۔ (رعد۔ ۷)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۶﴾

کہہ دیجئے کہ علم صرف خدا کے پاس ہے اور میں تو فقط ڈرانے والا ہوں۔ [2] (ملک۔ ۲۶)

نیز حضرت نوح جو کہ سب سے پہلے صاحب شریعت نبی تھے اُن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ اِنِّىۡ لَكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۵﴾

''نوح کو ہم نے اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔ (نوح نے اپنی قوم سے کہا) میں تمہارے لیے واضح ڈرانے والا ہوں'' (ھود۔ ۲۵)

سورۂ نوح آیت ۲ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

البتہ حصر (کہ اے پیغمبر تم صرف ڈرانے والے ہو) قطعاً حصر اضافی ہے یعنی اجبار کے مقابل تم صرف ڈرانے والے ہو نہ یہ کہ پیغمبر کا کام صرف ڈرانا ہی ہو۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے انبیاء کا کام ڈرانا اور بشارت دینا دونوں طرح ہے اگرچہ آیات نے بشارت کی نسبت انذار پر زیادہ تاکید کی ہے۔

---

[1] اس طرح (صافات۔ ۷۲)۔ (سباء۔ ۳۴) اور (زخرف۔ ۲۳) کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کی طرف رجوع کیا جائے (اعراف، ۱۸۴)، (ہود۔ ۱۲)، (حجر۔ ۸۹)، (حج۔ ۴۹)، (شعراء۔ ۱۱۵)، (عنکبوت۔ ۵۰)، (سبا۔ ۴۶)، (فاطر۔ ۲۳)، (ص۔ ۷۰)، (احقاف۔ ۹)، (ذاریات۔ ۵۰، ۵۱)، (فرقان۔ ۱)، (ص۔ ۶۵)، (شعراء۔ ۱۹۴)، (نمل۔ ۹۲) البتہ یہ آیات سے زیادہ ہیں انذار اور بشارت کو باہم ذکر کیا گیا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عام انسانوں پر ڈرانا خوش خبری سنانے کی نسبت زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

دوسرا عامل

دلیل کی بنیاد پر دعوت

انبیا کا ایک اور تبلیغی وسیلہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو گفتگو اور دلیل و بُرھان کے ذریعے سے اپنے دین کی طرف بلاتے تھے۔ انبیاء کی دعوت کے دائرکار میں آنے والے لوگوں میں عاقل، دانا اور حقیقت بین افراد ہوتے تھے۔

البتہ آیات اُن آیات سے زیادہ ہیں جن میں انذار اور بشارت کو باہم ذکر کیا گیا ہے۔

اُن کی فطرت اور عقل سے مدد لے کر ان کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتے۔

یہاں انبیاء لوگوں کی استعداد اور لیاقت کے مطابق دلیل و بُرھان لاتے۔ ان میں سے بعض دلائل تو کلی ہوتے یعنی جو اجمالی طور پر یہ ثابت کرتے کہ نبوت کا دعویدار شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے بعض جزئی ہوتے یعنی ایک خاص قاعدہ اور قانون جو وہ بیان کرتے اُس کی استواری اور حقانیت پر دلیل و استدلال قائم کرتے۔

انبیا کے معجزات کلی اور اجمالی دلائل [1] تھے جو اکثر لوگوں کے لیے یقین کا باعث بنتے جب کہ عقلی اور فطری دلائل اور بعض خاص موارد پر خطابات بعض خاص لوگوں کے لیے کارساز ہوتے نہ کہ تمام کے لیے چونکہ معجزات سے متعلق تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے لہٰذا یہاں ہم دوسری قسم کے بارے میں مختصر طور پر بحث کرتے ہیں یعنی استدلال اور بُرھان کی بنیاد پر دعوت یہ بھی بتاتے چلیں کہ دونوں قسموں پر لفظ ''بینہ اور بینات'' حاوی ہے۔ قرآن نے جہاں بھی یہ کلمہ استعمال کیا ہے تو مُراد وہ چیزیں ہیں جو مدعا پر روشنی ڈالتی ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ بن عمران کی زبانی یوں بیان ہُوا:

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝۱۰۵

مجھ پر لازم ہے کہ خدا کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے رب کی جانب سے

---

[1] قرآن کریم معجزات کو آیات (نشانیاں) اور بینات (روشن کرنے والی چیزیں) کہنے کے ساتھ ساتھ ''بُرھان'' بھی کہتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ کے دو معجزوں (عصا اور ید بیضا) کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ... یہ دو معجزے تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اُس کے حواریوں کے لیے دو بُرھان ہیں۔ (قصص۔۲۲) یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کے معجزات ان کے دعویٰ پر ایک منطقی دلیل کی حیثیت رکھتے تھے نہ یہ کہ سادہ فکر لوگوں کے لیے صرف اقناعی دلیل ہوں۔ (قانع کنندہ دلیل)۔

روشن دلیل لیکر آیا ہوں۔ بنی اسرائیل کو آزاد کر دو اور میرے ساتھ بھیج دو۔ (اعراف۔ ۱۰۵)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ۚ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ

اگر تجھے جھٹلاتے ہیں تو تجھ سے پہلے والوں کو بھی یہ جھٹلا چکے ہیں ہمارے رسول اُن کی طرف روشن دلائل لے کر آتے رہے۔[1] (فاطر۔ ۲۵)

استدلال کے ساتھ دی جانے والی دعوت کے نمونے

حضرت نوح کے تبلیغ رسالت سے متعلق بہت سی آیات میں سے یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اُن کی دعوت دلیل و استدلال کے ساتھ ہوتی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ

اُس نے کہا اے لوگو: تم کیا کہوں گے اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل لے کر آؤں اور اُس نے اپنی طرف سے مجھے رحمت عطا کی ہو؟ (ھود۔ ۲۸)

سورہ نوح میں پہلی مرتبہ انسانی معاشرے میں انسانی عمل اور جہان آفرینش کے درمیان موجود رابطہ حضرت نوح کی زبانی بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ‏ ﴿۱۰﴾ يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ۙ‏ ﴿۱۱﴾ (نوح۔ ۱۰۔۱۱)

اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

حضرت ابراہیم اور رسالت کی دلیل

ابراہیم خلیل اللہ کے دور میں افکار و نظریات ترقی کر گئے تھے اور انسانی معاشرہ کچھ زیادہ لیاقت پیدا کر چکا تھا۔ بالخصوص وہ بابل کی متمدن قوم میں مبعوث کیے گئے جو علم اور ایک تمدن سے بہرہ مند تھے۔ لیکن یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان میں سے بعض تو چاند ستاروں کی پوجا کرتے اور بعض مٹی کے بتوں کی فکری لحاظ سے اُن کی استعداد اور لیاقت کے مطابق ابراہیم ایک مضبوط منطق کے ساتھ تبلیغی میدان میں نکلے

---

[1] نیز سورہ حدید آیت ۲۵ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۔جب انہوں نے یہ دیکھا کہ لوگ ستاروں، چاند اور سورج کی پُوجا کرتے ہیں اور انہیں اپنا رب اور پروردگار سمجھ رہے ہیں تو انہوں نے ان کو مخاطب کر کے کہا: یہ اجرام سماوی جنہیں تم کائنات اور انسان کا پروردگار سمجھ رہے ہو کبھی تو ہمارے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی ہم سے غائب ہو جاتے ہیں۔انسان کو چلانے والا اپنے زیر تدبیر وزیر تربیت افراد سے کیسے دور رہ سکتا ہے؟ انہوں نے ''افول'' کی خصوصیات سے یہ نتیجہ لیا کہ یہ چیزیں فیض کا سرچشمہ اور انسان وکائنات کے چلانے والی نہیں ہو سکتیں۔ایک ایسے خُدا کی طرف جائیں جو ''افول'' اور ''غیب'' نہیں ہوتا۔

ممکن ہے ابراہیم کی دلیل اجرام سماوی کی حرکت کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اجسام کی ایک طرح سے حرکت یہ بتاتی ہے کہ ان سے بالاتر ایک قدرت نے انہیں تسخیر کیا ہوا ہے وہی انہیں چلا رہی ہے۔خود تسخیر شدہ چیز کیسے انسان وکائنات کا رب اور پروردگار ہو سکتی ہے؟

چنانچہ بُرھان حرکت ممکن ہے اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ کوئی حرکت بھی ہدف کے بغیر نہیں ہے۔یہ اجرام فاقد کہاں تھے اور کمال کی جستجو میں ہیں۔جو موجود خود ناقص ہو اور کمال کی تلاش میں ہو وہ کیسے کرہ زمین پر بسنے والی طرح طرح کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار ہو سکتا ہے؟

بعید نہیں ہے کہ اس بُرھان کے تمام مراحل یہاں تک کہ وہ مراحل بھی جو ہم نے ذکر نہیں کیے ابراہیم کی مُراد ہوں اور انہوں نے ان سے استفادہ کیا ہو۔[1]

ابراہیم خلیل کی منطق بُرھان اور استدلال تھی۔جب اُن پر بُت توڑنے کے جُرم میں مقدمہ چلایا گیا تو انہوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:

اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ؕ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

کیا خُدا کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں؟ افسوس ہے تم پر اور اُن معبودوں پر (خُدا کے سوا) جن کی تم عبادت کرتے ہو۔تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟ (انبیاء۔٦٦۔٦٧)

سلسلہ انبیا کے ان دو عظیم راہنماؤں کے بیانات نمونے کے طور پر کافی ہیں۔یہاں دو اور نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے

ا۔کبھی انبیاء بُرھان کی بجائے ''جدل'' سے کام لیتے ہیں یعنی اُن قضایا اور مقدمات سے استفادہ کرتے ہیں جنہیں دوسری طرف والا شخص بھی مسلم اور قطعی سمجھتا ہے۔قرآن کریم ایک ایسے شخص کا ذکر کرتا ہے جو مُردوں کے زندہ ہونے کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ سے مخاصمہ کرتا تھا۔وہ بوسیدہ ہڈیاں دکھا کر تعجب آمیز اور مذاق اڑانے والے لہجے میں آنحضرت سے یہ کہتا:

ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟

خُدا نے آپؐ پر وحی نازل کی کہ اُسے جواب دیں:

---

[1] سورہ انعام آیات ٧٦ تا ٧٩ کی طرف رجوع کیا جائے۔

يُحۡيِيۡهَا الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ

جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ [1]

سیاق کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص خُدا پر اعتقاد رکھتا تھا اور یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ ہڈیاں خُدا کی پیدا کردہ ہیں۔اسی وجہ سے اُس کی قبول شدہ اس بات کو استدلال کی بنیاد بنا کر اُسے جواب دیا گیا اور ''معاذ'' کے بارے میں اُس سے مناظرہ کیا گیا۔

چونکہ جدل کا مقصد طرف مقابل کو بیدار کرنا ہے اور مطلب کے بیان کے لیے اُسے متوجہ کرنا ہی کافی ہے لہٰذا وہ اسی پر اکتفا کرتے تھے۔لیکن اس کے باوجود جدل کو بُرھان اور استدلال کے ساتھ بیان کرتے۔اسی وجہ سے آیت کے ذیل میں اور اس کے بعد والی آیات میں بُرھان و استدلال کا رنگ نمایاں ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِيۡمُ

یعنی اگر قیامت سے متعلّق اعتراض خُدا کے علم سے مربوط ہے تو جان لو کہ خُدا کا علم لامحدود ہے اور تمام چیزوں پر محیط ہے۔

۲۔چونکہ بعض لوگ بُرھان عقلی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں لہٰذا انبیاء وعظ ونصیحت سے کام لیتے ہوئے انہیں صراط مستقیم کی طرف بُلاتے ہیں۔یہ تمام کام ''مبینہ'' کے زمرے میں آتے ہیں جن آیات کا محور بشارت اور ڈرانا تھا اُن کا واضح مصداق بھی وعظ ونصیحت ہے جس کا انبیاء سہارا لیتے تھے۔یہ تینوں طریقے مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیے گئے ہیں:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ؕ

ان میں سے ہر ایک ایک ایسی دوا کے مانند ہے جسے اُس کے مقام پر کام میں لانا چاہیے۔(نحل۔۱۲۵)

---

[1] سورہ یٰس (۷۹ تا ۸۳) رجوع کیا جائے۔ان کی تفصیل ''معاذ'' کی بحث میں ملاحظہ کریں۔

(۲۵) انبیاء اور ادائے رسالت

(۲) تبلیغ کی راہ میں

زیر بحث آیات

۱۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ (انعام۔ ۳۴)

۲۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ (احقاف۔ ۳۵)

۳۔ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ (اعراف۔ ۱۲۸)

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ (اٰل عمران۔ ۲۰۰)

۵۔ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (اعراف۔ ۵۹)

۶۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (نحل۔ ۳۶)

۷۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ (طٰہٰ۔ ۴۷ تا ۴۸)

۸۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ (انبیاء۔ ۵۷)

۹۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (اٰل عمران۔ ۱۵۹)

۱۰۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (کافرون۔ ۱۔ ۲)

۱۱۔اِنِّیٓ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوٓا اَنِّیۡ بَرِیٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۵۴﴾ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِیۡ
جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾ (هود۔۵۴۔۵۵)
۱۲۔قَدِ افۡتَرَيۡنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِیۡ مِلَّتِكُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰٮنَا اللّٰهُ مِنۡهَا ؕ
وَمَا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ فِيۡهَاۤ (اعراف۔۸۹)
۱۳۔يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِیۡ وَتَذۡكِيۡرِیۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ
تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ
اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ (یونس۔۷۱)
۱۴۔وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدۡ هَدٰٮنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ
اٰذَيۡتُمُوۡنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ (ابراهیم۔۱۲)
۱۵۔وَمَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۸۰﴾
(شعراء۔۱۸۰)
۱۶۔اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡئَلُكُمۡ اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (یٰس۔۲۱)
۱۷۔قُلۡ مَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ ﴿۸۶﴾ (ص۔۸۶)
۱۸۔قُلۡ مَاۤ اَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۵۷﴾
(فرقان۔۵۷)
۱۹۔قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ (سبا۔۴۷)
۲۰۔يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ
النّٰصِحِيۡنَ ﴿۷۹﴾
(اعراف۔۷۹)
۲۱۔لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ۔۱۲۸)
۲۲۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ (زخرف۔۵۴)
۲۳۔ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ (اعراف۔۶۹)
۲۴۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ
وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ (شعراء۔۱۳۲تا۱۳۴)
۲۵۔ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ
مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا
فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ (اعراف۔۷۴)
۲۶۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ
اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ (مائدۃ۔۲۰)
۲۷۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا
اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ (مائدۃ۔۱۱)
۲۸۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ (بقرۃ۔۲۶۴)
۲۹۔ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ
قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ (ہود۔۸۹)
۳۰۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾
(انعام۔۱۱)
۳۱۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ (نحل۔۳۶)
۳۲۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ
وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۵﴾

(ابراھیم۔۵)

۳۳۔وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

(نحل۔۳۶)

۳۴۔وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ
اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ (زخرف۔۴۵)

۳۵۔اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ (آل عمران۔۱۹)

۳۶۔لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ (آل عمران۔۸۴)

۳۷۔اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

(طٰہٰ۔۹۴)

۳۸۔وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ (آل عمران۔۱۰۳ تا ۱۰۵)

۳۹۔وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ
وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ (انفال۔۴۶)

تفسیر۔

اگر زمین پر بسنے والے تمام انسان منطقی ہوتے اور باطل مقاصد سے مبرا ہوتے تو ان کی ہدایت کے لیے استدلال، وعظ و نصیحت اور انذار ہی کافی تھا۔ انبیاء اپنی تبلیغ کے لیے انہی چیزوں کو کام میں لاتے اور کسی چیز کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن لوگوں کی ایک قابل توجہ تعداد ایسی بھی تھی جو انبیاء کے استدلال سے شکست کھا جاتے لیکن اس کے باوجود وہ حق بات تسلیم نہ کرتے بلکہ الٹا وہ سنگ اندازی بھی کرتے اس لیے ضروری ہے کہ انبیاء ایک قوی روح و مستحکم ارادے اور صبر و استقامت کے پیکر ہوں تا کہ دشمنوں کی سازشوں کے سامنے اپنے آپ کو کمزور محسوس نہ کرتے ہوئے اپنی رسالت و ذمہ داری کو عملی جامہ پہنائیں۔ اب ضروری ہے قرآنی آیات کے نکتہ نظر سے تبلیغ کی راہ میں انبیاء کے روحانی خصائل اور خصوصیات کو زیر گفتگو لایا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ تبلیغ رسالت کے لیے اُن کا رویہ اپنے مخالفین اور معتقدین سے کیا تھا؟

ا۔ مشکلات میں صبر و استقامت

صبر و استقامت اس کے برعکس کہ آسمانی شریعتوں اور بالخصوص اسلام دشمن عناصر نے اس کا جو غلط معنی کیا ہے یہ ایک بہت اہم ہتھیار ہے جس سے مبلغین الٰہی اور ناصحین انسانیت کو لیس ہونا چاہیے۔ صبر کا یہ معنی کرنا کہ ظالم اور ستمگر کے مقابلے میں خاموشی اختیار کی جائے ایک باطل اور غلط معنی ہے۔ یہ باطل معانی اسے اس لیے پہنائے گئے ہیں تا کہ اس اخلاقی تکنیک کو لوگوں کی نظروں سے گرایا جائے حالانکہ صبر کی حقیقت تو استقامت اور رنج ہے جو انسان اپنے بلند اور عظیم مقاصد کے حصول کے لیے برداشت کرتا ہے۔ انسان ایک ایسے وسیلے کے بغیر اپنے بلند مقاصد تک نہیں پہنچ سکتا اسی لیے جہاد سے متعلق آیات میں ''صبر'' پر بہت تاکید کی گئی ہے۔ ایک مجاہد شخص صبر سے مدد لیے بغیر دشمن پر کامیابی حاصل کر سکتا۔ ایک کمزور ارادے اور کم استقامت والا سپاہی تو جنگ لے پہلے لمحات میں ہی فرار کو جم کر لڑنے پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنا مورچہ دشمن کے سپرد کر دیتا ہے۔ انبیاء ایفائے رسالت کے لیے کیسے صبر سے کام لیتے تھے یہ معلوم کرنے کے لیے آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں:

۱۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ

تجھ سے پہلے انبیاء جھٹلائے گئے۔ وہ دشمنوں کے جھٹلانے پر صبر و استقامت کرتے، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس آ پہنچتی۔ (انعام۔ ۳۴)

۲۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ

خُدا پیغمبر اسلامؐ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ اولوالعزم انبیاء کے مانند تبلیغ کے راستے میں صبر و استقامت کرو، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: (احقاف۔ ۳۵)

صبر کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید میں صرف پیغمبر اسلام کو انیس بار صبر کی اتلقین کی گئی ہے۔لہٰذا اس کی اہمیت غافل نہیں ہونا چاہیے۔

نہ صرف انبیاء صبر سے کام لیتے بلکہ اپنے پیروکاروں کو صبر اور حوصلے کی تلقین کرتے ۔حضرت موسیٰؑ بن عمران نے اپنے پیروکاروں سے واضح طور پر کہا کہ ''صبر سے مدد حاصل کرو''۔

اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ (اعراف۔۱۲۸)

اس بات کی واضح دلیل کہ صبر استقامت کے معنی میں ہے نہ کہ ظلم وستم قبول کرنے کے معنی میں یہ ہے کہ صبر کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں سرحدوں کی حفاظت کی بات کی گئی ہے جو استقامت اور پامردی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ

اے ایمان والو! ثابت قدم رہو اور مقابلے میں مضبوطی کرو اور لگے رہو۔(ال عمران ۔(۲۰۰)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٨٦﴾

اگر صبر کا مظاہرہ کرو اور تجاوز کرنے سے بچو تو یہ ان امور میں سے ہے جو محکم ارادے سے ہیں۔(ال عمران ۱۸۶۔)

اسی طرح دوسری آیات ہیں جو نبی کے اپنے پیروکاروں کو صبر کی تلقین سے متعلق ہیں۔

۲۔صراحت اور قاطعیّت

رہبران الٰہی کی ایک خصوصیات واضح اور دوٹوک بات کہنا ہے۔ یہ دونوں خصوصیات بشری راہنماؤں میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں ۔وہ اپنے اہداف و مقاصد کے اعلان کے بارے میں زیادہ تر امور کو خفیہ ہی رکھتے ہیں۔ وہ صراحت اور قاطعیت کو کامیابی کی راہ میں ایک رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ انبیاء اور خدا کے بھیجے ہوئے رہبروں کی سیاست کا ایک اصول گفتار میں صراحت اور قاطعیت ہے۔وہ واضح اور دوٹوک لفظوں میں اپنے الٰہی اہداف اور آسمانی پروگرام کو بیان کرتے ہیں۔ وہ مخالفین کے اعتراض سننے اور دشمنوں کے ردعمل کے لیے بالکل تیار رہتے ہیں۔

البتہ فوجی مسائل میں وہ پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جنگی منصوبے چھپانے کے بنیادی قانون سے استفادہ کرتے ہیں۔لیکن ہماری بحث کا محور کلی اہداف اور اصولی رویہ اپنانے سے متعلق ہے۔اس سلسلے میں وہ پوری صراحت اور قاطعیت کے ساتھ اپنی رسالت کو نبھاتے ہیں۔مثلاً مسئلہ توحید اور یہ بتانے کے لیے کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے وہ سب کے سب صراحت کے ساتھ ایک بات کہتے ہیں:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

قرآن نے یہ جملہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب جیسے انبیاء کی زبانی بیان کیا ہے۔[1] قرآن انبیاء کے کلی اور عمومی پروگرام کے متعلق یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

''ہم نے ہر امت اور معاشرے کے لیے رسول بھیجے وہ سب کے سب یہ کہتے تھے کہ خُدا کی عبادت کرو اور بتوں کی پوجا سے بچو۔'(نحل۔۳٦)

اس سے بڑھ کے واضح اور دوٹوک اعلان کیا ہوسکتا ہے۔ جو موسیٰ اور ہارون نے فرعون کے سامنے اپنی رسالت کا ہدف بیان کرتے ہوئے کیا: ارشاد فرمایا:

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝

''بنی اسرائیل کو قید سے رہا کردو انہیں شکنجہ نہ دو۔ ہم خُدا کی طرف سے معجزہ لے کر تمہارے پاس آئے ہیں اور ہدایت کے پیروکاروں پر سلام ہو۔ ہم پر وحی نازل کی گئی ہے کہ خُدا کا آئین جھٹلانے والوں اور اُس کے پروگراموں سے منہ موڑنے والوں کے لیے عذاب الٰہی ہے۔'' (طٰہٰ۔۴۷،۴۸)

یہ آیات صراحت گفتار اور اہداف و مقاصد بیان کرنے سے متعلق ہیں وہ اپنے اہداف کو عملی جامعہ پہنانے کے سلسلے میں پوری طرح قاطع اور مصمم تھے۔ مثلاً جب حضرت ابراہیم یہ مصلحت دیکھتے ہیں کہ بابل کے عظیم بُت کدے کو لکڑی کے ایک ڈھیر میں تبدیل کردیں اور بُت پرستوں کے سامنے عملی طور پر یہ ثابت کردیں کہ یہ کسی کام کا سرچشمہ نہیں ہیں تو آپ نے پوری قاطعیت کے ساتھ ارادہ کرلیا کہ اس کام کو عملی جامہ پہنائیں۔ انہوں نے اپنا یہ ارادہ بعض لوگوں کے سامنے بیان بھی کردیا اور فرمایا:

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝

''خُدا کی قسم جب تم شہر سے باہر چلے جاؤ گے تو تمہارے بتوں کے متعلق فیصلہ کرلوں گا۔'(انبیاء۔۵۷)

البتہ قاطعیت کا معنیٰ استبداد اور ڈکٹیٹرسب نہیں ہے بلکہ یہ دونوں باتیں جُدا جُدا ہیں۔ استبداد تو خود محوری اور اپنی رائے کا سب کچھ

---

[1] اعراف۔۹۵۔٦۵۔۷۳۔۸۵

سمجھتا ہے اور ڈکٹیٹر نہ فقط یہ کہ دوسروں سے مشورہ نہیں کرتا بلکہ دونوں سے کوئی مشورہ لینا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ جب کہ قاطعیت مشورے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے، وہ اس طرح کہ اگر بات اول سے ہی واضح اور روشن ہو یا اہل فن سے مشورہ کرنے کے بعد اُس کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہو چکے ہیں تو پھر اس کے اعلان کرنے اور اُسے عملی جامہ پہنانے میں کسی قسم کے شک وشبہ سے کام نہ لے اور پوری قاطعیت کے ساتھ میدان عمل میں اُتر آئے۔ جو رکاوٹیں ہوں انہیں خُدا کی قدرت پر انحصار کرتے ہوئے معمولی چیز سمجھے۔ قرآن اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ

''ان سے مشاورت اور جب ارادہ کرلو تو خُدا پر توکل کرو۔'' (ال عمران۔۱۵۹)

۳۔ اصولوں پر سودے بازی نہ کرنا

انبیاء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اصولوں اور اہداف کے سلسلے میں دشمن سے کوئی سودے بازی نہیں کرتے۔ وہ اس بات پر تیار نہیں ہوتے کہ مکتب کے اصول کو کوئی نقصان پہنچے۔ اصولوں کی سودے بازی کے مقابلے میں یہ ان کی ایک خصوصیت ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کی زندگی میں یہ بات پوری طرح واضح ہے۔ قریش نے انہیں یہ تجویز پیش کی کہ ہمارے خُداؤں کی عبادت کرو تا کہ ہم بھی تمہارے خدا کی عبادت کریں۔ اس طرح کی تجویز کا قبول کرنا مکتب کے اصولوں سے ایک طرح کی دست برداری کے مترادف تھا۔ اس لیے وحی الٰہی نے رسول اسلام کو یہ سکھایا کہ وہ فرمائیں۔

لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝۲ (کافرون۔۲)

ابن ہشام اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں:

''طائف کے کچھ لوگ آئے تا کہ پیغمبرؐ کے ساتھ معاملات پر صلح کی جائے۔ اُن کی شرط یہ تھی کہ صلح نامہ لکھا جائے اور طرفین اُس پر دستخط کریں صلح نامے کا متن یہ ہو کہ طائف کے لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد ان امور کی انجام دہی میں آزاد ہوں:

۱۔ نماز نہ پڑھیں

۲۔ سود کھائیں

۳۔ ہر طرح کے جنسی کام کی آزادی ہو۔

۴۔ اُن کی بُت کدہ ایک سال یا اس سے زیادہ دیر تک باقی رہے تا کہ ان کی عورتیں بتوں کی عبادت کر سکیں۔

اس طرح کی صلح اور تجویز اُن اصولوں سے انحراف تھا جن کی تبلیغ کے لیے پیغمبرؐ اسلام کو بھیجا گیا تھا۔ اسی وجہ سے پیغمبرؐ نے یہ شرائط

قبول نہ کیں بعض کے رد کے لیے قرآن کی آیت تلاوت فرمائی تا کہ انہیں یہ بات سمجھا ئیں کہ یہ شرائط ان کے مکتب اور اہداف رسالت کے منافی ہیں۔ان پر کوئی سودے بازی نہیں ہوسکتی سود کے بارے میں ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (بقرة۔۲۷۸)

زنا کے متعلق فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ (اسراء۔۳۲)

نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا:

لَا خَيْرَ فِيْ دِيْنٍ لَّا صَلَاةَ مَعَهٗ

”جس دین میں نماز نہ ہو اُس کا کوئی فائدہ نہیں۔“[1]

لہٰذا سودے بازی نہ کرنے سے مُراد مکتب کے بنیادی اور اساسی اصولوں کی حفاظت کرنا ہے البتہ اصول کو باقی رکھتے ہوئے اگر مصلحت کی وجہ سے بعض خصوصیات سے چشم پوشی کی جائے تو یہ سودے بازی شمار نہیں ہوتی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلامؐ نے ایسی باتیں قبول کرلیں جن کے پہلے ہرگز مثال نہ تھی۔

حضرت علیؑ نے صلح نامے کی ابتدا میں لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هذا ما اصطلح عليه محمد رسول الله“

فریق مخالف نے جو عمر بن سہل تھا، اعتراض کیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے بلکہ یہ لکھو

بَسْمِكَ اللّٰهُمَّ

نیز ہم آپ کو رسول خدا نہیں سمجھتے لہٰذا لفظ ”رسول اللہ“ کو اپنے نام سے ہٹادو۔

پیغمبر اسلام نے یہ سب باتیں قبول کرلیں۔ آپ نے یہاں تک قبول کرلیا کہ اُسی سال حدیبیہ سے واپس مدینے چلے جائیں اور دوسرے سال عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ آئیں۔[2]

کسی خاص موقع پر ایک عظیم تر مصلحت کی خاطر اُن چیزوں سے دست بردار ہونا کہ مکتب کی بنیاد و اساس کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں ،ایک آگاہ اور حقیقت شناس رہبر کی شرائط میں سے ہے۔

اب گذشتہ انبیاء کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور اصولوں کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی کسی سازش کو قبول نہ کرنے کی بات خود

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۵۴۲۔۵۴۴

[2] بحار الانوار جلد ۲۰ ص ۳۶۸۔وغیرہ

انہی کی زبانی سنتے ہیں۔

حضرت ہود سے جب اُن کی قوم نے روگردانی کر لی اور کہا کہ وہ اُن کے خداؤں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنی ء ہیں تو حضرت ہود نے یہ ارادہ کرلیا کہ اُن سے اپنا رابطہ پوری طرح منقطع کر لیں اور یوں فرمایا:

اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَ اشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۵۴﴾ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِیۡدُوۡنِیۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾

میں خدا کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں خدائے واحد کے سوا تمہارے خداؤں سے بیزار ہوں ۔جو کچھ تم کر سکتے ہو کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔(ھود۔۵۴۔۵۵)

جب حضرت شعیبؑ کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے بُت پرستی کو قبول نہ کیا تو انہیں شہر سے باہر نکال دیا جائے گا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

قَدِ افۡتَرَیۡنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِیۡ مِلَّتِكُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنۡهَا ؕ وَ مَا یَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ فِیۡهَاۤ

اگر ہم تمہاری مِلّت کی طرف لوٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں نجات دے چکا ہے تو یقیناً ہم نے اللہ سے جھوٹ باندھا اور ہم سے نہیں ہوگا کہ ہم اُس (تمہاری مِلت) کی طرف لوٹ آئیں۔(اعراف۔۸۹)

یہاں اس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء ظاہری اور عادی اسباب جیسے صبر واستقامت پیروکاروں کو صبر کی دعوت ،ارادے اور عمل میں قاطعیت اور اصول مکتب پر کوئی سودے بازی نہ کرنے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن تمام حالات میں ان کو پوری توجہ اس بات کی طرف ہوتی تھی کہ ان عوامل کی تاثیر خُدا کے ارادے سے وابستہ ہے۔

دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔اُس کا سرچشمہ ارادہ خُدا ہے اس وجہ سے جو ایک سب سے اہم عامل اُن کی زندگی میں رونما ہوتا تھا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۴۔خدا پر توکل

توکل سے مراد اپنے تمام کام خُدا کے سپرد کر دینا ہے البتہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیائے اسباب ومسببات کی طرف بالکل توجہ نہ کریں اور ہمیشہ اس بات کے منتظر رہیں کہ غیب سے ایک ہاتھ نکلے اور کام انجام دے دے کیونکہ توکل کا یہ معنی خُدا کے حکیمانہ قانون اور سنت کے مخالف ہے۔اس کے حکیمانہ ارادے کا تعلق اس بات سے ہے کہ مادی حوادث اور معنوی برکات خاص اسباب وعلل سے حاصل ہوتے ہیں

۔ان اسباب کی طرف توجہ نہ کرنا خُدا کی مشیت کے برخلاف قدم اُٹھانا ہے۔اس وجہ سے ایک کوشش کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسباب وعلل کے دروازوں کو اچھی طرح کھٹکھٹائے۔انہی دروازوں سے داخل ہو۔اس کے باوجود یہ جانے کہ یہ اسباب خُدا کے ارادے سے وابستہ ہیں ممکن ہے یہ اسباب بے اثر ہوجائیں یا انسان اسباب کی تشخیص میں غلطی کر بیٹھے یا ان اسباب کے سامنے ظاہری رکاوٹیں پیدا ہوجائیں ۔اس طرح کے حقیقی مسائل کی وجہ سے ضروری ہے کہ اپنا کام خُدا کے سپرد کردے کہ اسباب خُدا کی حکیمانہ مشیت کے سائے میں اُسے مقصد تک پہنچائیں۔

اسی وجہ سے انبیاء طبیعی اور معمول کے اسباب وعلل پورے کرنے کے بعد یا قاطعیت سے کام لیتے ہوئے اور اپنے اصولوں پر کوئی سودے بازی نہ کرتے ہوئے بہرحال خُدا پر ہی توکل کرتے تھے۔اسی کو ہی وہ چکی کا نیچے والا پاٹ قرار دیتے تھے کہ جس کی بنیاد پر اوپر والا پاٹ کام اور اثر دکھا سکتا ہے۔اس سلسلے کی آیات ملاحظہ کریں:

ا۔حضرت نوح نے جب اپنی قوم کے سامنے آیات الٰہی بیان کردیں اور یہ محسوس کیا کہ وہ تکبر اور روگردانی کا مظاہرہ کررہے ہیں اور حیلہ وفریب سے کام لینا چاہتے ہیں تو یوں فرمایا:

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾

’’اے لوگو! اگر میرا ٹھہرنا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تمہیں گراں گزرتا ہے تو اپنی اور اپنے شریکوں کی طاقت کو اکٹھا کرلو تا کہ تمہارا معاملہ تم پر پوشیدہ نہ رہ جائے۔پھر میری زندگی کا خاتمہ کر دو اور مجھے مہلت نہ دو (لیکن تم یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔) (یونس۔۷۱)

۲۔یہ صرف نوح کی منطق نہ تھی بلکہ تمام انبیاء کا طریقہ کار خُدا پر توکل تھا۔قرآن نے قوم نوح قوم عادہ قوم ثمود اور بعد والی قوموں کی طرف بھیجے جانے والے انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ قوموں نے انہیں جھٹلایا۔یہ بہانہ بنا کر انبیاء انہیں اپنے آباؤاجداد کے راستے سے ہٹارہے ہیں انہوں نے انبیاء سے روگردانی کی۔اس موقع پر انبیاء نے تبلیغ کے تمام وسائل کو بروئے کار لاکر خُدا پر توکل کیا اور کہا:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿١٢﴾

ہم خُدا پر کیوں توکل نہ کریں جب کہ اُس نے ہماری ہدایت ہمارے راستوں کی طرف کی ہے اور ہم

تمہاری اذیتوں کے مقابلے میں استقامت کریں گے اور توکل کرنے والے خُدا پر توکل کرتے ہیں۔[1] (ابراہیم۔۲۱)

۵۔ تبلیغ رسالت خدا کے لیے

تبلیغ پیام کے لیے انبیاء کا ایک اور طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ہمیشہ یہ کہتے کہ ہم تم سے کسی اجرت و پاداش کے طلب گار نہیں ہیں۔ ہمارا اجر اور پاداش خُدا کے پاس ہے حقیقت میں ہر نبی کی منطق یہ جملہ تھا:

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۸۰

''ہم تم سے پاداش نہیں چاہتے۔ ہمارا اجر تو خُدا پر ہے۔'' (شعراء۔۱۸۰)

قرآن نے یہی اصول سورہ شعراء میں حضرت نوح (آیت۔۱۲۹) حضرت ہود (آیت۔۱۲۸) حضرت صالح (آیت ۔۱۴۵) حضرت لوط (آیت ۱۶۴) اور حضرت شعیب (آیت ۱۸۰) جیسے انبیاء کی زبانی بیان کیا ہے۔

قوموں کے درمیان یہ شعار اتنا مشہور تھا کہ جب حضرت مسیحؑ کے بھیجے ہوئے لوگ ''انطاکیہ'' میں وارد ہوئے تو حبیب نجار اُن پر ایمان لائے اور لوگوں کو مخاطب کر کے اُس نے کہا:

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۲۱

''جو تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتے اور خود ہدایت یافتہ ہیں ان کی پیروی کرو۔ (یٰس۔۲۱)

اصولی طور پر اس راستے میں انبیاء کا ہدف خُدائی ہے اور ان کا مقصد فرمان خُدا کی اطاعت لہٰذا اگر اس کام پر کوئی اجر د پاداش ہو تو وہ خُدا سے مانگنا چاہیے نہ کہ لوگوں سے۔

علاوہ ازیں ہر انسان چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جب بھی کوئی کام خُدا کے لیے انجام دیتا ہے تو وہ پاداش کا مستحق نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات اور سب کچھ خُدا کا ہے، اُس کے پاس اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں ہے کہ جسے وہ خُدا کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر نیک اعمال پر پاداش اور انعام دیا جائے گا تو یہ خُدا کے فضل اور لطف کی وجہ سے ہے۔

ہاں! پیغمبر اسلامؐ کا شعار بھی باقی انبیاء کی طرح یہی تھا کہ:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۸۶

---

[1] تبلیغ کے راستے میں خُدا پر توکل کرنا دوسرے انبیاء کے بارے میں بھی آیا ہے۔ (ھود۔۵۶،۸۸)، (یوسف۔۶۷) اور (اعراف۔۸۹) کی طرف رجوع کیا جائے۔ خُدا پیغمبر اسلامؐ کو نو آیات میں خُدا پر توکل کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں: (آل عمران۔۱۵۹)، (نساء۔۸۱)، (انفال۔۶۱)، (ھود۔۱۲۳)، (فرقان۔۵۸)، (شعراء۔۲۱۷)، (نمل۔۷۹)، (احزاب۔۳،۴۸)

''کہہ دیجئے میں تبلیغ رسالت کے لیے کوئی اجرت نہیں مانگتا اور تمھیں کوئی زحمت نہیں دیتا۔(ص۔۸۶)
لیکن اس کے باوجود ان کے اجر رسالت سے متعلق تین اور آیات بھی ہیں جو ایک طرح سے ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں:
ا۔ایک آیٰت میں انہوں نے اپنے قریبیون سے محبت کو اپنی رسالت کا اجر قرار دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ

''کہہ دیجئے میں اپنے خاندان سے دوستی کے سوا تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا ہوں۔''(شوریٰ۔۲۳)

۲۔ایک اور آیت میں اپنا اجر رسالت مومن بندوں کے خُدا تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

''کہہ دیجئے میں تم سے کچھ اجر رسالت نہیں مانگتا ہوں مگر یہ کہ جو بھی چاہے اپنے پرودگار کی طرف راستہ اختیار کرے۔''(فرقان۔۵۷)

۳۔تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ جو دو اجر تم سے مانگے گئے ہیں ظاہری طور پر یہ میرے نفع میں ہیں لیکن حقیقت میں خود مسلمانوں کے نفع میں ہیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ

کہہ دیجئے جو اجر میں نے تم سے مانگا ہے یہ تمہارے حق میں ہے۔خُدا کے علاوہ میرا کسی پر کوئی اجر نہیں۔(سبا۔۴۷)

تفسیر موضوعی کے اعتبار سے ان تینوں آیات کو آپس میں ملا کر دیکھیں اور ان کی ہم آہنگی کو سمجھیں۔اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:
خاندان رسالت سے محبت ایک ایسا کمال ہے جو خود انسان کے نفع میں ہے کیونکہ ان سے محبت کے سائے میں اس کے فکر و عمل کمال کی جانب گامزن ہوں گے۔پاک لوگوں کی دوستی پاکیزگی کا سبب بنتی ہے اور ناپاک لوگوں کی دوستی پلیدی کا۔لہٰذا ''مودت فی القربیٰ''اگرچہ ایک اجر رسالت کے طور پر بیان ہوئی ہے۔لیکن حقیقت میں یہ اجر نہیں ہے بلکہ ایسا کام ہے کہ جس کا نفع خود لوگوں کو ہوگا۔نہ کہ پیغمبر اور ذی القربیٰ کو۔اُس کی اجرت تو تب ہوتی کہ اس کا فائدہ پیغمبر کو پہنچتا نہ کہ مسلمانوں کو اور قربیٰ سے محبت رکھنے والوں کو۔
دوسری طرف دوسری آیت میں اجر و پاداش خُدا تک راہ پانے کو قرار دیا گیا ہے۔عترت سے رابطے کے علاوہ اور کون سا راستہ ہے، جو ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہی ہے اور قرآن ہمیشہ اس کے ساتھ رہا ہے۔
بات کی وضاحت کے لیے تینوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاتے ہیں:

۱۔ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ

۲۔ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

۳۔ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ان تینوں آیات کی حقیقت اس بات کی طرف لوٹ رہی ہے کہ پیغمبرؐ نے کوئی اجر نہیں مانگا۔ صرف لوگوں کی سعادت کے لیے مودت اہل بیت کی نصیحت کی۔ سعادت تک پہنچنے کا یہ واحد ذریعہ ہیں۔

دعائے ندبہ میں یہ تینوں آیات بڑے خوبصورت انداز میں پیش کی گئی ہیں اور ایک دوسرے کی تفسیر کر رہی ہیں۔

٦۔ انبیاء کا خیر خواہ اور ہمدرد ہونا

چونکہ انبیاء کا مقصد صرف خوشنودی خُدا ہے لہٰذا ان کی کوشش و جستجو کوئی حدو مرز نہیں رکھتی۔ لہٰذا انبیاء کی قدرت میں جو کچھ تھا وہ ہدایت امت کے لیے کرتے رہے۔ تھکاوٹ اور درماندگی جیسے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت کلیم، حضرت مسیح اور پیغمبر اسلامؐ جیسے انبیاء کی زندگی اس بات کو ثابت کر رہی ہے۔ اسی اصرار کی وجہ سے کبھی انہیں جان لیوا شکنجوں سے بھی گذرنا پڑتا۔ لیکن اُن کی بات یہ ہی رہتی کہ:

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

”اے لوگو خُدا کی جانب سے جو پیغام میرے ذمے تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کی لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔ (اعراف۔٧٩)

سورہ اعراف آیت ٦٢، ٦٨ بھی اسی مفہوم کی حامل ہیں۔ وحی خُدا لوگوں کی سعادت اور خوش بختی کے لیے پیغمبرؐ کی کوشش یوں بیان کرتی ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

یقیناً تم ہی میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا ہے۔ تمہارا تکلیف اٹھانا اس پر شاق گزرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے۔ مومنوں پر تو نہایت ہی شفیق بڑا مہربان ہے۔ (توبہ۔١٢٨)

۸۔صحیح ذرائع سے استفادہ

انبیائے الٰہی تبلیغ کے لیے لوگوں کی عقل وخرد کو کام میں لاتے تھے۔ان کے افکار کو جلا بخشنے کے ساتھ اُن میں خدا کی طرف لوٹنے کا جذبہ بیدار کرتے تھے۔تمام انبیاء کی سیرت میں یہ بات ایک بار بھی نہیں دیکھی گئی کہ انہوں نے اپنے اہداف اور مقاصد کی تکمیل کے لیے لوگوں کی حماقت، جہالت اور کم عقلی سے فائدہ اٹھایا ہو۔جب کہ دنیاوی راہنما اور دنیوی مقام ومنصب کے خواہاں رہبر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔بعض اوقات تو وہ ایسی غلط اور باطل باتوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جن پر خود ان کا عقیدہ بھی نہیں ہوتا۔آج کی دُنیا میں کئی ایسے روشن فکر اور آگاہ رہبر موجود ہیں جو محبت پرستی اور گائے کی پُوجا کی مذمت کرتے ہیں، اسے انسانی فکر کا انحطاط قرار دیتے ہیں ۔لیکن جب وہ منصب رہبری پر پہنچ جاتے ہیں تو نہرو کی مانند مقدس گائے کا طواف شروع کر دیتے ہیں اور ہندو مذہب کے باطل خداؤں کی تعریف وتمجید میں لگ جاتے ہیں۔جب اُن پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مقدس گائے میں صرف لفظ مقدس ہی پایا جاتا ہے اور تم دوسرے ہندوؤں کی طرح عید گاہ میں شرکت کر کے گائے کا طواف کیوں کرتے ہو تو وہ جواب دیتے ہیں چونکہ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے میں نہ صرف یہ کہ اُن کی مخالفت نہیں کرتا ہُوں بلکہ اُن کے ہمراہ اور ہم گام ہوں۔

حقیقت میں نہرو اور گاندھی جیسے لوگ اپنے مقام ومنصب کو عمومی افکار کی پیروی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔مقام ومنصب کی محبت انہیں اس سلیقے پر اُبھارتی ہے۔یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فرعون مصر جب موسیٰؑ کی دلیل کے سامنے ہار گیا اور پوری طرح رسوا ہو گیا تو اُس نے فوراً لوگوں کی جہالت اور نادانی سے فائدہ اٹھاتے ہُوئے اپنی بادشاہت، ثروت اور ان نہروں کی لوگوں پر دھاک بٹھا دی جو اُس کے محل کے نیچے بہہ رہی تھیں۔اُس نے ان چیزوں کو اپنی حقانیت کی دلیل قرار دیا اور موسیٰؑ کی غربت اور تنگ دستی کو اُن کی دعوت کے باطل ہونے کی دلیل قرار دیا حالانکہ ثروت اور مکتب کی حقانیت اور غربت اور مکتب کے باطل ہونے کے درمیان کوئی منطقی اور عقلی رابطہ نہیں پایا جاتا۔لیکن چونکہ مصر کے لوگ فکر وعقل کے اعتبار سے کمزور تھے لہٰذا اُس نے لوگوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بے بنیاد باتیں کیں۔قرآن فرعون کی اس غلط روش کے بارے یوں ارشاد فرماتا ہے:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﮤ

اُس نے اپنی قوم کو کم عقل سمجھا اور انہوں نے بھی اُس کی پیروی کی وہ فاسق اور خُدا کی اطاعت سے خارج لوگ تھے۔(الزخرف۔۵۴)

سیرت نگار حضرات پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بیٹے ابراہیم اٹھارہ سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت کر گئے۔پیغمبر اسلامؐ مسجد میں تھے کہ انہیں اپنے بیٹے کے حالت احتضار میں ہونے کی خبر ملی۔آپؐ فوراً گھر تشریف لائے بیٹے کو آغوش میں لیا۔اُس کے چہرے کو غمگین نظروں سے دیکھا۔اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور یہ فرمایا:

پیارے ابراہیم، دِل تڑپ رہا ہے آنکھیں برس رہی ہیں لیکن میں خُدا کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کہوں گا۔ اسی حالت میں ابراہیم کی روح اس کے بدن سے پرواز کر گئی۔ جنازہ مسجد میں لایا گیا تاکہ غسل اور کفن و دفن کا انتظام کیا جا سکے۔ اُس وقت سورج گرہن لگ گیا۔

لوگوں نے یہ سوچا کہ پیغمبرؐ پر آنے والی اس مصیبت کے بہت بڑا ہونے کی وجہ سے سورج گرہن لگا ہے ایسا خیال پیغمبرؐ کے فائدے میں تھا۔ یہ لوگوں کی نظروں میں اُن کے مقام کو بڑھاتا۔ لیکن پیغمبر اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے لوگوں کی جہالت سے فائدہ اُٹھائے۔ علاوہ ازیں علم ودانش کا مستقبل جو اس طرح کے حوادث کی حقیقت کو بیان کرنے والا تھا وہ بھی اُس کے متعلق فیصلہ کرنے والا تھا۔ یہاں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے ضمیر اور خُدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ابراہیم کی تجہیز و تکفین میں تاخیر کر دی اور منبر پر جا کر فرمایا:

اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ اٰیٰتِ اللهِ لَاتَنْخَسِفَانَ لِمَوْتَ اَحَدٍ وَّلَالِحَیَاۃِ اَحَدٍ....

اے لوگو! چاند اور سُورج تو اللہ کی نشانیاں ہیں۔ (ایسی نشانیاں ہیں جو خُدا کی طرف سے مقرر کردہ قوانین کے مطابق حرکت کر رہی ہیں)۔ انہیں کسی کی موت یا زندگی سے گرہن نہیں لگتا۔

یعنی میرے بیٹے ابراہیم کی موت اور سورج گرہن کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے جب بھی سُورج یا چاند گرہن لگے تو نماز پڑھو۔ [1]

پیغمبرؐ کے ضمیر اور خُدا کی یہ آواز ہر دور میں اُس کے مقام کو بلند کرتی رہے گی۔ بیدار دل لوگ یہ یقین پیدا کرتے رہیں گے کہ وہ حق گو شخص تھا نہ کہ مقام و منصب اور نام و نمود کا دلدارہ۔

۸۔ خدا کی نعمتیں یاد آوری

توحید، خُدا کی عبادت اور غیر خُدا سے دوری کی طرف دعوت دینے کے لیے انبیاء کا ایک طریقہ خُدا کی نعمتیں یاد دلانا تھا، وہ نعمتیں جو خُدا نے انسان کو عطا کی ہیں کیونکہ عبادت اُسی کی کی جاتی ہے جس کے قبضہ قدرت میں انسان کا وجود، اور زندگی ہو۔ چونکہ انسانی زندگی کا دارمدار خُدا کی عطا کردہ نعمتوں پر ہے لہٰذا عبادت اور پرستش بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں حضرت ہود اور حضرت صالح جیسے انبیاء نے کئی یاد دہانیاں کرائی ہیں جنہیں قرآن نے بیان کیا ہے۔

حضرت ہود نے اپنی قوم سے کہا:

---

[1] سیرہ حلبی جلد ۲ ص ۳۴۸ یہ ایک کلی قانون ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے واقعات سے شیطان صفت لوگ منفی منافع حاصل نہ کریں لیکن اگر کسی موقع کے لیے قطعی دلیل موجود ہو تو قبول کی جائے گی جیسے امام معصومؑ کی شہادت نے عالم کون پر اثر کیا تھا۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ (اعراف۔۶۹)

پھر ارشاد ہُوا:

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ (شعراء۔۱۳۲تا۱۳۴)

خُدا کی مخالفت سے بچو تا کہ کامیاب ہو جاؤ وہ خُدا جس نے تمہیں وہ کچھ دیا ہے جسے تم جانتے ہو اُس نے تمہاری مدد مال اولاد اور باغات کے ساتھ کی ہے۔

حضرت صالح نے اپنی نبوت کی دلیل (اونٹنی) لوگوں کو دکھانے کے بعد انہیں خُدا کی نعمات یاد دلائیں اور فرمایا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾

''یاد کرو کہ تمہیں قوم عادہ کا جانشین بنایا گیا اور زمین میں جگہ دی گئی۔ ہموار سرزمین محلات بناتے ہو اور پہاڑوں سے اپنے لیے گھر بناتے ہو۔ پس خُدا کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔'' (اعراف۔۷۴)

خُدا کی نعمتوں کی یاددہانی انبیاء کا ایک تبلیغی ہتھیار تھا۔ وہ دو مرحلوں میں اسے کام میں لائے تھے:

۱۔ لوگوں کے ان پر ایمان لانے سے پہلے

۲۔ لوگوں کے ان پر ایمان لانے کے بعد

کیونکہ ایمان لانے کے بعد ایمان پر ثابت قدم رہنے کے لیے بھی تبلیغ اور وعظ ونصیحت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے خُدا کی نعمتوں کو یاد دلانا ایک بہت اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت موسیٰ بن عمران اور پیغمبر اسلام نے جو نصیحتیں کی ہیں ہم وہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ

اُس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا خُدا کی نعمتوں کو یاد کرو کہ اُس نے تم میں انبیاء بھیجے اور

تمہیں زمین پر بادشاہ بنایا۔(المائدہ۔۲۰)

اسی سے ملتا جلتا مفہوم (ابراہیم۔۲)اور (بقرہ۔۴۰) میں بھی آیا ہے۔

۲۔پیغمبر اسلامؐ کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی کہ اپنے ساتھیوں کے ایمان کی مضبوطی کے لیے انہیں جگہ کی نعمات یاد دلائیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ

”یاد کرو خدا کی نعمتوں کو جب تمہاری طرف ایک قوم نے درست تجاوز بڑھایا تو خُدا نے ان کے ہاتھوں کو تم سے منقطع کر دیا۔“(مائدۃ۔۱۱)

اسی سے ملتا جلتا مضمون (مائدہ۔۷) میں بھی آیا ہے۔

اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ دوسروں کو جو نعمات دی گئی ہیں وہ صرف ایک صورت میں جتلائی جا سکتی ہیں وہ اُس وقت ہے جب خُدا کی نعمات اُسے یاد دلا رہے ہیں۔لیکن بعض افراد جو دوسرے بعض افراد کے لیے نیک کام کرتے ہیں انہیں جتلانا نہ فقط یہ کہ اچھا نہیں ہے بلکہ مذموم اور ناپسند ہے۔اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ تمام نعمتوں کو خُدا سے منسوب کر رہے ہیں نہ کہ اپنے آپ سے۔قرآن نے نعمت جتلانے سے دوسرے کے لیے باعث تکلیف واذیت ہو منع کیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

اے مومنو!اپنے صدقات کے اجروثواب کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر ضائع نہ کرو۔(بقرۃ۔۲۶۴)

۹۔مفسدین کے انجام کی یاددہانی

اگر آخرت کا عذاب گنہگار لوگوں کی بیداری کا باعث بنتا ہے تو اس دنیا میں گنہگاروں کے اُس انجام کی یاد دلانا جو اُن پر خُدا کے قہر کی شکل میں نازل ہوا ہے ہدایت اور معنویت کی طرف پلٹانے کے لیے بہت موثر ہے۔قصے اور گذشتہ قوموں کے واقعات بیان کرنے سے قرآن کا ایک بہت بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔سب لوگ اس بات کی طرف متوجہ رہیں کہ ہوس پرستی طغیان اور تجاوز کا انجام کار ایک ہی ہے۔قرآن کی بہت ساری آیات اس موضوع کے بارے میں ہیں۔ہم انبیاء کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔یہاں نمونے کے طور پر چند آیات ذکر کرتے ہیں۔

۱۔حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے یوں کہا:

وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۹﴾

اے لوگو! میری مخالفت اس بات کا باعث نہ بنے کہ تم قوم نوح قوم ہود اور قوم صالح جیسے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ۔ قوم لوط کا انجام (تمہاری نظروں) سے دور نہیں۔ (ھود۔ ۸۹)

۲۔ پیغمبر اسلام کو خدا کی جانب سے یہ حکم ملا کہ وہ لوگوں سے کہیں: کچھ گذشتہ قوموں کی زندگی میں بھی غور و فکر کرو تا کہ انبیاء کو جھٹلانے والے لوگوں کا انجام تم قریب سے دیکھ لو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ انْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۱﴾ (انعام۔ ۱۱)

سورہ نمل کی آیت ۶۹ میں بھی یہی مضمون بیان ہُوا ہے۔

بعض اوقات قرآن عمومی انداز میں گذشتہ ملتوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۳۶﴾ (نحل۔ ۳۶)

زمین میں چلو پھرو اور جھٹلانے والوں کا انجام دیکھو۔

ایسی تبلیغ اُس وقت زیادہ مؤثر واقع ہو سکتی ہے جب زیر تبلیغ افراد گناہ کے لحاظ سے گذشتہ لوگوں کے مانند ہوں تو طبعاً سزا و انجام کے لحاظ سے بھی اُن جیسے ہوں گے۔

نیز یہ بھی بتاتے چلیں کہ جیسے مفسدین کے انجام کی یاد آوری بعض لوگوں کی بیداری کا باعث بنتی ہے، اسی طرح بعض قوموں کی خوشحال زندگی جو انہوں نے اطاعت خُدا میں گزاری کی یاد دہانی انسانوں کو ہدایت اور اطاعت کی طرف لانے کا سبب بنتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت اس مطلب کو بھی واضح کرتی ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰٮمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ لِّـكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۵﴾

''ہم نے موسیٰ کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا تا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لائے اور خُدا کے دنوں (نعمت اور عذاب کے دنوں) کی یاد آوری کرے۔ اس یاد آوری میں بُرد بار اور سپاس گزار لوگوں

کے لیے ہدایت کی نشانیاں ہیں۔[1] (ابراہیم۔۵)

۱۰۔دین واحد کی دعوت

انبیاء کی منطق میں وحدت اور یگانگی کا عنصر کئی مظاہر رکھتا ہے جسے مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔تمام انبیاء کلمہ توحید کی اشاعت کے لیے مبعوث کیے گئے۔قرآن نے یہ حقیقت صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

(نحل۔۳۶)

''ہم نے ہر ملت میں رسول بھیجا (تاکہ وہ ان سے کہے کہ) خُدا کی عبادت کرو اور بتوں (غیر خُدا) کی عبادت سے پرہیز کرو۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

اپنے سے پہلے رُسولوں سے پوچھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کی عبادت کے سوا دوسرے خُداؤں کی عبادت کا حکم دیا ہے؟ (زخرف۔۴۵)

حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب جیسے تمام انبیاء کی بات یہ تھی کہ:

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔[2]

خدائے واحد کی طرف بلانا سب انبیا کے دین میں موجود توحید کے جلووں میں سے ہے۔بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے واحد کی طرف رُجحان فطری ہے جبکہ شرک اور کئی خداؤں کی طرف میلان فطرت سے انحراف ہے۔قرآن یہ بتانے کے بعد کہ دین توحید ایک فطری دین ہے اُن لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو اس سے دور ہو گئے ہیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ''ایام اللہ'' وہ دن ہیں جو ایک طرح سے اُن واقعات کی یاد دلاتے ہیں جو خُدا کی صفات جمال وجلال کے مظہر ہوں۔جو خُدا کے غیظ وغضب یا رحمت کو واضح طور پر بتاتے ہوں۔

[2] سورہ اعراف آیات ۵۹، ۶۵، ۷۳ اور ۷۵ کی طرف رجوع کیا جائے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾

اور تم مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ (یعنی) ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ کیا اور ہر فرقہ جو کچھ اُس کے پاس ہے اسی سے خوش ہوا: (روم۔۳۱،۳۲)

۲۔انبیاء کی دعوت کے ایک اور واحد ہونے کا دوسرا جلوہ یہ ہے کہ تمام ایک دین کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے۔تمام ایک دین ''اسلام'' کی طرف بلاتے تھے۔اگر فرق ہے تو وہ شریعتوں میں ہے۔ندیوں اور نالوں میں ہے وگرنہ بندوں کی طرف جاری وحی کے فیض حقیقت کا سر چشمہ ایک ہی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران۔۱۹)

۳۔انبیاء کی دعوت میں اتحاد کا ایک اور مظہر یہ تھا کہ اُن میں سے ہر ایک نبی لوگوں کو دوسرے انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دیتا تھا۔ضروری ہے کہ تمام امتیں تمام شریعتوں کی درستی اور حقانیت پر ایمان لائیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٤﴾ (آل عمران۔۸۴)

انبیاء کی منطق اور باتوں میں پائے جانے والی وحدت کے یہ چند ایک جلوے تھے۔ان کے ساتھ ساتھ ''توحید کلمہ'' کی بات بھی ہے جس کی طرف وہ اپنے پیروکاروں کو بلاتے تھے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے مستقل طور پر زیر بحث لاتے ہیں۔

۱۱۔امت کا اتحاد و نفاق

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تھوڑا تھوڑا پانی کسی کام نہیں آ سکتا لیکن جب اس طرح کا سارا پانی ایک مقام پر جمع ہو جائے تو یہ ایک عظیم طاقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ایک معاشرے میں انسانوں کا بھی یہی حال ہے۔اسی وجہ سے تمام مصلحین جہاں وحدت کلمہ کے داعی اور طرف دار تھے وہ ہمیشہ تفرقہ بازی کی مذمت کرتے تھے۔یہ بات تمام انبیاء کی باتوں میں بھی نمایاں ہے۔مثال کے لیے حضرت ہارون کے اپنی قوم سے رویے کو دیکھا جا سکتا ہے۔حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں جب چند افراد جادہ توحید سے منحرف ہو کر راہِ شرک پر گامزن ہو گئے تو حضرت ہارون اس مسئلے پر شدید رنجیدہ ہونے کے باوجود بہت نرم رویہ اختیار کرتے ہیں۔وحدت کلمہ اور تفرقے سے بچاؤ کو انہوں نے منحرف لوگوں کے مقابلے میں خشونت آمیز رویہ اپنانے پر ترجیح دی تا کہ حضرت موسیٰ بن عمران میقات سے لوٹ آئیں اور جیسے مصلحت دیکھیں اقدام کریں۔

جب حضرت موسیٰ نے اُن پر اعتراض کیا کہ تم ان لوگوں کو اس غلط کام سے سختی اور شدت کے ساتھ کیوں نہیں روکا تو انہوں نے یہ جواب دیا:

اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ ﴿۹۴﴾

مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ آپ کہتے کہ بنی اسرائیل کے درمیان تم نے تفرقہ کیوں ڈالا ہے اور میری بات کا خیال کیوں نہیں رکھا؟ (طٰہٰ۔ ۹۴)

البتہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں وحدت کی دعوت ایک خاص جلوے کی حامل ہے۔ رسول اسلامؐ نے اس سلسلے میں جو اقدام کیے ہیں ہم وہ بیان کرتے ہیں۔

سب سے پہلے انہوں نے اوس اور خزرج کے درمیان دوستی اور ہم آہنگی پیدا کی۔ اس کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت اور بھائی چارہ قائم کیا۔ وحیِ خُدا نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ پورے باایمان معاشرے کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا۔ ارشاد ہوا:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (حجرات۔۱۰)

اس کے بعد ایک کلی پروگرام کے عنوان سے مومن معاشرے کو یوں مخاطب کیا:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۵﴾

تمام مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو۔ تم پر جو خُدا کی نعمتیں نازل ہوئی ہیں انہیں یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی پس تم اُس کی نعمت کے سائے میں بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے کہ اُس نے تمہیں نجات دی۔ خُدا اپنی نشانیاں یوں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ (آل عمران۔ ۱۰۳، ۱۰۵)

اُن میں سے نہ ہو جاؤ جو گروہ گروہ ہو گئے تھے۔ روشن دلائل آنے کے بعد اُنہوں نے اختلاف کی راہ اختیار کی۔ اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سے زیادہ خوبصورت، پیارا اور عالمگیر خطاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن فرما رہا ہے:

''اوعتصموا بحبل الله جمیعاً'' گویا تمام انسان دین کی طرف آئے بغیر گمراہی اور ضلالت کے گڑھوں میں گرے ہوئے ہیں۔خُدا کا آئین ایک ایسی رسی ہے کہ اگر اُسے تھام لیں تو ضلالت کے اس کنوئیں سے باہر آ جائیں گے۔سنائی کے بقول

از چاہ شور این جہان ،برحبل قرآن زن تو دست

کای یوسف ،آخر بہر توست این حبل در چاہ آمدہ[۱]

قرآن ایک آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۚ﴿۴۶﴾

''خُدا اور اس کے رُسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نزاع وجدال نہ کرو جس کے نتیجے میں تم کمزور ہو جاؤ گے۔تمہاری بات کا نفوذ اور قدرت ختم ہو جائے گی۔اور ثابت قدم رہو۔خُدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' (انفال۔۴۶)

وحدت اور اخوت کی اہمیت کے پیش نظر پیغمبر اسلامؐ نے وحدت کو خاص طور پر موردِ توجہ قرار دیا ہے اس کے کچھ نمونوں کا ذکر یقیناً تربیت کے اچھے اثرات چھوڑے گا۔لہٰذا ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

ا۔''قبیلہ بنی المصطلق'' سے جنگ میں مشرکین پر مسلمانوں کی کامیابی کے بعد مہاجرین اور انصار میں سے اپنے قبیلے کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔اُن کی یہ تفرقہ آمیز آواز اور وہ بھی ایسی جگہ پر جہاں دشمن ان سے شکست کھا چکا تھا پیغمبر اسلام کے کانوں میں پڑی۔پیغمبر اسلامؐ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: ان خبیث آوازوں کی طرف توجہ نہ دو۔یہ زمانہ جاہلیت کے نعرے ہیں۔اس کے بعد اُن کے ذہنوں سے گروہ بازی کے تلخ نظریے کو نکالنے کے لیے اُسی جلتی دوپہر میں کوچ کا حکم دیا۔ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد ٹھہرنے کا حکم دیا۔سخت تکان کی وجہ سے سب لوگوں پر نیند طاری ہوگئی۔بیدار ہونے پر یہ حادثہ ایک مبہم سے خیال کی شکل میں ہی باقی رہ گیا۔پیغمبر نے اس طریقے سے ایک بار پھر وحدت اسلامی کو مضبوط کیا۔[۲]

۲۔اوس وخزرج کے جوان ایک طویل عرصے تک لڑائی کے بعد اسلام کے وحدت بخش دین کے سائے میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ایک دن وہ مسجد نبوی کے باہر اکٹھے بیٹھے تھے۔پیاری پیاری باتیں کر رہے تھے اور خوبصورت باتیں سن رہے تھے مدینے کا یہودی باشندہ جس کا نام ''شاس'' تھا یہ منظر دیکھ کر بہت ناراحت ہُوا۔اُس نے ایک یہودی نوجوان کو تیار کیا کہ اُن کی محفل میں جاؤ اور ان دونوں

---

[۱] دنیا کے نمکین پانی کے کنوئیں میں تو قرآن کی رسی کو تھام لے کہ اے یوسف آخر میں کنویں میں یہ رسی تیرے ہی لیے آئی ہے۔

[۲] سیرۃ ابن ہشام ج۳ ص ۳۰۳

قبیلوں کے درمیان ہونے والی خونریز لڑائیوں کی یاد تازہ کرکے اُن میں نفاق کا بیج بودو۔ اُس یہودی نوجوان نے اپنا کردار بخوبی انجام دیا۔ اُسی محفل میں لڑائی اور جھگڑا شروع ہوگیا۔ دونوں طرف کے نوجوان نے تلواریں سونت لیں۔ قریب تھا کہ لڑائی شروع ہوجاتی۔ جب پیغمبر اسلامؐ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپ جلدی سے اُن کے درمیان آئے اور بلند آواز سے کہا:

"اللہ اللہ ابدعوی الجاھلیّہ و آنا بین اظھر کم بعد ان ھدا کم اللہ بالاسلام و اکرمکم بہ وقطع بہ عنکم امر الجاھلیّہ واستنقذ کم من الکفر و الف بہ بین قلوبکم۔"

اللہ اللہ! اس کے باوجود کہ میں تمہارے درمیان ہُوں جاہلیت کے دعووں کو دوبارہ زندہ کرتے ہو حالانکہ خُدا نے اسلام کے ذریعے تمہیں ہدایت بخشی اور عزت عطا کی زمانہ جاہلیت کے رابطہ کو توڑ دیا، تمہیں کفر سے نجات دلائی اور تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ [1]

نہ صرف پیغمبر اسلامؐ نے وحدت کے راستے پر قدم اٹھاتے ہوئے تفرقے کے عوامل کو نابود کردیا بلکہ اُن کے بعد ان کے وحی اور جانشین حضرت علیؑ نے بھی اپنی تمام ہمت اور کوشش اس راستے کے لیے وقف کردی۔

اسی کام کی خاطر انہوں نے پچیس سال کی تلخ خاموشی برداشت کرلی تا کہ اسلامی معاشرے کی وحدت برقرار رہ سکے۔ چنانچہ فرمایا:

سَاَصْبِرُ مَالَمْ اَخَفْ عَلٰی جَمَاعَتِکُمْ

جب تک حفظ وحدت کا تقاضا ہے میں صبر کرتا رہُوں گا۔ [2]

آپ نے ایک جامع خطبے میں گذشتہ امتوں کی تاریخ بیان کی ہے اور ان کی کامیابی اور شکست کے عوامل بیان کیے ہیں۔ اُن کی کامیابی کا ایک بہت بڑا عامل وحدت کو قرار دیا ہے۔ اور ان کی شکست کا ایک بہت بڑا سبب اُن کے تفرقے کو۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

گذشتہ امتوں کی تاریخ دیکھو کہ وہ کیسے تھیں۔ جب افراد متحد، خواہشات ہم آہنگ، دل معتدل، ہاتھ ایک دوسرے کے پشت پناہ تلواریں ایک دوسرے کی مددگار، نظریں تیز اور عمیق اور ارادے استوار اور محکم تھے تو کیا وہ زمین کے بادشاہ نہ تھے۔ لیکن دیکھوں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ جب وحدت کی جگہ اختلاف نے لے لی اور وہ مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے (تو اس وقت) خُدا نے اُن سے لباس درگواری چھین لیا، اپنی نعمتیں اُن سے واپس لے لیں، اب ان کی داستان نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے ماۂ عبرت ہے۔ [3]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۵۰

[2] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۶۹

[3] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۲ (قاصعہ)

(۲۶)

انبیاء کے مؤثر ترین مخالفین

زیر بحث آیات کی فہرست

۱۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (انعام۔۱۱۲)

۲۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

(سبا۔۳۴)

۳۔ وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (زخرف۔۲۳)

۴۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ (بقرۃ۔۲۵۸)

۵۔ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ (یونس۔۸۳)

۶۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (قصص۔۴)

۷۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ (عنکبوت۔۳۹)

۸۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ (اعراف۔۷۵)

۹۔قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ(اعراف۔۸۸)

۱۰۔یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْۚ اَفَلَا
تُبْصِرُوْنَؕ۝۵۱

(زخرف۔۵۱)

۱۱۔اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ(قصص۔۲۰)

۱۲۔قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌۙ۝۱۰۹ (اعراف۔۱۰۹)

۱۳۔وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی
الْاَرْضِ(اعراف۔۱۲۷)

۱۴۔قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ(اعراف۔۶۶)

۱۵۔فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا(هود۔۲۷)

۱۶۔فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ۝۵۴ (زخرف۔۵۴)

۱۷۔وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا۝۶۷
(احزاب۔۶۷)

۱۸۔وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ
عَنِیْدٍ۝۵۹ (هود۔۵۹)

۱۹۔لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِیْنَ۝۳۱ (سبا۔۳۱)

۲۰۔اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ (سبا۔۳۳)

۲۱۔اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ(توبة۔۳۱)

۲۲۔وَتَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۶۲ (مائدۃ۔۶۲)

۲۳۔لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۝۶۳ (مائدۃ۔۶۳)

۲۴۔ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (بقرۃ۔۷۵)

۲۵۔فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۝۷۹ (بقرۃ۔۷۹)

۲۶۔وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝۸۹ (بقرۃ۔۸۹)

۲۷۔اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝۱۴۶ (بقرۃ۔۱۴۶)

۲۸۔اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۝۱۵۹ (بقرۃ۔۱۵۹)

۲۹۔اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۱۷۴ (بقرۃ۔۱۷۴)

۳۰۔وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۱۰۱

(بقرۃ۔۱۰۱)

تفسیر۔

اصلاح احوال کی کوئی دعوت بھی دنیا میں تمام افراد کو اپنا شیدا نہیں بنا سکتی کیونکہ اس طرح کی ہر دعوت بعض لوگوں کے مادی مفادات کے لیے خطرہ ہوتی ہے، لہٰذا وہ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں لہٰذا یہ خیال کرنا کہ تمام لوگ انبیاء کی دعوت پر لبیک کہیں ایک درست سوچ نہیں ہے بلکہ عقل مند مخلص اور حقیقت طلب لوگوں کی حمایت اور موافقت ہی کافی ہے۔

جس دن سے انبیاء نے حق وعدالت کی آواز بلند کی اُسی دن سے دو گروہوں نے سب سے زیادہ اُن کی مخالفت شروع کر دی

۱۔ثروت مند

۲۔مستکبر

ثروت مند کہ جنہیں قرآن نے مترفان کے لفظ سے یاد کیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو مادی امکانات وسائل رکھنے کی وجہ سے آرام طلبی کے عادی ہو چکے تھے۔اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ حد سے تجاوز کرتے جب کہ متکبرین ایسے سیاسی عناصر تھے جنہیں اپنے منصب ومقام کی فکر رہتی۔اسے وہ سب چیزوں پر مقدم سمجھتے۔قرآن نے مخالفین کے لیے اگر چہ ''مجرم'' کافر'' اور ''فاسق'' کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں ۔لیکن یہ سب کے سب مترفین اور ''مستکبرین'' کے عنوان کے تحت آجاتے ہیں۔البتہ سادہ لوح اور کمزور ارادے والے لوگ اس گروہ کے آلہ کار بن جاتے لہٰذا نتیجے کے طور پر وہ بھی مخالفین کی صف میں کھڑے ہو جاتے۔اب ہم انبیاء کے مخالفین سے متعلق آیات کو زیر بحث لاتے ہیں ۔لیکن اس سے پہلے یہ نکتہ بتاتے چلیں کہ:

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ انبیاء کے مخالف انسانی شیطان تھے جب کہ بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفت کا دائرۂ کار اس سے وسیع تر تھا۔شیاطین جن بھی ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے۔اُن کی مخالفت کس طرح تھی یہ ابھی زیر بحث نہیں ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شریر آدمیوں اور جنوں کو دشمن قرار دیا جو دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے کان میں بے بنیاد اور پُر فریب باتیں پھونکتے ہیں۔(انعام۔۱۱۲)

لہٰذا انسانوں سے ہٹ کے بھی ان کے دشمن تھے بلکہ آیات قرآن سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء کے پیرو کار انسان کے علاوہ

(جنّ) بھی تھے۔[1]

مذکورہ نکتے کے پیش نظر انسانی مخالفین سے متعلق آیات کو زیر بحث لاتے ہیں۔

۱۔ مترفین

''مترف'' کا مادہ ''ترف'' ہے جو کہ نعمت کے معنی میں ہے مقصود وہ ثروت مند افراد ہیں جو نعمت میں غرق تھے۔ کثرت نعمت کی وجہ سے وہ طغیان اور سرکشی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ کسی رکاوٹ کی پرواہ نہ کرتے۔ قرآن ان لوگوں کی مخالفت کی طرف یوں اشارہ کر رہا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

ہم نے کسی آبادی کے لیے ڈرانے والا نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس آبادی کے خوش حال لوگ اُن سے کہتے کہ ہم تمہاری رسالت کو نہیں مانتے۔ (سبا۔ ۳۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۳﴾

ہم نے آپ سے پہلے کسی جگہ پر ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس جگہ کے خوش حال (اور نعمات میں غرق) لوگ اُن سے کہتے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقے پر پایا اور ہم بھی انہی کی پیروی کریں گے۔ (الزخرف۔ ۲۳)

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ''ترف'' سرکشی کے ساتھ ایک بلا واسطہ رابطہ رکھتا ہے بالخصوص اگر اس کے ساتھ جوانی اور فراغت بھی جمع ہو جائیں تو پھر یہ طغیان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک عرب شاعر کے بقول ؎

انّ الشباب والفراغ والجدة
مفسدة للمرء ای مفسدة

جوانی، فراغت اور ثروت مندی

---

[1] سورۂ جن آیات ۱، ۱۶ کی طرف رجوع کیا جائے۔

انسان کے لیے کس قدر فساد انگیز ہیں!

۲۔ مستکبرین

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو ملک میں سیاسی مقام و منصب کے حامل تھے۔ اگر چہ بعض اوقات ثروت دنیا کے لحاظ سے زیادہ خوش حال نہ بھی ہوتے لیکن پھر بھی اپنا مقام برقرار رکھنے کے لیے مخالفت کرتے تھے۔ قرآن اپنے سلیقے کے مطابق جہاں پر بھی نمونے اور مثالیں پیش کرتا ہے ہمیشہ واضح اور مشہور مثالیں پیش کرتا ہے چاہے وہ حق کی ہوں چاہے باطل کی یہاں پر بھی اس نے نمرود اور فرعون کی مثال بیان کی ہے۔ پہلا حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا اور دوسرا حضرت موسیٰ کا معاصر تھا۔

نمرود کے بارے میں خدا کلمہ 'ملک رکھنے' پر اعتماد کرتا ہے جو کہ اُس کے حاکم ہونے کے معنی میں ہے۔ اس ذریعے سے اُس کی مخالفت کی وجہ بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ

کیا نہیں دیکھتے ہو اُس کی طرف کہ خدا نے جسے حکومت عطا کی تھی اُس نے ابراہیم سے اُس کے رب کے بارے میں نزاع کیا۔ (بقرۃ۔۲۵۸)

فرعون جو رسالت کی مخالفت کی ایک واضح مثال شمار ہوتا ہے اس کے بارے میں "عال" "علا" اور "استکبار" جیسے کلمات استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب حق و حقیقت کے ساتھ ناہم آہنگی کے رویے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کیونکہ منصب پر بیٹھا ہوا شخص فقط تخت کو ہی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ حق و حقیقت کو بھی وہ مقام و منصب کے لیے چاہتا ہے۔ اس سلسلے کی آیات یہ ہیں:

۱۔ وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۸۳﴾

فرعون زمین پر برتری طلب خود خواہ اور اسراف کرنے والوں میں سے تھا۔ (یونس۔۷۳)

۲۔ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا

فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا اور لوگوں کو گروہ گروہ کر دیا۔ (ایک گروہ کو اُس نے غلام بنالیا) (قصص۔۴)

۳۔ وَقَارُوۡنَ وَفِرۡعَوۡنَ وَہَامٰنَ ۟ وَلَقَدۡ جَآءَہُمۡ مُّوۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا کَانُوۡا سٰبِقِیۡنَ ﴿ۚۖ۳۹﴾

موسیٰ واضح اور روشن دلائل لے کر قارون، فرعون اور ھامان کی طرف آئے انہوں نے زمین میں تکبر کا مظاہرہ کیا۔ (عنکبوت۔۳۹)

۴۔قرآن مخالفین کو کبھی نام لیے بغیر"مستکبر" قرار دے رہا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۷۵

قوم صالح کے مستکبر اور خوش حال لوگ مومن اور مستضعف لوگوں سے کہتے کیا تم جانتے ہو کہ صالح واقعا ہی اپنے رب کی طرف سے آیا ہے؟وہ کہتے! ہاں ہم اُس کے دین پر ایمان رکھتے ہیں۔(اعراف۔۷۵)

۵۔حضرت شعیب کے مخالفین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ

قوم شعیب کے وڈیرے آس سے کہتے ہم تمہیں اوران لوگوں کو جو تم پر ایمان لائے ہیں شہر سے باہر نکال دیں گے۔(اعراف۔۸۸)

ان تمام موارد میں مخالفت کی وجہ استکبار اور غرور ہے۔استکبار کا واضح ترین مظہر صاحب منصب ہونا۔منصب کی خواہش رکھنا اور لوگوں پر حکومت رکھنا ہے جو کہ انبیاء کی حکومت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔یہاں تک کہ قارون جسے ان آیات میں مستکبر قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی ثروت اور مال نے اُس کے لیے ایک عزت وعظمت بنا رکھی تھی۔اگر موسیٰ کی طرف وہ لوٹ آتا تو اُس کی یہ قدرت برقرار نہ رہ سکتی۔

بعض آیات میں اگرچہ لفظ "استکبار"نہیں آیا لیکن بعض ایسے جملات آئے ہیں جو اُس گروہ کے استکبار کو بیان کررہے ہیں۔جب فرعون دلیل کے موقع پر حضرت موسیٰ سے شکست کھا گیا تو اُس نے فوراً لوگوں پر اپنی حکومت مصر کی دھاگ بٹھانی شروع کردی اور کہا:

يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا

اے لوگو! مصر کی حکومت اور یہ نہریں جو کہ میرے محل کے نیچے بہہ رہی ہیں کیا میری نہیں ہیں؟ دیکھتے کیوں نہیں ہو؟(الزخرف۔۵۱)

بعض آیات میں مخالفت کی بنیاد"طغیان"اور"سرکشی"قرار دی گئی ہے مسلماً طغیان ایک روحانی صفت ہے جس کا سبب ان دو باتوں میں سے ایک ہے یا تو تکبر اور جاہ طلبی جو کہ اُسے حق وباطل کے درمیان فاصلے کو نظرانداز کرنے پر اُبھارتے ہیں یا پھر"ترف"اور مال اندوزی

نفسانی خواہشات کے طغیان کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں تک مخالفت کے اسباب ''ترف'' اور استکبار سے ہم آگاہ ہوئے۔

۳۔ وڈیروں کی مخالفت

بعض آیات میں لفظ ''ملا'' کو محورِ سخن بنایا گیا ہے۔ اسے بھی زیر بحث لانا چاہیے۔ ملا ''لغت عرب میں اُن لوگوں کو کہتے ہیں جن کی عظمت آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ

مومن آل فرعون نے موسیٰؑ سے کہا: قوم کے وڈیرے تیرے خلاف سازش کرتے ہیں

لیکن وڈیروں کی انبیاء سے مخالفت یا تو گذشتہ دو اسباب کی وجہ سے تھی یا پھر ثروت سرداری اور آرام طلبی [1] کی وجہ سے یا پھر اس لیے کہ سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا۔

ملأ سے مربوط بعض آیات کو ملاحظہ کرتے ہیں:

۱۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾

قوم فرعون کے سرداروں نے کہا موسیٰ ایک دانا جادوگر ہے۔ (اعراف۔۱۰۹)

۲۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ

قوم فرعون کے سرداروں نے اس سے کہا: کیا موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو تم کھلا چھوڑ و گے کہ زمین میں فساد کرتے پھیریں؟ (اعراف۔۱۲۷)

۳۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ سَفَاهَةٍ

---

[1] اس مطلب پر گواہ سورۂ یونس کی آیت نمبر ۸۸ ہے کہ قوم کے ملأ انہیں قرار دیا گیا ہے جو بہت مال ثروت رکھتے تھے ارشاد ہوتا ہے: ''وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' نیز حضرت موسیٰ کے مخالفین کے بارے ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ملأ (جاہ طلب انسان) چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ (مومنون۔۴۵۔۴۶)

قوم ہود کے سرداروں نے اُس سے کہا: ہم تجھ میں بے وقوفی دیکھ رہے ہیں۔(اعراف۔٦٦)

۴۔حضرت نوح کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

قوم نوح کے کافر سرداروں نے اُس سے کہا: ہم تمہیں ایک عام انسان سے زیادہ کچھ نہیں جانتے ۔(ھود۔۲۷)

۴۔فریب خوردہ لوگ

یہ لوگ سرمایہ داروں اور "متکبرین" کے ہاتھوں آلہ کار بنے ہُوئے تھے لیکن وہ نہ یہ لپ فقط خود گمراہ تھے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔اصولاً معاشرے کی اکثریت ایسے سادہ لوح افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو صاحب زور وزر لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں چونکہ یہ سیاسی اور مالی اعتبار سے استقلال نہیں رکھتے لہٰذا اپنا فکری استقلال بھی کھو بیٹھے ہیں۔قرآن نے ایسے افراد کا ذکر کیا ہے جو مذکورہ دو گروہوں کے آلہ کار تھے اور اُن کی گمراہی کے فراڈ اور دھوکے میں آ چکے تھے

فرعون جو کہ خود گمراہ تھا اور موسیٰ کے مخالفین کا لیڈر اُس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾

اُس نے اپنی قوم کو کم عقل سمجھا انہوں نے بھی اس کی پیروی کی وہ فاسق لوگ تھے۔(زخرف۔۵۴)

قیامت کے دن جب ایک گروہ کو جہنم کی طرف بھیجا جائے گا تو وہ خدا سے یوں کہیں گے:

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾

اے ہمارے پرودگار ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ۔(احزاب۔٦٧)

سُورہ حٰم سجدہ کی آیت ۲۹ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

یہ قوم عاد کی سرگذشت ہے جس نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اُس کے رسولوں کی مخالفت کی اور ہر

ستمگر کی پیروی کی۔ (ھود۔۵۹)

قیامت کے دن مستضعفین اور متکبرین کے درمیان جھگڑا ہو گا تو مستضعفین متکبرین سے یہ کہیں گے:

اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان لے آتے۔

لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَكُنَّا مُؤۡمِنِيۡنَ (سبا۔۳۰)

اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان لے آتے۔

پھر متکبرین سے اپنے مناظر کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہیں گے:

اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجۡعَلَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ

تم ہمیں یہ حکم دیتے تھے کہ خُدا کا انکار کریں اور اُس کے لیے شریک قرار دیں۔ (سبا۔۳۳)

البتہ گمراہی کا بیج ہمیشہ بڑے لوگ ہی بوتے ہیں۔ ان کے دباؤ اور طاقت استعمال کرنے کی وجہ سے کمزور اور معمولی لوگ انہی افکار اور خیالات کے عادی ہو جاتے ہیں اور انبیاء کے مخالفین کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے انبیاء کے مخالف چار گروہوں کی طرف اشارہ کیا۔ بنیادی مخالفین دو ہی تھے، (مترفین اور متکبرین) ہم نے یہ بھی بتایا کہ وڈیروں کی مخالفت کی وجہ وہی دو پہلے گروہوں والی ہے، حقیقت میں دونوں ایک ہی ہیں جب کہ چوتھے گروہ کی مخالفت کی وجہ پہلے گروہ کی اندھی تقلید ہے۔ لہٰذا پہلے گروہ پر عذاب ان فریب خوردہ افراد پر عذاب کے مقابلے میں دُگنا ہونا چاہیے۔[1]

یہاں ایک پانچواں گروہ بھی ہے کہ لوگوں کی گمراہی میں جس کا کردار پہلے دو گروہوں سے کم نہیں ہے۔ یہ وہ علماء ہیں جو رشوت لے کر ہر حلال و حرام کام انجام دے دیتے ہیں لوگوں سے حقائق چھپاتے ہیں۔ قرآن میں اس گروہ کا خاص طور پر ذکر آیا ہے۔

۵۔ دُنیا پرست علماء

لوگ ایک عالم سے جس بات کی توقع رکھتے ہیں وہ ایسی توقع نہیں ہے جو وہ ایک معمولی انسان سے رکھتے ہیں کیونکہ علم و دانش کا تقاضا عمل ہے۔ اگرچہ علم کو ایمان کے لیے ایک مکمل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن علم بہرحال ایمان کا ایک پایہ ہے۔ چونکہ علمائے دین شریعتوں سے علم و آگاہی کی وجہ سے لوگوں کو ایمان اور اخلاص کی دعوت دیتے ہیں تو اُن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جادہ حق سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں، بالخصوص عیسائی پادری جو کہ لوگوں کو ہمیشہ زہد و تقویٰ کا درس دیتے ہیں۔ اب اگر ایسے لوگ دنیاوی مناصب کے حصول کے لیے حقائق کو چھپائیں یا خُدا کے حلال و حرام میں گڑبڑ کریں تو اس صورت میں اُن کی ایک عام شخص سے زیادہ مذمت کی جائے گی۔ شاید آخر میں بھی ان کا

---

[1] (اعراف۔۳۸)، (ص۔۶۱)۔ البتہ سادہ لوح افراد کو مختلف طریقوں سے ابھارا جاتا ہے عموماً قومی تعصّبات کو ہوا دے کر انہیں اُبھارا جاتا ہے۔

حساب گمراہ جاہل لوگوں کی نسبت زیادہ سخت ہو۔[1]

کیونکہ لوگ عالم دین پر جو اعتماد رکھتے ہیں اس کے باعث اُسے مذہبی مسائل کا ماہر اور اس کے کردار و گفتار کو سند کی حیثیت دیتے ہیں ۔لہٰذا اگر عالم دین خواہش نفس کا پیروکار بن جائے تو نہ فقط یہ کہ اُس نے اپنے آپ کو اس دلدل میں گرایا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے آلودہ کرے گا۔

اس سے بدتر یہ ہے کہ ایک عالم دین سیاسی قوتوں اور معاشرے کے سرمایہ دار لوگوں کا آلہ کار بن جائے۔اس وقت مستکبر ین اور سرمایہ دار علمائے دین کے ذریعے معاشرے کی لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے ہیں،لوگوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ایسے موقعے پر ہی اُس دینی عالم اور زاہد وارستہ جو کسی قیمت پر بھی حقیقت چھپانے یا تحریف کرنے پر راضی نہیں ہوتے،کی اہمیت اُن عالم نما افراد کے مقابلے میں واضح ہو جاتی ہے جو اپنے علم کو جاہ طلبی اور مال و ثروت کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔اس کے لیے وہ سیاسی قوتوں اور معاشرے کے سرمایہ داروں کا آلہ کار بھی بننا پسند کر لیتے ہیں۔

قرآنی آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی دعوت اور ان کے اثر و نفوذ کی رکاوٹ بنتے تھے وہ یہودی اور عیسائی علماء تھے۔پہلے کو ''احبار'' اور دوسرے کو ''رھبان'' کہا گیا ہے۔یہ لوگ صاحب اقتدار لوگوں کی خوشی اور اپنے مقام و منصب کی بقاء کے لیے دو طریقے اختیار کرتے تھے:

۱۔حقائق کی تحریف کرتے۔

۲۔حقائق چھپاتے۔

خُدا نے بنی اسرائیل پر انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے مکمل احکام نازل کیے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قانون انسان کی آزادی محدود کر دیتا ہے۔آزادی کا محدود ہونا خواہشات نفس کے مخالف ہے۔دینی علماء فتویٰ اور قضاوت کے مرجع تھے۔ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ تورات کے احکام کو کسی کمی بیشی کے بغیر بنی اسرائیل کے معاشرے میں نافذ کریں۔لیکن جب طاقت اور دولت کے نشے میں مدہوش لوگ انحراف کی راہ اپناتے تو ان کے لیے بھی احکام کا نفاذ کچھ مشکل ہو جاتا۔وہ رشوت لے کر احکام الٰہی کو تبدیل کر دیتے۔جب کہ غریب اور کمزور لوگوں پر وہی قانون پوری طرح سے نافذ کیا جاتا۔

بہر حال اُن کا ایک بُرا کام احکام الٰہی کی تحریف کے لیے رشوت خوری تھا۔بعض ''احبار'' اور ''رھبان'' کی زندگی میں یہ بات پوری طرح واضح تھی۔

عدی بن حاتم کہتے ہیں:

میں نے پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کی شہرت اپنی بہن کی زبانی سنی۔ان کے مقام و منزلت کی پہچان کے لیے اور یہ جاننے کے لیے کہ کیا

---

[1] مجمع البحرین جلد ۳ ص ۲۳، ۲۴ مختصر سی تشریح کے ساتھ۔

واقعاً اُس کی دعوت الٰہی ہے یا نہیں میں نے شام سے مدینے کی طرف کوچ کیا جب میں آپؐ کے حضور پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ اس آیہ شریفہ کی تلاوت فرمارہے ہیں:

اتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

اہل کتاب نے اپنے دینی علما کو اپنے خدا بنالیا ہے۔(توبۃ۔۳۱)

اس وقت میں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا:

ہم ان کے لیے ہرگز اس (مقام ربوبیت) کے قائل نہیں ہیں۔

پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا:

اگر کسی چیز کو تورات حرام قرار دے لیکن تمہارے علمائے دین اُسے حلال قرار دیں، یا اس کے برعکس، تو تم کسے مقدم قرار دو گے؟

میں نے کہا:

علمائے دین کی بات کو جب کہ مجھے معلوم بھی ہے کہ وہ حکم خُدا کی مخالفت کررہے ہیں۔

پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا:

یہی کام ان کی ربوبیت کا اعتراف ہے۔[۱]

''ربوبیت''''لفظ''رب'' سے ماخوذ ہے جو صاحب کے معنی میں ہے۔گویا انہوں نے قانون کی باگ ڈور علمائے دین کے ہاتھ میں دے کر انہیں اپنا صاحب اور رب بنالیا تھا۔قانون گزاری کا وہ حق جو کہ خُدا کے لیے ہے وہ انہوں نے انسان کے سپرد کر دیا۔ان کو انہوں نے اپنا مختار کل بنالیا۔

اس سلسلے میں ائمہ اہل بیت سے کئی روایات وارد ہوئی ہیں جنہیں بُرھان اور نورالثقلین جیسی کتب تفسیر میں دیکھا جاسکتا ہے۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

یہود و نصاریٰ ''احبار'' اور ''رھبان'' کے لیے نماز نہیں پڑھتے تھے اور ان کے لیے روزہ نہیں رکھتے تھے بلکہ حلال و احرام میں وہ ان کے مطیع بن گئے تھے۔

جسے وہ حلال قرار دیتے اسے یہ حلال سمجھنا شروع کر دیتے اور جسے وہ حرام قرار دیتے اسے یہ بھی حرام سمجھنا شروع کر دیتے۔[۲]

کبھی یہ لوگ خود بلا واسطہ پر تو گناہ سے آلودہ نہ ہوتے بلکہ گناہ سے آلودہ لوگوں کے سامنے حکومت اختیار کرتے۔

ارشاد ہوتا ہے

---

[۱] مجمع البیان جلد ۳، مطبوعہ صیدا

[۲] مجمع البیان جلد ۳ مطبوعہ صیدا

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ
الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

تو اُن (اہل کتاب) میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، دوسروں کے حقوق کی پامالی اور حرام خوری میں جلدی کرتے ہیں۔ وہ کیا ہی بُرا کام انجام دیتے ہیں! خُدا پرست علما اور مذہبی رہنماؤں نے انہیں کیوں نہ بُری باتوں اور حرام خوری سے روکا؟ وہ کیا ہی بُرا کام سر انجام دیتے ہیں۔ (مائدۃ۔ ۶۲۔ ۶۳)

قرآن کی متعدد آیات نے اہل کتاب علماء کی تحریف کا تذکرہ کیا ہے اور تورات و انجیل کی آیات کے اِدھر اُدھر کرنے پر ان کی مذمت کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ

اُن میں سے ایک جماعت کلام خُدا کو سنتی تھی اور سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتی تھی۔[1] (البقرۃ۔۷۵)

علمائے بنی اسرائیل کی بداعمالی کبھی تو اس درجے تک پہنچ جاتی کہ وہ اپنی آسمانی کتاب کو تحریف کر کے لکھتے اور پھر لوگوں میں اسے پھیلا دیتے تاکہ اس ذریعے سے وہ ان لوگوں سے پیسے وصول کریں جن کے دنیاوی مفادات کے لیے تحریف بہت مفید ہوتی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

افسوس ہے اُن پر جو آسمانی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ (تحریف شدہ) کتاب خُدا کی جانب سے ہے تاکہ اس سے تھوڑی سی قیمت وصول کر لیں۔ افسوس ہو ان کے ہاتھوں کی لکھائی پر اور افسوس ان کی کمائی پر۔ (بقرۃ۔۷۹)

البتہ ان کی تحریف صرف احکام کو تبدیل کرنے میں منحصر نہ تھی بلکہ جب لوگ پیغمبر خاتمؐ سے متعلق بشارتوں کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تو اس میں بھی وہ تحریف کر جاتے اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق تورات کی بشارتوں کی من مانی تفسیر کرتے۔ جب اوس و خزاج اُن سے کہتے کہ

---

[1] نساء ۴۶ اور مائدہ ۱۳۔ ۱۴ بھی اسی مضمون کی حامل ہیں۔

تم اہل کتاب تو بعثت سے قبل ہمیں ایسے دین اور پیغمبر کی طرف بلاتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے کہ اُس کے ظہور کے بعد تم اپنا منہ موڑ لیا ہے تو وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ کہتے:

وہ بشارتیں اس پیغمبر کے بجائے کسی اور سے مربوط ہیں۔

قرآن اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے (نبی خاتمؐ کی نبوت سے متعلق آیات) تو (انہوں نے اس کا انکار کیا) اور پہلے وہ خود کافروں کے خلاف فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب وہ ان کے پاس آ گئی جسے انہوں نے پہلے پہچانا ہوا تھا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ کی لعنت ہوا نکار کرنے والوں (کافروں) پر۔ (البقرۃ۔۸۹)

اس آیت سے مراد نبی خاتمؐ سے متعلق وہ بشارتیں ہیں جو عہدین (تورات، انجیل) میں موجود تھیں لیکن وہ اُس کی تفسیر اور تطبیق کے وقت تحریف کر جاتے اس پیغمبر کی بعثت کے زمانے کو اگلے کسی دور پر ڈال دیتے۔ [۱]

خاتمے میں اہل کتاب کی تحریم حلال اور تحلیل حرام سے متعلق تحریف کے معنی کے لیے ایک حدیث ذکر کرتے ہیں۔

مسلم اپنی صحیح میں بیان کرتے ہیں کہ بنی زہرہ کی ایک ''فاطمہ'' نامی عورت نے چوری کی۔ ''ابوسالم'' نامی شخص نے اُس کی سفارش کی۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ حدود الٰہی کے سلسلے میں سفارش نہیں کرنا چاہیے۔

مزید فرمایا:

اَنَّمَا هَلَكَ النَّاسُ قَبۡلَكُمۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡٓا اِذَاسَرَقَ الشَّرِيۡفُ فِيۡهِمۡ تَرَكُوۡهُ وَاِذَا سَرَقَ الضَّعِيۡفُ فِيۡهِمۡ اَقَامُوۡا عَلَيۡهِ الۡحَدَّ۔۔ [۲]

تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہُوئے کہ جب بھی اُن میں سے کوئی بڑا شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیا

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱ ص ۱۵۸

[۲] صحیح نسائی جلد ۸ کتاب قطع السارق ۲۷۔

جاتا اور جب کوئی کمزور شخص چوری کرتا تو اُس پر حد جاری کی جاتی۔

حقائق چھپانا

علمائے یہود ونصاریٰ کا ایک اور بُرا کام یہ تھا کہ وہ کتمان حقائق کرتے تھے، حقائق چھپانا اُن کی تحریف کرنے سے مختلف ہے تحریف احکام اور قوانین الٰہی کو کم وزیادہ کرنے سے ہوتی تھی یا نبی خاتمؐ سے متعلق بشارتوں میں تصرف کرنے سے جب کہ کتمان تورات میں کسی حکم یا انجیل میں کسی بشارت کی موجودگی کا انکار کرنے کی صورت میں ہوتا تھا۔ یہاں نہ فقط وہ خواہ گمراہ ہوتے بلکہ دوسرے لوگوں کی گمراہی کا سامان بھی فراہم کرتے۔ اگر وہ حقیقی عالم دین اور اپنے مذہب کے سچے پیروکار ہوتے تو ختمی مرتبت کے ظہور کے وقت اپنے اندر ایک انقلاب برپا کر لیتے ۔کئی سال تک جس بات کی وہ تبلیغ کرتے رہے تھے وہ اب آشکارا طور پر لوگوں کو بتاتے۔ لیکن یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی قوم سے ان حقائق کو چھپایا۔ ان کی قوم بھی اُمی اور ان پڑھ تھی۔

سورۂ بقرہ جو کہ ان سورتوں میں سے ہے جو ہجرت کے ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلامؐ پر مدینے میں نازل ہوئی۔ اہل کتاب کا پیغمبرؐ اسلام سے نزاع بھی وہیں شروع ہوا۔ اس سورۃ نے متعدد آیات میں ان کے کتمان حقائق کی بات کی ہے۔ ہم وہ آیات ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡہُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ (پیغمبر) کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں۔ بے شک اُن میں ایک جماعت جاننے کے باوجود حق کو چھپاتی ہے۔ (بقرۃ۔۱۴۶)

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

جو لوگ دلائل اور نشانیوں کو اس کے بعد کہ ہم نے لوگوں کے لیے انہیں بیان کیا ہے، چھپاتے ہیں خدا اور لعنت کرنے والے اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔ (بقرۃ۔۱۵۹)

۳۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۴﴾

جو لوگ چھپاتے ہیں اُس کو جو ہم نے اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے بھیجا ہے اور اسے تھوڑے سے

پیسوں کے ساتھ بیچ دیتے ہیں وہ حقیقت میں آگ کے علاوہ کچھ نہیں کھا رہے۔خدا قیامت کے دن نہ تو
اُن سے بات کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے
۔(بقرۃ۔۱۷۴)

بعض اوقات قرآن اہل کتاب کے بارے میں یوں کہتا ہے کہ انہوں نے کتاب خُدا کو پس پشت ڈال دیا اور اس کا اعتنا نہیں کیا ۔ممکن ہے یہ انہوں نے تحریف کے ساتھ کیا ہو اور اسی طرح ممکن ہے حقائق اور بشارتوں کو چھپا کر۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

جب خُدا کی جانب سے ایک رسول آیا جو اُس کتاب کی تصدیق کرنے والا تھا جو اُن کے پاس تھی تو اہل
کتاب کی ایک جماعت نے کتاب خُدا کو پس پشت ڈال دیا۔گویا وہ اُسے جانتے ہی نہیں
۔(بقرۃ۔۱۰۱)

اگلے ستائیسویں حصہّ میں جو مخالفت کے محرکات سے متعلق ہے،اس سلسلے میں ہم مزید گفتگو کریں گے اور یہ بحث مکمل کریں گے۔۔

(۲۷) مخالفت کے محرّکات

آیات مورد بحث

۱۔ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (ھود۔۶۱)

۲۔ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ (ھود۔۶۲)

۳۔ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ (انبیاء۔۵۳)

۴۔ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ (شعراء۔۷۴)

۵۔ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ (ھود۔۸۷)

۶۔ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (یونس۔۷۸)

۷۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (بقرۃ۔۱۷۰)

۸۔ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ (روم۔۷)

۹۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ (مؤمن۔۸۳)

۱۰۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ (قصص۔۷۸)

تفسیر

ہم انبیاء کے مخالف گروہوں سے گذشتہ بحث میں آشنا ہُوئے۔ جو چیز قابل اہمیت ہے وہ ان کی مخالفت کے اسباب اور محرکات کی پہچان ہے۔سب سے پہلے ہم ان کی مخالفت کے محرکات بیان کرتے ہیں۔

انبیاء کی مخالفت سے مربوط آیات کی تحقیق سے مجموعی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس سلسلے کے محرکات مندرجہ ذیل امور میں منحصر ہیں:

۱۔آباؤاجداد کے دین پر تعصب

۲۔علمی غروراور زندگی کا دائرکار محدود سمجھنا (اس مادی دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا نہیں ہے)۔

۳۔خواہشات نفس کی پیروی

اب ان محرکات کی تشریح کی جاتی ہے۔

''اتراف''اور''مترفین'' کی پہچان کے ساتھ ساتھ ہم نے ان کی مخالفت کے عوامل بھی پہچانے عیاش اور مال دار لوگ ہمیشہ اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کے پیچھے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ کسی حدو مرز کے قائل نہیں ہوتے۔چونکہ دین کو وہ اپنی خواہشات کی آزادی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں لہٰذا اُس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔چونکہ ''مترفین'' سے متعلق آیات پہلے بیان کی جا چکی ہیں لہٰذا انہیں دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح ہم نے انبیاء کی ایک اور شدید مخالف جماعت بنام''مستکبر ین'' کو پہچانا۔مستکبر وہ لوگ تھے جو مقام ومنصب سے شدید محبت رکھتے تھے۔انبیاء کی دعوت کے قبول کرنے کو وہ اپنے منصب کی بقاء کے ساتھ ہم آہنگ نہ سمجھتے تھے۔لہٰذا وہ مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ،مترفین اورمستکبر ین' چونکہ انبیاء کے شدید مخالف تھے لہٰذا ''ترف''اور''کبر' مخالفت کے محرکات شمار ہوں گے اس سے متعلق آیات پچھلے باب میں بیان کی جا چکی ہیں۔

اصل بات ترتیب سے بیان شدہ مذکورہ تینوں محرکات سے متعلق گفتگو ہے۔

۱۔آباءواجداد کے دین پر تعصب

''تعصب'' کا مادہ عصب ہے جو پسینے اور چربی کے معنی میں ہے۔اس کی حقیقت نسل پرستی کی طرف پلٹتی ہے۔گویا اپنی قوم اور خاندان سے محبت اس بات کا باعث بنتی ہے کہ تمام حقائق کو فراموش کر دیا جائے یا کم ازکم مسائل میں اُن (خاندان) کے مخالف فکر نہ رکھی جائے۔یہ عامل عموماً عام افراد میں پیدا ہوتا تھا۔اُن کے پاس نہ تو مال وثروت تھا اور مذہبی مقام ومنصب مخالفت پر۔جو چیز انہیں اُبھارتی تھی وہ یہ تھی کہ ان کے لیے اپنے آباءواجداد کی روش سے دست بردار ہونا بہت مشکل تھا۔اکثر انبیاء کو ایسے لوگوں اور ایسے محرکات سے واسطہ پڑا ہے۔اب ان

آیات میں ہم ترتیب وار انبیاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ جب حضرت صالح نے اپنی قوم سے کہا:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔

اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

توانہوں نے جواب دیا:

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

کیا تم ہمیں اُس سے روکتے ہو جس کی عبادت ہمارے آباء واجداد کرتے تھے؟

ہمیں تمہارے دعویٰ کی سچائی میں شک ہے۔ (ھود۔ ۶۲)

۲۔ جب حضرت ابراہیم نے روشن دلائل کے ساتھ بُت پرستی کے باطل ہونے کو ثابت کر دیا تو انہوں نے ابراہیم کو یہ جواب دیا:

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ (انبیاء۔ ۵۳)

پھر یہ کہا:

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ (شعراء۔ ۷۴)

۳۔ جب حضرت شعیب نے اپنی قوم کو ایک خُدا کی عبادت کی طرف پکارا تو انہوں نے یہ جواب دیا:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (ھود۔ ۸۷)

کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم سے یہ کہو کہ جس چیز کی عبادت ہمارے آباء اجداد کرتے تھے اُسے ہم چھوڑ دیں؟

۴۔ حضرت موسیٰؑ بن عمران نے جب فرعونیوں کو رب واحد کی عبادت کی دعوت دی تو انہوں نے اسکے جواب میں یہ کہا:

اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (یونس۔ ۷۸)

کیا تم ہماری طرف اس لیے آئے ہو تا کہ ہمیں ہمارے آبا و اجداد کی راہ سے روکو؟

۵۔ نبی اکرمؐ کی مخالفت کی ایک وجہ آباء اجداد کی پیروی قرار دی گئی ہے یہ بات (بقرہ۔ ۱۰۷) (مائدہ۔ ۱۰۴) (اعراف۔ ۲۸) (لقمان۔ ۲۱) اور (صافات۔ ۶۹، ۷۰) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم صرف ایک کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

جب اُن سے کہا جاتا کہ جو خُدا نے نازل کیا ہے اُس کی پیروی کرو جواب میں کہتے: ہم اُس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا اگرچہ اُن کے آباء کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ ہوں (کیا پھر بھی وہ پیروی کے قابل ہیں)؟ (بقرۃ۔۱۷۰)

اس حصے سے مربوط آیات ان سے کہیں زیادہ ہیں کہ جنہیں ہم نے یہاں ذکر کیا ہے کیونکہ مذکورہ آیات کے علاوہ بعض آیات ایسی ہیں جو کلی اور عمومی انداز میں یہ بیان کرتی ہیں کہ انبیاء کی مخالفت کا ایک محرک آباء اجداد کے طریقے پر بے جا تعصب تھا۔ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تعصب ایک پرانی بیماری ہے۔یہ آیات سورہ ابراہیم آیت ۱۰ اور سورہ زخرف آیات ۲۲، ۲۳، اور ۲۴ ہیں۔

۲۔علمی غرور

علم پر ناز کرنا صرف موجودہ صدی کی بیماری ہی نہیں بلکہ انسان ہمیشہ اپنے تھوڑے اور معمولی سے علم پر گھمنڈ اور غرور کرتا رہا ہے۔وہ اپنی اس چھوٹی سی عقل کے ساتھ انبیاء کے مقابلے میں چلا یا جاتا جبکہ بلند علم شخصیات تو ہمیشہ اپنے علم کو معمولی اور کمزور سمجھتی رہی ہیں وہ اسے ''علم'' کا نام ہی نہیں دیتے جب وہ اپنی معلومات کا موازنہ اپنی مجہولات سے کرتے ہیں تو انہیں بیکراں سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ قرار دیتے ہیں۔اُن کا علم جتنا بڑھتا جاتا ہے تو اپنی جہالت سے ان کی آگاہی بھی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔اس سلسلے میں شیخ الرئیس ابن سینا سے یہ شعر منقول ہے۔

تا بہ جائی رسید دانش من
کہ بد انستمی کہ نادانم

''جب میرا علم ایک مرتبے پر پہنچ گیا تو مجھے یہ معلوم ہُوا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا۔''

عصر حاضر میں فزکس کے مشہور سائنسدان آئن سٹائن جب اپنی بہت بڑی لائبریری کی سیڑھیوں کے سامنے کھڑا تھا تو اُس سے ایک نامہ نگار نے پوچھا کہ آپ کی معلومات اور مجہولات کے درمیان کیا نسبت ہے؟ اُس نے جواب دیا: ان دونوں کے درمیان ایسی ہی نسبت ہے جیسے کہ اس عظیم عمارت اور اس چھوٹی سی سیڑھی میں ہے۔[1]

---

[1] مجلہ ''رسالۃ الاسلام'' ناشر دار التقریب بین المذاہب الاسلامیہ احمد امین مصری جب مذکورہ مقالے میں اس جملے پر پہنچے ہیں تو اس کے بعد لکھتے ہیں: ولو انصف لقال بل ازیں۔اگر انصاف سے کام لیتا تو یہ کہتا کہ اس سے بھی بڑھ کے ہے۔

قرآن ایک مختصر سے جملے کے ذریعے انسان کے علم کی محدودیت بیان کر رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل۔ ۸۵)

تمہیں تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں انسان کا علم صرف ظاہری اور سامنے والی زندگی سے مربوط ہے۔ وہ اس دنیا کے باطن سے کوئی خبر نہیں رکھتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖۚ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۷﴾

وہ دُنیا کے ظاہر سے آگاہ ہیں اور دوسری دنیا سے بے خبر ہیں۔ (روم۔ ۷)

اب جب کہ انسان ٹیکنالوجی اور مادی روابط کی پہچان میں کچھ قدم آگے بڑھ آیا ہے تو پھر بھی حقیقی علماء اپنے علم کو معمولی اور ناچیز سمجھتے ہیں۔ اسلام اور اُس سے پہلے دور کے بارے میں تو پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت تو انسان کا علم اس سے بھی محدود تر تھا۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں کچھ لوگ اپنے ناچیز علم کا سہارا لیتے، انبیاء کی مخالفت شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۸۳﴾

جب ان کے انبیاء ان کی طرف روشن دلائل لے کر آتے تو وہ اپنے علم و دانش سے اپنا دل خوش کرتے لیکن انبیاء کے مذاق اڑانے کی سزا انہیں دامن گیر ہو گئی۔ (مؤمن۔ ۷۳)

البتہ اس آیت سے استدلال اُس وقت کیا جا سکتا ہے۔ جب ''فرحوا'' اور ''بما عندھم'' میں موجود ضمائر سے مراد کفار ہوں نہ کہ انبیاء یہ دوسرا احتمال ضعیف ہے۔ علم سے مُراد وہی محدود آگاہی تھی جس کی وجہ سے وہ زندگی کو فقط دنیا میں منحصر سمجھتے تھے اور موت کو زندگی کا اختتام قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ نبی سے کہتے کہ قیامت اور حساب کتاب کا کوئی دن نہیں ہے۔

قارون نے اپنے علم سے بہت سے خزانے جمع کر لیے۔ جب بنی اسرائیل کے مومن بندے اُس سے کہتے کہ اس مال و دولت کے ذریعے آخرت کی دنیا کا کچھ سامان کر و اور اس دنیا سے اپنے حصے فراموش نہ کرو (جو کہ بہت کم ہے) نیکی کرو جیسے کہ خُدا نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ کہ خدا فساد پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا[1] (جب اُس نے یہ باتیں سنیں تو جواب میں یہ کہا)

اِنَّمَآ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ ؕ

---

[1] قصص۔ ۷۷

میں نے یہ مال اپنے علم سے اکٹھا کیا ہے۔(قصص۔۷۸)

قرآن اس جواب کو رد کرتے ہُوئے۔یہ یاددہانی کرواتا ہے کہ اگر نجات کے لیے علم ہی کافی ہوتا تو اُس سے پہلے والی امتیں جو زیادہ طاقت والی تھیں وہ کیوں ہلاک ہُوئیں۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا ؕ

کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ خُدا نے ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جو اس سے زیادہ طاقت اور مال و دولت والی تھیں ؟(قصص۔۷۸)

علاوہ ازیں اُس سے یہ پوچھنا چاہیے کہ اُس نے یہ علم و دانش کیسے حاصل کیا ہے۔کیا اس کے علاوہ ہے کہ اُس نے خُدا کی نعمتوں کے طفیل اشیاء کے خواص سے آگاہی حاصل کی ہے۔سونے اور چاندی تک جو کہ خُدا کی مخلوق ہے اُس نے دسترس حاصل کی بلکہ اس راہ میں اُس نے جو سرمایہ اور مال خرچ کیا ہے وہ بھی خُدا کا تھا۔حقیقت میں خُدا کے لطف و کرم کے سوا اس خانۂ ہستی میں کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کا وہ مالک اور صاحب بن سکے۔

۳۔خواہشاتِ نفس

خواہشات نفس سے مُراد انسان کا عقلی خواہشات کی بجائے حیوانی خواہشات کی پیروی کرنا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ دین خواہشات نفس کے مخالف ہے۔نفسانی خواہشات میں فرد یا معاشرے کی بھلائی سامنے نہیں ہوتی بلکہ صرف اپنے نفس کی لذت کا خیال رکھا جاتا ہے اس طرح کا نظریہ مکتب الٰہی نہیں ہوسکتا۔اسی وجہ سے شہوت پرست اور خواہشات نفس کے تابع انبیاء کی مخالفت کرتے تھے۔یہ اُن کی عدالت خواہی،عدالت پسندی اور سادہ زندگی کی مخالفت کرتے۔

لیکن اگر اس محرک کے بارے میں غور کیا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ خواہشات نفس ہی مذکورہ تمام عوامل کی بنیاد ہیں۔کیونکہ اگرچہ شہوت پرستی،مقام و منصب کا خیال آباء اجداد کے طریقے پر تعصب یا محدود علم سے دل خوش کرنا انہیں انبیاء سے مقابلے کے لیے اُبھارتے تھے لیکن اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ وہ مقابلے کے وقت اپنی عقل و خرد کو پیچھے ہٹا کر خواہشات نفسانی سے کام لیتے۔وہ آیات جو اس سلسلے میں خواہشات نفس کو مخالفت کا عامل شمار کرتی ہیں وہ حقیقت میں گذشتہ عوامل پر بھی دلیل بن سکتی ہیں۔[1]

[1] اس عامل سے مربوط آیات مندرجہ ذیل ہیں (بقرۃ۔۸۷)،(عائدہ۔۷۰)،(قصص۔۵)،(کہف۔۲۸)،(حاشیہ ۲۳)،(محمد۔۱۶)،(قمر۔۳)

(۲۸)

مخالفت کے ہتھکنڈے تہمتیں اور تنقیدیں

زیر بحث آیات

۱۔ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۵۲

(ذاریات۔ ۵۲)

۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ۝۹

(قمر۔ ۹)

۳۔ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝۱۵۳ (شعراء۔ ۱۵۳)

۴۔ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹ (ذریت۔ ۳۹)

۵۔ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝۵۱ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۵۲ (قلم۔ ۵۱،۵۲)

۶۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۶ (اعراف۔ ۶۶)

۷۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ (بقرۃ۔ ۱۰۲)

۸۔ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝۷۰ (طٰہٰ۔ ۷۰)

۹۔ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ (ص۔ ۴)

۱۰۔ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝۲۴ (مدثر۔ ۲۴)

۱۱۔ وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۱۸۶ (شعراء۔ ۱۸۶)

۱۲۔ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ (سبا۔ ۸)

۱۳۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ

دِيۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ يُّظۡهِرَ فِى الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ۝۲۶ (مؤمن۔۲۶)

۱۴۔اَتَذَرُ مُوۡسٰى وَقَوۡمَهٗ لِيُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ‌ؕ

(اعراف۔۱۲۷)

۱۵۔يٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَكۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ

الصّٰدِقِيۡنَ۝۳۲

(هود۔۳۲)

۱۶۔يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ(هود۔۵۳)

۱۷۔اِنَّا كَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ وَاِنَّا لَفِىۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ۝۹

(ابراهيم۔۹)

۱۸۔يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ۝۲۵ (انعام۔۲۵)

۱۹۔لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ هٰذَاۤ‌ۙ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ۝۳۱ (انفال۔۳۱)

۲۰۔وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰٓى اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ

بَشَرًا رَّسُوۡلًا۝۹۴ (بنی اسرائیل۔۹۴)

۲۱۔ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ

اٰبَآؤُنَا(ابراهم۔۱۰)

۲۲۔ اَبَشَرٌ يَّهۡدُوۡنَنَا فَكَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا (تغابن۔۶)

۲۳۔قُلۡ لَّوۡ كَانَ فِى الۡاَرۡضِ مَلٰۤئِكَةٌ يَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّيۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَيۡهِمۡ مِّنَ

السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوۡلًا۝۹۵ (بنی اسرائیل۔۹۵)

۲۴۔قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ۝۱۱۱ؕ (شعراء۔۱۱۱)

۲۵۔اَمۡ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ مَهِيۡنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيۡنُ۝۵۲ فَلَوۡلَاۤ اُلۡقِىَ عَلَيۡهِ

اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ (زخرف۔۵۲۔۵۳)

۲۶۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ
وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ
اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (الكهف۔۲۸)

۲۷۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾
(سبا۔۳۴۔۳۵)

۲۸۔ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ (سبا۔۳۷)

۲۹۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ
وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ (هود۔۹۱)

۳۰۔ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۭ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ (نمل۔۴۷)

۳۱۔ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا
بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾
(اعراف۔۱۳۱)

۳۲۔ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ
يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ (نساء۔۷۸)

۳۳۔ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ (هود۔۳۸)

۳۴۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ (حجر۔ ۱۱)

۳۵۔ وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ (کهف۔ ۵۶)

۳۶۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۷﴾ (زخرف۔ ۷)

۳۷۔ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ (انبیاء۔ ۳۶)

۳۸۔ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾
(فرقان۔ ۴۱)

۳۹۔ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾
(بقرة۔ ۱۴)

۴۰۔ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ
وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿۷﴾ (نوح۔ ۷)

۴۱۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ
تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾
(حٰم السجدة۔ ۲۶)

۴۲۔ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ (شعراء۔ ۱۱۶)

۴۳۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ
لَاَرْجُمَنَّكَ (مریم۔ ۴۶)

۴۴۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ (اعراف۔ ۸۸)

۴۵۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ
مِلَّتِنَا ؕ (ابراهيم۔ ۱۳)

۴۶۔ قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۶۸﴾ (انبیاء۔۶۸)

۴۷۔ وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ (نساء۔۱۵۷)

۴۸۔ وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ‌ؕ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ‌ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾ (انفال۔۳۰)

۴۹۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ‌ؕ (بقرۃ۔۶۱)

۵۰۔ قًا كَذَّبُوۡا وَفَرِيۡقًا يَّقۡتُلُوۡنَ ﴿۷۰﴾ (مائدۃ۔۷۰)

تفسیر۔

انبیاء کے مخالفین مجموعی طور پر دو ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے، ایک تہمت اور افتراء دوسرے بے جا اعتراضات یعنی حقائق کی تفسیر غلط انداز میں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ کبھی تو وہ تہمت لگاتے اور کبھی وہ ایسی باتوں کو جو کہ ایک لحاظ سے نکتہ قوت ہوتی تھیں انہیں کمزور خیال کرتے۔ ان دونوں ہتھکنڈوں کو ہم متعلقہ آیات کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

پوری تاریخ میں ہمیشہ مصلحین لوگوں کو مخالفین کی طرف سے ناروا تہمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ ان پر بعض نفسیاتی تہمتیں لگاتے۔ ان تہمتوں کی تحقیق سے یہ حقائق روشن ہوتے ہیں کہ انبیاء کے مخالفین ان پر مالی جنسی آدم کشی یا خونریزی وغیرہ کے الزامات نہ لگا سکے۔ کیونکہ اُن کی زندگی اتنی پاک و پاکیزہ تھی کہ یہ تہمتیں اُن پر نہیں لگائی جا سکتی تھیں۔ لوگ بھی قبول نہ کرتے۔ اسی وجہ سے وہ اُن پر بعض ایسی روحانی اور نفسیاتی تہمتیں لگاتے جن کا اثبات یا نفی مشکل تھی جیسے جادو اور رکہانت کا الزام یا دیوانگی اور جنون کا بہتان وغیرہ۔

انبیاء پر بہتان باندھنے سے متعلقہ آیات کی تحقیق سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ مخالفین کا ردعمل اس سلسلے میں تین طرح سے ہوتا۔ بعض دفعہ وہ انبیاء پر بے بنیاد الزامات اور ناروا تہمتیں لگاتے۔ بعض اوقات ان کی زندگی میں موجود حقائق کی غلط تفسیر کرتے اور بعض اوقات وہ ان کے مقابلے میں عملی یا لفظی ردعمل کا مظاہرہ کرتے۔ اب ہم ان تینوں موضوعات کے بارے میں مختصر تحلیل کرتے ہیں۔

ا۔ جنون

''جنون'' جس کا فارسی مترادف ''دیوانگی'' ہے ایک عمومی تہمت ہے جو توحید کے اکثر علم برداروں پر لگائی گئی کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ

معاشرے کی خواہشات کے خلاف چلتے۔ ایسی حرکت جو کہ پانی کے مخالف سمت میں جانے والی حرکت کے مانند ہے لوگوں کی نظروں میں ایک محال اور مجنونانہ حرکت ہے۔ ان کے نزدیک بے وقوف اور کم عقل لوگ ہی ایسا کام کر سکتے ہیں۔

''مجنون'' لفظ ''جن'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی جن زدہ کے ہیں۔ جیسے کہ فارسی میں دیوانے سے مُراد وہ شخص ہے جس پر جن سوار ہوں لیکن گذشتہ زمان کے ساتھ یہ بنیادی معنی بھولتا گیا اور اس نے ایک نیا وسیع معنی اختیار کر لیا۔ یعنی وہ شخص جو عقل و خرد سے خالی ہو اگر چہ اس کی وجہ جن زدگی نہ ہو۔

یہ تہمت سب سے زیادہ تو پیغمبر اسلام پر لگائی گئی اس کے باوجود قرآن مجید حضرت نوح، حضرت صالح حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ بلکہ عام انبیاء کے متعلق بھی ایسی تہمت کے لگائے جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

انبیاء کی طرف عمومی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

اسی طرح گذشتہ امتوں کے لیے نبی نہیں آیا مگر یہ کہ اُسے جادوگر یا دیوانہ کہتے۔ (ذرایات۔ ۵۲)

حضرت نوح کے بارے میں فرماتا ہے:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴿۹﴾

اُن سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا یہ پاگل ہے اور پھر اس پر سختی کی۔ (قمر۔۹)

حضرت صالح اور شعیب پر جنون کی تہمت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

ان دونوں انبیاء کے مخالفین نے ان میں سے ہر ایک سے کہا تم پر جادو ہو گیا ہے (پاگل پن سے کنایہ ہے)۔ (شعراء۔ ۱۵۳)

موسیٰ پر دیوانگی کی تہمت کے متعلق فرمایا:

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ وَ

فرعون نے موسیٰ سے منہ موڑ لیا اور کہا یہ جادوگر یا پاگل ہے۔ (ذرایات۔ ۳۹)

قرآن سب سے زیادہ عصر رسالت کے مشرکین کی طرف سے اس الزام کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تہمت مندرجہ ذیل سورتوں میں ذکر کی گئی ہے ۔(حجر۔٦)،(شعراء۔٢٧)،(صافات۔٣٦)،(دخان۔٢٤)،(طور۔٢٩)،(قلم۔٥١)،(تکویر۔٢٣)۔ یہاں ہم صرف ایک

مقام کا ذکر کرتے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

کہتے ہیں وہ دیوانہ ہے حالانکہ اُس کا قرآن عالمین کے لیے یادآوری کے سوا کچھ نہیں۔ (قلم۔۵۱،۵۲)

بعض اوقات مجنون کی بجائے اُس کا امترادف لفظ ''سفیہ'' استعمال کرتے یہ بھی عقل وفکر کی کمزوری کا نام ہے۔ یہ جنون کے ایک نچلے درجے کا نام ہے۔ چنانچہ حضرت ہود کو یہ کہتے:

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

ہم تجھ میں کم عقلی دیکھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔ (اعراف۔٦٦)

یہاں تک جنون سے عقلی کچھ گفتگو کی گئی۔ اب ہم دوسری تہمتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۲۔سحر اجادوگری کا الزام

سحرا اور جادو کی اپنی ایک بہت لمبی چوڑی بحث ہے جس سے اس کی حقیقت روشن ہوتی ہے، بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ سحر اور جادو صرف ایک افسانہ ہیں حالانکہ قرآن نے جادو کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کی اپنی خاص شرائط ہیں ''بابل'' کے لوگ جو دو فرشتوں سے جادو سیکھتے تھے اُن کے متعلق فرماتا ہے:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ

دو فرشتوں سے ایسی چیزیں سیکھتے کہ جن کے ذریعے سے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال سکیں (بقرۃ۔١٠٢)

لہٰذا جادو اور سحر کو ایک خیالی اور افسانوی چیز نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ یہ اپنی حد تک ایک حقیقت اور اثر کے حامل ہیں سحر کی حقیقت کا خلاصہ جادوگری کی نفسانی قوت اور دوسروں کے حواس میں تصرف کرنے میں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جادو، جادوگر، نفسانی قوت اور دوسروں کے حواس میں تصرف یہ سب حقیقتیں ہیں جو دو کو وجود میں لائی ہیں۔ نتیجے میں انسان غیر حقیقی چیز کو حقیقی چیز سمجھنا شروع کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ جو کچھ وہ (جادوگر) دکھا رہا ہے وہ حقیقت رکھتا ہو۔

جب کہ معجزے کی حقیقت جادو کے برعکس ہے۔ انبیاء جو کچھ انجام دیتے ہیں اور دکھاتے ہیں وہ واقعیت اور حقیقت رکھتا ہوتا ہے۔

بہرحال تمام انبیاء یا ان کی اکثریت اپنے ماحول کی مناسبت سے جادوگری سے متہم ہوتی رہی ہے۔

قرآن مجید سب انبیاء کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

اسی طرح گذشتہ لوگوں کے لیے کوئی رسول نہیں آیا مگر یہ کہ وہ کہتے یہ جادوگر یا مجنون ہے

۔(ذاریات۔۵۲)

لیکن حضرت موسیٰ اور پیغمبر اسلامؐ پر یہ تہمت بھی لگائی گئی ہے۔قرآن حضرت موسیٰ پر لگنے والی جادو کی تہمت کو ان آیات میں بیان کرتا ہے۔(اعراف۔۱۰۹)،(یونس۔۷۲)،(بنی اسرائیل۔۱۱۰)، (طٰہٰ۔۶۶۔۷۱)، (شعراء۔۳۴،۴۹)، (نحل۔۱۳)،(قصص۔۴۸)،(مؤمن۔۲۴)،(زخرف۔۵۰)

پیغمبر اسلامؐ سے متعلق ان آیات میں (یونس۔۲)،(ھود۔۷)،(بنی اسرائیل ۔۴۷)،(فرقان۔۸)،(انبیائ۔۳)،اور (ص۔۴)شامل ہیں۔

البتہ موسیٰ پر جادو کا الزام ایک معمول کی بات تھی کیونکہ اُن کے زمانے میں سحر اور جادو کا عام رواج تھا۔وہ یہ سوچتے تھے کہ موسیٰ کا کام بھی اسی طرح ہے۔لیکن جب انہوں نے میدان مبارزہ میں جادوگروں کو شکست دے دی تو پھر ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی جادوگر تھے کیونکہ وہ موسیٰ کے کام کی حقیقت تک پہنچ چکے تھے۔قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾

جادوگر سجدے میں گر گئے اور انہوں نے کہا ہم موسیٰ اور ہارون کے ربّ پر ایمان لاتے ہیں

۔(طٰہٰ۔۷۰)

لیکن پیغمبر اسلامؐ پر جادو کے الزام کی وجہ وہ اختلاف تھا جو مشرکین کے درمیان پیدا ہو چکا تھا۔قریش کے جوان توحید کے شیدا ہو چکے تھے اور بوڑھے شرک پر باقی تھے۔چونکہ تفرقہ بازی جادوگروں کا ایک کام ہے اس لیے انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کو جادوگر اور ان کی کتاب کو جادو قرار دیا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۴﴾ (ص۔۴)

وہ یہ بھی کہتے:

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ (مدثر۔۲۴)

اسی طرح اور آیات بھی ہیں۔

۳۔جھوٹ بولنے کی تہمت

جھوٹ خلاف واقع بات ہے کہ کبھی تو کہنے والا اُس کے خلاف واقع ہونے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں ۔افترا اُس کو کہتے ہیں کہ کہنے والا وہ بات جان بوجھ کر اور قصدوعمد سے کہے۔

جو لوگ انبیاء پر ’’جنون‘‘ کا الزام لگاتے تھے طبعاً انہیں جھوٹ کا الزام بھی لگانا چاہیے کیونکہ مجنون انسان کی بات عقل نہ رکھنے کی بنا پر عموماً خلاف واقع ہوتی ہے ۔اسی طرح وہ لوگ جو انبیاء پر جادو کا الزام لگاتے تھے طبعاً وہ انبیاء پر جھوٹ کی تہمت بھی لگاتے ۔مثال کے طور پر قوم ھود نے جب انہیں سفیہ کہا تو اس کے بعد کہا:

وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝۶۶

ہمارا گمان یہ ہے کہ تم جھوٹے ہو۔(اعراف۔٦٦)

حضرت شعیبؑ پر جب انہوں نے سحر زدگی جو کہ پاگل پن کے قریب قریب ہے کا الزام لگایا تو اس کے بعد کہا:

وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝۱۸۶ (شعراء۔١٨٦)

لہٰذا چونکہ تمام انبیاء پر ’’دیوانگی‘‘ کا الزام لگایا جا چکا ہے طبعاً اُن پر جھوٹ کا الزام بھی تھوپا گیا ہے،لیکن ’’افترا‘‘ کا معاملہ ’’صرف جھوٹ سے الگ ہے۔افترا میں عمداور قصد ہوتا ہے جس میں عقل خرد اور مصلحتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔یہ جنون کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ پر بڑے محتاطانہ انداز میں وہ ان دو الزاموں میں سے ایک الزام لگاتے اور کہتے:

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ (سبا۔٨)

یا تو اس نے خُدا پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا ہے یا یہ کہ یہ پاگل ہے اور بے اختیار خلاف واقع باتیں کرتا ہے۔

۴۔زمین میں فساد اور تباہی پھیلانے کا الزام

چونکہ انبیا کی دعوت موجود نظام کے لیے ایک چیلنج ہوتی تھی لہٰذا مخالفین انہیں مفسد اور تباہی پھیلانے والے قرار دیتے۔اس کی واضح مثال حضرت موسیٰ کے فرعون سے مبارزے کے وقت دیکھی جا سکتی ہے۔جب موسیٰ دلیل کے اعتبار سے فرعون پر کامیاب ہو گئے۔تو فرعون نے ایک جمہوری شکل بنا کر اپنی قوم سے موسیٰؑ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی (گویا یا وہ)ایک جمہوری فکر رکھنے والا شخص تھا جس نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کے قتل کی اپنی قوم سے اجازت لے رکھی تھی)پھر اس کے بعد مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا:موسیٰ اپنے خُدا کو مدد کے لیے بلا لو مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ تمہارے دین کو تبدیل نہ کر دے اور مصر میں تباہی پھیلا دے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ

دِيۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ يُّظۡهِرَ فِى الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ۝۲۶ (مؤمن۔۲۶)

یہاں تک کہ قوم فرعون کے سردار اُس سے کہتے:

اَتَذَرُ مُوۡسٰى وَقَوۡمَهٗ لِيُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ‌ؕ

کیا تم موسیٰ اور اُس کی قوم کو آزاد چھوڑ دو گے کہ زمین پر تباہی پھیلاتے پھیریں اور تجھے اور تیرے خُدا وں کو چھوڑ دیں؟ (اعراف۔۱۲۷)

اصولاً عام فکر کے لوگوں کی نظر میں فساد ایک نسبی معنی رکھتا ہے۔ ایک شخص بہترین پروگرام کے ساتھ اپنی قوم کی نجات کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو یہ ارباب حکومت کی نظر میں فسادی ہوگا کیونکہ اس نے اُن کے مفادات کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ فساد اُس وقت حقیقی معنی پیدا کرتا ہے۔ جب حق و باطل کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جا سکے۔ اس کے بعد جو باطل کی طرف بُلائے وہ حقیقت میں مفسد ہوگا۔

۵۔ جدال کی تہمت

علم و تمدن سے دور لوگ جب افراد کی منطق اور دلیل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ اور ان کا کوئی کمزور پہلو نہیں نہیں مل سکتا تو پھر جدال اور مجادلہ کا بہانہ کر کے اپنے آپ کو گفتگو سے پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔ انبیاء توحید اور معاد کی طرف بلانے کے لیے بڑی محکم اور قوی دلیلیں پیش کرتے لیکن چونکہ اُن کی دعوت بُت پرستی اور دُنیا پرستی کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی تو اُن پر یہ الزام لگا دیا جاتا کہ ان کے پاس کوئی دلیل اور بُرھان نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت نوح کہ بُت شکنی کے بارے میں اُن کی دلیل قرآن نے بیان کی ہے اُن پر بھی جدال کی تہمت لگائی گئی اور کہتے تھے:

يٰنُوۡحُ قَدۡ جَادَلۡتَنَا فَاَكۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ۝۳۲

وہ کہتے ! اے نوح ہم سے تم نے بہت جھگڑا کیا۔ اگر سچے ہو تو اپنے وعدے (عذاب) کو لاؤ۔ (ھود۔۳۲)

حضرت ھودؑ پر بھی یہ الزام لگایا گیا۔ ان سے کہا گیا:

يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ

اے ہود! تو نے اپنے دعوٰی پر کوئی روشن دلیل پیش نہیں کی اور ہم بھی تیری باتوں سے اپنے خداؤں کو چھوڑ دیں گے نہیں۔ (ھود۔۵۳)

کبھی انبیاء کے دلائل کے سامنے ریاکارانہ انداز میں کہتے: تمہاری باتیں ہمارے لیے یقین آور نہیں ہیں ہم تمہاری گفتار کی سچائی

میں شک رکھتے ہیں۔قرآن فرماتا ہے کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور ان کے بعد آنے والوں کی بات یہ تھی کہ:

اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ⑨

تم جس کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے ہو ہم اُس کا انکار کرتے ہیں اور تم ہمیں جس چیز کی طرف بلاتے ہو ہم اُس میں شک رکھتے ہیں۔[1] (ابراہیم۔۹)

٦۔ان کی دعوت کو افسانہ قرار دینا

خُدا نے پہلے دن سے ہی ایک دین بھیجا ہے۔تمام رسالتوں اور نبوتوں کے دین کی بنیاد اور اصول ایک ہی تھا بالخصوص مسئلہ توحید جو کہ انبیاء کے قوانین کی اساس شمار ہوتا ہے۔لہٰذا جب بھی کوئی پیغمبر توحید اور معاد کی طرف بلاتا تو لوگ یہ سوچ کر کہ اُسکی دعوت والی باتیں تو گذشتہ شریعت میں بھی بیان ہوئی ہیں، اُس پر افسانے اور کہانی کا لیبل چسپاں کر دیتے حالانکہ نہ تو پرانا ہونا باطل ہونے کی علامت ہے اور نہ نیا ہونا حقانیت کی دلیل یہ تو عام سطح فکر کے لوگوں کی بات ہے کو ہر نئی بات کو ترقی کی علامت اور ہر پُرانی بات کو باطل ہونے کی علامت قرار دیتے ہیں حالانکہ حق اور باطل کی تمیز کے لیے عقل نے اپنا معیار و میزان قائم کیا ہے۔جس میں نئے یا پرانے کی بات نہیں۔

قرآن نے یہ تہمت عصر رسالت کے مشرکین کی زبانی کئی بار ذکر کی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ㉕

کافر کہتے ہیں قرآن گذشتہ لوگوں کے افسانوں کے سوا کچھ نہیں۔(انعام۔۲۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ㉛

اگر ہم چاہیں تو تیرے قرآن جیسا لا سکتے ہیں۔یہ گذشتہ لوگوں کے افسانوں کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔(انفال۔۳۱)

پیغمبر اسلامؐ پر اس الزام کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیات میں بھی آیا ہے۔

(نحل۔۲۴)،(مومنون۔۸۳)،(فرقان۔۵)،(نمل۔۶۸)،(احقاف۔۱۷)،(قلم۔۱۵)،(مطففین۔۱۴)

---

[1] سورہ ھود آیت ۶۲ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔

چند حقائق سے غلط فائدہ اٹھانا

یہاں تک انبیاء پر مخالفین کی طرف سے لگائے جانے والے الزامات سے متعلق گفتگو تمام ہوئی مختلف تہمتوں کے بارے میں وضاحت کی گئی۔انہی تہمتوں سے انبیاء کی پاک دامنی اور طہارت معلوم کی جاسکتی ہے۔ان الزامات کے ساتھ ساتھ انبیاء کی زندگی میں چند ایسے حقائق بھی تھے جو کسی لحاظ سے بھی نقص یا عیب نہیں تھے۔لیکن مخالفین اُن حقائق کی تشریح غلط انداز میں کرتے تھے گو یا اُن حقائق سے سوئے استفادہ کرتے۔ہم ان حقائق کو زیر بحث لاتے ہیں تا کہ یہ بات روشن ہو جائے کہ انبیاء کی روش کے مخالفین نے محرم کو مجرم بنا دیا۔

۷۔انبیاء کی بشریت

انبیاء کے مخالفین کا ایک بہت پُرانا اعتراض یہ تھا کہ تم بشر ہو۔مخالفین یہ سوچ کر کہ انسان،انسان کی راہنمائی نہیں کرسکتا یا خُدا سے رابطہ قائم نہیں کرسکتا کہ خُدا کا پیغام دریافت کر کے اُسے آگے پہچانے انبیاء سے کہتے: تم انسان سے زیادہ کچھ نہیں ہوتم ہمارے راہنما نہیں ہو سکتے۔لوگوں کے دلوں میں انبیاء کی ہدایت کے نفوذ میں یہ ایک رکاوٹ تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

اور لوگوں کو جب کہ ان کے پاس ہدایت آچکی تھی کس چیز نے رسولوں پر ایمان لانے سے روکا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجے؟ (بنی اسرائیل۔ ۹۴)

گذشتہ انبیاء کی امتوں کی زبانی قرآن یہ نقل کرتا ہے:

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا

تم ہماری طرح بشر ہو۔تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُس سے روک دو جس کی عبادت ہمارے آباء اجداد کرتے تھے۔(ابراہیم۔۱۰)

ایک اور جگہ گذشتہ امتوں کی یہی بات یوں بیان کی ہے:

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا

کیا بشر ہماری ہدایت کرے گا؟ پس انہوں نے کفر اختیار کیا اور روگردانی کی۔(تغابن۔۶)

یہی مضمون سورہ یٰس کی آیت ۱۵ میں بھی آیا ہے۔

ہم ''نبوت کے ناگزیز ہونے'' سے بحث کرتے ہوئے یہ بتائیں گے کہ ہدایت کی ایک بنیادی شرط مربی اور زیر تربیت افراد کا ایک

طرح اور ہم نوع ہونا ہے۔ جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ راہنما فرشتے کو ہونا چاہیے انہوں نے ہم نوع ہونے کی اس ضرورت سے غفلت برتی ہے۔لہٰذا قرآن اس نظریے کو رد کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

کہہ دیجئے اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ایک فرشتہ ہی رسول کے عنوان سے بھیجتے۔(بنی اسرائیل۔۹۵)

چونکہ ہم نے اس سلسلے میں کتاب کے آغاز میں گفتگو کی تھی لہٰذا اُسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۸۔انبیاء اوران کے ساتھیوں کی غربت

ہر معاشرے اور ماحول میں شخصیت کا اپنا ایک معیار ہوتا ہے علمی ماحول میں شخصیت کا معیار علم و دانش ہے۔سرمایہ دارانہ معاشرے میں افراد کی عظمت کا معیار اُن کی دولت اور سرمائے سے وابستہ ہوتا ہے۔طاقت والوں کے درمیان وہ شخص سب سے زیادہ باعظمت ہے۔جو سب سے زیادہ طاقت رکھتا ہو۔انبیاء جس معاشرے میں مبعوث ہُوئے وہ دو طبقوں مستضعفین اور مستکبرین میں بٹا ہُوا تھا۔پوری طاقت مستکبرین اور سرمایہ دار لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو کمزور اور غریب لوگوں کو اپنا غلام بنا کے رکھتے، جب خُدا کی جانب سے ایسے لوگ مبعوث ہُوئے جو عدالت و مساوات کے پرچم بردار تھے تو کمزور اور غریب لوگ فوراً ان کے گرد جمع ہو گئے۔غلامی اور اسارت سے نجات کی اُمید پر وہ ان کے پیروکار بن گئے۔اس لیے ان کے پیروکاروں کی اکثریت مستضعف اور غریب لوگوں پر مشتمل ہوتی۔مخالفین اسی حقیقت کو ایک دلیل بنا کر یہ کہتے کہ تمہارا مذہب سچا اور صحیح نہیں ہے۔وہ انبیاء سے کہتے کہ تمہارے پیرکار تو فقیر اور ان کی اصطلاح میں اراذل (نچلے طبقے کے لوگ) ہیں عقل کے یہ اندھے یہ نہیں سوچتے تھے کہ حق و باطل کا معیار ثروت یا تنگ دستی نہیں ہے۔حق و باطل کو اُن کے معیار کے مطابق پہچاننا چاہیے۔فقر اور غربت کو باطل ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن نے یہ بات مندرجہ ذیل آیات میں ذکر کی ہے:

۱۔نوح کے مخالفین اُن سے کہتے: ہم کیسے تیری پیروی کریں جب کہ معاشرے کا نچلا طبقہ تیری پیروی کرتا ہے: قرآن نے یہ بات یوں بیان کی ہے:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (شعراء۔۱۱۱)

۲۔فرعون نے موسیٰ سے دلیل کے میدان میں شکست کھانے کے بعد یہی حربہ استعمال کرتے ہُوئے کہا:

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ

أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿۵۳﴾

کیا میں اس ذلیل انسان سے بہتر نہیں ہوں جو صاف نہیں بول سکتا؟ اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس کے لیے سونے کے کنگن کیوں بھیجے گئے؟ اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آتے؟ (زخرف۔ ۵۲۔ ۵۳)

۳۔ مفسرین پیغمبر اسلامؐ کے متعلق لکھتے ہیں کہ مشرکین کے چند سرداروں نے آپؐ سے یہ درخواست کی کہ فقیر اور کمزور لوگوں کو اپنے آپ سے دور کریں۔ کم از کم جن محفلوں میں ثروت مند لوگ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں اُن میں کمزور اور غریب لوگوں کو نہ گھسنے دیں۔

قرآن اس جماعت کے نظریے کو رد کرتے ہوئے محکم اور واضح انداز میں فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اور جو لوگ صبح اور شام اپنے پروردگار سے دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اُس کی رضا مندی چاہتے ہیں تم اُن سے اپنی آنکھوں کو نہ ہٹاؤ اور صبر کرو۔ ہرگز دنیا کی زندگی کی زینت کے لیے اپنی نگاہ لطف ان سے پھیرو اور نہ اُس کا کہنا مانو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل پایا ہے اور اُس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہوئی ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے (کھف۔ ۲۸)

سورہ انعام کی آیت ۲۵ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

۴۔ قرآن کریم جہاں انبیاء سے ''مترفین'' کی مخالفت کا ذکر کرتا ہے وہاں کی دلیل مال وثروت کی فراوانی اور اولاد کی کثرت قرار دے رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِ كٰفِرُونَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿۳۵﴾

ہم نے کسی آبادی میں ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کے ثروت مند یہ کہتے کہ تم جس کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے ہو۔ ہم اُس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم عذاب میں گرفتار نہیں ہوں گے (سبا۔ ۳۴۔ ۳۵)

قرآن اس بے بنیاد نظریے کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِىْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ

تمہارا مال اور اولاد ہمارے تقرب کا ذریعہ نہیں بنے گا مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے (سبا۔ ۳۷)

۹۔ان کے پیروکاروں کا کم ہونا

چونکہ معاشرے میں عنان حکومت مستکبرین اور سرمایہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اس کی وجہ سے لوگ انبیاء کی طرف آنے سے ڈرتے جو لوگ اپنے اندر جرأت وشجاعت رکھتے تھے وہ ان مستکبرین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور انبیاء پر ایمان لاتے۔اس وجہ سے ان کے پیروکار تعداد میں تھوڑے ہوتے۔یہی بات اس بات کا سبب بنتی کہ مخالفین اسے اس بات کی سند بنا لیتے کہ اُس کی دعوت غلط اور باطل ہے۔

حضرت شعیب کے بارے میں مخالفین کا یہی نظریہ بیان ہُوا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

اے شعیب ہم تمہاری اکثر باتوں کو نہیں سمجھتے اور تمہیں اپنے درمیان ضعیف اور کمزور دیکھتے ہیں۔اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کردیتے تم ہم سے ہرگز قوی نہیں ہو۔(ھو۔۹۱)

۱۰۔نحوست اور فال بد

بعض لوگ اپنی زندگی میں چند حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔لیکن چونکہ وہ ان کے حقیقی اسباب کو نہیں جانتے ہوتے اس لیے اپنی حس جستجو کی تسکین کے لیے یا کسی اور سبب سے جیسے حسد اور عداوت وغیرہ کی وجہ سے اُن کے لیے چند اسباب گھڑ لیتے ہیں۔دنوں کی نحوست کا عقیدہ جو کہ کئی قوموں میں رائج ہے اسی کی ایک مثال ہے۔

''نحوست ایام'' اپنی جگہ ایک الگ بحث رکھتی ہے۔اسے ہم اب نہیں چھیڑتے۔لیکن اس قدر کہتے ہیں کہ نیکی یا برائی کے اسباب انفرادی یا اجتماعی زندگی میں تلاش کرنے چاہیں تا کہ واقعات کے اسباب تک پہنچا جا سکے۔اپنے برے کردار کے نتیجے کو آسمان یا قسمت کے ستارے کے گلے نہیں ڈالا جاسکتاہ۔یہ امر باعث افسوس ہے کہ بہت سے بلند مرتبہ شعراء نے یہ کام کیا ہے مثلاً

کو کب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت
یا رب از ما درگیتی بہ چہ طالع زادم ؟

کوئی منجم میری قسمت کے ستارے کو نہیں پہچان سکا۔ یا رب مادر گیتی کے بطن سے میری کیسی قسمت پیدا ہوئی ہے۔[1]

حالانکہ اس جگہ پر تو یہ کہنا چاہیے کہ

تو خود گر کئی اختر نیک رابد
مدار از فلک چشم اختری را

اگر آپ خود ہی اپنے اچھے ستارے کو بُرا کر لیں تو پھر آسمان سے نیک ستارے کی توقع نہ رکھیں۔

انبیاء کے دور میں کم عقل اور گنہگار لوگ واقعات کے اسباب کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے انبیاء کو ان حوارث اور اپنی زندگی کی تلخیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اس طرح کا نظریہ بڑا پُرانا ہے۔ مثلاً قوم صالح ان کی دعوت کے مقابلے میں یوں کہتی:

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ

کہتے ہم نے تیرے اور ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے ساتھ بُرا شگون لیا۔

وہ جواب میں یہ فرماتے:

طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

یہ قسمت کی بُرائی خدا کی جانب سے ہے اور وہ بھی تمہارے بُرے اعمال کی وجہ سے تم ہمیشہ امتحان میں ہو (نمل۔ ۴۷)

قوم فرعون جب ایک خوش حال زندگی بسر کر رہی تھی اور خُدا کی بہت سی نعمتیں اسے حاصل تھیں تو یہ کہتی تھی: یہ برکتیں تو خود ہماری وجہ سے ہیں۔ اگر کوئی سختی دیکھتے مثلاً بارش کم ہوتی تو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو منحوس قرار دے کر اُن کے ذمے ڈال دیتے۔ خُدا ان کے جواب میں کہہ رہا ہے۔ یہ سختیاں تمہارے اعمال کا نتیجہ ہیں اور خُدا کی جانب سے ہیں۔ موسیٰ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ یہ منصف ہی عقل کے اندھے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى
وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

---

[1] اُردو کے بھی ایک معروف شاعر نے تقدیر پر کچھ اس طرح سے الزام لگایا ہے

چاک تقدیر کو ممکن کرنا رفو سوزن تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے (مترجم)

(اعراف۔۱۳۱)

پیغمبر اسلامؐ کے مخالفین بھی آپؐ کے بارے یہی فیصلہ کرتے تھے صرف اس فرق کے ساتھ کہ جب بھی اُن تک کوئی بھلائی پہنچتی تو اُسے خُدا کی جانب سے سمجھتے اور جب بھی کوئی مصیبت اُن پر پڑتی تو اسے پیغمبر اسلامؐ کی جانب سے سمجھتے۔ خُدا اپنے نبیؐ کو یہ حکم دے رہا ہے کہ کہو یہ دونوں خُدا کی جانب سے ہیں۔ وہ نادان اور کم عقل لوگ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا ۝ (نساء۔۷۸)

یہ صرف انبیاء ہی نہ تھے کہ جو لوگوں کی نظروں میں منحوس سمجھے جاتے تھے بلکہ حضرت عیسیٰ کے نمائندوں کو بھی اس طرح کے طرز تفکر کا سامنا کرنا پڑا[1] بلکہ حقیقت کے داعی ہمیشہ اس طرح کے ردعمل کا سامنا کرتے بشریت کے مصلحین ار حقیقت کے پرستار ہمیشہ تطیر (نحوست) کا باعث سمجھے جاتے رہے ہیں۔ لوگوں کو ان سے دور کرنے کے لیے ہر طرح کے بُرے واقعے کو ان کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا تھا۔ خود ہم نے اپنی زندگی میں اس کی بہت سی مثالیں دیکھی ہیں جن کے بیان کا یہ مقام نہیں۔

مخالفین کا ردعمل

یہاں تک دو موضوعات تفصیل سے زیر گفتگو آئے۔ ایک تو انبیاء پر بے بنیاد الزامات اور ناروا تہمتیں۔ دوسرا اُن کی زندگی میں موجود حقائق کی غلط تفسیر۔ ابھی تیسرا موضوع باقی ہے اور وہ انبیاء کے مقابلے میں مخالفین کا عملی یا لفظی ردعمل ہے۔ یعنی تہمت لگانے اور حقائق کی غلط تفسیر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ انبیاء کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے کچھ عملی اقدام بھی کرتے۔ ہم اس موضوع کو ردعمل کے عنوان سے بیان کریں گے۔ ان کے ردعمل کا مجموعی طور پر مندرجہ ذیل امور میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تمسخر و استہزا

۲۔ دعوت سننے سے فرار

۳۔ قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں

۴۔ قتل کا ارادہ

اب ہم ہر ایک ردعمل کی وضاحت کرتے ہیں۔

---

[1] سورہ یٰس آیہ ۱۸، ۱۹

۱۱۔ تمسخر واستہزا

انبیاء کے مخالفین کا ایک کام یہ تھا کہ وہ ان کی دعوت کو سنجیدگی سے نہ لیتے کیونکہ سنجیدگی سے سمجھنا ذمہ داری کا باعث بنتا ہے اور وہ ذمہ داری سے گریزاں تھے۔اسی لیے قرآن نے کئی بار یہ تذکرہ کیا ہے کہ مخالفین انبیاء کا مذاق اڑانے۔مُراد یہ ہے کہ وہ ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہُوئے ایک خاص ادا سے اُن کی تحقیر کرتے ۔مثلاً شیخ الانبیاء، حضرت نوح جب خُدا کی جانب سے کشتی بنانے پر مامور ہُوئے تو مخالفین ان کے پاس سے گزرتے اور ان کے کام کا مذاق اڑانے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيۡهِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ سَخِرُوۡا مِنۡهُ‌ؕ

وہ کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی قوم کے وڈیرے اُن کے پاس سے گزرتے (اور خشکی میں اُن کے کشتی بنانے کو دیکھتے) تو ان کا مذاق اڑاتے۔(ھود۔۳۸)

یہ بات بن کہے ہی واضح ہے کہ ہر جگہ پر مذاق کی کیفیت جُدا ہوتی ہے۔

اس بنا پر انبیاء کی دعوت کو مخالفین کے مذاق کا سامنا کرنا پڑتا۔چونکہ مخالفین کی خود اپنی کوئی حیثیت نہ تھی وہ اس طریقے سے انبیاء کی شخصیت کو نقصان پہچانے کی کوشش کرتے اور انہیں اپنے مقام تک لانے کی کوشش کرتے۔

قرآن اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ‏ ﴿۱۱﴾

ان کی طرف کوئی پیغمبر نہیں آیا مگر یہ کہ وہ اُس مذاق اڑاتے تھے۔ (حجر۔۱۱)

انبیاء کے مخالفین کے متعلق ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا هُزُوًا‏ ﴿۵۶﴾

آیات الٰہی اور وہ چیزیں کہ جن کے ساتھ ڈرایا جاتا تھا انہیں مذاق سمجھتے۔(کہف۔۵۶)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ‏ ﴿۷﴾

کوئی پیغمبر اُن کی جانب نہیں آیا مگر یہ کہ وہ اُس کا مذاق اڑاتے۔(زخرف۔۷)

تمدن کے لحاظ سے لوگوں کی سطح جتنی بھی نیچے ہوتی مذاق کے اعتبار سے وہ اسی قدر آگے ہوتے دوسرے الفاظ میں یوں کہ تہذیب و تمدن سے عاری لوگ انبیاء کے مقابلے میں سب سے کمزور اور عاجز لوگ تھے۔مذاق اڑانا تو کمزور اور عاجز انسان کا حربہ ہی ہے۔جاہلیت کے

عرب گویا اس میں سب سے سبقت لے گئے تھے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ط

جب کفار آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ سے مذاق اور تمسخر کے سوا کوئی سلوک نہیں کرتے۔ (انبیاء۔ ۳۶)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ط اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

(فرقان۔ ۴۱)

وہ نہ فقط رسول اکرم کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے بلکہ اُن کے ساتھیوں اور پیروکاروں کا بھی مذاق اڑاتے۔ منافقین سب سے زیادہ اس حربے سے کام لیتے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

(بقرة۔ ۱۴)

اب یہ کہ اُن کے مذاق کا انداز کیا ہوتا تھا، اس سلسلے میں گذشتہ آیات سے مدد لی جا سکتی ہے مثلاً حقائق کی وہ اپنی مرضی سے تفسیر کرتے۔ اس کے بعد اُن کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے۔ مثلاً یہ کہتے:

انسان کہ چند بھوکے ننگے فقیر جس کے گرد جمع ہو گئے ہیں کیا یہ اللہ کا رسول ہے؟

جیسے کہ فرعون یہی بات ایک اور انداز میں کہتا تھا وہ یُوں کہ:

یہ کمزور اور محروم طبقے سے اُٹھنے والا انسان ہم پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ (زخرف۔ ۵۲)

۱۲۔ دعوت سُننے سے فرار

گمراہ لوگوں کے لیے انبیاء کی تبلیغ ویسا ہی اثر رکھتی ہے۔ جیسا کہ بیمار لوگوں کے لیے کڑوی دوا۔ لیکن یہی کڑوی دوا ہی صحت اور تندرستی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ یہ بیماری ہے جس نے ان تعلیمات کا ذائقہ اُن کے لیے تلخ اور کڑوا کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے قوم نوح جب بھی حضرت نوح کی دعوت کا سامنا کرتی تو سب سے پہلے اپنے کان بند کر لیتی۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کرتی بلکہ اپنے کپڑے اپنے سروں کے اوپر کر لیتی تاکہ ان کی باتیں اس کے کانوں میں نہ پڑیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿۷﴾

میں جب بھی انہیں بلاتا تا کہ آپ کی بخشش کریں وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے اور کپڑے سروں پر ڈال لیتے اور اس کام پر اصرار کرتے اور اپنے تکبر کا مظاہرہ کرتے۔(نوح۔۷)

قریش نبی اسلامؐ سے متعلق مختلف منصوبے بنا رہے تھے تا کہ جس قیمت پر بھی ہو آپ کی تبلیغ کو روکا جائے۔ چونکہ قرآن ان کے افکار میں ایک خاص جاذبیت اور خوبصورتی کا حامل تھا اور بعض اوقات تو ایک آیت سن کر لوگ ایمان لے آتے اس لیے یہ طے پایا کہ جب بھی پیغمبر اکرمؐ اپنی دلربا آہنگ میں مسجد نبوی میں تلاوت قرآن شروع کریں تو ان کے اردگرد خوب شور مچایا جائے تا کہ اُس شور وغل میں قرآن کی آواز دب جائے اور کچھ سمجھ نہ آئے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿٢٦﴾

بڑے کافر ایک دوسرے سے کہتے: قرآن نہ سنو اور اُس کی تلاوت کے وقت شور غل مچاؤ تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔(حٰم سجدۃ۔۲۶)

تاریخ میں اسعد بن زرارہ کی داستان مشہور ہے۔ وہ جب عتبہ بن ربیعہ کے گھر سے خانہ کعبہ کے طواف کے لیے کعبے کی طرف آنے لگا تو اُس کے میزبان نے اُسے ایک نصیحت کی۔ اُس نے کہا: ایک نیا دین لانے والا شخص محمد (ص) اب حجر اسماعیل کے پاس بیٹھا ہے بنی ہاشم اُس کے اردگرد بیٹھے ہیں اور وہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے۔ قرآن سننے سے ہی اس کے شیدا ہو جاؤ گے۔

اسعد نے اُس سے پوچھا: مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اُس نے کہا: تجھے میں روئی دیتا ہوں، اُسے اپنے کانوں میں رکھ لو اور اپنی انگلیاں بھی کانوں میں ٹھونس اور اپنی نظریں نیچی رکھو تا کہ تم اسے دیکھ سکو نہ اُس کی آواز سن سکو۔ [1]

اب بھی عقل و منطق سے تہی دست اقلیتیں اپنے پیروکاروں کو یہ اجازت نہیں دیتیں کہ وہ دوسروں کے تبلیغی پروگرام کو سمجھیں۔

۱۳۔ قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں

انبیاء کے مخالفین ان کی دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے۔ ان میں سے بہت سے حربے بیان کیے جا چکے ہیں جب وہ انبیاء کو ان کے مقصد سے ہٹانے کے بارے میں مایوس ہو جاتے اور ان کی دعوت کو بھی روز بروز آگے بڑھتا ہُوا دیکھتے تو اس صورت میں شکنجے قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں پر اُتر آتے۔

---

[1] اعلام الوریٰ الہدیٰ' داستان ابھی جاری ہے۔ تفصیل کے لیے کتاب فروغ ابدیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب ، حضرت ہود اور حضرت صالح جیسے انبیاء کے مخالفین کی اس روش کو بیان کیا ہے۔ہم بالترتیب ذکر کرتے ہیں:

حضرت نوح کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ يٰنُوۡحُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِيۡنَ ﴿۱۱۶﴾

اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہیں آوٴ گے تو سنگسار ہو جاوٴ گے۔(الشعراء۔۱۱۶

حضرت ابراہیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ‌ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ

آذر نے ابراہیم سے کہا: کیا تم مجھے میرے خداؤں سے روکتے ہو؟ اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا(مریم۔۴۶)

حضرت شعیب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لَنُخۡرِجَنَّكَ يٰشُعَيۡبُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَكَ مِنۡ قَرۡيَتِنَاۤ

قوم شعیب کے مستکبرین اُس سے کہتے تھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو ہم شہر سے نکال دیں گے ۔(الاعراف۔۸۸)

ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ شعیبؑ کے مخالفین انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے تھے اور کہتے تھے:

وَلَوۡلَا رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ‌ ۚ

اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو تجھے سنگسار کردیتے۔ (ھود۔۹۱)

بعض انبیاء جن میں نوح، ہود ، اور صالحؑ بھی ہیں اُن کے بارے میں جلاوطنی کا تذکرہ ہے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا‌ ؕ

کفار اپنے انبیاء سے کہتے ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے مگر یہ کہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آوٴ۔(ابراہیم۔۱۳)

حضرت موسیٰ کے بارے میں فرعون کی اس بات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ:

ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ

مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ کو قتل کردوں اور وہ اپنے خدا کو مدد کے لیے پکارے۔(مومن۔۲۶)

۱۴۔قتل کا ارادہ

اگر مخالفین انبیاء کو قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں دیتے تھے تو کبھی تو اپنی دھمکی پر عمل پیرا ہونے کے لیے مقدمات بھی فراہم کرلیتے۔یہ تو خُدا کا لطف وکرم تھا جو انبیاء کو موت کے منہ سے بچاتا۔

قرآن چنداُن انبیاء کے نام لیتا ہے جن کے مخالفین نے اُن کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اُس پر عمل پیرا بھی ہُوئے اگرچہ انہیں اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

حضرت ابراہیم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

قَالُوۡا حَرِّقُوۡہُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِہَتَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۶۸﴾

انہوں نے کہا اُسے جلا ڈالوں اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔(انبیاء۔۶۸)

سورہ عنکبوت کی آیت ۲۴ بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ کے بارے ارشاد ہوتا ہے:

وَّقَوۡلِہِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِیۡحَ عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ۚ وَمَا قَتَلُوۡہُ وَمَا صَلَبُوۡہُ وَلٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ ؕ

اور یہودیوں کی یہ بات کہ ہم نے مریم کے بیٹے اور خُدا کے رسول عیسیٰ کو قتل کردیا ہے(جب کہ انہوں نے اسے قتل کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا)انہوں نے اُسے قتل نہیں کیا اور نہ ہی پھانسی دی بلکہ معاملہ اُن پر مشتبہ ہو گیا۔(نساء۔۱۵۷)

پیغمبر اسلامؐ کے مخالفین دارالندوہ میں جمع ہُوئے انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ نبیؐ سے متعلق ان تینوں کاموں میں سے ایک کام کرڈالا جائے۔جلاوطنی،قید،قتل۔لیکن آخرکار آخری کام پر اتفاق رائے ہوگیا۔حضرت عیسیٰؑ کے مانند مقدمات فراہم کرلیے۔لیکن انہیں ناکامی اُٹھانا پڑی۔خُدا نے آپ قتل کے منصوبے سے آگاہ کردیا اور آپؐ مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کرگئے۔آپ مدینے کے راستے سے جانے کی بجائے شہر کے جنوب کی طرف سے نکلے اور تین دن تک ایک غار میں پیچھے رہے۔

قرآن نے ان کے منصوبے کو یوں بیان کیا ہے:

وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ‌ؕ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ‌ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ‏ ﴿۳۰﴾

اُس وقت کو یاد کر جب کفار نے سازش کی کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطنی۔ انہوں نے سازش سے کام لیا۔ خُدا نے ان سازشوں کو ناکام کر دیا۔ خُدا بہترین (جواب دینے والا) ہے حیلہ گروں کا۔ (انفال۔ ۳۰)

۱۵۔ انبیاء کا قتل

یہاں تک مخالفین کے اُن منصوبوں اور ارادوں کی بات تھی جو وہ انبیاء کے قتل کے متعلق بناتے لیکن ناکام رہے۔ اس کے باوجود انبیاء کے مخالفین بعض اوقات اپنے مذموم منصوبوں کو جامہ عمل پہنا کر بعض انبیا کو قتل کر دیتے۔ اس سلسلے میں قرآن یوں ارشاد فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ‌ؕ

وہ (بنی اسرائیل) آیات الہٰی کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو بغیر حق کے قتل کرتے تھے۔ (بقرۃ۔۶۱) سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۲ بھی اسی مضمون کی حامل ہے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

فَرِيۡقًا كَذَّبۡتُمۡ وَفَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ

ایک جماعت کو جھٹلاتے اور ایک کو قتل کر دیتے۔

اصولاً ہدف کے حصول کی راہ میں انبیاء کی شہادت ان کے ایمان اور خلوص کی دلیل ہے۔ وہ تختہ دار تک مقادمت کرتے۔ اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کا یہ عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے ہدف پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ انسانیت کی نجات کو وہ چند دنوں کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا انبیاء کی ایک خصوصیت اپنے ہدف کی راہ میں پائیداری اور ثابت قدمی ہے ہم نے انبیاء کی خصوصیات سے متعلق بحث میں اس بارے میں کچھ گفتگو کی ہے کیا خوب کہا ہے کسی نے کہ ؎

با مسجد و منبر نبود دعوی توحید
منز لگہ مردان موحد سردار است

"صرف مسجد اور منبر کے ساتھ ہی توحید پرستی کا دعوٰی نہیں کیا جا سکتا۔ توحید پرست لوگ تو تختہ دار پر چڑھ کر بھی نعرہ توحید بلند کرتے ہیں۔"

(۲۹)

انبیاء کی زندگی میں سُنن الٰہی

آیاتِ موردِ بحث

۱۔اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ ﴿۵۱﴾ (مؤمن۔۵۱)

۲۔حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾ (یوسف۔۱۱۰)

۳۔بَلۡ نَظُنُّکُمۡ کٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾ (هود۔۲۷)

۴۔اِنِّیۡ لَاَظُنُّکَ یٰمُوۡسٰی مَسۡحُوۡرًا ﴿۱۰۱﴾ (بنی اسرائیل۔۱۰۱)

۵۔وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ ۚۖ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ ۪ وَاِنَّ جُنۡدَنَا لَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾ (الصفت۔۱۷۱تا ۱۷۳)

۶۔هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾ (توبة۔۳۳) (صف۔۹)

۷۔ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ۚ وَمَنۡ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِکُمۡ فَذُوۡقُوۡهُ وَاَنَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ (انفال۔۱۳۔۱۴)

۸۔اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ کَانُوۡا هُمۡ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ

بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۞ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞
(مؤمن۔۲۱۔۲۲)

۹۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ
وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۞ (طلاق۔۸)

۱۰۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (بقرۃ۔۶۱)

۱۱۔ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۞ (مائدۃ۔۷۰)

۱۲۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۞
(اعراف۔۸۸)

۱۳۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ
خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ
لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۞ (بنی اسرائیل۔۷۶۔۷۷)

۱۴۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۞ (انفال۔۳۰)

۱۵۔ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا
اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۞ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا
عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ (یونس۔۱۰۲،۱۰۳)

۱۶۔ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ (یونس۔۷۳)

۱۷۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (هود۔۶۶)

۱۸۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸
(یونس۔۹۸)

۱۹۔ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ (یونس۔۹۰)

۲۰۔ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝۱۳۴ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝۱۳۵ (اعراف۔۱۳۵،۱۳۴)

تفسیر۔

پیامبران خدا قوی اور مضبوط ایمان رکھنے کی وجہ سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ خدا کے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ فداکاری اور جاں نثاری کا راستہ اپناتے۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں ان کا سامنا بڑے ضدی اور سرکش دشمنوں سے ہوتا تھا جنہیں اپنے مفادات خطرے میں نظر آتے۔ لہٰذا اختلاف کے شعلے بھڑکنے لگتے اور صف آرائی شروع ہو جاتی۔ یہاں پیغمبر روحانی اور مادی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کس قسم کی کوتاہی نہ کرتے۔ جو کچھ ان کے بس میں ہوتا اسے اپنے مقصد پر قربان کر دیتے۔

ا۔ غیبی امداد

انبیاء اور ان کے انگشت شمار ساتھیوں کی محدود مادی اور انسانی قوت اس مقابلے کے لیے کافی نہ تھی۔ اسی وجہ سے خُدا غیبی طاقتوں کے ذریعے ان کی مدد کرتا اور ان کے لیے راستہ ہموار کر دیتا۔

یہ غیبی طاقتیں بعض آیات میں فرشتوں کو اور بعض میں کچھ مہلک طبیعی عوامل کو قرار دیا گیا ہے۔[1]

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض کام تو نبی اور اس کے ساتھیوں کے ذمے ہوتے اور بعض دوسرے کام خدا کے ذمے ایسے ہوتے کہ جو اس کی قدرت کے دائرکار میں آتے کیونکہ ایسا سوچنا تو ایک طرح کا شرک اور دوئیت کا قائل ہونا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خُدا کی مدد مومنین کی

[1] آل عمران۔۱۲۴، انفال۔۱۲، توبہ۔۲۶۔۴۰، احزاب۔۹

زحمات اور غیبی کارندوں کی کوششوں کے سائے میں متحقق ہوتی [1] تمام کامیابیوں کا سرچشمہ خدا ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱۲۶﴾ (اٰل عمران۔۱۲۶)

یہ قانون قدرت مختلف جلوے اور مظاہر رکھتا ہے جنہیں اس باب میں بیان کیا جائے گا۔ اب اس قانون قدرت سے متعلق آیات کی تفسیر کرتے ہیں:

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ ﴿۵۱﴾

ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد دنیوی زندگی میں اور اس دن کریں گے کہ جب گواہ قائم ہوں گے ۔(مؤمن ۔۵۱)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَيۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّىَ مَنۡ نَّشَآءُ ‌ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۰﴾

جب رسول اپنی اقوام کے اپنی طرف آنے سے مایوس ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا ہے تو اچانک ہماری مدد آ پہنچی۔ پھر جسے ہم نے چاہا اسے نجات دی اور ہمارا عذاب مجرموں کی قوم سے ہٹایا نہیں جاتا۔(یوسف۔۱۱۰)

یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے اگرچہ وہ ہمارے زیر بحث موضوع سے خارج ہے۔ وہ یہ کہ "وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا" کے جملے کا ظاہر یہ ہے کہ اس میں متصل ضمائر سے مُراد انبیاء ہیں (نہ کہ ان کے مخالفین) گویا (العیاذ اللہ) انبیاء یہ گمان کرتے تھے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے یعنی یہ وعدہ کہ خُدا ان کی مدد کرے گا ور دشمن کو نیست و نابود کر دے گا بے بنیاد وعدہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مومن اور بلند و وارستہ لوگوں کی یہ شان نہیں کہ وہ اس طرح کا گمان رکھیں انبیاء کی تو بات ہی اور ہے، الہٰذا یہ جملہ یقینی طور پر کسی اور معنی کو بیان کر رہا ہے جسے ہم ذکر کرتے ہیں:

اس جملے میں تین احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ اس ظن و گمان سے مُراد کوئی محکم اور قلب و فکر میں راسخ گمان نہیں ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ مشکلات اور مصائب کے اعتبار سے ان کی

---

[1] قرآن نے اس توحید افعالی کی طرف بالخصوص نصرت اور کامیابی کے سلسلے میں اشارہ کیا ہے۔ وہ میدان ان کارزار میں مومن بندوں کو کام کے آلات کے مانند قرار دیتا ہے کہ خدا جن کے ذریعے اپنے نافذ ارادے کو آشکار کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَيَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾ (سورہ توبہ۔ ۱۴)

ظاہری حالت اس بات کی حکایت کرتی تھی کہ ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہ یہ کہ اس طرح کا گمان ان کے دل پر حاکم تھا روزمرہ کی گفتگو میں اس بات کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ جو شخص بُرائی اور شہوت میں غرق ہے اور جاہ طلبی اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کے سوا جس کا کوئی کام نہیں ،لوگ اُس بارے کے یہ کہتے ہیں: یہ شخص یہ سوچتا ہے کہ اس کو ہرگز مرنا نہیں اور اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اس طرح کی سوچ اور فکر کسی عقل مند انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ ایک روز انہیں مرنا ہے۔ لیکن اس شخص کا زندگی کے ساتھ عملی سلوک ایسا ہے گویا کہ وہ موت پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ اس کا عمل اذہان میں یہ فکر ایجاد کرتا ہے کہ یہ شخص موت پر عقیدہ نہیں رکھتا نہ یہ کہ واقع اور حقیقت میں بھی ایسا ہے۔ ظلم و ستم کی چکی میں پسے ہوئے اور زحمت کش پیغمبروں کی زندگی کا حال جب کہ وہ حق ناشناس لوگوں کے دست ستم میں گرفتار ہو جاتے اور عرصے تک سختی کی حالت میں رہتے یہ تھا کہ گویا کسی قسم کی مدد کا وعدہ نہیں ہے کیونکہ اگر ہوتا تو اب تک وہ نصرت پہنچ چکی ہوتی اور یہ پاک و پاکیزہ بندے اس سختی سے نجات پا چکے ہوتے۔ گویا اس طرح کا گمان ان کی زبان حال تھا نہ زبان مقال۔ ان کی ظاہری حالت اس پر دلالت کرتی نہ یہ کہ ان کے ذہنوں میں کوئی ایسی سوچ ہوتی۔

۲۔ گمان ایک ایسی روحانی کیفیت ہے جو دو صورتوں میں ذہن میں جلوہ نمائی کرتی ہے کبھی تو ایک لحاتی حالت میں اور گذرگاہ کے عالم میں ذہن میں بظاہر ہوتا ہے، بجلی کی طرح اور پھر فوراً ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک راسخ اور محکم عقیدے کے طور پر دل پر اپنی حکومت جما لیتا ہے جو ان کے شایان شان نہیں وہ یہ دوسری حالت ہے جو ان کی عصمت اور رفعت شان سے ہم آہنگ نہیں۔ وہ پہلی حالت جو کہ ایک گزرگاہ کی طرح ہے اور جو ان کی زندگی میں درپیش آنے والے سخت حالات کا نتیجہ ہے، وہ صحت کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے برق آسا گمان کے بعد ایک مضبوط اور محکم ایمان ہوتا ہے جو اس گمان پر خط بطلان کھینچ دیتا ہے اور اس امر کی یاد آوری کراتا ہے کہ مدد میں تاخیر چند ایسی مصلحتوں کی وجہ سے ہے جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔

یہ دونوں جواب مندرجہ ذیل آیت کے بارے میں بھی آسکتے ہیں۔ آیت یہ ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم کو ان لوگوں جیسی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر گئے؟ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آ پڑیں اور وہ ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ رسول کا اور وہ مومنین جو اس کے ہمراہ تھے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے ۔(البقرۃ۔ ۲۱۴)

یہ امر قطعی ہے کہ اس کی طرح کی تضرع آمیز بات اور وہ بھی ایک مایوسی اور نا اُمیدی کے ساتھ زبان حال سے تھی نہ کہ زبان مقال سے یعنی وہ حالات کن اور ہلا دینے والے تھے نہ یہ کہ وہ حقیقت میں ہی مایوس یا متزلزل ہو گئے تھے۔

اگر اس طرح کی سوچ ان کے ذہن میں آتی بھی تھی تو یہ لحاتی ہوتی تھی اور انبیاء اور مؤمنین کا حقیقی اور عمیق ایمان سے نابود کر دیتا تھا۔

۳۔ ایک اور جواب یہ ہے کہ ''ظنّوا'' میں ضمیر متصل سے مراد رُسول نہیں ہیں بلکہ دوسرے لوگ ہیں یعنی خُدا کی مدد میں تاخیر اس بات کا باعث بنتی کہ لوگ یہ بات کہنے کی جرأت کرتے کہ کسی قسم کی نصرت کا وعدہ نہیں ہے۔ یہ خیال کرنیوالے کافر ہی تھے۔ اس بات پر شاہد وہ آیات ہیں جو دشمنوں کے انبیاء کے بارے میں بُرے خیالات کی حکایت کرتی ہیں، جیسے کہ حضرت نوح کے واقعے میں مخالفین کی زبانی یہ حکایت بیان ہُوئی ہے۔ وہ کہتے:

بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾

ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو۔ (ھود۔ ۲۷)

یہی تعبیر حضرت ھود اور حضرت صالح کے بارے میں بھی آئی ہے۔ فرعون کے متعلق ملتا ہے کہ اُس نے حضرت موسیٰ کو مخاطب کر کے کہا:

اِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰمُوۡسٰى مَسۡحُوۡرًا ﴿۱۰۱﴾

اے موسیٰ: میرے خیال میں تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔[1] (بنی اسرائیل۔ ۱۰۱)

رشتہ کلام کو تھوڑی دیر قطع کرنے پر آپ سے معذرت خواہی کے بعد ہم دوبارہ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اور انبیاء کے متعلق دوسرے قوانین الٰہی بیان کرتے ہیں۔

۲۔ انبیاء کا غلبہ اور کامیابی

مخالفین پر انبیاء کا غلبہ اور کامیابی خُدا کی ان سنتوں میں ہے۔ جنہیں قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾

ہماری مشیت ہمارے بھیجے ہوئے بندوں کی کامیابی پر ٹھہری، وہ کامیاب ہیں اور ہمارا لشکر دشمن پر ہمیشہ کامیاب ہے۔ (صفت۔ ۱۷۱ تا ۱۷۳)

نیز ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

---

[1] المیزان جلد ۱۱ ص ۳۰۷

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيۡزٌ ﴿۲۱﴾

اللہ نے اپنے آپ پر یہ ضروری ٹھہرایا ہے کہ میں اور میرے رسول کامیاب ہوں۔ خُدا طاقت ولا اور کامیاب ہے۔(مجادلۃ۔۲۱)

یہ دونوں آیات تمام انبیاء سے مربوط ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے متعلق یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ وہ جہان شرک پر غلبہ پائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾

وہ ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام نادرست ادیان پر غالب کرے اگر چہ مشرکوں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔(توبۃ۔۳۳،صف۔۹)

خدا نے تمام انبیاء سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے اور پیغمبر اسلامؐ سے بھی ایک قطعی وعدہ کیا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں۔ جو بات اہم ہے وہ اس کامیابی کی حقیقت کو روشن کرنا ہے۔

کیا اس سے مُراد تبلیغ حجت و برہان قائم کرتے وقت کامیابی ہے کہ تمام لوگ انبیاء کے استدلال کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیں گے اگر چہ بعض لوگ عناد اور ڈھٹائی کی راہ اختیار کرتے؟ یا یہ کہ مراد میدان جنگ میں کامیابی ہے اور وہ یہ کہ دونوں کے آمنے سامنے آنے پر انبیاء کو مخالفین پر کامیابی عطا کرے گا؟

یا یہ مُراد ہے کہ ان کی مخالفت ان کے اپنے تباہ و برباد ہونے کا باعث بنے گی یہاں تک کہ انبیاء کے دشمن خُدائی عذابوں کے ذریعے نیست و نابود ہو جاتے؟ حضرت نوحؑ کے مخالفین طوفان سے، حضرت موسیٰؑ کے مخالفین دریا میں طغیانی سے، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت شعیب اور حضرت لوطؑ کے مخالفین مختلف آسمانی عذابوں سے ہلاک ہوئے۔

قرآن گذشتہ ادوار میں رسالت کے مخالفین کی تباہی پر زور دیتا ہے۔ اور یہ بات یاد دلاتا ہے کہ جو انبیاء کی مخالفت کے لیے اٹھے وہ دنیا میں شدید ترین عذاب میں گرفتار ہوئے۔

اس سلسلے کی چند آیات جن میں یہ سنت الٰہی بیان ہوئی ہے ہم انہیں یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ‌ ۚ وَمَنۡ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمۡ فَذُوۡقُوۡهُ وَاَنَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

یہ سزا اس لیے ہے کیونکہ وہ خُدا اور اس کے رسول کے ساتھ مجادلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جو کوئی

بھی خُدا اور اس کے رسول کے ساتھ جھگڑا شروع کرے گا تو خدا سخت سزا دینے والا ہے، یہ تو دنیوی عذاب ہے جسے چکھو اور کافروں کے لیے (تو دوسری دنیا میں) آگ کا عذاب ہے۔ (انفال۔ ۱۳، ۱۴)

۲۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۳۲

تجھ سے پہلے میرے رسولوں کا مذاق اڑایا گیا۔ ہم نے کافروں کو مہلت دی پھر انھیں (بُرے اعمال کی وجہ سے) پکڑ لیا۔ ہماری سزا کیسی تھی؟ (رعد۔ ۳۲)

۳۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۲۱ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۲۲

کیا وہ زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے طاقت میں ان سے بڑھ کر تھے اور قبل ازیں انہوں نے زمین کو آباد کیا تھا؟ اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب ان کی گرفت کی۔عذاب الٰہی سے انکے بچاؤ کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ یہ عذاب انہیں اس لیے ہوا کہ ہمارے رسول دلائل کے ساتھ ان کے پاس آتے تھے لیکن وہ ان کا انکار کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں پکڑا۔ یقیناً وہ طاقت ور اور سزا دینے والا ہے۔ (مؤمن۔ ۲۱، ۲۲)

۴۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۹

اور کتنی ہی بستیوں نے اپنے پرودگار کے حکم اور رسولوں سے سرکشی کی۔ پھر ہم نے ان کا حساب بڑی سختی سے لیا۔ اور ہم نے انہیں ایک سخت عذاب کی سزا دی۔ پس انہوں نے اپنے کئے کا وبال چکھ لیا اور دنیا و آخرت میں انہوں نے نقصان اُٹھایا۔ (طلاق۔ ۸۔ ۹)

یہ آیات مجموعی طور پر ایک سنت الٰہی کی نقاب کشائی کرتی ہیں اور وہ یہ کہ جب انبیاء کے مخالفین علم مخالفت بلند کرتے اور اپنی ظاہری

طاقت اور عزت پر گھمنڈ کرتے تو خُدا انہیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ زمینی اور آسمانی بلائیں انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتیں وہ اپنے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں ہی دیکھ لیتے۔ گذشتہ اُمتوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

ان آیات کا انداز تو کلی ہے البتہ ہر ایک پیغمبر کہ جس کی قوم اس کی مخالفت کر کے عذاب میں گرفتار ہوئی اس سلسلے کی بھی بہت سی آیات ہیں جو کہ ان کی خصوصی زندگی کے بارے میں بیان ہوں گی۔ یہاں یہ کہنا چاہیے کہ گناہ اور سرکشی اور نزول عذاب کے مابین ایک تکوینی رابطہ ہے جس کے لیے ہم سنت الٰہی (یا قانون الٰہی) کی تعبیر لائے ہیں۔

یہاں ایک چوتھا احتمال بھی موجود ہے وہ یہ کہ درست ہے کہ میدان جنگ میں بعض دفعہ کامیابی دشمن کو حاصل ہوتی تھی یا بعض انبیاء جلادوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش فرما جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ

کفار انبیائے الٰہی کو ناحق قتل کر دیتے۔ (بقرۃ۔ ٦١)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝

بعض کو جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔ (مائدۃ۔ ٧٠)

لیکن جو قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے اہداف کی تکمیل (دین الٰہی کی اشاعت) میں کامیاب ہوئے۔ بشر کی اکثریت وہ دین کے سائے تلے لے آئے اور دین ایک جامع معنی میں بشر پر حکم فرما ہوا اگر چہ اس دوران خود خواہ غرض و نادان لوگوں کی طرف سے اس میں تحریف بھی ہوتی رہی۔ خود اسی مقام پر جہاں انبیاء ظاہری طور پر قتل ہوئے یا شکست کھا گئے آخر کار ان کا دین ہی کامیاب ہُوا اور مخالفین کی نسل کو اس نے اپنے سائے میں لے لیا۔ بعض انبیاء کی شہادت اور قتل ان کی کامیابی کی علامت ہوئے۔ نہ کہ ان کی شکست و ناکامی کے۔ اگر اسے ہدف کے لحاظ سے مدنظر رکھیں تو انبیاء ہدف کے لحاظ سے جیت گئے اور ان کے مخالفین نابود ہو گئے یا کچھ عرصے بعد ان کے دین میں آ گئے۔

۳۔ انبیاء کی جلا وطنی اور نزول عذاب

حق و باطل کے اس معرکے میں کبھی باطل گروہ یہ بزدلانہ ارادہ کرتے کہ انبیاء کو ذلت و خواری کے ساتھ اپنی مادر گیتی سے باہر نکال دیں۔ آج کل کی اصطلاح میں گویا انہیں ''جلا وطن'' کر دیں اور گذشتہ اصطلاح میں ''نفی بلد'' کر دیں۔ قرآن یہ حکایت کرتا ہے کہ حضرت شعیب کے مخالفین نے انہیں ''جلا وطنی'' کی دھمکی دی۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾

قوم شعیب کے مستکبر وڈیرے اُس سے کہتے: اے شعیب! تجھے اور ایمان لانے والوں کو ہم اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے یا یہ کہ ہمارے طریقے پر آ جاؤ۔ شعیب نے کہا! اگر چہ ہم اسے نہ چاہتے ہوں؟ (اعراف۔۸۸)

ایک اور آیت میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں فرماتا ہے کہ اگر مشرکین مکہ یہ ارادہ کر لیں کے تجھے مکہ سے باہر نکال دیں تو پھر وہ تھوڑی مدت کے لیے ہی زندہ رہ سکیں گے۔ گزشتہ انبیاء کے بارے میں سنت الٰہی یہی ہے اور سنت خُدا میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ آیت یہ ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿٧٧﴾

اور قریب تھا کہ یہ لوگ تیرے خلاف سازش کرتے اور مکہ کا ماحول ایسے بنا دیتے کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کر دیتے) نتیجۃً تجھے مکہ سے نکال دیتے۔ اس صورت میں وہ تھوڑی دیر ہی زندہ رہتے۔ یہ سنت الٰہی ان رسولوں کے بارے میں ہے جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا تھا۔ اور تم ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے (بنی اسرائیل۔۷۶۔۷۷)

یہاں دو نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ خُدا اپنی سنتوں کو جن کا سرچشمہ حقیقی مصالح اور بے پایاں علم ہے نا قابل تبدل اعلان کر رہا ہے۔ یہ انسانی قوانین کے برعکس ہیں کہ جن کا سرچشمہ انفرادی مفادات اور محدود علم ہے لہٰذا ان میں ہمیشہ تغیر و تبدل آتا رہتا ہے۔ قرآن نے سنت الٰہی کے ثابت اور محکم ہونے پر کئی اور آیات میں بھی تاکید کی ہے۔[1]

۲۔ اگر قانون الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ انبیاء کو ان کی سرزمین سے نکال کر چراغ ہدایت خاموش کرنے کے درپے ہیں انہیں نابود کر دیا جائے تو قریش کے وہ سازش کار لوگ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا ان پر یہ سنت الٰہی کیوں جاری نہ ہوئی؟ قرآن بتاتا ہے کہ قریش نے اکٹھے ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت کے بارے میں ان تینوں کاموں سے کوئی ایک کام کر دیا جائے:

---

[1] انفال۔۳۸، حجر۔۱۳، کہف۔۵۵، احزاب۔۳۸۔۶۲۔ فاطر۴۳۔ مؤمن۔۸۵، فتح۔۲۳

ا۔قید کر دیا جائے:

۲۔قتل کر دیا جائے:

۳۔مکہ سے باہر نکال دیا جائے:

قرآن نے یہ سازش مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ ؕ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ۝۳۰

اور یاد کر جبکہ وہ لوگ جو کافر ہو گئے تیرے بارے میں تدبیریں کرتے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں۔انہوں نے حیلے سے کام لیا۔خدا نے ان کے حیلے کو ناکام کر دیا۔خدا حیلہ گروں کا بہت اچھا جواب دیتا ہے۔(انفال۔۳۰)

یہاں اس سوال کو جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ:

یہ آیت اُس مورد سے متعلق ہے جہاں وہ بلا واسطہ پیغمبر کو جلا وطن کرنے کا ارادہ کرلیں جب کہ قریش نے پیغمبرؐ اسلام کے قتل کا ارادہ کیا نہ کہ انہیں شہر سے نکالنے کا۔یہ پیغمبر اسلامؐ تھے جنہوں نے قتل سے بچنے اور مشرکین کے اس منصوبے کو نقش بر آب کرنے کے لیے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت اس سنت الٰہی کا موضوع نہیں ہے۔۔۔۔

لہٰذا قرآن نے اس حقیقت کو ''وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَسۡتَفِزُّوۡنَكَ '' کے جملے کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قریب تھا کہ وہ تجھے نکالنے کا ارادہ کر لیتے۔لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ ان کا پروگرام تبدیل ہو گیا اور انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔

۴۔نزول عذاب اور انبیاء و مؤمنین کی نجات

عدالت الٰہی کا یہ فیصلہ ہے کہ جب مجرم لوگ چراغ ہدایت کو بجھانے کے درپے ہو جائیں تو وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔عدل حکیمانہ سے پھوٹنے والی مشیت کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو عذاب سے نجات بخشے کیونکہ گناہ اور نزول عذاب کے مابین ایک رابطہ ہے اور وہ رابطہ کسی دوسرے گروہ کے مابین نہیں۔قرآن نے اس سنت الٰہی جو کہ حقیقت میں اُس کے عدل کا تقاضا بھی ہے کی طرف عمومی اور انفرادی صورتوں میں اشارہ کیا ہے ارشاد ہوتا ہے

فَهَلۡ يَنۡتَظِرُوۡنَ اِلَّا مِثۡلَ اَيَّامِ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ قُلۡ فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ

مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

پھر کیا وہ ایسے دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسا کہ ان لوگوں کے دن تھے جو ان سے پہلے گزر گئے۔ کہہ دو کہ تم انتظار کرو یقیناً میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (جب عذاب آئے گا) ہم اپنے رسولوں اور مومنین کو نجات دیں گے۔ (یونس۔ ۱۰۲، ۱۰۳)

''كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کا جملہ اس سنت الٰہی کو بیان کر رہا ہے۔ دوسری آیات میں انفرادی اور جزئی عذابوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ بھی آیا ہے کہ انبیاء اور اہل ایمان اس عذاب سے نجات پا چکے ہیں۔

۱۔ حضرت نوح کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ

انہوں نے نوح کو جھٹلایا۔ ہم نے اسے اور جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے، انہیں نجات دی۔ (یونس۔ ۷۳)

۲۔ حضرت صالح کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

جب ہمارا عذاب آیا ہم نے صالح اور اہل ایمان کو نجات دی۔ (ھود۔ ٦٦)

سورہ ہود کی آیت ۹٦ بھی اسی مضمون کی حامل ہے جو کہ حضرت شعیب کے متعلق گفتگو کرتی ہے۔[1]

ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ خدا نے انبیاء کو اور ان لوگوں کو جو کہ عذاب کے آثار دیکھنے سے پہلے ان پر ایمان لے آئے تھے، نجات بخشی۔ لیکن حضرت یونس سے متعلق آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ۔

کبھی یہ رحمت الٰہی ان لوگوں کے شامل حال بھی ہو جاتی جو عذاب کے آثار دیکھنے سے پہلے کافر تھے لیکن عذاب دیکھتے ہی وہ اپنے پیغمبر پر ایمان لا کر اس کے گرویدہ ہو جاتے۔

حضرت یونس کی قوم کی داستان قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہے جو اس امر کی حکایت کرتی ہے کہ ان کا ایمان مؤثر ثابت ہوا اور وہ اہل نجات ہو گئے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اس آیت میں یوں بیان کیا ہے:

---

[1] انبیاء اور مومنین کی نجات سے متعلق معجم المفہرس مادہ ''نجات'' کے ذیل میں رجوع کیا جائے

فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۹۸﴾

شہروں اور آبادیوں کے لوگ نزول عذاب کے وقت کیوں ایمان نہیں لائے تا کہ ان کا ایمان مفید ہو سوائے قوم یونس کے (کہ جب قوم یونس ایمان لے آئی) تو ہم نے اس دنیا میں خوار کرنے والے عذاب کوان سے دور کر دیا اور انہیں ایک عرصے تک زندگی عطا کی۔[1] (یونس۔۸۹)

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان لوگوں کا ایمان کیسے مفید ثابت ہو گیا جب کہ دوسری قوموں کا ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔ یہاں تک کہ فرعون نے بھی دریا میں غرق ہوتے وقت یہ کہا:

اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِيۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۹۰﴾

میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے (خدائے واحد) کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (یونس۔۹۰)

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ:

ا۔ گذشتہ امتوں کو گھیر نے والا عذاب اچانک نازل ہوتا اور انہیں سوچنے سمجھنے اور ایمان لانے کی مہلت تک نہ دیتا۔ جیسے آسمانی بجلی کے ذریعے تباہی شدید زلزلے اور اسی طرح کے دوسرے عذاب جب کہ قوم یونس کو جس عذاب کی وعید کی گئی تھی اس کے آثار اور علامات تھے جو کہ اس کے نزدیک ہونے کا پتہ دیتے۔ اسی وجہ سے قوم یونس آخر کار ہوش میں آ گئی اور صمیم قلب سے اپنے نبی یونس کے دین پر ایمان لے آئی۔

۲۔ گذشتہ امتوں کا ایمان فقط ظاہری تھا اور دل میں جا گزیں نہیں ہوا تھا۔ اگر عذاب ہٹا لیا جاتا تو یہ لوگ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتے۔ خدا نے قوم فرعون کو کئی بار سیلاب، مینڈک، ٹڈی دل وغیرہ کے عذاب کے ذریعے آزمایا۔ اُن پر جب بھی ایسا عذاب نازل ہوتا تو وہ موسیٰ سے کہتے:

ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ لَٮِٕنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

---

[1] یہ احتمال بھی ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہو کہ نزول عذاب کے وقت کوئی قوم ایمان نہ لائی کہ اس کا ایمان مفید ثابت ہوتا سوائے قوم یونسؑ کے۔

تو وہ کہتے اسے موسیٰ ہمارے لیے اپنے پرودگار سے دعا کر وجس کا اس نے تمہارے ساتھ عہد کیا ہوا ہے ۔اگر تو نے اس عذاب کو ہم سے اُٹھا دیا تو ہم ضرور تجھ پر ایمان لائیں گے اور تمہارے ساتھ ضرور بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے (لیکن ان کا ایمان ظاہری تھا کیونکہ) پھر جب ہم نے ان سے ایک وقت تک کے لیے جس تک وہ پہنچنے ہی والے تھے عذاب ہٹا لیا تو وہ فوراً عہد توڑ ڈالتے ۔(اعراف ۔۱۳۴۔۱۳۵)

چونکہ قوم فرعون اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے خمیر میں اس طرح کی پیمان شکنی تھی ۔اس وجہ سے ان کا ایمان مفید ثابت نہ ہوا اور انہیں نجات نہ ملی۔

آخر میں یہ یاد کراتے چلیں کہ اس قوم سے عذاب کے اٹھا لینے سے حضرت یونس کی تکذیب نہیں ہوتی کیونکہ عذاب کے آثار اور علامات کا دکھائی دینا حضرت یونس کی صداقت کی گواہی تھی ۔اصل بات یہ ہے کہ ان کا حقیقی ایمان اور زندگی میں انقلاب ان سے عذاب کے دور ہو جانے کا باعث بنا ہم نے اس موضوع کو ''بدا'' کی بحث میں تفصیل سے بیان کیا ہے ۔یہ وہی ''بدا'' ہے جس کے شیعہ قائل ہیں اہل سنت اس عقیدے کی کہ جو ایک قرآنی اصول شمار ہوتا ہے نا آگاہی کی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں ۔وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''بدا'' کا عقیدہ خُدا کے علم میں کسی قسم کی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

(۳۰)

انبیاء قیامت میں

زیر بحث آیات

۱۔ فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ۝۴۱
(نساء۔۴۱)

۲۔ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا
لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ (حج۔۷۸)

۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ
الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ (بقرة۔۱۴۳)

۴۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا (احزاب۔۴۵) (فتح۔۸)

۵۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ (مزمل۔۱۵)

۶۔ وَكَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ
يَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡضٰى ۝۲۶ (نجم۔۲۶)

۷۔ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى (انبیاء۔۲۸)

۸۔ وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۝۷۹
(بنی اسرائیل۔۷۹)

۹۔ وَلَلۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُوۡلٰى ۝۴ وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ۝۵
(ضحی۔۴۔۵)

۱۰۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ

(زمر۔۵۳)

۱۱۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ (اعراف۔۶)

۱۲۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ (مائدۃ۔۱۰۹)

۱۳۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (مائدۃ۔۱۱۶)

۱۴۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۳۰

(فرقان۔۳۰)

تفسیر۔

قیامت کے دن لوگوں کے مرتبہ اور منزلت ان کے ایمان کے قوی ہونے اور عمل کے اعتبار سے ہوگا۔ انبیاء ایمان اور عمل صالح کے سائے میں خُدا کے دربار میں بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ اسی مرتبے کی وجہ سے وہ کئی کاموں کا سرچشمہ ہوں گے۔ قرآن نے ان میں سے بعض کو یاد کیا ہے۔ دوسرے روایات میں بیان ہوئے ہیں اسی وجہ سے ہم قیامت میں انبیاء کے بعض حالات اور کاموں کو وحی کے نکتہ نظر سے زیر بحث لاتے ہیں۔

(۱)۔ اعمال پر گواہی

اعمال پر گواہی کا موضوع ایک دقیق معنی کا حامل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر امت کے پیغمبر اس کے ظاہری اور باطنی اعمال پر گواہی دیں گے۔ بعض اوقات تو ایک عمل جو کہ اچھائی اور برائی میں مشترک تھا اُس کی حقیقت پر گواہی دیں گے۔ ایسی گواہی ایک ایسے قوی اور محکم علم کے طفیل ہی دی جاسکتی ہے جس کے ذریعے ظاہر اور باطن دونوں کا ادراک کیا جا سکے۔

جو آیات انبیاء کے اس خاص اور عظیم مقام پر گواہ ہیں وہ ''معاد'' سے متعلق گفتگو میں زیر بحث آ چکی ہیں بحث کی تکمیل کے لیے بعض آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۴۱

کیسے ہوگا کہ جب ہم ہر امت سے گواہ لے کر آئیں گے اور تجھے ان (امتوں کے گواہوں) پر گواہ لائیں

گے۔(نساء۔۴۱)

۲۔بعض آیات[1] میں ایک کلی انداز میں یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن ہر امت پر شاہد اور گواہ ہے۔لیکن مفسرین نے ہر امت کا گواہ اس امت کے پیغمبر کو قرار دیا ہے۔

۳۔مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

تمہارے والد ابراہیم کی ملت اور طریقہ وہ ابراہیمؑ کہ جس نے زمانہ ماقبل میں تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس سلسلے میں رسول تم پر گواہ ہیں اور تم بھی لوگوں پر گواہ ہو۔(حج۔۷۸)

۴۔وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

ہم نے تم کو برگزیدہ امت قرار دیا تا کہ تم لوگوں پر شاہد اور گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہو۔(بقرۃ۔۱۴۳)

۵۔قرآن کریم کی بعض آیات میں پیغمبر گرامی اسلامؐ کو شاہد اور مبشر کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا

اے نبی! ہم نے تمہیں گواہ اور خوش خبری سنانے والے بنا کر بھیجا۔(فتح۔۸)،(احزاب۔۴۵)

ممکن ہے اس گواہی سے مُراد قیامت کے دن پیغمبر کی گواہی ہو۔

۶۔ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ

ہم نے تمہاری طرف ایسے رسول کو بھیجا جو تم پر گواہ ہے۔(مزمل۔۱۵)

مذکورہ آیات سے قیامت کے دن انبیاء کے گواہی دینے کا مقام عظیم آشکارا ہو رہا ہے۔ان آیات کے مفاہیم سے آگاہی کے لیے ''معاد'' کی بحث کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

[1] (نحل۔۹۸،۴۸)،(قصص۔۵۷)،(نسائی۔۱۴)،کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۲)۔شفاعت

گنہگاروں کے حق میں انبیاء کا شفاعت کرنا ان کا ایک عظیم مقام شمار ہوتا ہے۔ان کی شفاعت ایسے گنہگاروں کے لیے ہوگی جنھوں نے اپنا رابطہ مقام ربوبیت سے منقطع نہیں کیا ہوگا۔نیز انہوں نے پیغمبر سے اپنا روحانی اور قلبی تعلق بھی برقرار رکھا ہوگا۔شفاعت سہ طرفہ رابطے کا نام ہے:

ا۔شفیع (شفاعت کرنے والا)

۲۔مشفوع لہ (جس کے حق میں پیغمبر شفاعت کرتا ہے)

۳۔مشفوع عندہ (جس کے پاس شفیع جاتا ہے تاکہ اس کی رضا حاصل کر سکے)

شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ مغفرت اور گناہوں کی بخشش جیسا خُدا کا فیض چند اسباب کے ذریعے امتوں تک پہنچتا ہے جیسے کہ مادی دنیا میں فیض طبیعی بھی طبعی وسائل و اسباب کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

لہٰذا اگر خُدا انبیاء کی شفاعت کی وجہ سے کسی گنہگار کو معاف کردے یا معتزلہ کے عقیدے کے مطابق درجہ بلند کر دے تو یہ کوئی قابل حیرت بات نہیں۔

دنیاوی سفارش کے لیے گہنگار سفارش کرنے والے کے پیچھے جاتا ہے۔آہ وزاری یا منت سماجت سے اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ صاحب حق کے پیچھے جائے جب کہ آخرت کی شفاعت میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔یہ صاحب حق ہے جو گنہگار میں موجود حالات کے پیش نظر شفیع کو اس امر پر ابھارتا ہے کہ وہ گہنگار کی شفاعت کرے تاکہ اس کا فیض شفیع کے ذریعے مجرم تک پہنچے لہٰذا یہ ناآگاہ لوگ جو کہ شفاعت کو ایک قسم کی ''پارٹی بازی'' قرار دیتے ہیں یہ نہ قرآن سے واقف ہیں نہ حدیث سے اور نہ ہی انہیں حقیقت شفاعت کا ادراک ہے۔

شفاعت تو مجرموں اور گہنگاروں کے لیے اُمید کا ایک روزن ہے جس پر اعتقاد کے طفیل وہ مایوسی اور نا اُمیدی سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ مایوسی کے عالم میں تو انسان کسی قسم کے بُرے کام سے بھی نہیں بچتا۔اسی وجہ سے اُمید کا یہ دروازہ ہونے سے گنہگاروں کے سامنے ایک روشن افق نمایاں ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے حالات میں تبدیلی کر سکیں اور بُرے اعمال سے دست بردار ہو جائیں تاکہ شاید لطف الٰہی ان کے شامل حال ہو جائے۔

شفاعت قرآن ایک محدود شفاعت ہے جس کی اپنی شرائط ہیں ان میں سے سب سے اہم شرط اذن الٰہی ہے۔جب تک اُس کی طرف سے اذن نہ ملے اُس وقت تک انبیاء شفاعت نہیں کریں گے اُس وقت تک انہیں حق شفاعت نہیں ہوگا اور ایسی شرط کی موجودگی کے بارے میں معلوم ہونا بہت مشکل ہے۔اسی وجہ سے شفاعت گہنگار کے لیے امید کی ایک کرن کے سوا کسی قسم کی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہم نے چونکہ آٹھویں جلد میں شفاعت کی حقیقت اور اُس کی شرائط سے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے لہٰذا یہاں دامن سخن سمیٹتے ہوئے ان آیات کی یاد آوری کراتے ہیں جو انبیاء کے لیے یہ مقام ثابت کرتی ہیں۔

(۳)۔ قیامت کے دن کے شفیع

جن آیات نے شفیعوں کا نام لیا ہو وہ بہت کم ہیں۔ خُدا نے قرآن میں اس موضوع کو اجمالی سے انداز میں بیان فرمایا ہے ایسا بھی ایک مصلحت کی بنا پر ہے جو اپنی جگہ پر بیان ہوئی ہے۔

صرف بعض آیات میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ فرشتے خُدا کے اذن اور انتخاب کے بعد شفاعت کریں گے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾

آسمان میں کتنے فرشتے ہیں کہ جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی مگر یہ کہ خُدا جس کے بارے میں چاہے اذن دے اور اُس سے راضی ہو۔ (نجم۔۲۶)

اسی طرح ایک اور آیت میں فرشتوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اُنہیں معزز بندے اور گناہ سے معصوم قرار دینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى

اُن کے بارے میں شفاعت کریں گے جنہیں خُدا نے چن لیا ہو۔ (انبیاء۔۲۸)

انبیاء کے بارے میں کوئی ایسی صریح آیت نہیں جو انہیں درگاہ حق میں شفیع قرار دے رہی ہو۔ لیکن احادیث میں بعض آیات کی تفسیر انبیاء کے مقام شفاعت کے ساتھ کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے لیے قرآن میں جس ''مقام محمود'' کا ذکر ہے وہ مقام شفاعت ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

رات کے کچھ حصے میں تہجد کے لیے اُٹھ کھڑے ہو۔ یہ تم پر ایک اضافی ذمہ داری ہے۔ اُمید ہے کہ خُدا تجھے مقام محمود پر فائز کر دے۔ (بنی اسرائیل۔۷۹)

طبرسی لکھتے ہیں:

''مفسرین اس بات پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ یہ مقام محمود مقام شفاعت ہی ہے۔ جب پیغمبر اکرمؐ لوائے حمد کو ہاتھ میں لیں گے تو انبیاء اور فرشتے اس پر چم تلے جمع ہو جائیں گے۔ پیغمبر اسلامؐ وہ سب سے پہلے شفیع ہوں گے جن کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس سلسلے میں کئی روایات بھی ہیں جو اسی رائے کی

تائید کرتی ہیں''۔[1]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵

تیرے لیے آخرت اس دنیا سے بہتر ہے۔ تیرا پرودگار تجھے اس قدر عطا کرے گا کہ تو راضی ہو جائے۔ (ضحیٰ۔ ۴،۵)

روایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ آیت شفاعت سے متعلق ہے کیونکہ حضرت امام جعفر صادقؑ اس آیت کی تفسیر میں یوں فرماتے ہیں:

''انبیاء اس بات پر خوش نہیں ہوں گے کہ کوئی موحد آگ میں جائے یعنی ان کی رضا تب حاصل ہوگی جب یہ ہدف پورا ہو جائے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ قرآن کی سب سے زیادہ اُمید بخش آیت یہ ہے کہ:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط [2]

(زمر۔ ۵۳)

لیکن ہم خاندان رسالت کی نظر میں سب سے زیادہ اُمید افزا آیت یہ ہے:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔

خُدا کی قسم! یہ وہی شفاعت ہے کو خُدا اپنے پیغمبر کو عطا کرے گا تا کہ وہ ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کہنے والوں کی یہاں تک شفاعت کرے کہ کہے خُدایا میں راضی ہو گیا ہوں۔''[3]

(۴)۔سوال اور باز پرس

قرآنی آیات کے نکتۂ نظر سے قیامت کا دن باز پرس اور پوچھ گچھ کا دن ہے۔ سب مکلف انسانوں سے اُس دن باز پرس کی جائے گی۔ ان کا حساب کتاب لیا جائے گا۔ انبیاء بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن قرآن نے اس سلسلے میں ایک خاص موضوع کی نشاں دہی کرتے ہوئے اس بات کی یاد آوری کی ہے کہ انبیاء کی باز پرس ایک خاص طریقے سے کی جائے گی۔ ان آیات کا ماحصل یہ ہے کہ ان سے دو چیزوں کے

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ ص ۵ ۴۳ نیز درالمنثور جلد ۴ ص ۱۹۷ برھان جلد ۲ ص ۴۳۸۔ ۴۴۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] اے میرے وہ بندو! کہ جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو خُدا تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

[3] مجمع البیان جلد ۵ ص ۵۰۵، مفاتیح الغیب جلد ۸ ص ۴۲۲

بارے میں باز پرس اور سوال کیا جائے گا:

۱۔ ابلاغ رسالت

۲۔ امت کے اعمال

پہلے سوال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶

یقیناً جن کی طرف (رسولان الٰہی) بھیجے گئے نیز رسولوں سے ہم سوال کریں گے۔ (اعراف۔۶)

پہلے گروہ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے تکالیف الٰہی پر کیسے عمل کیا اور پیغمبروں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے خدا کے احکام اور تکالیف اپنی امتوں تک کیسے پہنچائے۔ اگر چہ خدا رسولوں کے ابلاغ رسالت اور بندوں کے اُس پر عمل پیرا ہونے سے آگاہ ہے لیکن اس بات پر عقیدہ کہ قیامت کے دن بھی اُمتوں اور پیغمبروں سے سوال کیا جائے گا یہ انسانوں کی ہدایت میں ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے کہ وہ تکالیف الٰہی کا سامنا پوری سنجیدگی سے کریں اور اپنے آپ کو خدا اور اُس کی طرف سے مقرر کردہ لوگوں کی پوچھ گچھ کے لیے آمادہ کرسکیں۔

اس سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت مروی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

خدا (قیامت کے دن) مجھ سے سوال کرے گا کہ کیا تو نے میرا پیغام بندوں تک پہنچایا؟

میں جواب دوگا:

خدایا میں نے پیغام پہنچادیا۔[1]

دوسری بات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ (مائدۃ۔۱۰۹)

قیامت کے دن خدا پیغمبروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے کہے گا: تمہیں کیا جواب دیا گیا

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ سوال تثبیت اور مذمت کا آہنگ لیے ہوئے ہے اس سے مُراد منافقوں کو سرزنش کرنا ہے جب وہ عدالت الٰہی میں رسوا ہوں گے یعنی منافقوں کے ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد خدا انبیاء کی طرف رخ کر کے یہ کہے گا! امت نے تمہاری خیر خواہ دعوت کا کیا جواب دیا؟ اس سے منافقین کی توبیخ کی جارہی ہے کہ انہوں نے انبیاء کی دعوت کا مثبت جواب نہ دیا اور فریب کاری اور نفاق سے کام لیا۔

ایک اور آیت میں حضرت عیسیٰ کے متعلق بالخصوص یہ ارشاد ہو رہا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ

---

[1] المیزان، جلد ۸ ص ۱۲

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

جب خُدا نے عیسٰی بن مریمؑ سے کہا کہ کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدائے واحد کے مقابلے میں خُدا بنالو؟ (مائدۃ۔۱۱۶)

آیت میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ حضرت عیسٰی سے ان کی امت کے ایک باطل اور انحرافی عقیدے کے متعلق باز پرس کی جارہی ہے اور یہ کہ یہ انحراف یعنی انسانوں کی پرستش کہاں سے ہے تا کہ حضرت عیسٰی کے جواب سے سب یہ سمجھ لیں کہ حضرت عیسٰی کا پیغام توحید کے سوا کچھ نہ تھا انسان کی عبادت تو تحریف گروں کا کام ہے۔

(۵)۔ اُمت سے شکایت

قرآن بعض آیات میں اس بات کی یاد آوری کرواتا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ اسلام قیامت کے دن اپنی امت کے گنہگاروں کی شکایت کریں گے اور یہ کہ انہوں نے قرآن کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰

اور رسول اکرم کہیں گے: پروردگارا، میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا اور اس سے کنارہ کشی کر لی۔ (فرقان۔۳۰)

کلمہ ''مہجور'' چھوڑے ہوئے کے معنی میں ہے۔ اس آیت کے اطلاق کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام مندرجہ ذیل مراحل پر محیط ہے۔

۱۔ قراءت اور تلاوت

۲۔ تدبر اور فہم معانی

۳۔ عملی زندگی میں اس سے استفادہ

اُمید ہے کہ تفسیر اور معانی قرآنی کی تفہیم کے لیے ہماری یہ ناچیز سی کاوش بارگاہ قرآن میں قبول ہوگی اور وہ ہماری شکایت نہیں کرے گا۔ آخر میں یہ بتاتے چلیں کہ انبیاء مذکورہ مقامات کے علاوہ بھی قیامت میں کئی مقامات کے حامل ہیں مثلاً وہ اصحاب اعراف ہیں اور اپنی امتوں کے اعمال کے لیے ترازو ہیں۔ ہم نے چونکہ اس سے متعلق معاد کی ابحاث میں تفصیلی گفتگو کی ہے لہٰذا یہاں اسے نہیں دہراتے۔ اشتیاق رکھنے والے حضرات اُن ابحاث کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ ہم منشور جاوید کی دسویں جلد کے خاتمے پر خُدا کے شکر گزار ہیں اور اس کی بارہ گاہ میں ہماری یہ التجا ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں وہ ہماری مدد کرے اور اس ناچیز سے ہدیے کو قبول فرمائے۔